بیان القرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران)

بیانُ القرآن

حصّہ ہفتم

ترجمہ ومختصر تفسیر

سُورۃ قٓ تا سُورۃُ النّاس

از

ڈاکٹر اسرار احمد

مُرتّبہ

حافظ خالد محمود خضر

لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین

شائع کردہ

انجمن خُدّامُ القُرآن

خیبر پختونخوا' پشاور

مرحوم و مغفور مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد ﷫ کی تاحیات خواہش اور عمل کے عین مطابق‘ مرحوم کے قانونی جانشین تمام حضرات کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طبع شدہ تصنیفات / تالیفات‘ آڈیوز‘ ویڈیوز کو طبع / تیار کر کے‘ چاہے قیمتاً ہو یا مفت‘ تقسیم کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہیں ہے‘ البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ہم ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی مذموم کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ‘ غلط اقتباس‘ سیاق و سباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت و شہرت پر حرف آئے‘ تو ہم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق رکھتے ہیں۔

نام کتاب : بیان القرآن (حصہ ہفتم)

اشاعت اوّل : جون 2015ء

قیمت : 650 روپے

ISBN: 978-969-606-038-3

شائع کردہ :

انجمن خدام القرآن خیبر پختونخوا

18-A ناصر مینشن‘ ریلوے روڈ نمبر 2‘ شعبہ بازار‘ پشاور
فون: 2214495 - 2584824 (091)
ای میل: peshawar@tanzeem.org

زیر اهتمام :

شعبہ مطبوعات‘ قرآن اکیڈمی لاہور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور‘ فون: 3-35869501
ای میل: publications@tanzeem.org

ملنے کا پتا: مکتبہ خُدّامُ القُرآن‘ 36-K ماڈل ٹاؤن لاہور

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس‘ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

حافظ عاکف سعید

''بیان القرآن'' کی ساتویں جلد ترتیب وتسوید کے تمام مراحل سے گزر کر اب بحمد اللہ تعالیٰ طباعت کے آخری وحتمی مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ ۱۹۹۸ء کے رمضان المبارک میں کراچی میں والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد ﷫ نے نمازِ تراویح کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کے ترجمہ ومختصر تشریح کا جو مبارک فریضہ ادا کیا تھا' جسے عرفِ عام میں ''دورۂ ترجمہ قرآن'' کہا جاتا ہے' وہ ایک سو آٹھ گھنٹوں پر محیط تھا۔ ''بیان القرآن'' دراصل اسی کی تحریری صورت ہے۔ تصنیف وتالیف کی دنیا سے وابستہ حضرات خوب جانتے ہیں کہ محض ایک ڈیڑھ گھنٹے پر محیط کسی بلند پایہ تقریر یا خطاب کو اعلیٰ معیاری سطح پر تحریری صورت میں مرتب کرنا بھی کس قدر مشقت طلب اور کٹھن کام شمار ہوتا ہے اور اس کے لیے کس اعلیٰ درجے کی علمی وادبی صلاحیت درکار ہوتی ہے' جبکہ ''بیان القرآن'' کی ریکارڈنگ ایک ڈیڑھ گھنٹے پر نہیں' ایک سو آٹھ گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید وتوفیق کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ۔۔۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

اس کارِ خیر کی تکمیل میں جن ساتھیوں نے بھی عملی حصہ ڈالا ہے وہ تمام لوگ ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ میں خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کروں گا اپنے دیرینہ تنظیمی وتحریکی ساتھی اور قرآن اکیڈمی میں میرے خصوصی معاونِ کار حافظ خالد محمود خضر صاحب کا' جن کی سال ہا سال کی پیہم جِدوجُہد اور قابلِ رشک خلوص ولگن کا نتیجہ ''بیان القرآن'' کی تکمیل کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ محترم حافظ صاحب نے ''کلمۂ تشکر'' کے حوالے سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کتاب کے آخر میں کیا ہے۔ ''بیان القرآن'' کی ترتیب وتسوید اور طباعت واشاعت کے ضمن میں جن ساتھیوں کا خصوصیت کے ساتھ انہوں نے ذکر کیا اور شکریہ ادا کیا ہے' اُن میں ہمارے ایک تنظیمی ساتھی' جن کی قافلۂ تنظیم میں شمولیت تو زیادہ پرانی نہیں ہے' لیکن بعض اعتبارات سے وہ اُن قابلِ رشک افراد میں شامل ہیں جو دیر سے آتے ہیں لیکن آگے نکل جاتے ہیں ـــــ کرنل (ر) عاشق حسین صاحب ہیں' جو ''بیان القرآن'' کے حصہ اول کی اشاعت کے بعد ہمارے رابطے میں آئے' لیکن پھر انہوں نے خود کو ہمہ تن اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ زبان وادب کے حوالے سے اللہ نے انہیں خصوصی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ راقم کا احساس ہے کہ ''بیان القرآن'' کی ترتیب وتسوید (editing) کے کام میں ان کا غیر معمولی تعاون ہمارے لیے تائیدِ غیبی سے کم نہ تھا۔ اسی طرح طباعت کے حوالے سے ہمارے ایک دیرینہ ساتھی شیخ رحیم الدین صاحب کی غیر معمولی مساعی' ان تھک محنت اور بے پناہ جذبہ ولگن مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان حضرات کے ساتھ ساتھ عملہ کے تمام دیگر ارکان جن کا

خصوصی تعاون اس کام میں ہمیں حاصل رہا' بالخصوص حافظ محبوب احمد صاحب' حافظ محمد زاہد صاحب اور مرتضیٰ احمد اعوان سب ہمارے شکریے اور دعاؤں کے مستحق ہیں۔ فجزاھم اللّٰہ احسن الجزاء!

''بیان القرآن'' عام معنوں میں تفسیر قرآن نہیں ہے۔ اگرچہ یہ امر واقعہ ہے کہ والد محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو زمانۂ طالب علمی کے آخری سالوں میں ہی قرآن حکیم کے ساتھ ایک ذہنی و قلبی والہانہ تعلق قائم ہو چکا تھا' چنانچہ میڈیکل کی تعلیم کے آخری سالوں میں ہی ان کے دروسِ قرآن کو قبولیتِ عام کا مقام حاصل ہو گیا تھا' لیکن جیسا کہ انہوں نے ''بیان القرآن'' حصہ اول کے مقدمہ میں خود اس حقیقت کا وضاحت کے ساتھ اظہار کیا ہے کہ انہیں ہرگز ''مفسر'' ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ان کے دروسِ قرآن سے متاثر ہو کر جب بھی احباب فرمائش کرتے تھے کہ آپ قرآن حکیم کی تفسیر بھی ضرور لکھیں تو اُن کا جواب یہ ہوتا تھا کہ میں خود کو اس مقام کا اہل نہیں سمجھتا۔ بہرکیف' قرآن کی عظمت کا نقش ان کے دل پر کچھ اس انداز سے ثبت ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف متوجہ کرنا' قرآن کو پڑھنے' سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی انہیں ترغیب دینا اور قرآن کے منتخب مقامات کے دروس کے ذریعے مسلمانوں کو ان کی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرنا ان کی زندگی کا مشن تھا۔ اُن کی ان تمام تر دعوتی و تبلیغی مساعی کے مرکز و محور کی حیثیت قرآن حکیم ہی کو حاصل تھی ـــ قرآن مجید کی عظمت اور امت کے عروج و زوال کے ضمن میں قرآن کی اہمیت کے حوالے سے علامہ اقبال کے یہ اشعار گویا اُن کے تحت الشعور کا حصہ بن چکے تھے کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اور ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

حکیم الامت علامہ اقبال' امت کے زوال و انحطاط کی تشخیص کرتے ہوئے' ہمیں مسلسل یہ پیغام دیتے رہے کہ اس کا اصل سبب ترکِ قرآن ہے' یعنی قرآن سے اپنے مطلوب تعلق کو توڑ کر اسے محض ایک ایسی کتابِ مقدس یا بقول اقبال نسخۂ موت بنا دینا ہے جس کا زندگی کے پیچیدہ معاملات و مسائل کے حل اور علم و فکر کے میدان میں رشد و ہدایت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اقبال ہی کے دور کی ایک اور عظیم شخصیت جن کا تعلق طبقہ علماء سے تھا' یعنی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ' وہ بھی یہی سوچ رکھتے تھے کہ زوالِ امت کا اصل سبب قرآن کو ترک کر دینا ہے۔ انگریز کے خلاف جہادِ حریت کے اس عظیم مجاہد نے مالٹا کی اسیری سے رہائی پانے کے بعد اپنی پیرانہ سالی میں طبقۂ علماء کے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس

کام میں صرف کروں گا کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے' بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے' اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔'' (بحوالہ: ''وحدتِ امت'' از مفتی محمد شفیع ؒ)

والد محترمؒ کی تمام مساعی پر اگر نگاہ ڈالیں تو ع ''میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!'' کے مصداق امت کو دوبارہ قرآن کے ساتھ جوڑنے کی کوشش ہی کا مظہر ہیں اور اس ضمن میں شیخ الہندؒ نے جو راستہ تجویز کیا' یعنی قرآن حکیم کو لفظاً اور معناً عام کرنا' لوگوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں قرآن کے معانی سے روشناس کرانا اور انہیں قرآن کی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کرنا' اسی کی عملی تعبیر ہیں۔ قرآن کا پیغام آج ان کے دروسِ قرآن اور خطابات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اردو بولنے سمجھنے والے دنیا بھر میں کروڑوں افراد تک پہنچ رہا ہے۔ اسی خدمتِ قرآنی کا ایک بہت بڑا مظہر اور ایک اعتبار سے نقطۂ عروج' نزولِ قرآن کے مہینے' رمضان المبارک کی بابرکت راتوں میں نمازِ تراویح کے ساتھ پورے قرآن کا ترجمہ' نہایت مختصر اور ضروری تشریح کے ساتھ' یعنی دورۂ ترجمۂ قرآن ہے' جو بحمداللہ اب ''بیان القرآن'' کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی پورے کا پورا دستیاب ہے۔ فالحمد للّٰہ علٰی ذٰلک!

یہ امرِ واقعہ ہے کہ ''بیان القرآن'' کا کتابی صورت میں مرتب ہو جانا' والد محترمؒ اور ہم سب کا ایک خواب تو ضرور تھا' لیکن اس کی عملی تعبیر بظاہر ناممکن نظر آتی تھی۔ تاہم' اس کی پہلی جلد کی اشاعت سے ہمیں یہ حوصلہ ملا کہ یہ کام ناممکن نہیں ہے' جیسا کہ خود والد محترمؒ نے بھی پہلی جلد کی بارِ دگر اشاعت کے موقع پر ''تقدیم'' میں اپنے ان خیالات کا اظہار فرمایا تھا:

''اس جلد میں ابھی صرف سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی ترجمانی ہوئی ہے' گویا کہ ابھی پہاڑ ایسا کام باقی ہے۔ تاہم' اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے توقع ہے کہ جیسے اس نے میرے کسی ارادے یا منصوبہ بندی کے بغیر اور میری خالص لاعلمی میں پیشِ نظر جلد شائع کرا دی' ویسے ہی باقی بھی شائع کرا دے گا —— خواہ میری اس دنیا سے دارِ آخرت کی جانب روانگی کے بعد ہی سہی!''

والد محترمؒ کی حیات میں صرف پہلی جلد ہی شائع ہو سکی تھی' بعد کی تمام جلدیں اُن کی وفات کے بعد وقفے وقفے سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ اور اب اُن کی وفات کے پانچ سال دو ماہ بعد آخری جلد کے آ جانے پر یہ کام بحمداللہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ السّعی مِنّا و الا تمام من اللّٰہ!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ خدمتِ قرآنی کے اس کام کو والد محترمؒ کے لیے توشۂ آخرت اور عوام الناس کو قرآن سے جوڑنے' اس کے پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا موجب بنا دے۔ آمین یا ربّ العالمین!

۲۴ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ/۱۲ جون ۲۰۱۵ء
بروز جمعۃ المبارک

احقر عاکف سعید عفی عنہ
امیر تنظیم اسلامی

ترتیب

سورۃ قٓ	9
سورۃ الذّٰرِیٰت	27
سورۃ الطُّوْر	39
سورۃ النَّجْم	51
سورۃ الْقَمَر	67
سورۃ الرَّحْمٰن	80
سورۃ الْوَاقِعَة	98
سورۃ الْحَدِیْد	118
سورۃ الْمُجَادَلَة	163
سورۃ الْحَشْر	180
سورۃ الْمُمْتَحِنَة	201
سورۃ الصَّفّ	215
سورۃ الْجُمُعَة	231
سورۃ الْمُنٰفِقُوْن	244
سورۃ التَّغَابُن	256
سورۃ الطَّلَاق	272
سورۃ التَّحْرِیْم	284
سورۃ الْمُلْك	297
سورۃ الْقَلَم	308
سورۃ الْحَآقَّة	321
سورۃ الْمَعَارِج	328
سورۃ نُوْح	339
سورۃ الْجِنّ	347
سورۃ الْمُزَّمِّل	357
سورۃ الْمُدَّثِّر	365
سورۃ الْقِیٰمَة	378
سورۃ الدَّهْر	387
سورۃ الْمُرْسَلٰت	395
سورۃ النَّبَا	402
سورۃ النّٰزِعٰت	407
سورۃ عَبَس	415
سورۃ التَّکْوِیْر	422

سورۃ الْاِنْفِطَار	428
سورۃ الْمُطَفِّفِيْن	432
سورۃ الْاِنْشِقَاق	438
سورۃ الْبُرُوْج	447
سورۃ الطَّارِق	451
سورۃ الْاَعْلٰى	453
سورۃ الْغَاشِيَة	460
سورۃ الْفَجْر	465
سورۃ الْبَلَد	473
سورۃ الشَّمْش	479
سورۃ الَّيْل	484
سورۃ الضُّحٰى	491
سورۃ اَلَمْ نَشْرَح	496
سورۃ التِّيْن	500
سورۃ الْعَلَق	504
سورۃ الْقَدْر	509
سورۃ الْبَيِّنَة	512
سورۃ الزِّلْزَال	517
سورۃ الْعٰدِيٰت	520
سورۃ الْقَارِعَة	522
سورۃ التَّكَاثُر	524
سورۃ الْعَصْر	526
سورۃ الْهُمَزَة	528
سورۃ الْفِيْل	531
سورۃ قُرَيْش	533
سورۃ الْمَاعُوْن	535
سورۃ الْكَوْثَر	537
سورۃ الْكٰفِرُوْن	539
سورۃ النَّصْر	541
سورۃ اللَّهَب	543
سورۃ الْاِخْلَاص	546
سورۃ الْفَلَق	548
سورۃ النَّاس	552
دعائے ختمِ قرآن	555

سُوْرَۃُ قٓ

تمہیدی کلمات

سورۂ قٓ سے مکی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ اور ساتویں (آخری) منزل کا آغاز ایک ساتھ ہو رہا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مقام بھی گویا **قِران السّعدین** ہے۔ قبل ازیں سورۂ یونس کے آغاز کو بھی میں نے اس لحاظ سے **قِران السّعدین** قرار دیا تھا کہ وہاں پر بھی مکی مدنی سورتوں کے نئے گروپ اور نئی منزل کا آغاز ایک ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ وہاں تو سورتوں کے گروپ اور منزل کے اعداد بھی برابر ہیں۔ یعنی سورۂ یونس کے آغاز کے ساتھ مکی مدنی سورتوں کا تیسرا گروپ اور تیسری منزل ایک ساتھ شروع ہوتے ہیں' جبکہ یہاں پر مکی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ اور ساتویں منزل کا آغاز ایک ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں ضمنی طور پر منازل (احزاب) کی تقسیم کے بارے میں بھی چند اہم نکات نوٹ کر لیجیے۔ اس ضمن میں یاد رکھنے کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ یہ تقسیم ہفتے کے سات دنوں کے حساب سے کی گئی ہے تا کہ اگر کوئی شخص ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم کرنا چاہے تو وہ ہر روز ایک منزل (حزب) تلاوت کر لے' جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اکثر حضرات نے رات کے نوافل میں تلاوت کا یہی معمول اپنا رکھا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تمام منازل میں قرآن کی مقدار بالکل برابر نہیں بلکہ تقریباً برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منازل خالصتاً سورتوں کے حساب سے بنائی گئی ہیں اور مقدار برابر کرنے کے لیے پاروں کی تقسیم کی طرح سورتوں کو تقسیم نہیں کیا گیا۔ اس حوالے سے تیسری اہم بات یہ ہے کہ منازل کی تقسیم میں سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک خاص ''حسنِ ترتیب'' پایا جاتا ہے۔ یعنی پہلی منزل میں تین سورتیں ہیں (اس گنتی میں سورۃ الفاتحہ شامل نہیں کہ وہ قرآن حکیم کے لیے بمنزلہ مقدمہ کے ہے اور سورۃ الحجر کی آیت ۸۹ کی رو سے خود ایک قرآن ہے)' دوسری منزل میں پانچ سورتیں' تیسری منزل میں سات' چوتھی میں نو' پانچویں میں گیارہ' چھٹی میں تیرہ' جب کہ ساتویں منزل میں پینسٹھ سورتیں شامل ہیں (۶۵ کا عدد ۱۳ کا حاصل ضرب ہے)۔ گویا منزل بہ منزل سورتوں کی تعداد میں ایک خاص ''عددی نسبت'' کارفرما ہے جس کی وجہ سے اعداد کی ایک خوبصورت سیڑھی بنتی نظر آتی ہے۔ اور چوتھا اہم نکتہ یہ کہ ساتویں یا آخری منزل میں چونکہ سورتوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے اس منزل کو ''حزبِ مفصّل'' بھی کہا جاتا ہے۔

مکی مدنی سورتوں کا چھٹا گروپ جس کا آغاز سورۂ قٓ سے ہو رہا ہے' سات مکی (سورۂ قٓ تا سورۃ الواقعہ) اور دس مدنی (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) سورتوں پر مشتمل ہے۔ اس گروپ میں مکی اور مدنی قرآن کا حجم تقریباً برابر ہے۔ یعنی سورۂ قٓ سے لے کر سورۃ الواقعہ تک مکی قرآن کا حجم تقریباً ایک پارے کے برابر ہے' جبکہ سورۃ الحدید سے لے کر سورۃ التحریم تک مدنی قرآن تقریباً سوا پارے کے برابر ہے' اس کے بعد مکی مدنی سورتوں کا

ساتواں اور آخری گروپ زیادہ تر مکی قرآن پر مشتمل ہے۔ مکی اور مدنی قرآن کے حجم کے اعتبار سے سورتوں کے پہلے دو گروپس اور آخری دو گروپس میں باہم ایک بہت خوبصورت ''مناسبت'' پائی جاتی ہے۔ اس مناسبت کو یوں سمجھیں کہ جس طرح پہلا گروپ تقریباً تمام تر مدنی قرآن پر مشتمل ہے (اس میں صرف سورۃ الفاتحہ مکی ہے' باقی سورۃ البقرۃ تا سورۃ المائدۃ تقریباً سوا چھ پارے مدنی قرآن ہے) اسی طرح آخری گروپ اکثر و بیشتر مکی قرآن پر مشتمل ہے (اس گروپ میں بالاتفاق تو صرف آخری دو سورتوں یعنی ''معوذتین'' کو ہی مدنی مانا گیا ہے)۔ پھر جس طرح دوسرا گروپ مکی اور مدنی قرآن کے حجم کے اعتبار سے متوازن ہے (اس گروپ میں سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف دو مکی سورتیں ہیں جبکہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ دو ہی مدنی سورتیں ہیں) اسی طرح آخری سے پہلا یعنی چھٹا گروپ بھی اس لحاظ سے متوازن ہے کہ اس میں تقریباً ایک پارہ مکی قرآن (سورۂ قٓ تا سورۃ الواقعہ) اور تقریباً سوا پارہ مدنی قرآن (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) ہے۔

چھٹے گروپ کی مکی سورتوں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ لسانی اور ادبی محاسن کے اعتبار سے قرآن کا خوبصورت ترین حصہ ان سورتوں پر مشتمل ہے۔ قرآن کا مخصوص صوتی آہنگ جسے میں Divine Music سے تعبیر کرتا ہوں' ان سورتوں میں تیز ردھم کے ساتھ اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ چھوٹی چھوٹی آیات میں خوبصورت الفاظ نگینوں کی طرح چمکتے دمکتے نظر آتے ہیں۔ ان ہی سورتوں میں سورۃ الرحمٰن بھی شامل ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ''عروس القرآن'' (قرآن کی دلہن) قرار دیا ہے۔ بہرحال فصاحت' بلاغت اور ادبی خوبیوں کے اعتبار سے ان سورتوں کو قرآن کے ذروۂ سنام (climax) کا درجہ حاصل ہے۔ ان میں سورۂ قٓ بہت جامع اور اپنے مزاج کے اعتبار سے منفرد سورت ہے۔ باقی چھ سورتیں باہم جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ یعنی سورۃ الذّاریات اور سورۃ الطّور کا جوڑا' سورۃ النجم اور سورۃ القمر (ان میں چاند اور ستارے کی نسبت بھی ہے) کا جوڑا' اور سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا جوڑا۔

زیر مطالعہ (آخری) منزل کی مکی سورتوں (سورۂ قٓ سے آخر تک) سے متعلق دو باتیں جو قبل ازیں بھی کئی مرتبہ دہرائی جا چکی ہیں یہاں موقع کی مناسبت سے ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ پہلی بات یہ کہ یہ تمام سورتیں حضور ﷺ کے مکی دور کے ابتدائی چار برسوں میں نازل ہوئی ہیں اور دوسری یہ کہ ان سورتوں کا مرکزی مضمون ''انذارِ آخرت'' ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ حضور ﷺ کو دعوت و تبلیغ کے ضمن میں جو پہلا حکم ملا تھا وہ اِنذار کا تھا۔ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے نزول کے ساتھ حضور ﷺ کی نبوت کا ظہور ہوا۔ ان آیات میں کوئی حکم نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد حضور ﷺ کو پہلا حکم سورۃ المدثر کی ان آیات میں دیا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝﴾ ''اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے! اب اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور لوگوں کو خبردار کرو''۔ یعنی لوگوں کو یاد دلاؤ کہ ان کی دنیوی زندگی ہی بس اصل زندگی نہیں ہے کہ وہ کھائیں' پئیں' عیش کریں اور اس دنیا سے چلے جائیں' بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور جس اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے اسی نے یہ کائنات پیدا کی ہے۔ نہ تو یہ کائنات ہمیشہ رہنے والی ہے اور نہ ہی کسی انسان کی زندگی دائمی ہے۔ انسانی زندگی کی مہلت محدود مدت کے لیے ہے۔ ایک وقت آئے گا جب یہ دنیا ختم

ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ ہو کر اپنے خالق و مالک کے حضور پیش ہونا ہے اور دنیوی زندگی کے حوالے سے ایک بے لاگ محاسبے کا سامنا کرنا ہے۔ اسی محاسبے کے بعد سزا یا جزا کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس حوالے سے قرآن حکیم میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ جن لوگوں کے دل آخرت سے غافل ہیں ان پر اس ''اِنذار'' کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ غالبؔ کا یہ شعر گویا انہی لوگوں کی ذہنی کیفیت کا ترجمان ہے: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اسی وجہ سے قرآن میں ''انذارِ آخرت'' پر خصوصی زور دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے ''عقیدۂ آخرت'' کے لیے صرف ''ایمان'' کے لفظ کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ یعنی جہاں دوسرے عقائد کے لیے ''ایمان'' کا مطالبہ ہے وہاں ''آخرت'' کے لیے عام طور پر یقین (حقیقی ایمان) کا مطالبہ کیا گیا ہے: ﴿وَبِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؃﴾ (البقرۃ)۔ عقیدۂ آخرت کی ایک خصوصی اہمیت یہ بھی ہے کہ انسان کی سیرت اور شخصیت کے اندر عملی اعتبار سے حقیقی مثبت تبدیلی اسی عقیدے کی بنا پر آتی ہے۔ بہرحال چھٹے اور ساتویں گروپ یعنی آخری منزل کی مکی سورتوں کا مرکزی مضمون ''انذارِ آخرت'' ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان میں بہت مختصر انداز میں ''انباء الرسل'' کا تذکرہ بھی ہے اور مکی سورتوں کے عمومی مضامین کی جھلکیاں بھی۔

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

آیات ۱ تا ۱۵

قٓ ۚ۟ وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ ۝۱ بَلۡ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ فَقَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا شَیۡءٌ
عَجِیۡبٌ ۝۲ ءَ اِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِکَ رَجۡعٌۢ بَعِیۡدٌ ۝۳ قَدۡ عَلِمۡنَا مَا تَنۡقُصُ الۡاَرۡضُ
مِنۡہُمۡ ۚ وَ عِنۡدَنَا کِتٰبٌ حَفِیۡظٌ ۝۴ بَلۡ کَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَہُمۡ فَہُمۡ فِیۡۤ اَمۡرٍ مَّرِیۡجٍ ۝۵ اَفَلَمۡ
یَنۡظُرُوۡۤا اِلَی السَّمَآءِ فَوۡقَہُمۡ کَیۡفَ بَنَیۡنٰہَا وَ زَیَّنّٰہَا وَ مَا لَہَا مِنۡ فُرُوۡجٍ ۝۶ وَ الۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰہَا
وَ اَلۡقَیۡنَا فِیۡہَا رَوَاسِیَ وَ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍۭ بَہِیۡجٍ ۝۷ تَبۡصِرَۃً وَّ ذِکۡرٰی لِکُلِّ عَبۡدٍ
مُّنِیۡبٍ ۝۸ وَ نَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَکًا فَاَنۡۢبَتۡنَا بِہٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الۡحَصِیۡدِ ۝۹ وَ النَّخۡلَ
بٰسِقٰتٍ لَّہَا طَلۡعٌ نَّضِیۡدٌ ۝۱۰ رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ ۙ وَ اَحۡیَیۡنَا بِہٖ بَلۡدَۃً مَّیۡتًا ؕ کَذٰلِکَ الۡخُرُوۡجُ ۝۱۱ کَذَّبَتۡ
قَبۡلَہُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ اَصۡحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوۡدُ ۝۱۲ وَ عَادٌ وَّ فِرۡعَوۡنُ وَ اِخۡوَانُ لُوۡطٍ ۝۱۳ وَّ اَصۡحٰبُ
الۡاَیۡکَۃِ وَ قَوۡمُ تُبَّعٍ ؕ کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیۡدِ ۝۱۴ اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ
لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۝۱۵ ع ۱۵

آیت ۱ ﴿قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱﴾ ''ق، قسم ہے عظیم الشان قرآن کی۔''

قرآن کی تین سورتیں ایسی ہیں جن کے آغاز میں صرف ایک ایک حرفِ مقطعہ ہے۔ ان میں سورۂ قٓ کے علاوہ تیئسویں پارے کی سورۂ صٓ اور انتیسویں پارے کی سورۃ القلم (یا سورۂ نٓ) شامل ہیں۔ بہت سی دوسری سورتوں کے آغاز کی طرح اس سورت کے آغاز میں بھی قرآن مجید کی قسم کا مقسم علیہ محذوف ہے۔ بہرحال چونکہ سورۂ یٰسٓ کے آغاز میں قرآن حکیم کی قسم کا مقسم علیہ موجود ہے اس لیے اس قسم کا مقسم علیہ بھی وہی ہوگا، یعنی ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳﴾ (یٰسٓ)۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ (اے محمد ﷺ) قسم ہے اس عظیم الشان قرآن کی، بے شک آپ مرسلین میں سے ہیں۔ اس قسم کے فوراً بعد دوسری آیت میں حضور ﷺ کا تعارف انذارِ آخرت کے حوالے سے کرایا گیا ہے جو اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔

آیت ۲ ﴿بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ﴾ ''بلکہ انہیں بہت عجیب محسوس ہوا ہے کہ ان کے پاس آیا ہے ایک خبردار کرنے والا ان ہی میں سے''

مُنْذِر کے معنی ہیں انذار کرنے والا، خبردار (warn) کرنے والا۔

﴿فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝۲﴾ ''تو کافروں نے کہا یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔''

آیت ۳ ﴿ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ﴾ ''کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو ہم پھر سے زندہ کیے جائیں گے؟)''

﴿ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳﴾ ''یہ لوٹایا جانا تو بہت دور کی بات ہے۔''

مر کر مٹی ہو جانے کے بعد ہمارا دوبارہ زندہ ہونا بالکل انہونی سی بات ہے، یہ بعید از قیاس دعویٰ کر کے یہ صاحب بہت دُور کی کوڑی لائے ہیں۔

آیت ۴ ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ﴾ ''ہم خوب جانتے ہیں کہ زمین ان میں سے کیا چیز کم کرتی ہے۔''

''ہم'' کے صیغے کے ساتھ یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ انسانوں کے دفن ہونے کے بعد زمین ان کے جسموں کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے، ہر انسان کا کون سا عضو کیسے ضائع ہوتا ہے اور پھر ان کے اجزاء کس کس صورت میں کہاں کہاں جاتے ہیں، ہمیں ایک ایک چیز کا علم ہے۔

﴿وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝۴﴾ ''اور ہمارے پاس تو ایک محفوظ رکھنے والی کتاب بھی موجود ہے۔''

ہمارے پاس ایک ایک چیز کا ریکارڈ موجود ہے۔ ان کے جسموں کو ہم نے مٹی سے پیدا کیا تھا اور ان کی موت کے بعد ان کے تمام اجزاء کو ہم مٹی میں ہی محفوظ رکھتے ہیں۔ قیامت کے دن اسی مٹی سے ہم انہیں نکال لیں گے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝۵۵﴾ (طٰہٰ)۔ اس کے علاوہ ان کے ایک ایک عمل کی پوری تفصیل بھی ہم نے لکھ رکھی ہے اور ان کی ارواح بھی ہمارے پاس عِلِّيِّين یا سِجِّين میں موجود ہیں۔ غرض ان کی کوئی چیز بھی ہمارے علم یا قبضے سے باہر نہیں ہے۔

آیت ۵ ﴿بَلۡ كَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ﴾ ''بلکہ انہوں نے جھٹلا دیا حق کو جب کہ وہ ان کے پاس آیا''
﴿فَهُمۡ فِىۡۤ اَمۡرٍ مَّرِيۡجٍ۝۵﴾ ''سو اب وہ ایک بڑی اُلجھن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔''

ایک طرف تو جواب دہی اور احتساب کی باتیں ماننے کے لیے ان کی طبیعتیں آمادہ نہیں اور دوسری طرف اس بارے میں قرآن کی زبان میں حضورﷺ کے دلائل ایسے قوی ہیں کہ انہیں جھٹلانا ان کے لیے ممکن نہیں۔ بس یہی اُلجھن ہے جس میں یہ لوگ پھنس چکے ہیں۔ اس کائنات کی ایک ایک چیز اس حقیقت پر گواہ ہے اور اس کا مربوط و مستحکم نظام بھی زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا خالق ایک علیم و حکیم ہستی ہے۔ پھر انسان کے اندر پائی جانے والی ''اخلاقی حس'' بھی اس کے اچھے برے اعمال کے ٹھوس اور حتمی نتائج کا تقاضا کرتی ہے جس کے لیے ایک دوسری زندگی کی ضرورت ہے۔ ان تمام حقائق و شواہد کی موجودگی میں ایک صاحبِ عقل اور ذی شعور انسان کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ کائنات بس ''رام کی لیلا'' ہے اور انسان کی اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ چنانچہ منکرینِ آخرت کے لیے ان حقائق کو تسلیم کیے بغیر چارہ بھی نہیں، لیکن ان کی طبیعتیں ہیں کہ احتساب کے لیے تیار بھی نہیں۔ یہ انسان کی وہی نفسیاتی الجھن ہے جس کا ذکر غالب نے اس شعر میں کیا ہے جو میں نے ابھی آپ کو سنایا ہے: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

ان لوگوں کے قلوب و اذہان میں منفی خیالات و نظریات اس قدر راسخ ہو چکے ہیں کہ اب ان سے پیچھا چھڑانا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔ دراصل انسان اپنے لڑکپن کی عمر میں جن عقائد و نظریات کا اثر قبول کرتا ہے وہ ساری عمر کے لیے اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ انسان کی اس کمزوری کا نقشہ ایک انگریزی نظم The Cage میں بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں دکھایا گیا ہے۔ یہ نظم میں نے اپنے انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں پڑھی تھی۔ اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی ان عادات کے ''پنجرے'' کا قیدی ہے جنہیں وہ لڑکپن کی عمر میں ایک ایک کر کے اپناتا ہے۔ گویا اس پنجرے کی سلاخیں اپنے لیے وہ خود تیار کرتا ہے۔ بقول شاعر:

"I built these bars when I was young"

''اس پنجرے کی سلاخیں میں نے اس وقت تیار کی تھیں جب میں جوان تھا''۔ جوانی میں انسان کے قویٰ مضبوط ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ اس کے ذہن پر نقش کالحجر بن جاتا ہے اور پھر اپنی باقی عمر وہ ان عادات و نظریات کا قیدی بن کر پنجرے میں قید پرندے کی مانند گزار دیتا ہے۔ چنانچہ یہ منکرین آخرت بھی اپنے غلط عقائد و نظریات کے خودساختہ پنجروں کے قیدی ہیں۔ ان پنجروں کی سلاخیں وہ اس قدر مضبوط کر چکے ہیں کہ اب انہیں توڑ کر باہر نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔

آیت ۶ ﴿اَفَلَمۡ يَنۡظُرُوۡۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ كَيۡفَ بَنَيۡنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ۝۶﴾ ''تو کیا انہوں نے دیکھا نہیں آسمان کی طرف جو ان کے اوپر ہے کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے اور کیسے اسے مزین کیا ہے اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔''

اس آیت کی کماحقہ تشریح تو کوئی ماہر فلکیات ہی کر سکتا ہے۔ بہرحال آج کا انسان خوب جانتا ہے کہ

ستاروں‘ سیاروں اور کہکشاؤں کا نظام بہت محکم و مربوط ہے اور یہ کہ اس نظام میں کسی رخنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

آیت ۷ ﴿وَالۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰهَا وَاَلۡقَيۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ﴾ ''اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے اور ہم نے اس میں لنگر ڈال دیے ہیں''

ماہرین طبقات الارض (Geologists) بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زمین کی گردش کے دوران اس کا توازن (isostacy) برقرار رکھنے میں پہاڑوں کا انتہائی اہم کردار ہے۔

﴿وَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِيۡجٍ ۝۷﴾ ''اور ہم نے اس میں ہر طرح کی بڑی ہی رونق والی چیزیں (جوڑوں کی شکل میں) پیدا کر دیں۔''

آیت ۸ ﴿تَبۡصِرَةً وَّذِكۡرٰى لِكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِيۡبٍ ۝۸﴾ ''(یہ اللہ کی نشانیاں ہیں) بجھانے اور یاد دہانی کرانے کو ہر اُس بندے کے لیے جو رجوع رکھے ہوئے ہو۔''

عَبۡدٍ مُّنِيۡب سے ایسا بندہ مراد ہے جس کی روح اور فطرت کا رخ اللہ کی طرف ہو۔ مطلب یہ کہ اگر کسی انسان کی فطرت سلیم اور روح زندہ ہو تب ہی یہ ''بصائر'' اس کے لیے مفید ہوں گے۔ ایسی صورت میں اسے کائنات میں بکھری اللہ کی نشانیاں نظر بھی آئیں گی اور ان نشانیوں سے اس کے دل میں خالق حقیقی کی ''یاد'' بھی تازہ ہوتی رہے گی۔ لیکن اگر کسی انسان کی فطرت مسخ اور روح مردہ ہو چکی ہو تو اس کا ''دیکھنا'' اور ''سننا'' اس کے لیے ہرگز مفید نہیں ہوگا۔

سورۃ الغاشیہ کی ان آیات کا انداز بھی اس حوالے سے بہت بصیرت افروز ہے:

﴿اَفَلَا يَنۡظُرُوۡنَ اِلَى الۡاِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ ۝۱۷ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ ۝۱۸ وَاِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ ۝۱۹ وَاِلَى الۡاَرۡضِ كَيۡفَ سُطِحَتۡ ۝۲۰﴾

''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کو کہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں؟ اور آسمان کو کہ کیسے بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کو کہ کیسے گاڑ دیے گئے ہیں؟ اور زمین کو کہ کیسے بچھا دی گئی ہے؟''

یعنی پوری کائنات میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں‘ جو انسان کو قدم قدم پر یاد دلاتی ہیں کہ ہر چیز کا خالق اور صورت گر وہی ہے: ﴿هُوَ اللّٰهُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى﴾ (الحشر: ۲۴) ''وہی ہے اللہ‘ پیدا کرنے والا‘ وجود بخشنے والا‘ صورتیں بنانے والا‘ تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔''

اقبال نے ''آیاتِ خداوندی'' کے مشاہدے کی دعوت ان الفاظ میں دی ہے: ؎

کھول آنکھ‘ زمیں دیکھ‘ فلک دیکھ‘ فضا دیکھ — مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

آیت ۹ ﴿وَنَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا﴾ ''اور ہم نے آسمان سے اُتارا برکت والا پانی''

لفظ ''برکت'' میں کسی چیز کی خفتہ صلاحیت کو ترقی دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی متعدد بار وضاحت ہو چکی ہے کہ بارش کا پانی زمین کی قوتِ نمو کو جلا بخشتا ہے اور اس کی روئیدگی کو اجاگر کرنے کا باعث بنتا ہے اور اسی پہلو سے یہ مبارک ہے۔

﴿فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الۡحَصِيۡدِ ۝۹﴾ ''تو ہم نے اُگایا اس کے ذریعے سے باغات کو اور ان فصلوں کو جو کٹ جاتی ہیں۔''

الفاظ کی یہ ترتیب منطقی اور بہت خوبصورت ہے۔ جَنّٰت سے درختوں کے باغات مراد ہیں اور درختوں کو کاٹا نہیں جاتا' صرف ان کے پھل اُتارے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اناج کی فصل (جیسے گندم کی فصل) پودوں سمیت کاٹ لی جاتی ہے' اس لیے اس کے لیے حَبَّ الۡحَصِيۡدِ کی ترکیب آئی ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِيۡدٌ ۝۱۰﴾ ''اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت جن کے خوشے ہیں تہ بر تہ۔''

آیت ۱۱ ﴿رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ ۙ وَاَحۡيَيۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا ؕ﴾ ''یہ سب رزق ہے بندوں کے لیے' اور اسی (پانی) سے ہم زندہ کر دیتے ہیں مُردہ زمین کو۔''

﴿كَذٰلِكَ الۡخُرُوۡجُ ۝۱۱﴾ ''اسی طریقے سے نکلنا ہوگا (تمہارا بھی)۔''

جس طرح بارش کے پانی کے باعث خشک اور بنجر زمین سے طرح طرح کی نباتات اُگ آتی ہیں اسی طرح تم بھی ہمارے حکم سے زندہ ہو کر زمین سے نکل آؤ گے۔

آیت ۱۲ ﴿كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّاَصۡحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوۡدُ ۝۱۲﴾ ''جھٹلایا تھا ان سے پہلے بھی نوحؑ کی قوم نے' کنویں والوں نے اور قومِ ثمود نے۔''

یہ انباء الرسل کا تذکرہ ہے لیکن انتہائی مختصر انداز میں۔

آیت ۱۳ ﴿وَعَادٌ وَّفِرۡعَوۡنُ وَاِخۡوَانُ لُوۡطٍ ۝۱۳﴾ ''اور قومِ عاد' فرعون اور لوطؑ کے بھائیوں نے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّاَصۡحٰبُ الۡاَيۡكَةِ وَقَوۡمُ تُبَّعٍ ؕ﴾ ''اور بن والوں اور قومِ تُبّع نے۔''

بن والوں سے یہاں اہل مدین مراد ہیں جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ''تُبّع'' شاہانِ یمن کا لقب تھا۔ قبل ازیں سورۃ الدخان کی آیت ۳۷ میں بھی ہم قومِ تُبّع کا ذکر پڑھ آئے ہیں۔

﴿كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيۡدِ ۝۱۴﴾ ''ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو وہ مستحق ہو گئے میری وعید کے۔''

پیغمبروں کو جھٹلا کر وہ لوگ عذاب کی وعیدوں کے مصداق بن گئے۔

آیت ۱۵ ﴿اَفَعَيِيۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ﴾ ''تو کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کر کے عاجز آ گئے ہیں!''

کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں (creative potential) اب ختم ہو کر رہ گئی ہیں اور اب ہم انہیں دوبارہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ یہی مضمون سورۃ الاحقاف میں اس طرح آیا ہے:

﴿اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَلَمۡ يَعۡيَ بِخَلۡقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنۡ يُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰى ؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝۳۳﴾

''کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی اور ان کی تخلیق سے تھکا نہیں' وہ اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے! کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

﴿بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝﴾ ''بلکہ یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں نئی تخلیق سے متعلق۔''
ہماری خلاقی کی قدرت میں تو کوئی کمی نہیں آئی' البتہ یہ لوگ اپنے ذہنوں کی تنگی کی وجہ سے پریشان ہیں اور مبتلائے شک ہیں کہ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ کر لیا جائے گا!

آیات ۱۶ تا ۳۵

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ
الْوَرِيْدِ ۝ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا
لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ۝ وَنُفِخَ
فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۝ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ۝ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ
غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا
لَدَيَّ عَتِيْدٌ ۝ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۝ الَّذِيْ
جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۝ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ
وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ۝ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ۝ مَا
يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ ع
هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ۝ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ
حَفِيْظٍ ۝ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ
الْخُلُوْدِ ۝ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۝

آیت ۱۶ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ﴾ ''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے۔''
یہ اُس قوتِ شر کا ذکر ہے جو انسان کے اندر ہے۔ نفس انسانی کے شر کا ذکر سورۂ یوسف میں یوں آیا ہے:
﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾
''اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا' یقیناً (انسان کا) نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے سوائے اُس کے جس پر میرا ربّ رحم فرمائے۔ یقیناً میرا ربّ بہت بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہے۔''
فطری طور پر انسان کے اندر داعیہ خیر بھی ہے اور داعیہ شر بھی۔ انسان کی اندرونی قوتِ شر کو سورۂ یوسف کی اس

آیت میں ''نفسِ امارہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ فرائیڈ اسے id یا libido کہتا ہے۔ دوسری طرف انسان کے اندر خیر کی قوت اس کی روح ہے جس کا مسکن قلب انسانی ہے۔ انسان کی روح اسے بلندی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اس داعیہ یا قوت کو فرائیڈ super ego کا نام دیتا ہے' یعنی ego (انسانی انا) کا اعلیٰ درجہ۔ فرائیڈ کے دیے ہوئے یہ عنوانات تو کسی حد تک ہمارے لیے قابل قبول ہیں' لیکن ان عنوانات کی تشریح جو اُس نے کی ہے اسے ہم درست نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اس حوالے سے کئی مرتبہ پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ مغربی سائنسدان اور فلاسفرز سب کے سب ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ وہ صرف ''عالمِ خلق'' یعنی اسباب وعلل کی دنیا سے واقف ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ مادی دنیا کے اَسرار و رموز کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ اس میدان میں انہوں نے تحقیق و تفتیش کے ایسے معیار قائم کیے ہیں کہ انسانی عقل واقعی دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف ''عالمِ امر'' کے بارے میں وہ بالکل اندھے اور کورے ہیں۔ یعنی ان کے ہاں روح' وحی اور فرشتے وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''انسان'' کے بارے میں ان کے فلسفیانہ تجزیے اکثر درست نہیں ہوتے۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ میں انسان کے اندر موجود قوتِ شر (نفسِ امارہ) کا ذکر ہے کہ انسان کا نفس اسے جو پٹیاں پڑھاتا ہے اس کی تفصیلات اس کے خالق سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

﴿وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہم تو اُس سے اُس کی رَگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے اس قرب کی کیفیت اور نوعیت کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکتے' بقول شاعر یہ قرب ''بے تکیف و بے قیاس'' ہے: ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس ہست ربّ الناس را با جانِ ناس

سورۃ الحدید کی آیت ۴ میں بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس قرب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَھُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ﴾ کہ تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ہم اس ''معیت'' کا تصور نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور چہرے کا ذکر بھی ہے' اس کا چہرہ کیسا ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ اس کا ہاتھ کیسا ہے؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصے میں آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ وہ کیسے نزول فرماتا ہے؟ ہم اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے معاملات میں خواہ مخواہ کا تجسّس ہمیں فتنوں میں مبتلا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس حوالے سے ہمیں آخری بات یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ''عالمِ امر'' اور اس کی کیفیات ہماری سمجھ سے وراء الوراء ہیں۔ ہم اپنے حواسِ خمسہ اور عقل وشعور کے ذریعے جو علم حاصل کر سکتے ہیں اس کا تعلق ''عالم خلق'' سے ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسی ''دائرے'' میں رہتے ہوئے' سوچیں سمجھیں' تحقیق کریں' نتائج اخذ کریں اور ان نتائج کو بروئے کار لائیں۔ دوسری طرف ''عالم امر'' سے متعلق جو معلومات وحی کے ذریعے ہم تک پہنچیں انہیں من وعن تسلیم کر لیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کے الفاظ ﴿اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ﴾ میں اسی طرزِ عمل کی طرف ہماری راہنمائی کی گئی ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے ہمارے لیے بس یہ جان لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رگِ جان سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔ اس قرب

کی منطق اور کیفیت کے بارے میں ہمیں عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔

آیت ۱۷ ﴿اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''جبکہ لیتے جاتے ہیں دو لینے والے جو دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہوتے ہیں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ خود بھی ہر جگہ‘ ہر آن موجود ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے ہر انسان کے دائیں بائیں دو فرشتے بھی مقرر کر رکھے ہیں جو اُس کے ہر فعل اور عمل کو ریکارڈ کر رہے ہیں۔ سورۃ الانفطار‘ آیت ۱۱ میں ان فرشتوں کو 'کِرَامًا کَاتِبِیْنَ' کا نام دیا گیا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴿۱۸﴾﴾ ''وہ کوئی لفظ بھی نہیں بولتا ہے مگر اُس کے پاس ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔''

یعنی کوئی انسان جو لفظ بھی اپنی زبان سے بولتا ہے متعلقہ فرشتہ اس کو فوراً ریکارڈ کر لیتا ہے اور ظاہر ہے فرشتوں کی یہ ریکارڈنگ بھی عالم امر کی چیز ہے‘ اس لیے اس کی کیفیت بھی ہمارے تصور میں نہیں آ سکتی۔ ریکارڈنگ کے شعبے میں گزشتہ چند دہائیوں میں انسانی سطح پر جو ترقی دیکھنے میں آئی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب انسان کی ''ریکارڈنگ'' کا معیار یہ ہے اور اس معیار میں مزید ترقی بھی رُکنے کا نام نہیں لے رہی تو اللہ کی قدرت سے جو ریکارڈنگ ہو رہی ہے اُس کا معیار کیا ہوگا!

آیت ۱۹ ﴿وَجَآءَتْ سَکْرَۃُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''اور بالآخر موت کی بے ہوشی کا وقت آن پہنچا ہے حق کے ساتھ۔''

موت کا آنا تو قطعی اور برحق ہے‘ اس سے کسی کو انکار نہیں۔ اللہ کے منکر تو بہت ہیں لیکن موت کا منکر کوئی نہیں۔

﴿ذٰلِکَ مَا کُنْتَ مِنْہُ تَحِیْدُ ﴿۱۹﴾﴾ ''یہی ہے نا وہ چیز جس سے تو بھاگا کرتا تھا!''

اس بات کا انسان کی نفسیات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ یہ ہر انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ موت کو برحق جانتے ہوئے بھی وہ اس کے تصور کو حتی الوسع اپنے ذہن سے دور رکھنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ وقتی طور پر اگر کسی عزیز کی موت اور تجہیز و تکفین کے موقع پر اپنی موت اور قبر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا بھی ہے تو انسان فوری طور پر اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر روزمرہ کے معمولات میں خود کو مصروف کر لیتا ہے۔

آیت ۲۰ ﴿وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ ؕ ذٰلِکَ یَوْمُ الْوَعِیْدِ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور صور میں پھونکا جائے گا‘ یہ ہے وعدے کا دن!''

پہلے انفرادی موت کی بات کی گئی تھی۔ اب اس آیت میں پوری دنیا کی اجتماعی موت کا ذکر ہے۔ جب کسی شخص کو موت آتی ہے تو اس کے لیے تو گویا وہی قیامت ہے۔ اس لیے انسان کی انفرادی موت کو قیامتِ صغریٰ اور تمام انسانوں کی اجتماعی موت کو قیامت کبریٰ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ آیت میں قیامت صغریٰ کا بیان تھا‘ اب یہاں قیامتِ کبریٰ کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿وَجَآءَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّعَھَا سَآئِقٌ وَّشَھِیْدٌ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور ہر جان آئے گی (اس حالت میں کہ) اس کے ساتھ ہوگا ایک دھکیلنے والا اور ایک گواہ۔''

دنیا میں ہر انسان کے ساتھ جو دو فرشتے (کِرَامًا کَاتِبِیْنَ) مامور ہیں وہی قیامت کے دن اسے لا کر اللہ کی عدالت میں پیش کریں گے۔ ان میں سے ایک فرشتہ اس کا اعمال نامہ اٹھائے ہوئے ہوگا جب کہ دوسرا اسے عدالت کی طرف دھکیل رہا ہوگا۔

آیت ۲۲ ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا﴾ ''(اللہ فرمائے گا: اے انسان!) تو اس دن سے غفلت میں رہا تھا نا!''

﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝۲۲﴾ ''تو آج ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے' تو آج تمہاری نگاہ کتنی تیز ہوگئی ہے۔''

دنیا میں رہتے ہوئے بہت سے حقائق تمہارے لیے پردۂ غیب میں تھے۔ وہاں تجھ سے مطالبہ تھا کہ ان حقائق پر بغیر دیکھے ایمان لاؤ۔ آج غیب کا پردہ اٹھا دیا گیا ہے اور اب تمہاری نظر ہر چیز کو دیکھ سکتی ہے' حتیٰ کہ آج تم اپنے ساتھ آنے والے فرشتوں کو بھی دیکھ رہے ہو۔

آیت ۲۳ ﴿وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ۝۲۳﴾ ''اور اُس کا ساتھی کہے گا: (پروردگار!) یہ جو میری تحویل میں تھا' حاضر ہے!''

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں ''ساتھی'' سے فرشتہ مراد ہے' لیکن میں ان لوگوں سے متفق ہوں جو اس سے شیطان مراد لیتے ہیں۔ دراصل خیر اور شر کی قوتیں انسان کے اندر بھی موجود ہیں اور خارج میں بھی۔ اندر سے انسان کا نفس اسے برائی پر اُبھارتا ہے' جبکہ خارج میں ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان بھی مامور ہے جو اس کے نفس میں ہر وقت وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے اندر اس کی روح ''داعیٔ خیر'' کے طور پر موجود ہے جبکہ خارج میں اس حوالے سے فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیات ۳۰ اور ۳۱ میں ان فرشتوں کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں جو نیکی کے کاموں میں انسان کی پشت پناہی کرتے ہیں: ﴿نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ﴾۔ فرشتوں کی معیت کے باعث ہی کوئی نیک کام کر کے ہمیں خوشی اور طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر فرشتے دراصل ہمیں بشارت اور شاباش دے رہے ہوتے ہیں جس کے اثرات ہماری روح پر طمانیت کی صورت میں مرتب ہوتے ہیں۔

آیت ۲۴ ﴿اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۝۲۴﴾ ''(اللہ تعالیٰ فرمائے گا) جھونک دو جہنم میں ہر ناشکرے سرکش کو۔''

یہ حکم گویا اس انسان اور اس کے ساتھی شیطان دونوں کے لیے ہوگا۔

آیت ۲۵ ﴿مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۝۲۵﴾ ''جو خیر سے روکنے والا' حد سے بڑھنے والا اور شکوک و شبہات میں مبتلا رہنے والا ہے۔''

آیت ۲۶ ﴿نِ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ''جس نے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی بنا لیا تھا۔''

﴿فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۝۲۶﴾ ''تو جھونک دو اس کو بڑے سخت عذاب میں۔''

اس انسان کا شیطان یہ سمجھ رہا ہوگا کہ اس کی اپنی حیثیت ''سرکاری کارندے'' کی ہے جو مجرم کو سزا کے لیے لے کر آیا ہے' لیکن دونوں کو جہنم رسید کرنے کا حکم سن کر وہ فوراً اپنی صفائی میں چلانا شروع کر دے گا۔

آیت ۲۷ ﴿قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ﴾ ''اُس کا ساتھی (شیطان) کہے گا: پروردگار! میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا' بلکہ یہ خود ہی بہت دور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔''

گویا وہ چاہے گا کہ جو انسان اس کی تحویل میں دیا گیا تھا اُسے سزا کے لیے وصول کر لیا جائے اور خود اس کی جان بخشی کر دی جائے۔

آیت ۲۸ ﴿قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ﴾ ''(اللہ فرمائے گا:) اب میرے سامنے جھگڑا مت کرو' جبکہ میں پہلے ہی تمہاری طرف وعید بھیج چکا ہوں۔''

کہ میں نے تو جن وانس پر ''انذار'' کے حوالے سے اتمامِ حجت کر دیا تھا۔ سورۃ الاحقاف میں ان جِنّات کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں جو حضور ﷺ سے قرآن سن کر ایمان لائے اور پھر داعیانِ حق بن کر اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ گویا قرآن کا پیغام اور انذار جنّات تک بھی پہنچا دیا گیا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ ''میرے حضور میں بات تبدیل نہیں کی جا سکتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔''

چنانچہ اب میرے قانون کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں گے۔

آیت ۳۰ ﴿يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ﴾ ''جس دن ہم پوچھیں گے جہنم سے کہ کیا تو بھر گئی؟''

﴿وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ ''اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے؟''

یعنی وہ کہے گی کہ ابھی تو میرے اندر بہت گنجائش ہے۔ ابھی مزید جنّوں اور انسانوں کو میرے اندر ڈالا جائے تا کہ میں بھر جاؤں۔

آیت ۳۱ ﴿وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ﴾ ''اور جنت قریب لائی جائے گی اہل تقویٰ کے لیے' کچھ بھی دُور نہیں ہوگی۔''

آیت ۳۲ ﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ﴾ ''(ان سے کہا جائے گا) یہ ہے جس کا وعدہ تم لوگوں سے کیا جاتا تھا''

﴿لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ﴾ ''ہر اُس شخص کے لیے جو (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا اور حفاظت کرنے والا ہو۔''

یعنی اس امانت کی حفاظت کرنے والا جو ہم نے اس کے سپرد کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو روح پھونکی ہے وہ اس کے پاس اللہ کی امانت ہے' جیسا کہ سورۃ الاحزاب کی اس آیت سے واضح ہوتا ہے: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ (آیت ۷۲) ''ہم نے اس امانت کو پیش کیا آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر تو ان سب نے انکار کر دیا اس کو اٹھانے سے اور وہ اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اُٹھا لیا''۔ چنانچہ ''حَفِيْظ'' سے ایسا شخص مراد ہے

جس نے اس امانت کا حق ادا کیا اور اپنی روح کو گناہ کی آلودگی سے محفوظ رکھا۔ سورۃ الشعراء میں ایسی محفوظ اور پاکیزہ روح کو ''قلب سلیم'' کا نام دیا گیا ہے: ﴿یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۹﴾﴾ ''جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے۔ سوائے اُس کے جو آئے اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر''۔ اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۲ کی تشریح۔

آیت ۳۳ ﴿مَنۡ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ﴾ ''جو ڈرتا رہا رحمٰن سے غیب میں ہونے کے باوجود۔''

﴿وَ جَآءَ بِقَلۡبٍ مُّنِیۡبِۣ ﴿۳۳﴾﴾ ''اور لے کر آیا رجوع کرنے والا دل۔''

قلب منیب سے بھی یہاں قلب سلیم ہی مراد ہے۔ یہ ایسے شخص کا ذکر ہے جو دنیا میں اللہ کا فرمانبردار بندہ بن کر رہا۔ اللہ کی امانت کو اُس نے پوری حفاظت اور سلامتی کے ساتھ رکھا اور صحیح وسلامت حالت میں لوٹایا۔

آیت ۳۴ ﴿ادۡخُلُوۡہَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡخُلُوۡدِ ﴿۳۴﴾﴾ ''(ان سے کہا جائے گا:) داخل ہو جاؤ اس (جنت) میں سلامتی کے ساتھ' اب یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔''

اب ایسا کوئی مرحلہ نہیں آئے گا کہ تمہیں جنت سے نکلنا پڑے۔

آیت ۳۵ ﴿لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ فِیۡہَا وَ لَدَیۡنَا مَزِیۡدٌ ﴿۳۵﴾﴾ ''ان کے لیے اس میں وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے' اور ہمارے پاس مزید بھی بہت کچھ ہے۔''

قرآن کے مختلف مقامات پر جنت کی نعمتوں کا جو تعارف ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی نعمتوں کے تین درجے ہیں۔ نفس انسانی کے بنیادی تقاضوں کی تسکین کا بھرپور سامان تو جنت میں پہلے سے موجود ہو گا۔ اس کے علاوہ ہر شخص اپنی پسند' ذوق اور خواہش کے مطابق جو کچھ طلب کرے گا وہ بھی اسے فراہم کیا جائے گا۔ ظاہر ہے ہر شخص کی طلب اپنے ذوق اور معیار کے مطابق ہو گی۔ ایک سادہ لوح دیہاتی اپنی پسند کے مطابق کوئی چیز مانگے گا اور ایک حکیم و فلسفی اپنے ذوق کی تسکین چاہے گا۔ البتہ اس حوالے سے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو کچھ بھی طلب نہیں کریں گے' وہ لوگ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ (الکہف:۲۸) کے مصداق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضا کے طالب ہوں گے۔ جیسے رابعہ بصریؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک مرتبہ جذب کے عالم میں ایک مشعل اور پانی کا لوٹا لیے گھر سے نکلیں۔ لوگوں کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ میں اس آگ سے جنت کو جلانے نکلی ہوں اور اس پانی سے میں جہنم کی آگ کو بجھا دینا چاہتی ہوں تاکہ لوگ اللہ سے خالص اُس کی ذات کے لیے محبت کریں نہ کہ جنت کے لالچ اور جہنم کے خوف کی وجہ سے اسے چاہیں۔ بہرحال جنت میں وہ لوگ بھی ہوں گے جنہیں اللہ کی رضا کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے ہو گا۔ جبکہ ان دو اقسام کے علاوہ تیسری قسم کی نعمتیں وہ ہوں گی جو انسانی تصور سے بالاتر ہیں اور آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ''وَلَدَیۡنَا مَزِیۡدٌ'' میں انہی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے۔ سورۃ السجدۃ میں جنت کی ان نعمتوں کا ذکر اس طرح ہوا ہے: ﴿فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ ۚ﴾ (آیت ۱۷) ''پس کوئی جان یہ نہیں جانتی کہ ان (اہل جنت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے''۔ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ :اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَالَا عَیْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ، فَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ :فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَھُمْ مِنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ)) (۱)

''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا گمان ہی گزرا۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا:) اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ''پس کوئی جان یہ نہیں جانتی کہ ان (اہل جنت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔''

آیات ۳۶ تا ۴۵

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖۗ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۚ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۙ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ۝ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ۙ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ۝ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۟ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ ع

آیت ۳۶ ﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ۝﴾ ''اور کتنی ہی قوموں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے جو قوت میں ان سے بڑھ کر تھیں' سو انہوں نے ملکوں کے ملک فتح کیے! پھر کیا وہ کوئی جائے فرار پا سکے؟''

نَقَبَ کا معنی ہے نقب لگانا' یعنی دیوار میں سوراخ کرنا' جبکہ نَقَّبَ فِی الْاَرْضِ (باب تفعیل) کا مفہوم ہے: بھاگ دوڑ کرتے ہوئے کسی ملک میں جا گھسنا' یعنی کسی علاقے کو فتح کر لینا۔ وہ لوگ اتنے زور آور تھے کہ اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے مختلف علاقوں میں گھستے چلے گئے اور ملکوں پر ملک فتح کرتے چلے گئے' لیکن جب اللہ کی پکڑ آئی تو انہیں بھاگنے کو جگہ نہ ملی۔

آیت ۳۷ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ۝﴾ ''یقیناً اس میں یاددہانی ہے اُس کے لیے جس کا دل ہو یا جو توجہ سے سنے حاضر ہو کر۔''

(۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ وانھا مخلوقۃ ۔ وصحیح مسلم' کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا۔

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کا بہت اہم مقام ہے۔ یاددہانی کے حوالے سے اس آیت میں دو طرح کے لوگوں کا ذکر ہوا ہے۔ یہ یاددہانی یا تو ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو ''دل'' رکھتے ہیں' یا پھر وہ جو پوری توجہ سے اس کو سنیں۔ گویا یہاں قرآن کی ہدایت تک پہنچنے کے دو الگ الگ طریقوں اور راستوں (approaches) کا ذکر ہے۔ ایک ان لوگوں کا راستہ ہے جو دل رکھتے ہیں۔ یہ دراصل وہ لوگ ہیں جن کی روح زندہ ہے۔ روح کا مسکن چونکہ قلبِ انسانی ہے اس لیے جس انسان کی روح زندہ ہوگی اس کا دل بھی زندہ ہوگا۔ ایسے دل کو دلِ بیدار' دلِ زندہ یا قلبِ سلیم کہا جاتا ہے۔ میر دردؔ نے اپنے اس شعر میں دل کی اسی ''زندگی'' کا ذکر کیا ہے: ؎

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے — کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے! (۱)

چنانچہ ایک زندہ دل شخص جب قرآن سنے گا تو اس شخص کی روح یوں لپک کر قرآنی پیغام تک پہنچ جائے گی جیسے پٹرول دور سے آگ پکڑ لیتا ہے۔ اس کیفیت کو سورۃ النور کی آیت ۳۵ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿یَکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ﴾(النور:۳۵) ''قریب ہے کہ اس کا روغن خود بخود روشن ہو جائے' چاہے اسے آگ نے ابھی چھوا بھی نہ ہو''۔ گویا ایک پاکیزہ روح نورِ وحی تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔ بقول اقبال: ؎

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز — تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے — طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے!

حافظ ابن قیمؒ نے اس بارے میں بڑی خوبصورت بات لکھی کہ بہت سے لوگ قرآن کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے قرآن ان کے دل پر نقش ہے اور وہ اس کی عبارت کو مصحف سے نہیں بلکہ اپنی لوحِ قلب سے پڑھ رہے ہیں۔ یعنی سلیم الفطرت لوگوں کی ارواح کو قرآن حکیم کے ساتھ خصوصی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کی روحوں میں ایک مانوس قسم کا ارتعاش (sympathetic vibration) پیدا ہوتا ہے۔ گویا ان کی ارواح قرآنی الفاظ و آیات کے ساتھ پہلے سے ہی مانوس ہیں۔ بقول غالبؔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

ایسے لوگوں کو قرآن کی ہدایت تک پہنچنے کے لیے کسی مہلت یا تگ و دو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قبولِ حق میں ایک لمحے کا توقف بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس وہ لوگ جن کی ارواح پر غفلت اور مادیت کے پردے پڑ چکے ہوں' ان کے لیے اس آیت میں دوسرا طریقہ بتایا گیا ہے: ﴿اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ

---

(۱) علامہ اقبال کے کلام میں بھی جا بجا دلِ بیدار' دلِ زندہ' دلِ مردہ' دلِ بینا اور قلبِ سلیم وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ''بالِ جبریل'' میں انہوں نے ''دلِ بیدار'' کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

دلِ بیدار فاروقی' دلِ بیدار کراری — مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک — نہ تیری ضرب ہے کاری' نہ میری ضرب ہے کاری!

(حاشیہ از مرتب)

وَھُوَ شَھِیْدٌ﴾۔ یعنی ان لوگوں کو خصوصی توجہ کے ساتھ محنت کرنا ہوگی' تب کہیں جا کر ''گوہرِ مقصود'' تک ان کی رسائی ہوگی۔ مطالعہ قرآن کے ہمارے منتخب نصاب میں ایمان کی بحث کے تحت دو دروس (درس ۶ اور ۷) ایسے ہیں جو انہی دو طریقوں کی الگ الگ نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں پہلا درس سورۂ آل عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں آیاتِ آفاقی کے مشاہدے کی بنیاد پر تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴿۱۹۱﴾﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں' کھڑے بھی' بیٹھے بھی اور اپنے پہلوؤں پر بھی اور مزید غور و فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔ اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد تو پیدا نہیں کیا ہے۔ تو پاک ہے (اس سے کہ کوئی عبث کام کرے)' پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا!''

لیکن یہ تفکر و تدبر تب نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے ساتھ اللہ کے ذکر کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔ گویا ایمان و ہدایت کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ذکر اور فکر دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا ہوگا' جیسا کہ اقبال نے کہا ہے۔

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر
جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است فقرِ قرآں اصل شاہنشاہی است

یعنی فقر قرآن تو ذکر اور فکر کے امتزاج کا نام ہے جبکہ میں ذکر کے بغیر فکر کو ناقص اور نامکمل دیکھتا ہوں۔ اگر کوئی شیر بھی ہو تو قرآن کے بغیر وہ لومڑی کی طرح ہوگا' اصل شہنشاہ تو وہ ہے جسے فقر قرآنی مل گیا۔

اس ضمن میں ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں ذکر اور فکر کے الگ الگ حلقے بن چکے ہیں۔ ان میں سے ہر حلقے کے لوگ اپنے طور طریقوں میں اس قدر مگن ہیں کہ انہیں دوسروں سے کچھ سروکار نہیں۔ ایک طرف مفکرین ہیں جو فلسفہ و فکر پر بڑی بڑی کتابیں رقم کر رہے ہیں' کیسی کیسی تفسیریں لکھتے جاتے ہیں' مگر وہ ذکر کی لذت سے بالکل ناآشنا ہیں۔ دوسری طرف ذاکرین ہیں جو ذکر کی روح پرور محفلیں سجاتے ہیں لیکن انہیں فکر و تدبر سے کوئی واسطہ نہیں۔ ظاہر ہے گاڑی کے ان دونوں پہیوں میں ہم آہنگی ہوگی تو امت کا قافلہ منزل کی طرف گامزن ہوگا۔ بہرحال سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیات میں ذکر و فکر کے ذریعے ہدایت کی ''منزلِ مقصود'' تک پہنچنے کا طریقہ بتایا گیا ہے' جبکہ دوسرے طریقے کی نشاندہی سورۃ النور کے پانچویں رکوع (منتخب نصاب کے درس ۷) میں کی گئی ہے کہ اپنے قلب کو صاف کر لیجیے' اس کی تمام کدورتیں دور کر دیجیے تو اس کے آئینے میں قرآن خود بخود منعکس ہو کر اسے منور (نُوْرٌ عَلٰی نُوْر) کر دے گا اور یوں نورِ فطرت اور نورِ وحی کے امتزاج سے نورِ ایمان کی تکمیل ہو جائے گی۔

آیت ۳۸ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ۖ﴾ ''اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے پیدا کیا چھ دنوں میں۔''

﴿وَّمَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ ﴿۳۸﴾﴾ ''اور ہم پر کوئی تکان طاری نہیں ہوئی۔''

یہ مضمون موجودہ تورات میں کچھ اس طرح بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کر کے تھکن دور کی۔ اسی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں ''ویک اینڈ'' کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن کام کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کیا تھا' لہٰذا تم لوگ بھی چھ دن کام کر کے ساتویں دن آرام کرو۔ اس آیت میں دراصل تورات کے اس تصور کی نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ اسلام میں ''ویک اینڈ'' کا کوئی تصور نہیں۔ اس حوالے سے یہ تاریخی حقیقت واضح رہنی چاہیے کہ اصل تورات بخت نصر کے حملے میں گم ہوگئی تھی اور دوبارہ اس کو یادداشت کی مدد سے مرتب کیا گیا تھا۔ مرتبین چونکہ عام انسان تھے' نبی نہیں تھے' اس لیے ان کی یادداشتوں نے ٹھوکریں کھائیں اور بہت سی غلط باتیں بھی اس میں شامل کر دی گئیں۔

آیت ۳۹ ﴿فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ) آپ صبر کیجیے اس پر جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں''

﴿وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے سورج کے طلوع ہونے سے قبل اور غروب ہونے سے قبل۔''

جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے' زیر مطالعہ سورتیں مکی دور کے ابتدائی چار سال کے دوران نازل ہوئی تھیں۔ اُس وقت تک پنج گانہ نماز کا باقاعدہ نظام وضع نہیں ہوا تھا۔ پنج گانہ نماز تو معراج کے موقع پر (۱۰ نبوی میں) فرض ہوئی تھی۔ اس سے پہلے تو بس صبح و شام اللہ کا ذکر کرنے کی بار بار تلقین و تاکید کی جاتی تھی' جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۳۰ میں بھی بالکل یہی الفاظ آئے ہیں یا اس سے بھی پہلے سورۃ المزمل میں رات کی نماز اور اس میں تلاوتِ قرآن کا حکم آ چکا تھا۔ بعد میں جب باقاعدہ اوقات کے ساتھ پانچ نمازوں کا نظام وضع ہوا تو ان دو اوقات میں دو نمازیں فرض ہوگئیں' یعنی قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ کے اوقات میں فجر کی نماز اور قَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ کے وقت میں نمازِ عصر۔

آیت ۴۰ ﴿وَمِنَ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡہُ﴾ ''اور رات کے حصوں میں بھی اس کی تسبیح بیان کرو۔''

﴿وَاَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ ﴿۴۰﴾﴾ ''اور سجدوں (نمازوں) کے بعد بھی۔''

یہ گویا نماز سے فارغ ہونے کے بعد کی تسبیح و تحمید کا حکم ہے۔ نمازوں کے بعد کے اذکار کی تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں' جیسے تسبیح فاطمہؓ (۳۳ مرتبہ سبحان اللہ' ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۳ یا ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھنا) کی مداومت سے متعلق احادیث میں ترغیب آئی ہے۔

آیت ۴۱ ﴿وَاسۡتَمِعۡ یَوۡمَ یُنَادِ الۡمُنَادِ مِنۡ مَّکَانٍ قَرِیۡبٍ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور کان لگائے رکھو جس دن پکارنے والا پکارے گا بہت قریب کی جگہ سے۔''

یعنی اس دن کے منتظر رہو جب صور میں پھونکا جائے گا اور ہر شخص کو اس کی آواز بہت قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوگی۔ صور کی آواز ایسی زوردار اور خوفناک ہوگی کہ اس سے ہر جاندار کی موت واقع ہو جائے گی۔ اس کے بعد سب انسانوں کو زندہ کر کے محشر میں جمع کرنے کے لیے پھر صور پھونکا جائے گا۔ یہاں اسی دوسرے صور کا ذکر ہے۔

آیت ۴۲ ﴿یَّوۡمَ یَسۡمَعُوۡنَ الصَّیۡحَۃَ بِالۡحَقِّ ؕ﴾ ”جس دن کہ وہ سنیں گے ایک چنگھاڑ حق کے ساتھ۔“

﴿ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡخُرُوۡجِ ﴿۴۲﴾﴾ ”وہ ہوگا نکلنے کا دن۔“

یعنی وہ زمین سے مُردوں کے نکلنے کا دن ہوگا۔

آیت ۴۳ ﴿اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ﴾ ”یقیناً ہم ہی زندہ رکھتے ہیں اور ہم ہی موت وارد کرتے ہیں۔“

﴿وَ اِلَیۡنَا الۡمَصِیۡرُ ﴿۴۳﴾﴾ ”اور ہماری ہی طرف (سب کو) پلٹ کر آنا ہے۔“

واضح رہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ اپنی شانِ جلالت کا زیادہ اظہار کرنا چاہتا ہے وہاں اپنے لیے جمع کا صیغہ پسند فرماتا ہے۔

آیت ۴۴ ﴿یَوۡمَ تَشَقَّقُ الۡاَرۡضُ عَنۡہُمۡ سِرَاعًا ؕ﴾ ”جس دن زمین ان پر سے پھٹ جائے گی اور وہ تیزی سے نکل پڑیں گے۔“

﴿ذٰلِکَ حَشۡرٌ عَلَیۡنَا یَسِیۡرٌ ﴿۴۴﴾﴾ ”یہ (سب کا) جمع کر دینا ہمارے لیے بہت آسان ہے۔“

آیت ۴۵ ﴿نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں“

﴿وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِجَبَّارٍ ۟﴾ ”اور آپ ان پر کوئی زبردستی کرنے والے نہیں ہیں۔“

آپ کا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ ہم نے آپؐ کو اس اختیار کے ساتھ نہیں بھیجا کہ آپؐ انہیں زبردستی حق کی طرف لے آئیں۔

﴿فَذَکِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مَنۡ یَّخَافُ وَعِیۡدِ ﴿۴۵﴾﴾ ”پس آپ تذکیر کرتے رہیے اِس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہے۔“

جس شخص کی روح مردہ نہ ہو چکی ہوگی اور اس میں تھوڑی سی بھی جان ہوگی اور جس کے اندر اخلاقی حس دم نہ توڑ چکی ہوگی اور بھلائی کی معمولی سی رمق بھی باقی ہوگی وہ آپ ﷺ کی باتیں سن کر قرآن کی تذکیر اور یاددہانی سے ضرور فائدہ اٹھائے گا۔ یہاں پر ﴿فَذَکِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ﴾ کے الفاظ میں حضور ﷺ کو خصوصی طور پر ہدایت دی جا رہی ہے کہ آپؐ تبلیغ و تذکیر‘ انذار و تبشیر اور لوگوں کے تزکیہ نفس کا ذریعہ قرآن ہی کو بنائیں۔ اس حکم کے مقابلے میں آج اُمتِ مسلمہ کی مجموعی حالت یہ ہے کہ مسلمانوں نے خود کو قرآن سے بالکل ہی بے نیاز کر لیا ہے اور دعوت و تبلیغ‘ وعظ و نصیحت اور تربیت و تزکیہ کے دیگر ذرائع اختیار کر لیے ہیں۔

سُوْرَۃُ الذّٰرِیٰت

تمہیدی کلمات

سورۃ الذاریات کا آغاز چار قسموں سے ہو رہا ہے۔ اس انداز سے شروع ہونے والی یہ قرآن مجید کی دوسری سورت ہے۔ اس سے پہلے ۲۳ ویں پارے میں سورۃ الصّٰفّٰت ہے جس کے آغاز میں بالکل اسی انداز میں تین قسمیں کھائی گئی ہیں:

﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝۱ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا ۝۳ اِنَّ اِلٰھَکُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴﴾

''قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو قطار در قطار صفیں باندھے حاضر رہتے ہیں۔ پھر قسم ہے اُن کی جو ڈانٹنے والے ہیں۔ پھر قسم ہے اُن کی جو تلاوت کرنے والے ہیں ذکر کی۔ یقیناً تمہارا اِلٰہ ایک ہی ہے۔''

سورۃ الصّٰفّٰت کا تعلق سورتوں کے جس گروپ سے ہے اس گروپ کا مرکزی مضمون توحید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے آغاز کی تین قسموں کے مقسم علیہ کا تعلق بھی توحید سے ہے: ﴿اِنَّ اِلٰھَکُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴﴾ کہ یقیناً تمہارا اِلٰہ ایک ہی ہے۔ زیر مطالعہ گروپ کی سورتوں کا مرکزی مضمون چونکہ انذارِ آخرت ہے اس لیے سورۃ الذاریات کی قسموں کے بعد قیامت اور جزا و سزا کے واقع ہونے کی تصدیق کی گئی ہے: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾

جس طرح سورۃ الصّٰفّٰت کی قسموں کے بارے میں تقریباً سب علمائے تفسیر کا اتفاق ہے کہ وہ قسمیں فرشتوں کے بارے میں ہیں' اسی طرح سورۃ الذّٰرِیٰت کی قسموں کے بارے میں بھی تقریباً سب مفسرین متفق ہیں کہ ان میں ہواؤں کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

آیات ۱ تا ۲۳

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۝۱ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝۲ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ۝۳ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝۴ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ
لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُکِ ۝۷ اِنَّکُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸
یُّؤْفَکُ عَنْہُ مَنْ اُفِکَ ۝۹ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝۱۰ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ غَمْرَۃٍ سَاھُوْنَ ۝۱۱ یَسْئَلُوْنَ
اَیَّانَ یَوْمُ الدِّیْنِ ۝۱۲ یَوْمَ ھُمْ عَلَی النَّارِ یُفْتَنُوْنَ ۝۱۳ ذُوْقُوْا فِتْنَتَکُمْ ؕ ھٰذَا الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہٖ
تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۱۴ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝۱۵ اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰھُمْ رَبُّھُمْ ؕ اِنَّھُمْ کَانُوْا

قَبۡلَ ذٰلِكَ مُحۡسِنِيۡنَؕ﴿۱۶﴾ كَانُوۡا قَلِيۡلًا مِّنَ الَّيۡلِ مَا يَهۡجَعُوۡنَ﴿۱۷﴾ وَبِالۡاَسۡحَارِ هُمۡ يَسۡتَغۡفِرُوۡنَ﴿۱۸﴾
وَفِىۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ﴿۱۹﴾ وَفِى الۡاَرۡضِ اٰيٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِيۡنَۙ﴿۲۰﴾ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ‌ ؕ
اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ﴿۲۱﴾ وَفِى السَّمَآءِ رِزۡقُكُمۡ وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ﴿۲۲﴾ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ
ع ۱۸ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّكُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ﴿۲۳﴾

آیت ۱ ﴿وَالذّٰرِيٰتِ ذَرۡوًا ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے اُن ہواؤں کی جو بکھیرنے والی ہیں جیسے کہ بکھیرا جاتا ہے۔''
ہوائیں بہت سی چیزوں کو بکھیرتی ہیں۔ مثلاً پودوں کے پھولوں کے زردانے (pollens) ہواؤں کی مدد سے ایک پودے سے دوسرے تک پہنچ کر اسے بارور کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے درختوں کے بیج ہواؤں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے دور دراز علاقوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ یوں ہوائیں پودوں کے پھلنے پھولنے اور جنگلات کے بڑھانے میں بھی مدد دیتی ہیں۔

آیت ۲ ﴿فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ﴿۲﴾﴾ ''پھر بوجھ اٹھا کر لانے والی ہیں۔''
ہوائیں اربوں کھربوں ٹن پانی سمندر سے اٹھا کر بادلوں کی شکل میں ہزاروں میل دور لے جاتی ہیں اور پھر مختلف علاقوں میں بارش برساتی ہیں۔

آیت ۳ ﴿فَالۡجٰرِيٰتِ يُسۡرًا ۙ﴿۳﴾﴾ ''پھر نرمی سے چلنے والی ہیں۔''
کبھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس طرح چلتی ہے کہ اس کے ہلکے ہلکے جھونکے نباتات و حیوانات سب کے لیے بہت فرحت بخش ہوتے ہیں۔

آیت ۴ ﴿فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ۙ﴿۴﴾﴾ ''پھر اللہ کے امر کو تقسیم کرنے والی ہیں۔''
اس سے مراد بارش کے پانی کی تقسیم ہے۔ بادل کی شکل میں سمندر کے پانی کو ہوائیں مختلف علاقوں میں اڑائے پھرتی ہیں، مگر کس جگہ بارش ہوگی اور کس جگہ نہیں ہوگی اور جہاں ہوگی وہاں کس قدر ہوگی، یہ سب کچھ تو اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اللہ کے اس امر (حکم) کی تقسیم ہواؤں کے ذریعے سے ہی ہوتی ہے۔ اس تقسیم کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض علاقوں میں بارش سے جل تھل ہو جاتا ہے اور کچھ علاقے پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے رہ جاتے ہیں اور کالی گھٹائیں ان کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔
ان آیات میں ہواؤں کی قسمیں کھا کر اور پھر ان کے ذریعے طے پانے والے بعض امور کا ذکر کر کے دراصل کائنات کے محکم نظام پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اگر انسان اس بارے میں غور کرے گا تو وہ ضرور اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے بنائی ہے: ((اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ))(۱) ''یہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔''

آیت ۵، ۶ ﴿اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّيۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۶﴾﴾ ''جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً

---

(۱) تخریج الاحیاء للعراقی ۳/۲۵۲۔ حافظ عراقی نے اس حدیث کو منقطع قرار دیا ہے۔

سچ ہے۔اور جزاوسزا ضرور واقع ہو کر رہے گی۔''

یہ کائنات اور اس کا نظام گواہ ہے کہ بعث بعد الموت' نفخہ اولیٰ' نفخہ ثانیہ وغیرہ سے متعلق جو خبریں تمہیں دی جارہی ہیں وہ یقیناً سچی ہیں اور جس عذاب کی تمہیں وعید سنائی جا رہی ہے اس میں کچھ شک وشبہ نہیں۔قیامت ضرور قائم ہوگی اور اس دن تمام انسانوں کو پھر سے ضرور زندہ کیا جائے گا اور انہیں ان کے اعمال کا بدلہ مل کر رہے گا۔

آیت ۷ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝﴾ ''اور قسم ہے جالی دار آسمان کی۔''

یہ اس منظر کی طرف اشارہ ہے جو رات کے وقت تاروں بھرا آسمان پیش کرتا ہے۔

آیت ۸ ﴿اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝﴾ ''یقیناً تم لوگ ایک جھگڑے کی بات میں پڑ گئے ہو۔''

یعنی آخرت کے بارے میں تم ایک اختلاف میں پڑ گئے ہو اور تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

آیت ۹ ﴿يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝﴾ ''اس سے وہی پھیرا جاتا ہے جو پھیر دیا گیا ہے۔''

تم میں سے بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو وحی کے اس پیغام کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے اور جزاوسزا کے متعلق مختلف باتیں بناتے رہتے ہیں۔حالانکہ جزاوسزا کا معاملہ ایک بدیہی حقیقت ہے اور اس کو تسلیم کرنے سے وہی شخص باز رہے گا جو راندۂ درگاہ ہے اور خیر وسعادت کے راستوں سے پھیر دیا گیا ہے۔

آیت ۱۰ ﴿قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝﴾ ''ہلاک ہو جائیں یہ اٹکلیں دوڑانے والے۔''

آیت ۱۱ ﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝﴾ ''جو اپنی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

انہیں نہ تو اپنے مقصد تخلیق کی خبر ہے اور نہ اپنے انجام کی فکر۔حتیٰ کہ وہ اپنے اس عہد کو بھی بھولے ہوئے ہیں جو عالم ارواح میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا۔سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں اس عہد کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ﴾

''اور یاد کرو جب نکالا آپؐ کے رب نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسل کو اور ان کو گواہ بنایا خود ان کے اوپر' (اور سوال کیا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔''

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس عہد کا ''عرفان'' اس کی روح کے اندر موجود ہوتا ہے۔لیکن دنیوی زندگی کے دوران بعض لوگوں کی ارواح غفلت میں اس قدر ڈوب جاتی ہیں کہ انہیں اپنے رب سے کیا ہوا یہ عہد یاد ہی نہیں رہتا۔زیر مطالعہ آیت میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے۔

آیت ۱۲ ﴿يَسْـَٔــلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝﴾ ''وہ پوچھتے ہیں کب آئے گا وہ جزاوسزا کا دن!''

مشرکین یہ سوال طنزیہ انداز میں کرتے تھے کہ آپؐ کہتے رہتے ہیں کہ جزائے اعمال کا دن آکر رہے گا' تو آخر کب تک آئے گا وہ روزِ جزا؟ چنانچہ ان کے اس سوال کا جواب بھی انہیں اسی انداز میں دیا جا رہا ہے:

آیت ۱۳ ﴿یَوۡمَ هُمۡ عَلَی النَّارِ یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۱۳﴾﴾ ''جس دن یہ لوگ آگ پر سینکے جائیں گے۔''

چونکہ مشرکین یہ سوال غیر سنجیدہ انداز میں کرتے تھے اس لیے جواب میں ان کے لیے ڈانٹ کا انداز پایا جاتا ہے۔

آیت ۱۴ ﴿ذُوۡقُوۡا فِتۡنَتَکُمۡ ؕ هٰذَا الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِهٖ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''(اُس دن ان سے کہا جائے گا) اب چکھو مزا اپنی شرارت کا۔ یہ ہے وہ (عذاب) جس کی تم جلدی مچایا کرتے تھے۔''

تم لوگ ہمارے رسولؐ کو چیلنج کیا کرتے تھے نا کہ لے آؤ ہم پر عذاب اگر لا سکتے ہو۔ چنانچہ یہ ہے آج تمہارے اس مطالبے کا جواب۔ اب چکھو اس عذاب کا مزا!

آیت ۱۵ ﴿اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّعُیُوۡنٍ ﴿۱۵﴾﴾ ''یقیناً اہل تقویٰ باغات اور چشموں کے اندر ہوں گے۔''

آیت ۱۶ ﴿اٰخِذِیۡنَ مَاۤ اٰتٰهُمۡ رَبُّهُمۡ ؕ اِنَّهُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''وہ (شکریے کے ساتھ) لے رہے ہوں گے جو کچھ ان کا رب انہیں دے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس سے پہلے نیکوکار تھے۔''

یہ لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے نیک اعمال کی وجہ سے درجہ احسان تک پہنچے ہوئے تھے۔

آیت ۱۷ ﴿کَانُوۡا قَلِیۡلًا مِّنَ الَّیۡلِ مَا یَهۡجَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ ''رات کا تھوڑا ہی حصہ ہوتا تھا جس میں وہ سوتے تھے۔''

ان لوگوں کی راتوں کا بیشتر حصہ اپنے رب کے حضور حاضری میں گزرتا تھا۔ سورۃ الفرقان میں ''عباد الرحمٰن'' کے اس معمول کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿وَالَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴿۶۴﴾﴾ ''اور وہ لوگ راتیں بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام کرتے ہوئے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَبِالۡاَسۡحَارِ هُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور سحری کے اوقات میں وہ استغفار کرتے تھے۔''

آیت ۱۹ ﴿وَفِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور ان کے اموال میں سائل اور محتاج کا حق ہوا کرتا تھا۔''

انہوں نے اس حقیقت کو قبول کر رکھا تھا کہ ان کے پاس اللہ کا دیا جو کچھ بھی ہے اس میں فقراء و مساکین کا بھی حصہ ہے اور وہ متعلقہ لوگوں کا حق ان تک پہنچایا بھی کرتے تھے۔

آیت ۲۰ ﴿وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور زمین میں (ہر چہار طرف) نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے۔''

سورۃ البقرۃ' آیت ۱۶۴ (آیت الآیات) میں اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور تمہاری اپنی جانوں میں بھی (نشانیاں ہیں)۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟''

یعنی انسان کے جسم اور جسم کے ایک ایک نظام کے اندر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ان نشانیوں پر غور کرے۔ مرزا بیدلؔ نے اس خوبصورت شعر میں اسی مضمون کی ترجمانی کی ہے: ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو دمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ!

اے انسان! بڑے ستم کی بات ہے اگر تجھے تیری خواہش نفس کسی باغ کی سیر کے لیے کھینچ کر لے جاتی ہے' جبکہ خود تیری اپنی چمک دمک کسی پھول سے کم نہیں ہے۔ کبھی اپنے دل کا دروازہ کھول کر اس چمن کی سیر کے لیے بھی آ ؤ جو تمہاری روح کے اندر اللہ تعالیٰ نے مہکا رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنی تخلیق اور اپنے وجود پر غور کرے اور اس اعتبار سے اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانے۔ بقول مرزا بیدلؔ: ؎

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی
اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہوشیار باش!

(اس شعر کی تشریح سورۃ النحل کی آیت ۴۰ کے تحت بیان ہوئی ہے۔)

آیت ۲۲ ﴿وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارا رزق بھی طے شدہ ہے اور تمہارے جنت یا دوزخ میں جانے کا فیصلہ بھی اُسی کی مشیت سے ہونا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''تو آسمانوں اور زمین کے رب کی قسم' یقیناً یہ حق ہے' بالکل ایسے جیسے (اِس وقت) تم بات چیت کر رہے ہو۔''

یعنی بعث بعد الموت شدنی ہے' برحق ہے' قیامت آ کر رہے گی۔

آیات ۲۴ تا ۴۶

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۞ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۞ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۞ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۞ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۞ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۞ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۞ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۞ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۞ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۞ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۞ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۞ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۞ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ

بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ۝ فَتَوَلّٰی بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ۝ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی
الْیَمِّ وَهُوَ مُلِیْمٌ۝ۭ وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ۝ۚ مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ
عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ۝ۭ وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ
رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّمَا كَانُوْا
مُنْتَصِرِیْنَ۝ۙ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ۝ۧ ع ۲۳

آیت ۲۴ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ الْمُكْرَمِیْنَ۝﴾ ’’کیا آپؐ کے پاس ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے!‘‘

یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب فرشتے انسانی شکلوں میں مہمان بن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر آئے تھے۔

آیت ۲۵ ﴿اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ﴾ ’’جب وہ اس کے ہاں داخل ہوئے تو انہوں نے سلام کہا۔‘‘

﴿قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ۝﴾ ’’اس نے بھی (جواب میں) سلام کہا (اور دل میں کہا کہ) یہ تو کوئی اجنبی لوگ ہیں۔‘‘

آیت ۲۶ ﴿فَرَاغَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ۝﴾ ’’پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کی طرف گیا اور ایک (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لے آیا۔‘‘

سورۂ ہود (آیت ۶۹) میں ’’عِجْلٍ حَنِیْذٍ‘‘ (بھنا ہوا بچھڑا) کے الفاظ آئے ہیں۔ پرانے زمانے کی دعوتیں اسی انداز سے ہوا کرتی تھیں کہ جانور ذبح کیا اور گھی میں تل کر یا بھون کر پورے کا پورا مہمانوں کے سامنے حاضر کر دیا۔

آیت ۲۷ ﴿فَقَرَّبَهٗٓ اِلَیْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ۝﴾ ’’پھر اسے ان کی طرف بڑھایا اور کہا کہ آپ لوگ کھاتے نہیں؟‘‘

آیت ۲۸ ﴿فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ۭ﴾ ’’تو اُس نے ان کی طرف سے دل میں اندیشہ محسوس کیا۔‘‘

مہمانوں کے کھانا تناول نہ کرنے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اندیشہ لاحق ہوا کہ شاید یہ لوگ میرے دشمن ہیں' مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور اسی لیے میرا نمک کھانے سے احتراز کر رہے ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگ دشمنی میں بھی شرافت دکھاتے تھے۔ اگر کسی کا نمک کھا لیا جاتا تو اس کے بعد اسے نقصان پہنچانے کا نہیں سوچا جاتا تھا۔

﴿قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ﴾ ’’انہوں نے کہا: آپ ڈریں نہیں۔‘‘

﴿وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ۝﴾ ’’اور انہوں نے اسے بشارت دی ایک صاحب علم بیٹے کی۔‘‘

صاحبِ علم بیٹے سے مراد حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں جن کی پیدائش کی بشارت فرشتوں نے دی۔

آیت ۲۹ ﴿فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝۲۹﴾ ''اس پر اُس کی بیوی سامنے آئی بڑبڑاتی ہوئی اور اس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اور کہنے لگی: بڑھیا بانجھ (بچہ جنے گی کیا)؟''

کہ میں تو ساری عمر بانجھ رہی ہوں اور اب تو میری عمر بھی ماں بننے کی نہیں رہی' تو کیا اب میرے ہاں بیٹا پیدا ہوگا؟

آیت ۳۰ ﴿قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ﴾ ''انہوں نے کہا: ایسا ہی فرمایا ہے آپ کے رب نے۔''

فرشتے جو انسانی شکل میں تھے انہوں نے جواب دیا: یقیناً ایسے ہی ہوگا۔ ہم اپنی طرف سے یہ خبر نہیں دے رہے' بلکہ یہ آپ کے رب کا فیصلہ ہے۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝۳۰﴾ ''یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا بھی ہے اور بہت حکمت والا بھی۔''

آیت ۳۱ ﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝۳۱﴾ ''ابراہیم نے پوچھا کہ اے ایلچیو! پھر آپ لوگوں کا مقصد کیا ہے؟''

آپ کا قصد اور ارادہ کیا ہے؟ کیا خصوصی مہم آپ کو درپیش ہے؟

آیت ۳۲ ﴿قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۲﴾ ''انہوں نے کہا: ہم بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف۔''

آیت ۳۳ ﴿لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝۳۳﴾ ''تاکہ ہم ان پر بارش برسائیں کنکریوں کی۔''

آیت ۳۴ ﴿مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۴﴾ ''جو نشان زدہ ہیں آپ کے رب کے پاس حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہر کنکری کو ان کے ایک خاص فرد کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جو اس کے لیے گولی (bullet) کا کام کرے گی۔

آیت ۳۵ ﴿فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۳۵﴾ ''پھر ہم نے نکال لیا جو بھی اس بستی میں تھے اہلِ ایمان۔''

آیت ۳۶ ﴿فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۶﴾ ''تو نہیں پایا ہم نے اس میں سوائے ایک گھر کے کسی کو مسلمانوں میں سے۔''

یعنی حضرت لوط علیہ السلام کے ایک گھر کے سوا اس پوری قوم میں اور کوئی بھی مسلمان نہیں تھا۔

آیت ۳۷ ﴿وَتَرَكْنَا فِيْهَاۤ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝۳۷﴾ ''اور ہم نے اس میں ایک نشانی چھوڑ دی ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہوں دردناک عذاب سے۔''

قومِ لوط کی بستیاں (سدوم اور عامورہ) سمندر کے کنارے پر آباد تھیں' جو اب بحیرۂ مردار (Dead Sea) کہلاتا ہے۔ ان بستیوں کے بارے میں یہی اندازہ تھا کہ جب زلزلے سے یہ علاقہ تلپٹ ہوا ہوگا تو یہ بستیاں

سمندر میں غرق ہوگئی ہوں گی۔ اب اس کی تصدیق بھی ہوگئی ہے اور بحیرۂ مردار کی تہہ میں ان شہروں کے کھنڈرات کو دریافت بھی کر لیا گیا ہے۔ یہاں نشانی سے مراد یہی کھنڈرات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک لوگوں کی عبرت کے لیے ظاہر فرما دیا ہے۔

آیت ۳۸ ﴿وَفِیْ مُوْسٰٓی اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۸﴾﴾ ''اور موسیٰ کے معاملے میں بھی (نشانی ہے) جب ہم نے اسے بھیجا فرعون کی طرف کھلی سند دے کر۔''

آیت ۳۹ ﴿فَتَوَلّٰی بِرُكْنِهٖ﴾ ''تو اُس نے منہ موڑ لیا اپنی شان و شوکت کے گھمنڈ میں''

﴿وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور کہا کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔''

یعنی فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہی القابات دیے تھے جو اہل مکہ حضور ﷺ کو دے رہے تھے۔

آیت ۴۰ ﴿فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ وَهُوَ مُلِیْمٌ ﴿۴۰﴾﴾ ''سو ہم نے پکڑا اُس کو اور اُس کے لشکروں کو اور انہیں پھینک دیا سمندر میں اور وہ ملامت زدہ تھا۔''

آیت ۴۱ ﴿وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور قومِ عاد میں بھی (نشانی ہے) جب ہم نے اُن پر ایک ایسی ہوا چھوڑ دی تھی جو ہر خیر سے خالی تھی۔''

عَقِیْم کے معنی بانجھ کے ہیں، یعنی ایسا مرد یا ایسی عورت جس کے اولاد پیدا نہ ہوتی ہو۔ قبل ازیں آیت ۲۹ میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ اس مفہوم میں اَلرِّیْحَ الْعَقِیْمَ سے مراد ایسی ہوا ہے جو ہر قسم کی خیر سے خالی تھی۔

آیت ۴۲ ﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ ﴿۴۲﴾﴾ ''وہ نہیں چھوڑتی تھی کسی شے کو جس پر وہ آ جاتی تھی مگر اُس کو چورا چورا کر کے رکھ دیتی تھی۔''

آیت ۴۳ ﴿وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور اسی طرح ثمود کے معاملے میں بھی (نشانی ہے) جب ان سے کہا گیا کہ ایک خاص وقت تک کے لیے تم فائدہ اٹھا لو (دنیا کی نعمتوں سے)۔''

آیت ۴۴ ﴿فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ﴾ ''تو انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے''

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''تو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چنگھاڑ نے انہیں آ پکڑا۔''

آیت ۴۵ ﴿فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''تو نہ ان میں کھڑے ہونے کی سکت رہی اور نہ ہی اس قابل رہے کہ بدلہ لیتے۔''

یعنی نہ تو وہ اُٹھ ہی سکے اور نہ اپنا بچاؤ ہی کر سکے۔

آیت ۴۶ ﴿وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ﴾ ''اور قومِ نوح کو بھی اس سے پہلے (ہم نے پکڑا)۔''

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''یقیناً وہ بھی بڑے ہی نافرمان لوگ تھے۔''

نوٹ کیجیے یہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے سوا ان سب پیغمبروں کا ذکر آ گیا ہے جن کے حالات طویل مکی

سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ یعنی سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں ایک ایک پیغمبر کا واقعہ عموماً ایک ایک رکوع میں بیان ہوا ہے لیکن یہاں ان کا ذکر ایک ایک دو دو آیات میں آیا ہے۔ گویا بعد میں نازل ہونے والی طویل مکی سورتوں میں انباء الرسل کی تفصیل بیان ہوئی ہے جبکہ زیر مطالعہ مکی سورتوں میں ان پیغمبروں کا ذکر انتہائی مختصر انداز میں آیا ہے۔

آیات ۴۷ تا ۶۰

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۱﴾ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

آیت ۴۷ ﴿وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور آسمان کو ہم نے بنایا اپنے ہاتھوں سے اور ہم (اس کو) توسیع دینے والے ہیں۔''

اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ کا ترجمہ عام طور پر ''ہم بڑی ہی وسعت رکھنے والے ہیں'' یا ''ہم بڑی قدرت والے ہیں'' کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن لغوی اعتبار سے اس کا یہ ترجمہ زیادہ مناسب اور زیادہ جامع ہے جو اوپر متن میں اختیار کیا گیا ہے۔ اَوْسَعَ یُوْسِعُ باب افعال ہے' جس کا مطلب ہے کشادہ کرنا' وسعت دینا۔ وَسِعَ ثلاثی مجرد ہے' جس سے اسم الفاعل وَاسِعٌ آتا ہے۔ چنانچہ ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ کا مطلب ہے: اللہ بڑی وسعت سمائی والا ہے' اس کے خزانے لامحدود ہیں۔ جبکہ مُوْسِع باب افعال سے اسم الفاعل ہے اور اس کے معنی ہوں گے: وسعت دینے والا۔ اس لحاظ سے یہاں ﴿اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس کائنات کو مسلسل وسعت بخش رہے ہیں' اسے وسیع سے وسیع تر کیے جا رہے ہیں۔ اور یہ وہی بات ہے جو آج ہمیں سائنس کی مدد سے معلوم ہوئی ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے تک انسان کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا مگر آج ہم جانتے ہیں کہ کائنات میں ہر گھڑی نئے نئے ستارے پیدا ہو رہے ہیں' ہر آن نئی نئی کہکشائیں وجود میں آ رہی ہیں اور یہ کائنات مسلسل پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ ''Expanding Universe'' کے اس تصور کو اقبال نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے: ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُنْ فَیَکُوْن

تو اللہ تعالیٰ کی شانِ کُنْ فَیَکُوْن کا ظہور مسلسل جاری ہے۔ اسی مفہوم کو سورۂ فاطر کی پہلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ؕ﴾ ''وہ اپنی تخلیق میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا رہتا ہے''۔ چنانچہ وہ آسمانوں کو یعنی کائنات کو مسلسل وسعت دیے جا رہا ہے۔

آیت ۴۸ ﴿وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور زمین کو ہم نے (فرش کی مانند) بچھا دیا' پس ہم کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں!''

آیت ۴۹ ﴿وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم نصیحت اخذ کرو۔''

''جوڑوں'' کی تخلیق میں ہمارے لیے کس کس پہلو سے نصیحت کا سامان ہے؟ یہ جاننے کے لیے تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے۔ یہاں پر اس حوالے سے صرف یہ نکتہ سمجھ لیجیے کہ اس مفہوم کی آیات آخرت سے متعلق عقلی دلیل فراہم کرتی ہیں۔ یعنی جب ہر شے کا جوڑا ہے تو دنیا کا بھی تو جوڑا ہونا چاہیے اور ظاہر ہے دنیا کا جوڑا آخرت ہے۔

آیت ۵۰ ﴿فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۰﴾﴾ ''تو دوڑو اللہ کی طرف' یقیناً میں تم لوگوں کے لیے اُس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔''

اگر اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچ گیا ہے اور میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ گئی ہیں تو پھر اللہ کی طرف رجوع کرنے میں دیر نہ کرو۔ ممکن ہے فرشتے کو تمہاری جان قبض کرنے کا حکم بھی مل چکا ہو اور تمہاری مہلت عمل ختم ہونے کا وقت بالکل قریب آ لگا ہو۔

آیت ۵۱ ﴿وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ﴾ ''اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہراؤ۔''

﴿اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۱﴾﴾ ''یقیناً میں اُس کی جانب سے تمہارے لیے واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں۔''

آیت ۵۲ ﴿كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾﴾ ''اسی طرح (ہوتا آیا ہے کہ) نہیں آیا تھا ان سے پہلے لوگوں کے پاس کوئی رسول مگر انہوں نے یہی کہا تھا کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔''

آیت ۵۳ ﴿اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ﴾ ''کیا وہ ایک دوسرے کو وصیت کر گئے تھے اس کی؟''

یعنی جو باتیں آج سے صدیوں پہلے کے لوگ اپنے پیغمبروں سے کہتے تھے' عین وہی باتیں قریشِ مکہ آج ہمارے آخری رسول ﷺ سے کہہ رہے ہیں۔ کیا ان کی ہر نسل دوسری نسل کو یہ باتیں وصیت میں بتا کر جاتی رہی ہے؟

﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ''بلکہ یہ ہیں ہی سرکش لوگ!''

ان کے رویے کی یکسانی اور ایک ہی طرزِ جواب کی مسلسل تکرار کی وجہ یہ ہے کہ طغیان و سرکشی ان سب کا مشترک وصف ہے۔ چنانچہ اپنے اپنے پیغمبروں کے خلاف ان کے اعتراضات بھی ایک جیسے ہیں۔

آیت ۵۴ ﴿فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ ﴿۵۴﴾﴾ ''پس (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے رُخ پھیر لیں' آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے۔''

یعنی اگر وہ آپؐ کی مخالفت میں یہاں تک آ گئے ہیں کہ آپؐ کو شاعر' ساحر' مجنون اور مُعلَّم (سکھایا ہوا) تک کہہ رہے ہیں اور آپؐ کی دعوت سے مسلسل اعراض کر رہے ہیں تو اب آپ بھی اپنی توجہ ان کی طرف سے ہٹا لیجیے۔ آپ محکم دلائل کے ساتھ ان پر اتمامِ حجت کر چکے ہیں۔ اگر یہ لوگ راہِ راست پر نہ آئے تو اس کی جواب دہی آپ سے نہیں ہو گی۔ لہٰذا آپ انہیں چھوڑ کر اُن لوگوں کی طرف اپنی توجہ مرکوز کریں جو آپؐ کی بات کو سننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

آیت ۵۵ ﴿وَّ ذَکِّرۡ فَاِنَّ الذِّکۡرٰی تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۵﴾﴾ ''اور آپ تذکیر کرتے رہیے' کیونکہ یہ تذکیر اہل ایمان کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔''

آپ تعلیم و تبلیغ کی صورت میں تذکیر و یاد دہانی کا سلسلہ جاری رکھیں۔ یہ سرکش لوگ اگر اس تذکیر کو نظر انداز کر رہے ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں' اہل ایمان کے لیے تو یہ بہت مفید ہے۔ آپ سے قرآن سن سن کر اہلِ ایمان کے ایمان میں برابر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

آیت ۵۶ ﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ ''اور میں نے نہیں پیدا کیا جِنّوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

شیخ سعدیؒ نے اس مفہوم کی ترجمانی اس طرح کی ہے: ؎

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی!

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں تخلیق انسانی کی غایت بیان کی گئی ہے۔ کائنات کی تخلیق کے حوالے سے عام طور پر ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس تخلیق کا سبب کیا ہے؟ یہ ایک مشکل اور پیچیدہ سوال ہے جس کے جواب میں ہر زمانے کے فلاسفر اور حکماء نے اپنی اپنی آراء دی ہیں۔ یہ ان تفاصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ ایک عام شخص کے لیے تخلیق کائنات کے سبب کے بارے میں آ گاہی حاصل کرنا ضروری نہیں اور اس لاعلمی کی وجہ سے اسے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی نہیں۔ البتہ اپنی تخلیق کی غرض و غایت کے بارے میں جاننا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ اگر انسان کو اپنی غایت تخلیق ہی کا علم نہیں ہو گا تو گویا اس کی ساری زندگی رائیگاں جائے گی۔ چنانچہ اس آیت میں بنی نوع انسان کو ان کی غایت تخلیق واضح طور پر بتا دی گئی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ''بندگی'' کے لیے پیدا کیا ہے۔

بندگی یا عبادت کے بارے میں قبل ازیں بھی میں نے کئی مرتبہ وضاحت کی ہے کہ اس کے تین حصے ہیں: اوّلاً ہمہ تن اطاعت' ثانیاً اطاعت کی روح یعنی اللہ تعالیٰ کی غایت درجے کی محبت۔ عبادت اصلاً ان دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے (اَلۡعِبَادَۃُ تَجۡمَعُ اَصۡلَیۡنِ : غَایَۃَ الۡحُبِّ مَعَ غَایَۃِ الذُّلِّ وَالۡخُضُوۡعِ)۔ جبکہ تیسری چیز مراسمِ عبودیت ہے' جس کی حیثیت عبادت کے ظاہر یا جسم کی ہے۔ مثلاً اللہ کے سامنے عاجزی کی حالت

(قنوت) میں کھڑے ہونا (قیام)' رکوع' سجدہ' حمدیہ کلمات ادا کرنا' نماز وغیرہ مراسم عبودیت ہیں اور ان کی اپنی اہمیت ہے۔ اگر ہم عبادت کی اس تعریف (اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن اطاعت) کی روشنی میں آج اپنی حالت کا جائزہ لیں تو یہ تلخ حقیقت واضح ہوگی کہ ہم میں سے جو لوگ اپنے زعم میں شب و روز پابندی کے ساتھ اللہ کی عبادت پر کمر بستہ ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ فیصد تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اس کا واضح تر مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگیوں کا غالب حصہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت سے نکلا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس پر کافرانہ نظام کا غلبہ ہے اور اس نظام کے تحت رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن اطاعت ممکن ہی نہیں۔ ان حالات میں ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا عبادت کے تقاضوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے خواہش مند حضرات اس موضوع پر میری کتب اور تقاریر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے یہاں پر مختصراً یہ سمجھ لیں کہ مادی و علمی لحاظ سے انسان جس قدر چاہے ترقی کر لے اگر وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا بندگی کے قالب میں ڈھالنے سے قاصر رہا تو انسانی سطح پر اس کی ساری زندگی بیکار اور رائیگاں ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ان اشعار میں انسان کی اسی ناکامی کی طرف اشارہ کیا ہے:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا!

آیت ۵۷ ﴿مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ﴾ ''میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا''
﴿وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ۝۵۷﴾ ''اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ مجھے کھلائیں' پلائیں۔''

آیت ۵۸ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۝۵۸﴾ ''یقیناً اللہ ہی سب کو رزق دینے والا' قوت والا' زبردست ہے۔''

آیت ۵۹ ﴿فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ۝۵۹﴾ ''پس ان ظالموں کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا ہے جس طرح ان کے ساتھیوں کا پیمانہ لبریز ہوا تھا' سو یہ مجھ سے جلدی نہ مچائیں۔''

''ذَنُوب'' ایسے ڈول کو کہتے ہیں جو پانی وغیرہ سے لبالب بھرا ہوا ہو۔ مراد یہ کہ زمانہ ماضی میں عذاب کا شکار ہونے والی اقوام کی طرح ان کفار و مشرکین کی بداعمالیوں کا ڈول بھی لبریز ہو چکا ہے اور یہ ڈول اب کسی وقت بھی کھینچا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر فوری طور پر ان کی پکڑ نہیں بھی ہو رہی تو اس سے وہ یہ نہ سمجھیں کہ انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔

آیت ۶۰ ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ۝۶۰﴾ ''تو ہلاکت اور بربادی ہے ان کافروں کے لیے اُس دن سے جس کا اُن سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔''

سُوْرَةُ الطُّور

تمہیدی کلمات

سورۃ الطّور کے آغاز میں پانچ قسموں کا ذکر ہے۔ ان قسموں کے مفہوم کا تعین کرنا مشکلات القرآن میں سے ہے۔ سورۃ الطّور اور سورۃ الذاریات کے درمیان نسبت زوجیت اور گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً دونوں سورتوں کے آغاز کا اسلوب بھی ایک جیسا ہے۔ دونوں کے آغاز میں پے در پے قسمیں کھائی گئی ہیں اور دونوں کی قسموں کا مقسم علیہ بھی ایک ہے۔ سورۃ الذاریات کی قسموں کے بعد فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۶﴾﴾ جبکہ سورۃ الطّور کی قسموں کے مقسم علیہ کا ذکر یوں ہوا: ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴿۸﴾﴾۔ اس کے بعد سورۃ الذاریات میں جنت اور دوزخ کی کیفیات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بالکل اسی انداز سے یہ مضمون سورۃ الطّور میں بھی آیا ہے۔ پھر سورۃ الذاریات کے دوسرے رکوع میں نہایت اختصار کے ساتھ انباءِ الرسل کا تذکرہ ہے جبکہ سورۃ الطّور میں اس کے مقابل تذکیر بآلاء اللہ یعنی اللہ کی قدرتوں اور اس کی صفاتِ کاملہ کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

آیات ۱ تا ۲۸

وَالطُّوْرِ ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ﴿۳﴾ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ﴿۴﴾ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ﴿۵﴾
وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴿۸﴾ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ﴿۹﴾
وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴿۱۰﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۱۲﴾
يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ
اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴿۱۷﴾ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ
رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ
مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا
بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾

وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحۡمٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ ۝ يَتَنَازَعُوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِيۡهَا وَلَا تَاۡثِيۡمٌ ۝
وَيَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ غِلۡمَانٌ لَّهُمۡ كَاَنَّهُمۡ لُـؤۡلُـؤٌ مَّكۡنُوۡنٌ ۝ وَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ
يَّتَسَآءَلُوۡنَ ۝ قَالُوۡۤا اِنَّا كُنَّا قَبۡلُ فِىۡۤ اَهۡلِنَا مُشۡفِقِيۡنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا وَوَقٰٮنَا عَذَابَ
السَّمُوۡمِ ۝ اِنَّا كُنَّا مِنۡ قَبۡلُ نَدۡعُوۡهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡبَرُّ الرَّحِيۡمُ ۝ ع

آیت ۱ ﴿وَالطُّوۡرِ ۝۱﴾ ''قسم ہے طور کی۔''

طور عام پہاڑ کو بھی کہا جاتا ہے' لیکن ''الطُّور'' سے مراد وہ خاص پہاڑ (طورِ سِینین☆) ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے۔

آیت ۲ ﴿وَكِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۝۲﴾ ''اور اس کتاب کی قسم جو لکھی ہوئی ہے۔''

اس بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ اس سے مراد تورات ہے' کیونکہ تورات پتھر کی تختیوں پر لکھی ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی' جبکہ قرآن قلبِ محمد ﷺ پر براہِ راست نازل ہوا تھا۔

آیت ۳ ﴿فِىۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۝۳﴾ ''کشادہ ورق میں۔''

یعنی وہ تختیاں خوب کشادہ تھیں جن پر تورات کی عبارت تحریر تھی۔ گویا یہ تین قسمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات سے متعلق ہیں۔ کوہِ طور پر آپؑ کو مکالمہ الٰہی سے سرفراز فرمایا گیا اور آپؑ کو ایک ایسی کتاب عطا کی گئی جو کشادہ تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔

آیت ۴ ﴿وَّالۡبَيۡتِ الۡمَعۡمُوۡرِ ۝۴﴾ ''اور قسم ہے آباد گھر کی۔''

''الۡبَيۡتِ الۡمَعۡمُوۡر'' سے بعض مفسّرین بیت اللہ مراد لیتے ہیں کہ اس میں طواف اور عبادت کے لیے ہر وقت لوگ موجود رہتے ہیں۔ بعض دوسرے مفسّرین کی رائے میں اس سے مراد خانہ کعبہ کے عین اوپر ساتویں آسمان میں فرشتوں کا کعبہ ہے جو ہر وقت ''معمور'' رہتا ہے' جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ بعض مفسّرین کی رائے میں اس سے دنیا مراد ہے جو طرح طرح کی مخلوق سے معمور ہے اور مجھے ذاتی طور پر اس رائے سے اتفاق ہے۔ اس لیے کہ بعد والی قسم اسی مفہوم سے مناسبت رکھتی ہے۔

آیت ۵ ﴿وَالسَّقۡفِ الۡمَرۡفُوۡعِ ۝۵﴾ ''اور قسم ہے اونچی چھت کی۔''

اس سے آسمان مراد ہے۔ پچھلی آیت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ دنیا ایک گھر کی مانند ہے جس میں انسان آباد ہیں اور آسمان اس گھر کی چھت ہے۔

آیت ۶ ﴿وَالۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ ۝۶﴾ ''اور قسم ہے اُبلتے ہوئے سمندر کی۔''

اس سے سمندر کی وہ کیفیت مراد ہے جسے ہم اپنی زبان میں ''موج زن سمندر'' یا ''ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر''

☆ اس کا تذکرہ سورۃ التّین میں بایں الفاظ ہوا ہے: ﴿وَطُوۡرِ سِيۡنِيۡنَ ۝۲﴾ ''اور قسم ہے طورِ سینین کی!''

کہہ کر بیان کرتے ہیں۔ سمندر کو دیکھنے سے واقعتاً ایسے محسوس بھی ہوتا ہے جیسے یہ جوش سے اُبل رہا ہے۔ بہر حال جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے ان قسموں کے معانی و مفاہیم کے بارے میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ البتہ ان قسموں کا مقسم علیہ وہی ہے جو کہ سورۃ الذاریات کی قسموں کا مقسم علیہ ہے۔

آیت ۷ ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ ''تیرے رب کا عذاب یقیناً واقع ہو کر رہے گا۔''

اس سے قیامت کا سخت دن مراد ہے جس کے اٹل ہونے کی حقیقت کو سورۃ الشوریٰ کی آیت ۴۷ میں ﴿یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ﴾ ''وہ دن جسے لوٹایا نہ جاسکے گا'' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

آیت ۸ ﴿مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝﴾ ''اسے کوئی روکنے والا نہ ہوگا۔''

آیت ۹ ﴿یَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝﴾ ''جس روز کہ آسمان بری طرح لرزے گا۔''

آیت ۱۰ ﴿وَّتَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا ۝﴾ ''اور پہاڑ چل رہے ہوں گے جیسے چلا جاتا ہے۔''

پہاڑوں پر زمین کی گرفت برقرار نہیں رہے گی اور وہ ٹوٹ کر فضا میں بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔

آیت ۱۱ ﴿فَوَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝﴾ ''پس ہلاکت و بربادی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیت ۱۲ ﴿الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ خَوْضٍ یَّلْعَبُوْنَ ۝﴾ ''وہ لوگ جو خوش گپیوں میں مصروف کھیل رہے ہیں۔''

آیت ۱۳ ﴿یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝﴾ ''جس دن ان کو دھکے دے دے کر جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا۔''

آیت ۱۴ ﴿هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝﴾ ''(اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ آگ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔''

آیت ۱۵ ﴿اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝﴾ ''کیا یہ جادو ہے یا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟''

اب بتاؤ! کیا تم اپنے سامنے واقعی جہنم کو دیکھ رہے ہو یا اس کو بھی تم جادو کا کھیل ہی سمجھتے ہو؟

آیت ۱۶ ﴿اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ ؕ﴾ ''اب داخل ہو جاؤ اس میں' تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو' اب تمہارے حق میں برابر ہے۔''

اب تمہارے جزع فزع کرنے اور چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ تمہارے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس میں خاموشی سے داخل ہو جاؤ اور اس کی سختیوں کو صبر سے برداشت کرو۔

﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ ''تمہیں بدلے میں وہی کچھ تو مل رہا ہے جو کچھ تم عمل کیا کرتے تھے۔''

آیت ۱۷ ﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ ۝﴾ ''یقیناً متقی لوگ باغات میں اور نعمتوں میں ہوں گے۔''

آیت ۱۸ ﴿فٰكِهِیْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۚ﴾ ''وہ مزے کر رہے ہوں گے ان نعمتوں کے ساتھ جو ان کے

رب نے انہیں عطا کی ہوں گی۔"

﴿وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ⑱﴾ "اور بچا لے گا انہیں ان کا ربّ جہنم کے عذاب سے۔"

آیت ۱۹ ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ⑲﴾ "اور کھاؤ پیو رچتا پچتا' اُن اعمال کا صلہ جو تم کرتے رہے ہو۔"

قبل ازیں بھی متعدد مرتبہ ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل جنت کی قدر افزائی کے لیے جنت اور اس کی نعمتوں کو ان کے اعمال کا صلہ قرار دیا جائے گا' جبکہ اہل جنت بار بار یہ اقرار کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! یہ تیرا فضل ہے جو تو نے ہمیں بخش دیا اور جنت کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا' ورنہ ہم اس قابل ہرگز نہ تھے۔

آیت ۲۰ ﴿مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ﴾ "وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ان تختوں پر جو برابر بچھے ہوں گے صف در صف۔"

﴿وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ⑳﴾ "اور انہیں ہم بیاہ دیں گے بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کے ساتھ۔"

آیت ۲۱ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ "اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ان کی پیروی کی ایمان کے ساتھ' ہم ملا دیں گے ان کے ساتھ ان کی اس اولاد کو"

قبل ازیں اس مضمون کا ذکر سورۃ المؤمن میں حاملین عرش اور ان کے ساتھی فرشتوں کی دعا کے ضمن میں بھی آ چکا ہے۔ وہ اللہ کے حضور مؤمنین کے لیے یوں دعا کر رہے ہوں گے: ﴿رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ۨ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑧﴾ "اے ہمارے پروردگار! انہیں داخل فرمانا اُن رہنے والے باغات میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور (ان کو بھی) جو نیک ہوں ان کے آباء و اَجداد' ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے۔ تو یقیناً زبردست ہے' کمالِ حکمت والا ہے"۔ اب زیر مطالعہ آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے اس کریمانہ فیصلے کا خود اعلان فرما رہے ہیں کہ ہم اہلِ جنت کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے۔ یعنی نچلے درجے کی جنت کے مستحق افراد کو بھی ان کے والدین کے برابر لے آئیں گے جو اعلیٰ درجات کی جنتوں میں متمکن ہوں گے۔

﴿وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ﴾ "اور ہم اُن کے عمل میں سے کوئی کمی نہیں کریں گے۔"

یعنی اگر کوئی شخص اعلیٰ درجے کی جنت میں ہے اور اس کے اہل و عیال نسبتاً نچلے درجے میں ہیں تو یہ نہیں ہوگا کہ اس شخص کو اس کے اہل و عیال کے پاس نچلے درجے میں بھیج دیا جائے بلکہ اس کے اہل و عیال کے درجات بلند کر کے اس کے برابر کر دیا جائے گا۔ گویا اہل جنت کے اکرام کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہوگا کہ ان کے رشتے داروں میں سے جو کوئی کم سے کم درجے کی جنت کا بھی مستحق ہو جائے گا اسے ترقی دے کر ان کے اعلیٰ جنتوں والے رشتے داروں سے ملا دیا جائے گا تاکہ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہو۔

﴿كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿٢١﴾﴾ ''ہر انسان اپنی کمائی کے عوض رہن ہوگا۔''

آیت ۲۲ ﴿وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾ ''اور ہم انہیں دیے چلے جائیں گے پھل اور گوشت جس سے وہ چاہیں گے۔''

آیت ۲۳ ﴿يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴿٢٣﴾﴾ ''اس میں وہ ایک دوسرے سے چھین رہے ہوں گے وہ جام جن (کے مشروب) میں نہ تو کوئی بے ہودگی ہوگی اور نہ ہی گناہ میں ڈالنے والی کوئی بات۔''

یہ اہلِ جنت کی دوستانہ محفلوں کی رونق اور چہل پہل کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے کہ وہ خوش طبعی کے انداز میں ایک دوسرے سے جام چھین رہے ہوں گے۔ اہل جنت کو جو مشروب ملے گا اس میں کیف و سرور تو ہوگا لیکن دنیا کی شراب کی طرح بے ہودگی کی کوئی کیفیت نہیں ہوگی۔

آیت ۲۴ ﴿وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿٢٤﴾﴾ ''اور ان پر گردش میں رہیں گے نوجوان لڑکے ان کی خدمت کے لیے' وہ ایسے ہوں گے جیسے موتی ہوں غلافوں میں رکھے ہوئے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٥﴾﴾ ''اور وہ (اہل جنت) ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے باہم سوال کریں گے۔''

آیت ۲۶ ﴿قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿٢٦﴾﴾ ''وہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے اہل و عیال میں ڈرتے ہوئے رہتے تھے۔''

دنیا میں اپنے اہل و عیال اور عزیز و اقارب کے درمیان معمول کی زندگی بسر کرتے ہوئے ہمیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں شرفِ قبولیت حاصل کر بھی پائیں گے یا نہیں۔ نہ معلوم نیک اعمال کی قبولیت کے لیے مطلوبہ معیار کا اخلاص ہمارے دلوں میں ہے بھی یا نہیں۔ کہیں ہم سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے جو ہماری ساری محنت کو بھی اکارت کر دے۔ ایسے اندیشے اور خدشے ہر لحہ ہمیں دامن گیر رہتے تھے۔

آیت ۲۷ ﴿فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿٢٧﴾﴾ ''تو اللہ نے بڑا احسان کیا ہم پر اور ہمیں بچا لیا لُو کے عذاب سے۔''

آیت ۲۸ ﴿اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ﴾ ''یقیناً ہم پہلے سے اس کو پکارا کرتے تھے۔''

البتہ یہ ضرور تھا کہ اپنی دنیوی زندگی میں ہم اپنی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے مسلسل دعائیں کرتے رہتے تھے۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿٢٨﴾﴾ ''یقیناً وہ بہت ہی اچھا سلوک کرنے والا' بہت رحم فرمانے والا ہے۔''

آیات ۲۹ تا ۴۹

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ
الْمَنُوْنِ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ۝ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ
هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا
صٰدِقِيْنَ۝ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ
بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ۝ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ۝ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ
يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۝ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ۝ اَمْ
تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ۝ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ۝ اَمْ يُرِيْدُوْنَ
كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ۝ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا
يُشْرِكُوْنَ۝ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ۝ فَذَرْهُمْ حَتّٰى
يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ۝ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۝
وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ
فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ۝ ع

آیت ۲۹ ﴿فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝۲۹﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ تذکیر کرتے رہیے' پس آپ اپنے رب کے فضل سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون۔''

یہ خطاب اگرچہ حضور ﷺ سے ہے لیکن اصل میں سنانا ان لوگوں کو مقصود ہے جو آپ کے ایسے نام رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو نظر انداز کر کے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ان کی فضول باتوں پر بالکل توجہ نہ دیں اور لوگوں کو مسلسل تذکیر اور یاددہانی کرتے رہیں۔ اس سے ملتا جلتا مضمون قبل ازیں گزشتہ سورت (الذاریات) میں بھی آ چکا ہے۔ وہاں فرمایا گیا تھا:

﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۝۵۴ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۵﴾

''پس (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے رخ پھیر لیں' آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اور آپ تذکیر کرتے رہیے' کیونکہ یہ تذکیر اہل ایمان کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔''

آپ تذکیر و تبلیغ کا عمل مسلسل جاری رکھیے۔ کیا خبر کسی دل میں ایمان کی کوئی کلی کھلنے والی ہو' کیا خبر آپ کے کسی دشمن کا دل بھی موم ہونے والا ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ اس حقیقت کا گواہ ہے کہ تذکیر آہستہ آہستہ دلوں کو متاثر کرتی رہتی ہے اور پھر کسی وقت اچانک وہ گھڑی آ پہنچتی ہے جب دل میں

ایمان کی کلی کھل اٹھتی ہے۔ حضرت عمرؓ اگرچہ حضورﷺ کی مخالفت میں ہر وقت پیش پیش رہتے تھے لیکن چونکہ سخن شناس تھے اس لیے کلامِ الٰہی سننے کے لیے متجسس بھی رہتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورﷺ رات کو صحنِ کعبہ میں قیام اللیل کے دوران قرآن مجید کی تلاوت فرمایا کرتے تو کبھی کبھی حضرت عمرؓ چھپ کر حضورﷺ کی زبانِ مبارک سے تلاوت سنتے اور کلامِ الٰہی کی تاثیر کو اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتے تھے۔ گویا حضورﷺ کی تذکیر اور قرآن کی تاثیر تدریجاً ان کے دل میں گھر کر رہی تھی۔ اسی تدریجی عمل کے باعث آپؓ کے خیالات وجذبات میں اندر ہی اندر ایک مثبت تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ اُس کے بعد مشیت الٰہی سے وہ واقعہ رونما ہوا جس کے باعث اس خاموش تبدیلی کو اظہار کا موقع ملا اور آپؓ کو ایمان کی دولت نصیب ہوگئی۔ اس دن تو آپؓ گھر سے حضورﷺ کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے تھے۔ راستے میں اپنی بہن فاطمہؓ بنت خطاب اور اپنے بہنوئی حضرت سعیدؓ بن زید سے اُلجھ پڑے۔ آپؓ کے تشدد کا سامنا کرتے ہوئے بہن نے جب ڈٹ کر کہا کہ عمر تم جو چاہے کرلو اب ہم اپنے دین کو چھوڑنے والے نہیں! تو آپؓ اپنی بہن کے اس غیر معمولی عزم اور حوصلے کے سامنے ڈھیر ہوگئے۔ پھر کیا تھا' آپؓ کے دل کا ''بند'' یکدم کھل گیا اور آپؓ نے حق کو اعلانیہ قبول کرلیا۔

آیت ۳۰ ﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ ۝۳۰﴾ ''کیا ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک شاعر ہے' جس کے لیے ہم منتظر ہیں گردشِ زمانہ کے؟''

مشرکین مکہ آپس میں ایک دوسرے کو یہ کہہ کر تسلی دیتے تھے کہ محمد (ﷺ) محض ایک شاعر ہیں۔ ان کے شاعرانہ کلام سے متاثر ہونے میں جلدی مت کرو' کچھ دیر انتظار کروگے (wait and see!) 'تو ان کے دعووں کی اصل حقیقت خود بخود کھل کر سامنے آجائے گی۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ بہت جلد یہ خود ہی گردشِ زمانہ کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

آیت ۳۱ ﴿قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ ۝۳۱﴾ ''آپؐ کہیے کہ اچھا تم انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔''

آیت ۳۲ ﴿اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝۳۲﴾ ''کیا ان کی عقلیں انہیں یہی کچھ سکھا رہی ہیں یا یہ ہیں ہی سرکش لوگ؟''

مشرکین کے ایمان نہ لانے کی یہ دو ہی ممکنہ وجوہات تھیں۔ یا تو واقعتاً انہیں بات سمجھ نہیں آرہی تھی اور ان کی عقلیں انہیں یہی سکھاتی تھیں کہ محمد (ﷺ) جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ محض شاعری اور ان کا من گھڑت کلام ہے۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ بات ان کی سمجھ میں بھی آتی تھی اور ان کے دل گواہی بھی دیتے تھے کہ یہ سب کچھ درست ہے مگر وہ اپنی سرکشی' ضد اور عناد کی وجہ سے انکار پر جمے رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں یہ ساری باتیں وہ عقل سے نہیں بلکہ سراسر ضد' عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر کر رہے تھے۔ دراصل نفس انسانی کی سرکشی بھی دریا کی طغیانی کی طرح ہے جس کے سامنے منطق' تدبیر' کوشش وغیرہ کسی کی نہیں چلتی۔ بقول الطاف حسین حالی: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

آیت ۳۳ ﴿اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَہٗ ۚ﴾ ''کیا ان کا کہنا ہے کہ یہ اس (محمدﷺ) نے خود گھڑ لیا ہے؟''

تَقَوَّلَ باب تفعّل سے ہے اور اس کے معنی تکلف کر کے کچھ کہنے کے ہیں' یعنی قرآن کے بارے میں مشرکین کا یہ کہنا تھا کہ محمد (ﷺ) محنت و ریاضت کے ذریعے یہ کلام خود ''موزوں'' کرتے ہیں۔

﴿بَلۡ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ ماننے والے نہیں ہیں۔''

آیت ۳۴ ﴿فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِہٖۤ اِنۡ کَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ ﴿ؕ۳۴﴾﴾ ''تو وہ لے آئیں اس جیسی کوئی ایک بات اگر وہ سچے ہیں۔''

یہ وہ چیلنج ہے جو قرآن نے بار بار انہیں دیا کہ اگر تم واقعتاً یہ سمجھتے ہو کہ یہ کلام محمد (ﷺ) کا اپنا بنایا ہوا ہے تو ایسا ہی کلام تم بھی اس کے مقابلے میں بنا کر لے آؤ۔ آخر تمہارے درمیان بڑے بڑے خطباء' ادباء اور شعراء موجود ہیں' ان سب کو اکٹھا کر واور کوشش کر کے دیکھ لو۔

آیت ۳۵ ﴿اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ اَمۡ ہُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿ؕ۳۵﴾﴾ ''کیا یہ بغیر کسی کے بنائے ہوئے خود بن گئے ہیں یا یہ خود ہی خالق ہیں؟''

یہ فلسفے کا بہت گہرا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کوئی شے بغیر کسی کے بنائے ہوئے خود بخود تو بنتی نہیں ہے۔ چنانچہ کسی بھی چیز کی تخلیق کے حوالے سے دو ہی صورتیں ممکن ہیں' یعنی یا تو اس چیز کو کسی نے تخلیق کیا ہے یا اس چیز نے اپنے آپ کو خود تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ یہ منطقی سوال ان کے سامنے رکھا گیا کہ اگر تم اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ تم نے خود اپنے آپ کو تخلیق نہیں کیا تو پھر خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ کسی دوسری ہستی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ہستی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

آیت ۳۶ ﴿اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا یُوۡقِنُوۡنَ ﴿ؕ۳۶﴾﴾ ''کیا آسمانوں اور زمین کو انہوں نے بنایا ہے؟ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ یقین نہیں رکھتے۔''

چلو اپنی تخلیق کی بحث کو چھوڑو' تم ذرا یہ بتاؤ کہ زمین و آسمان تم نے بنائے ہیں؟ اگر تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے نہیں بنائے تو پھر مان کیوں نہیں لیتے کہ خود تمہارا خالق اور تمام مخلوق سمیت پوری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو دو اور دو چار کی طرح مسلم ہیں' لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ یقین سے محروم ہیں۔

آیت ۳۷ ﴿اَمۡ عِنۡدَہُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّکَ اَمۡ ہُمُ الۡمُصَۜیۡطِرُوۡنَ ﴿ؕ۳۷﴾﴾ ''کیا ان کے قبضہ قدرت میں آپ کے رب کے خزانے ہیں یا یہ داروغہ ہیں؟''

اس آیت کو پڑھتے ہوئے مشرکین مکہ کا وہ اعتراض بھی ذہن میں تازہ کر لیں جس کا ذکر سورۃ الزخرف کی آیت ۳۱ میں ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر وحی بھیجنا تھی اور اپنا کلام دنیا میں نازل کرنا ہی تھا تو اس کے لیے اس کی نظر بنو ہاشم کے ایک یتیم شخص ہی پر کیوں پڑی' جو نہ تو سرمایہ دار ہے اور نہ ہی مکہ کے قبائلی نظام کے اعلیٰ عہدوں (hierarchy) میں سے کوئی عہدہ اس کے پاس ہے! عرب کے قبائلی معاشرے میں کسی شخصیت کے ''بڑے''

ہونے کا ایک معیار یہ بھی تھا کہ وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہو۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس زمانے میں مقدماتِ قتل کے فیصلے کرنے پر مامور تھے۔ یہ قبائلی نظام کا بہت بڑا اور انتہائی حساس نوعیت کا عہدہ تھا جس پر حضرت ابوبکرؓ اس زمانے میں فائز تھے۔ اس کے علاوہ آپؓ بہت بڑے تاجر اور سرمایہ دار بھی تھے۔ اس زمانے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سرمائے کی مالیت چالیس ہزار درہم کے لگ بھگ تھی۔ اس حوالے سے یہ حقیقت بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد آپؓ نے یہ سارا سرمایہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹا دیا اور جب آپؓ ہجرت کے لیے مدینہ روانہ ہوئے تو پیچھے گھر والوں کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔

بہرحال مشرکین مکہ بار بار یہ اعتراض کرتے تھے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے اس منصب کے لیے ان دو بڑے شہروں (مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑی شخصیت کو کیوں منتخب نہیں کیا: ﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ (الزخرف) ''اور کہنے لگے کہ کیوں نہیں اتارا گیا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی عظیم شخص پر؟'' اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ﴾ (الزخرف: ۳۲) ''کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ لوگ تقسیم کریں گے؟'' آیت زیر مطالعہ میں بھی حضور ﷺ کے خلاف اسی نوعیت کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خزانے کیا ان لوگوں کے قبضہ قدرت میں ہیں؟ اور کیا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے فیصلے کرنے میں ان لوگوں کی مرضی ومنشا کا پابند ہے؟

آیت ۳۸ ﴿اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ﴾ ''کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس کے ذریعے سے یہ آسمان کی خبریں سن لیتے ہیں؟''

﴿فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾ ''(اگر ایسا ہے) تو ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل لائے۔''

آیت ۳۹ ﴿اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ﴾ ''کیا اُس کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے؟''

آیت ۴۰ ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ ''کیا آپ ان لوگوں سے کوئی اجرت طلب کر رہے ہیں کہ یہ تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں؟''

یہاں پے درپے سوالات کا انداز خصوصی تاثیر کا حامل ہے۔ یہ مقام زورِ خطابت' فصاحت' بلاغت' ادبیت اور عذوبت کے حوالے سے گویا قرآن کی معراج ہے۔ ظاہر بات ہے ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے۔

آیت ۴۱ ﴿اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ ''کیا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہیں؟''

آیت ۴۲ ﴿اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ﴾ ''کیا یہ لوگ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ اصل میں تو یہ کافر خود ہی چال کا شکار ہو گئے ہیں۔''

یہ لوگ ایک منصوبہ بندی کے تحت ہمارے رسول ﷺ اور قرآن کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلا رہے ہیں تاکہ عوام ان سے متاثر نہ ہوں۔ لیکن ان کی یہ باتیں اس قدر بودی ہیں کہ خود ان کے اپنے دل بھی ان کو نہیں مانتے۔ ان کی سازشوں کو اللہ تعالیٰ اسی طرح ناکام کرتا رہتا ہے' جیسا کہ سورۃ الطارق میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ

كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾﴾ ''یہ لوگ تو اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اور میں اپنی تدبیر کر رہا ہوں۔''

آیت ۴۳ ﴿اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٤٣﴾﴾ ''کیا ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟ پاک ہے اللہ اس سے جو شرک یہ کر رہے ہیں۔''

آیت ۴۴ ﴿وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿٤٤﴾﴾ ''اور اگر کبھی یہ دیکھیں آسمان کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا تو کہیں گے کہ یہ تو بادل ہیں تہ بر تہ۔''

ان کی حالت تو یہ ہے کہ اگر آسمان کا کوئی ٹکڑا بھی عذابِ الٰہی بن کر ان پر گر رہا ہو تو اسے بھی یہ لوگ بارش برسانے والا بادل ہی سمجھیں گے۔ جیسا کہ قومِ عاد کے لوگوں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے عذاب کو دیکھ کر کہا تھا: ﴿هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ (الاحقاف: ٢٤) ''یہ تو بادل ہے جو ہم کو سیراب کرنے والا ہے''۔ یہ بادل برسیں گے تو ہمارے علاقے میں جل تھل کر دیں گے۔

آیت ۴۵ ﴿فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿٤٥﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) چھوڑے رکھیے ان کو یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس میں ان پر بجلی کی کڑک گرے گی۔''

''چھوڑ دینے'' کے مفہوم میں یہ حکم ابتدائی زمانے کی سورتوں میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ جیسے سورۃ المعارج میں فرمایا گیا: ﴿فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿٤٢﴾﴾ ''تو (اے پیغمبر ﷺ!) ان کو باطل میں پڑے رہنے اور کھیل لینے دو یہاں تک کہ جس دن کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ان کے سامنے آموجود ہو''۔ سورۃ القلم میں فرمایا گیا: ﴿فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٤﴾﴾ ''تو آپ مجھ کو اس کلام کے جھٹلانے والوں سے سمجھ لینے دیں۔ ہم ان کو آہستہ آہستہ ایسے طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی''۔ اس حکم کے تکرار کا مطلب یہی ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ ان لوگوں کے تمسخر، استہزاء اور دیگر مخالفانہ ہتھکنڈوں کو بالکل خاطر میں نہ لائیں اور تبلیغ و تذکیر کے حوالے سے اپنا مشن جاری رکھیں۔ ان لوگوں کے معاملے کو آپ مجھ پر چھوڑ دیں، ان سے میں خود نمٹ لوں گا۔

آیت ۴۶ ﴿يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٦﴾﴾ ''جس دن ان کی چالیں ان کے کسی کام نہ آسکیں گی اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ہی ہوگی۔''

ان کی ساری چالیں ناکام ہو جائیں گی اور کوئی مددگار ان کی مدد کو نہ پہنچ سکے گا۔

آیت ۴۷ ﴿وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٧﴾﴾ ''اور ان ظالموں کے لیے اُس (آخرت کے عذاب) کے علاوہ بھی ایک عذاب ہے لیکن ان کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔''

اس عذاب سے یا تو قحطِ مکہ کا عذاب مراد ہے جس کا ذکر سورۃ الدخان میں ہے اور یا پھر غزوۂ بدر کے دن کا عذاب جس دن مکہ کے ستر سردار مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

آیت ۴۸ ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ ''(اور اے نبی ﷺ) آپ اپنے ربّ کے فیصلے کا انتظار کیجیے۔''

ابتدائی مکی دور کی سورتوں میں یہ حکم بار بار آیا ہے۔ خصوصاً زیر مطالعہ گروپ کی سورتوں اور ۲۹ ویں پارے کی سورتوں میں تو فَاصْبِرْ یا وَاصْبِرْ کے صیغے کی بہت تکرار ملتی ہے۔ سورۃ النحل میں فرمایا گیا: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (آیت ۱۲۷) ''آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر تو اللہ ہی کے سہارے پر ہے''۔ سورۃ الاحقاف میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (آیت ۳۵) ''پس آپ بھی صبر کیجیے جیسے ہمارے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا تھا''۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کی زیادتیاں برداشت کیں۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ (آیت ۱۰) ''اور اس پر صبر کیجیے جو یہ لوگ آپ کے خلاف باتیں بنا رہے ہیں''۔ سورۃ المدثر میں فرمایا گیا: ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۞﴾ ''اور آپ اپنے رب کے لیے صبر کریں''۔ غرض ابتدائی مکی دور کی سورتوں میں رسول اللہ ﷺ کو براہِ راست مخاطب کر کے بار بار ہدایت کی جاتی رہی کہ آپ صبر کا دامن مضبوطی سے تھامیں رہیں۔ عربی میں ''صبر'' کے بعد اگر ''ل'' آ جائے جیسے کہ آیت زیر مطالعہ میں ہے' تو اس کے معنی انتظار کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ اسی مفہوم کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

﴿فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ ''بے شک آپ ہماری نگاہوں میں ہیں۔''

آپ مسلسل ہماری نظروں کے سامنے ہیں' ہم آپ کے حالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ہم آپ کی نگہبانی کر رہے ہیں' آپ کو آپ کے حال پر نہیں چھوڑ دیا۔ بالکل یہی مضمون سورۂ یونس کی آیت ۶۱ میں بھی آیا ہے:

﴿وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) نہیں ہوتے آپ کسی بھی کیفیت میں اور نہیں پڑھ رہے ہوتے آپ قرآن میں سے کچھ اور (اے مسلمانو!) تم نہیں کر رہے ہوتے کوئی بھی (اچھا) عمل مگر یہ کہ ہم تمہارے پاس موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔''

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۞﴾ ''اور آپ تسبیح کرتے رہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ جب آپ کھڑے ہوں۔''

اس بارے میں عام رائے یہی ہے کہ یہ حضور ﷺ کی تہجد کی نماز کی طرف اشارہ ہے' کیونکہ آغاز میں تو وہی ایک نماز تھی۔ جیسا کہ سورۃ المزمل کی ان آیات میں قیام اللیل کا ذکر ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۞ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۞ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۞ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۞﴾

''اے کپڑا اوڑھنے والے! رات کو قیام کیا کرو مگر (ساری رات نہیں بلکہ) کم۔ (یعنی) نصف رات یا اس سے کچھ کم کر لو۔ یا اس پر کچھ زیادہ کر لو' اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔''

آیت ۴۹ ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ﴾ ''اور رات کے ایک حصے میں بھی آپ اُس کی تسبیح کریں''

گویا تہجد کے علاوہ بھی رات کے مختلف حصوں میں حضور ﷺ کو تسبیح وتحمید کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔ ابتدائی دور کی ان سورتوں میں جن اوقات کو اللہ کے ذکر کے لیے مخصوص کرنے کے احکام دیے گئے ہیں' بعد میں جب پانچ اوقات کی نماز فرض ہوئی تو وہی اوقات مختلف نمازوں کے اوقات قرار پائے۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق مغرب اور عشاء کی نمازیں فرض ہوئیں' کیونکہ غروبِ آفتاب سے رات شروع ہو جاتی ہے اور عشاء کی نماز بھی رات کے ایک حصے میں ہی ادا کی جاتی ہے۔

﴿وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور ستاروں کے پیٹھ موڑتے وقت بھی (آپ تسبیح کیجیے)۔''

جب ستاروں کا قافلہ کوچ کرتا ہے تو صبح کی آمد آمد ہوتی ہے۔ اس سے صبح صادق کا وقت مراد ہے اور بعد میں اس وقت پر نمازِ فجر فرض ہوئی۔

سُوْرَۃُ النَّجم

تمہیدی کلمات

مکی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی تین سورتوں کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں۔ان میں سورۃ قٓ منفرد ہے جبکہ سورۃ الذاریات اور سورۃ الطّور جوڑے کی شکل میں ہیں۔ان میں سے سورۃ الذاریات میں انباء الرسل کے انداز میں مختلف پیغمبروں کا ذکر ہے‘ جبکہ سورۃ الطّور میں قیامت کے احوال‘ جنت‘ دوزخ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور قدرتوں کا ذکر ہے۔اس کے بعد سورۃ النجم اور سورۃ القمر بھی جوڑے کی صورت میں ہیں۔ان دونوں سورتوں میں بعض مضامین بہت مشکل ہیں۔ان دونوں کی باہمی مناسبت اور مشابہت ان کی آغاز کی آیات سے ظاہر ہوتی ہے۔سورۃ النجم کی پہلی آیت میں ستارے کے گرنے کا ذکر ہے‘ جبکہ سورۃ القمر کی پہلی آیت میں چاند کے پھٹنے کا حوالہ آیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

آیات ۱ تا ۱۸

وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی ۝۱ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ۝۲ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝۳ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝۴ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۝۵ ذُوْ مِرَّۃٍ ؕ فَاسْتَوٰی ۝۶ وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ۝۷ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝۸ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝۹ فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی ۝۱۰ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝۱۱ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ۝۱۲ وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَةً اُخْرٰی ۝۱۳ عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی ۝۱۴ عِنْدَھَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ۝۱۵ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ۝۱۶ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ۝۱۷ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ۝۱۸

آیت ۱ ﴿وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی ۝۱﴾ ’’قسم ہے ستارے کی جبکہ وہ گرتا ہے۔‘‘

ھَوٰی یَھْوِیْ ھَوِیًّا کا اصل معنی ہے اوپر سے نیچے گرنا۔ یہاں اس سے ستاروں کا اُفق سے غائب ہونا‘ ڈوب جانا یا فنا ہو جانا مراد ہو سکتا ہے۔(اس پر قدرے تفصیلی بحث سورۃ الواقعہ میں ’’مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ‘‘ کے ضمن میں آئے گی۔) اَلْھَوِیَّۃ گہرے کنویں کو اور ھَاوِیَۃ دوزخ کو کہا جاتا ہے۔جبکہ اسی مادہ سے ھَوِیَ یَھْوٰی ھَوًی کا معنی ہے خواہش کرنا۔یہ لفظ (الھوٰی) آگے آیت ۳ میں آ رہا ہے۔

آیت۲ ﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝۲﴾ ’’(اے لوگو!) تمہارے یہ ساتھی نہ تو بھٹکے ہیں اور نہ ہی بہکے ہیں۔‘‘

قرآن حکیم میں قسم بالعموم شہادت کے لیے آتی ہے۔ یہاں ستاروں کے غروب یا سقوط کی قسم کھا کر قریش کو مخاطب کر کے بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے یہ ساتھی (محمد رسول اللہ ﷺ) نہ تو غلط فہمی کی بنا پر راستہ سے بہکے ہیں اور نہ اپنے قصد واختیار سے جان بوجھ کر غلط راستے پر چلے ہیں۔

آیت۳ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳﴾ ’’اور یہ (جو کچھ کہہ رہے ہیں) اپنی خواہش نفس سے نہیں کہہ رہے ہیں۔‘‘

آیت۴ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴﴾ ’’یہ تو صرف وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔‘‘

اگلی آیات میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ذکر ہے جنہوں نے نبی مکرم ﷺ کو اس کلام کی تعلیم دی۔ یہ مضمون دوسری مرتبہ ۳۰ویں پارے کی سورۃ التکویر میں آیا ہے۔ دونوں عبارتوں میں ایک خوبصورت مماثلت یہ ہے کہ وہاں بھی حضور ﷺ کا ذکر صَاحِبُكُمْ کے لفظ سے کیا گیا ہے:

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲۲ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝۲۳ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝۲۴ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝۲۵﴾ (التکویر)

’’اور (مکے والو) تمہارے یہ رفیق دیوانے نہیں ہیں۔ بے شک انہوں نے اس (جبرائیل) کو کھلے اُفق پر دیکھا ہے۔ اور وہ غیب کے معاملے میں بخیل نہیں ہیں۔ اور یہ ہرگز کسی شیطان رجیم کا قول نہیں ہے۔‘‘

حضرت جبرائیل علیہ السلام جب وحی لے کر آتے تو وہ حضور ﷺ کو نظر نہیں آتے تھے اور نہ ہی وحی کو آپ اپنے کانوں سے سن سکتے تھے۔ فرشتے اور وحی دونوں کا تعلق چونکہ عالم امر سے ہے اس لیے ان کا نزول بھی آپؐ کی شخصیت کے اس حصے پر ہوتا تھا جو عالمِ امر سے متعلق تھا، یعنی آپؐ کی روحِ مبارک۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ انسانی روح کا مسکن چونکہ قلبِ انسانی ہے اس لیے وحی کا نزول براہِ راست حضور ﷺ کے قلب مبارک پر ہوتا تھا: ؎

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو ‏ ‏ رُوح سنے اور روح سنائے!

تاہم حضرت جبرائیل علیہ السلام کا حضور ﷺ کے پاس انسانی شکل میں آنا بھی ثابت ہے۔ روایات میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ حضرت جبرائیلؑ جب انسانی شکل میں آپؐ کے پاس آتے تو عموماً خوبصورت نوجوان صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آتے جو بہت عظیم انسان تھے۔ اس حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ انسانی شکل میں حضرت جبرائیلؑ کی حضور ﷺ سے جو گفتگو ہوتی وہ ’’وحی متلو‘‘ یعنی قرآن میں شامل نہیں ہے۔ مثلاً ’’حدیثِ جبریلؑ‘‘ میں حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ حضور ﷺ کے مکالمے کی تفصیل درج ہے۔ اس موقع پر حضرت جبرائیلؑ انسانی شکل میں حضور ﷺ کے پاس آئے اور آپؐ سے دین کے بارے میں چند بنیادی سوالات پوچھے۔ آپؐ نے ان سوالات کے جوابات دیے۔ ان کے چلے جانے کے بعد آپؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا کہ یہ جبرائیلؑ تھے جو تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔ اس حدیث کا مضمون اس قدر اہم ہے کہ

محدثین نے اسے ''اُمُّ السُّنَّۃ'' قرار دیا ہے' لیکن اس حدیث کے مندرجات قرآن میں شامل نہیں۔

البتہ حضور ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ کو دو مرتبہ ان کی اصلی شکل میں بھی دیکھا ہے۔ پہلی مرتبہ تو آپ ﷺ نے انہیں آغازِ نبوت کے زمانے میں دیکھا تھا۔ یہ واقعہ ''فترتِ وحی'' کے دنوں میں پیش آیا۔ (پہلی وحی کے بعد وحی کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے منقطع رہا' اس وقفے کو ''فترتِ وحی'' کہا جاتا ہے۔) ایک دن آپ ﷺ غارِ حرا سے اُتر رہے تھے تو آپؐ نے ایک آواز سنی ''یا محمد!'' آپؐ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ آپؐ نے سمجھا کہ شاید مجھے دھوکہ ہوا ہے' لیکن دوسرے ہی لمحے وہی آواز پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ بھی آپؐ کو جب کوئی انسان دکھائی نہ دیا تو آپؐ کو کچھ خوف محسوس ہوا۔ تیسری مرتبہ جب آپؐ نے پھر وہی آواز سنی تو آپؐ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اوپر دیکھنے سے آپؐ کو حضرت جبرائیلؑ اپنی اصلی ملکوتی شکل میں اس طرح نظر آئے کہ پورا اُفق بھرا ہوا تھا۔

دوسری مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ کو معراج کے موقع پر سدرۃ المنتہٰی کے قریب دیکھا۔ آئندہ آیات میں اسی مشاہدے کا ذکر ہے۔ حضرت جبرائیلؑ جب حضور ﷺ کو سفرِ معراج پر لے جانے کے لیے آئے تو وہ انسانی شکل میں تھے اور آپؐ کے لیے جو سواری (براق) وہ لے کر آئے تھے وہ بھی کوئی محسوس و مرئی قسم کی مخلوق تھی۔ لیکن جب آپؐ ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہٰی کے پاس پہنچے تو وہاں حضرت جبرائیلؑ اصل ملکوتی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس مقام پر انہوں نے آگے جانے سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں یہاں سے آگے بڑھوں گا تو میرے پَر جل جائیں گے: ؎

اگر یک سرِ مُوئے برتر قدم فروغِ تجلی بسوزد پرم

اس مضمون کے حوالے سے یہاں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی اصل ملکوتی شکل میں حضور ﷺ سے ملاقات کرانے اور پھر اس ملاقات کا قرآن مجید میں ذکر کرنے کا مقصد نزولِ وحی کے سلسلے کے درمیانی رابطے (link) کی سند فراہم کرنا ہے۔ اس نکتہ لطیف کو ''اصولِ حدیث'' کے حوالے سے سمجھنا چاہیے۔ محدثین نے احادیث کی صحت (authenticity) کی تحقیق کے لیے جو اصول وضع کیے ہیں ان میں ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ جس شخص کی کسی دوسری شخصیت سے روایت منقول ہے اس کی اس شخصیت سے شعور کی عمر اور شعور کی کیفیت میں ملاقات بھی ثابت ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسی ملاقات ثابت نہ ہو سکے تو متعلقہ راوی کی روایت قابلِ قبول نہیں سمجھی جاتی۔ مثلاً اگر ایک تابعیؒ کی کسی صحابیؓ سے کوئی روایت منقول ہے مگر حقائق ثابت کرتے ہیں کہ جب وہ صحابیؓ فوت ہوئے تو متعلقہ تابعی کی عمر صرف چھ سال تھی' یعنی اس وقت ان کی عمر ایسی نہ تھی کہ وہ بات کو سمجھ کر کسی دوسرے کو بتا سکتے' تو ایسی صورت میں متعلقہ تابعی کی وہ روایت محدثین کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ چنانچہ حدیث رسولؐ کی صحت (authenticity) کے لیے اگر متعلقہ راویوں کی ملاقات کا ثابت ہونا ضروری ہے تو ایسا ہی ثبوت اللہ تعالیٰ کی حدیث (اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سورۃ الزمر کی آیت ۲۳ میں اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ قرار دیا ہے) کی روایت کے حوالے سے بھی دستیاب ہونا چاہیے —— چنانچہ قرآن مجید کی روایت کی تصدیق و توثیق یوں ہوگی: قرآن کیا ہے؟ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ سے اس کا کلام کس نے سنا؟ جبرائیلؑ نے سنا۔ جبرائیلؑ سے کس نے سنا؟ جبرائیلؑ سے محمد (ﷺ) نے سنا۔ تو کیا جبرائیلؑ اور محمد (ﷺ) کی ملاقات ثابت ہے؟

جی ہاں! ان کے درمیان دو مرتبہ کی ملاقات قرآن سے ثابت ہے — چنانچہ وحی کی ''روایت'' کا درمیانی رابطہ (link) ثابت کرنے کے لیے حضور ﷺ کی حضرت جبرائیلؑ سے اصل ملکوتی شکل میں ملاقات کی ''سند'' انتہائی اہم ہے جو یہ آیات فراہم کر رہی ہیں۔

آیت ۵ ﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝﴾ ''انہیں سکھایا ہے اُس نے جو زبردست قوت والا ہے۔''

''شَدِيْدُ الْقُوٰى'' سے یہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں' یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ قرآن جبرائیلؑ نے سکھایا ہے جو زبردست قوت والا ہے۔

آیت ۶ ﴿ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝﴾ ''جو بڑا زور آور ہے۔ وہ سیدھا ہوا۔''

آیت ۷ ﴿وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝﴾ ''اور وہ افق اعلیٰ پر تھا۔''

یعنی حضور ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ کو افق پر اپنی اصلی شکل میں دیکھا۔

آیت ۸ ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝﴾ ''پھر وہ قریب آیا اور جھک پڑا۔''

آیت ۹ ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝﴾ ''بس دو کمانوں کے برابر (فاصلہ رہ گیا) یا اس سے بھی قریب۔''

آیت ۱۰ ﴿فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝﴾ ''پھر اُس نے وحی کی اللہ کے بندے کی طرف جو وحی کی۔''

''اَوْحٰى'' کا فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا: ''پس اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔''

جس وحی کا یہ ذکر ہے وہ ''وحیٔ رسالت'' تھی' جبکہ پہلی وحی جو سورۃ العلق کی ابتدائی آیات پر مشتمل تھی ''وحیٔ نبوت'' تھی۔ اس وحی سے حضور ﷺ کی نبوت کا ظہور ہوا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝﴾ ان پانچ آیات میں نہ تو آپؐ کو کوئی حکم دیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد کئی ماہ تک کوئی وحی نہیں آئی۔ اس عارضی وقفے کو ''فترتِ وحی'' کا دور کہا جاتا ہے۔ پھر ایک دن جب آپ ﷺ غارِ حرا سے واپس آ رہے تھے تو وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر آیات زیر مطالعہ میں ہو رہا ہے۔ یعنی آپؐ نے حضرت جبرائیلؑ کو ان کی اصل ملکی شکل میں اُفق پر دیکھا۔ اس منظر سے آپؐ خوفزدہ ہو گئے اور اسی گھبراہٹ کی حالت میں آپؐ گھر پہنچے۔ گھر پہنچتے ہی آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو کمبل اوڑھانے کا فرمایا۔ اس کیفیت میں جب آپؐ کمبل اوڑھے لیٹے تھے تو یہ وحی نازل ہوئی' جس میں آپؐ کو رسالت کی ذمہ داری سونپ دی گئی: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ (المدثر) ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے! اب کھڑے ہو جاؤ اور لوگوں کو خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی (کا اعلان) کرو!'' یعنی آپ ﷺ کی اس دعوت کا نقطۂ آغاز تو ''انذار'' ہے مگر دنیا میں اس کا ہدف ''تکبیر رب'' ہے۔ پس آپؐ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں' اس کی بڑائی منوائیں اور اس کی بڑائی کو نافذ کریں۔

آیت ۱۱ ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝﴾ ''جو کچھ انہوں نے دیکھا' ان کے دل و دماغ نے اسے جھٹلایا نہیں۔''

یعنی دل میں کسی قسم کا شک پیدا نہیں ہوا۔ یہ خیال نہیں آیا کہ یہ وہم ہو سکتا ہے یا خواب ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے' انسان جب کوئی غیر معمولی واقعہ یا انوکھا منظر دیکھتا ہے تو ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ع ''آنچہ می بینم بیداریست یارب یا بخواب!'' (اے اللہ! یہ جو میں دیکھ رہا ہوں یہ بیداری میں دیکھ رہا ہوں یا خواب میں!) لیکن اس واقعہ کے بارے میں حضور ﷺ کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ آپؐ کی آنکھوں نے جو دیکھا آپؐ کے دل نے اسے تسلیم کیا اور اس کی تصدیق کی۔ گویا اس انتہائی غیر معمولی واقعہ کے بارے میں آپ ﷺ کے دل اور آپؐ کی نگاہوں کے درمیان کوئی تضاد و اختلاف نہیں تھا۔

آیت ۱۲ ﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ⑫﴾ ''تو کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس چیز پر جسے وہ دیکھتا ہے!''

اس بارے میں جو تفصیل محمد (ﷺ) بیان کر رہے ہیں تم لوگ اس میں شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے ہو۔ لیکن وہ تو یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں اور وہ تم سے آنکھوں دیکھا واقعہ ہی بیان کر رہے ہیں۔ بقول اقبال : ع ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' کہ قلندر جو بھی بیان کرتا ہے اپنا مشاہدہ ہی بیان کرتا ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ⑬﴾ ''اور انہوں نے تو اس کو ایک مرتبہ اور بھی اُترتے دیکھا ہے۔''

یعنی حضور ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ کو دو مرتبہ اصلی شکل و صورت میں دیکھا ہے۔ دوسری مرتبہ کہاں دیکھا؟

آیت ۱۴ ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ⑭﴾ ''سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔''

یہ ساتویں آسمان پر وہ مقام ہے جس سے آگے کسی مخلوق کو جانے کی اجازت نہیں۔ اس انتہائی حد کی علامت بیری کا وہ درخت ہے جسے آیت میں ''سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس مقام کی کیفیت اور نوعیت ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ معراج کے موقع پر ''سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی'' پر حضرت جبرائیلؑ اپنی اصل ملکوتی شکل میں ظاہر ہوئے اور آگے جانے سے معذرت کر لی۔

آیت ۱۵ ﴿عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ⑮﴾ ''جنت الماویٰ بھی اس کے پاس ہی ہے۔''

''جنت الماویٰ'' سب سے اونچے درجے کی جنت ہے' جو ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے قریب ہے۔ قیامت کے دن اہلِ جنت کو جہاں ''نُزُل'' پیش کیا جائے گا وہ جنت تو زمین پر واقع ہو گی۔ اس کے بعد ان میں سے ہر شخص کے اپنے اپنے ایمان و خلوص کی گہرائی اور انفاقِ جان و مال کے تناسب کے حساب سے درجہ بدرجہ ترقی ہوتی جائے گی۔ حتیٰ کہ کچھ خوش قسمت لوگ جنت الماویٰ میں پہنچ جائیں گے۔

آیت ۱۶ ﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی ⑯﴾ ''جبکہ چھائے ہوئے تھا سدرہ پر جو چھائے ہوئے تھا۔''

یعنی تم انسانوں کو کیا بتایا جائے کہ اس بیری کے درخت کی اس وقت کیا کیفیت تھی۔ تم اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے ہو۔ وہ انوار و تجلیاتِ الٰہیہ کے نزول کی ایسی کیفیت تھی جو نہ تو کسی زبان سے ادا ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کے الفاظ اس کی تعبیر کر سکتے ہیں۔

آیت ۱۷ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ⑰﴾ ''(اُس وقت محمد ﷺ کی) آنکھ نہ تو کج ہوئی اور نہ ہی حد سے بڑھی۔''

یہاں پر دونوں انتہائی کیفیات کی نفی کر دی گئی۔ انسان کی فطری اور طبعی کمزوری ہے کہ اگر اسے اچانک بہت تیز روشنی کا سامنا کرنا پڑے تو وہ نظروں کو اس سے پھیرنے اور ہٹانے کی کوشش کرتا ہے یا پلک جھپک لیتا ہے۔ اس حوالے سے یہاں بتایا گیا کہ حضور ﷺ نے انوار و تجلیاتِ الٰہیہ کا کھلی آنکھوں سے براہِ راست مشاہدہ کیا اور نگاہ جما کر دیکھا۔ لیکن اس مشاہدے میں حد ادب سے تجاوز بھی نہیں کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کو اکثر و بیشتر لوگ سمجھ نہیں سکے۔ جبکہ میں نے اس کے مفہوم کو علامہ اقبال کے اس شعر کی مدد سے سمجھا ہے:

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہِ بے ادب!

یہ بالِ جبریل کی نظم ''ذوق و شوق'' کا شعر ہے۔ یہ نظم بلا شبہ علامہ اقبال کی شاعرانہ استعداد کی معراج ہے، اگرچہ اُمتِ مسلمہ کے لیے پیغام کے اعتبار سے ان کی آخری عمر (۱۹۳۶ء) کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' نقطۂ عروج کا درجہ رکھتی ہے۔ اس شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ میں وصال کے دوران ادب کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر محبوب کے حسن کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا مگر نظریں جما کر براہِ راست دیکھنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔ یہاں اقبال اپنی نظر کی ''بے ادبی'' کو خود تسلیم کر رہے ہیں اور حد ادب سے تجاوز کرنے کی شدید خواہش کا بھی اعتراف کر رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ اپنی معذوری کا بھی اعتراف کر رہے ہیں کہ ایسا کرنے کا حوصلہ ان میں نہیں تھا۔ گویا صرف وہ حوصلے کے فقدان کی وجہ سے ''بے ادبی'' کے ارتکاب سے بچے رہے۔ اب اس شعر میں پیش کیے گئے تصور کی روشنی میں غور کریں تو آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے تحمّل اور حوصلے کا یہ عالم تھا کہ آپؐ نے اُن انوار و تجلیات کو براہِ راست دیکھا اور جم کر مشاہدہ کیا۔ لیکن دوسری طرف آپؐ کے ضبط اور ''ادب'' کا کمال یہ تھا کہ ''حوصلہ'' ہوتے ہوئے بھی آپؐ کی طرف سے ایک خاص حد سے سرِ مو تجاوز نہ ہوا۔

آیت ۱۸ ﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝۱۸﴾ ''انہوں نے اپنے رب کی عظیم ترین آیات کو دیکھا۔''

معراج کے موقع پر حضور ﷺ کے مشاہدے سے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی دو آراء پائی جاتی ہیں۔ کچھ صحابہؓ کا خیال ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ کو دیکھا، جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ آپؐ نے اللہ کو نہیں دیکھا بلکہ انوارِ الٰہیہ کا مشاہدہ کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس بات کے قائل تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو یہاں تک فرمایا کرتی تھیں کہ ''جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا تھا وہ اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا افترا کرتا ہے''۔ صحیح مسلم (کتاب الایمان) میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے عبداللہ بن شقیقؒ کی دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک روایت میں حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: هَلْ رَاَيْتَ رَبَّكَ ''کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟'' حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: ((نُوْرٌ اَنّٰى اَرَاهُ؟)) ''ایک نور تھا، میں اسے کیسے دیکھتا؟'' دوسری روایت میں حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میرے اس سوال کا جواب آپ ﷺ نے یہ دیا کہ ((رَاَيْتُ نُوْرًا)) ''میں نے ایک نور دیکھا تھا''۔ علامہ ابن القیمؒ نے ''زاد المعاد'' میں رسول اللہ ﷺ کے پہلے ارشاد کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ''میرے اور رؤیت باری تعالیٰ کے درمیان نور حائل تھا''۔ جبکہ دوسرے ارشاد کا مطلب وہ یہ بیان کرتے

ہیں کہ ''میں نے اپنے رب کو نہیں بلکہ بس ایک نور دیکھا''۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے منسوب روایات میں رؤیتِ باری تعالیٰ کا اثبات ملتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ اس حوالے سے یہ واضح کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ کی عظیم آیات کا مشاہدہ کیا۔ چنانچہ یہ آیت اولی الذکر کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا مشاہدہ کیا نہ کہ خود اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں سفرِ معراج کے پہلے حصے (مسجد حرام تا مسجد اقصیٰ) کا ذکر ہوا' وہاں بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم اپنے بندے کو اس لیے لے گئے تھے ﴿لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا﴾ ''تاکہ اُس کو اپنی نشانیاں دکھائیں''۔ لیکن وہاں ''زمینی آیات'' کے مشاہدے کی بات ہوئی ہے' جبکہ ان آیات میں سفرِ معراج کے دوسرے مرحلے کے دوران سدرۃ المنتہیٰ کے مقام کی آیات و تجلیات کے مشاہدے کا ذکر ہے۔ یہ مقام کسی مخلوق کی رسائی کی آخری حد ہے۔ اس سے آگے ''حریم ذات'' ہے' جہاں کسی غیر کا کوئی دخل ممکن نہیں۔ اس مقام خاص اور اس آخری حد پر لے جا کر حضور ﷺ کو خاص الخاص آیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرایا گیا جنہیں آیت زیر مطالعہ میں ''آیات الکبریٰ'' کہا گیا ہے۔

آیات ۱۹ تا ۳۲

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝١٩ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝٢٠ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝٢١ تِلْكَ اِذًا
قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝٢٢ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَاۗءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ
سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ
الْهُدٰى ۝٢٣ۭ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ۝٢٤ۡ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ۝٢٥ۧ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا ع
تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـــًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْضٰى ۝٢٦ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰۗىِٕكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۝٢٧ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ
اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا ۝٢٨ۚ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ
يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝٢٩ۭ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ
سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ۝٣٠ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ
اَسَاۗءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۝٣١ۚ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ
وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝٣٢ ع

آیت ۱۹ ﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝١٩﴾ ''تو کیا تم لوگوں نے لات اور عُزّیٰ کے بارے میں غور کیا ہے؟''

اب یہاں سے مکی سورتوں کے عمومی مضامین کا آغاز ہو رہا ہے۔

آیت ۲۰ ﴿وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی﴾ ''اور جو تیسری ایک اور (دیوی) منات ہے؟''

یعنی کبھی تم لوگوں نے اپنی ان تین دیویوں کی حقیقت کے بارے میں بھی سوچا ہے؟

آیت ۲۱ ﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰی﴾ ''کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور اُس کے لیے بیٹیاں؟''

تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کو تم نے الاٹ بھی کی ہیں تو بیٹیاں!

آیت ۲۲ ﴿تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰی﴾ ''یہ تو بہت بھونڈی تقسیم ہے!''

آیت ۲۳ ﴿اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ﴾ ''یہ کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ کچھ نام ہیں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے''

﴿مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ ''اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اُتاری۔''

﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ﴾ ''یہ لوگ نہیں پیروی کر رہے مگر ظن و تخمین کی اور اپنی خواہشاتِ نفس کی۔''

یعنی ان لوگوں نے اپنی خواہشاتِ نفس اور wishful thinkings کو عقائد کی شکل دے دی ہے اور کچھ فرضی نام رکھ کر ان کی پوجا شروع کر دی ہے۔

﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰی﴾ ''جب کہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے الہدیٰ آچکا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب بھی نازل کی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی بھیجا ہے۔

آیت ۲۴ ﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی﴾ ''کیا انسان کو وہی کچھ مل جائے گا جس کی وہ آرزو کرتا ہے؟''

آیت ۲۵ ﴿فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰی﴾ ''پس آخرت اور دنیا' سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''

یعنی دنیا اور آخرت سے متعلق اختیارِ مطلق اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

آیت ۲۶ ﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا﴾ ''اور کتنے ہی فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت کسی کام نہیں آئے گی''

﴿اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰی﴾ ''مگر اس کے بعد کہ اللہ جس کے لیے چاہے اجازت بخشے اور (سفارش) پسند کرے۔''

آسمانوں کے فرشتے اہل ایمان کے لیے تو دعا کرتے ہیں: ﴿يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (المؤمن:۷) کہ پروردگار! تو اہل ایمان کی مغفرت فرما دے۔ لیکن ان مشرکین کے لیے نہ کوئی دعا کرے گا اور نہ ہی شفاعت۔

آیت ۲۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰی﴾ ''یہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہوں نے فرشتوں کے مؤنث نام رکھ دیے ہیں۔''

اور پھر اپنے خیال کے مطابق ان ہی ناموں پر انہوں نے اپنے لیے دیویاں گھڑ لی ہیں۔

آیت ۲۸ ﴿وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ﴾ ''اوران کے پاس اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ وہ نہیں پیروی کر رہے مگر صرف گمان کی۔''

یعنی فرشتوں کے مؤنث نام رکھنے اور پھر ان ناموں کے مطابق دیویاں بنا کر ان کی پوجا کرنے کے بارے میں ان کے پاس نہ تو کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ ہی اللہ کی اتاری ہوئی کسی کتاب سے کوئی سند۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ لوگ محض اپنے ظن و تخمین اور وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔

﴿وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۝۲۸﴾ ''اور ظن تو حق سے کچھ بھی مستغنی نہیں کر سکتا۔''

یعنی گمان کسی درجے میں بھی حق کا بدل نہیں ہو سکتا اور وہ حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا — حق یا تو وہ الہامی علم (revealed knowledge) ہے جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچایا ہے یا پھر انسان کا وہ اکتسابی علم (acquired knowledge) جو وہ اپنے حواس سے حاصل ہونے والی ٹھوس معلومات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر حاصل کرتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ، عِلْمُ الْاَدْيَانِ وَعِلْمُ الْاَبْدَانِ۔ (اس موضوع پر مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کی تشریح۔) اس کے علاوہ جن علوم کی بنیاد ظن و تخمین پر ہے، حق کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

آیت ۲۹ ﴿فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۲۹﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ اعراض کیجیے ہر اُس شخص سے جس نے روگردانی کی ہے ہمارے ذکر سے، اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے۔''

آپ ﷺ ہر ایسے شخص کو نظر انداز کر دیں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں جو صرف اور صرف دنیا کا طالب ہے اور اپنے اُس مطلوب کی دھن میں اس نے ہماری یاد سے پیٹھ موڑ لی ہے۔ ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا قانون اٹل ہے جس کی وضاحت سورۂ بنی اسرائیل کی ان آیات میں کر دی گئی ہے:

> ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝۱۸ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝۱۹﴾
>
> ''جو کوئی عاجلہ (دنیا) کا طلب گار بنتا ہے ہم اس کو جلدی دے دیتے ہیں اس میں سے جو کچھ ہم چاہتے ہیں، جس کے لیے چاہتے ہیں، پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لیے جہنم۔ وہ داخل ہوگا اس میں ملامت زدہ، دھتکارا ہوا۔ اور جو کوئی آخرت کا طلب گار ہو اور اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر افزائی کی جائے گی۔''

آیت ۳۰ ﴿ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ﴾ ''یہ ہے ان کے علم کی رسائی کی حد۔''

ان کے علم کی رسائی بس دنیا تک ہی ہے اور وہ اسی میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ علمِ آخرت ان کے چھوٹے اور

محدود ذہنوں کی پہنچ میں ہے ہی نہیں۔ حالانکہ انسان کا ذہنی ظرف ذرا بھی وسیع ہو تو وہ اپنے غور وفکر سے اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے اس کی زندگی اتنی بے وقعت نہیں ہو سکتی کہ اسے ''چار دن'' کی زندگی کا عنوان دے کر فضول خواہشات کی نذر کر دیا جائے۔ بقول بہادر شاہ ظفر: ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن دو آرزو میں کٹ گئے' دو انتظار میں!

بہرحال یہ بات عقل اور منطق ہی کے خلاف ہے کہ انسان جیسی اشرف المخلوقات اور مسجودِ ملائک ہستی کی زندگی محض تیس' چالیس یا پچاس برس کے دورانیے تک ہی محدود ہو۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کا فلسفہ بہت بصیرت افروز اور مبنی برحقیقت ہے۔ علامہ کے نزدیک انسانی زندگی وقت کے ایسے جاودانی تسلسل کا نام ہے جسے پیمانہ امروز و فردا سے ناپنا ممکن ہی نہیں: ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ۝﴾ ''یقیناً آپ (ﷺ) کا ربّ خوب جانتا ہے ان کو بھی جو اُس کی راہ سے بھٹک گئے ہیں اور وہ خوب جانتا ہے ان کو بھی جو ہدایت پر ہیں۔''

آیت ۳۱ ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ﴾ ''اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے''

آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا﴾ ''تاکہ وہ بدلہ دے ان کو جنہوں نے برائیاں کمائی ہیں ان کے اعمال کا''

﴿وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۝﴾ ''اور بدلہ دے ان کو جنہوں نے نیک کام کیے ہیں اچھا۔''

آیت ۳۲ ﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ﴾ ''وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی سے بچتے ہیں سوائے کچھ آلودگی کے۔''

یہاں پر لَمَم سے مراد صغائر ہیں[1]۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النساء آیت ۳۱ اور سورۃ الشوریٰ آیت ۳۷ میں بھی آ چکا ہے اور اب یہاں تیسری مرتبہ آیا ہے۔ مذکورہ آیات کے ضمن میں اس مضمون کے مختلف

(۱) عربی میں ''لَمَم'' کا لفظ کسی چیز کی تھوڑی سی مقدار' یا اس کے خفیف سے اثر' یا اُس کے محض قرب' یا اُس کے ذرا سی دیر رہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مفسرین نے ''لَمَم'' کی تفسیر میں کئی قول نقل کیے ہیں۔ بعض کے نزدیک گناہ کے جو خیالات دل میں آئیں مگر ان پر عمل نہ کیا جائے وہ ''لَمَم'' ہیں۔ بعض نے صغیرہ گناہ مراد لیے ہیں۔ بعض نے کہا کہ آدمی جس گناہ پر اصرار نہ کرے یا اُسے اپنی عادت نہ بنالے یا جس گناہ سے توبہ کر لے وہ مراد ہیں۔ بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آدمی عملاً کسی بڑے گناہ کے قریب تک پہنچ جائے مگر اس کا ارتکاب نہ کرے۔ (حاشیہ از مرتب)

پہلوؤں کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں بہت زیادہ متفکر بھی نہ ہوا جائے اور دوسروں سے درگزر سے بھی کام لیا جائے۔

یہاں اس حوالے سے میں آپ کی توجہ اس تلخ حقیقت کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں ہر شخص کسی نہ کسی دلیل کے ساتھ ایک دو کبائر کو اپنے لیے ''جائز'' قرار دے لیتا ہے (اِلا ماشاء اللہ)۔ فیکٹری کا مالک کہتا ہے کہ کیا کریں جی! سود کے بغیر تو ہمارے ملک میں کاروبار کا کوئی تصور ہی نہیں۔ اب مجبوری ہے' کیا کریں! فیکٹری بند کر کے تو نہیں بیٹھ سکتے نا۔ سرکاری ملازم کہتا ہے کہ سکولوں کی فیسیں' گھر کا کرایہ' یوٹیلٹی بلز کہاں سے ادا کروں؟ تنخواہ میں تو کسی طرح بھی گزارا ممکن نہیں۔ اب اگر رشوت نہیں لیں گے تو ظاہر ہے بھوکوں مریں گے! غرض ہر شخص نے اپنے ضمیر کے سامنے اپنی مجبوری کا رونا رو کر کبائر میں سے کم از کم ایک گناہ کو اپنا لیا ہے اور ضمیر کی تسلی کے لیے اپنی تمام تر ترجیحات صغائر سے ''پرہیز'' کی طرف منتقل کر دی ہیں۔ اس حوالے سے یہ لوگ صغائر سے متعلق مسائل بھی دریافت کرتے ہیں' پھر ان مسائل پر بحثیں بھی ہوتی ہیں اور ان کے بارے میں دوسروں پر اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں' بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑوں کی وجہ سے ''من دیگرم تو دیگری'' (میں اور ہوں' تم اور ہو) کے فتوے بھی صادر کیے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کوئی بھی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا (الا ماشاء اللہ!) کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ میں اس چند روزہ زندگی کی آسانیوں اور عیاشیوں کے بدلے اصل زندگی کو تو قربان نہ کروں۔ اگر ایک کام سے جائز طور پر گزارا نہیں ہوتا تو کوئی دوسرا کام کر لوں' یا اپنی ضروریات کو سکیڑ کر کم وسائل کے ساتھ زندگی بسر کر لوں' مگر حرام تو نہ کھاؤں!

﴿اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ﴾ ''یقیناً آپ کا ربّ بہت ہی وسیع مغفرت والا ہے۔''

اُس کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔ اہلِ ایمان بندے اگر کبائر و فواحش سے اجتناب کرتے رہیں تو وہ ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر گرفت نہیں کرے گا اور اپنی رحمت بے پایاں کی وجہ سے ان کو معاف فرما دے گا۔

﴿هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ﴾ ''وہ تمہیں خوب جانتا ہے' جبکہ اُس نے تمہیں زمین سے اٹھایا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں تھے۔''

﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾﴾ ''تو تم خود کو بہت پاکباز نہ ٹھہراؤ۔ وہ اسے خوب جانتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے۔''

یعنی اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو' وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعتاً متقی کون ہے۔ دراصل اپنی پرہیزگاری کا ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت اس شخص کو ہی محسوس ہوتی ہے جس کا دل ''تھوتھا چنا باجے گھنا'' کے مصداق تقویٰ سے خالی ہو۔ جہاں تقویٰ کی روح کو نظرانداز کیا جا رہا ہو گا وہاں سارا زور تقویٰ کے مظاہر پر ہو گا۔ اندر سے حرام خوری جاری ہو گی اور اس کو چھپانے کے لیے اوپر سے چھوٹی چھوٹی دینی علامات کو اپنا کر تقویٰ کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو گا۔

آیات ۳۳ تا ۶۲

اَفَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ تَوَلّٰىۙ۝ وَاَعۡطٰى قَلِيۡلًا وَّاَكۡدٰى۝ اَعِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡغَيۡبِ فَهُوَ يَرٰى۝ اَمۡ لَمۡ
يُنَبَّاۡ بِمَا فِىۡ صُحُفِ مُوۡسٰىۙ۝ وَاِبۡرٰهِيۡمَ الَّذِىۡ وَفّٰٓىۙ۝ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰىۙ۝ وَاَنۡ
لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰىۙ۝ وَاَنَّ سَعۡيَهٗ سَوۡفَ يُرٰى۝ ثُمَّ يُجۡزٰٮهُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰىۙ۝ وَاَنَّ
اِلٰى رَبِّكَ الۡمُنۡتَهٰىۙ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضۡحَكَ وَاَبۡكٰىۙ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحۡيَاۙ۝ وَاَنَّهٗ خَلَقَ
الزَّوۡجَيۡنِ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰىۙ۝ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اِذَا تُمۡنٰى۝ وَاَنَّ عَلَيۡهِ النَّشۡاَةَ الۡاُخۡرٰىۙ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ
اَغۡنٰى وَاَقۡنٰىۙ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعۡرٰىۙ۝ وَاَنَّهٗۤ اَهۡلَكَ عَادَا ۨالۡاُوۡلٰىۙ۝ وَثَمُوۡدَا۟ فَمَاۤ اَبۡقٰىۙ۝
وَقَوۡمَ نُوۡحٍ مِّنۡ قَبۡلُ‌ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا هُمۡ اَظۡلَمَ وَاَطۡغٰىؕ۝ وَالۡمُؤۡتَفِكَةَ اَهۡوٰىۙ۝ فَغَشّٰٮهَا مَا
غَشّٰىۚ۝ فَبِاَىِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى۝ هٰذَا نَذِيۡرٌ مِّنَ النُّذُرِ الۡاُوۡلٰى۝ اَزِفَتِ الۡاٰزِفَةُ‌ۚ۝ لَيۡسَ
لَهَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ‌ؕ۝ اَفَمِنۡ هٰذَا الۡحَدِيۡثِ تَعۡجَبُوۡنَۙ۝ وَتَضۡحَكُوۡنَ وَلَا تَبۡكُوۡنَۙ۝
وَاَنۡتُمۡ سٰمِدُوۡنَ۝ فَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ وَاعۡبُدُوۡا۝۩

آیت ۳۳ ﴿اَفَرَءَ يۡتَ الَّذِىۡ تَوَلّٰى ۝﴾ ”پھر (اے نبی ﷺ!) کیا آپ نے اُس شخص کو بھی دیکھا جس نے پیٹھ موڑ لی؟“

آیت ۳۴ ﴿وَاَعۡطٰى قَلِيۡلًا وَّاَكۡدٰى ۝﴾ ”تھوڑا سا دیا اور پھر سخت ہو گیا۔“

عام مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ان آیات میں ولید بن مغیرہ کا تذکرہ ہے۔ مجھے بھی اس رائے سے اتفاق ہے۔ تاریخ میں اس شخص کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر ایمان لانے کے قریب پہنچ چکا تھا‘ مگر پھر اچانک اسے اپنی چودھراہٹ یاد آ گئی۔ حق جوئی کی خواہش پر عصبیت کا جذبہ غالب آ گیا اور یوں اس نے اپنی سوچ دوبارہ بدل لی۔ یہاں اس کے اسی رویے کا ذکر ہے۔ سورۃ المدثر میں اس شخص کا تذکرہ قدرے تفصیل سے آیا ہے۔

آیت ۳۵ ﴿اَعِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡغَيۡبِ فَهُوَ يَرٰى ۝﴾ ”کیا اُس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے!“

آیت ۳۶ ﴿اَمۡ لَمۡ يُنَبَّاۡ بِمَا فِىۡ صُحُفِ مُوۡسٰى ۝﴾ ”کیا اسے خبر نہیں پہنچی اس بارے میں جو کچھ موسٰیؑ کے صحیفوں میں تھا؟“

آیت ۳۷ ﴿وَاِبۡرٰهِيۡمَ الَّذِىۡ وَفّٰٓى ۝﴾ ”اور ابراہیم کے (صحیفوں میں تھا) جس نے وفا کی انتہا کر دی!“

صحفِ ابراہیمؑ اور صحفِ موسٰیؑ کا ذکر سورۃ الاعلیٰ میں بھی آیا ہے: ﴿اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى ۝۱۸﴾

﴿صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ⑲﴾ ''یہی بات پہلے صحیفوں میں (مرقوم) ہے' (یعنی) ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں''۔ صحفِ موسیٰ تو عہد نامہ قدیم (Old Testament) کی پہلی پانچ کتابوں کی شکل میں آج بھی موجود ہیں' البتہ صحفِ ابراہیمؑ کے بارے میں کسی کو کچھ خبر نہیں۔ اس حوالے سے میرا گمان ہے (واللہ اعلم) کہ ہندوؤں کے اُپنشد صحفِ ابراہیمؑ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ (اس موضوع پر مزید تفصیل سورۂ طٰہٰ کی آیت ۹۸ کے تحت ملاحظہ ہو۔) حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں سے جس بات کا یہاں حوالہ دیا جا رہا ہے وہ یہ ہے:

آیت ۳۸ ﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ㊳﴾ ''کہ نہیں اٹھائے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے بوجھ کو۔''

قیامت کے دن ہر شخص اپنی ذمہ داریوں کے لیے خود جواب دہ ہوگا۔ وہاں کوئی کسی کی مدد کو نہیں آئے گا' جیسا کہ سورۂ مریم کی اس آیت میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ㊉﴾ کہ اُس دن ہر شخص اکیلا حاضر ہوگا۔ ماں باپ' اولاد' عزیز و اقارب میں سے کوئی اس کے ساتھ نہیں ہوگا۔

آیت ۳۹ ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ㊴﴾ ''اور یہ کہ انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی کچھ جس کی اُس نے سعی کی ہوگی۔''

انسان کو جو کچھ کرنا ہوگا اپنی محنت اور کوشش کے بل پر کرنا ہوگا' خواہشوں اور تمناؤں سے کچھ نہیں ہوگا۔ قبل ازیں آیت ۲۴ میں سوال کیا گیا تھا کہ ''کیا انسان کو وہی کچھ مل جائے گا جس کی وہ تمنا کرے گا؟'' یہ آیت گویا مذکورہ سوال کا جواب ہے۔

آیت ۴۰ ﴿وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ㊵﴾ ''اور یہ کہ اُس کی سعی عنقریب اسے دکھا دی جائے گی۔''

سورۃ الزلزال میں اس مضمون کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ⑦ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ⑧﴾ ''تو جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا' اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

آیت ۴۱ ﴿ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ㊶﴾ ''پھر اُس کو بدلہ دیا جائے گا پورا پورا بدلہ۔''

آیت ۴۲ ﴿وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ㊷﴾ ''اور یہ کہ بالآخر پہنچنا تمہارے رب ہی کی طرف ہے۔''

آیت ۴۳ ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ㊸﴾ ''اور یہ کہ وہی ہے جو ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی ہے۔''

یعنی اچھے برے حالات' خوشی' غم' تکلیف' بیماری سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔

آیت ۴۴ ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ㊹﴾ ''اور یہ کہ وہی ہے جو مارتا بھی ہے اور زندہ بھی رکھتا ہے۔''

آیت ۴۵' ۴۶ ﴿وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ㊺ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ㊻﴾ ''اور یہ کہ وہی ہے جس نے پیدا کیے ہیں جوڑے نر اور مادہ کے' ایک ہی بوند سے جبکہ وہ ٹپکائی جاتی ہے۔''

آیت ۴۷ ﴿وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ㊼﴾ ''اور یہ کہ اُسی کے ذمے ہے دوبارہ اٹھانا۔''

یہاں یہ نکتہ بہت اہم اور لائق توجہ ہے کہ انسانوں کو دوبارہ اٹھانا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ گویا انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے ان کا احتساب کرنا اللہ کے انصاف کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر وہ انسانوں کو دوبارہ نہیں اٹھاتا اور ان کو ان کے اچھے برے اعمال کا بدلہ نہیں دیتا تو نیکوکار لوگوں کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہو جائے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی بھی آزمائشوں اور مصیبتوں میں گزاری۔ ساری زندگی وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے رہے، حرام خوریوں سے بچنے کے لیے روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتے رہے۔ اگر انہیں ان کی محنتوں اور قربانیوں کا صلہ نہیں ملتا تو اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا؟

آیت ۴۸ ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿٤٨﴾﴾ ''اور یہ کہ اُسی نے دولت دی اور اسی نے خزانہ دیا۔''

اَقْنٰى چونکہ باب افعال سے ہے، جس کی خصوصیات میں ''سلب ماخذ'' بھی ہے، چنانچہ اس کا ترجمہ اَفْقَرَ بھی کیا گیا ہے۔ یعنی اُس نے کسی کو غنی اور کسی کو فقیر بنا دیا۔

آیت ۴۹ ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿٤٩﴾﴾ ''اور یہ کہ وہی شِعریٰ کا بھی ربّ ہے۔''

الشِّعریٰ وہ ستارہ تھا جس کی مختلف اقوام میں پوجا کی جاتی تھی۔ یہ ستارہ اس حیثیت سے اہل عرب کے ہاں بھی معروف تھا۔ اس لیے انہیں بتایا گیا کہ جسے تم لوگ الٰہ مانتے ہو اس کا رب بھی اللہ ہی ہے۔ تمہاری قسمت کے فیصلے یہ ستارہ نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

آیت ۵۰ ﴿وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ِۨ الْاُوْلٰى ﴿٥٠﴾﴾ ''اور یہ کہ اُسی نے ہلاک کیا تھا عادِ اولیٰ کو۔''

''عادِ اولیٰ'' سے مراد قدیم قومِ عاد ہے، جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث کیے گئے۔ یہ قوم اَحقاف کے علاقے میں آباد ہوئی۔ اس قوم پر جب عذاب بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو حضرت ہودؑ اپنے اہل ایمان ساتھیوں کے ہمراہ اس علاقے سے ہجرت کر گئے۔ ان لوگوں کی نسل سے جو قوم وجود میں آئی وہ ''ثمود'' کہلائی۔ لیکن وہ لوگ چونکہ قومِ عاد ہی کی نسل سے تھے اس لیے انہیں ''عادِ ثانیہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

آیت ۵۱ ﴿وَثَمُوْدَا۟ فَمَآ اَبْقٰى ﴿٥١﴾﴾ ''اور ثمود کو بھی، پس کسی کو باقی نہ چھوڑا۔''

آیت ۵۲ ﴿وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ﴾ ''اور قومِ نوحؑ کو بھی (ہلاک کیا) ان سے پہلے۔''

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ﴿٥٢﴾﴾ ''یقیناً وہ تو ان سے بڑھ کر ظالم اور ان سے بڑھ کر سرکش تھے۔''

آیت ۵۳ ﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿٥٣﴾﴾ ''اور (اُسی نے) الٹی ہوئی بستیوں کو پٹخ دیا۔''

اس سے سدوم اور عامورہ یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں مراد ہیں۔

آیت ۵۴ ﴿فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿٥٤﴾﴾ ''اور پھر اس کو ڈھانپ لیا جس چیز نے ڈھانپ لیا۔''

پہلے شدید زلزلے نے ان آبادیوں کو تلپٹ کیا اور اس کے بعد ان پر کنکروں کی بارش ہوئی۔ یہاں اس آیت میں اس بارش کی طرف اشارہ ہے یعنی کنکروں کی بارش نے اس علاقے کو ڈھانپ لیا۔

آیت ۵۵ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿٥٥﴾﴾ ''تو تم اپنے رب کی کون کون سی قدرتوں کے بارے میں شک کرو گے؟''

آیت ۵۶ ﴿هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى﴾ ''یہ (محمدﷺ) ایک خبردار کرنے والے ہیں' پہلے خبردار کرنے والوں (کے زمرے) میں سے۔''

نذیر کے معنی ہیں: ڈرانے والا' آگاہ کرنے والا' خبردار (warn) کرنے والا' اور النُّذُر اسی کی جمع ہے۔

آیت ۵۷ ﴿اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ﴾ ''قریب آچکی ہے وہ آنے والی۔''

آیت ۵۸ ﴿لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ﴾ ''نہیں ہے اس کو اللہ کے سوا کوئی کھولنے والا۔''

قیامت برپا کرنے کا اختیار صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔ گویا اس وقت قیامت کسی کشتی کی طرح ''لنگر انداز'' ہے' اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اس کا لنگر اٹھا کر اسے برپا کر دے گا۔ پھر یہ کہ اس کے وقوع کا علم بھی اللہ ہی کے پاس ہے۔ اللہ کے سوا کوئی کھول کر نہیں بتا سکتا کہ قیامت کب آئے گی۔ اور جب وہ وقت معین آجائے گا تو اللہ کے سوا کوئی اس کو ٹالنے اور دور کرنے پر قادر نہ ہو گا۔

آیت ۵۹ ﴿اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ﴾ ''تو کیا تم لوگوں کو اس کلام کے بارے میں تعجب ہو رہا ہے؟''

هٰذَا الْحَدِيْثِ سے مراد یہاں قرآن مجید ہے' یعنی کیا تم لوگ قرآن کے بارے میں تعجب کر رہے ہو؟

آیت ۶۰ ﴿وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ﴾ ''اور تم ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو!''

آیت ۶۱ ﴿وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ﴾ ''اور تم خوش فعلیاں کر رہے ہو!''

آیت ۶۲ ﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا﴾ ''پس سجدہ کرو اللہ کے لیے اور اُسی کی بندگی کرو!''

روایات میں آتا ہے کہ حضورﷺ نے پہلی مرتبہ یہ سورت حرمِ کعبہ میں قریش کے ایک بڑے مجمع کے سامنے تلاوت فرمائی تھی۔ اس مجمع میں اہل ایمان بھی تھے اور مشرکین کے خواص وعوام بھی۔ اس کلام کی شدتِ تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جب آپﷺ نے اسے سنانا شروع کیا تو مخالفین کو اس پر شور مچانے کی ہمت نہ ہوئی اور حضورﷺ نے جب یہ آخری آیت تلاوت فرمانے کے بعد سجدہ کیا تو آپؐ کے ساتھ مسلم و کافر سبھی سجدہ میں گر گئے۔ بعد میں مشرکین کو سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ ہم نے کیا کیا۔ آخر کار انہوں نے اپنے سجدے کے جواز میں یہ بات بتائی کہ ہم نے تو لات' عزیٰ اور منات کے ذکر (آیت ۱۹ اور ۲۰) کے بعد محمد (ﷺ) کی زبان سے یہ کلمات بھی سنے تھے: تلك الغرانِقة العُلٰى' وان شفاعتُهن لتُرجٰى (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں' اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے)۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کلمات سننے کے بعد ہم نے سمجھا کہ محمد (ﷺ) نے ہماری دیویوں کو بھی تسلیم کر لیا ہے' لہٰذا اب ان کے ساتھ ہمارا جھگڑا ختم ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس پوری سورت کے سیاق و سباق میں ان فقروں کی کوئی جگہ ممکن ہی نہیں جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے کانوں نے سنے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مشرکین کے سجدہ میں گر جانے کا واقعہ کلامِ الٰہی کی غیر معمولی تاثیر اور خصوصی طور پر اس سورت کے پُرجلال اندازِ خطابت کے باعث پیش آیا تھا۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ہم کلام اللہ کے ادبی جمال' اس کی

فصاحت و بلاغت کی لطافتوں اور خطابت کی چاشنی کا صحیح ادراک نہیں کر سکتے۔ مگر اس کے اوّلین مخاطبین تو اہلِ زبان تھے۔ پھر نزولِ قرآن کے زمانے کے عرب معاشرے میں سخن گوئی اور سخن فہمی کا مجموعی ذوق بھی عروج پر تھا۔ وہ لوگ قرآن مجید کے ادبی و لسانی محاسن کو خوب سمجھتے تھے' بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے شعراء' ادباء اور خطباء قرآن مجید کے اعجازِ بیان کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے اچھے کلام کی تاثیر سے تو کسی کو بھی انکار نہیں۔ خود حضورﷺ کا فرمان ہے: ((اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً))(۱) ''یقیناً بہت سے اشعار حکمت پر مبنی ہوتے ہیں''۔ نیز فرمایا: ((اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا)) (۲) ''یقیناً بہت سے خطبات جادو کی سی تاثیر رکھتے ہیں''۔ زورِ خطابت اور تاثیر کے اعتبار سے اگرچہ قرآن مجید کی ہر آیت ہی لاجواب ہے مگر سورۃ النجم اس حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کے تناظر میں مذکورہ واقعہ کی توجیہہ یہ ہے کہ جب حضورﷺ نے اس سورت کی تلاوت شروع کی تو تمام حاضرین مجمع دم بخود ہو کر سننے میں محو ہو گئے۔ حضورﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ ان کی روحوں کی گہرائیوں تک اترتا گیا۔ خصوصاً مشرکین کی کیفیت تو ایسی تھی کہ تلاوت کے اختتام تک وہ گویا مبہوت ہو چکے تھے۔ چنانچہ اختتامِ تلاوت پر جب حضورﷺ اور مجمع میں موجود اہلِ ایمان سجدہ میں گئے تو ﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ﴾ کے حکم کی تاثیر' ہیبت اور جلالت کی تاب نہ لاتے ہوئے سب کے سب مشرکین بھی بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ گویا وہ اسی طرح سجدے میں گرا دیے گئے (واللہ اعلم!) جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے ہوئے جادوگر سجدوں میں گرا دیے گئے تھے: ﴿وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝۱۲۰﴾ (الاعراف)۔ واضح رہے کہ سورۃ الاعراف کی اس آیت میں فعل مجہول (اُلْقِيَ) استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایسے لگا جیسے انہیں کسی نے پکڑ کر سجدے میں گرا دیا ہو۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب ما یجوز من الشعر والرجز والحداء ...... وسنن الترمذی' ابواب الادب' باب ما جاء ان من الشعر حکمۃ۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الطب' باب ان من البیان سحراً۔ وصحیح مسلم' کتاب الجمعۃ' باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ۔

سُوْرَةُ الْقَمَر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

آیات ۱ تا ۸

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۝ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ۝ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ۝ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ۝ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ۝ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ۭ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ۝

آیت ۱ ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ①﴾ ”قیامت کی گھڑی قریب آ چکی اور چاند شق ہو گیا۔“
جیسا کہ قبل ازیں بھی کئی بار ذکر ہو چکا ہے کہ قیامت کی نشانیوں میں سب سے قطعی اور یقینی نشانی حضور ﷺ کی بعثت ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ))[1] ”مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح (جڑا ہوا) بھیجا گیا ہے“۔ اس لحاظ سے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ کا مفہوم یہ ہے کہ اب جبکہ آخری رسولؐ بھی دنیا میں آ چکے ہیں تو سمجھ لو کہ قیامت کا وقت بہت قریب آ لگا ہے۔ سورۃ السجدۃ کی آیت ۵ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک دن ہمارے ہزار برس کے برابر ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حضور ﷺ کے وصال کو ابھی صرف ڈیڑھ دن ہی ہوا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اب قیامت بالکل سامنے ہے۔ حضرت اسرافیلؑ اپنے منہ کے ساتھ صور لگائے بالکل تیار کھڑے ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اشارے کی دیر ہے۔ جونہی اشارہ ہو گا وہ صور میں پھونک مار دیں گے۔ قربِ قیامت کے اس مفہوم کو سورۃ المعارج میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ⑥ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ⑦﴾ ”یہ لوگ تو قیامت کو بہت دُور سمجھ رہے ہیں، جبکہ ہم اسے بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔“

آیت میں چاند کے پھٹنے کا ذکر ایک خرقِ عادت واقعہ کے طور پر ہوا ہے۔ روایات کے مطابق اس وقت حضور ﷺ منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ چاند کی چودھویں رات تھی۔ آپؐ کے اردگرد ہر طرح کے لوگ تھے۔ کسی نے کہا کہ آپؐ کی طرف سے کوئی نشانی ہونی چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چاند کی طرف دیکھو۔ لوگوں کو متوجہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ بعثت انا والساعة کھاتین۔ ح:٦٥٠٤ و ٦٥٠٥۔ وصحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعة، باب قرب الساعة، ح:٨٦٧ و ٢٩٥١۔

کر کے آپ ﷺ نے انگلی کا اشارہ کیا اور چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں ٹکڑے قریب آ کر دوبارہ جڑ گئے۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: دیکھو اور گواہ رہو! کفار نے کہا کہ محمد (ﷺ) نے ہم پر جادو کر دیا تھا' اس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکہ کھایا۔ بعد میں باہر سے آنے والے لوگوں نے بھی اس کی شہادت دی۔ میرے نزدیک یہ معجزہ نہیں تھا بلکہ ایک ''خرقِ عادت'' واقعہ تھا۔ اس نکتے کی وضاحت اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کی جا چکی ہے کہ ہر رسول کو ایک معجزہ دیا گیا جو باقاعدہ دعوے کے ساتھ دکھایا گیا۔ اس لحاظ سے حضور ﷺ کا معجزہ قرآن ہے۔ البتہ خرقِ عادت واقعات حضور ﷺ سے بے شمار نقل ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے اگر اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے تو حضور ﷺ کی کرامات تو ہزار گنا بڑی ہوں گی۔

اس واقعہ پر بہت سے اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔ اس بنیاد پر بھی کہ اس سے متعلق دنیا میں کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ اسی لیے سر سید احمد خان مرحوم اور ان کے مکتبہ فکر کے لوگوں نے آیت کے متعلقہ الفاظ کی مختلف تاویلات کی ہیں۔ بہر حال جہاں تک تاریخی ثبوت نہ ہونے کا تعلق ہے اس بارے میں یہ حقیقت بھی مدِنظر رہنی چاہیے کہ یہ واقعہ رونما ہونے کے وقت آدھی دنیا میں تو دن کی روشنی ہو گی۔ لیکن جن علاقوں میں چاند دیکھا جا سکتا تھا ان علاقوں کے لوگ بھی تو ظاہر ہے اس وقت ٹکٹکی باندھے چاند کو نہیں دیکھ رہے تھے کہ ان میں سے اکثر اس واقعے کے عینی شاہد بن جاتے۔ پھر یہ منظر بھی صرف لمحے بھر کا تھا اور اس دوران چاند کی روشنی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا کہ لوگ چونک کر دیکھتے۔ البتہ ایک تاریخی روایت کے مطابق برصغیر میں مالابار کے ساحلی علاقے کے ایک ہندو راجہ نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بعد میں جب عرب تاجروں کے ذریعے اس تک اسلام کی دعوت اور قرآنی تعلیمات پہنچیں تو اس نے نہ صرف ایک چشم دید گواہ کے طور پر اس واقعہ کی تصدیق کی بلکہ وہ ایمان بھی لے آیا۔ واللہ اعلم!

آیت ۲ ﴿وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝﴾ ''اور اگر وہ دیکھیں گے کوئی نشانی تب بھی وہ اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔''

آیت ۳ ﴿وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ﴾ ''اور انہوں نے تکذیب کی اور اپنی خواہشات کی پیروی کی''

﴿وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝﴾ ''اور (اللہ کا) ہر امر ایک وقتِ معین کے لیے قرار پا چکا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی منصوبہ بندی میں ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ کوئی کام اللہ کے طے شدہ وقت سے نہ تو پہلے انجام پا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے مؤخر ہو سکتا ہے۔ انسان کا کام ہے کہ وہ کوشش کرتا رہے اور نتائج اللہ پر چھوڑ دے۔ جیسے یہ طے شدہ امر ہے کہ اللہ کے دین کا غلبہ دنیا میں ہو کر رہے گا' مگر اللہ کی مشیت میں اس کے لیے کون سا وقت مقرر ہے ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ ہم اقامتِ دین کی جدوجہد کو فرضِ عین اور اپنی اخروی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس میں اپنا تن من دھن لگانے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہیں۔ سیرتِ نبویؐ سے اس جدوجہد کے منہج کو سمجھیں' اس کے آداب سیکھیں' اس کی شرائط معلوم کریں

اور پورے خلوصِ نیت کے ساتھ اس کے لیے محنت کریں۔ اس محنت اور جدوجہد کے دوران ہمیں نتائج کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں تو یہ محنت اللہ کی رضا کے لیے کرنی ہے۔ اگر ہماری اس محنت کے نتائج ہماری زندگیوں میں ظاہر نہیں ہوتے تو کوئی پروا نہیں‘ ہم دین کو غالب کرنے کے مکلّف نہیں‘ ہم تو صرف اس کے لیے جدوجہد کرنے کے مکلّف ہیں۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اللہ کے ذمے ہے۔ اگر ہم نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق خلوصِ نیت سے اس راستے میں محنت کی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم ضرور سرخرو ہوں گے۔

اس فلسفے کو اچھی طرح سے نہ سمجھنے کی وجہ سے اقامت دین کی جدوجہد میں لوگ غلطیاں کرتے ہیں۔ جب ان کی جدوجہد کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آتے تو وہ عجلت اور بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے الٹے سیدھے طریقے اپناتے ہیں۔ ایسی ہی غلطیوں سے تحریکیں غلط راستوں پر چل پڑتی ہیں اور اس وجہ سے دین الٹا بدنام ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ایک بہت اہم نکتہ یہ بھی لائق توجہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے دوران غور وفکر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ حضور ﷺ کے بعد اب نہ تو کوئی شخصیت معصوم عن الخطا ہے اور نہ ہی کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست راہنمائی مل سکتی ہے۔ ظاہر ہے اب یہ کام اجتہاد اور غور وفکر سے ہی چلنا ہے اور اجتہاد میں غلطی کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ چنانچہ انفرادی و اجتماعی سطح پر انسانوں سے غلطیاں سرزد ہونے کے امکان کے پیش نظر فیصلوں پر نظر ثانی کی گنجائش بھی رکھنی چاہیے اور اس کے لیے ذہنی طور پر ہر وقت تیار بھی رہنا چاہیے۔

آیت ۴ ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝۴﴾ ”اور ان کے پاس وہ خبریں آ چکی ہیں جن میں تنبیہہ ہے۔“

گزشتہ اقوام کے اپنے پیغمبروں کو جھٹلانے اور پھر اس کے نتیجے میں عذابِ الٰہی کے ذریعے تباہ ہو جانے کی خبریں (انباء الرسل) ان لوگوں کو تفصیل سے بتائی جا چکی ہیں۔ ان خبروں میں مشرکین مکہ کے لیے یقیناً کافی تنبیہہ وتہدید اور سامانِ عبرت موجود ہے۔

آیت ۵ ﴿حِكْمَةٌ ۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵﴾ ”کامل دانائی (کی باتیں)‘ لیکن ان خبردار کرنے والوں سے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا۔“

آیت ۶ ﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ﴾ ”تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے صرفِ نظر کر لیجیے۔“

﴿يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝۶﴾ ”جس دن ایک پکارنے والا پکارے گا ایک بہت ناگوار چیز کی طرف۔“

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے‘ ابتدائی مکی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں حضور ﷺ کو ملتے جلتے الفاظ میں یہ ہدایت بار بار دی گئی ہے کہ آپؐ صبر کریں‘ آپؐ درگزر سے کام لیں‘ انہیں نظر انداز کر دیں‘ وغیرہ وغیرہ۔

آیت ۷ ﴿خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ﴾ ''(اس وقت) ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوں گی۔''

﴿یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝﴾ ''یہ اپنی قبروں سے ایسے نکل کر آئیں گے جیسے ٹڈی دَل پھیلا ہوا ہو۔''

ظاہر ہے ہزاروں سال سے انسان اس زمین میں دفن ہو رہے ہیں اور قیامت تک ان کی تعداد کتنی ہو جائے گی، ہم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری فوت ہونے والے انسان تک سب کے سب زمین سے نکل کر ایک ہی سمت دوڑے چلے جا رہے ہوں گے تو وہ ٹڈی دل کی طرح نظر آئیں گے۔

آیت ۸ ﴿مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ﴾ ''دوڑتے ہوئے آئیں گے پکارنے والے کی طرف۔''

﴿يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝﴾ ''کافر کہیں گے کہ یہ تو بڑا سخت دن ہے۔''

ہر شخص کو اپنی قبر سے اٹھتے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے ساتھ کیسا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ جیسا کہ سورۃ القیامہ میں فرمایا گیا: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝﴾ کہ ہر انسان اپنے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ ''من آنم کہ من دانم!'' چنانچہ کفار و مشرکین اپنی قبروں سے نکلتے ہی روزِ حشر کی سختیوں کے بارے میں چیخ و پکار شروع کر دیں گے۔

آیات ۹ تا ۱۷

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ۝ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

آیت ۹ ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ﴾ ''جھٹلایا تھا ان سے پہلے نوح کی قوم نے''

اب یہاں سے اس سورت میں انباء الرسل کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے، سورۃ النجم اور سورۃ القمر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سورۃ النجم میں ''تذکیر بآلاء اللہ'' (اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور نعمتوں کے ذریعے تذکیر) کا انداز تھا، جبکہ اس سورت میں ''تذکیر بایام اللہ'' اور انباء الرسل کا تذکرہ ہے۔ بالکل یہی تقسیم اور یہی انداز اس سے پہلے ہم سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف کے مطالعے کے دوران بھی دیکھ چکے ہیں۔ سورۃ الانعام میں آلاء اللہ کے ذریعے تذکیر کی گئی ہے، جبکہ سورۃ الاعراف میں انباء الرسل کا انداز ہے۔ اسی طرح یہ دونوں سورتیں بھی مل کر تذکیر و انذار کے دونوں پہلوؤں

کی تکمیل کرتی ہیں۔

﴿ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ⑨ ﴾ ''تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ تو مجنون ہے اور اسے جھڑک دیا گیا۔''

اس بدبخت قوم نے ہمارے جلیل القدر رسولؑ کو نہ صرف جھٹلا دیا بلکہ اس کے ساتھ اہانت آمیز سلوک روا رکھا۔

آیت ۱۰ ﴿ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ⑩ ﴾ ''تو اُس نے پکارا اپنے رب کو کہ میں مغلوب ہو چکا ہوں' اب تو اُن سے انتقام لے۔''

رسولوںؑ کی مدد کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے قانون کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت میں اس طرح آیا ہے: ﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ⑰ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ⑱ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ⑲ ﴾ ''اور ہماری یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے اپنے ان بندوں کے لیے جن کو ہم (رسول بنا کر) بھیجتے رہے ہیں' کہ ان کی لازماً مدد کی جائے گی۔ اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

آیت ۱۱ ﴿ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ⑪ ﴾ ''تو ہم نے کھول دیے آسمان کے دروازے اس پانی کے ساتھ جو مسلسل چھاجوں برستا رہا۔''

آیت ۱۲ ﴿ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا ﴾ ''اور ہم نے زمین کو پھاڑ کر چشمے ہی چشمے کر دیا''

اس وقت اس علاقے کی صورتِ حال یوں تھی کہ آسمان سے مسلسل موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور نیچے زمین سے جابجا چشمے اس طرح پھوٹ رہے تھے کہ زمین گویا چشموں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

﴿ فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ⑫ ﴾ ''تو وہ سارا پانی مل گیا ایک ایسے کام کے لیے جس کا فیصلہ ہو چکا تھا۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نافرمان قوم کو غرق کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے مطابق آسمان سے برسنے والے اور زمین سے پھوٹنے والے پانی نے مل کر ایک خوفناک سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔

آیت ۱۳ ﴿ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ⑬ ﴾ ''اور ہم نے اُسے سوار کر دیا اس (کشتی) پر جو تختوں اور کیلوں سے بنی تھی۔''

آیت ۱۴ ﴿ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ ﴾ ''جو چل رہی تھی ہماری نگاہوں کے سامنے۔''

وہ کشتی ہماری نگرانی اور حفاظت میں چل رہی تھی۔

﴿ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ⑭ ﴾ ''یہ بدلہ تھا اُس شخص کے لیے جس کی ناقدری کی گئی تھی۔''

یوں ہم نے اپنے بندے نوحؑ کی قدر افزائی فرمائی جس کی قوم نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کشتی کے ذریعے ہم نے اسے اور اس کے اہل ایمان ساتھیوں کو سیلاب سے محفوظ رکھا۔

آیت ۱۵ ﴿ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ⑮ ﴾ ''اور ہم نے اسے چھوڑ دیا ایک نشانی کے طور پر

تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا!‘‘

یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی مشیت الٰہی سے محفوظ کر لی گئی اور کسی وقت ایک بہت بڑی نشانی کے طور پر دنیا کی نظروں کے سامنے آ جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح زیر زمین دفن شدہ شدّاد کی جنت ارضی کے بارے میں اب دنیا جان چکی ہے یا بحیرۂ مردار کی تہہ میں قوم لوطؑ کے شہروں کے کھنڈرات دریافت کر لیے گئے ہیں۔

آیت ۱۶ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ⑯﴾ ’’تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا!‘‘

آیت ۱۷ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ⑰﴾ ’’اور ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے نصیحت اخذ کرنے کے لیے‘ تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا!‘‘

یہ اس سورت کی ترجیعی (بار بار دہرائی جانے والی) آیت ہے اور اس میں ایک چیلنج کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ مضمون کی اہمیت کے پیش نظر پوری سورت میں اس آیت کو چار مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اعلان کو پڑھ لینے یا سن لینے کے بعد ایک بندے پر گویا اتمامِ حجت ہو جاتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن کو سمجھنے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے استطاعت بھر کوشش شروع کر دے۔ خصوصی طور پر پڑھے لکھے خواتین وحضرات پر تو گویا فرض ہے کہ وہ عربی سیکھیں اور قرآن کے معانی ومفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ باقی علوم حاصل کر سکتے ہیں تو قرآن کا علم باقاعدہ حاصل نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔ آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس قدر اہم اور بنیادی فرض کے بارے میں لوگوں کو بتایا ہی نہیں جاتا۔ لیلۃ القدر میں نوافل پڑھنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے‘ مختلف اَذکار و وظائف کے ثواب کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے‘ لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق قرآن کے مطالب ومفاہیم کا سمجھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

عربی سیکھنے کے حوالے سے ہمارے لیے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ یہ ایک زندہ زبان ہے۔ دنیا کے ایک بہت بڑے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ آج کوئی بین الاقوامی فورم ایسا نہیں جہاں پر عربی ترجمہ پیش کرنے کا انتظام نہ ہو۔ ہم مسلمانوں کو اپنی الہامی کتاب کی زبان کو سیکھنے کے لیے یہودیوں اور ہندوؤں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اگر یہ قومیں اپنی مردہ زبانوں (عبرانی اور سنسکرت) کو زندہ کر سکتی ہیں تو ہم اپنی زندہ زبان کو کیوں نہیں سیکھ سکتے؟ بہرحال آج نوجوان نسل میں یہ احساس اجاگر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

آیات ۱۸ تا ۳۲

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ⑱ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ
نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ⑲ تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ⑳ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ
وَنُذُرِ ㉑ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ㉒ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ㉓ ع

فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ
مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۝ اِنَّا مُرْسِلُوا
النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ
مُّحْتَضَرٌ ۝ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ
مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

آیت ۱۸ ﴿كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۱۸﴾ ''جھٹلایا تھا قومِ عاد نے بھی' تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟''

آیت ۱۹ ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا﴾ ''ہم نے ان پر مسلط کر دی ایک تند و تیز ہوا''

﴿فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۝۱۹﴾ ''ایک مسلسل نحوست کے دن میں۔''

آیت ۲۰ ﴿تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۝۲۰﴾ ''وہ لوگوں کو یوں اُکھاڑ پھینکتی تھی جیسے وہ کھجور کے تنے ہوں اُکھڑی ہوئی جڑوں والے۔''

طویل القامت ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو کھجور کے تنوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ ہوا کے اس عذاب کی وجہ سے وہ مردہ حالت میں زمین پر ایسے پڑے تھے جیسے جڑوں سے اُکھڑے ہوئے کھجوروں کے تنے پڑے ہوں۔

آیت ۲۱ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۲۱﴾ ''تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟''

آیت ۲۲ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۲۲﴾ ''اور ہم نے اس قرآن کو آسان کر دیا ہے نصیحت حاصل کرنے کے لیے' تو ہے کوئی اس سے نصیحت حاصل کرنے والا!''

آیت ۲۳ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝۲۳﴾ ''قومِ ثمود نے بھی جھٹلایا خبردار کرنے والوں کو۔''

آیت ۲۴ ﴿فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ۙ﴾ ''انہوں نے کہا: کیا ہم اپنے میں سے ہی ایک بشر کی پیروی کریں؟''

﴿اِنَّاۤ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝۲۴﴾ ''پھر تو یقیناً ہم پڑ جائیں گے گمراہی میں اور آگ میں۔''

اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت اور پیروی کرنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے اپنے آپ کو خود ہی گمراہی میں اور آگ کے گڑھے میں ڈال دیا۔ سُعُر جمع ہے سَعِیْر کی اور سَعِیْر کے معنی آگ کے ہیں۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ گویا حضرت صالح علیہ السلام ہی کے الفاظ میں آپؑ کو جواب دے رہے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام ان سے کہتے تھے کہ تم لوگ اگر میری بات نہیں مانو گے تو آخرت میں جہنم کی آگ کا ایندھن بنو گے۔ جواب میں

وہ کہتے تھے کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو۔ اگر ہم تمہیں اپنا پیشوا مان کر تمہارے پیچھے چل پڑیں تو یہ گمراہی کا راستہ ہوگا اور ہمارے لیے اسی دنیا میں خود کو آگ میں جھونک دینے کے مترادف ہوگا۔

آیت ۲۵ ﴿ءَ اُلْقِیَ الذِّکْرُ عَلَیْهِ مِنْۢ بَیْنِنَا﴾ ''کیا یہ ذکر ہمارے مابین اسی پر القا کیا گیا ہے؟''

اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ سچ کہہ رہے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے وحی کے لیے آخر اسی شخص کا انتخاب کیوں کیا؟ اس منصب کے لیے اس کی نظر ہمارے کسی بڑے سردار پر کیوں نہیں پڑی؟

﴿بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾﴾ ''بلکہ یہ انتہائی جھوٹا اور شیخی خورا ہے۔''

لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے اور صرف اپنی بڑائی جتلانے اور شیخی بگھارنے کے لیے اس نے یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے۔

آیت ۲۶ ﴿سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾﴾ ''جلد ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون انتہائی جھوٹا اور شیخی خورا ہے!''

آیت ۲۷ ﴿اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾﴾ ''ہم بھیجے دیتے ہیں اونٹنی کو ان کی آزمائش کے لیے، تو آپؑ انتظار کیجیے ان کے بارے میں اور صبر کیجیے۔''

یہ خطاب حضرت صالح علیہ السلام سے ہے کہ ہم ان کے مطالبے کے مطابق اونٹنی بطور معجزہ ان کے سامنے لا رہے ہیں، جو ان کے لیے بہت بڑی آزمائش بن جائے گی۔ لیکن ابھی چونکہ ان کی مہلت باقی ہے اس لیے آپؑ صبر کے ساتھ ان کے بارے میں اللہ کے فیصلے کا انتظار کیجیے۔

آیت ۲۸ ﴿وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَیْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور انہیں بتا دیجیے کہ اب پانی ان کے مابین تقسیم ہوگا، ہر پینے کی باری پر حاضری ہوگی۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبے پر ایک چٹان سے حاملہ اونٹنی پیدا کر دی اور اس کا نام ناقۃُ اللّٰہ (اللہ کی اونٹنی) [الاعراف: ۷۳ اور ہود: ۶۴] رکھا۔ وہ اونٹنی جب چشمے پر پانی پینے کے لیے آتی تو اس کی ہیبت سے ان کے تمام مویشی بدک کر بھاگ جاتے تھے۔ بالآخر باہمی مشورے سے طے ہوا کہ ایک دن اونٹنی پانی پیئے گی اور دوسرے دن ان کے مال مویشی پانی پینے کے لیے آئیں گے۔ چنانچہ جب وہ دوسرے دن چشمے پر آتی تو چشمے کا سارا پانی پی جاتی۔

آیت ۲۹ ﴿فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾﴾ ''تو انہوں نے پکارا اپنے ایک ساتھی کو، پس اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی کونچیں کاٹ دیں۔''

انہوں نے اس اونٹنی سے جان چھڑانے کے لیے اپنی قوم کے ایک ایسے شخص کو تیار کیا جو ان میں سب سے زیادہ سخت دل تھا۔ اس بدبخت نے ناقۃ اللہ پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔

آیت ۳۰ ﴿فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ ﴿۳۰﴾﴾ ''پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟''

آیت ۳۱ ﴿اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ صَیۡحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوۡا كَهَشِیۡمِ الۡمُحۡتَظِرِ ۝۳۱﴾ ''ہم نے ان پر بس ایک ہی چنگھاڑ بھیجی تو وہ باڑھ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح چورا ہو کر رہ گئے۔''

اگر جانوروں کا کوئی بڑا سا گلہ کسی کھیت کی باڑھ کو روندتا ہوا گزر جائے تو وہ باڑھ چورا چورا ہو جاتی ہے' بالکل اسی طرح وہ نافرمان لوگ بھی چورا چورا ہو کر پڑے رہ گئے۔

آیت ۳۲ ﴿وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ ۝۳۲﴾ ''اور ہم نے تو اس قرآن کو آسان کر دیا ہے سمجھنے کے لیے' تو ہے کوئی سوچنے سمجھنے والا؟''

آیات ۳۳ تا ۴۲

كَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطٍۭ بِالنُّذُرِ ۝ اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ ؕ نَجَّیۡنٰهُمۡ بِسَحَرٍ ۝
نِّعۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِیۡ مَنۡ شَكَرَ ۝ وَلَقَدۡ اَنۡذَرَهُمۡ بَطۡشَتَنَا فَتَمَارَوۡا
بِالنُّذُرِ ۝ وَلَقَدۡ رَاوَدُوۡهُ عَنۡ ضَیۡفِهٖ فَطَمَسۡنَاۤ اَعۡیُنَهُمۡ فَذُوۡقُوۡا عَذَابِیۡ وَنُذُرِ ۝
وَلَقَدۡ صَبَّحَهُمۡ بُكۡرَةً عَذَابٌ مُّسۡتَقِرٌّ ۝ فَذُوۡقُوۡا عَذَابِیۡ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ
لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ ۝ وَلَقَدۡ جَآءَ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ النُّذُرُ ۝ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا كُلِّهَا ع ۱۸ ۹
فَاَخَذۡنٰهُمۡ اَخۡذَ عَزِیۡزٍ مُّقۡتَدِرٍ ۝

آیت ۳۳ ﴿كَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطٍۭ بِالنُّذُرِ ۝۳۳﴾ ''لوطؑ کی قوم نے بھی خبردار کرنے والوں کو جھٹلایا۔''

آیت ۳۴ ﴿اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ ؕ نَجَّیۡنٰهُمۡ بِسَحَرٍ ۝۳۴﴾ ''ہم نے ان پر بھیج دی ایک ایسی تیز آندھی جس میں پتھر تھے' سوائے لوط کے گھر والوں کے۔ ان کو ہم نے نجات دے دی صبح کے وقت۔''

آیت ۳۵ ﴿نِّعۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِیۡ مَنۡ شَكَرَ ۝۳۵﴾ ''وہ نعمت تھی ہمارے پاس سے۔ اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں اُس کو جو شکر کرتا ہے۔''

آیت ۳۶ ﴿وَلَقَدۡ اَنۡذَرَهُمۡ بَطۡشَتَنَا فَتَمَارَوۡا بِالنُّذُرِ ۝۳۶﴾ ''اور لوطؑ نے ان کو خبردار کر دیا تھا ہماری پکڑ سے' لیکن انہوں نے شک کیا ان چیزوں پر جن کے بارے میں انہیں خبردار کیا گیا تھا۔''

وہ ہماری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اڑاتے رہے۔

آیت ۳۷ ﴿وَلَقَدۡ رَاوَدُوۡهُ عَنۡ ضَیۡفِهٖ فَطَمَسۡنَاۤ اَعۡیُنَهُمۡ﴾ ''اور انہوں نے اس سے اس کے مہمانوں کو لے جانا چاہا تو ہم نے ان کی آنکھوں کو مٹا دیا۔''

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے بدکردار لوگ ان خوبصورت مہمان لڑکوں کو حاصل کرنا چاہتے تھے جو اصل میں فرشتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اندھا کر دیا۔ بائبل میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے کہ ان میں

سے ایک فرشتے نے ان لوگوں کی طرف اپنا ہاتھ پھیلایا تو وہ سب کے سب اندھے ہو گئے۔

﴿فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ﴾ ''تو مزا چکھو اب میرے عذاب کا اور میرے خبردار کرنے کا۔''

آیت ۳۸ ﴿وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ﴾ ''اور ان پر صبح ہی صبح آ دھمکا ایک عذاب جو کہ ٹھہر چکا تھا۔''

آیت ۳۹ ﴿فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ﴾ ''تو چکھو مزا اب میرے عذاب کا اور میرے خبردار کرنے کا۔''

آیت ۴۰ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ ''اور ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن سمجھنے کو' تو ہے کوئی سوچنے سمجھنے والا؟''

یہ آیت یہاں چوتھی اور آخری مرتبہ آئی ہے۔

آیت ۴۱ ﴿وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ﴾ ''اسی طرح قومِ فرعون کے پاس بھی آئے تھے خبردار کرنے والے۔''

آیت ۴۲ ﴿كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا﴾ ''انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلا دیا''

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ میں ان نشانیوں کی تعداد نو (۹) بتائی گئی ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ﴾ ''اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں دیں''۔ ان میں دو نشانیاں تو آپؑ کو ابتدا میں عطا ہوئی تھیں یعنی عصا کا اژدھا بن جانا اور ہاتھ کا چمکدار ہو جانا۔ جبکہ سات نشانیاں وہ تھیں جن کا ذکر سورۃ الاعراف کے سولہویں رکوع میں آیا ہے۔ یہ نشانیاں قومِ فرعون پر وقتاً فوقتاً عذاب کی صورت میں نازل ہوتی رہیں۔

﴿فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ ''پھر ہم نے انہیں پکڑا' ایک زبردست' صاحبِ قدرت کا پکڑنا۔'' یعنی یہ کوئی معمولی اور کمزور پکڑ نہیں تھی کہ اس سے کوئی نکل بھاگتا' بلکہ اُس اللہ کی پکڑ تھی جو زبردست طاقت کا مالک ہے اور کائنات کے ہر معاملے میں اسے پوری قدرت حاصل ہے۔

ان پیغمبروں اور ان کی نافرمان قوموں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد اب روئے سخن حضور ﷺ اور کفارِ مکہ کی طرف پھیرا جا رہا ہے۔

آیات ۴۳ تا ۵۵

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۚ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۝ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ۝ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ۭ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۝

وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ ع

آیت ۴۳ ﴿اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ﴾ ''(تو اے قریش!) کیا تمہارے کفار اُن (کفار) سے کچھ بہتر ہیں؟''

زمانہ سابق میں جن قوموں نے کفر کی روش اختیار کی ان کے انجام سے متعلق تمام تفصیلات تم لوگ جان چکے ہو۔ اب ذرا سوچو کہ تم میں سے جو لوگ ہمارے رسول ﷺ کا انکار کر کے کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں' کیا وہ کسی خاص خوبی کے حامل ہیں کہ گزشتہ کافر اقوام کی طرح ان پر عذاب نہیں آئے گا؟

﴿اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۝﴾ ''یا تمہارے لیے سابقہ الہامی کتب میں کوئی فارغ خطی آ چکی ہے؟''

تم میں آخر کیا خوبی ہے کہ جس تکذیب اور ہٹ دھرمی کی روش پر پچھلی قوموں کو سزا دی گئی ہے وہی روش تم اختیار کرو تو تمہیں سزا نہ دی جائے؟ کیا تمہارے لیے آسمانی صحیفوں میں کوئی براءت نامہ لکھا ہوا ہے کہ تم پر عذاب نہیں آئے گا؟

آیت ۴۴ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۝﴾ ''یا یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک طاقتور جمعیت ہیں اور بدلہ لینے پر قادر ہیں؟''

آیت ۴۵ ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝﴾ ''عنقریب ان کی جمعیت شکست کھا جائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔''

یہ پیشین گوئی جو ہجرت سے پانچ سال پہلے کر دی گئی تھی' میدانِ بدر میں حرف بحرف پوری ہوئی۔ روایات میں آتا ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلی رات میں حضور ﷺ نے سجدے کی حالت میں رو رو کر دعا کی۔ آپ کا یہ سجدہ بہت طویل تھا اور دعا بھی بہت طویل تھی۔ آپؐ کی اس دعا کا لُبِ لُباب یہ تھا کہ اے اللہ! میں نے اپنی پندرہ سال کی کمائی لا کر اس میدان میں ڈال دی ہے۔ میں آخری رسول ہوں' میرے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔ اے اللہ! اس معرکے میں اگر یہ لوگ ہلاک ہو گئے تو پھر قیامت تک اس زمین پر تیری بندگی کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس رات آپ ﷺ کے عریشے پر پہرے کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مامور تھے' وہ سجدے میں آپؐ کی کیفیت کا مشاہدہ کر رہے تھے اور دعا کے رقت آمیز الفاظ سن رہے تھے۔ اس دوران ایک موقع ایسا بھی آیا جب حضرت ابوبکرؓ سے رہا نہ گیا اور وہ پکار اُٹھے: حَسْبُكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ...... کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اب بس کر دیجیے۔ پھر جب حضور ﷺ نے سجدے سے سر مبارک اٹھایا تو آپؐ کی زبان مبارک پر یہی الفاظ تھے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝﴾ کہ یہ لوگ اپنی طرف سے بہت بڑا لشکر لے کر آئے ہیں۔ ان کا یہ لشکر یہاں شکست سے دوچار ہوگا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ (۱)

(۱) صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قولہ ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝﴾' ومتعدد مقامات' ح:۳۹۵۳' ۲۹۱۵' ۴۸۷۷۔

آیت ۴۶ ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوۡعِدُهُمۡ وَالسَّاعَةُ اَدۡهٰی وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾﴾ ''بلکہ ان کے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور قیامت بہت بڑی آفت ہے اور بہت زیادہ کڑوی ہے۔''

عربی میں کڑوی چیز کو مُرٌّ کہتے ہیں اور اَمَرُّ کے معنی ہیں بہت ہی زیادہ کڑوی۔ سیاقِ مضمون میں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں پے در پے شکست مشرکین عرب کا مقدر ہے۔ عنقریب (۹ ہجری میں) ان پر ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب جزیرہ نمائے عرب کی سرزمین ان پر تنگ ہو جائے گی۔ اس وقت ان کے پاس اسلام قبول کرنے یا حدودِ عرب سے باہر چلے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ ایک مضبوط جمعیت اور اعلیٰ پائے کی جنگی صلاحیت کے باوجود ان کی یہ ہزیمتیں' نقصانِ مال و جان اور ذلت و رسوائی اللہ کے عذاب ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن یہ تو چھوٹے چھوٹے عذاب ہیں اور دنیا کی زندگی کی حد تک عارضی نوعیت کی تکالیف ہیں۔ جبکہ انہیں بہت بڑے اور دائمی عذاب کا سامنا تو آخرت میں کرنا پڑے گا۔

آیت ۴۷ ﴿اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۴۷﴾﴾ ''یقیناً یہ مجرمین گمراہی میں ہیں اور یہ آگ (کے مختلف طبقات) میں ہوں گے۔''

آیت ۴۸ ﴿یَوۡمَ یُسۡحَبُوۡنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوۡهِهِمۡ ؕ﴾ ''جس دن یہ گھسیٹے جائیں گے آگ میں اپنے چہروں کے بل۔''

﴿ذُوۡقُوۡا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾﴾ ''(ان سے کہا جائے گا:) اب چکھو آگ کی لپٹ کا مزا!''

آیت ۴۹ ﴿اِنَّا کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾﴾ ''یقیناً ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔''

آیت ۵۰ ﴿وَمَاۤ اَمۡرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمۡحٍۭ بِالۡبَصَرِ ﴿۵۰﴾﴾ ''اور ہمارا امر تو یکبارگی ہوتا ہے' جیسے نگاہ کا لپک جانا۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کا امر یک دفعہ پلک جھپکنے کی طرح پورا ہوتا ہے۔ اللہ کے امر کی یہ وہی شان ہے جو قرآن میں جگہ جگہ ''کُن فَیکون'' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی وہ جب کسی چیز کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ اس کی مشیت کے مطابق اُسی وقت ہو جاتی ہے۔

آیت ۵۱ ﴿وَلَقَدۡ اَهۡلَکۡنَاۤ اَشۡیَاعَکُمۡ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ﴿۵۱﴾﴾ ''تو (اے قریشِ مکّہ) ہم نے تم جیسے بہت سے لوگوں کو ہلاک کیا ہے' تو کوئی ہے اس سے سبق حاصل کرنے والا؟''

تمہاری تذکیر اور یاددہانی کے لیے قرآن حکیم میں سابقہ اقوام کے انجام کی عبرت انگیز تفاصیل بار بار بیان کی گئی ہیں۔ تاریخی حوالوں سے بھی ان اقوام کے حالات سے تم لوگ اچھی طرح واقف ہو۔ اب تم لوگ چاہو تو ان کے انجام سے سبق حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ بے شمار آیات آفاقی و انفسی بھی تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم لوگ کبھی ان آیات کا مشاہدہ دل کی آنکھ سے کرو تو وہ بھی تمہاری ہدایت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

آیت ۵۲ ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ﴿۵۲﴾﴾ ''اور وہ تمام اعمال جو ان لوگوں نے کیے ہیں وہ صحیفوں میں محفوظ ہیں۔''

آیت ۵۳ ﴿وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ﴿۵۳﴾﴾ ''اور ہر ایک چھوٹی اور بڑی چیز لکھی ہوئی ہے۔''

قیامت کے دن یہ لوگ اپنے اعمال ناموں میں اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کا اندراج دیکھ کر حیران و ششدر رہ جائیں گے۔ سورۃ الکہف کی یہ آیت اس منظر کا نقشہ دکھاتی ہے جب سرِ محشر ان مجرمین کے سامنے ان کے اعمال نامے کھولے جائیں گے:

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴿۴۹﴾﴾

''اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہوگا اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو' مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔ اور وہ اسے موجود پائیں گے جو عمل بھی انہوں نے کیا ہوگا۔ اور آپ کا رب ظلم نہیں کرے گا کسی پر بھی۔''

آیت ۵۴ ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ﴿۵۴﴾﴾ ''یقیناً متقین باغات اور نہروں (کے ماحول) میں ہوں گے۔''

یہ مقام ان خوش نصیب لوگوں کو عطا ہوگا جو اپنی دنیا کی زندگی میں اللہ سے ڈرنے والے' آخرت کے خیال سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہنے والے' اللہ کے احکام کی پابندی کرنے والے' اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے والے اور اس حوالے سے پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے تھے۔

آیت ۵۵ ﴿فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴿۵۵﴾﴾ ''بہت اعلیٰ راستی کے مقام میں اُس بادشاہ کے پاس جو اقتدارِ مطلق کا مالک ہے۔''

ان خوش قسمت لوگوں کے مقام و مرتبہ کا ذکر ایسے ہی الفاظ کے ساتھ سورۂ یونس کی اس آیت میں بھی ہوا ہے: ﴿اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ﴾ (آیت ۲) ''ان کے لیے ان کے رب کے پاس بہت اونچا مرتبہ ہے''۔ یعنی ان لوگوں کو آخرت میں شہنشاہِ ارض و سما کا خصوصی قرب حاصل ہوگا۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! آمین یاربَّ العالمین!!

سُوْرَۃُ الرَّحْمٰن

تمہیدی کلمات

قبل ازیں سورۂ قٓ کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ زیر مطالعہ سات مکی سورتوں میں سے سورۂ قٓ منفرد ہے جبکہ باقی چھ سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ پہلا جوڑا سورۃ الذاریات اور سورۃ الطّور کا ہے' دوسرا سورۃ النجم اور سورۃ القمر کا اور تیسرا سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا۔ چنانچہ اب ہم ان میں سے تیسرے جوڑے کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں سورتیں (سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ) اس لحاظ سے پورے قرآن میں منفرد ہیں کہ ان میں نبوت' رسالت اور وحی کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ پھر سورۃ الرحمٰن پورے قرآن میں واحد ایسی سورت ہے جس میں جنّوں اور انسانوں سے مسلسل اور متوازی خطاب ہو رہا ہے۔

اس حوالے سے ضمنی طور پر یہاں ایک یہ نکتہ بھی سمجھ لیں کہ جنوں کے ہاں نبوت اور وحی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ''عالمِ خلق'' (دنیا) میں وحی الٰہی کے نزول کی متحمل صرف ''روح'' ہو سکتی ہے اور روح اللہ تعالیٰ نے صرف انسانوں کو عطا کی ہے۔ جنوں میں روح نہیں ہوتی۔ اس لیے جِنّات ان ہی انبیاء و رسل کے پیروکار رہے ہیں جو انسانوں کی طرف مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ان میں اہلِ ایمان اور کافر جن بھی ہیں اور نیک و بد بھی۔ سورۃ الاحقاف میں ہم جنات کی ایک جماعت کا ذکر پڑھ آئے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کے ماننے والے تھے۔ وہ حضور ﷺ سے قرآن سن کر ایمان لائے اور پھر انہوں نے ایمان وقرآن کی دعوت اپنی قوم تک بھی پہنچائی۔ بہرحال سورۃ الرحمٰن اس حوالے سے پورے قرآن میں منفرد سورت ہے کہ اس میں جنوں اور انسانوں سے خطاب کے لیے بار بار تثنیہ کا صیغہ آیا ہے' بلکہ خصوصی طور پر یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کے الفاظ میں بھی خطاب ہوا ہے۔ اس طرح اس سورت میں تخصیص کے ساتھ واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ان دونوں نسلوں کے افراد ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید میں جہاں کہیں یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کے الفاظ میں خطاب کیا گیا ہے اس سے مراد اگرچہ نوعِ انسانی ہے لیکن اس صیغہ تخاطب میں جنوں کو انسانوں کے تابع سمجھا جائے گا' چنانچہ ایسے ہر خطاب میں انسانوں کے ساتھ جن بھی مخاطب ہیں۔

سورۃ الرحمٰن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دو دو جنتوں کا دو مرتبہ تذکرہ ہے اور سورۃ الواقعہ میں بھی ایسا ہی ہے۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین کی ترتیب میں ایک انوکھی اور عجیب مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس ترتیب کو معکوس ترتیب یا mirror image کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک سورۃ کے مضامین جس ترتیب سے آئے ہیں دوسری سورت میں وہی مضامین اس کے برعکس ترتیب میں ہیں۔ آج کل بعض لوگ جڑواں گھر اس طرح بناتے ہیں کہ دونوں کا نقشہ ایک جیسا ہوتا ہے لیکن ایک گھر میں کمروں وغیرہ کی location کی ترتیب

دوسرے کی ترتیب کے برعکس ہوتی ہے۔ اس طرح ایک گھر دوسرے گھر کا mirror image محسوس ہوتا ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین اوران مضامین کی ترتیب میں گہری مناسبت پائی جاتی ہے۔

سورۃ الرحمٰن کی ترجیعی آیت ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ ہے جو اس سورت میں ۳۱ مرتبہ آئی ہے' جبکہ اس سورت کی کُل آیات ۷۸ ہیں۔ آیات کی ترجیع کا اسلوب اگرچہ قبل ازیں ہم سورۃ الشعراء اور سورۃ القمر میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ سورۃ الشعراء میں یہ دو آیات آٹھ بار دہرائی گئی ہیں: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝﴾ جبکہ سورۃ القمر میں ان دو آیات کی تکرار چار مرتبہ آئی ہے: ﴿فَکَیْفَ کَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ ۝﴾۔ بہرحال یہ خاص اسلوب سورۃ الرحمٰن میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

آیات ۱ تا ۲۵

اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ ۝۴ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ
بِحُسْبَانٍ ۝۵ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ۝۶ وَالسَّمَآءَ رَفَعَھَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ ۝۷ اَلَّا تَطْغَوْا
فِی الْمِیْزَانِ ۝۸ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۝۹ وَالْاَرْضَ وَضَعَھَا
لِلْاَنَامِ ۝۱۰ فِیْھَا فَاکِھَۃٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَکْمَامِ ۝۱۱ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ ۝۱۲
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝۱۳ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ ۝۱۴ وَخَلَقَ الْجَآنَّ
مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝۱۵ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝۱۶ رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ ۝۱۷
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝۱۸ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ۝۱۹ بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ۝۲۰ فَبِاَیِّ
اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝۲۱ یَخْرُجُ مِنْھُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝۲۲ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝۲۳
وَلَہُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ ۝۲۴ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝۲۵ ع

آیت ۱ ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝۱﴾ ''رحمٰن نے''

آیت ۲ ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲﴾ ''قرآن سکھایا۔''

رحمٰن' اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے۔ اس کا مادہ ''رحم'' ہے اور یہ فَعلان کے وزن پر ہے۔ اس وزن پر جو الفاظ آتے ہیں ان کے مفہوم میں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دو مرتبہ (الاعراف: ۱۵۰ اور طٰہٰ: ۸۶) غَضْبان کا لفظ آیا ہے' یعنی غصے سے بہت زیادہ بھرا ہوا۔ اسی طرح اَنَا عَطْشَان

کا مطلب ہے کہ میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں اور اَنَا جَوْعَان : بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ چنانچہ لغوی اعتبار سے رحمٰن کے مفہوم میں ایک طوفانی شان پائی جاتی ہے (لفظ ''طوفان'' بھی اسی وزن پر ہے' اس لیے اس لفظ کے مفہوم میں بھی مبالغہ پایا جاتا ہے)۔ اس مفہوم کو ہم اپنی زبان میں اس طرح ادا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ رحمٰن وہ ذات ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہے۔ اس کی رحمت تمام مخلوقات کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ کسی مخلوق کا کوئی فرد بھی اس کی رحمت سے مستغنی نہیں۔ خاص طور پر بنی نوعِ انسانی تو دنیا میں بھی اُس کی رحمت کی محتاج ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص صرف اپنے اعمال کی بنیاد پر جنت میں نہیں جا سکے گا جب تک کہ رحمت خداوندی اس کی دستگیری نہ کرے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ! کیا آپؐ بھی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ((وَلَا اَنَا' اِلَّآ اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِمَغْفِرَۃٍ وَرَحْمَۃٍ))[1] ''ہاں میں بھی نہیں' اِلا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ لے''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں رحمٰن چوٹی کا نام ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے ناموں میں چوٹی کا نام رحمٰن ہے' اسی طرح اللہ نے انسان کو جو علم سکھایا ہے اس میں چوٹی کا علم قرآن ہے۔ اکتسابی علم (acquired knowledge) میں تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق انسان رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو الہامی علم (revealed knowledge) عطا ہوا ہے اس میں چوٹی کا علم قرآن ہے' جو ہر قسم کے تمام علوم کا نقطۂ عروج ہے۔

آیت ۳ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۞﴾ ''اُسی نے انسان کو بنایا۔''

اس سلسلے کا تیسرا اہم نکتہ یہ نوٹ کر لیں کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی معراج (climax) انسان ہے۔ انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے عالمِ امر اور عالمِ خلق (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ النحل' آیت ۴۰ کی تشریح) دونوں کو جمع فرما دیا ہے۔ اسی لیے انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ﴿خَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾ (ص: ۷۵) کہ میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔

آیت ۴ ﴿عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ۞﴾ ''اس کو بیان سکھایا۔''

یعنی اسے بولنا سکھایا' اسے گویائی کی صلاحیت بخشی۔ آیات زیر مطالعہ کے حوالے سے یہاں چوتھا اہم نکتہ یہ ہے کہ انسان کی صلاحیتوں میں سے جو چوٹی کی صلاحیت ہے وہ قوتِ بیان (گویائی) ہے۔ آج میڈیکل سائنس کی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انسان کی قوتِ گویائی کا تعلق اس کے دماغ کی خصوصی بناوٹ سے ہے۔ سائنس کی زبان میں تو انسان بھی حیوان ہی ہے' لیکن اس کے بولنے کی صلاحیت کی وجہ سے اسے حیوانِ ناطق (بولنے والا حیوان) کہا گیا ہے۔ دماغ تو ظاہر ہے انسان سمیت تمام جانوروں میں موجود ہے' لیکن ہر جانور کے دماغ کی بناوٹ اور صلاحیت مختلف ہے۔ اس لحاظ سے انسان کا دماغ تمام حیوانات کے دماغوں میں

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب القصد والمداومۃ علی العمل' ح:۶۴۶۷۔ وصحیح مسلم' کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار' باب لن یدخل احد الجنۃ بعملہ بل برحمۃ اللّٰہ تعالیٰ' ح:۲۸۱۶۔

سب سے اعلیٰ ہے اور اس میں ایسی صلاحیتیں بھی پائی جاتی ہیں جو کسی اور جانور کے دماغ میں نہیں ہیں۔ بہرحال استعداد کے حوالے سے حیوانی دماغ کی بناوٹ نچلی سطح سے ترقی کر کے گوریلوں اور چیمپنزیز (champenzies) کے دماغ کی سطح تک پہنچتی ہے' اور پھر اس ترقی کی معراج انسان کا دماغ ہے۔ انسانی دماغ کے مختلف حصے ہیں' مثلاً سماعت سے متعلقہ حصہ' بصارت سے متعلقہ حصہ وغیرہ۔ حواس (آنکھ' کان وغیرہ) سے حاصل ہونے والی معلومات پہلے دماغ کے متعلقہ حصے میں جاتی ہیں اور پھر وہاں سے gray matter کے پچھلے حصے میں پہنچتی ہیں۔ لیکن انسانی دماغ کا سب سے اہم اور بڑا حصہ speech centre ہے' اور پھر اس میں بھی کلام کے فہم اور ابلاغ سے متعلق دو الگ الگ حصے ہیں' یعنی ایک حصے میں دوسروں کی بات سمجھنے کی صلاحیت ہے جبکہ دوسرا حصہ دوسروں تک بات پہنچانے سے متعلق ہے۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے' لیکن قوتِ گویائی کے علاوہ انسان کی باقی تقریباً تمام صلاحیتیں کسی نہ کسی سطح پر کسی نہ کسی درجے میں دوسرے حیوانات کو بھی ملی ہیں' بلکہ بعض حیوانات کی بعض صلاحیتیں تو انسان کے مقابلے میں کہیں بہتر ہیں۔ بعض جانوروں کی بصارت ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ تیز ہے' کئی جانور اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں جبکہ ہم دیکھنے کے لیے روشنی کے محتاج ہیں۔ گھوڑے کی قوتِ سماعت انسان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ چنانچہ ذرا سی آہٹ پر گھوڑے کے کان (antenna کی طرح) کھڑے ہو جاتے ہیں' جبکہ گھڑ سوار نے ابھی کچھ دیکھا ہوتا ہے نہ سنا ہوتا ہے۔ اسی طرح کتوں کے دماغ میں سونگھنے کا حصہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے سونگھنے کی حس انسان کے مقابلے میں سو گنا سے بھی زیادہ تیز ہے۔ بہرحال باقی صلاحیتیں تو دوسرے جانوروں میں بھی پائی جاتی ہیں' لیکن بیان اور گویائی کی صلاحیت صرف اور صرف انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ان آیات کو دوبارہ پڑھیے۔ ان چار آیات سے تین جملے بنتے ہیں۔ پہلی آیت ﴿اَلرَّحْمٰنُ ①﴾ جملہ نہیں ہے' یہ مبتدأ ہے اور ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ②﴾ اس کی خبر ہے۔ چنانچہ پہلی اور دوسری آیت کے ملنے سے مکمل جملہ بنتا ہے۔ یعنی ''رحمٰن نے قرآن سکھایا''۔ اس کے بعد آیت ۳ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ③﴾ ''اُس نے انسان کو پیدا کیا'' بھی مکمل جملہ ہے اور آیت ۴ ﴿عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ④﴾ ''اسے بیان کی صلاحیت عطا کی'' بھی مکمل جملہ ہے ـــــ اب ان آیات پر اس پہلو سے غور کیجیے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے اعلیٰ نام کے حوالے سے سب سے اعلیٰ علم (قرآن) کا ذکر کیا۔ پھر اپنی چوٹی کی مخلوق اور اس مخلوق کی چوٹی کی صلاحیت (بیان) کا ذکر کیا۔ اس زاویے سے غور کیا جائے تو یہ تین جملے ریاضی کے کسی سوال کی طرح ''جواب'' کا تقاضا کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح ریاضی کے ''نسبت و تناسب'' کے سوالات میں تین رقموں (values) کی مدد سے چوتھی رقم معلوم کی جاتی ہے' اسی طرح ان تین جملوں پر غور کرنے سے اس عبارت کے اصل مدعا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ''رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کی صلاحیت عطا فرمائی''۔ کس لیے؟ ـــ جواب بالکل واضح ہے: ''قرآن کے بیان کے لیے!'' ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ ترین مخلوق کو

''بیان'' کی انمول صلاحیت سے اس لیے تو نہیں نوازا کہ وہ اسے لہو ولعب میں ضائع کرتا پھرے' یا دلائل کے انبار لگانے والا وکیل یا شعلہ بیان مقرر بن کر اسے حصولِ دولت وشہرت کا ذریعہ بنا لے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ توپ اس لیے تو نہیں بنائی جاتی کہ اس سے مکھیاں ماری جائیں۔ چنانچہ انسان کی اس بہترین صلاحیت کا بہترین مصرف یہ ہوگا کہ وہ اسے بہترین علم کے سیکھنے سکھانے کا ذریعہ بنائے۔ یعنی اپنی قوتِ بیان کو قرآن کی تعلیم اور نشر واشاعت کے لیے وقف کر دے۔ ان آیات کے اس مفہوم کو حضور ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))(۱) یہاں خَیْرُکُمْ کا صیغہ تفضیل کُل (superlative degree) کے مفہوم میں آیا ہے کہ تم سب میں بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث کے حوالے سے ضمنی طور پر یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس کے راوی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام اور حدیث کے لفظ ''قرآن'' کے قافیے بھی زیرِ مطالعہ آیات کے قافیوں کے ساتھ مل رہے ہیں۔ یعنی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس حدیث کی ان آیات کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی ان ابتدائی آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر سورۃ القمر کی ترجیعی آیت ﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ ......﴾ کے مفہوم اور اس کے پُرشکوہ اسلوب کو بھی مدنظر رکھا جائے اور ان آیات کی ترتیب پر بھی غور کیا جائے کہ سورۃ القمر کی مذکورہ آیت کو بار بار دہرانے کے فوراً بعد سورۃ الرحمٰن کی یہ آیات آئی ہیں تو ان آیات کا مذکورہ مفہوم واضح تر ہو جاتا ہے۔ بہرحال ان آیات کے بین السطور یہ پیغام بھی مضمر ہے کہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کا حق ادا کرنا لازم ہے۔

آیت ۵ ﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝﴾ ''سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔''

سورج اور چاند کی گردش ایک قطعی اور مربوط نظام کا حصہ ہے۔ ان کی گردش سے ہی دن رات بنتے ہیں اور دنوں' مہینوں اور سالوں کا حساب ممکن ہوتا ہے۔

آیت ۶ ﴿وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ۝﴾ ''اور ستارے اور درخت (اللہ کو) سجدہ کرتے ہیں۔''

نَجْم کے معروف معنی ستارے کے ہیں' لیکن عربی میں یہ لفظ ایسے پودوں اور بیل بوٹوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے جن کا تنا نہیں ہوتا۔ مثلاً جھاڑیاں اور خربوزے اور تربوز کی بیلیں وغیرہ۔ جس طرح لاتعداد ستارے آسمان پر بکھرے نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح بے شمار جھاڑیاں اور بیل بوٹے زمین پر پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ پچھلی آیت میں سورج اور چاند کے ذکر کی نسبت سے دیکھا جائے تو یہاں النَّجْم سے ستارے مراد ہوں گے لیکن اگلے لفظ الشَّجَر کے حوالے سے جھاڑیاں یا بیلیں کا ترجمہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

آیت ۷ ﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ ۝﴾ ''اور آسمان کو اُس نے بلند کیا اور میزان قائم کی۔''

یہاں میزان سے مراد کائناتی نظام کے اندر پایا جانے والا مربوط اور خوبصورت توازن (cosmic balance) ہے جس کی وجہ سے یہ کائنات قائم ہے۔ یہ توازن تمام اجرامِ سماویہ کے اندر موجود

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمه۔

کششِ ثقل (gravitational force) کی وجہ سے قائم ہے۔ تمام اجرامِ فلکی اس کشش کی وجہ سے آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔ قدرت کی طرف سے ہر کرّے کا دوسرے کرّے سے فاصلہ اس کی کشش کی طاقت کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ اگر کہیں یہ فاصلہ ایک طرف سے معمولی سا کم ہو جائے اور دوسری طرف سے معمولی سا بڑھ جائے تو یہ سارا نظام تلپٹ ہو جائے اور تمام کرّے آپس میں ٹکرا جائیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تمام چیزوں میں ایک توازن قائم کر رکھا ہے۔

آیت ۸ ﴿اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ⑧﴾ ''تاکہ تم میزان میں زیادتی مت کرو۔''

اس کائناتی توازن کا تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات میں رہتے ہوئے تم بھی عدل وانصاف پر قائم رہو۔

آیت ۹ ﴿وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ⑨﴾ ''اور قائم رکھو وزن کو انصاف کے ساتھ اور میزان میں کوئی کمی نہ کرو۔''

کسی بھی نظام میں توازن برقرار رکھنے کے لیے اس نظام کے اندر عدل قائم رکھنا یعنی اس کی ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر رکھنا ضروری ہے' کیونکہ کسی بھی قسم کی کمی بیشی نظام میں خرابی اور عدمِ توازن کا باعث بنتی ہے۔ اسی لیے زیادتی سے بھی منع کر دیا گیا (لَا تَطْغَوْا) اور کمی کرنے سے بھی روک دیا گیا (لَا تُخْسِرُوْا)۔ خالق کائنات نے اس کائنات کا پورا نظام توازن اور عدل وقسط پر قائم کیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انسان بھی اپنے دائرۂ اختیار میں اسی طرح توازن اور عدل وقسط کو ملحوظ رکھے۔ اس میزان میں کوئی خرابی نہ پیدا کرے' ورنہ سارے نظامِ معاش ومعیشت میں فساد پھیل جائے گا۔ یہاں کوئی بڑا ظلم تو درکنار' ترازو میں ڈنڈی مار کر اگر کوئی شخص خریدار کے حصے کی تھوڑی سی چیز بھی مار لیتا ہے تو میزانِ عالم میں خلل برپا کر دیتا ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ⑩﴾ ''اور زمین کو اُس نے بچھا دیا مخلوق کے لیے۔''

ظاہر ہے مخلوق میں انسان بھی شامل ہیں اور جنات بھی۔ نوٹ کیجیے کہ پہلے آسمان' سورج اور چاند کا ذکر ہوا ہے اور اب زمین کا۔ گویا ترتیب تدریجاً اوپر سے نیچے کی طرف آ رہی ہے۔

آیت ۱۱ ﴿فِیْهَا فَاکِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَکْمَامِ ⑪﴾ ''اس میں میوے ہیں اور کھجوریں ہیں' جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔''

آیت ۱۲ ﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ ⑫﴾ ''اور بُھس والا اناج بھی ہے اور خوشبودار پھول بھی۔''

بعض مترجمین ''الرَّیْحَان'' سے مختلف النوع غذائیں بھی مراد لیتے ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ⑬﴾ ''تو تم دونوں (گروہ) اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

عام طور پر اٰلَآءِ کا ترجمہ ''نعمتیں'' کیا جاتا ہے' لیکن اس لفظ میں نعمتوں کے ساتھ ساتھ قدرتوں کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سورت میں بھی اس لفظ سے کہیں اللہ کی نعمتیں مراد ہیں اور کہیں اس کی قدرتیں۔ تُکَذِّبٰنِ

تثنیہ کا صیغہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سورت میں جنوں اور انسانوں سے مسلسل ایک ساتھ خطاب ہو رہا ہے۔ آگے چل کر آیت ۳۳ میں یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کے خطاب سے یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔ (۱)

آیت ۱۴ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾﴾ ''اُس نے پیدا کیا انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی ہوئی مٹی سے۔''

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے حوالے سے سورۃ الحجر کے تیسرے رکوع میں تین مرتبہ ﴿صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد ایسا گارا ہے جس میں سڑاند پیدا ہو چکی ہو یعنی سنا ہوا گارا۔ ایسا گارا خشک ہونے پر سخت ہو جاتا ہے اور ٹھوکر لگنے سے کھنکنے لگتا ہے۔ یہاں پر صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ سے ایسا ہی سوکھا ہوا گارا مراد ہے، یعنی ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتا ہوا گارا۔

آیت ۱۵ ﴿وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور جنات کو اُس نے پیدا کیا آگ کی لپٹ سے۔''

مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ سے آگ کی لو یا لپٹ مراد ہے۔ اس کا اطلاق آگ کے شعلے کے اس حصے پر ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا لیکن انتہائی گرم ہوتا ہے۔ شعلے کے اندر سب سے زیادہ درجہ حرارت اسی نظر نہ آنے والے حصے میں ہوتا ہے۔ سورۃ الحجر کی آیت ۲۷ میں آگ کی اس لپٹ کو نَارِ السَّمُوْمِ کا نام دیا گیا ہے۔

آیت ۱۶ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۱۷ ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾﴾ ''وہ ربّ ہے دونوں مشرقوں کا اور دونوں مغربوں کا۔''

یہاں پر رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ اور رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ تثنیہ کے اس صیغہ کی مناسبت سے آیا ہے جو پوری سورت میں بار بار آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (المزّمّل:۹) اور ﴿رَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ﴾ (المعارج:۴۰) کی تراکیب بھی آئی ہیں۔ بہرحال واحد، تثنیہ اور جمع کے یہ تینوں صیغے اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ واحد کے صیغے میں مشرق اور مغرب تو معروف عام ہیں۔ دو مشرقوں اور دو مغربوں کے تصور کو یوں سمجھیں کہ ایک وقت میں سورج جہاں سے طلوع ہو رہا ہے گلوب کی دوسری طرف وہیں پر وہ غروب ہوتا بھی نظر آ رہا ہے۔ اسی طرح جس نقطے پر سورج غروب ہوتا نظر آتا ہے دوسری طرف اسی جگہ سے طلوع ہوتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ گویا سورج طلوع ہونے کا ہر نقطہ مقامِ غروب بھی ہے اور اسی طرح ہر مقامِ غروب

(۱) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو سورۃ الرحمٰن شروع سے آخر تک سنائی تو وہ اسے سن کر خاموش رہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے لیلۃ الجن میں یہ سورت جنوں کو سنائی تھی تو وہ تم سے بہتر جواب دینے والے تھے۔ میں جب بھی یہ آیت شریفہ پڑھتا: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○﴾ تو وہ جواب میں کہتے: لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ، فَلَكَ الْحَمْدُ (پروردگار! ہم تیری نعمتوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرتے، پس شکر و تعریف تیرے ہی لیے ہے)''۔ سنن الترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الرحمٰن، ح:۳۲۹۱۔ (حاشیہ از مرتب)

گویا مقامِ طلوع بھی ہے۔اس لحاظ سے گویا مشرق بھی دو ہیں اور مغرب بھی دو۔ پھر کسی ایک مقام سے بظاہر نظر آنے والے مشرق و مغرب کے درمیان زمین پر ہر ہر نقطہ گلوب میں کسی کے لیے مقامِ طلوع ہے اور کسی کے لیے مقامِ غروب۔اس طرح گویا بہت سے مشرق ہیں اور بہت سے مغرب۔

آیت ۱۸ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ⑱﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۱۹ ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ⑲﴾ ''اُس نے چلا دیے دو دریا جو آپس میں ملے ہوئے بھی ہیں۔''

آیت ۲۰ ﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ⑳﴾ ''لیکن ان کے مابین ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

دونوں دریا باہم مل کر چلتے ہیں لیکن ایک دوسرے میں گھستے نہیں' اپنی اپنی حد میں رہتے ہیں۔ جیسے ٹھنڈے پانی کے سمندروں میں گرم پانی کی روئیں بہتی ہیں اور کھاری سمندروں میں میٹھے پانی کی روئیں بہتی ہیں۔اسی طرح کئی دریا باہم ملتے ہیں لیکن دور تک الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں دریائے کابل کا پانی جب دریائے سندھ میں ملتا ہے تو بہت دور تک دونوں پانی اپنے رنگ کی وجہ سے الگ الگ نظر آتے ہیں۔اٹک کے پل پر کھڑے ہو کر دونوں پانیوں کا الگ الگ رہتے ہوئے ایک ساتھ چلنے کا یہ منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ایسا ہی منظر مظفر آباد کے قریب ''دومیل'' کے مقام پر نظر آتا ہے جہاں دریائے نیلم دریائے جہلم میں ملتا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ㉑﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۲۲ ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ㉒﴾ ''ان دونوں سے نکلتے ہیں موتی بھی اور مونگے بھی۔''

آیت ۲۳ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ㉓﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۲۴ ﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ㉔﴾ ''اور اُسی کے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی مانند اونچے اٹھے ہوئے ہیں۔''

یعنی اُسی کی قدرت کا نمونہ ہیں اور اُسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔پچھلے زمانے کے جہاز اگرچہ دورِ جدید کے جہازوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے تھے' لیکن جب ان کے بادبان کھلتے تھے تو وہ بھی اونچائی میں پہاڑوں جیسے نظر آتے تھے۔اور آج کل کے جہاز تو واقعتاً پہاڑوں سے مشابہ ہیں۔

آیت ۲۵ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ㉕﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟''

یہاں ایک دفعہ پھر نوٹ کر لیں کہ سورت کے آغاز سے لے کر اب تک جو آیات ہم نے پڑھی ہیں ان میں

پہلے قرآن کی عظمت کا ذکر آیا ہے اور اس کے بعد اللہ کی صناعی اور اس کی قدرتوں کا بیان ہے۔ ابتدائی آیات میں انسان کی قوتِ بیان کے تذکرے کے ساتھ قرآن کی عظمت کا ذکر کر کے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ اس کی اس صلاحیت کا بہترین مصرف یہی ہے کہ وہ قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس کی مزید وضاحت نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان میں ملتی ہے: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) کہ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔ بہرحال انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کو بہترین طور پر صرف کرے۔ علامہ اقبال کے اس شعر میں اسی جذبے کو ترغیب و تحریک دی گئی ہے:

اگر یک قطرہ خوں داری' اگر مشتِ پرے داری ۔۔۔ بیا من با تو آموزم طریق شاہبازی را!

(کہ اے ننھی چڑیا! اگر تیرے پاس چند پَر ہیں اور ایک قطرۂ خون بھی ہے تو میرے پاس آؤ' میں تجھے شاہین کی سی اڑان کا طریقہ سکھا دوں!)

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے' یہ موضوعات (قرآن کی عظمت اور اللہ کی صناعی کا بیان) ہم سورۃ الواقعہ میں بھی پڑھیں گے' لیکن وہاں ان کی ترتیب سورۃ الرحمٰن کے مضامین کی ترتیب کے بالعکس ہے۔ یعنی قرآن کی عظمت کا بیان جو سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں ہے سورۃ الواقعہ میں بالکل آخر پر ہے۔ پھر سورۃ الرحمٰن میں اللہ کی خلاقی و صناعی کا ذکر عظمت قرآن کے بعد ہے جبکہ سورۃ الواقعہ میں یہ موضوع عظمت قرآن کے ذکر سے پہلے بیان ہوا ہے۔ یعنی دونوں سورتوں میں ایک جیسے موضوعات بیان ہوئے ہیں لیکن معکوس ترتیب سے۔ اس ترتیب کو قبل ازیں mirror image کا نام دیا گیا ہے۔

آیات ۲۶ تا ۴۵

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۚ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ۝ يَسْــَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ۝ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا
تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ڏ
وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاۗءُ فَكَانَتْ
وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُسْــَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا
جَاۗنٌّ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ
وَالْاَقْدَامِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝
يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ ع

آیت ۲۶ ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝﴾ ''جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے فنا ہونے والا ہے۔''

آیت ۲۷ ﴿وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝﴾ ''اور باقی رہے گا صرف تیرے رب کا چہرہ جو بہت بزرگی اور بہت عظمت والا ہے۔''

اللہ کے چہرے کا تصور ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس لحاظ سے اگرچہ یہ آیت آیاتِ متشابہات میں سے ہے لیکن اس کا عمومی مفہوم بالکل واضح ہے کہ باقی رہنے والی صرف ایک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے' جس کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور ان میں کوئی ایک مخلوق بھی ایسی نہیں جو اپنے بل پر اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہو۔ ہر چیز اور ہر مخلوق کا وجود اللہ تعالیٰ کی منشاء و مرضی کا مرہونِ منت ہے۔ جب تک وہ چاہتا ہے کسی چیز کا وجود برقرار رہتا ہے اور جب وہ چاہتا ہے اسے فنا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ القصص کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ ''ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اُس کے چہرے کے۔ فرمان روائی اُسی کی ہے اور اُسی کی طرف تم سب لوٹا دیے جاؤ گے۔''

آیت ۲۸ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۲۹ ﴿يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''اُسی سے مانگتا ہے جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے اللہ ہی کے در کی سوالی ہے۔ ہر کسی کو وجود بھی اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ ہر زندہ وجود کی زندگی بھی اسی کی دین ہے' کسی مخلوق میں اگر کوئی صلاحیت ہے تو وہ بھی اسی کی بخشی ہوئی ہے اور تمام مخلوقات کے ایک ایک فرد کی ضرورتوں کا خبر گیر و نگہبان بھی وہی ہے۔ اس حوالے سے سورۂ محمد کی آیت ۳۸ کے یہ الفاظ بہت واضح ہیں: ﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ﴾ کہ اللہ غنی اور بے نیاز ہے اور تم سب اس کے محتاج ہو۔ یعنی تمہارا وجود' تمہاری زندگی' تمہاری صلاحیتیں' غرض تمہارا سب کچھ اُسی کا عطا کردہ ہے۔ تم اپنے تمام تر وسائل سے بس وہی کچھ کر سکتے ہو جس کی وہ اجازت دیتا ہے اور صرف اسی قدر جان سکتے ہو جس قدر وہ چاہتا ہے۔ اس کی مخلوق کے تمام افراد پر یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۵) کہ وہ سب کے سب اس کے احاطۂ علم میں مقید و محصور ہیں اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے' مگر اسی قدر جس قدر وہ چاہتا ہے۔

﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝﴾ ''ہر دن وہ ایک نئی شان میں ہے۔''

ہر دن اُس کی ایک نئی شان کا ظہور ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر امر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورۃ السجدۃ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝﴾ ''وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی

طرف' پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف' (یہ سارا معاملہ طے پاتا ہے) ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار برس ہے''۔ یعنی کائنات اور مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فارغ ہو کر نہیں بیٹھ گیا' بلکہ اس کائنات کے نظام اور ارض وسماء میں پھیلی ہوئی مخلوقات سے متعلق تمام امور کو وہ لحہ بہ لحہ اپنی تدبیر سے چلا رہا ہے۔ اس تدبیر کی منصوبہ بندی کے لیے اس کا ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں ایک ایک دن کی منصوبہ بندی ہوتی ہے' اہم فیصلے کیے جاتے ہیں' احکام جاری ہوتے ہیں' ان احکام کی تعمیل و تنفیذ عمل میں لائی جاتی ہے اور پھر جائزہ رپورٹیں اسے پیش کی جاتی ہیں۔ اس طرح ہر دن کے لیے اس کی نئی شان ہے اور نئی مصروفیات!

آیت ۳۰ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿٣٠﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟''

آیت ۳۱ ﴿سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّہَ الثَّقَلٰنِ ﴿٣١﴾﴾ ''ہم جلد ہی فارغ ہو جائیں گے تمہارے لیے' اے دو بھاری قافلو!''

اس آیت میں اشارۃً اور آگے آیت ۳۳ میں باقاعدہ نام لے کر تثنیہ (تُکَذِّبٰن) کے صیغے کی وضاحت کردی گئی کہ اے جن وانس کے قافلوں کے افراد! ہم تم سے مخاطب ہیں۔ یاد رکھو! تم دونوں گروہ اپنے اعمال کے لیے ہمارے سامنے جواب دہ ہو۔ یاد رکھو! ہم اس کائنات کو ''مہلت'' کے اصول پر چلا رہے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے کائنات کی ایک عمر ﴿اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی﴾ مقرر کر رکھی ہے' اسی اصول کے تحت ہر قوم کو بھی ہم ایک وقتِ معیّن تک مہلت دیتے ہیں: ﴿لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ ۚ﴾ (الاعراف: ٣٤) اور ہر فرد کو بھی۔ چنانچہ ہماری عطا کردہ مہلت سے تم یہ مت سمجھو کہ تمہارا احتساب نہیں ہوگا' بلکہ ہم عنقریب تم سب لوگوں کو اپنے حضور حاضر کرنے والے ہیں' جہاں تمہیں اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔

آیت ۳۲ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿٣٢﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۳۳ ﴿یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ﴾ ''اے گروہِ جن وانس! اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل بھاگو تو نکل بھاگو۔''

﴿لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿٣٣﴾﴾ ''تم نکل نہیں سکو گے مگر (اللہ کی) سند کے ساتھ۔''

یہ آیت مشکلات القرآن میں سے ہے۔ جب تک کائنات (cosmos) کی وسعتوں کے بارے میں انسان کا علم مزید ترقی نہیں کر جاتا' اس آیت کا مفہوم شاید ہم پوری طرح سمجھ نہ پائیں۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ اپنی تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود ابھی تک انسان زمین کی ''حدود'' سے نکل کر نظامِ شمسی کے کسی ایک سیارے تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ اس کی اس رفتار سے تو یہی لگتا ہے کہ نظامِ شمسی کی وسعتوں تک بھی اس کی رسائی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ جہاں تک اس معاملے میں جنوں کی ''استطاعت'' کا تعلق

ہے اس کے بارے میں قبل ازیں سورۃ الحجر کی آیت ۱۷ کے ضمن میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ وہ نظامِ شمسی کی حدود کے اندر آسانی سے گھوم پھر سکتے ہیں' لیکن نظامِ شمسی کی حدود کو پھلانگنے کی استطاعت وہ بھی نہیں رکھتے۔ دوسری طرف اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی وسعتوں کا عالم یہ ہے کہ ان وسعتوں کے اندر خود نظامِ شمسی کی حیثیت ایک نقطے کی سی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں گروہِ جن وانس کی اس بے بسی اور بے بضاعتی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کی طرف آیت زیرِ مطالعہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم میں جب آسمانوں اور زمین کا ذکر آتا ہے تو اس سے پوری کائنات مراد ہوتی ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہاں پوری کائنات کے کناروں سے نکل بھاگنے کے معنی معدوم ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ قیامت کے دن عذاب کے مستحق لوگ خواہش کریں گے: ﴿یَوْمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا ﴿۴۲﴾﴾ (النساء) ''اُس دن تمنا کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اور رسولؐ کی نافرمانی کی تھی کہ کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے۔ اور وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہیں سکیں گے''۔ لیکن ہمارا یہ وجود چونکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر یہ معدوم بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم میرے خیال میں یہ ہے کہ تم لوگ اگر معدوم بھی ہونا چاہو تو اللہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر (اِلَّا بِسُلْطٰنٍ) ایسا نہیں کر سکو گے۔ واللہ اعلم!

آیت ۳۴ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۳۵ ﴿یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾﴾ ''تم پر پھینکے جائیں گے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اور دھواں' تو تم لوگ بدلہ نہیں لے سکو گے۔''

آیت ۳۶ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۳۷ ﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ وَرْدَةً کَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾﴾ ''پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی' تیل کی تلچھٹ جیسا۔''

آیت ۳۸ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۳۹ ﴿فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾﴾ ''تو اُس روز پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی' نہ کسی جن سے اور نہ انسان سے اُس کے گناہوں کے بارے میں۔''

اگرچہ سوال و جواب بھی ہوں گے اور ایک ایک عمل کا حساب بھی ہوگا' لیکن چونکہ ہر انسان اپنے اندرونی احوال کو خوب سمجھتا ہے: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ﴿۱۴﴾﴾ (القیامۃ) اس لیے میدانِ حشر میں ہر شخص کا

چہرہ ہی گویا اُس کے انجام کی خبر دے رہا ہوگا۔ اس کیفیت کا نقشہ قرآن میں جابجا دکھایا گیا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس دن کئی چہرے تر و تازہ ہوں گے' جبکہ کچھ چہروں پر مردنی چھا رہی ہوگی۔ اس کیفیت کی عملی مثال ہمارے ہاں اسکولوں کے سالانہ نتائج کے اعلان کے موقع پر دیکھنے میں آتی ہے۔ چونکہ ہر طالب علم کو امتحان کے دوران اپنی کارکردگی کے بارے میں پہلے سے معلوم ہوتا ہے' اس لیے نتائج کے باقاعدہ اعلان سے پہلے ہی ہر ایک کا نتیجہ اس کے چہرے پر سے پڑھا جا سکتا ہے۔

آیت ۴۰ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۴۱ ﴿یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰھُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾﴾ ''پہچان لیے جائیں گے مجرم اپنے چہروں سے' پھر ان کو پکڑا جائے گا پیشانی (کے بالوں) سے اور پاؤں سے۔''

اُس دن مجرمین کے اترے ہوئے چہرے ہی ان کی پہچان ہوں گے۔ چنانچہ فرشتے انہیں ٹانگوں اور پیشانی کے بالوں سے پکڑ پکڑ کر جہنم کی طرف اُچھالتے جائیں گے۔

آیت ۴۲ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۴۳ ﴿ھٰذِہٖ جَھَنَّمُ الَّتِیْ یُکَذِّبُ بِھَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''(اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جہنم جسے مجرمین جھٹلایا کرتے تھے۔''

آیت ۴۴ ﴿یَطُوْفُوْنَ بَیْنَھَا وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾﴾ ''اب وہ چکر لگاتے رہیں گے اس (آگ) کے اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان۔''

آگ کی تپش سے گھبرا کر پانی کی طرف لپکیں گے اور جب کھولتے ہوئے پانی کا مزہ چکھیں گے تو پھر واپس بھاگیں گے۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذٰلِکَ!

آیت ۴۵ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

یہ اہل جہنم کا تذکرہ تھا' اب اس کے بعد آئندہ آیات میں اہلِ جنت کا بیان ہوگا۔ البتہ سورۃ الواقعہ میں پہلے اہلِ جنت کا ذکر ہے اور اس کے بعد اہلِ جہنم کا۔ یعنی جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ ان دونوں سورتوں کے مضامین باہم عکسی ترتیب میں ہیں۔

آیات ۴۶ تا ۷۸

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَیِّ

اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ
فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ
اِسْتَبْرَقٍ ۭ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ
يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ
وَالْمَرْجَانُ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ مُدْهَآمَّتٰنِ ۝ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فِيْهِمَا
فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ
اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ
حِسَانٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ ع ۳ / ۱۲

آیت ۴۶ ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝﴾ ''اور جو کوئی اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اُس کے لیے دو جنتیں ہیں۔''

اہلِ جنت کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ دنیا میں اپنے رب کے حضور پیشی سے لرزاں و ترساں رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا جادۂ مستقیم پر قائم رکھنے والی واحد چیز یہی اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی کا خوف ہے۔

دو جنتوں کے بارے میں مفسرین نے مختلف آراء نقل کی ہیں' تاہم دو جنتوں کی توجیہہ جو میری سمجھ میں آئی ہے اور مجھے اپنی اس رائے پر اطمینان اور انشراح ہے کہ یہ انسانوں اور جنوں کے لیے الگ الگ جنتوں کا بیان ہے۔ چونکہ اس سورت میں خطاب بھی مسلسل ان دونوں سے ہے اور جہنم کی وعید بھی دونوں گروہوں کو دی گئی ہے' اس لیے جنت کی نوید بھی دونوں کے لیے ہونی چاہیے تھی۔ اب چونکہ انسانوں اور جنوں کا مادۂ تخلیق اور ان کی فطرتیں الگ الگ ہونے کی وجہ سے ان کی ضرورتیں' پسند و ناپسند' رنج و غم کے معیار' راحت و سکون کے پیمانے اور کیف و سرور کے انداز' سب کچھ ہی ایک دوسرے سے مختلف اور جدا ہیں' اس لیے ظاہر ہے جنت میں بھی ان کے لیے الگ الگ ماحول کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ یہاں ان دونوں گروہوں کے لیے الگ الگ جنتوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی مدنظر رہے کہ آیت زیر مطالعہ میں جن دو جنتوں کا ذکر ہوا ہے وہ نچلے درجے کی جنتیں ہیں' جبکہ آگے چل کر آیت ۶۲ میں جن دو جنتوں کا ذکر ہوا ہے وہ اونچے درجے کی جنتیں ہیں۔ گویا اس سورت میں کُل چار جنتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ہر گروہ کے لیے دو جنتیں ہوں گی' ان میں سے ایک جنت نچلے درجے میں ہوگی اور دوسری نسبتاً برتر درجے میں۔

آیت ۴۷ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور

قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۴۸ ﴿ذَوَاتَآ اَفۡنَانٍ ﴿۴۸﴾﴾ ''دونوں بہت سی شاخوں والی ہوں گی۔''

آیت ۴۹ ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۰ ﴿فِیۡهِمَا عَیۡنٰنِ تَجۡرِیٰنِ ﴿۵۰﴾﴾ ''ان دونوں میں دو چشمے بہہ رہے ہوں گے۔''

یعنی ہر جنت میں ایک چشمہ رواں ہوگا۔

آیت ۵۱ ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۲ ﴿فِیۡهِمَا مِنۡ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوۡجٰنِ ﴿۵۲﴾﴾ ''ان دونوں میں ہر قسم کے میوے ہوں گے جوڑوں کی شکل میں۔''

یعنی ہر پھل کی دو قسمیں ہوں گی۔

آیت ۵۳ ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۴ ﴿مُتَّکِـِٕیۡنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنۡ اِسۡتَبۡرَقٍ ؕ﴾ ''وہ وہاں تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ایسے بچھونوں پر جن کے اَستر گاڑھے ریشم کے ہوں گے۔''

یہاں پر جنت کے بچھونوں کے اندرونی کپڑے (اَستر) کا ذکر ہوا ہے کہ وہ گاڑھے یعنی موٹے ریشم کے بنے ہوں گے لیکن ان کے بیرونی غلافوں کا ذکر نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بیرونی غلافوں کی کیفیت ہمارے احاطہ خیال میں آ ہی نہیں سکتی۔

﴿وَ جَنَا الۡجَنَّتَیۡنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾﴾ ''اور دونوں جنتوں کے پھل جھکے ہوئے ہوں گے۔''

یعنی وہ اہل جنت میں سے ہر ایک کی پہنچ میں ہوں گے۔

آیت ۵۵ ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۶ ﴿فِیۡهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ ۙ﴾ ''ان میں ایسی عورتیں ہوں گی جن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔''

عورت کی جھکی ہوئی نگاہیں شرم و حیا کی علامت ہیں اور شرم و حیا نسوانیت کا خاص زیور بھی ہے اور اس کے اخلاق کا سب سے بڑا محافظ بھی۔ جنتی عورتوں کی جھکی ہوئی نظروں کا ذکر گویا ان کے حسن ظاہری و باطنی کا بیان ہے۔

﴿لَمۡ یَطۡمِثۡهُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَهُمۡ وَ لَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾﴾ ''ان کو چھوا نہیں ہوگا ان سے پہلے نہ کسی انسان نے اور نہ کسی جن نے۔''

جنتی جنوں کی بیویاں ظاہر ہے انہی کی جنس سے ہوں گی جنہیں پہلے کسی جن نے نہیں چھوا ہوگا' جبکہ انسانوں کی بیویاں انسان ہوں گی اور انہیں بھی پہلے کسی انسان نے نہیں چھوا ہوگا۔

آیت ۵۷ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۝۵۷﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۸ ﴿كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ۝۵۸﴾ ''وہ ایسی ہوں گی گویا لعل اور مونگے ہوں۔''

﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۝۵۹﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۶۰ ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۝۶۰﴾ ''کیا بھلائی کا بدلہ بھلائی کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟''

نیک لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے دین کے لیے جو قربانیاں دیں' اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے کے حوالے سے انہوں نے جو مشقتیں اٹھائیں' ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کا بدلہ تو دینا ہے۔ لہٰذا جنت کی مذکورہ نعمتوں کی صورت میں انہیں بدلہ دے کر اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں اور کوششوں کی قدر افزائی فرمائے گا۔

آیت ۶۱ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۝۶۱﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۶۲ ﴿وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ۝۶۲﴾ ''اور ان سے پرے دو جنتیں اور بھی ہیں۔''

مفسرین نے ان دو جنتوں کی مختلف توجیہات کی ہیں' لیکن جیسا کہ قبل ازیں آیت ۴۶ کی تشریح میں ذکر ہو چکا ہے' میرے نزدیک ان میں سے دو جنتیں جنوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ نچلے درجے میں ہیں اور دو جنتیں ان دونوں گروہوں کے لیے الگ الگ اونچے درجے میں ہیں۔ اہل جنت کے ان درجات کی وضاحت اگلی سورت یعنی سورۃ الواقعہ میں ملے گی (یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے)۔ سورۃ الواقعہ میں اہل جہنم (اَصْحٰبُ الشِّمَال) کے مقابلے میں اہل جنت کے دو گروہوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں ایک گروہ تو اَصْحٰبُ الْيَمِيْن (دائیں جانب والوں) کا ہے۔ ان کے لیے الگ جنت کا ذکر ہے جو نسبتاً نچلے درجے کی جنت ہوگی۔ جبکہ دوسرا گروہ مقربین بارگاہ کا ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ۝۱۰ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ۝۱۱﴾ ''اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔ وہ تو بہت مقرب ہوں گے''۔ یہ وہی خوش نصیب لوگ ہیں جن کا ذکر سورۃ التوبہ میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝۱۰۰﴾

''اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے' اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی نیکوکاری کے ساتھ اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے' اور اُس نے ان کے لیے وہ باغات

تیار کیے ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی' ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔''

سورۃ الواقعہ میں ان مقربین بارگاہ کے لیے بہت خصوصی انداز میں جنت کا ذکر ہوا ہے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کے لیے بہت اونچے درجے کی جنت ہوگی۔ چنانچہ میری رائے میں سورۃ الرحمٰن کی آیت ۴۶ میں جن دو جنّتوں (جنّوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ) کا ذکر ہوا ہے وہ اصحاب الیمین کے لیے ہیں' جبکہ زیر مطالعہ آیات میں جنّوں اور انسانوں میں سے مقربین بارگاہ کی جنتوں کا ذکر ہونے جا رہا ہے۔

آیت ۶۳ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۶۳﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۶۴ ﴿مُدْهَآمَّتٰنِ ۝۶۴﴾ ''دونوں گہرے سبز رنگ کی ہوں گی۔''

ان دونوں جنتوں کا رنگ سیاہی مائل سبز ہوگا۔ یعنی بہت گھنی اور سرسبز و شاداب۔ اس رنگ کے ذکر کی توجیہہ آگے آیت ۶۸ کے ضمن میں بیان کی گئی ہے۔

آیت ۶۵ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۶۵﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۶۶ ﴿فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۝۶۶﴾ ''ان میں دو چشمے ہوں گے اُبلتے ہوئے۔''

یعنی ہر جنت میں ایک ایک ایسا چشمہ ہوگا۔

آیت ۶۷ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۶۷﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۶۸ ﴿فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ۝۶۸﴾ ''ان دونوں میں میوے' کھجور اور انار ہوں گے۔''

ان جنتوں کی کیفیت کے بیان میں ایک طرف گویا عجمی پسند کی جھلک نظر آتی ہے تو دوسری طرف عربی ذوق کی عکاسی۔ عجمی علاقوں کے درختوں اور باغات کے جوبن کا کمال یہ ہے کہ ان کے سبز پتوں کا رنگ گہرا ہوتے ہوتے سیاہی مائل ہو جائے۔ ایسے درختوں اور پودوں کا سایہ بھی مثالی ہوتا ہے اور ان کے پھلوں کی پیداوار اور کوالٹی بھی بہترین ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرزمین عرب خصوصاً نزولِ قرآن کے علاقے حجاز کے ذوق کے مطابق ایک مثالی باغ کا نقشہ بھی دکھایا گیا ہے۔ یعنی پہاڑی ڈھلوان سے ابلتا ہوا چشمہ' چشمے کے نشیب میں کھجور اور انار کے درختوں کا جھنڈ اور ان درختوں کے جھرمٹ میں انگور کی لہلہاتی بیلیں!

آیت ۶۹ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۶۹﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۷۰ ﴿فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ۝۷۰﴾ ''ان میں ہوں گی نہایت نیک سیرت اور خوبصورت عورتیں۔''

آیت ۷۱ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۷۱﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۷۲ ﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ﴾ ’’یعنی حوریں‘ جو قیام پذیر ہوں گی خیموں میں۔‘‘

یہاں پر ’’خیموں‘‘ کا ذکر خصوصی طور پر عرب کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت عرب میں شہروں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور زیادہ تر لوگ خیموں میں رہتے تھے۔ اس لیے یہاں پر گھر یا محل کے بجائے خیمے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں ﴿مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ﴾ کے الفاظ میں ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ (الاحزاب:۳۳) کے حکم کی عملی جھلک دکھائی دیتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ دراصل عورت کا وہ روپ ہے جس روپ میں اسلام اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام عورت کو ’’چراغِ خانہ‘‘ بن کر رہنے کی ترغیب دیتا ہے اور اسے ’’شمعِ محفل‘‘ بننے سے منع کرتا ہے۔

یہاں پر ایک بہت اہم نکتہ یہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ ان آیات میں جن دو جنتوں کا ذکر ہو رہا ہے ان میں ’’حوریں‘‘ ہوں گی جبکہ قبل ازیں جن جنتوں کا ذکر ہوا تھا ان میں حوروں کا نہیں بلکہ ’’جنتی عورتوں‘‘ کا تذکرہ تھا: ﴿فِیْھِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ ’’ان میں ایسی عورتیں ہوں گی جن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی‘‘۔ اسی طرح سورۃ الواقعہ میں اصحاب الیمین کی جنت میں خوبصورت عورتوں ﴿اِنَّآ اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً﴾ کا ذکر ہے جبکہ ’’مقربین‘‘ کے لیے جنت کے حوالے سے ’’حُوْرٌ عِیْنٌ‘‘ (آیت ۲۲) کا تذکرہ ہے۔

آیت ۷۳ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۷۴ ﴿لَمْ یَطْمِثْھُنَّ اِنْسٌ قَبْلَھُمْ وَلَا جَآنٌّ﴾ ’’نہیں چھوا ہو گا ان سے پہلے انہیں نہ کسی انسان نے اور نہ کسی جن نے۔‘‘

یہاں خصوصی طور پر جن اور انسان کے ذکر سے بھی میری اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ یہ جنوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ جنتوں کا بیان ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ جنوں کی جنت کی حوروں کو ان کے خاوندوں سے پہلے کسی جن نے نہیں چھوا ہو گا اور انسانوں کی جنت کی حوروں کو قبل ازاں کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا ہو گا۔

آیت ۷۵ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۷۶ ﴿مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ﴾ ’’وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے سبز مسندوں اور بہت نفیس بچھونوں پر۔‘‘

آیت ۷۷ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۷۸ ﴿تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ﴾ ’’بہت بابرکت نام ہے تیرے رب کا جو بہت عظمت والا‘ بہت اکرام والا ہے۔‘‘

سُوْرَةُ الْوَاقِعَة

تمہیدی کلمات

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الرحمٰن کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے‘ سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ اس اعتبار سے ان سورتوں کی باہمی مناسبت اور مشابہت بہت گہری ہے۔ دونوں سورتیں اس لحاظ سے پورے قرآن میں منفرد ہیں کہ ان میں نبوت‘ رسالت یا وحی کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ دونوں سورتیں اللہ تعالیٰ کی صناعی و خلاقی کے تذکرے‘ جنت و دوزخ کے احوال‘ آیاتِ انفسی و آفاقی کے بیان اور تذکیر بآلاء اللہ جیسے مضامین کی حامل ہیں۔ یہ مضامین ان دونوں سورتوں میں عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

آیات ۱ تا ۴۰

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝١ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝٢ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝٣ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ
رَجًّا ۝٤ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝٥ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا ۝٦ وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝٧ فَأَصْحٰبُ
الْمَيْمَنَةِ ۝ مَا أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝٨ وَأَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۝ مَا أَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۝٩ وَالسّٰبِقُوْنَ
السّٰبِقُوْنَ ۝١٠ أُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝١١ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝١٢ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِيْنَ ۝١٣ وَقَلِيْلٌ مِّنَ
الْاٰخِرِيْنَ ۝١٤ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۝١٥ مُّتَّكِـِٔيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ۝١٦ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ
مُّخَلَّدُوْنَ ۝١٧ بِأَكْوَابٍ وَّأَبَارِيْقَ ۝ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝١٨ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۝١٩
وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۝٢٠ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝٢١ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۝٢٢ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ
الْمَكْنُوْنِ ۝٢٣ جَزَاءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝٢٤ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيْمًا ۝٢٥ إِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا
سَلٰمًا ۝٢٦ وَأَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۝ مَا أَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۝٢٧ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۝٢٨ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۝٢٩
وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۝٣٠ وَّمَاءٍ مَّسْكُوْبٍ ۝٣١ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۝٣٢ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ۝٣٣ وَّفُرُشٍ
مَّرْفُوْعَةٍ ۝٣٤ إِنَّا أَنْشَأْنٰهُنَّ إِنْشَاءً ۝٣٥ فَجَعَلْنٰهُنَّ أَبْكَارًا ۝٣٦ عُرُبًا أَتْرَابًا ۝٣٧ لِّأَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝٣٨ ع
ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِيْنَ ۝٣٩ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝٤٠

آیت ۱ ﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱﴾ ''جب وہ ہونے والا واقعہ رونما ہو جائے گا۔''

اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ ''جب وہ وقوع پذیر ہونے والی وقوع پذیر ہو جائے گی''۔ یعنی جس قیامت کی خبر تم لوگوں کو دی جا رہی ہے جب وہ آ جائے گی۔

آیت ۲ ﴿لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝۲﴾ ''(اور جان لو) اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔''

یعنی وہ ہر صورت وقوع پذیر ہو کر رہے گی۔

آیت ۳ ﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝۳﴾ ''وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہوگی۔''

بہت سے ایسے لوگ جو دنیا میں بہت بلند مقام و مناصب کے مالک تھے' قیامت انہیں ذلیل و رسوا کر دے گی۔ اس کے برعکس کئی فقراء و مساکین جن کا دنیا میں کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا' اس دن بہت بلند مقامات پر فائز نظر آئیں گے۔ اُس دن حضرت ابوہریرہؓ' حضرت ابودرداءؓ' حضرت ابوذر غفاریؓ اور دوسرے فقراء صحابہ ؓ کو ایسے اعلیٰ مراتب عطا ہوں گے جن کے بارے میں آج ہم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

آیت ۴ ﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝۴﴾ ''جب زمین ہلا ڈالی جائے گی جیسے کہ زلزلہ آتا ہے۔''

آیت ۵ ﴿وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝۵﴾ ''اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔''

آیت ۶ ﴿فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝۶﴾ ''پس وہ ہو جائیں گے اُڑتا ہوا غبار۔''

آیت ۷ ﴿وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝۷﴾ ''اور تم تین گروہوں میں منقسم ہو جاؤ گے۔''

ان تین گروہوں کا ذکر بالواسطہ طور پر سورۃ الرحمٰن میں دو جنتوں کے حوالے سے ہوا ہے۔ یعنی اہل جہنم' نچلے درجے کی جنت کے مستحق اور اونچے درجے کی جنت کے باسی۔

آیت ۸ ﴿فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝۸﴾ ''تو جو داہنے والے ہوں گے' کیا خوب ہوں گے وہ داہنے والے!''

داہنے والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا ہوگا — یا تم لوگوں کو کیا معلوم کہ وہ داہنے والے لوگ کون ہوں گے' ان کی کیا شان ہوگی اور وہ کس کیفیت میں ہوں گے۔ مَيْمَنَة ''یمین'' سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں' اور ''یُمن'' سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی برکت اور خوش نصیبی کے ہیں۔ اس اعتبار سے اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَة کا ترجمہ مبارک لوگ یا خوش نصیب اور نیک بخت لوگ بھی ہو سکتا ہے۔

آیت ۹ ﴿وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝۹﴾ ''اور جو بائیں والے ہوں گے' تو کیا حال ہوگا بائیں والوں کا!''

مَشْئَمَة ''شئوم'' سے ہے' جس کے معنی بدنصیبی اور نحوست کے ہیں۔ عربوں کے ہاں جس طرح داہنی جانب خوش قسمتی اور برکت کی علامت سمجھی جاتی تھی اسی طرح بائیں جانب کو منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ان دونوں مادوں میں مستقل طور پر برکت اور نحوست کے معنی بھی شامل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَة

کا دوسرا ترجمہ بدقسمت' بدبخت اور برے لوگ بھی کیا گیا ہے۔ اردو لفظ ''شوم'' (شومئی قسمت وغیرہ) بھی اسی سے مشتق ہے۔ بہرحال دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوگا جو دربارِ الٰہی میں بائیں جانب کھڑے کر دیے جائیں گے اور بہت برے انجام سے دوچار ہوں گے۔

آیت ۱۰ ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿۱۰﴾﴾ ''اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔''

آیت ۱۱ ﴿اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾ ''وہی تو بہت مقرب ہوں گے۔''

یعنی تیسرا گروہ مقربین بارگاہ پر مشتمل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے قرب سے نوازنا چاہتا ہے اور اس کے لیے قرآن میں جابجا ترغیبی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ سورۃ المائدۃ میں تو امر کے صیغے میں فرمایا گیا: ﴿وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ﴾ (آیت ۳۵) کہ تم اس کا قرب تلاش کرو اور اس کے لیے اس کی راہ میں جہاد کرو۔ ظاہر ہے جو کوئی اللہ کی راہ میں جان و مال کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے گا اللہ تعالیٰ اسے ضرور اپنے مقربین میں شامل فرمائیں گے۔

آیت ۱۲ ﴿فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۱۲﴾﴾ ''یہ نعمتوں والے باغات میں ہوں گے۔''

آیت ۱۳ ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ''یہ بڑی تعداد میں ہوں گے پہلوں میں سے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''اور تھوڑے ہوں گے پچھلوں میں سے۔''

بعض مفسرین کے نزدیک یہاں اَوَّلِین سے پہلی اُمتیں اور آخِرین سے یہ اُمت مراد ہے۔ لیکن اگر اس مفہوم کو درست سمجھا جائے تو اس سے الٹا یہ ثابت ہوگا کہ پہلی اُمتیں اس اُمت کے مقابلے میں بہتر اور افضل تھیں۔ اس لیے زیادہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرے کو ہر اُمت کے اولین اور آخرین سے متعلق سمجھا جائے۔ یعنی ہر اُمت کے اَوَّلِین (ہر نبی کے ابتدائی پیروکاروں) میں سے مقربین کی تعداد زیادہ ہوگی' جبکہ ہر اُمت کے آخِرِیْنَ میں سے بہت کم لوگ اس درجے تک پہنچ پائیں گے۔ اور یہی معاملہ اس اُمت کا بھی ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اِنَّ خَیْرَکُمْ قَرْنِیْ، ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ، ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ، ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ))[1] یعنی اس اُمت کا بہترین زمانہ حضور ﷺ کا زمانہ تھا۔ اس دور کے لوگ کثیر تعداد میں مقربین بارگاہ کے درجے تک پہنچے' کیونکہ جس قدر قربانیاں ان لوگوں نے دیں پچھلے زمانہ کے لوگوں نے نہیں دیں۔ تاہم یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ یعنی ہر دور میں لوگ صدیقین کے مقام تک بھی پہنچیں گے اور شہادتِ عظمیٰ کا درجہ بھی حاصل کریں گے' لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوگی' جبکہ زیادہ تر مؤمنین ''صالحین'' کے درجے تک پہنچ پائیں گے۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت سے واضح ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ......﴾ (آیت ۱۰۰) ''اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ ومتعدد مقامات' ح: ۶۴۲۸' ۶۶۹۵۔ وصحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابۃ' باب فضل الصحابۃ ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم' ح: ۲۵۳۵۔ واللفظ لہ۔

انصار میں سے‘ اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی احسان کے ساتھ......‘‘ یعنی ’’سابقون الاولون‘‘ تو آگے نکل جانے والے ہوں گے جبکہ کچھ لوگ اسی راستے پر ان کے پیچھے آنے والے بھی ہوں گے۔ یہ عام مؤمنین صالحین ہوں گے جنہیں آیات زیر مطالعہ میں اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ اور اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ کے القاب سے نوازا گیا ہے۔ چنانچہ ہر اُمت کے پہلے دور کے اہل ایمان میں سے نسبتاً زیادہ لوگ ’’مقربین‘‘ ہونے کی سعادت حاصل کریں گے جبکہ بعد کے ادوار میں بہت کم لوگ اس درجہ تک پہنچ پائیں گے۔ جیسے آج حضور ﷺ کی امت کی تعداد ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ ہے لیکن ان میں مقربین آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہوں گے۔

آیت ۱۶٬۱۵ ﴿عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَۃٍ ﴿۱۵﴾ مُّتَّکِـِٕیۡنَ عَلَیۡہَا مُتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۱۶﴾﴾ ’’جڑاؤ تختوں پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے آمنے سامنے۔‘‘

آیت ۱۷ ﴿یَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ ’’ان پر گردش کر رہے ہوں گے وہ لڑکے جو سدا اسی طرح رہیں گے۔‘‘

عام طور پر گھروں میں چھوٹی عمر کے لڑکوں کو ملازم رکھا جاتا ہے اور وہ آپ کے مزاج اور ذوق سے واقف ہوجاتے ہیں‘ لیکن بڑے ہونے پر انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر سے نکالنا پڑتا ہے۔ جبکہ جنت میں چھوٹے لڑکے (غلمان) جو اہل جنت کی خدمت پر مامور ہوں گے وہ ’’بڑے‘‘ نہیں ہوں گے بلکہ ہمیشہ لڑکپن کی عمر میں ہی رہیں گے۔

آیت ۱۸ ﴿بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۬ۙ وَ کَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ﴿۱۸﴾﴾ ’’آب خورے‘ صراحیاں اور شرابِ خالص کے جام لیے ہوئے۔‘‘

اہلِ جنت کی محفلوں میں خوبصورت غلمان نہایت شفاف قسم کی شراب کے مینا و جام لیے ہر وقت محوِ گردش رہیں گے۔

آیت ۱۹ ﴿لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡہَا وَ لَا یُنۡزِفُوۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ ’’(اس سے) نہ تو ان کے سروں میں کوئی گرانی ہوگی اور نہ ہی وہ بہکیں گے۔‘‘

دنیا کی شراب پینے سے تو سر چکرانے لگتا ہے اور آدمی مدہوش ہوجاتا ہے‘ بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے‘ لیکن جنت کی ’’شرابِ طہور‘‘ کو اس شراب پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں ایسی کسی خرابی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

آیت ۲۰ ﴿وَ فَاکِہَۃٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ ’’اور میوے جو وہ پسند کریں گے۔‘‘

آیت ۲۱ ﴿وَ لَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ’’اور پرندوں کے گوشت جو انہیں مرغوب ہوں گے۔‘‘

خوب صورت ابدی لڑکے یہ سب نعمتیں اہل جنت کی خدمت میں پیش کر رہے ہوں گے۔

آیت ۲۲ ﴿وَ حُوۡرٌ عِیۡنٌ ﴿۲۲﴾﴾ ’’اور حوریں ہوں گی بڑی بڑی آنکھوں والی۔‘‘

نوٹ کیجیے یہاں اس جنت کی نعمتوں میں حوروں کا ذکر بھی ہوا ہے لیکن اگلی آیات میں اصحاب الیمین کی جنت کے تذکرے میں ’’حُوۡرٌ‘‘ کا لفظ نہیں آیا۔ یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن میں نچلے درجے کی جنت کا ذکر پہلے

جبکہ حوروں والی جنت (اونچے درجے کی جنت) کا ذکر بعد میں آیا ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین کی اسی ترتیب کو میں نے ابتدا میں عکسی ترتیب (mirror image) کا نام دیا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿٢٣﴾﴾ ''جیسے موتی ہوں چھپا کر رکھے گئے۔''

آیت ۲۴ ﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾﴾ ''یہ بدلہ ہوگا ان کے اعمال کا جو وہ کرتے رہے تھے۔''

یہ ان قربانیوں کا صلہ ہوگا جو انہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے دی ہوں گی۔

آیت ۲۵ ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿٢٥﴾﴾ ''وہ نہیں سنیں گے اس میں کوئی لغو بات اور نہ ہی کوئی الزام۔''

آیت ۲۶ ﴿اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿٢٦﴾﴾ ''مگر (ان کے لیے' ہر طرف سے) سلام سلام ہی کی آوازیں ہوں گی۔''

یہ تو تھا مقربین اور ان کی جنت کا بیان' اب آگے اصحاب الیمین اور ان کی جنت کا ذکر ہے۔

آیت ۲۷ ﴿وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿٢٧﴾﴾ ''اور اصحاب الیمین! کیا کہنے ہیں اصحاب الیمین کے!''

آیت ۲۸ ﴿فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿٢٨﴾﴾ ''وہ ہوں گے بیری کے درختوں میں جن میں کانٹے نہیں ہوں گے۔''

آیت ۲۹ ﴿وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿٢٩﴾﴾ ''اور تہ بر تہ کیلے۔''

آیت ۳۰ ﴿وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿٣٠﴾﴾ ''اور پھیلے ہوئے سائے۔''

آیت ۳۱ ﴿وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿٣١﴾﴾ ''اور بہتا ہوا پانی۔''

آیت ۳۲ ﴿وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿٣٢﴾﴾ ''اور کثرت کے ساتھ میوے۔''

آیت ۳۳ ﴿لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿٣٣﴾﴾ ''نہ ٹوٹے ہوئے اور نہ ہی پہنچ سے باہر۔''

جنت کے پھل درختوں سے توڑ کر انہیں پیش نہیں کیے جائیں گے بلکہ جب وہ پھل حاصل کرنا چاہیں گے درخت خود ان کے سامنے جھک جائیں گے۔ تمام پھل بکثرت بے روک ٹوک ملیں گے۔ کوئی پھل ایسا نہیں ہوگا جو ان کی پہنچ سے باہر ہو یا اسے کھانا ممنوع قرار دیا گیا ہو۔

آیت ۳۴ ﴿وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿٣٤﴾﴾ ''اور اونچے اونچے بچھونے۔''

آیت ۳۵ ﴿اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿٣٥﴾﴾ ''ان (کی بیویوں) کو اٹھایا ہے ہم نے بڑی اچھی اُٹھان پر۔''

آیت ۳۶ ﴿فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿٣٦﴾﴾ ''پس ہم نے بنایا ہے انہیں کنواریاں۔''

آیت ۳۷ ﴿عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿٣٧﴾﴾ ''پیار دینے دلانے والیاں' ہم عمر۔''

آیت ۳۸ ﴿لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٣٨﴾﴾ ''(یہ سب کچھ ہوگا) اصحاب الیمین کے لیے۔''

آیت ۳۹ ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''جو پہلوں میں سے بھی بہت ہوں گے۔''

آیت ۴۰ ﴿وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''اور پچھلوں میں سے بھی بہت ہوں گے۔''

اب اس کے بعد اہل جہنم کا تذکرہ ہے۔

آیات ۴۱ تا ۵۶

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ۬ مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾
لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿۴۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ
الْعَظِيْمِ ﴿۴۶﴾ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ۬ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾ اَوَاٰبَاۤؤُنَا
الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ۬ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾
ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّاۤلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا
الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ
الدِّيْنِ ﴿۵۶﴾

آیت ۴۱ ﴿وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ۬ مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور بائیں والے! کیا (ہی برا) حال ہوگا بائیں والوں کا!''

آیت ۴۲ ﴿فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾﴾ ''وہ ہوں گے تیز لو اور کھولتے ہوئے پانی میں۔''

آیت ۴۳ ﴿وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور کالے دھوئیں کے سائے میں۔''

آیت ۴۴ ﴿لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿۴۴﴾﴾ ''نہ وہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ ہی سکون بخش۔''

آیت ۴۵ ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''یہ لوگ اس سے پہلے (دنیا میں) بڑے خوشحال تھے۔''

دنیا میں انہیں ہر طرح کا عیش وآرام میسر تھا۔ وہاں انہوں نے خوب مزے کیے۔

آیت ۴۶ ﴿وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿۴۶﴾﴾ ''اور یہ اصرار کرتے تھے بہت بڑے گناہ پر۔''

بہت بڑے گناہ سے یہاں شرک مراد ہے' جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۃ النساء میں حتمی فیصلہ دیا جا چکا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۤءُ﴾ (آیت ۴۸) کہ اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ کیے گئے شرک کو کبھی نہیں بخشے گا' اس کے علاوہ جس کو چاہے گا بخش دے گا۔

آیت ۴۷ ﴿وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ۬ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور وہ یہ کہا کرتے تھے کہ کیا ہم جب مر جائیں گے اور ہو جائیں مٹی اور ہڈیاں تو کیا پھر سے اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟''

آیت ۴۸ ﴿اَوَاٰبَاۤؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور کیا ہمارے آباء واجداد بھی جو پہلے گزر چکے ہیں؟''

آیت ۴۹ ﴿قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ یقیناً پہلے بھی اور پچھلے بھی۔''

آیت ۵۰ ﴿لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾﴾ ''لازماً جمع کیے جائیں گے ایک مقرر دن کے طے شدہ وقت پر۔''

آیت ۵۱ ﴿ثُمَّ اِنَّکُمْ اَیُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُکَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾ ''پھر تم' اے گمراہو اور جھٹلانے والو!''

آیت ۵۲ ﴿لَاٰکِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾﴾ ''ضرور کھاؤ گے زقوم کے درخت سے۔''

تم بھٹکے ہوئے تھے' ہم نے تمہاری راہنمائی کے لیے اپنا رسولؐ بھیجا' کتاب ہدایت بھیجی: ﴿تَبْصِرَةً وَّذِکْرٰی لِکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ﴿۸﴾﴾ (ق) یہ سب کچھ تمہاری آنکھیں کھولنے کے لیے تھا۔ لیکن اس کے باوجود تم نے ہمارے رسولؐ کو بھی جھٹلا دیا' ہماری کتاب کی بھی تکذیب کی اور گمراہ رہنے کو ہی ترجیح دی۔ تو اے بھٹکے ہوئے اور ہماری ہدایت کو جھٹلانے والے لوگو! اب جہنم کے اندر تمہاری ضیافت زقوم کے درخت سے ہی کی جائے گی۔(1)

آیت ۵۳ ﴿فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ''پس اسی سے تم اپنے پیٹ بھرو گے۔''

آیت ۵۴ ﴿فَشٰرِبُوْنَ عَلَیْهِ مِنَ الْحَمِیْمِ ﴿۵۴﴾﴾ ''پھر پیو گے اس پر کھولتا ہوا پانی۔''

آیت ۵۵ ﴿فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِیْمِ ﴿۵۵﴾﴾ ''اور ایسے پیو گے جیسے پیاس کا مارا اونٹ پیتا ہے۔''

جس طرح پیاس زدہ اونٹ جلدی جلدی اپنے پیٹ میں پانی بھرتا چلا جاتا ہے تم بھی وہ کھولتا ہوا پانی اسی طرح اپنے پیٹو میں بھرو گے۔

آیت ۵۶ ﴿هٰذَا نُزُلُهُمْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۵۶﴾﴾ ''یہ ہوگی ان کی ابتدائی ضیافت جزا کے دن۔''

---

(1) زقوم کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ اَنَّ قَطْرَةً مِنَ الزَّقُّوْمِ قُطِرَتْ فِیْ دَارِ الدُّنْیَا لَاَفْسَدَتْ عَلٰی اَهْلِ الدُّنْیَا مَعَایِشَهُمْ فَکَیْفَ بِمَنْ یَکُوْنُ طَعَامَهٗ)) (سنن الترمذی' ابواب صفة جهنم' باب ما جاء فی صفة شراب اهل النار)

''اگر زقوم کا ایک قطرہ بھی دنیا میں ٹپکا دیا جائے تو دنیا والوں کے لیے ان کی زندگی برباد کر دے' تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کی غذا ہی یہی ہوگی!''

''زقوم'' صحرائے عرب کا ایک درخت ہے' جس کے بارے میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

''زقوم ایک قسم کا درخت ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزہ اس کا تلخ ہوتا ہے' بو ناگوار ہوتی ہے اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔'' (تفہیم القرآن' جلد ۴' ص ۲۸۹)

اس کے بارے میں مفتی محمد شفیعؒ رقم طراز ہیں:

''بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سانپ بچھو وغیرہ دنیا میں بھی ہوتے ہیں اسی طرح دوزخ میں بھی ہوتے ہیں' لیکن دوزخ کے سانپ بچھو یہاں کے سانپ بچھوؤں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوں گے' اسی طرح دوزخ کا زقوم بھی اپنی جنس کے لحاظ سے تو دنیا ہی کے زقوم کی طرح ہوگا' لیکن یہاں کے زقوم سے کہیں زیادہ کریہہ المنظر اور کھانے میں کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوگا' واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!'' (معارف القرآن' جلد ۷' ص ۲۴۱)

یہاں پر ان تینوں گروہوں کا بیان مکمل ہو گیا۔ یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن میں جہنم اور جنت کے حوالے سے ان تینوں گروہوں کا تذکرہ سورۃ کے آخر میں آیا تھا' جبکہ یہاں ان کا ذکر سورت کے آغاز میں آیا ہے۔ یعنی دونوں سورتوں کے مضامین معکوس ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔ اسی عکسی ترتیب کے تحت اب سورت کے دسرے رکوع میں وہ مضمون آ رہا ہے جو سورۃ الرحمٰن کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے۔ سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی خلاقی اور صناعی کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان بنائے' زمین بنائی' زمین میں دریا چلائے' سمندر پھیلائے۔ دریاؤں اور سمندروں کی تہوں میں عجیب وغریب قسم کے موتی اور مونگے پیدا کیے اور پہاڑوں جیسے بڑے بڑے جہازوں کا پانی کی سطح پر تیرنا ممکن بنایا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی قدرتوں کے مظاہر ہیں۔ چنانچہ اسی انداز سے یہاں اس سورت میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور صناعی کا ذکر ہونے جا رہا ہے' لیکن پے در پے سوالات کے ساتھ بہت ہی خوبصورت اور مؤثر انداز میں:

آیات ۵۷ تا ۷۴

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ
الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ
وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا
تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ
تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾
ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾
اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا
تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ ع ۲ ۱۵

آیت ۵۷ ﴿نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾﴾ ''ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے' تو تم لوگ تصدیق کیوں نہیں کرتے؟''

جب یہ تسلیم کرتے ہو کہ تم سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو پھر تم لوگوں کو یہ یقین کیوں نہیں آتا کہ وہی اللہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں آخر تعجب اور شک والی کون سی بات ہے؟

آیت ۵۸ ﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ ''کیا تم نے کبھی غور کیا اس پر جو (منی) تم ٹپکا دیتے ہو؟''

آیت ۵۹ ﴿ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ ''کیا اس کی تخلیق تم کرتے ہو یا ہم تخلیق کرنے والے ہیں؟''

تم تو پانی کی وہ بوند ٹپکا کر فارغ ہو جاتے ہو۔ اس کے بعد رحم مادر میں ایک حیرت انگیز تخلیقی عمل کا آغاز

ہو جاتا ہے۔ وہ نطفہ علقہ میں تبدیل ہوتا ہے' علقہ سے مغضہ بنتا ہے۔ پھر ہڈیاں بنتی ہیں' جوڑ بند درست ہوتے ہیں' آنکھوں' کانوں اور دوسرے اعضاء کا نقشہ تیار ہوتا ہے اور یہ سارا عمل تین پردوں ﴿فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ﴾ (الزمر:٦) کے اندر پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ کیا اس سارے عمل میں تمہارا بھی کوئی حصہ ہے؟ ماں کے پیٹ میں مختلف پیچیدہ تخلیقی مراحل سے گزرتے ہوئے بچے کے کسی عضو کے بنانے میں کیا کوئی تمہارا کردار بھی ہے؟ یا اس کی تذکیر و تانیث میں تمہارا کچھ اختیار ہے؟ ظاہر ہے اس پورے تخلیقی عمل میں تمہارا حصہ یا کردار بالکل نہیں ہے' اور تم تسلیم کرتے ہو کہ نہیں ہے' تو پھر اس حقیقت کو قبول کیوں نہیں کر لیتے ہو کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی و منشاء اور صناعی و خلاقی کا مظہر ہے۔

جب ہم ان آیات کی تلاوت کریں تو ہر سوال کے جواب میں عجز و انکساری سے عرض کرنا چاہیے: بَلْ اَنْتَ یَارَبِّ! کہ اے میرے پروردگار! یہ سب تیری کاریگری' تیری صناعی اور تیری خلاقی کا مظہر ہے' اس میں سے ہمارے بس میں کچھ بھی نہیں۔ (تفسیر عثمانی کے مطابق بعض روایات کی بنا پر علماء نے یہ مستحب سمجھا ہے۔)

آیت ٦٠'٦١ ﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَیْنَکُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ۝ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَکُمْ﴾

''ہم نے تمہارے مابین موت کو ٹھہرا دیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری مثل بدل کر لائیں''

یہ مقام بھی مشکلات القرآن میں سے ہے۔ بہرحال اس کی ایک توجیہہ جو میری سمجھ میں آتی ہے' وہ یہ ہے کہ یہاں دو انسانی زندگیوں اور ان کے درمیان طے شدہ موت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ایک دنیا کی زندگی ہے اور دوسری آخرت کی زندگی اور درمیان میں اللہ تعالیٰ نے موت کا پردہ حائل کر دیا ہے۔ موت کی اس سرحد کے اس طرف بھی تم ہو اور دوسری طرف بھی تم ہو۔ گویا موت کے وقفے کے بعد زندگی کا تسلسل پھر سے بحال ہو جائے گا۔ بقول شاعر ؎

موت اِک زندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

یہاں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم تو مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے' جبکہ اس کی روح کو موت نہیں آتی' روح زندہ رہتی ہے۔ قیامت میں انسان کو جس جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جائے گا وہ بعینہٖ اس کا دنیا والا جسم نہیں ہوگا' بلکہ ''اس جیسا'' جسم ہوگا۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ انسان کا دُنیوی زندگی والا جسم تو اس زندگی میں بھی مسلسل بدلتا رہتا ہے۔ زندہ جسم کے اربوں خلیے مسلسل ختم ہوتے رہتے ہیں اور ایسے ہی نئے خلیے مسلسل بنتے رہتے ہیں۔ جلد کی جھلی بھی بدلتی رہتی ہے اور ناخن بھی لگاتار گھستے اور نئے بنتے رہتے ہیں۔ اس عمل کو ذہن میں رکھیں تو یہ حقیقت بخوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ایک انسان کا چند سال پہلے جو جسم تھا آج اس کا جسم وہ نہیں ہے اور جو جسم اس کا آج ہے چند سال بعد بعینہٖ یہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ جب انسان کا جسم مسلسل تبدیل ہو رہا ہے تو آخرت میں اسے بعینہٖ دنیا والا جسم ملنا ویسے ہی بعید از قیاس ہے۔ اگر وقتی طور پر یہ فرض کر لیا جائے کہ انسان کو آخرت میں دنیا والا جسم ملے گا تو پھر اس سوال کا جواب بھی دینا پڑے گا کہ وہ اس کا کون سا جسم ہوگا؟ بیس برس کی عمر والا؟ چالیس سال کی عمر والا؟ یا ساٹھ سال کی عمر والا؟ لہٰذا یہ بات عقل اور منطق ہی کے خلاف

ہے کہ انسان کو دوبارہ دنیا والے جسم کے ساتھ زندہ کیا جائے گا۔

چنانچہ آخرت میں انسان کو دنیا کے جسم جیسا جسم دیا جائے گا اور اس کی روح کو اس کے اس جسم سے ملا کر اسے نئی زندگی بخشی جائے گی۔ یہ مضمون قرآن میں تین مقامات (بنی اسرائیل:۹۹' یٰسٓ:۸۱' الدھر:۲۸) پر آیا ہے۔ بہرحال دوبارہ زندہ ہونے کے بعد انسان کی جان اور روح جب نئے جسم میں منتقل ہو جائے گی تو اس کے شعور اور اس کی یادداشت کا دنیوی تسلسل بعینہٖ بحال کر دیا جائے گا۔ دنیا میں وہ کیا تھا؟ وہاں اس نے کب کیا کیا تھا؟ زندہ ہوتے ہی اسے سب کچھ یاد آ جائے گا۔ کیونکہ دُنیوی زندگی کے دوران اس کا جسم تو بدلتا رہا تھا لیکن اس کے شعورِ ذات کا تسلسل بغیر کسی خلل کے آخر تک برقرار رہا تھا۔ اس لیے وہ سلسلہ موت کے باعث جہاں سے ٹوٹا تھا عین وہیں سے اسے جوڑ دیا جائے گا۔ چنانچہ ان آیات کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ اے لوگو! تمہاری دو زندگیوں کے درمیان ہم نے ہی موت کا پردہ حائل کر رکھا ہے' تو کیا ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ تم جیسے وجود دوبارہ پیدا کر دیں۔

﴿وَنُنْشِـئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۱﴾ ''اور تمہیں ایسی تخلیق میں اٹھائیں جسے تم نہیں جانتے!''

اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ تمہیں ہم ایسے عالم میں اٹھا کھڑا کریں گے جس کی کیفیت سے آج تم واقف نہیں ہو یعنی عالم آخرت میں۔

آیت ۶۲ ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى﴾ ''اور تم (اپنی) پہلی زندگی کے بارے میں تو جانتے ہی ہو''

یعنی اپنی دنیوی تخلیق سے متعلق تمام مراحل کے بارے میں تو تم جانتے ہو۔ انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر قرآن مجید میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے' سورۃ المؤمنون کی یہ آیات اس موضوع پر قرآن کے ذروۂ سنام کا درجہ رکھتی ہیں:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝۱۲ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝۱۳ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝۱۴﴾

''ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے خلاصے سے۔ پھر ہم نے اسے بوند کی شکل میں ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو علقہ کی شکل دے دی' پھر علقہ کو ہم نے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر ہم نے گوشت کے اس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر ہم نے اسے ایک اور ہی تخلیق پر اٹھا دیا۔ پس بڑا بابرکت ہے اللہ' تمام تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والا۔''

تو جب اس حیرت انگیز اور پیچیدہ تخلیقی عمل کے مختلف مراحل تمہارے علم اور مشاہدے میں آ چکے ہیں:

﴿فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۶۲﴾ ''تو پھر تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟''

تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟ تم اس سے نصیحت اور یاد دہانی کیوں اخذ نہیں کرتے؟ —— اللہ تعالیٰ کی قدرت اور صناعی کے ان مظاہر کا ادراک کر لینے کے بعد بھی تمہیں یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ جس اللہ نے اس عمل سے گزار کر ہمیں ابتدا میں پیدا کیا ہے وہ دوبارہ بھی ہمیں پیدا کر سکتا ہے؟

آئندہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی خلاقی کی چند اور مثالیں بیان کی جا رہی ہیں:

آیت ۶۳ ﴿اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ﴿۶۳﴾﴾ ''کیا تم نے کبھی غور کیا کہ یہ بیج جو تم بوتے ہو؟''

تم لوگ تو بیج کو مٹی میں دبا کر آ جاتے ہو۔ اس کے بعد تم کیا جانو کہ وہ بیج کس کس مرحلے سے گزرتا ہے' کس طرح اس کی جڑیں نکل کر زمین میں پیوست ہوتی ہیں اور کس طرح اس کی کونپلیں زمین کو پھاڑ کر باہر نکلتی ہیں!

آیت ۶۴ ﴿ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ﴿۶۴﴾﴾ ''کیا تم اسے اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں؟''

یہاں ہماری زبانوں پر بے اختیار یہ الفاظ آ جانے چاہئیں: بَلۡ اَنۡتَ يَارَبِّ! کہ نہیں! اے ہمارے پروردگار! اسے تو ہی اُگاتا ہے' اس میں ہمارا کچھ بھی اختیار نہیں! علامہ اقبال کی نظم اَلۡاَرۡضُ لِلّٰهِ کے درج ذیل اشعار میں ان ہی آیات کے اسلوب اور مضمون کی جھلک نظر آتی ہے:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے' کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں' تیری نہیں! — تیرے آباء کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں!

یعنی یہ زمین' یہ کائنات' کائنات کا پورا نظام یہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے اور اسی کی قدرت و مشیت سے اس کائنات کا یہ نظام چل رہا ہے۔

آیت ۶۵ ﴿لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰهُ حُطَامًا﴾ ''اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کر دیں''

اگر ہم چاہیں تو کسی آسمانی آفت' طوفان' جھکڑ یا ژالہ باری سے تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری لہلہاتی فصلوں کو برباد کر کے رکھ دیں۔

﴿فَظَلۡتُمۡ تَفَكَّهُوۡنَ ﴿۶۵﴾﴾ ''پھر تم بیٹھے رہو باتیں بناتے ہوئے۔''

آیت ۶۶ ﴿اِنَّا لَمُغۡرَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾﴾ ''(کہ لو جی!) ہم پر تو بڑا تاوان پڑ گیا۔''

کہ ہم نے محنت کی' ہل چلائے' بیج ڈالا' آبیاری کی اور بہت سے دوسرے اخراجات کیے' لیکن ہم پر تو الٹی چٹی پڑ گئی۔

آیت ۶۷ ﴿بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم ہو کر رہ گئے۔''

ہمارا تو سب کچھ برباد ہو گیا۔

آیت ۶۸ ﴿اَفَرَءَيۡتُمُ الۡمَآءَ الَّذِىۡ تَشۡرَبُوۡنَ ﴿۶۸﴾﴾ ''کبھی تم نے غور کیا کہ وہ پانی جو تم پیتے ہو؟''

آیت ۶۹ ﴿ءَاَنۡتُمۡ اَنۡزَلۡتُمُوۡهُ مِنَ الۡمُزۡنِ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡزِلُوۡنَ ﴿۶۹﴾﴾ ''کیا بادلوں سے تم نے اسے برسایا ہے یا ہم ہیں برسانے والے؟''

آیت ۷۰ ﴿لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنٰهُ اُجَاجًا﴾ ''اگر ہم چاہیں تو اسے کڑوا کر دیں''

﴿فَلَوۡلَا تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۰﴾﴾ ''تو تم کیوں شکر ادا نہیں کرتے؟''

آیت ۷۱ ﴿اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ﴾ ''کبھی تم نے سوچا کہ وہ آگ جو تم جلاتے ہو؟''

آیت ۷۲ ﴿ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴾ ''کیا اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے' یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟''

بَلْ اَنْتَ یَارَبِّ! نوٹ کیجیے پے درپے سوالات کا یہ تیکھا اسلوب پورے قرآن میں اور کہیں نہیں ہے۔

آیت ۷۳ ﴿نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ﴾ ''ہم نے بنا دیا اس کو ایک نشانی یاد دولانے کو اور ایک بہت فائدہ مند چیز صحرا کے مسافروں کے لیے۔''

جیسا کہ سورۂ یٰسین کی آیت ۸۰ کے ضمن میں بھی وضاحت کی جا چکی ہے' بعض صحراؤں میں ایسے درخت پائے جاتے ہیں جن کی سبز گیلی شاخوں کو آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ یہاں پر شَجَرَتَهَآ سے وہ مخصوص درخت بھی مراد ہے اور عام درخت بھی۔ کیونکہ درختوں کی لکڑی آگ جلانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اور یہ درخت ظاہر ہے اللہ نے پیدا کیے ہیں اور اسی نے ان میں جلنے کی خصوصیت رکھی ہے۔

آیت ۷۴ ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ﴾ ''پس تم تسبیح بیان کرو اپنے ربّ کے نام کی جو بہت عظمت والا ہے۔''

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ!

اب اگلی آیات میں قرآن کی عظمت کا بیان ہے۔ ان آیات کے مطالعہ سے پہلے عظمت قرآن کے حوالے سے سورۃ الرحمٰن کے آغاز کی یہ عظیم آیات بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ① عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ② خَلَقَ الْاِنْسَانَ ③ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ④﴾۔ قرآن کی عظمت کے اس بیان کے بین السطور میں یہ پیغام بھی مضمر ہے کہ انسانوں پر اس عظیم کتاب کا حق ادا کرنا لازم ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا یہ فرمان بھی ہم ان آیات کے ضمن میں پڑھ آئے ہیں: ((خَیْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) کہ تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو خود قرآن سیکھتے اور دوسروں کو سکھاتے ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین چونکہ عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں' اس لیے عظمت قرآن کا وہ مضمون جو سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں آیا تھا' اس سورت کے آخر میں آ رہا ہے اور سورۃ الرحمٰن کی مذکورہ چار آیات کے مقابلے میں یہاں اس موضوع پر آٹھ آیات آئی ہیں۔

آیات ۷۵ تا ۸۲

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ۝ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَفَبِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝

آیت ۷۵ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴾ ''پس نہیں! قسم ہے مجھے ان مقامات کی جہاں ستارے

ڈوبتے ہیں۔‘‘

بعض مفسرین نے مَوَاقِعِ النُّجُوم کی وضاحت شہابِ ثاقب کے حوالے سے کی ہے‘ حالانکہ شہابِ ثاقب بالکل مختلف چیز ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اسے شیاطین کو عالَمِ بالا سے مار بھگانے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ موجودہ دور میں سائنس کی فراہم کردہ معلومات کی مدد سے اس آیت کو نسبتاً بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے‘ اگرچہ ابھی بھی اس کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوا۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ حلال و حرام‘ جائز و ناجائز‘ فرائض اور دین کے عملی پہلو سے متعلق قرآنی احکام کی تفہیم و تعمیل کے حوالے سے ہمیں راہنمائی کے لیے ’’دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!‘‘ کے مصداق پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہیے۔ اس ضمن میں ہماری نظری و عملی اطاعت کا کمال یہ ہوگا کہ ہم اپنے اسلاف کا دامن تھامے رکھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اتباع کو لازم جانیں۔ یہاں تک کہ اس حوالے سے خود کو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں پہنچا دیں‘ بقول اقبال: ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر باوٗ نہ رسیدی تمام بولہبی است!

البتہ دوسری طرف کائنات کی تخلیق‘ کائنات میں زندگی کی ابتدا‘ تاریخی حوالہ جات اور سائنس کے مختلف شعبوں سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح و تعبیر کے لیے ہمیں ہر دور کے اجتماعی انسانی شعور اور دستیاب حقائق و معلومات کو مدنظر رکھنا چاہیے‘ پھر جہاں مناسب معلوم ہو ان معلومات سے استفادہ بھی کرنا چاہیے اور جب ممکن نظر آئے تکلف سے اجتناب کرتے ہوئے فطری انداز میں قرآنی الفاظ و معانی کا زمینی حقائق کے ساتھ تطابق ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ ایسی آیات کا جو مفہوم آج سے ہزار سال پہلے سمجھا گیا تھا آج ہم اس مفہوم کو ماننے اور درست جاننے کے پابند نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ایسی آیات کا تعلق حکمت سے ہے‘ کسی حکم سے نہیں ہے۔ چنانچہ حکمت اور سائنس کے میدان میں تو نئے نئے افق تلاش کرنے کے لیے مستقبل کی طرف دیکھنا چاہیے‘ لیکن احکام اور دین کے عملی پہلو کو سمجھنے‘ سمجھانے کے لیے ماضی سے تعلق جوڑنے اور حضور ﷺ کے فرمان مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ کو مشعل راہ بنائے رکھنے کی ضرورت ہے۔

اب آیئے آیت زیر مطالعہ کو موجودہ دور کی سائنسی معلومات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ موجودہ دور میں سائنس دانوں نے کائنات کے اندر ایسے بے شمار بڑے بڑے اندھے غاروں کا کھوج لگایا ہے جو اپنے پاس سے گزرنے والی ہر چیز کو نگل جاتے ہیں۔ سائنس دانوں نے ان ’’غاروں‘‘ کو Black Holes کا نام دیا ہے۔ ایسے کسی ایک بلیک ہول کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے ستارے پلک جھپکنے میں غائب ہو جاتے ہیں‘ بلکہ ایسے کروڑوں ستاروں پر مشتمل کہکشائیں بھی ایسے بلیک ہولز کے اندر گم ہو کر معدوم ہو جاتی ہیں۔ سائنسی تحقیقات سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ کائنات کے اندر مسلسل نئے نئے ستارے جنم لے رہے ہیں اور نئی نئی کہکشائیں وجود میں آ رہی ہیں‘ جبکہ ساتھ ہی ساتھ بے شمار کہکشائیں اپنے اَن گنت ستاروں کے ساتھ مسلسل بلیک ہولز کی نذر ہو کر معدوم ہو رہی ہیں۔ اگرچہ کائنات کے اسرار و رموز سے متعلق آج بھی انسان کی معلومات بہت محدود ہیں لیکن پھر بھی بلیک ہولز کے متعلق اب تک

حاصل ہونے والی یہ معلومات بہت ہوشربا ہیں۔

اب اگر ہم اپنی زمین کی جسامت اور وسعت کا نقشہ ذہن میں رکھیں' پھر اس کے مقابلے میں سورج کی جسامت کا اندازہ کریں' پھر یہ تصور کریں کہ کائنات میں ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے اربوں کھربوں ستارے بھی موجود ہیں اور ان ستاروں کے درمیان اربوں نوری سالوں کے فاصلے ہیں' پھر یہ تصور کریں کہ ایسے اَن گنت ستاروں پر مشتمل ان گنت کہکشائیں ہیں' اور ان کہکشاؤں کے درمیانی فاصلے بھی اسی تناسب سے ہیں۔ کہکشاؤں اور ستاروں سے متعلق یہ تمام معلومات ذہن میں رکھ کر اگر ہم کائنات کے طول وعرض میں موجود لاتعداد بلیک ہولز کا تصور کریں اور پھر یہ نقشہ ذہن میں لائیں کہ ان میں سے ایک ایک بلیک ہول اتنا بڑا ہے کہ وہ اپنے پاس سے گزرنے والی کسی بڑی سے بڑی کہکشاں کو آنِ واحد میں ایسے نگل جاتا ہے کہ اس کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا اور پھر ان بلیک ہولز کا اطلاق مَوٰقِعِ النُّجُوْمِ پر کریں تو شاید ہمیں کچھ کچھ اندازہ ہو جائے کہ اس آیت میں جس قسم کا ذکر ہوا ہے وہ کتنی بڑی قسم ہے۔

آیت ۷۶ ﴿وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴾ ''اور یقیناً یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو!''

یعنی ابھی تم مَوٰقِعِ النُّجُوْمِ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ایک وقت آئے گا جب تمہیں ان کی حقیقت سے متعلق معلومات حاصل ہو جائیں گی' پھر تمہیں احساس ہوگا کہ ہم نے تمہارے سامنے یہ کس قدر عظیم قسم پیش کی ہے۔

آیت ۷۷ ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴾ ''یقیناً یہ بہت عزت والا قرآن ہے۔''

یہاں پر ہم میں سے ہر شخص کو پوری دیانت داری سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ اس نے اپنی حد تک قرآن مجید کی کیا قدر کی ہے اور کس حد تک اس کے حقوق پورے کیے ہیں؟ بہرحال جہاں تک ان حقوق کی ادائیگی کا تعلق ہے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر کسی انسان کو ہزاروں زندگیاں مل جائیں اور وہ انہیں ''قرآن'' کے لیے وقف کر دے' تب بھی قرآن کا حق ادا نہیں ہو سکے گا۔

آیت ۷۸ ﴿فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴾ ''ایک چھپی ہوئی کتاب میں۔''

یہ قرآن کریم ایک پوشیدہ کتاب میں محفوظ ہے۔ سورۃ الزخرف کی آیت ۴ میں اس کِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ کو اُمِّ الْکِتَاب کا نام دیا گیا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ ''اور یہ اُمّ الکتاب میں ہے ہمارے پاس بہت بلند وبالا' بہت حکمت والی!'' جبکہ سورۃ البروج میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾﴾ ''بلکہ یہ قرآن عظیم الشان (کتاب) ہے۔ لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا)۔''

آیت ۷۹ ﴿لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ ''اسے چھو نہیں سکتے مگر وہی جو بالکل پاک ہیں۔''

یعنی اسے فرشتے ہی چھو سکتے ہیں جو بالکل پاک مخلوق ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی عظمت کے ضمن میں سورۂ عبس میں فرمایا گیا ہے: ﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾﴾ ''ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پس جو کوئی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو باعزت ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں۔ ایسے کاتبوں کے ہاتھوں میں

ہیں جو معزز اور نیک ہیں۔"

آیت زیر مطالعہ میں اَلۡمُطَهَّرُوۡنَ سے مراد فرشتے ہیں اور یَمَسُّهٗ میں ہٗ کی ضمیر کا تعلق "کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ" سے ہے۔ مَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ کی قسم کا مقسم علیہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت باعزت اور برتر کلام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک محفوظ کتاب میں ہے، جس تک اُس کے پاک فرشتوں کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں۔ یعنی اس کو صرف ملائکہ مقربین ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں، جنات اور شیاطین وہاں پھٹک بھی نہیں سکتے۔

فقہاء نے اس آیت سے یہ حکم بھی استنباط کیا ہے کہ قرآن مجید کو ناپاکی کی حالت میں چھونے کی اجازت نہیں ہے۔ اس بارے میں فقہاء کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو چھونے اور چھو کر پڑھنے کے لیے وضو ضروری ہے، جبکہ زبانی تلاوت بغیر وضو بھی کی جا سکتی ہے، البتہ جنابت کی حالت میں قرآن مجید کے الفاظ کو زبانی پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ قرآن کے اصل لب لباب تک پہنچنے اور اس کی ہدایت سے مستفیض ہونے کے لیے باطنی صفائی ضروری ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے قرآن کے ظاہر اور باطن کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس طرح ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں پڑھتے ہیں: ﴿ هُوَ الۡاَوَّلُ وَ الۡاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الۡبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید:۳) "کہ وہ اول بھی ہے، آخر بھی ہے، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے"۔ اسی طرح قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ قرآن کا ظاہر اس کی عبارت اور اس کے الفاظ ہیں۔ جہاں تک قرآن کے اس ظاہر کا تعلق ہے ہر عربی دان شخص اس کے معانی و مطالب کو سمجھ سکتا ہے اور اس کی صرف و نحو پر بحث کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے کئی ایسے غیر مسلموں کی مثالیں بھی موجود ہیں جنہوں نے عربی میں مہارت حاصل کر کے قرآن کے تراجم کیے اور تفسیریں لکھیں۔ لیکن ایسے لوگ قرآن کے باطن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اقبال نے اسی مفہوم میں ایسی ہی بات بندۂ مؤمن کے بارے میں کہی ہے:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے!

اقبال نے اس شعر میں بندۂ مؤمن کے وجود کے مرکز کا ذکر کیا ہے۔ بالکل اسی مفہوم میں قرآن مجید کا بھی "مرکز" ہے۔ قرآن کے مرکز سے مراد اس کی روح باطنی، اس کی ہدایت، اس کا اصل علم اور اس کا لب لباب ہے۔ اس لحاظ سے آیت زیر مطالعہ اس حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کرتی ہے کہ قرآن مجید کے مرکز (nucleus) تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تزکیہ باطنی ضروری ہے۔ اس تزکیہ باطنی کا ذکر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا میں بھی ہے:

﴿رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ یُزَكِّیۡهِمۡ ؕ﴾

(البقرۃ: ۱۲۹)

"پروردگار! ان لوگوں میں اٹھائیو ایک رسول خود انہی میں سے جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے۔"

یہاں پر یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اس دعا میں تعلیم کتاب و حکمت کا ذکر پہلے کیا اور

تزکیہ کو آخر پر رکھا‘ لیکن جب حضورﷺ کے حوالے سے ان ہی چار امور کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو ترتیب بدل دی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تین مقامات (البقرۃ:۱۵۱‘ آل عمران:۱۶۴‘ الجمعہ:۲) پر حضورﷺ کی ان ذمہ داریوں کا ذکر کیا اور تینوں مقامات پر تزکیہ کا ذکر تعلیم کتاب وحکمت سے پہلے کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن مجید کی روحِ باطنی تک رسائی کا طالب ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے دل کو تکبر‘ حسد‘ حُبِّ دُنیا سمیت تمام خباثتوں سے پاک کرے‘ ورنہ قرآن مجید کا نور اس کے باطن میں کبھی سرایت نہیں کرے گا اور نہ ہی اس کا اصل فہم اس پر کبھی منکشف ہوگا‘ اگرچہ بظاہر وہ قرآن کا بہت بڑا مفسر ہی کیوں نہ بن جائے۔ تزکیہ باطن کے حوالے سے یہاں سورۂ یونس کی آیت ۵۷ کا پیغام بھی ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کو انسانی دل کی تمام باطنی امراض کے لیے شفا قرار دیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴿۵۷﴾﴾

”اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے اَمراض) کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔“

آیت ۸۰ ﴿تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴿۸۰﴾﴾ ”اس کا اتارا جانا ہے ربّ العالمین کی جانب سے۔“

اور اس کے بعد اب یہ چبھتا ہوا سوال (piercing question) پوچھا جا رہا ہے:

آیت ۸۱ ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ﴿۸۱﴾﴾ ”تو کیا تم لوگ اس کتاب کے بارے میں مداہنت کر رہے ہو؟“

اس آیت کا مفہوم ہمیں تب سمجھ آئے گا جب ہم میں سے ہر ایک خود کو اس کا مخاطب سمجھے کہ یہ آیت براہِ راست اس سے پوچھ رہی ہے کہ اے اللہ کے بندے! کیا تم اپنے دُنیوی معاملات و مفادات کو اللہ کی اس نعمت کے مقابلے میں ترجیح دے رہے ہو؟ کیا تم اس عظیم کتاب کو سیکھنے سکھانے اور سمجھنے میں سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کر رہے ہو؟ ذرا سوچو تو! تم نے کیسے کیسے مشکل علوم وفنون میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ ان علوم کو سیکھنے کے لیے تم نے کیسی کیسی محنت کی ہے اور کتنا وقت کھپایا ہے! اس کے مقابلے میں قرآنی زبان سیکھنے کے لیے تم نے کتنی کوشش کی ہے؟ تو کیا تم نے اپنی دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس قدر عظیم نعمت کو پس پشت ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

آیت ۸۲ ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴿۸۲﴾﴾ ”اور تم نے اپنا نصیب یہ ٹھہرا لیا ہے کہ تم اس کو جھٹلا رہے ہو!“

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی یاد رکھیں کہ قرآن کا جھٹلانا ایک تو زبانی ہے اور دوسرا عملی۔ زبانی اور نظریاتی طور پر تو قرآن مجید کو مشرکین عرب جھٹلاتے تھے یا ہر زمانے کے بہت سے غیر مسلم جھٹلاتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود محمد (ﷺ) کی تصنیف ہے۔ جبکہ عملی طور پر اسے ہم مسلمان جھٹلاتے ہیں۔ ہم نظریاتی طور پر تو اسے اللہ کا کلام مانتے ہیں اور زبان سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر اس کے احکام ماننے سے کھلم کھلا اعراض کرتے ہیں۔

ہماری اس کیفیت کی مثال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے حوالے سے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (الجمعة:۵) کہ جو لوگ حامل تورات بنائے گئے اور پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا' ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔ اگر آپ ایک گدھے پر مکالماتِ افلاطون اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی تمام جلدیں لاد دیں تو ان کتابوں کو اٹھا لینے سے وہ ان کا عالم تو نہیں بن جائے گا۔ اس آیت کی روشنی میں یہودیوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیں تو انہوں نے زبان سے کبھی تورات کی تکذیب نہیں کی' بلکہ وہ ابھی تک اسے اپنے سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید نے مذکورہ آیت میں ان کی جس تکذیب کا ذکر کیا ہے وہ عملی تکذیب ہے۔ بالکل اسی طرح ہم بھی آج قرآن مجید کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں' لیکن عملی طور پر اس کے احکام کی تعمیل سے روگردانی کر کے مذکورہ بالا مثال کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق تو ہمارے اس طرزِ عمل سے قرآن مجید پر ہمارے زبانی ایمان کی بھی تکذیب ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ))(۱) ''جس نے قرآن کی حرام کردہ اشیاء کو اپنے لیے حلال ٹھہرالیا اس کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں۔''

قرآن مجید کی اس عملی تکذیب کے علاوہ آج ہم مسلمان اس کی ''تکذیب حالی'' کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں۔ تکذیب حالی یہ ہے کہ کسی شخص کا حال اس حقیقت کی گواہی دے رہا ہو کہ اس کے نزدیک فلاں چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن مجید کے حوالے سے اپنی تکذیب حالی کو سمجھنے کے لیے آپ اپنے ہاں کے ایک عام ڈاکٹر کی مثال لے لیں۔ اس نے رات دن ایک کر کے پچیس سال کی عمر میں ایم بی بی ایس کیا۔ پھر FRCS کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ امریکہ گیا' وہاں جا کر امتحان دیا۔ وہاں کے بورڈز سے یہ ڈپلومہ' وہ ڈپلومہ......! اس پڑھائی میں اس نے اپنی زندگی کے پینتیس چالیس سال کھپا دیے۔ اس کے بعد وہیں ملازمت اختیار کر لی ...... یا واپس آ کر اپنی ملازمت اور پریکٹس میں کولہو کے بیل کی طرح جت گیا۔ مشن کیا ہے؟ معاش اچھی ہو جائے اور معیارِ زندگی بلند ہو جائے! یہ مشن تو اس نے حاصل کر لیا' لیکن اپنی زندگی کے ماہ و سال میں سے اُس نے قرآن مجید سیکھنے کے لیے کوئی وقت نکالا اور اس کے لیے کوئی محنت کی؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو اس کا حال گویا چیخ چیخ کر گواہی دے رہا ہے کہ اس شخص کی زندگی میں قرآن مجید کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے بارے میں یقین نہیں۔

یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیات میں قرآن کے حقوق ادا کرنے کی ترغیب مثبت انداز میں دلائی گئی تھی' جبکہ یہاں سورۃ الواقعہ کے اختتام پر اسی ترغیب کے لیے منفی انداز اپنایا گیا ہے۔ یعنی سورۃ الرحمٰن کی چار ابتدائی آیات کے بین السطور میں یہ پیغام مضمر تھا کہ اگر رحمٰن نے اپنا کلام ''قرآن'' تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہیں ''بیان'' کی صلاحیت سے بھی نوازا ہے تو تمہاری اس طلاقت لسانی کا بہترین اور لازمی مصرف یہی ہے کہ تم اس صلاحیت کو قرآن کے لیے وقف کر دو۔ جبکہ یہاں سورۃ الواقعہ کی ان آیات میں یہ تنبیہ مضمر ہے کہ جو لوگ

(۱) سنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن' باب ما جاء فیمن قرأ حرفاً من القرآن ماله من الاجر' ح: ۲۹۱۸۔ والمعجم الاوسط للطبرانی: ۳۳۷/۴۔

قرآن کے حقوق کما حقہٗ ادا نہیں کرتے آخرت میں انہیں اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا اور کوتاہی ثابت ہونے پر ان کی سخت گرفت ہوگی۔

آیات ۸۳ تا ۹۶

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا
تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاَمَّآ اِنْ
كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ
الْيَمِيْنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۱﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۹۲﴾
فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۹۳﴾ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۹۵﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ
الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾ ع ۲۲/۱۶

جیسا کہ قبل ازیں بھی بار بار ذکر ہوا ہے کہ سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ باہم جوڑا ہیں اور ان کے مضامین بھی باہم مشابہ و مربوط ہیں۔ البتہ زیر مطالعہ آیات کا مضمون صرف اسی سورت میں آیا ہے۔ اس کے مقابل سورۃ الرحمٰن میں ایسا کوئی مضمون نہیں ہے۔ گویا یہ مضمون اس سورۃ کی اضافی شان ہے۔

آیت ۸۳ ﴿فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾﴾ ''تو کیوں نہیں، جب جان حلق میں آ (کر پھنس) جاتی ہے۔''

آیت ۸۴ ﴿وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾﴾ ''اور تم اُس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو۔''

ان آیات میں ایک انسان کے وقتِ نزع کی کیفیت کا عبرت انگیز نقشہ پیش کر کے دعوتِ فکر دی گئی ہے کہ ذرا سوچو! جب تم میں سے کسی کی جان حلق میں پھنسی ہوتی ہے۔ تم اُس وقت کا تصور کرو جب تم میں سے کسی کے بیٹے، کسی کے بھائی، کسی کے والد، کسی کی والدہ یا کسی کی بیوی پر نزع کا عالم طاری ہوتا ہے اور وہ بے بسی کی تصویر بنے اپنے اس عزیز کی اس کیفیت کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

آیت ۸۵ ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''اور ہم تمہارے مقابلے میں اس سے قریب تر ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں پاتے۔''

یہ تو تخصیص کے ساتھ عالمِ نزع کی کیفیت کا ذکر ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر بندے کے ساتھ ہوتا ہے، جیسا کہ سورۂ قٓ میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہم تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں۔''

آیت ۸۶، ۸۷ ﴿فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''تو اگر تم کسی کے اختیار میں نہیں ہو تو اس (جان) کو لوٹا کیوں نہیں لیتے اگر تم سچے ہو؟''

یہاں الفاظ کی ترتیب اس طرح ہے کہ ان دونوں آیات کو ملانے سے ایک فقرہ مکمل ہوتا ہے۔ قرآن کے

خصوصی اسلوب کی وجہ سے لَوۡلَاۤ پہلی آیت کے شروع میں آ گیا ہے‘ لیکن اس کا مفہوم دوسری آیت کے ساتھ ملنے سے واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ مفہوم کی وضاحت کے لیے یوں سمجھیں کہ ان دونوں آیات میں الفاظ کی اصل ترتیب یوں ہے: فَاِنۡ کُنۡتُمۡ غَیۡرَ مَدِیۡنِیۡنَ‘ لَوۡلَا تَرۡجِعُوۡنَهَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ؟ کہ تم لوگ آئے دن اپنے عزیز واقارب کی اموات کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو تم سب مل کر بھی اور اپنے تمام وسائل استعمال میں لا کر بھی اس کو بچا نہیں پاتے ہو۔ اس معاملے میں تمہارے بڑے بڑے صاحب اختیار واقتدار لوگ بھی بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ شاہی اطباء اور ماہر ڈاکٹرز کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور بادشاہ سلامت ان کی آنکھوں کے سامنے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ تم لوگ دعویٰ کرتے ہو کہ تم خود ہی پیدا ہوتے ہو اور خود ہی مرتے ہو اور تمہاری زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اپنے پیاروں کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر بے بسی کی تصویر بن کر کیوں رہ جاتے ہو؟ اپنے وسائل کو استعمال میں لا کر انہیں بچا کیوں نہیں لیتے ہو؟

اس کے بعد اگلی آیات میں ان تین گروہوں کی جزا وسزا کا تذکرہ ہے جن کا ذکر سورۃ کے آغاز میں ہوا تھا۔

آیت ۸۸ ﴿فَاَمَّاۤ اِنۡ کَانَ مِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ﴿۸۸﴾﴾ ”پھر اگر وہ مقربین میں سے تھا۔“

یعنی اگر مرنے والا شخص سابقون میں سے تھا۔ اپنی زندگی میں ﴿فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ﴾ (المائدۃ:۴۸) کے حکم پر عمل کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مسابقت کرتے ہوئے دوسروں کے لیے مثال بنتا رہا تھا:

آیت ۸۹ ﴿فَرَوۡحٌ وَّ رَیۡحَانٌ ۬ۙ وَّ جَنَّتُ نَعِیۡمٍ ﴿۸۹﴾﴾ ”تو اُس کے لیے راحت اور سرور اور نعمتوں والی جنت ہے۔“

آیت ۹۰ ﴿وَ اَمَّاۤ اِنۡ کَانَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴿۹۰﴾﴾ ”اور اگر وہ اصحاب الیمین میں سے تھا۔“

اگرچہ وہ ”سابقون“ میں سے تو نہیں تھا لیکن نیک تھا اور دین کی خدمت میں حسبِ استطاعت کوشاں رہتا تھا:

آیت ۹۱ ﴿فَسَلٰمٌ لَّکَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴿۹۱﴾﴾ ”تو سلامتی پہنچے آپ کو اصحاب الیمین کی طرف سے۔“

اے نبی ﷺ! آپ اطمینان رکھیں کہ آپ کی امت کے اصحاب الیمین بھی عیش میں ہوں گے اور جنت کی ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے جن کا ذکر سورۃ کے آغاز میں ہو چکا ہے۔(۱)

آیت ۹۲ ﴿وَ اَمَّاۤ اِنۡ کَانَ مِنَ الۡمُکَذِّبِیۡنَ الضَّآلِّیۡنَ ﴿۹۲﴾﴾ ”اور اگر وہ تھا جھٹلانے والوں اور گمراہوں میں سے۔“

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قبل ازیں دوسرے رکوع میں جب اس گروہ کا ذکر ہوا تو وہاں ان لوگوں کو ’اَیُّهَا

---

(۱) اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ اصحاب یمین کی طرف سے اس کا استقبال کیا جائے گا اور اسے سلام کہا جائے گا۔ جب کہ بعض مفسرین نے اس جملے میں اَنۡتَ محذوف مانا ہے۔ یعنی تقدیر عبارت یوں ہے: **فسلام لك انت من اصحٰب الیمین** کہ تیرے لیے اب سلامتی ہی سلامتی ہے‘ تو اصحاب یمین میں شامل ہے! (حاشیہ از مرتب)

الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ'' کہہ کر مخاطب فرمایا گیا تھا' لیکن یہاں پر انہیں ''الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ'' کہا گیا ہے۔ یعنی یہاں پر الفاظ کی ترتیب بدل گئی ہے۔ بظاہر اس کی توجیہہ یہ سمجھ آتی ہے کہ سزا کے حوالے سے ان کے بڑے اور اصل جرم کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ حق کو جھٹلا دینے کے مقابلے میں گمراہی نسبتاً چھوٹا جرم ہے' کیونکہ کسی گمراہ اور بھٹکے ہوئے شخص کو اگر کوئی سیدھا راستہ دکھا دے تو ممکن ہے وہ اسے قبول کر لے۔ لیکن جو حق کو جھٹلا دے اس کا سیدھے راستے پر گامزن ہونا ممکن نہیں۔

آیت ۹۳ ﴿فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۹۳﴾﴾ ''تو اس کے لیے مہمانی ہے کھولتے پانی سے۔''

آیت ۹۴ ﴿وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾﴾ ''اور جہنم میں جلنا۔''

یعنی ان لوگوں کی ابتدائی تواضع تو کھولتے ہوئے پانی سے ہوگی۔ اس کے بعد ان کو جہنم کے اصل عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

آیت ۹۵ ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۹۵﴾﴾ ''یقیناً یہ سب کچھ قطعی حق ہے۔''

بے شک یہ ساری باتیں سچی اور یقینی ہیں۔ یہ سب تفصیلات جو اس سورت میں بیان ہوئی ہیں ان کے بارے میں تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ ہو کر رہنا ہے۔ قیامت کے دن تمام نوعِ انسانی کو مذکورہ بالا تین گروہوں میں تقسیم کر کے ہر گروہ کے افراد کو ان کے اعمال و اعتقادات کے مطابق بدلہ دیا جانا ہے۔

آیت ۹۶ ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾﴾ ''پس آپ تسبیح کیجیے اپنے رب کے نام کی جو کہ بہت عظمت والا ہے۔''

اس کے جواب میں امتثالِ امر کے طور پر کہا جائے گا: سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ! یہ آیت اس سورت میں دو مرتبہ آئی ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ((اِجْعَلُوْهَا فِيْ رُكُوْعِكُمْ))[1] کہ اس کو تم لوگ اپنے رکوع میں رکھ دو۔ چنانچہ حضور ﷺ کے اس فرمان کے مطابق رکوع کی تسبیح سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ اس آیت سے اخذ کی گئی ہے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب الصلاۃ' باب ما یقول الرجل فی رکوعه وسجوده' ح:٨٦٩ وصحیح ابن حبان' ح: ۱۸۹۸ ـــــ اسی طرح جب آیت ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴿۱﴾﴾ (الاعلیٰ) نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِجْعَلُوْهَا فِيْ سُجُوْدِكُمْ)) کہ اس کو تم لوگ اپنے سجدوں میں رکھ دو۔

سُوْرَۃُ الحَدِیْد

تمہیدی کلمات

سورۃ الحدید سے قرآن حکیم کی مکی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی مدنی سورتوں کے سلسلے کا آغاز ہو رہا ہے جو سورۃ التحریم پر اختتام پذیر ہوگا۔ اس ضمنی گروپ میں دس مدنی سورتیں ہیں۔ ان سورتوں کا حجم تقریباً سوا پارے کے برابر ہے' لیکن تعداد کے اعتبار سے یہ پورے قرآن میں مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔ اس حوالے سے پہلے پانچ گروپس کی مدنی سورتوں کی ترتیب کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کرلیں۔ پہلے گروپ میں سورۃ البقرۃ' سورۂ آل عمران' سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ چار مدنی سورتیں ہیں جو تقریباً سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں اور حجم کے اعتبار سے یہ مدنی قرآن کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے گروپ میں سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ دو مدنی سورتیں ہیں۔ پھر تیسرے اور چوتھے گروپ میں صرف ایک ایک مدنی سورت ہے' یعنی تیسرے گروپ میں سورۃ النور اور چوتھے گروپ میں سورۃ الاحزاب۔ جبکہ پانچویں گروپ میں سورۂ محمد' سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات تین مدنی سورتیں ہیں۔

زیر مطالعہ گروپ کی ان مدنی سورتوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے پانچ سورتوں کا آغاز سَبَّحَ لِلّٰہِ یا یُسَبِّحُ لِلّٰہِ سے ہوتا ہے۔ یعنی ان کے آغاز میں اللہ کی تسبیح کا ذکر فعل ماضی میں بھی ہے اور فعل مضارع میں بھی۔ عربی کا فعل مضارع چونکہ حال اور مستقبل دونوں زمانوں کے معنی دیتا ہے اس لیے ماضی اور مضارع کے ان دو صیغوں سے گویا پورے زمانے کا کلی طور پر احاطہ ہوگیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے اندر جو چیز بھی ہے اس نے ہمیشہ اللہ کی تسبیح بیان کی ہے' ہر چیز اب بھی اُس کی تسبیح بیان کر رہی ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ اس کی تسبیح کرتی رہے گی۔ ان سورتوں کے آغاز کے اس مضمون کی مناسبت سے انہیں اَلْمُسَبِّحَات کا نام دیا گیا ہے۔ بعض لوگ سورۃ الاعلیٰ کو بھی اَلْمُسَبِّحَات کے اس گروپ میں شامل کرتے ہیں' لیکن یہ سورت اس لحاظ سے ان سے مختلف ہے کہ اس کے آغاز میں تسبیح کا صیغہ فعل امر ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ①﴾ یعنی حکم کی صورت میں آیا ہے۔ اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مکی مدنی سورتوں کے زیر مطالعہ (چھٹے) گروپ میں دس مدنی سورتیں ہیں جن میں سے پانچ اَلْمُسَبِّحَات ہیں اور سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے یہ مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔

ان مدنی سورتوں کے بارے میں تیسری اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ یہ سب سورتیں (سوائے سورۃ التغابن کے) آنحضور ﷺ کے مدنی دور کے نصف آخر میں یعنی سن ۵ ہجری کے بعد نازل ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کی صفوں میں جوشِ جہاد' ذوقِ شہادت' جذبۂ انفاق وغیرہ کے حوالے سے بحیثیت مجموعی ضعف و اضمحلال کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کا مطلب' معاذ اللہ' یہ ہرگز نہیں کہ ''السابقون الاوّلون'' کے جذبے

میں کوئی کمی آ گئی تھی' بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب مسلمانوں کی مجموعی تعداد میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو ہجرت کے بعد ایمان لائے تھے اور وہ سب لوگ تربیت اور آزمائش و ابتلاء کے ان تمام مراحل سے نہیں گزرے تھے جن کا سامنا مکی دور کے اہل ایمان کر چکے تھے۔ چونکہ ابتدائی دور کے مسلمانوں کے مقابلے میں نئے شامل ہونے والوں کی تعداد زیادہ تھی' اس لیے جماعت کے اجتماعی کردار و عمل پر بھی ان ہی کا رنگ غالب تھا۔ ظاہر ہے اس رنگ کے ''اوسط معیار'' کو السابقون الاولون کے خصوصی معیار کے پیمانہ سے نہیں پرکھا جا سکتا تھا۔

مسلمانوں کی صفوں میں مذکورہ ضعف کا ذکر سورۃ الانفال کی آیت ۶۶ میں ﴿عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ﴾ کے الفاظ میں بھی آیا ہے۔ آیات ۶۵'۶۶ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے تو ایک مؤمن دس کفار پر بھاری ہو سکتا تھا' لیکن اب چونکہ تم میں کمزوری آ چکی ہے اس لیے اب ہم نے تمہارے مقابلے کے معیار میں بھی نرمی کر دی ہے۔ چنانچہ اب اگر تم اپنے سے دوگنا کفار کا مقابلہ بہادری اور جواں مردی سے کرو گے تو ہم ان پر تم لوگوں کو فتح دیں گے۔ بہرحال مذکورہ کمزوری کے اثرات کے باعث ان سورتوں میں جابجا مسلمانوں کو جھنجوڑنے اور ان کی گرفت کرنے کا انداز ملتا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الصف کی دوسری آیت کا اسلوب بہت واضح ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ ''اے اہل ایمان! کیا ہو گیا ہے تمہیں' کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟'' سورۃ الحدید کی اس آیت کا انداز بھی بالکل ایسا ہی ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۸) ''تمہیں کیا ہے' تم اللہ پر پختہ ایمان کیوں نہیں رکھتے؟'' پھر زیر مطالعہ سورت یعنی سورۃ الحدید کی اس آیت کا لب و لہجہ بھی ملاحظہ کریں: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۰) ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟'' سورۃ الجمعہ کی آخری آیت کا یہ انداز بھی بہت سخت ہے: ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ۨانْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ﴾ ''جب انہوں نے دیکھا کسی کاروبار یا کسی اور دلچسپی کی چیز کو تو وہ اس کی طرف لپک گئے اور چھوڑ گئے آپ کو (اے نبی ﷺ!) کھڑے ہوئے۔''

اس سورت میں یقیناً روئے سخن منافقین کی طرف بھی ہے (ان سورتوں میں منافقت کے موضوع پر ایک مکمل سورت (سورۃ المنافقون) بھی موجود ہے اور پھر سورۃ الحدید میں منافقت کے مرض کی علامات سے لے کر تشخیص تک گویا پوری پیتھالوجی بیان ہوئی ہے) لیکن مجموعی طور پر اصل خطاب منافقین سے نہیں بلکہ ''ضعفاء'' سے ہے۔ یعنی ان میں ان کمزور مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو ''ہر چہ بادا باد'' کے سے جذبے کے ساتھ ہر حالت اور ہر قیمت پر اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے تقاضوں کو کماحقہ پورا کرنے سے معذور ہیں۔ چنانچہ منافقت یا منافقین کے معاملے میں ان سورتوں کا انداز سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ جیسا نہیں ہے' کیونکہ ان دو سورتوں کی متعلقہ آیات میں اصل خطاب ہی منافقین سے ہے' جبکہ زیر مطالعہ سورتوں میں اگر کہیں مسلمانوں کی صفوں کے اندر موجود کمزوری کو موضوع بنایا گیا ہے تو وہاں اصل خطاب ضُعفاء سے ہے نہ کہ منافقین سے۔

جہاں تک ایمان کی پختگی اور کمزوری کے حوالے سے اہل ایمان کے درمیان انفرادی سطح پر فرق و تفاوت کا تعلق ہے تو یہ ایک فطری بات ہے اور یہ فرق شروع سے تھا۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (آیت۱۰۰)

''اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے' اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی نیکو کاری کے ساتھ' اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ ترین درجات پر فائز اہل ایمان کے درمیان بھی فرق تھا۔ کچھ لوگ ''السابقون الاوّلون'' تھے اور کچھ وہ تھے جو ان کے نقش قدم پر چلے رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ! (اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۰ کی تشریح۔) سورۃ التوبہ کی درج بالا آیت سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اہلِ ایمان کے درجات کے فرق کو سمجھنا اور ان کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے: ع ''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی!'' بہرحال جب تک اس فلسفے کو نہیں سمجھا جائے گا نہ ''کمزور مسلمان'' کی اصطلاح سمجھ میں آئے گی اور نہ ہی ان آیات کا مفہوم واضح ہوگا جن میں ''ضُعفاء'' یعنی کمزور مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔

''حفظِ مراتب'' کا یہ فلسفہ آج کل ہم جیسے مسلمانوں کو ''اہل ایمان'' کی صفوں میں جگہ دلانے کا جواز اور راستہ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم لوگ ''نسلی مسلمان'' ہیں۔ یعنی ہم میں سے اکثر اس لیے مسلمان ہیں کہ ہم مسلمان والدین کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں ہمارے ارادے' اختیار یا انتخاب کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا عام مسلمان اپنے حالات اور ماحول کے مطابق اللہ' رسول' آخرت' نماز روزہ وغیرہ کا تعارف تو بچپن میں ہی سیکھ لیتا ہے۔ لیکن ایمان حقیقی اور عمل کے اعتبار سے اس کا دامن خالی ہی رہتا ہے (اِلا ماشاء اللہ)۔ اس اعتبار سے آج ہم مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا تعلق اس ''مسلمانی'' سے ہے جس کا ذکر سورۃ الحجرات کی اس آیت میں ہوا ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (آیت۱۴)

''یہ بدو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) جبکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

سورۃ الحجرات کے مطالعے کے دوران اس آیت کا پس منظر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال جس طرح اس آیت کے مخاطب لوگوں کی اکثریت نے حالات کا رخ دیکھ کر ''حادثاتی'' طور پر اسلام قبول کیا تھا' اسی طرح ہم بھی اپنی پیدائش کے ''حادثے'' کی وجہ سے مسلمان ہیں۔ ہم نے اسلام کو ایک موروثی نظریے کے طور پر تو قبول کیا ہے' لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری اکثریت ایمان اور اسلام کے تقاضے پورے کرنے کی فکر سے بالکل ہی لاتعلق ہو چکی ہے (اِلا ماشاء اللہ)۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ایسے تمام لوگ حقیقی ایمان سے تہی دامن ہونے کے باوجود منافق نہیں اس لیے کہ وہ کسی کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام نہیں لائے۔ چنانچہ ان سب لوگوں کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ ''کمزور مسلمان'' ہیں۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ سب مسلمان ''بحیثیت مسلمان'' برابر نہیں ہیں۔ ایمان کی پختگی اور عمل کے معیار سے ان کے اپنے اپنے درجات ہیں اور ان درجات کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جن لوگوں نے

مسلمانوں کے درجات میں پائے جانے والے اس فرق کو نہیں سمجھا انہیں سورۃ الحجرات کی مذکورہ آیت کے بارے میں بھی مغالطہ ہوا ہے کہ اس میں منافقین کا تذکرہ ہے۔ حالانکہ اسی آیت میں آگے ان اسلام قبول کرنے والوں کو یہ ضمانت بھی دی گئی ہے: ﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا﴾ ''اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال میں کچھ بھی کمی نہیں کی جائے گی''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں وہ مسلمان ہی تھے' کیونکہ منافق کا تو کوئی عمل قابل قبول ہے ہی نہیں۔ بلاشبہ ان لوگوں کی صفوں میں منافق بھی تھے لیکن مذکورہ آیت میں خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو اگرچہ دیکھا دیکھی مسلمان ہوئے تھے' لیکن اس میں ان کی بدنیتی شامل نہیں تھی۔

آج ہماری غالب اکثریت بلاشبہ ''کمزور مسلمانوں'' پر مشتمل ہے' اس لیے آج ہماری ہدایت کے لیے قرآن کا یہ حصہ (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) بہت اہم ہے۔ آج کا مسلمان اگر ان دس سورتوں کو سمجھ لے تو اس کا یہ عمل ایسے ہوگا جیسے اس نے پورے قرآن کو سمجھ لیا۔ کیونکہ ان دس سورتوں میں پورے قرآن حکیم کا خلاصہ آ گیا ہے۔ مثلاً منافقت اور منافقین کا تذکرہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ خصوصاً سورۃ النساء' سورۃ التوبہ اور سورۂ محمد میں یہ مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ لیکن اس مجموعے میں شامل گیارہ آیات پر مشتمل ایک مختصر سی سورت یعنی سورۃ المنافقون میں اس پورے مضمون کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایمان کی بحث سے پورا قرآن بھرا پڑا ہے۔ دو تہائی قرآن مکی سورتوں پر مشتمل ہے اور ان مکی سورتوں میں تذکیر بآلاء اللہ کے علاوہ توحید' رسالت اور آخرت کے موضوعات کے تحت ساری بحث ایمان سے ہی متعلق ہے۔ اس قدر وسیع اور مفصل مضمون کو اس مجموعے کی سورۃ التغابن (۱۸ آیات) میں سمو دیا گیا ہے۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ ان دس سورتوں میں پورے قرآن کے مضامین کا عطر کشید کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے چھ سورتوں (سورۃ الحدید' سورۃ الصف' سورۃ الجمعہ' سورۃ المنافقون' سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم) کو ہم نے اپنے منتخب نصاب میں شامل کیا ہے۔ جہاں تک سورۃ الحدید کے تعارف کا تعلق ہے' یہ بہت جامع اور بہت بلند مرتبہ سورت ہے۔ الْمُسَبِّحَات میں ممتاز مقام کی وجہ سے اسے اُمُّ الْمُسَبِّحَات کہا جاتا ہے۔ ہمارے منتخب نصاب کا حصہ ششم اسی سورت کے ۷ دروس پر مشتمل ہے۔ میں اکثر تحدیثِ نعمت کے طور پر ذکر کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اس سورت کا خصوصی فہم اور انشراح عطا فرمایا ہے' بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی سے مجھے یہ سورت عطا فرما دی ہے۔ پچھلی نصف صدی سے اس پر میرا غور و فکر جاری ہے اور میں نے اس پر بہت طویل اور مفصل دروس بھی دیے ہیں۔ بہر حال اس مضمون کے لیے یہ سطور زیادہ تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس سورت پر میرے سلسلہ وار دروس کی آڈیو' ویڈیو ریکارڈنگ موجود ہے۔ مفصل دروس کی ریکارڈنگ ۱۵ گھنٹے پر مشتمل ہے' جبکہ نسبتاً مختصر دروس کا دورانیہ چھ گھنٹے ہے۔ مزید تفصیل جاننے کے خواہش مند حضرات میرے ان دروس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔[1]

(۱) محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے متذکرہ بالا دروس کی ترتیب و تدوین کے بعد انہیں ۳۶۸ صفحات پر مشتمل کتاب بعنوان ''اُمّ المُسَبِّحات یعنی سورۃ الحدید کی مختصر تشریح'' کی صورت میں مکتبہ خدام القرآن لاہور نے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

آیات ا تا ٦

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۝ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ۚ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ ھُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالۡبَاطِنُ ۚ وَھُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝ ھُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا یَخۡرُجُ مِنۡھَا وَمَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعۡرُجُ فِیۡھَا ؕ وَھُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ۝ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ۝ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّھَارِ وَیُوۡلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیۡلِ ؕ وَھُوَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝

آیت ا ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ﴾ ’’تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔‘‘

ان سورتوں (المُسَبِّحات) کا یہ مضمون بہت اہم ہے۔ آگے چل کر سورۃ الحشر اور سورۃ الصف میں یہ آیت ’’مَا فِیۡ‘‘ کے اضافے کے ساتھ اس طرح آئے گی: ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ﴾ اور پھر سورۃ الجمعہ اور سورۃ التغابن میں مزید پُرزور انداز میں فعل مضارع کے ساتھ یوں آئے گا: ﴿یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ﴾۔ کائنات کی ہر چیز کس طرح اللہ کی تسبیح کرتی ہے؟ اس کی ایک صورت تو ’’تسبیح حالی‘‘ کی ہے جو ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ ہر چیز اپنی زبانِ حال سے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ اس کی مثال ایک تصویر ہے جو اپنے مصور کے کمالِ فن یا عدمِ مہارت پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ جس طرح ایک خوبصورت تصویر زبانِ حال سے اپنے مصور کی تعریف کرتی نظر آتی ہے اسی طرح اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے وجود سے گواہی دے رہا ہے کہ میرا پیدا کرنے والا‘ میرا صانع‘ میرا خالق‘ میرا مصور ہر عیب سے پاک‘ ہر نقص سے بالا اور ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے‘ اس کے علم‘ اس کی قدرت اور اس کی حکمت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے۔ دوسری صورت ’’زبانی تسبیح‘‘ کی ہے جو کہ خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ سورۂ حٰمٓ السَّجدۃ کی آیات ۲۰ اور ۲۱ میں قیامت کے اس منظر کا ذکر ہے جب انسانوں کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے۔ اس پر وہ لوگ حیرت سے اپنی کھالوں سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ جواب میں ان کی کھالیں کہیں گی: ﴿اَنۡطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡطَقَ کُلَّ شَیۡءٍ﴾ (آیت ۲۱) کہ آج اُس اللہ نے ہمیں بھی زبان دے دی ہے جس نے ہر شے کو زبان دی ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنی تسبیح کے لیے ایک طریقہ تفویض کر رکھا ہے:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ ؕ وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰـكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ ؕ﴾ (آیت ۴۴)

''اُسی کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور (وہ تمام مخلوق بھی) جو ان میں ہے۔ اور کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ تسبیح کرتی ہے اُس کی حمد کے ساتھ' لیکن تم نہیں سمجھ سکتے ان کی تسبیح کو۔''

بہرحال کائنات کی ہر چیز اپنی زبانِ حال سے بھی اللہ کی تسبیح کر رہی ہے اور اللہ کی عطا کردہ اپنی مخصوص زبان سے بھی اس کی تعریف و توصیف میں مشغول و مصروف ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تسبیح کی اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں جو کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

﴿وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝۱﴾ ''اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا۔''

ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے یہ دو اسماء اکٹھے ایک ساتھ بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ اسمائے حسنیٰ کا یہ جوڑا معنوی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ العزیز وہ ہستی ہے جس کا اختیار مطلق ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی سطح پر مطلق العنانیت کا تجربہ ہمیشہ بہت تلخ رہا ہے۔ عملی طور پر ہمارے ہاں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جہاں مطلق العنانیت آتی ہے' وہاں اختیارات کا ناجائز استعمال ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ پولیٹیکل سائنس کا تو اس حوالے سے آزمودہ فارمولا یہ ہے:

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."

چنانچہ جب کسی ملک کا آئین بنایا جاتا ہے اور معاشرے کے لیے قوانین وضع کیے جاتے ہیں تو متعلقہ ماہرین کی ساری کوشش اختیارات کو مشروط کرنے اور ان میں توازن قائم کرنے پر مرکوز ہوتی ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ایسی صاحبِ اختیار ہستی ہے جس کے اختیارات کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ ہی اس کے اختیارات کسی شرط سے مشروط ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ''الحکیم'' بھی ہے۔ وہ اپنے مطلق اختیارات میں خود ہی اپنی حکمت سے توازن قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ زبردست ہے' وہ اپنی تمام مخلوقات پر غالب ہے' اس کے اختیارات مطلق ہیں' لیکن اس کا کوئی کام' اس کا کوئی عمل اور اس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

آیت ۲ ﴿لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ﴾ ''اُسی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔''

آیت کے آغاز میں جو حرفِ جار ''ل'' آیا ہے یہ تملیک کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور استحقاق کے لیے بھی۔ یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی de facto بھی اُسی کی ہے اور de jure بھی —— اُسی کو حاکمیت کا حق پہنچتا ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔ اُسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک ہو اور بالفعل بھی وہی مالک ہے۔

اس سورۂ مبارکہ میں دین کا ذکر خصوصی طور پر بطور ایک نظام کے کیا گیا ہے اور یہ نظام صرف حکومتِ الٰہیہ کے زیرِ سایہ ہی قائم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں اللہ کی ایسی صفات بار بار نمایاں کی گئی ہیں جن کا تعلق طاقت' حکومت' قدرت اور اختیار سے ہے۔

﴿يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝۲﴾ ''وہی زندہ رکھتا ہے' وہی مارتا ہے۔ اور وہ

ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس سورۂ مبارکہ کی پہلی چھ آیات پورے قرآن حکیم میں اس اعتبار سے منفرد وممتاز ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ذکر فلسفے اور منطق کی سطح پر جامع ترین انداز میں ہوا ہے۔لیکن ظاہر ہے یہ موقع ایسی تفصیلات میں جانے کا نہیں۔

آیت ۳ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ ''وہی اول ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے۔''

ایک انسان کے لیے اس کیفیت کو سمجھنا یقیناً مشکل ہے کہ ہر زمان' ہر مکان اگر وہ ہی وہ ہے تو پھر باقی سب کیا ہے۔غالبؔ نے اس صورت حال سے متعلق انسانی حیرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اس آیت کے بارے میں امام رازیؒ کا درج ذیل قول بہت فکر انگیز ہے۔یوں لگتا ہے جیسے اس آیت کو پڑھ کر وہ جلالِ ذات کے رعب کے باعث ساکت وششدر ہوئے کھڑے ہیں۔لکھتے ہیں: اِعْلَمْ اَنَّ هٰذا المَقَامَ مقامٌ غامِضٌ عميقٌ مُهيبٌ ''جان لو کہ یہ بہت مشکل' بہت گہرا اور بڑا پُرہیبت مقام ہے!'' اس کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔گویا بقول شاعر ع ''ہشدار کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را!'' اس راستے پر خبردار ہو کر چلنا' اب تمہارا پاؤں تلوار کی دھار پر آ گیا ہے!

صوفیاء نے ''وحدت الوجود'' کا فلسفہ اسی آیت سے اخذ کیا ہے' لیکن یہ فلسفے کا بھی مشکل ترین مسئلہ ہے۔ ''وحدت الوجود'' کی تعبیر میں کچھ لوگوں نے ''ہمہ اوست'' کا تصور گھڑا ہے جس کے کفر وشرک ہونے میں کسی اہلِ علم کو اختلاف نہیں ہے۔بہرحال ''وحدت الوجود'' کے بارے میں یہ حقیقت بھی واضح رہنی چاہیے کہ یہ عام لوگوں کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔البتہ میں نے اپنے مذکورہ دروس میں اپنی حد تک اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم (۱۸۹۶۔۱۹۸۴ء) سے مجھے اپنی اس وضاحت کی سند بھی مل چکی ہے۔ایک مرتبہ اسی سورت کے میرے ایک درس میں پروفیسر صاحب بھی موجود تھے۔درس کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ اس ''وحدت الوجود'' کے مسئلے کو پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے مجھے پچاس برس ہو گئے ہیں' لیکن آپ نے اس ایک درس میں اسے جس انداز میں واضح کیا ہے میں آج تک نہیں کر سکا۔یہاں ان سطور میں اس مسئلے کی وضاحت کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔تفصیل معلوم کرنے کے خواہش مند حضرات سورۃ الحدید پر میرے متعلقہ دروس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔بہرحال اس آیت کا آسان مفہوم یہ ہے کہ یہ کائنات ''حادث'' ہے۔ایک وقت تھا جب یہ موجود نہیں تھی اور جب یہ موجود نہیں تھی اس وقت کون موجود تھا؟ ظاہر ہے اللہ اُس وقت بھی موجود تھا۔تو اس کائنات کا آغاز کہاں سے ہوا؟ اللہ سے! پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اس کائنات میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾﴾ (الرحمٰن) ''جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے فنا ہونے والا ہے۔'' تو جب یہ سب کچھ نہیں رہے گا تو اُس وقت کون موجود ہوگا؟ ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو

الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ﴿۲۷﴾﴾(الرحمٰن) ''اور باقی رہے گا صرف تیرے رب کا چہرہ جو بہت بزرگی والا اور بہت عظمت والا ہے۔'' تو جب کچھ نہیں رہے گا تو اللہ اُس وقت بھی موجود ہو گا۔ تو پھر ''آخر'' کون ہوا؟ ظاہر ہے کہ اللہ! اب یوں سمجھیں کہ اول اور آخر کے مابین ظاہر بھی وہ ہے اور باطن بھی وہ ہے۔

اس مشکل مضمون کو درج ذیل حدیث نے عام لوگوں کے لیے آسان کر دیا ہے۔ حضور ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ وَرَبَّ الْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ' رَبَّنَا وَرَبَّ کُلِّ شَیْءٍ، فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰی' وَمُنْزِلَ التَّوْرَاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْفُرْقَانِ' اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ کُلِّ شَیْءٍ اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِیَتِہٖ' اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الْآخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الظَّاھِرُ فَلَیْسَ فَوْقَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَکَ شَیْءٌ))(1)

''اے اللہ آسمانوں اور زمین کے رب! اے عرشِ عظیم کے مالک! اے ہمارے رب اور ہر چیز کے پروردگار! اے دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے اور تورات' انجیل اور فرقان کو نازل کرنے والے! میں ہر چیز کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس کی پیشانی تیرے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! تو ہی اول ہے' پس تجھ سے پہلے کوئی چیز نہ تھی اور تو ہی آخر ہے' تیرے بعد کوئی چیز نہ ہو گی' اور تو ہی ظاہر ہے' تجھ سے بالاتر کوئی چیز نہیں' اور تو ہی ایسا باطن ہے کہ تجھ سے مخفی کوئی چیز نہیں۔''

﴿وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۳﴾﴾ ''اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

جب ہر زمان' ہر مکان وہ ہی وہ ہے' وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی تو کائنات کی کوئی ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ کیسے ہو سکتی ہے! بلکہ وہ تو انسان کے دل میں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی آگاہ ہے۔ اس حوالے سے سورۂ قٓ کی یہ آیت ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے' اور ہم تو اُس سے اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادر (عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ) ہونے کا اعلان ہوا ہے' جبکہ زیر مطالعہ آیت میں اُس کے علم کل کا بیان ہے کہ اُسے ہر چیز کا علم ہے (وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ)۔ اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفات ایسی ہیں جن کا ذکر قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔

آیت ۴ ﴿ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۭ﴾ ''وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں' پھر وہ متمکن ہوا عرش پر۔''

﴿یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا ۭ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو کچھ نکلتا ہے اس سے' اور جو کچھ اترتا ہے آسمان سے اور جو

(1) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب ما یقول عند النوم واخذ المضجع۔

کچھ چڑھتا ہے اس میں۔''

بالکل یہی الفاظ اس سے پہلے سورۂ سبا کی آیت ۲ میں بھی آ چکے ہیں۔ اس فقرے میں بہت سی چیزوں کا احاطہ ہو گیا' مثلاً زمین میں پانی جذب ہوتا ہے' مختلف قسم کے بیج بوئے جاتے ہیں' مُردے دفن ہوتے ہیں۔ اسی طرح آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے اور فرشتے احکامِ الٰہی لے کر اُترتے ہیں۔ آسمان کی طرف چڑھنے کی مثال بخارات کی ہے' اور پھر فرشتے بھی فوت ہونے والے انسانوں کی ارواح اور دنیا کے حادثات و واقعات کی رپورٹس لے کر اوپر جاتے ہیں۔

﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴﴾ ''اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

جو کچھ اچھے یا برے اعمال تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ بذاتِ خود ان کا چشم دید گواہ ہے۔

آیت ۵ ﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی ''بادشاہی'' کے بارے میں تکرار و تاکید کا خصوصی اسلوب ملاحظہ ہو۔ آیت ۲ کے ہو بہو الفاظ یہاں پھر دہرائے گئے ہیں۔

اس مضمون کے حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ جس طرح اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں اسی طرح اس کے علاوہ کوئی اور حاکم و مقتدر بھی نہیں۔ چنانچہ جس طرح اللہ کو اکیلے معبود کے طور پر ماننا ضروری ہے' اسی طرح توحید کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اللہ کی زمین پر صرف اُسی کی بادشاہی قائم ہو اور اُس کے تمام احکام عملاً نافذ ہوں۔

﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۵﴾ ''اور تمام معاملات اُسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔''

آیت ۶ ﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۭ﴾ ''وہ پرولاتا ہے رات کو دن میں اور پرولاتا ہے دن کو رات میں۔''

یہ مضمون ان ہی الفاظ کے ساتھ قرآن حکیم میں متعدد بار آیا ہے۔

﴿وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۶﴾ ''اور وہ جانتا ہے اس کو بھی جو سینوں کے اندر ہے۔''

نوٹ کیجیے! ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے علم کا ذکر بہت تکرار کے ساتھ ہوا ہے' پہلے فرمایا: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۳﴾ پھر فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا...... ﴾ (آیت ۴) اور اب یہاں اس آیت میں بتایا گیا کہ وہ سینوں کے رازوں کا بھی علم رکھتا ہے۔

ان چھ ابتدائی آیات پر مشتمل یہ پُرشکوہ تمہید گویا ایک اعلان ہے کہ خبردار! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم یہ کس کا کلام پڑھ رہے ہو' کس سے ہم کلام ہو رہے ہو! ان تمہیدی آیات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت' اُس کی قدرت' اُس کی بادشاہی اور خصوصی طور پر اُس کے علم کا تعارف ہے۔ یہ گویا توحید فی العقیدہ کا بیان ہے۔ توحید کا یہ عقیدہ عملی میدان میں بندوں سے کیا تقاضا کرتا ہے اس کا ذکر اب آگے آ رہا ہے۔ چنانچہ اگلی آیات میں توحید کے دو بنیادی تقاضے بتائے گئے ہیں۔

آیات ۷ تا ۱۱

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝ ع ۱۷

آیت ۷ ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ﴾ ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر اور خرچ کرو اُن سب میں سے جن میں اُس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔''

خلافت کے حوالے سے انسان کو سب سے زیادہ اختیار تو اپنے جسم پر عطا کیا گیا ہے۔ اس میں اس کے مختلف اعضاء ہیں' طاقت جسمانی' طلاقت لسانی' ذہانت و فطانت اور دوسری بہت سی صلاحیتیں ہیں۔ پھر مال و دولت' اولاد اور دوسری بے شمار نعمتیں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو معبود ماننے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی ان خداداد صلاحیتوں اور نعمتوں کو اللہ کی رضا کے لیے اس کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہے۔ واضح رہے کہ ''نفق'' کا لفظ مال و دولت خرچ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور جان خرچ کر دینے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ نَفَقَتِ الدَّرَاهِم کے معنی ہیں رقم ختم ہوگئی اور نَفَقَ الْفَرَس کے معنی ہیں گھوڑا مر گیا۔

یہاں یہ آیت پڑھتے ہوئے ضروری ہے کہ سورۃ الحجرات کی اس آیت کو بھی ذہن میں تازہ کر لیں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

ان دونوں آیات میں دو دو مطالبات آئے ہیں' پہلا مطالبہ دونوں میں مشترک ہے یعنی ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ پر' جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ جبکہ دوسرے مطالبے کے حوالے سے سورۃ الحجرات کی مذکورہ بالا آیت میں جہاد کا ذکر ہے کہ اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد کرو' اور زیر مطالعہ

آیت میں ہر اُس چیز کے انفاق کا حکم ہے جس پر انسان کو خلیفہ بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس میں انفاقِ مال بھی شامل ہے اور بذلِ نفس یعنی انفاقِ جان بھی۔

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ⑦﴾ ''پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے (اپنے مال و جان کو) خرچ کیا' ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

جس خوش نصیب نے مذکورہ دونوں مطالبات پورے کر دیے' یعنی اسے یقین والا ایمان بھی نصیب ہو گیا اور اس نے اپنی زیرِ ملکیت ہر چیز کو اللہ کی رضا کے لیے پیش بھی کر دیا تو اس کے گویا وارے نیارے ہو گئے۔ وہ بہت بڑے اجر کا مستحق ٹھہرا — مضمون کے حوالے سے یہاں آیات کے ربط و نظم کی خوبصورتی اور مندرجات کی ترتیب ملاحظہ کیجیے کہ پہلے ایک آیت میں دو مطالبات کا ذکر کر کے ان کے بارے میں ترغیب دی گئی ہے۔ اب اس کے بعد ان میں سے ہر مطالبے سے متعلق دو دو آیات اس طرح آ رہی ہیں کہ پہلی آیت میں زجر یعنی ڈانٹ ڈپٹ کا انداز ہے' جبکہ دوسری میں راہنمائی اور ترغیب دی گئی ہے۔

آیت ۸ ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ﴾ ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نہیں ایمان رکھتے اللہ پر!''

یہ پہلے مطالبے یعنی ''ایمان'' سے متعلق گویا زجر و ملامت اور ایک طرح سے تنبیہہ کا انداز ہے۔

﴿وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ﴾ ''جبکہ رسول (محمد ﷺ) تمہیں دعوت دے رہے ہیں کہ تم ایمان رکھو اپنے رب پر''

ہمارے رسولؐ ابھی تمہارے مابین موجود ہیں' اور وہ تم لوگوں کو براہِ راست ایمان کی دعوت دے رہے ہیں۔

﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ﴾ ''اور دیکھو! وہ تم سے عہد بھی لے چکا ہے''

اگر تم ایمان کے دعوے دار ہو تو ذرا غور کرو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کتنے عہد کر رکھے ہیں۔ ایک عہد تو وہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے تم سے عالمِ اَرواح میں لیا تھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' اور تم سب نے اس سوال کے جواب میں ﴿بَلٰى﴾ کہا تھا (بحوالہ الاعراف: ۱۷۲)۔ اس کے بعد تم ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ (بحوالہ البقرۃ: ۲۸۵ والمائدۃ: ۷) کا عہد بھی کر چکے ہو۔ اس عہدِ اطاعت کے علاوہ تم نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو اللہ کے ہاتھ بیچنے کا عہد بھی کر رکھا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ......﴾ (التوبۃ: ۱۱۱) ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہل ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے''۔ تو تم لوگ اپنے رب کے ساتھ کیے ہوئے اپنے وعدوں اور معاہدوں کا تو لحاظ کرو:

﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ⑧﴾ ''اگر تم حقیقتاً مؤمن ہو!''

یہ ڈانٹ سننے کے بعد ہر بندۂ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے گریبان میں جھانکے اور اپنا جائزہ لے کہ کیا اس کے دل میں حقیقی ایمان موجود ہے یا کچھ خلا سا ہے؟ الحمد للہ ہم سب مسلمان تو ہیں' کسی نہ کسی درجے میں نماز روزہ وغیرہ کا تقاضا بھی پورا کر رہے ہیں' لیکن اللہ کرے ہمیں احساس ہو جائے اور ہم اپنا اپنا جائزہ لیں کہ اسلام کے ساتھ ساتھ کیا ابھی تک ہمیں حقیقی ایمان بھی نصیب ہوا ہے یا نہیں! اور اگر کسی کو یہ محسوس ہو کہ واقعی اس کے

دل میں اس پہلو سے ابھی خلا موجود ہے تو پھر اسے یہ معلوم کرنے کے لیے بھی تگ و دو کرنی چاہیے کہ وہ یقین والا ایمان کہاں سے ملے گا۔ اگلی آیت میں اس حوالے سے راہنمائی فرمائی جا رہی ہے۔

آیت ۹ ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ﴾ ''وہی تو ہے جو اپنے بندے (ﷺ) پر یہ آیاتِ بینات نازل کر رہا ہے تاکہ نکالے تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف۔''

یعنی یقین والے ایمان کا منبع و سرچشمہ اللہ کی یہ کتاب ہے۔ اگر تم اس کتاب کو سمجھ کر پڑھو گے‘ اس پر فکر و تدبر کرو گے تو تمہارے اندر ایک ہلچل برپا ہو جائے گی‘ تمہاری روح کے تاروں میں خود بخود سرسراہٹ پیدا ہوگی اور تم خود محسوس کرو گے۔ بقولِ اقبال ؎

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز تو ذرا چھیڑ تو دے‘ تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے!

دراصل ایمان تمہاری روح کے اندر خفتہ (dormant) حالت میں پہلے سے موجود ہے۔ بس اسے فعال (active) کرنے کی ضرورت ہے۔ اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایمان کو فعال کرنے کا نسخہ پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے‘ یعنی آیاتِ قرآنیہ۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝۹﴾ ''اور یقیناً اللہ تمہارے حق میں بہت رؤف اور رحیم ہے۔''
وہ تمہارے حال پر نہایت ہی شفیق اور مہربان ہے۔

اس آیت میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ ایمانِ حقیقی کا منبع اور سرچشمہ قرآن ہے۔ اس سے پہلے سورۃ الشوریٰ میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ خود حضور ﷺ کو بھی ایمان قرآن مجید ہی سے ملا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۵۲﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے‘ لیکن اس (قرآن) کو ہم نے ایسا نور بنایا ہے جس کے ذریعے سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔ اور آپ یقیناً سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔''

یعنی اس سے پہلے نہ تو آپؐ تورات سے واقف تھے اور نہ ہی آپؐ انجیل کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ آپ تو اُمی تھے۔ لیکن جب ہم نے قرآن کریم کو نور بنا کر آپؐ کے دل پر اُتارا تو اس سے آپؐ کا باطن نورِ ایمان سے جگمگا اٹھا اور آپؐ نوعِ انسانی کے لیے روشنی کا مینار بن گئے۔ اب آپؐ لوگوں کو ہدایت دیں گے اور انہیں سیدھے راستے کی طرف بلائیں گے۔ اسی مضمون کو مولانا ظفر علی خان نے بڑی خوبصورتی اور سادگی سے یوں بیان کیا ہے: ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

ان دو آیات میں پہلے مطالبے یعنی ''ایمان'' سے متعلق پہلے ڈانٹ پلائی گئی کہ تمہارا ایمان پختہ کیوں نہیں ہے؟ یہ ڈِھل مِل ایمان لیے کیوں پھر رہے ہو جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے ہوئے ہیں؟ اگر تمہارے ایمان میں کمزوری ہے تو اس کمزوری کو دور کیوں نہیں کرتے ہو؟ کمزور ایمان کے ساتھ گزارا کیوں کر رہے ہو؟ پھر دوسری آیت میں راہنمائی بھی کر دی گئی کہ ایمان کی کمزوری کو دور کرنے اور حقیقی ایمان کے حصول کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرو! قرآن کا یہی مطالبہ ہم سے بھی ہے۔ اس حوالے سے ایک اہم بات ہمیشہ کے لیے پلے باندھ لیجیے کہ قرآن کا ترجمہ پڑھنے سے نہ تو قرآن دل میں اترتا ہے اور نہ ہی اس سے جذبے کو تحریک ملتی ہے۔ ترجمہ پڑھنے سے آپ کچھ آیات کا مفہوم تو سمجھ لیں گے اور کچھ معلومات بھی آپ کو حاصل ہو جائیں گی' مگر قرآن آپ کے دل کے تاروں کو چھوئے گا نہیں' اور نہ ہی اس کی تاثیر آپ کی روح تک پہنچے گی۔ لہٰذا اگر آپ چاہتے ہیں کہ قرآن آپ کی روح کو فیوضِ ملکوتی سے سیراب اور آپ کے دل کو نورِ ایمانی سے منور کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ قرآن کو اس کی زبان میں پڑھیں اور سمجھیں۔ بقول اقبال : ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

ظاہر ہے کسی کے ضمیر پر قرآن کا نزول تبھی ممکن ہے جب وہ قرآن کی زبان یعنی عربی سے واقف ہوگا اور قرآن کے الفاظ اور اس کی عبارت کو براہِ راست سمجھے گا۔ اس کے لیے وہ پڑھے لکھے حضرات جو عربی زبان سے نابلد ہیں خصوصی طور پر اللہ کے ہاں جواب دہ ہوں گے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک علوم و فنون سیکھتے رہے لیکن قرآن کی زبان سیکھنے کے لیے انہوں نے کوئی منصوبہ بندی اور کوئی کوشش نہ کی۔ ایسے تمام حضرات کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک سال اس کام کے لیے ضرور وقف کریں اور کم از کم اس حد تک عربی زبان ضرور سیکھیں کہ قرآن مبین کو پڑھتے ہوئے انہیں اس کی آیاتِ بینات کا مفہوم تو معلوم ہو۔ (خواہش مند حضرات اس مقصد کے لیے قرآن اکیڈمی کے تحت چلنے والے رجوع الی القرآن کورس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔) یہ تو تھی توحید کے پہلے مطالبے (ایمان) سے متعلق ڈانٹ ڈپٹ اور راہنمائی۔ اور اب دوسرے مطالبے سے متعلق ڈانٹ:

آیت ۱۰ ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں' جبکہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت!''

یہ جو تم بڑے بڑے محل تعمیر کر رہے ہو اور فیکٹریوں پر فیکٹریاں لگاتے چلے جا رہے ہو' ان سے آخر کب تک استفادہ کرو گے؟ تم تو آج ہو کل نہیں ہو گے۔ تمہارے بعد تمہاری اولاد میں سے بھی جو لوگ ان جائیدادوں کے وارث بنیں گے وہ بھی اپنے وقت پر چلے جائیں گے۔ پھر جو ان کے وارث بنیں گے وہ بھی نہیں رہیں گے۔ بالآخر تمہارے اس سب کچھ کا اور پوری کائنات کا حقیقی وارث تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تو جب یہ سب کچھ تم نے ادھر ہی چھوڑ کر چلے جانا ہے تو پھر غیر ضروری دولت اکٹھی کرنے میں کیوں وقت برباد کر رہے ہو؟ اور کیوں اسے

سینت سینت کر رکھ رہے ہو؟ واضح رہے کہ انفاق سے مراد یہاں انفاقِ مال بھی ہے اور بذلِ نفس (جان کھپانا) بھی۔ یہ نکتہ قبل ازیں آیت ۷ کے مطالعے کے دوران بھی زیر بحث آیا تھا اور اب اگلے فقرے میں مزید واضح ہو جائے گا:

﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ﴾ ''تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے انفاق کیا اور قتال کیا فتح سے پہلے وہ (فتح کے بعد انفاق اور قتال کرنے والوں کے) برابر نہیں ہیں۔''

وضاحت کے لیے یہاں انفاق اور قتال کا ذکر الگ الگ آ گیا ہے۔ یعنی 'انفاق' مال خرچ کرنے کے لیے اور 'قتال' جان کھپانے کے لیے۔ چنانچہ یہاں واضح کر دیا گیا کہ آیت ۷ میں جس انفاق کا ذکر ہوا تھا اس سے مال و جان دونوں کا انفاق مراد تھا اور ظاہر ہے انفاقِ جان کا سب سے اہم موقع تو قتال ہی ہے۔ میدانِ جنگ سے غازی بن کر لوٹنے کا انحصار تو حالات اور قسمت پر ہے' لیکن میدانِ کارزار میں اترنے کا مطلب تو بہرحال یہی ہوتا ہے کہ اس مردِ مجاہد نے اپنی نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر قربانی کے لیے پیش کر دی۔

اس آیت میں خاص بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اہل ایمان جنہوں نے ابتدائی دور میں اس وقت قربانیاں دیں جبکہ اسلام کمزور تھا اور مسلمانوں کی طاقت بہت کم تھی' ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ اور بعد کے مسلمان جنہوں نے یہی اعمال بعد میں سرانجام دیے' ثواب و مرتبہ میں برابر نہیں۔

﴿اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ﴾ ''ان لوگوں کا درجہ بہت بلند ہے ان کے مقابلے میں جنہوں نے انفاق اور قتال کیا فتح کے بعد۔''

﴿وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ⑩﴾ ''اگرچہ ان سب سے اللہ نے بہت اچھا وعدہ فرمایا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

حضور ﷺ کی سربراہی میں کفر و باطل سے جنگ میں پہلی واضح فتح تو صلح حدیبیہ تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے خود فتح مبین قرار دیا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ①﴾ (الفتح)۔ یہ فتح مبین مسلمانوں کو ۶ ہجری میں عطا ہوئی جبکہ ظاہری فیصلہ کن فتح انہیں ۸ ہجری میں فتح مکہ کی صورت میں حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس آیت میں فتح کے ذکر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سورۃ الحدید کم از کم ۶ ہجری یعنی صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی۔

اب سنیے' کھلے اور بیدار دل کے ساتھ ایک اہم پکار! ذرا دھیان سے سنیے! میرا خالق' آپ کا خالق' میرا مالک' آپ کا مالک اور پوری کائنات کا مالک کیا ندا کر رہا ہے؟

آیت ۱۱ ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسنہ؟''

﴿فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ⑪﴾ ''کہ وہ اس کے لیے اسے بڑھاتا رہے اور اُس کے لیے بڑا باعزت اجر ہے۔''

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور بھلا کون اجر دے سکتا ہے؟ ایسا منافع اور بھلا کہاں سے مل سکتا ہے؟ چنانچہ اے اہل ایمان! آگے بڑھو! لبیک کہو اپنے رب کی اس پکار پر! اور اپنا مال اور اپنا وقت قربان کر دو اس کی رضا کے لیے! اپنی صلاحیتیں اور اپنی جان کھپا دو اس کی راہ میں!

یہاں پر یہ نکتہ ایک دفعہ پھر سے ذہن نشین کر لیجیے کہ انفاقِ مال اور انفاقِ جان ایک اعتبار سے ایک ہی چیز ہے۔ مال اور جان کے باہمی تعلق کو اس پہلو سے بھی سمجھنا چاہیے کہ ایک شخص اپنی جان‘ یعنی جسمانی قوت‘ ذہانت اور دیگر صلاحیتوں کی مدد سے مال کماتا ہے۔ پھر اپنے اس مال سے ایک طرف وہ اپنی جان کی بقا کا سامان پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اسی کی مدد سے وہ دوسروں کی قوت‘ ذہانت اور دیگر صلاحیتوں کو خریدنے کی استعداد بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح انسان کی مہلت زندگی یعنی ''وقت'' بھی اُس کی دولت ہے جس کے ذریعے سے وہ مال کماتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر کہا جاتا ہے: time is money کہ وقت اصل دولت ہے۔ گویا انسان کی جان‘ اُس کا مال اور وقت باہم یوں متعلق و مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے انفاق میں عملی طور پر باقی دو چیزوں کا انفاق بھی شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں جس انفاق کی بات ہو رہی ہے اس میں آپ کا مال‘ آپ کا وقت‘ آپ کی جسمانی قوت‘ ذہانت‘ فطانت‘ جان وغیرہ سب شامل ہیں۔

اب اگلی آیات میں روزِ محشر کے اس مرحلے کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے جب منافقین کو چھانٹ کر سچے اہلِ ایمان سے الگ کر دیا جائے گا۔ اس مرحلے کو ہمارے ہاں عموماً ''پل صراط'' کا مرحلہ کہا جاتا ہے۔ میدانِ حشر کا یہ نقشہ ذہن میں رکھیے کہ وہاں مختلف مواقع پر مختلف قسم کے لوگوں کی چھانٹی ہوتی چلی جائے گی۔ اس چھانٹی کے عمل کو سمجھنے کے لیے بجری بنانے والے کرشرز (crushers) میں لگی چھلنیوں کی مثال ذہن میں رکھیے۔ جس طرح ان مشینوں میں لگی مختلف قسم کی چھلنیاں مختلف سائز کے پتھروں کو الگ کرتی چلی جاتی ہیں بالکل اسی طرح میدانِ محشر میں مختلف مراحل پر مختلف قسم کے انسان بھی اپنے اعتقادات و اعمال کی بنیاد پر الگ ہوتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلی چھانٹی میں تمام کفار و مشرکین کو الگ کر لیا جائے گا۔ پھر کسی مرحلے پر ایمان کے دعوے داروں میں سے سچے مؤمنین اور منافقین کو الگ الگ کرنے کے لیے چھانٹی کی جائے گی اور یہی وہ مرحلہ ہے جس کا نقشہ آئندہ آیات میں دکھایا جا رہا ہے۔ اس چھانٹی کے لیے تمام مسلمانوں کو گھپ اندھیرے میں پل صراط پر سے گزرنا ہو گا جس کے نیچے جہنم بھڑک رہی ہو گی۔ جن لوگوں کے دلوں میں سچا ایمان تھا اور انہوں نے ایمان کی حالت میں نیک اعمال بھی کیے تھے‘ ان کے قلوب اور داہنے ہاتھوں سے اس وقت نور پھوٹ رہا ہو گا اور وہ اس روشنی میں راستہ پار کر کے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن جو لوگ دنیا میں سچے ایمان سے محروم رہے اور اعمالِ صالحہ کی پونجی بھی ان کے پاس نہیں ہو گی‘ وہ خواہ دنیا میں مسلمانوں ہی کے ساتھ شریک رہے ہوں اور خواہ وہ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائدین بن کر رہے ہوں اُس وقت وہ روشنی سے محروم کر دیے جائیں گے۔ اس حالت میں وہ ٹھوکریں کھاتے جہنم میں گرتے چلے جائیں گے۔ آئندہ آیات میں اس مرحلے کا تفصیلی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کے بعد روزِ محشر کے اس مرحلے کی ایک جھلک سورۃ التحریم کی آیت ۸ میں بھی دکھائی گئی ہے۔

آیات ۱۲ تا ۱۵

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ

جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۲﴾ یَوْمَ یَقُوْلُ
الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِیْلَ ارْجِعُوْا
وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ
مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ
وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾
فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْیَةٌ وَّ لَا مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِیَ مَوْلٰىكُمْ ؕ
وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۵﴾

آیت ۱۲ ﴿یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ﴾ ’’جس دن تم دیکھو گے مؤمن مَردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نور دوڑتا ہو گا ان کے سامنے اور ان کے داہنی طرف‘‘

بعض مفسرین کی رائے کے مطابق ’’یَوْمَ‘‘ سے پہلے ’’اُذْکُرْ‘‘ محذوف ہے۔ یعنی ذرا تصور کرو اُس دن کا جس دن مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں پر یہ عنایت خاص ہو گی۔ اُن کے سامنے اُن کے ایمان کا نور ہو گا جبکہ داہنی طرف اعمالِ صالحہ کی روشنی ہو گی۔ (یہ مضمون سورۃ التحریم میں مکرر آئے گا۔ وہاں اس پر‘ ان شاء اللہ‘ قدرے تفصیل سے گفتگو ہو گی۔)

﴿بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ﴾ ’’(ان سے کہا جائے گا:) آج تمہارے لیے بشارت ہے ان جنتوں کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں‘ تم رہو گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔‘‘

﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۲﴾﴾ ’’یقیناً یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔‘‘

آیت ۱۳ ﴿یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ﴾ ’’جس دن کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھا لیں۔‘‘

اس صورتِ حال کو یوں سمجھیں جیسے کچھ مسافر ایک خطرناک جنگل کے اندر تنگ پگڈنڈی پر گھپ اندھیرے میں سفر کر رہے ہوں۔ ان میں سے جن لوگوں کے پاس ٹارچ ہے وہ تو تیز تیز قدموں کے ساتھ پگڈنڈی پر رواں دواں ہیں‘ لیکن جن کے پاس ٹارچ نہیں ہے‘ وہ ان کی منتیں کر رہے ہیں کہ خدارا ذرا رکو‘ ذرا ٹھہرو‘ ہم پر عنایت کرو‘ ہمیں بھی ساتھ لے لو۔ نَقْتَبِسْ کا مادہ قبس ہے‘ جس کے لغوی معنی ہیں کسی کی آگ سے چنگاری لے کر اپنی آگ جلانا۔ لفظ ’’اقتباس‘‘ اردو میں quotation کے معنی میں مستعمل ہے۔ آپ نے اپنے مضمون میں کسی اور کی تحریر سے اقتباس شامل کیا تو گویا آپ نے کسی کے چولہے کی ایک چنگاری لا کر اپنے چولہے میں شامل کی ہے۔

﴿قِیۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَکُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا ؕ﴾ ''کہا جائے گا: لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور تلاش کرو نور!''

انہیں بتا دیا جائے گا کہ یہ نور یہاں سے نہیں ملتا۔ اس وقت جن لوگوں کے پاس تمہیں نور نظر آ رہا ہے وہ اسے دنیا سے کما کر لائے ہیں۔ چنانچہ اب اگر تمہیں اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو اس کے لیے تمہیں واپس دنیا میں جانا ہوگا اور وہاں جا کر اسے تلاش کرنا ہوگا' جس کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ یہاں پر یہ لطیف نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ منافقین روشنی کے لیے درخواست تو اہل ایمان سے کریں گے لیکن اس کا جواب کوئی اور دے گا۔ کیونکہ یہاں قَالُوۡا نہیں بلکہ قِیۡلَ (کہا جائے گا) کا صیغہ آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ اہل ایمان کی مروت اور شرافت سے بعید ہوگا کہ وہ انہیں کورا جواب دیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی فرشتہ انہیں ان کی مذکورہ درخواست کا جواب دے گا۔

﴿فَضُرِبَ بَیۡنَہُمۡ بِسُوۡرٍ لَّہٗ بَابٌ ؕ﴾ ''پھر ان کے درمیان ایک فصیل کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔''

﴿بَاطِنُہٗ فِیۡہِ الرَّحۡمَۃُ وَظَاہِرُہٗ مِنۡ قِبَلِہِ الۡعَذَابُ ﴿۱۳﴾﴾ ''اس (فصیل) کی اندرونی جانب رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہوگا۔''

یعنی اس دیوار کے اندر کی طرف رحمت باری تعالیٰ کا نزول شروع ہو جائے گا' اہل ایمان کی ابتدائی مہمان نوازی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا' جبکہ اس فصیل کے باہر کی طرف عذابِ الٰہی کا نزول شروع ہو جائے گا۔ اس طرح اس چھلنی سے گزار کر منافقین کو سچے اہل ایمان سے الگ کر لیا جائے گا۔

اب اگلی دو آیات میں منافقت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ مرض کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس کی پیتھالوجی کیسے ارتقاء پاتی ہے۔

آیت ۱۴ ﴿یُنَادُوۡنَہُمۡ اَلَمۡ نَکُنۡ مَّعَکُمۡ ؕ﴾ ''وہ (منافق) انہیں پکار کر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟''

ہم تمہارے ساتھ مسجد نبویؐ میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ عیدوں کی نمازوں میں بھی ہم تمہارے ساتھ ہوتے تھے۔ ہم نے تمہارے ساتھ فلاں فلاں مہمات میں بھی حصہ لیا۔ ہر جگہ' ہر مقام پر ہم تمہارے ساتھ ہی تو تھے۔ پھر آج تمہارے اور ہمارے مابین اتنا فرق وتفاوت کیوں ہے؟

﴿قَالُوۡا بَلٰی﴾ ''وہ کہیں گے: ہاں کیوں نہیں! (تم تھے تو ہمارے ساتھ ہی)۔''

﴿وَلٰکِنَّکُمۡ فَتَنۡتُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں ڈالا''

فتنہ کیا ہے؟ قرآن مجید میں فتنے کی تین نسبتیں بیان کی گئی ہیں۔ کہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے کہ ہم نے ان کو فتنے میں ڈالا ہے کہ ہم آزما کر ظاہر کر دیں کہ کون کھرا ہے' کون کھوٹا ہے۔ دوسری نسبت ان کفار کی طرف کی گئی جو مسلمانوں کو ستا رہے تھے اور انہیں فتنے میں ڈال رہے تھے۔ تیسری نسبت یہ ہے کہ

انسان اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالتا ہے۔ یعنی جو لوگ اہل وعیال اور متاعِ دنیوی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی محبت کو اللہ کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں وہ اپنے آپ کو فتنے میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ اس فتنے کا ذکر سورۃ التغابن میں بایں الفاظ فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (آیت ۱۵) ''بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں''۔ اللہ تعالیٰ اس کے رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلے میں اپنے مال ومتاع اور اہل وعیال کو عزیز تر جاننا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ یہاں پر سورۃ التوبہ کی یہ آیت بھی ذہن میں تازہ کر لیں:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)' تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں' اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے' اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں' (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ' اُس کے رسول اور اُس کے راستے میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

اس آیت نے گویا ایک ترازو نصب کر کے اس کے ایک پلڑے میں آٹھ اور دوسرے میں تین محبتیں رکھ دی ہیں۔ اب ہر کوئی اپنے اپنے پلڑوں کی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ تو اے گروہِ منافقین! تم خود بتاؤ تم نے اپنی زندگیوں میں ان میں سے کونسے پلڑے کو جھکا کر رکھا تھا؟ آٹھ محبتوں والے پلڑے کو یا اللہ ورسولؐ اور جہاد کی محبت والے پلڑے کو؟ ظاہر ہے دنیا میں تم لوگ دنیاداری کے تقاضوں کو' اپنے مال ومنال اور اہل وعیال کو اللہ کی رضا اور اس کے رسولؐ کی محبت پر ترجیح دیتے رہے ہو۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ یہ فیصلہ کر کے تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

﴿وَتَرَبَّصْتُمْ﴾ ''اور تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے''

یہ وہی لفظ ہے جو سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت کے آخر میں (فَتَرَبَّصُوْا) آیا ہے۔ تَرَبُّص کے معنی انتظار کے بھی ہیں کہ آدمی کسی جگہ پر ٹھٹک کر کھڑا ہو جائے۔ ایمان وعمل کے معاملے میں یہ ''انتظار'' ہی دراصل فتنہ ہے۔ یہ ایمان کی ڈانواں ڈول کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے آدمی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آگے بڑھوں یا نہ بڑھوں! آگے بڑھتا ہوں تو جان ومال کو شدید خطرات لاحق ہوتے ہیں اور رُکتا ہوں تو باز پرس کا ڈر ہے۔ ایسی صورتِ حال میں وہ سوچنے لگتا ہے کہ کچھ دیر انتظار کرتا ہوں' اگر خطرہ ٹل گیا تو آگے بڑھ جاؤں گا' ورنہ پیچھے مڑ جاؤں گا۔ اور باز پرس ہوگی تو جھوٹ بول کر جان بچا لوں گا۔

﴿وَارْتَبْتُمْ﴾ ''اور تم لوگ شکوک وشبہات میں پڑ گئے''

پھر تمہاری منافقت کا مرض بڑھ کر اگلے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ یعنی پہلے اللہ کے مقابلے میں مال واولاد

کی محبت نے فتنے میں ڈالا' اس کا نتیجہ "تربُّص" (گومگو کی کیفیت) کی صورت میں سامنے آیا۔ پھر اس کے بعد ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب بچے کھچے ایمان میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھنے شروع ہو گئے کہ کیا پتا قیامت آئے گی بھی کہ نہیں! معلوم نہیں یہ مر کر زندہ ہونے کی باتیں سچی اور واقعی ہیں یا محض افسانے ہیں! یہ دنیا تو ایک حقیقت ہے' لیکن آخرت کا کیا اعتبار! یہاں کا عیش اور یہاں کے مزے تو نقد ہیں۔ اس آرام و آسائش کو اگر میں آخرت کے موہوم وعدے پر قربان کر دوں تو پتا نہیں اس کا اجر ملے گا بھی یا نہیں! اس کے بعد اس مرض کی آخری نشانی بتائی گئی:

﴿وَغَرَّتۡكُمُ الۡاَمَانِیُّ﴾ "اور تمہیں دھوکے میں ڈال دیا تمہاری خواہشات نے"

ان خواہشات کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔ وہ بڑے بڑے گناہگاروں کو بخش دیتا ہے۔ ہم جو بھی ہیں' جیسے بھی ہیں' اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کی اُمت ہیں۔ بالکل ایسا ہی زعم یہودیوں کو بھی تھا کہ ہم اللہ کے محبوب و برگزیدہ بندے ہیں: We are the chosen people of the Lord۔ چنانچہ تم لوگ اپنی انہی خوش فہمیوں میں مگن رہے۔ اس مرحلے میں اگر کبھی توبہ کرنے اور روش تبدیل کرنے کا خیال تمہیں آیا بھی تو خوشنما آرزوؤں (wishful thinkings) کے تصور نے تمہارے ضمیر کو تھپک تھپک کر پھر سے سلا دیا۔

﴿حَتّٰی جَآءَ اَمۡرُ اللّٰہِ وَغَرَّكُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ ﴿۱۴﴾﴾ "یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا اور تمہیں خوب دھوکہ دیا اللہ کے معاملے میں اُس بڑے دھوکے باز نے۔"

یعنی شیطان لعین نے تم لوگوں کو اللہ کے نام پر دھوکہ دیا۔ اس حوالے سے سورۂ لقمان میں ہم یہ تنبیہہ پڑھ چکے ہیں: ﴿فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا ٝ وَلَا یَغُرَّنَّكُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ ﴿۳۳﴾﴾ "تو (دیکھو!) تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے دُنیا کی زندگی اور (دیکھنا!) تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے اللہ کے حوالے سے وہ بڑا دھوکے باز۔"

زیر مطالعہ اس آیت میں بہت جامع انداز میں منافقت کے مدارج اور مراحل کے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔ مرض کا نقطہ آغاز مال و اولاد کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سے ہوتا ہے۔ ان چیزوں میں انہماک کی وجہ سے انسان کے دل میں اللہ' اس کے رسولؐ اور جہاد کی محبت بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں تَرَبُّص کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ایمان کے اندر شکوک و شبہات کے رخنے پڑ جاتے ہیں اور یہ وہ مرحلہ ہے جب نفاق اپنی اصلی شکل میں نمودار ہو کر دل میں مستقل ڈیرے جما لیتا ہے۔

آیت ۱۵ ﴿فَالۡیَوۡمَ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡكُمۡ فِدۡیَۃٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا ؕ﴾ "تو آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ہی کافروں سے۔"

ان الفاظ میں گویا واضح کر دیا گیا کہ دنیا میں تمہارا شمار بے شک مسلمانوں میں ہوتا رہا تھا لیکن یہاں تمہارا حشر کافروں کے ساتھ ہو گا۔ دنیا میں تو منافق خود کو مسلمان ہی کہتا ہے اور قانوناً بھی وہ مسلمان ہی شمار ہوتا ہے' لیکن اللہ خوب جانتا ہے کہ اُس کا دل ایمان سے خالی ہے اور وہ صرف ایک زبانی عقیدہ (dogma) لیے پھرتا ہے۔ ظاہر ہے جب دل میں ایمان ہی نہیں تو اس کے نیک اعمال بھی ریاکاری اور دکھاوے پر مبنی ہیں۔ چنانچہ

ایسے لوگوں کو ان کے نیک اعمال کا بھی بالکل کوئی اجر نہیں ملے گا۔ بہر حال میدانِ محشر میں یہ لوگ نور سے محروم ہوں گے اور ان کا حشر کافروں کے ساتھ ہوگا۔

﴿مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑮﴾ ''تمہارا ٹھکانہ آگ ہے' وہی تمہاری غم خوار ہے' اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔''

''مَاْوٰى'' سے مراد ہے پناہ گاہ' جس کی طرف انسان کسی خطرے سے بچنے کے لیے دوڑتا اور لپکتا ہے۔ یہاں طنزاً فرمایا کہ اب تمہاری پناہ گاہ اور ٹھکانہ یہی آگ ہے۔ اسی طرح یہاں ''مَوْلٰى'' کا لفظ بھی طنزاً استعمال ہوا ہے۔ مَوْلٰى کا مطلب ہے ہمدرد' مونس وغم خوار' غم گسار' مددگار' دوست' پشت پناہ' دمساز' ساتھی وغیرہ۔ چنانچہ فرمایا کہ اب یہی آگ تمہاری ہمدرد' غم گسار اور خبر گیری کرنے والی ہے' دکھ درد کہنا ہے تو اس سے کہو' نالہ وشیون ہے تو اسی سے کرو! مزید فرمایا کہ وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ''مَصِيْر'' کا مطلب ہے لوٹنے کی جگہ' وہ جگہ جہاں انسان بانجامِ کار پہنچا دیا جائے ——— اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ!

آیات ۱۶ تا ۱۹

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ⑯ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ⑰ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ⑱ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ⑲ ع ۱۸

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ ہر اُس شخص سے سوال کر رہے ہیں جس نے اب تک کی یہ سب باتیں پڑھ کر یا سن کر اپنے دل میں اتار لی ہیں۔ سوال وخطاب کا یہ بہت جذباتی انداز ہے:

آیت ۱۶ ﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ﴾ ''کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے اہلِ ایمان کے لیے کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد کے لیے اور اُس (قرآن) کے آگے کہ جو حق میں سے نازل ہو چکا ہے؟''

یہاں قرآن کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ﴾ یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں زیادہ پُرزور انداز میں فرمائی گئی ہے: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾ (آیت ۱۰۵) ''اور ہم نے اس کو نازل کیا ہے حق کے ساتھ اور یہ نازل ہوا ہے حق کے ساتھ۔''

دین یا نیکی کے معاملے میں فیصلہ کرتے ہوئے انسان ہمیشہ تاخیر وتعویق سے کام لیتا ہے کہ یہ کر لوں' وہ

کرلوں، بس اس کے بعد اپنا طرزِ زندگی درست کرلوں گا! ابھی ذرا بچیوں کے ہاتھ پیلے کرلوں! بس ذرا یہ بچوں کی تعلیم مکمل ہو لے وغیرہ وغیرہ۔ اور دیکھا جائے تو بچوں کی تعلیم ہے کیا؟ صرف دنیا بنانے اور دنیا کمانے کے علم وفن کی تحصیل! گویا جس کوئے ملامت کے طواف میں خود ساری عمر برباد کردی انہی راستوں پر اپنی اولاد کو گامزن کرنے کے خواب دیکھے جا رہے ہیں! پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ بچوں کے کیریئرز بنانے کے جنون میں انہیں کچی عمر میں برطانیہ اور امریکہ بھیجنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ وہاں جا کر بچے جب ''ترقی'' کی منازل طے کرتے کرتے اس ''مقام'' پر پہنچ جاتے ہیں کہ مذہب واخلاق سے اپنے تعلق کو باعث عار سمجھنے لگتے ہیں تو پھر یہ لوگ بیٹھ کر روتے ہیں اور لادینی تہذیب وتمدن کو کوستے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس سوال پر لازم ہے کہ ہم سب اپنے اپنے ضمیر کی عدالت میں پیش ہو کر خود سے پوچھیں کہ کیا ہماری زندگیوں میں وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ ہم اللہ اور قرآن کے احکام کے سامنے جھک جائیں؟

﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی''

﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ﴾ ''تو جب ان پر ایک طویل مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔''

یہاں پر ﴿فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ کے یہ الفاظ پڑھتے ہوئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۴ کا وہ حصہ بھی ذہن میں تازہ کرلیں جس میں بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ﴾ ''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کچھ کے بعد، پس اب تو وہ پتھروں کی مانند ہیں، بلکہ سختی میں ان سے بھی زیادہ شدید ہیں۔''

﴿وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۱۶﴾ ''اور ان کی اکثریت اب فاسقوں پر مشتمل ہے۔''

آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ بنی اسرائیل بھی تمہاری طرح اپنے زمانے کی اُمتِ مسلمہ تھے۔ ان کی روش کو بھی تم جانتے ہو اور ان کے انجام سے بھی تم آگاہ ہو۔ دیکھ لو! اگر تم نے اب بھی توبہ نہ کی اور اپنی روش تبدیل نہ کی تو یہ مت بھولو کہ ان کی طرح تمہیں بھی نشانِ عبرت بنایا جا سکتا ہے۔

اس ڈانٹ کے بعد اب اگلی آیت میں ہمت افزائی کی جا رہی ہے کہ دیکھو! اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے دل کی ''زمین'' ایمان کی فصل کے قابل نہیں رہی، تو بھی تمہیں گھبرانے یا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

آیت ۱۷ ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ﴾ ''جان لو کہ اللہ زندہ کر دیتا ہے زمین کو اُس کے مرنے کے بعد۔''

تم اکثر دیکھتے ہو کہ بے آب وگیاہ بنجر زمین پر جب بارش برستی ہے تو اس کے ذرے ذرے میں زندگی رواں دواں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر تم لوگ بھی خلوصِ نیت کے ساتھ توبہ کرلو گے اور اللہ کے حضور جھک جاؤ گے تو وہ

اپنی نظرِ رحمت سے تمہارے دلوں کی زمین کو بھی از سرِ نو زندگی بخش دے گا اور اسے پھر سے ایمان کی فصل کے قابل بنادے گا۔

﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴿۱۷﴾﴾ ''ہم نے تو تمہارے لیے اپنی آیات خوب واضح کردی ہیں تاکہ تم عقل سے کام لو۔''

لہٰذا تم عقل سے کام لیتے ہوئے اس مثال سے سبق سیکھو! تم خوب سمجھتے ہو کہ فصلیں کب برباد ہوتی ہیں اور زمینیں کیونکر بنجر بنتی ہیں' تمہیں بنجر زمینوں کو پھر سے سرسبز و شاداب بنانے کا نسخہ بھی معلوم ہے۔ یہی نسخہ ذرا اپنے دل کی زمین پر بھی آزماؤ اور اس زمین کو بھی پھر سے آباد کرنے پر کمر ہمت باندھو۔ توکل علی اللہ کا سرمایہ اکٹھا کرو' انفاق فی سبیل اللہ کے ہل چلا کر حب مال کے جھاڑ جھنکاڑ سے جان چھڑاؤ' پھر اللہ کی اطاعت و محبت کے بیج بو کر اس کے ذکر کے پانی سے مسلسل آبیاری کرتے چلے جاؤ اور دل میں یقین رکھو کہ اللہ مردہ زمینوں کو پھر سے زندہ کردیا کرتا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴿۱۸﴾﴾ ''یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو قرض دیں اللہ کو قرضِ حسنہ ان کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہے۔''

سورۃ البقرۃ کے رکوع ۳۵ اور ۳۶ کے مطالعہ کے دوران بھی یہ نکتہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے مال خرچ کرنے کی دو مدیں ہیں ـــــ یعنی ایک صدقہ اور دوسری انفاق فی سبیل اللہ یا اللہ کے لیے قرضِ حسنہ۔ چنانچہ وہ مال جو اللہ کی رضا کے لیے غرباء' مساکین' بیواؤں' یتیموں' بیماروں' مسافروں' مقروضوں' محتاجوں اور ضرورت مند انسانوں کی مدد اور حاجت روائی کے لیے خرچ کیا جائے وہ صدقہ ہے۔ اسی مفہوم میں سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ میں زکوٰۃ کو بھی ''صدقہ'' قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ بنیادی طور پر غرباء و مساکین اور محتاجوں کے لیے ہے۔ اس میں اللہ کے لیے (فی سبیل اللہ) صرف ایک مد رکھی گئی ہے۔ اس حوالے سے دوسری اصطلاح ''انفاق فی سبیل اللہ'' یا اللہ کے لیے قرضِ حسنہ کی ہے۔ واضح رہے کہ یہ باقاعدہ ایک اصطلاح کی بات ہو رہی ہے' ورنہ عرفِ عام میں تو صدقہ بھی فی سبیل اللہ ہی ہے' کیونکہ وہ بھی اللہ کے لیے اور اس کی رضا جوئی کے لیے ہی دیا جاتا ہے۔ بہرحال ایک باقاعدہ اصطلاح کے اعتبار سے انفاق فی سبیل اللہ ایسا انفاق ہے جو اللہ کے دین کے لیے' دین کی نشر و اشاعت کے لیے اور اس کے غلبہ و اقامت کی جدوجہد کے لیے کیا جائے اور یہی وہ انفاق ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے۔

اللہ کی مشیت سے مردہ زمین کے زندہ ہو جانے کے ذکر کے بعد یہاں صدقہ اور اللہ کے لیے قرضِ حسنہ کی ترغیب میں گویا دل کی مردہ زمین کو پھر سے ایمان کی فصل کے لائق بنانے کی ترکیب پنہاں ہے۔ یعنی اگر تم نے دل کی مردہ زمین کو زندہ کرنا ہے تو اس میں انفاقِ مال کا ہل چلاؤ اور اس میں سے حُبِّ دنیا کی جڑوں کو کھود کھود کر نکال باہر کرو۔ یقین رکھو کہ جیسے جیسے تم اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرتے جاؤ گے' ویسے ویسے تمہارے دل کی

زمین میں ایمان کی فصل جڑیں پکڑتی چلی جائے گی۔ دنیا کی محبت کو میں عام طور پر گاڑی کی بریک سے تشبیہہ دیا کرتا ہوں۔ جس طرح گاڑی کو بریک لگی ہو تو وہ حرکت میں نہیں آسکتی' اسی طرح اگر دنیا کی محبت آپ کے دل میں پیوست ہو چکی ہے تو اس میں اللہ کے راستے پر گامزن ہونے کی امنگ پیدا نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ دل کی گاڑی کو رضائے الٰہی کی شاہراہ پر رواں دواں کرنے کے لیے اس کی بریک سے پاؤں اٹھانا بہت ضروری ہے۔ یعنی اس کے لیے مال کی محبت کو دل سے نکالنا ناگزیر ہے۔ اور اس محبت کو دل سے نکالنے کی ترکیب یہی ہے کہ اپنے مال کو زیادہ سے زیادہ اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے۔

آیت ۱۹ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر وہی ہیں صدیق اور شہداء اپنے رب کے پاس۔''

یعنی وہ لوگ جو صدقات کے ذریعے اور اللہ کو قرضِ حسنہ دے کر اپنے دلوں سے مال کی محبت اور اس کی نجاست کو دھو ڈالتے ہیں' وہ جب ایمانِ حقیقی سے سرشار ہوتے ہیں تو اب ان کے لیے مقامِ صِدّیقیت اور مرتبۂ شہادت تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ صدقہ وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ سے اگر دل کی گاڑی کی بریک کھل گئی اور یہ گاڑی ایمانِ حقیقی کے راستے پر رواں دواں ہوگئی تو پھر اہلِ ایمان میں سے ہر کوئی اپنی ہمت اور کوشش کے مطابق اس راستے کی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ سیاقِ مضمون کے اعتبار سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم نے انفاقِ مال کے ذریعے مال کی محبت کو دل سے نکال کر اللہ کی محبت سے اپنے دل کو آباد کرلیا تو ایمانِ حقیقی تمہارے دلوں میں راسخ ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے بعد تم اپنی اپنی کوششوں اور اپنی اپنی طبائع کے مطابق ترقی کرتے چلے جاؤ گے۔ ترقی کے اس راستے میں تم میں سے بعض لوگ شہادت کے مقام پر بھی فائز ہوسکتے ہیں اور بعض صدیقیت کا مرتبہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ وہی اعلیٰ مراتب ہیں جن کا ذکر سورۃ النساء کی اس آیت میں ہوا ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾﴾

''اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسولؐ کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی اُن کی جن پر اللہ کا انعام ہوا یعنی انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین' اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے!''

چنانچہ تم ہمت کرو' اپنے اپنے دل کی گاڑی کی بریک کھولو' ایمان کا ایکسلریٹر (accelerator) دباؤ اور اللہ کے راستے پر نکل پڑو۔ اس ایکسلریٹر کو تم جتنا بڑھاتے چلے جاؤ گے اسی نسبت سے تمہاری منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جائے گی۔ (انسانی مزاج اور طبائع کے اعتبار سے مقامِ صدیقیت اور مقامِ شہادت کی تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ مریم کی آیت ۴۱ کی تشریح۔)

﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ﴾ ''ان کے لیے ہوگا ان کا اجر اور ان کا نور۔''

انہیں اللہ کے ہاں سے اجر بھی ملے گا اور نور بھی۔ نور تو میدانِ حشر میں پُل صراط سے گزرنے کے لیے ملے

گا' جبکہ اجر جنت میں داخلے اور اس میں درجات کی بلندی کے لیے ملے گا۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴿۱۹﴾﴾ ''اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں۔''

آیات ۲۰ تا ۲۴

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۝ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۝

آیت ۲۰ ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ﴾ ''خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل' دل لگی کا سامان اور ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش ہے۔''

گزشتہ سطور میں دنیا کی محبت کو گاڑی کی بریک سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حُبِّ دنیا انسان کو اللہ کے راستے پر چلنے سے ایسے روک دیتی ہے جیسے ایک گاڑی کو اس کی بریک جامد و ساکت کر دیتی ہے۔ اب اس آیت میں اس بریک یعنی حُبِّ دنیا کی اصل حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ تو آیئے اس آیت کے آئینے میں دیکھئے انسانی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ انسانی زندگی کا آغاز کھیل کود (لعب) سے ہوتا ہے۔ بچپن میں انسان کو کھیل کود کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ باپ امیر ہے یا غریب' اس کا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے یا مندے کا شکار ہے' بچے کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا' اسے تو کھیلنے کودنے کا موقع ملتے رہنا چاہیے اور بس۔ پھر جب وہ لڑکپن کی عمر (teenage) کو پہنچتا ہے تو اس کا کھیل کود محض ایک معصوم مشغولیت تک محدود نہیں رہتا' بلکہ اس میں کسی نہ کسی حد تک تلذّذ (sensual gratification) کا عنصر بھی شامل ہو جاتا

ہے۔اس مشغولیت کو آیت میں لَھْو کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ عام طور پر قرآن میں انسان کی دنیوی زندگی کی حقیقت بیان کرنے کے لیے لَھْو و لَعب کی ترکیب استعمال ہوئی ہے' لیکن یہاں ان الفاظ کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں عمر کی تقسیم کے حساب سے انسانی زندگی کے مراحل کا ذکر ہو رہا ہے اور اس حوالے سے لَعب یعنی کھیل کود کا مرحلہ پہلے آتا ہے جبکہ اس میں لَھْو کا عنصر بعد کی عمر میں شامل ہوتا ہے۔

جوانی کی اسی عمر میں انسان پر اپنی شخصیت کی ظاہری ٹیپ ٹاپ (زِیْنَة) کا جنون سوار ہوتا ہے۔عمر کے اس مرحلے میں وہ شکل وصورت کے بناؤ سنگھار' ملبوسات وغیرہ کی وضع قطع' معیار اور فیشن کے بارے میں بہت حساس ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد جب عمر ذرا اور بڑھتی ہے تو تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا چوتھا اور اہم ترین مرحلہ ہے۔اس عمر میں انسان پر ہر وقت تفاخر کا بھوت سوار ہوتا ہے' اور وہ عزت' شہرت' دولت' گھر' گاڑی وغیرہ کے معاملے میں خود کو ہر قیمت پر دوسروں سے برتر اور آگے دیکھنا چاہتا ہے۔اس کے بعد جب عمر ذرا ڈھلتی ہے تو تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کا دور آتا ہے۔اس دور میں انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔تفاخر کے دور میں تو سوچ یہ تھی کہ کچھ بھی ہو جائے مونچھ نیچی نہیں ہونی چاہیے' لیکن اب سوچ یہ ہے کہ مال آنا چاہیے' مونچھ رہے یا نہ رہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اس عمر میں پہنچ کر انسان اپنے مفاد کے معاملے میں بہت حقیقت پسند (realistic) ہو جاتا ہے' بلکہ جوں جوں بڑھاپے کی طرف جاتا ہے' اس کے دل میں مال و دولت کی ہوس بڑھتی چلی جاتی ہے۔حتیٰ کہ ایک مرحلے پر اسے خود بھی محسوس ہو جاتا ہے کہ اب وہ پاؤں قبر میں لٹکائے بیٹھا ہے مگر اس کی هَلْ مِنْ مَّزِیْد کی خواہش ختم ہونے میں نہیں آتی۔انسان کی اسی کیفیت کو سورۃ التکاثر میں یوں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۝ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝﴾ ''(لوگو!) تم کو (مال کی) کثرت کی طلب نے غافل کر دیا' یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔''

بہرحال وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں' لیکن عمر کے ہر مرحلے میں کسی ایک چیز کی دھن اس کے ذہن پر سوار رہتی ہے۔اس موضوع پر یہ قرآن حکیم کی واحد آیت ہے اور اس اعتبار سے بہت اہم اور منفرد ہے' مگر حیرت ہے کہ انسانی زندگی کے نفسیاتی مراحل کے طور پر اسے بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔

آیت کے اگلے حصے میں انسانی اور نباتاتی زندگی کے مابین پائی جانے والی مشابہت اور مماثلت کا ذکر ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے کہ نباتاتی سائیکل (Botanical cycle) اور انسانی زندگی کے سائیکل (Human life cycle) دونوں میں بڑی گہری مشابہت اور مناسبت ہے۔ اس تشبیہہ سے انسان کو دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر تم اپنی زندگی کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہو تو کسان کی ایک فصل کے سائیکل کو دیکھ لو۔اس فصل کے دورانیہ میں تمہیں اپنی پیدائش' جوانی' بڑھاپے' موت اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے کا حقیقی نقشہ نظر آ جائے گا۔

﴿کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُهٗ﴾ ''(انسانی زندگی کی مثال ایسے ہے) جیسے بارش برستی ہے تو اس سے پیدا ہونے والی روئیدگی کسانوں کو بہت اچھی لگتی ہے''

﴿ ثُمَّ يَهِيْجُ﴾ ''پھر وہ کھیتی اپنی پوری قوت پر آتی ہے''
﴿فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا﴾ ''پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو جاتی ہے''
﴿ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ﴾ ''پھر وہ کٹ کر چورا چورا ہو جاتی ہے۔''

اس تشبیہہ کے آئینے میں انسانی زندگی کی مکمل تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ پھر وہ جوان ہو کر اپنی پوری قوت کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر عمر ڈھلتی ہے تو بالوں میں سفیدی آ جاتی ہے اور چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ پھر موت آنے پر اسے زمین میں دبا دیا جاتا ہے جہاں وہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تشبیہہ صرف دنیوی زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہے۔ تم اشرف المخلوقات ہو' نباتات نہیں ہو' تمہاری اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جو کہ دائمی اور ابدی ہے اور اس کی نعمتیں اور صعوبتیں بھی دائمی اور ابدی ہیں۔ لہٰذا عقل اور سمجھ کا تقاضا یہی ہے کہ تم اپنی آخرت کی فکر کرو۔

﴿وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ﴾ ''اور آخرت میں بہت سخت عذاب ہے اور (یا پھر) اللہ کی طرف سے مغفرت اور (اس کی) رضا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے ابتدائی دور کا ایک خطبہ ''نہج البلاغہ'' میں نقل ہوا ہے۔ اس کے اختتامی الفاظ یوں ہیں:

((...... ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءً ، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا))(۱)

''......پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی۔''

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور دنیا کی زندگی تو سوائے دھوکے کے ساز و سامان کے اور کچھ نہیں ہے۔''

تمہاری دنیوی زندگی کی حقیقت تو بس یہی ہے' لیکن تم ہو کہ اس حقیقت کو فراموش اور نظر انداز کیے بیٹھے ہو۔ تمہارے دل میں نہ اللہ کی یاد ہے اور نہ آخرت کی فکر۔ بس تم اس عارضی اور دھوکے کی زندگی کی آسائشوں میں مگن اور اسی کی رنگینیوں میں گم ہو۔ یاد رکھو! یہ طرزِ عمل غیروں کی پہچان تو ہو سکتا ہے' ایک بندۂ مؤمن کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہے۔ بقول علامہ اقبال:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق!

آیت ۲۱ ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ﴾ ''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت

(۱) بحوالہ جمهرة الخطب' ص ۵۔ وفقه السيرة للالبانی' ص ۹۷۔

آسمان اور زمین جیسی ہے۔"

دنیا کمانے میں تو تم لوگ خوب مسابقت کر رہے ہو۔ اس میدان میں تو تم ہر وقت ع "ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!" کی فکر میں لگے رہتے ہو۔ عارضی دنیا کی اس مسابقت کو چھوڑ و! اپنی یہی صلاحیتیں اللہ کی رضا اور جنت کے حصول کے لیے صرف کرو۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے محنت کرو اور اس منزل میں بہتر سے بہتر مقام پانے کے لیے دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔

جنت کی وسعت کی مثال کے لیے یہاں "كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" جبکہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۳ میں "عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" کے الفاظ آئے ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود ابھی تک ارض و سماء کی وسعت کے بارے میں انسان کا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ بہرحال اب تک میسر ہونے والی معلومات کے مطابق اس کائنات میں ارب ہا ارب کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں کی وسعت اور ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں کے فاصلے کو کروڑوں نوری سالوں پر محیط تصور کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر کہکشاں میں اَن گنت ستارے، ہمارے نظامِ شمسی (solar system) جیسے بے شمار نظام اور ہماری زمین جیسے لاتعداد سیارے ہیں۔ اسی طرح ہر ستارے کی جسامت اور ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک کے فاصلے کا اندازہ بھی نوری سالوں میں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس آیت میں آسمان اور زمین کی وسعت سے مراد پوری کائنات کی وسعت ہے جس کا اندازہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ بہرحال اس مثال سے جنت کی وسعت کے تصور کو انسانی ذہن کی سطح پر ممکن حد تک قابلِ فہم بنانا مقصود ہے۔ اس حوالے سے میرا گمان یہ ہے (واللہ اعلم!) کہ قیامت برپا ہونے کے بعد پہلی جنت اسی زمین پر بنے گی اور اہل جنت کی ابتدائی مہمانی (نُزُل) بھی یہیں پر ہوگی۔ اس کے بعد اہلِ جنت کے درجات و مراتب کے مطابق ان کے لیے آسمانوں کے دروازے کھولے جائیں گے۔ اس حوالے سے سورۃ الاعراف کی اس آیت میں واضح فرما دیا گیا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ......﴾ (آیت ۴۰) کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے اور ان کے بارے میں تکبر کرنے والوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ بہرحال اس کے بعد اہلِ جنت کو ان کے مراتب کے مطابق اس جنت میں منتقل کر دیا جائے گا جس کی وسعت کا یہاں ذکر ہوا ہے۔ اہلِ جنت کو وہاں جانے کے لیے کسی راکٹ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی' بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں اسی انداز سے آسمانوں پر لے جائے گا جیسے محمد رسول اللہ ﷺ سفر معراج میں زمین سے ساتویں آسمان تک چلے گئے تھے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام ساتویں آسمان سے زمین پر آتے ہیں۔

﴿اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ﴾ "وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر۔"

"اِعداد" (بابِ افعال) کے معنی ہیں کسی خاص مقصد کے لیے کسی چیز کو تیار کرنا۔ یعنی وہ جنت بڑے اہتمام سے تیار کی گئی ہے' سجائی اور سنواری گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴿۲۱﴾﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے جس کو بھی وہ چاہے گا دے گا۔ اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔''

''فَضْل'' سے مراد ہے اللہ کی طرف سے بغیر استحقاق کے دی جانے والی شے۔ اس کے بالمقابل اجرت اور اجر کے الفاظ عام استعمال ہوتے ہیں' جن کا مطلب ہے بدلہ' جو کسی محنت اور مزدوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں بالعموم جہاں بھی جنت کا تذکرہ آیا ہے وہاں لفظ ''فَضْل'' استعمال ہوا ہے۔ گویا قرآن مجید کا تصور یہ ہے کہ انسان مجرد اپنے عمل کے ذریعے سے جنت کا مستحق نہیں بن سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کی دست گیری نہ کرے۔ ☆

اب اگلی آیت میں دنیوی زندگی میں پیش آنے والی تکالیف و مشکلات کو قابل برداشت بنانے کا نسخہ بتایا جا رہا ہے۔ دراصل اہلِ ایمان کو جس راستے کی طرف بلایا جا رہا ہے وہ بہت کٹھن اور صبر آزما راستہ ہے۔ یہ انفاق' جہاد اور قتال کا راستہ ہے اور اس کی منزل ''اقامتِ دین'' ہے' جس کا ذکر آگے آیت ۲۵ میں آ رہا ہے۔ اس اعتبار سے آیت ۲۵ اس سورت کے ذروۂ سنام (climax) کا درجہ رکھتی ہیں۔ بہرحال اہل ایمان جب اس راستے پر گامزن ہوں گے تو آزمائشیں' صعوبتیں اور پریشانیاں قدم قدم پر ان کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کریں گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے جس کا ذکر قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ﴾ (آیت ۱۵۵) ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے''۔ جبکہ سورۂ آل عمران میں اس قانون کا ذکر ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ﴾ (آیت ۱۸۶) ''(مسلمانو! یاد رکھو) تمہیں لازماً آزمایا جائے گا تمہارے مالوں میں بھی اور تمہاری جانوں میں بھی' اور تمہیں لازماً سننا پڑیں گی بڑی تکلیف دہ باتیں ان لوگوں سے بھی جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان سے بھی جنہوں نے شرک کیا''۔ چنانچہ مشکلات و مصائب کی اس متوقع یلغار کے دوران اہل ایمان کو سہارا دینے کے لیے یہ نسخہ بتایا جا رہا ہے:

☆ اس ضمن میں یہ حدیث بھی ذہن میں رہنی چاہیے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ((لَنْ يُّدْخِلَ اَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ)) ''تم میں سے کسی شخص کا عمل اسے ہرگز جنت میں داخل نہیں کرے گا (جب تک کہ اللہ کی رحمت اس کی دستگیری نہ فرمائے)''۔ اب کسی صحابی نے بڑی ہمت' حوصلے اور جرأت سے کام لیتے ہوئے پوچھ لیا: وَلَا اَنْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! ''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ بھی (اعمال کی بنیاد پر جنت میں داخل نہیں ہو سکتے)؟'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا وَلَا اَنَا' اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِفَضْلٍ وَّرَحْمَةٍ)) ''نہیں' میں بھی نہیں' اِلا یہ کہ اللہ عزوجل اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت کی چادر سے مجھے ڈھانپ دے۔'' [صحيح البخاري' كتاب المرضى' باب تمنى المريض الموت' ح: ۵۶۷۳ ۔ وصحيح مسلم' كتاب صفة القيامة والجنة والنار' باب لن يدخل احد الجنة بعمله......' ح: ۲۸۱۸] (حاشیہ از مرتب)

آیت ۲۲ ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ؕ﴾ ''نہیں پڑتی کوئی پڑنے والی مصیبت زمین میں اور نہ تمہاری اپنی جانوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے'اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔''

اَصَابَ یُصِیْبُ (آ پڑنا' نازل ہونا) سے اسم الفاعل ''مُصِیْب'' ہے اور اس کی مؤنث ''مُصِیْبَۃ'' ہے' جس کے معنی ہیں نازل ہونے یا آ پڑنے والی شے۔ چنانچہ لغوی اعتبار سے تمام حوادث' واقعات' کیفیات جو ہم پر وارد ہوتی ہیں' وہ سب کی سب اس میں شامل ہو جائیں گی' لیکن عام طور پر یہ لفظ تکلیف دہ' ناگوار اور ناپسندیدہ چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس آیت کی رو سے مصیبتیں دو قسم کی ہیں۔ یا تو آفاتِ ارضی وسماوی یعنی آفاقی مصیبتیں' جو زمین پر بڑے پیمانے پر نازل ہوتی ہیں' مثلاً سیلاب' زلزلے' طوفانِ باد و باراں وغیرہ' یا انسانوں کی اپنی جانوں پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے' مثلاً کوئی بیماری یا کوئی عارضہ لاحق ہو گیا یا کوئی حادثہ پیش آ گیا۔ یہاں واضح فرما دیا گیا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی انسانوں پر اجتماعی یا انفرادی طور پر کسی بھی شکل میں کوئی مصیبت' آفت یا تکلیف آتی ہے اس کے معرضِ وجود میں آنے سے قبل اس کی پوری تفصیل اللہ کے علمِ قدیم میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔

﴿اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ﴿۲۲﴾﴾ ''یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

انسانوں کو یہ بات بے شک عجیب یا مشکل لگے' مگر اللہ کا علم مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ پر محیط ہے۔ اس کے لیے کائنات کی ایک ایک چیز کا پوری تفصیل سے احاطہ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ بات تم لوگوں کو بھلا کیوں بتائی جا رہی ہے؟ اس لیے:

آیت ۲۳ ﴿لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ﴾ ''تاکہ تم افسوس نہ کیا کرو اُس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے''

کوئی اچھا موقع ہاتھ سے نکل جانے پر انسان رہ رہ کر افسوس کرتا اور پچھتاتا ہے کہ اگر میں اس وقت یوں کر لیتا تو میرا یہ کام ہو جاتا' اگر فلاں شخص فلاں وقت فلاں رکاوٹ کھڑی نہ کر دیتا تو میں فلاں نقصان سے بچ جاتا وغیرہ وغیرہ۔ ایسے پچھتاوے بعض اوقات زندگی کا روگ بن جاتے ہیں۔ لیکن اگر اللہ اور اُس کے فیصلوں پر انسان کا ایمان مضبوط ہو تو وہ اپنے بڑے سے بڑے نقصان کو بھی یہ کہہ کر بھلا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو میرے حق میں ایسا ہی منظور تھا اور اس چیز کے میرے ہاتھ سے نکل جانے میں ہی خیر تھی' کیونکہ میرے لیے کیا بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ سورۃ البقرۃ کی یہ آیت اس بارے میں بہت واضح ہے:

﴿وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾﴾

''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو' اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

﴿وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۨ ﴿۲۳﴾﴾ ''اور اس پر اترایا نہ

کرو جو وہ تمہیں دے دے‘ اور اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں اِترانے والے اور فخر کرنے والے۔“

ایسی کسی صورت میں انسان کے لیے اترانے کا جواز اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے جو کچھ بھی دیا جاتا ہے دراصل اس کی آزمائش کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ہمیں اس حقیقت کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس دنیا میں ہمیں جو نعمت‘ صلاحیت یا دولت ملتی ہے اس کے لیے ہمیں جواب دہ ہونا ہے۔ چنانچہ جس انسان کے پاس دُنیوی نعمتوں کی جس قدر بہتات ہوگی جوابدہی کے حوالے سے اس کی ذمہ داری بھی اسی حد تک بڑھ جائے گی۔ اکاؤنٹس کی زبان میں ایسی ذمہ داری کو liability کہا جاتا ہے۔ جب کسی محکمے یا ادارے کی balance sheet تیار ہوتی ہے تو اس ادارے کو ملنے والا سرمایہ liability کے کھاتے میں لکھا جاتا ہے۔ کھاتے میں liability کا اندراج ہو جانے کے بعد اس کی ایک ایک پائی کا حساب دینا اس ادارے کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کو دنیا میں جو کچھ دیتا ہے وہ اس کے ذمہ liability ہے۔ کل قیامت کے دن اس میں سے ہر چیز کا آڈٹ ہونا ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ بندے سے پوچھے گا کہ تمہیں جو مال دیا گیا تھا بتاؤ اس کا تم نے کیا کیا؟ میری طرف سے دی گئی قوت‘ ذہانت اور دوسری صلاحیتوں کو کہاں کہاں صرف کیا؟ دنیا بنانے میں کھپایا یا آخرت کمانے میں لگایا؟ اس احتساب یا آڈٹ کا تصور کر کے ہم میں سے ہر ایک کو اپنے کھاتے کی فکر کرنی چاہیے۔ جیسے آج ہمارے بہت سے لوگ ورلڈ بینک‘ آئی ایم ایف اور بین الاقوامی سطح کے دوسرے اداروں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور لاکھوں ڈالر تنخواہ وصول کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یقیناً یہ بہت بڑے اعزاز اور فخر کی بات ہے‘ لیکن ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ کس کی چاکری کر رہے ہیں؟ اور کس کی رتھ میں گھوڑے بن کر جتے ہوئے ہیں؟ ظاہر ہے وہ باطل نظام کی خدمت کر رہے ہیں اور اسی نظام سے اپنی خدمت کا معاوضہ وصول کر رہے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ آخرت کے آڈٹ کے وقت وہ اپنی balance sheet کو کیسے justify کریں گے۔

چنانچہ انسان کو مال و دولت اور دوسری نعمتوں پر اترانے کے بجائے ان کے حساب کتاب کی فکر کرنی چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ چیزیں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے طور پر دی گئی ہیں۔ اگر وہ اس آزمائش میں ناکام ہوگیا تو یہی نعمتیں آخرت میں اُس کے گلے کا طوق بن جائیں گی۔ اس حوالے سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ایک واقعہ بہت عبرت انگیز ہے۔ آپؒ کو خلیفہ وقت کی طرف سے ”خلق قرآن“ کے مسئلے پر جیل میں ڈالا گیا۔ خلیفہ آپؒ سے اپنی مرضی کا فتویٰ حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے خلیفہ کے حکم پر جیل میں آپؒ پر بے پناہ تشدد ہوا۔ روایات میں آتا ہے کہ جس انداز میں آپؒ کو پیٹا جاتا تھا ایسی مار کسی ہاتھی کو پڑتی تو وہ بھی بلبلا اٹھتا‘ مگر اس بے رحم تشدد کو آپؒ نے ایسے حوصلے اور صبر سے برداشت کیا کہ کبھی آنکھوں میں آنسو تک نہ آئے۔ مگر جب نئے خلیفہ کے دور میں آپؒ کو جیل سے رہا کیا گیا اور خلیفہ کے ایلچی آپؒ کی خدمت میں اشرفیوں کے تھیلے لے کر حاضر ہوئے تو ان تھیلوں کو دیکھ کر آپؒ رو پڑے۔ آپؒ نے روتے ہوئے اللہ کے حضور عرض کی کہ اے اللہ‘ یہ آزمائش بہت سخت ہے! میں اس سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں ہوں‘ مجھے اس امتحان میں مت

ڈال! اس حوالے سے دوسری انتہا پر برصغیر کے قوم فروشوں کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر میں انگریزوں نے بڑی بڑی جاگیروں' عہدوں اور خطابات کے ذریعے یہاں کے لوگوں کو خریدا اور حکمرانوں کے ہاتھوں بکنے کے بعد وہ لوگ اپنی قوم سے غداری کر کے اپنے آقاؤں کی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ بہرحال یہ ہر انسان کا اپنا فیصلہ ہے کہ اس کی ترجیح دنیا ہے یا آخرت؟

آیت ۲۴ ﴿الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ﴾ ''جو لوگ بخل سے کام لیتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔''

جو شخص اپنی دولت پر اتراتا ہے وہ اسے بہت سنبھال سنبھال کر بھی رکھتا ہے' کیونکہ اسی دولت کے بل پر تو اس کی اکڑ قائم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس دولت کو بچا بچا کر رکھتا ہے اور نہ صرف خود بخل سے کام لیتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ دراصل اسے یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ جب دوسرے لوگ اللہ کی راہ میں بڑھ چڑھ کر خرچ کریں گے تو اُس کے بخل کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس لیے وہ دوسروں کو بڑے مخلصانہ انداز میں سمجھاتا ہے کہ میاں ذرا اپنی ضروریات کا بھی خیال رکھو' تم نے تو اپنے دونوں ہاتھ کھلے چھوڑ رکھے ہیں۔ آخر تمہارے ہاں چار بیٹیاں ہیں' ان کے ہاتھ بھی تم نے پیلے کرنے ہیں۔ آج کی بچت ہی کل تمہارے کام آئے گی......!

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴾ ۲۴ ''اور جو کوئی رخ پھیرے گا تو (وہ سن رکھے کہ) اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔''

وہ غنی ہے' اسے کسی کی احتیاج نہیں ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اگر وہ اقامت دین کی جدوجہد میں اپنے جان و مال سے شریک نہ ہوگا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ اسے کسی کی حمد و ثنا کی بھی کوئی احتیاج نہیں ہے' وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے۔

آیت ۲۵

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۲۵ ع ۱۹

اب آ رہی ہے وہ آیت جو اس پوری سورۂ مبارکہ کا نقطۂ عروج یا ذروۂ سنام (climax) ہے۔ اس آیت کا مضمون خصوصی طور پر آج کے مسلمانوں کے لیے بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ آج ہمارے ہاں دین کا اصل تصور مسخ ہو چکا ہے اور یہ آیت دین کے درست تصور کو اجاگر کرتی ہے۔ دراصل انگریزوں کی غلامی کے دور میں ہم مسلمانوں کے ذہنوں میں دین کا عام تصور یہی تھا کہ حکومت انگریز کی ہے تو ہوتی رہے' ہمیں کیا! ہم نے تو نمازیں پڑھنی ہیں اور روزے رکھنے ہیں۔ اس دور میں برصغیر کے ایک بہت بڑے عالم نے کہا تھا کہ ہمیں کوئی

ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے انگریزوں کو ہماری طرف سے کوئی تشویش لاحق ہو' اس لیے کہ انہوں نے ہمیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ یعنی انگریز ہمیں نمازیں پڑھنے' روزے رکھنے' حج ادا کرنے اور داڑھیاں رکھنے سے نہیں روکتا۔ مذہبی آزادی کی اسی وکالت پر علامہ اقبال نے یہ پھبتی چست کی تھی: ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

ظاہر ہے انگریز مسلمانوں کو مراسمِ عبودیت ادا کرنے اور داڑھیاں بڑھانے سے کیوں منع کرتے؟ اس سے انہیں بھلا کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ ملک میں قانون تو تاجِ برطانیہ کا نافذ تھا' دیوانی اور فوجداری عدالتیں اسی قانون کے مطابق فیصلے کر رہی تھیں۔ اس ماحول میں اسلام کہاں تھا اور قرآنی قوانین کی کیا حیثیت تھی؟ عام مسلمانوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو بس اسی پر مسرور و مطمئن تھے کہ انہیں ''مکمل'' مذہبی آزادی حاصل ہے۔ بہرحال انگریز کی غلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا تصورِ دین سکڑتے سکڑتے صرف چند عبادات اور رسومات (rituals) تک محدود ہو گیا۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں آج بھی تصورِ دین یہی ہے کہ نماز پڑھو' روزے رکھو' ہو سکے تو حج کرو' قرآن خوانی کی محفلیں سجاؤ اور بس! اور جہاں تک سودی کاروبار اور حرام خوریوں کا تعلق ہے یہ دُنیوی معاملات ہیں' اسلام کا ان سے کیا لینا دینا؟ ہاں سال بہ سال عمرہ کر کے پچھلے گناہوں سے پاک ہو جایا کرو' جیسے ہندو گنگا میں نہا کر اپنے زعم میں اپنے سارے پاپ دھوڈالتے ہیں۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر جب آپ اس آیت کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو دین کا روایتی تصور لڑکھڑاتا ہوا محسوس ہوگا۔ اس آیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں ڈنکے کی چوٹ انقلاب کی بات کی گئی ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسی بے باک اور عریاں انقلابی عبارت پوری انسانی تاریخ کے کسی انقلابی لٹریچر میں موجود نہیں ہے۔ اس تمہید کے بعد آیئے اب اس آیت کا مطالعہ کریں اور اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

آیت ۲۵ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ﴾ ''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ''

﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ ''اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری''

یہاں تین چیزوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے جو رسولوں کے ساتھ بھیجی گئیں: (۱) بینات (۲) کتاب' اور (۳) میزان —— ان میں سب سے پہلی چیز ''بینات'' ہے۔ ''بیّن'' اُس شے کو کہتے ہیں جو از خود ظاہر اور نمایاں ہو اور اسے کسی دلیل اور وضاحت کی حاجت نہ ہو۔ ع ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!'' یہ لفظ عام طور پر رسولوں کے تذکرے میں معجزات کے لیے آتا ہے۔

''کتاب'' کا لفظ عام فہم اور بالکل واضح ہے' جبکہ ''میزان'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام ہے جس میں حقوق و فرائض کا توازن موجود ہے۔ کسی معاشرے میں اگر حقوق و فرائض کے مابین توازن ہوگا تو وہ معاشرہ صحیح رہے گا' اور اگر اس کے اندر عدمِ توازن راہ پا گیا تو اسی کا نام ظلم' عدوان' زیادتی اور ناانصافی ہے۔

﴿لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔''

یہ ہے اس کتاب یعنی قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد۔ اب اس کے مقابلے میں اپنی موجودہ صورت کا

بھی جائزہ لیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے قرآن کو کس حد تک ''بے دخل'' کر چکے ہیں۔کیا قرآن اس لیے نازل ہوا تھا کہ قرآن خوانی کی مجالس سجالی جائیں؟ یا حسنِ قراءت کی محافل کا اہتمام کرلیا جائے' یا اس کی آیات کی خطاطی کی نمائشیں لگائی جائیں' یا چالیس من وزنی قرآن سونے کی تاروں سے لکھ کر لوگوں کی زیارت کے لیے رکھ دیا جائے —— اور زندگی باطل نظام کے تحت ہی بسر کی جائے؟ اس حوالے سے مولانا ماہر القادری کی زبان سے قرآن کا یہ شکوہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے:۔

یہ میری عقیدت کے دعوے' قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں' ایسے بھی ستایا جاتا ہوں!

ظاہر ہے قرآن تو ایک ضابطہ زندگی اور ایک نظامِ حکومت لے کر آیا ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس کے نظام کو عملی طور پر اپنے ملک اور معاشرے میں قائم کریں' اس کی لائی ہوئی میزان کو نصب کریں اور اس کی دی ہوئی شریعت کے مطابق اپنے فیصلے کریں ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!''

اس آیت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہاں درج ذیل آیات کو بھی دہرانے کی ضرورت ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں فرمایا: ﴿قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ؕ﴾ (آیت ۱۸) کہ میں عدل وقسط کو قائم کرنے والا ہوں۔ سورۃ النساء میں اہل ایمان کو باقاعدہ حکم دیا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے اہل ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''۔ سورۃ المائدۃ میں الفاظ کی ترتیب بدل کر یہی حکم پھر سے دہرایا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ﴾ (آیت ۸) ''اے اہل ایمان! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ''۔ پھر سورۃ الشوریٰ میں حضور ﷺ سے اعلان کروایا گیا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ''مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل قائم کروں''۔ پھر سورۃ الشوریٰ ہی میں فرمایا گیا: ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ؕ﴾ (آیت ۱۷) ''اللہ وہ ہستی ہے جس نے نازل فرمائی کتاب حق کے ساتھ اور میزان بھی''۔ یعنی سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں بھی کتاب اور میزان نازل کرنے کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔

اس حوالے سے سورۃ المائدۃ کی یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے: ﴿قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ (آیت ۶۸) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قائم نہیں کرتے تورات کو اور انجیل کو اور اُس کو جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تمہارے رب کی طرف سے''۔ سورۃ المائدۃ کی اس آیت کے مطالعہ کے دوران میں نے کہا تھا کہ مسلمان ''تورات وانجیل'' کی جگہ لفظ ''قرآن'' رکھ کر اس آیت کو اس طرح پڑھ کر دیکھیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے خود ہی اپنی حیثیت کا تعین کریں: ''قُلْ یٰۤاَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا الْقُرْاٰنَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ'' کہ اے قرآن والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے

جب تک تم قائم نہیں کرتے قرآن کو اور اس کو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے — تم قرآن کی تلاوت کر کے سمجھ لیتے ہو کہ تم نے قرآن کا حق ادا کر دیا' یا تراویح میں قرآن ختم کر کے فخر محسوس کرتے ہو کہ تم نے بڑا تیر مار لیا' چاہے تم نے اس کا ایک حرف بھی نہ سمجھا ہو۔ یاد رکھو! جب تک تم قرآن کے احکام کو عملی طور پر خود پر نافذ نہیں کرتے ہو اور قرآن کے نظامِ عدل کو اپنے ملک و معاشرہ میں قائم نہیں کرتے ہو' قرآن پر ایمان کے تمہارے زبانی دعوے کی کوئی حیثیت نہیں۔

قرآن کے نظامِ عدل وقسط کے حوالے سے یہ حقیقت بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ معاشرے کے مراعات یافتہ طبقات کے لیے یہ نظام کسی قیمت پر قابل قبول نہیں ہوگا۔ اس لیے جونہی اس کے قیام کے لیے ٹھوس کوششوں کا آغاز ہوگا یہ طبقات ان کوششوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے آ موجود ہوں گے۔ ظاہر ہے جن سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات (vested interests) پرانے نظام کے ساتھ وابستہ ہیں' وہ کب چاہیں گے کہ معاشرے میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔ اگرچہ اس حوالے سے بھی تاریخ میں استثنائی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما اپنے معاشرے کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے' اس کے باوجود ان دونوں حضراتؓ نے اپنے مفادات' کاروبار اور سٹیٹس کی پروا کیے بغیر حق کی آواز پر بلاتاخیر لبیک کہا۔ لیکن مجموعی طور پر اشرافیہ اور دولت مند طبقہ ہمیشہ نظامِ عدل کے قیام کی کوشش میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ مراعات یافتہ طبقات کی سرتوڑ کوشش ہوتی ہے کہ موجودہ نظام کے اندر کوئی تبدیلی نہ آئے۔ چنانچہ باطل نظام کی بیخ کنی اور نظامِ عدل وقسط کے قیام کی جدوجہد کے لیے اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو راستے سے ہٹانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ آیت کے اگلے حصے میں ایسے عناصر کی سرکوبی کا نسخہ بتایا جا رہا ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے' اس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں۔''

نوٹ کیجیے! نہ کوئی لگی لپٹی بات کی گئی ہے اور نہ ہی معذرت خواہانہ اسلوب اپنایا گیا ہے۔ جو بات کہنا مقصود تھی وہ دوٹوک انداز میں ڈنکے کی چوٹ کہی گئی ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ ''عریاں ترین'' انقلابی عبارت ہے۔ ظاہر ہے جب انقلاب اپنا راستہ بنائے گا اور جب ظالمانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا مرحلہ آئے گا تو خون بھی ضرور بہے گا اور کچھ سر بھی کچلنے پڑیں گے۔ یہ انقلاب کا ناگزیر مرحلہ ہے' اس کے بغیر انقلاب کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل کے لیے انقلاب کی بات ہو رہی ہے جو ساری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ یہاں تو ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ دنیا میں خود انسان عدلِ انسانی کے اپنے تصور کی ترویج وتنفیذ کے لیے طاقت کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں' مخالف ممالک کا گھیراؤ کرتے ہیں' ان پر بے رحمانہ پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ ''امن کے لیے جنگ'' (War for Peace) کا نعرہ لگا کر کمزوروں پر چڑھائی کرتے ہیں اور پھر ملکوں کے ملک برباد کر کے رکھ دیتے ہیں' اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس قتل وغارت اور بربریت کو وہ وقت کی اہم ضرورت اور عین انصاف سمجھتے ہیں۔

اس کائنات کا خالق اور مالک بھی اللہ ہے اور زمین پر حکمرانی کا حق بھی اُسی کا ہے۔ اُسی نے اپنی تمام مخلوق کو اپنا تابع فرمان بنایا ہے اور اُسی نے انسان کو ایک حد تک اختیار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اسی اختیار کی وجہ سے انسان اکثر من مانی کرتے ہوئے اُس کی حکمرانی کے مقابلے میں اپنی حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی وجہ سے زمین میں فساد برپا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ وہ زمین میں عدل وانصاف کی ترویج اور اپنے قانون کی حکمرانی چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس کی مشیت یہی ہے کہ اُس کے حق حکمرانی کو چیلنج کرنے والے باغیوں کو حق کی طاقت کے ذریعے سے کچل دیا جائے: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ط﴾ (الانبیاء:۱۸) ''بلکہ ہم حق کو دے مارتے ہیں باطل پر تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے' تو جبھی وہ نابود ہو جاتا ہے''۔ بہرحال اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُس کا یہ کام اُس کے نام لیوا کریں۔ اُس کے نام لیوا حق کے علمبردار بن کر اللہ کے باغیوں کا مقابلہ کریں' باطل نظام کو بزورِ بازو اُکھاڑ پھینکیں اور اللہ کی زمین پر اللہ کی حکمرانی کو یقینی بنائیں۔

آیت زیر مطالعہ میں لوہے کا ذکر اسی حوالے سے آیا ہے کہ اہل حق حالات و زمانہ کی ضرورت کے مطابق اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے سامانِ حرب تیار کریں' رائج الوقت ٹیکنالوجی سے استفادہ کریں اور باطل کے مقابلے کے لیے مطلوبہ طاقت فراہم کریں۔ لیکن اس انقلابی عمل میں سب سے اہم سوال افرادی قوت کی فراہمی کا ہے' اور اس عمل کی ابتدا دعوت وتبلیغ سے ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں بارہ سال تک مسلسل دعوت وتبلیغ کا کام کیا۔ حق کو قبول کرنے والے افراد کی تربیت کی' انہیں منظم کیا اور جب مطلوبہ افرادی قوت فراہم ہوگئی تو آپؐ نے اللہ کی مشیت کے عین مطابق طاقت کے اس ''کوڑے'' کو باطل کے سر پر یوں دے مارا کہ اس کا بھیجا نکال کے رکھ دیا۔ آج بھی یہ کام اگر ہوگا تو اسی طریقے سے ہوگا جس طریقے سے حضور ﷺ نے اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا۔ آج بھی اہلِ حق کو اسی طرح جانیں قربان کرنا ہوں گی' تکلیفیں جھیلنا پڑیں گی' گھر بار چھوڑنے پڑیں گے اور جان و مال کے نقصانات برداشت کرنا پڑیں گے۔ گویا یہ انتہائی مشکل کام ہے اور اہل حق کی بے دریغ قربانیوں کے بغیر اس کا پایہ تکمیل تک پہنچنا ممکن نہیں۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ط اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾﴾ ''اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔ یقیناً اللہ بہت قوت والا' بہت زبردست ہے۔''

''تاکہ اللہ جان لے'' کا مفہوم یہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ دکھا دے' ظاہر کر دے' ممیز کر دے کہ کون ہے وہ جو غیب کے باوجود اللہ اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ گویا حق و باطل کی جنگ کے دوران جو مردانِ حق لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کے دین کے غلبے کے لیے میدان میں آئیں گے وہی اللہ اور اس کے رسولؐ کے مددگار ہوں گے۔ دراصل اللہ کے دین کو غالب کرنا بنیادی طور پر حضور ﷺ کا فرضِ منصبی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اسی مقصد کے لیے مبعوث فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ

کُلِّہٖ﴾ (الصف:۹) ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ' تاکہ وہ غالب کر دے اس کو کُل کے کُل دین پر''۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ حضور ﷺ کے اس مشن میں تمام اہلِ ایمان آپؐ کے دست و بازو بنیں' بلکہ سورۃ الصف میں تو اس کے لیے براہِ راست حکم آیا ہے: ﴿**یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ**﴾ (آیت ۱۴) ''اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ۔''

یہ مضمون سورۃ الصف میں مزید وضاحت کے ساتھ آئے گا۔ لیکن اس حوالے سے یہاں یہ اہم نکتہ سمجھ لیجیے کہ آیت زیر مطالعہ میں غلبہ دین کی تکمیل اور نظامِ عدل وقسط کی تنفیذ کے لیے تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے: بینات' کتاب اور میزان: ﴿**لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ**﴾ یعنی حضور ﷺ سے پہلے رسولوں کو اس مشن کے لیے بینات (معجزات)' کتاب اور میزان کے ساتھ بھیجا جاتا رہا' جبکہ حضور ﷺ کو اس مشن کے لیے صرف دو چیزیں (الہدیٰ اور دین الحق) عطا کی گئیں: ﴿**هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ**﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸ اور الصف:۹)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے لیے بینات (معجزات) اور الکتاب ایک ہو گئے۔ یعنی الہدیٰ (قرآن) آپؐ کی کتاب بھی ہے' اسی میں قانون ہے اور یہی آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ بھی ہے' جبکہ آپؐ کی رسالت میں میزان (شریعت) مکمل ہو کر ''دین الحق'' کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

آیات ۲۶ تا ۲۹

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِیْمَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْکِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَکَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۶ ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّیْنَا بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِیَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا کَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا ۚ فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَکَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۷ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۲۸ لِّئَلَّا یَعْلَمَ اَهْلُ الْکِتٰبِ اَلَّا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝۲۹ ع

اس سورۂ مبارکہ کا اصل مضمون تدریجاً آگے بڑھتا ہوا آیت ۲۵ پر اپنے نقطۂ عروج (climax) پر پہنچ گیا ہے۔ اب آئندہ آیات میں گویا اس مضمون کا ضمیمہ اور تکملہ آ رہا ہے (قبل ازیں کبھی میں بغرضِ تفہیم اس کے لیے anti climax کی اصطلاح استعمال کرتا رہا ہوں' لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ اصطلاح مناسب نہیں ہے)۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر مناسب ہو گا کہ متعلقہ آیات کے مطالعے سے پہلے اس مضمون کی روح کو اچھی

طرح سے سمجھ لیا جائے۔ ظاہر ہے زمین پر اللہ کے قانون کی حکمرانی اور معاشرے میں عدل وانصاف کی ترویج شیطان پر بہت بھاری ہے۔ اس لیے اس نے اس ''انقلاب'' کا راستہ روکنے کے لیے یہ چال چلی کہ مخلص اہلِ ایمان کی توجہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کی طرف مبذول کرا دی' تا کہ اُسے انسانوں کے معاشرے میں ننگا ناچ ناچنے کی کھلی چھٹی مل جائے۔

اہلِ ایمان کے دلوں میں اللہ کی محبت' دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طلب کے جذبے کا نتیجہ تو یہ نکلنا چاہیے کہ وہ اللہ کی فوج کے سپاہی بن کر اقامت دین کی جدوجہد کے علمبردار بن جائیں اور نتائج سے بے پروا ہو کر ہر زماں' ہر مکاں شیطانی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار رہیں' لیکن شیطان نے ایسے لوگوں کو رہبانیت کا سبق پڑھا دیا کہ اللہ والوں کا دنیا کے جھمیلوں سے کیا واسطہ؟ انہیں تو چاہیے کہ وہ دنیا اور علائق دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں کی غاروں میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کریں اور اللہ کے ہاں اپنے درجات بلند کریں۔ ظاہر ہے ایسی رہبانیت دین کی اصل روح کے خلاف ہے۔ غلبہ دین کی جدوجہد کی راہ میں مصیبتیں جھیلنے' اس میدان میں شیطانی قوتوں سے نبردآزما ہونے کے لیے مال وجان کی قربانیاں دینے اور خانقاہوں میں بیٹھ کر عبادت وریاضت کی سختیاں برداشت کرنے میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اللہ کے راستے میں جہاد کی سختیاں برداشت کرنے سے معاشرے سے ظلم وناانصافی کا خاتمہ ہوتا ہے' انسانیت عدل وانصاف کے ثمرات سے بہرہ ور ہوتی ہے اور ماحول میں فلاح وخوشحالی کے پھول کھلتے ہیں' جبکہ رہبانیت کی راہ میں اٹھائی گئی تکالیف سے دنیا اور اہلِ دنیا کو کسی قسم کا فائدہ پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ بہرحال شیطان کا یہ وار عیسائیت کے حوالے سے بہت کارگر ثابت ہوا۔ اس کے نتیجے میں عیسائیوں کے ہاں نہ صرف خانقاہی نظام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ''رہبانیت'' اعلیٰ ترین ذریعہ اور وسیلہ قرار پائی۔ (History of Christian Monasticism پر لکھی گئی یورپین مصنفین کی بڑی بڑی ضخیم کتابیں عیسائی راہبوں اور رہبانیت کے بارے میں عجیب وغریب تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔)

اس کے بعد اسلام میں جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور احیاءِ خلافت کی چند کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں تو مسلمانوں کے ہاں بھی رہبانیت کے طور طریقے رائج ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی عملی صورت یہ سامنے آئی کہ مخلص اہل ایمان اور اہل علم لوگ بادشاہوں اور سلاطین کے رویے کی وجہ سے اُمت کے اجتماعی معاملات سے لاتعلق ہو کر گوشہ تنہائی میں جا بیٹھے۔ البتہ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے ان سے اکتسابِ فیض کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ اہل اللہ اور اہل علم کی مسندوں نے خانقاہوں کی شکل اختیار کر لی۔ سلاطین واُمراء نے اپنے مفاد کے لیے ان خانقاہوں کی سرپرستی کرنی شروع کر دی۔ ایسی خانقاہوں کے لیے بڑی بڑی جاگیریں مختص کر دی گئیں تا کہ خانقاہ اور اس سے متعلقہ تمام لوگوں کے اخراجات احسن طریقے سے پورے ہوتے رہیں اور یہ لوگ حکومت کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ چلہ کشیوں اور اپنی روحانی منازل طے کرنے میں مصروف ومشغول رہیں۔ دوسری طرف ان خانقاہوں سے متعلقہ لوگوں کے ہاں بھی رفتہ رفتہ دین ودنیا کا یہ تصور جڑ پکڑتا گیا کہ حکومت کرنا اور اجتماعی معاملات نپٹانا

سلاطین وامراء کا کام ہے' ہمیں ان معاملات سے کیا سروکار؟ ہمارا کام تو دینی تعلیمات کی اشاعت اور لوگوں کی روحانی اصلاح کرنا ہے' تاکہ وہ اچھے مسلمان اور اللہ کے مقرب بندے بن سکیں۔ یوں دین اسلام کا اصل تصور دھندلاتا گیا اور اس کی جگہ خانقاہی نظام کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ دین کا درست تصور اور انبیاء ورسل کی بعثت کا اصل مقصد تو وہی ہے جو ہم گزشتہ آیت میں پڑھ چکے ہیں: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں۔''

چنانچہ آئندہ آیات میں ایک تو یہ نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانیت نے ''رہبانیت'' کا غلط موڑ کب اور کیسے مڑا' اور ساتھ ہی مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو! بے شک دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنا اور دنیا کے مقابلے میں آخرت بنانے کی فکر اختیار کرنا ہی دین کا اصل جوہر ہے' لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم راہب بن کر تمدن کی زندگی کو خیر باد کہہ دو' بن باس لے لو' اور جنگلوں میں جا کر چلے کاٹنا شروع کر دو' پہاڑوں کی چوٹیوں اور غاروں میں جا کر تپسیائیں کرو' یا خانقاہوں میں گوشہ نشین ہو جاؤ۔ تمہیں تو دنیا کی منجدھار میں رہتے ہوئے دوسروں کو زندگی کی ضمانت فراہم کرنی ہے۔ تمہیں تو جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے دنیا میں حق کا بول بالا کرنا ہے۔ ظلم و ناانصافی کو جڑ سے اکھاڑ کر معاشرے میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنا ہے' اور اپنے اردگرد ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں مظلوم کو اُس کا حق ملے اور ظالم کو سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکے۔ اس کے لیے تمہارے سامنے اُسوۂ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قائم کردہ معیار بطور نمونہ موجود ہے۔

حضور ﷺ نے عرب کے معاشرے کو حق و انصاف کا جو معیار عطا کیا تھا اس کی جھلک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس تقریر میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو آپؓ نے لوگوں سے بیعتِ خلافت لینے کے فوراً بعد کی تھی۔ آپؓ نے بحیثیت امیر المؤمنین اپنے پہلے خطاب میں عدل و انصاف کے بارے میں اپنی ترجیح واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''لوگو! تمہارا کمزور شخص میرے نزدیک بہت قوی ہو گا جب تک کہ میں اسے اُس کا حق نہ دلوا دوں اور تمہارا قوی شخص میرے نزدیک بہت کمزور ہو گا جب تک کہ میں اس سے کسی کا حق وصول نہ کر لوں''۔ اسی طرح اس ضمن میں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ بھی بہت اہم ہیں جو آپؓ نے ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔ قادسیہ کے محاذ پر اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جنگ سے پہلے ایرانیوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ رستم نے ان سے سوال کیا تھا کہ تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟ اس پر انہوں نے اپنے مشن کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:

اِنَّ اللّٰہ ابتعثنا لنخرج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ ربّ العباد' ومن ضیق الدُّنیا الی سِعَۃ الآخرۃ ومن جور الادیان الی عدل الاسلام

''ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب کی غلامی میں لے آئیں' اور انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی کشادگی سے ہم کنار کریں' اور باطل نظاموں سے نجات دلا کر اسلام کے عادلانہ نظام سے روشناس کرائیں۔''

یہ ہے اس مضمون کا لُبِّ لُباب جو اس سورت کے آخر میں مرکزی مضمون کے ضمیمے کے طور پر بیان ہوا ہے۔

اب اگلی آیت سے اس مضمون کی تمہید شروع ہو رہی ہے۔

آیت ۲۶ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ﴾ ''ہم نے ہی بھیجا تھا نوحؑ کو بھی اور ابراہیمؑ کو بھی''

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ''اور ہم نے انہی دونوں کی نسل میں رکھ دی نبوت اور کتاب''

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر عذاب کے بعد انسانیت کی نسل حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں حضرت سامؑ حضرت حام اور حضرت یافث سے چلی تھی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاء بھی آئے وہ آپؑ ہی کی نسل سے تھے۔ البتہ قرآن میں صرف سامی رسولوں کا تذکرہ ہے' آپؑ کے دوسرے دو بیٹوں کی نسلوں میں مبعوث ہونے والے پیغمبروں کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود بھی حضرت نوح علیہ السلام ہی کی نسل سے تھے' لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں جو انبیاء و رسل علیہم السلام آئے ان کا ذکر قرآن میں تخصیص کے ساتھ آپؑ کی نسل یا ذریت کے حوالے سے ہوا ہے۔ آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گزرے تقریباً پانچ ہزار برس ہو چکے ہیں۔ اس دوران آپؑ کی اولاد کہاں کہاں پہنچی اور کس کس علاقے میں آباد ہوئی' یہ اپنی جگہ تحقیق کا ایک مستقل موضوع ہے' لیکن اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؑ کی نسل جس جس علاقے میں بھی آباد ہوئی ان تمام علاقوں میں انبیاء آتے رہے۔

﴿فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۶﴾ ''تو ان (کی نسل) میں کچھ تو ہدایت یافتہ بھی ہیں' لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے۔''

آیت ۲۷ ﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ﴾ ''پھر ہم نے بھیجے ان کے نقش قدم پر اپنے بہت سے رسولؑ اور پھر ان کے پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو اور اسے ہم نے انجیل عطا فرمائی''

آیت ۲۶ اور ۲۷ میں حضرت نوح' حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیاء و رسل علیہم السلام کا ذکر تمہید کے طور پر آیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اصل میں یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جن کے پیروکاروں نے رہبانیت کی ابتدا کی تھی۔

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ﴾ ''اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہم نے ان کے دلوں میں بڑی نرمی اور رحمت پیدا کر دی۔''

رأفت اور رحمت ملتے جلتے مفہوم کے دو الفاظ ہیں۔ رأفت دراصل وہ انسانی جذبہ ہے جس کے تحت انسان کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ بقول امیر مینائی ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ ‌ ‌ ‌ ‌ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

یعنی یہ جذبۂ رأفت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کسی کے درد کو اپنا درد سمجھتا ہے' جبکہ رحمت کا جذبہ انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ دوسرے انسان کی تکلیف دور کرنے کے لیے کوشش کرے۔ گویا رأفت کا جذبہ بنیادی طور پر انسان کے دل میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اس کے ردِّعمل (reflex action) کا اظہار جذبۂ رحمت کی وجہ سے ہوتا

ہے۔اس اعتبار سے رأفت اور رحمت باہم تکمیلی (complementary) نوعیت کے جذبات ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا تصدیق فرمائی گئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کے دلوں کو خصوصی طور پر رأفت و رحمت کے جذبات سے مزین کیا گیا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود بھی مزاج کے اعتبار سے انتہائی نرم اور رقیق القلب تھے' آپؑ کی شخصیت میں سختی کا عنصر بالکل نہیں تھا۔آپؑ کی شخصیت کے اس پہلو کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ آپؑ نے ایک شخص کو چوری کرتے دیکھا تو پوچھا کہ کیا تم چوری کر رہے ہو؟ اس نے کہا نہیں میں چوری تو نہیں کر رہا۔آپؑ نے فرمایا: اچھا تو پھر میری آنکھ نے غلط دیکھا ہے۔ چنانچہ آپؑ کی شخصیت کے زیر اثر آپؑ کے حواریین کی طبیعتوں میں بھی رأفت' رحمت' رقتِ قلب اور شفقت کے غیر معمولی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ جذبات بلاشبہ اپنی جگہ مستحسن ہیں۔خود حضور ﷺ کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ میں فرمایا ہے کہ آپؐ اہل ایمان کے حق میں بہت نرم دل اور شفیق ہیں: ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (رأفت اور رء وف ایک ہی مادے سے ہیں)۔ بہرحال شیطان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے مزاج کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے ان جذبات کا رخ رہبانیت کی طرف موڑ دیا۔

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا﴾ ''اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی تھی''

﴿مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ ''ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں''

اس فقرے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ رہبانیت انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اختیار کی تھی' اس میں ان کی کسی بدنیتی کا عنصر شامل نہیں تھا۔اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم نے تو ان پر کچھ لازم نہیں کیا تھا سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی رضا تلاش کریں۔لیکن انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے نفس کشی (self annihilation)' ترکِ دنیا' رہبانیت اور تجرد (بغیر نکاح کے) کی زندگی بسر کرنے کا راستہ اختیار کر لیا۔ بہرحال حقیقت میں یہ اللہ کی رضا کا راستہ نہیں تھا۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا درست راستہ تو جہاد کا راستہ ہے: ﴿وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ﴾ (المائدۃ: ۳۵) ''اللہ کا قرب تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو!'' یعنی باطل کو ملیامیٹ کرنے' حق کو غالب کرنے' ظلم و ناانصافی کو اکھاڑ پھینکنے اور عدل و قسط کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے مجاہد بن جاؤ! اس راستے پر چلتے ہوئے جان و مال کی قربانیاں دو' فاقے برداشت کرو اور ہر طرح کی تکالیف و مشکلات کا سامنا کرو۔ بہرحال شیطان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو اللہ کے مقرب بننے اور اُس کی رضا تلاش کرنے کا یہ راستہ ان کی نظروں سے اوجھل کر کے رہبانیت کے راستے پر ڈال دیا تا کہ اللہ کے نیک اور مخلص بندے تمدن کے معاملات سے لاتعلق رہیں اور معاشرے کے اندر ابلیسیت کے ننگے ناچ کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو۔ دنیا میں ظالموں اور شریروں کو کھلی چھوٹ حاصل ہو اور ان کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو۔ علامہ اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس کی بہترین تعبیر کی ہے کہ ابلیس نے اپنے چیلے چانٹوں کو ہدایات دیتے ہوئے ''مؤمن'' کے بارے میں کہا کہ ۔

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾ ''پھر وہ اس کی رعایت بھی نہ کر سکے جیسا کہ اس کی رعایت کرنے کا حق تھا۔''

دراصل انسان کے لیے اپنے اوپر کوئی غیر فطری پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کر لینا تو آسان ہے مگر پھر ساری عمر اس فیصلے کو نبھانا بہت مشکل ہے۔ یہی مشکل رہبانیت کا راستہ اختیار کرنے والے لوگوں کو پیش آئی۔ راہب اور راہبائیں بظاہر تو مجرد زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے لیکن پھر فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زناکاریوں میں ملوث ہو جاتے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ راہب خانوں کے تہہ خانے حرامی بچوں کے قبرستان بن گئے۔ History of Christian Monasticism پر لکھی گئی کتابوں میں اس بارے میں لرزہ خیز تفصیلات ملتی ہیں۔ دراصل انسان کے جنسی جذبے کو غیر فطری طور پر دبانا ایسا ہی ہے جیسے بہتے دریا پر بند باندھنا۔ دریا کے پانی کو مناسب راستہ دے کر تو اس پر بند باندھا جا سکتا ہے لیکن دریا کے پورے پانی کو روکنا کسی طور پر بھی ممکن نہیں۔ ظاہر ہے اگر کہیں کوئی ایسی کوشش ہو گی تو اس کے خطرناک نتائج نکلیں گے۔ یہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کا جنسی جذبہ بہت منہ زور ہے۔ سگمنڈ فرائڈ عیسائیوں کے گھر کا آدمی ہے اور اس کی گواہی گویا ''شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا'' کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان کے جنسی جذبے کو وہ تمام جذبات پر غالب اور باقی تمام جذبات کا محرک قرار دیتا ہے۔ اگرچہ میں ذاتی طور پر فرائڈ کے اس تجزیے سے متفق نہیں ہوں اور میری یہ رائے اکیلے فرائڈ یا اس کے اس تجزیے کے بارے میں ہی نہیں' بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ بیشتر مغربی فلاسفر انسانی زندگی پر فلسفیانہ بحث کے دوران اکثر غلط بینی اور کج روی کا شکار ہو گئے ہیں۔ جیسے فرائڈ کو ہر طرف سیکس ہی سیکس نظر آیا' کارل مارکس کی نظریں انسان کے پیٹ پر مرکوز ہو کر رہ گئیں' جبکہ ایڈلر صاحب کو انسان کے بڑا بننے کا جذبہ (urge to dominate) ہی ہر طرف چھایا ہوا دکھائی دیا۔ بہرحال مذکورہ فلاسفرز نے اپنے اپنے مطالعے اور تجزیے میں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور بہت سے دوسرے اہم پہلوؤں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کی ایسی آراء جزوی طور پر ہی درست تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ بہرحال اگر یہ درست نہ بھی ہو کہ انسان کا جنسی جذبہ اس کے تمام جذبوں پر غالب اور اس کے باقی تمام جذبوں کا محرک ہے تو بھی اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ انسان کا یہ جذبہ بہت منہ زور ہے اور اس کو غیر فطری طریقے سے قابو میں لانا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس جذبے کو نظم وضبط میں لانے کے لیے نکاح کا فطری راستہ تجویز کیا ہے۔ رہبانیت کے لیے اختیار کیے گئے طور طریقے زیادہ تر چونکہ غیر فطری تھے اس لیے اسے اختیار کرنے والے لوگ اس کا حق ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔

﴿فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ﴾ ''تو ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو ان کا اجر دیا جو ایمان لے آئے۔''

ایک رائے کے مطابق یہ عیسائیوں کے ان لوگوں کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کے زمانے

میں صاحبِ ایمان تھے' لیکن اس سے ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ ان میں سے جو لوگ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لا کر مسلمان ہو گئے انہیں ان کا اجر دیا جائے گا۔

﴿وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴿۲۷﴾﴾ ''لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے۔''

آیت ۲۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اُس کے رسولؐ (محمد ﷺ) پر ایمان لاؤ!''

اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے — ایک تو یہ کہ یہاں 'يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' کا خطاب محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں سے ہے۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم محض زبان سے آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کر کے نہ رہ جاؤ بلکہ صدقِ دل سے ایمان لاؤ اور اپنے ایمان کو پختہ کرو۔ حضور ﷺ پر سچے ایمان کا معیار آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اہل ایمان سے فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (آیت ۲۱) ''تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے''۔ تم لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے اُسوہ کو دیکھو' آپؐ کی زندگی کے معمولات کو اپنے لیے مشعل راہ بناؤ اور اپنی زندگیوں میں ویسا توازن پیدا کرو جیسا کہ آپؐ کی زندگی میں توازن تھا۔ دیکھو! حضور ﷺ نے ترکِ دنیا کا طریقہ نہیں اپنایا۔ آپؐ نے نکاح کیے' آپؐ کی اولاد بھی ہوئی' آپؐ نے بھرپور زندگی گزاری' اس کے باوجود آپؐ نے اپنی زندگی کی تمام توانائیاں اور تمام صلاحیتیں غلبہ دین کی جدوجہد کی نذر کر دیں۔ تم پر بھی لازم ہے کہ تم لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے اس اُسوہ کی پیروی کرو۔

حضور ﷺ کے اسوہ کے حوالے سے یہ اہم نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ جیسے آپؐ کا اتباع ضروری ہے' ویسے ہی اس اتباع میں توازن قائم کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر کسی نے حضور ﷺ کی تمام سنتوں کو اپنا لیا لیکن اتباع کرتے ہوئے ہر سنت کی مطلوبہ ترجیح اور اہمیت کا خیال نہ رکھا تو گویا وہ شخص حضور ﷺ کے اُسوہ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا۔ اس نکتہ کو اس مثال سے سمجھیں کہ ایک طبیب نے آپ کو چند دوائیوں پر مشتمل ایک نسخہ لکھ کر دیا۔ ان میں سے ایک دوائی کا مطلوبہ وزن ایک چھٹانک ہے' دوسری کا ایک تولہ اور تیسری کا ایک ماشہ۔ اب اگر آپ اپنی پسند سے تولہ والی دوائی کا وزن ایک چھٹانک کر لیں اور چھٹانک والی دوائی کا وزن ایک تولہ کر لیں تو وہ نسخہ' نسخۂ شفا نہیں رہے گا' نسخۂ ہلاکت بن جائے گا۔ اس لیے صرف یہ اطمینان کافی نہیں کہ فلاں عمل آپ ﷺ کی سنت سے ثابت ہے' بلکہ سنت و سیرتِ نبویؐ کو اس اعتبار سے دیکھنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے اپنی زندگی مجموعی طور پر کس طرح گزاری۔ آپؐ کی زندگی میں کس چیز کی کتنی اہمیت تھی؟ آپؐ نے کس عمل کو کتنا وقت دیا؟ آپؐ کی ترجیحات کیا تھیں؟ آپؐ کی ترجیحات میں بنیادی نوعیت کی چیزیں کون سی تھیں اور کون سی چیزوں کو ثانوی حیثیت حاصل تھی؟ واضح رہے کہ اگر کسی نے حضور ﷺ کے اُسوہ کا اتباع کرتے ہوئے اس اعتبار سے توازن برقرار نہ رکھا تو اس کا طرزِ عمل حضور ﷺ کے اُسوہ کے اتباع کے بجائے ذاتی پسند و ناپسند کا معاملہ بن جائے گا۔

سیاق و سباق کے اعتبار سے آیت زیر مطالعہ کے اس حصے کا ایک مفہوم اور بھی ہے۔ پچھلی آیت میں چونکہ

اہل کتاب کا ذکر ہے' اس لیے اس حوالے سے اس خطاب کا رخ اہل کتاب کی طرف بھی ہے۔ اس پہلو سے اس فقرے کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں سے جن لوگوں کے اندر اپنے سابقہ ایمان کی کچھ رمق موجود ہے' ان سے کہا جا رہا ہے کہ اے وہ لوگو جو پہلے سے اللہ پر ایمان رکھتے ہو اب اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے اُس کے آخری رسولؐ پر بھی ایمان لے آؤ! اگر تم ایسا کرو گے تو:

﴿يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ﴾ ''وہ تمہیں دہرا حصہ عطا کرے گا اپنی رحمت سے''

اہل کتاب کے ایسے لوگوں کے لیے ہم سورۃ القصص میں بھی یہ خوشخبری پڑھ چکے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ﴾ (آیت ۵۴) کہ اگر یہ لوگ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لائیں گے تو انہیں دہرا اجر ملے گا۔

﴿وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ﴾ ''اور وہ تمہیں ایسا نور عطا فرمائے گا جس کو لے کر تم چل سکو گے''

اس سے ایک تو وہ نور مراد ہے جس کا ذکر قبل ازیں آیت ۱۲ میں ہو چکا ہے کہ پُل صراط سے گزرتے وقت تمہیں نور عطا کیا جائے گا جس کی مدد سے تم آسانی سے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ لیکن اس کے علاوہ اس سے مراد یہاں ایمان بالرسول اور اُسوۂ رسولؐ کے اتباع کا وہ نور بھی ہے جو اہل ایمان کو دنیوی زندگی میں بھی نصیب ہوتا ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے آیت کے الفاظ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ کو ذہن میں دوبارہ تازہ کر لیں اور سمجھ لیں کہ یہاں اصل زور (emphasis) ایمان بالرسولؐ پر ہے۔ اس حوالے سے آیت کے اس حصے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم لوگ اُسوۂ رسولؐ کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تمہیں عملی زندگی میں ایک ایسی روشنی عطا ہوگی جو تمہیں کبھی بھٹکنے نہیں دے گی۔ خاص طور پر تم رہبانیت جیسی بدعت میں ملوث ہونے سے محفوظ رہو گے۔ چونکہ زیر مطالعہ آیات کا تعلق اقامتِ دین اور اقامتِ عدل وقسط کے مضمون سے ہے اس لیے سیاقِ مضمون کے اعتبار سے آیت کے اس حصے میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ اگر تمہیں نظامِ عدل وقسط کے قیام کی منزل پر پہنچنے کے لیے رہنمائی اور روشنی درکار ہے تو وہ تمہیں ایمان بالرسولؐ اور منہجِ انقلابِ نبویؐ سے ملے گی۔ اور اگر تم نے اپنا یہ ایمان پختہ کر لیا اور منہجِ نبوی کو اپنا راستہ بنا لیا تو اس راستے پر ہم تمہیں ایسا نور عطا کریں گے جس کی راہنمائی میں تمہارے لیے کسی غلطی' کوتاہی یا منزل سے بھٹکنے کا کوئی امکان نہیں رہے گا —— چنانچہ اگر ہمیں عدل وقسط کے قیام کے لیے انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کرنی ہے (دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس جدوجہد میں اپنا تَن مَن دھن کھپا دینے کی توفیق عطا فرمائے!) تو ہمیں اس کے لیے روشنی اور راہنمائی انقلابِ نبویؐ کے منہج سے حاصل ہوگی۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر ہم حضور ﷺ کے راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ اختیار کریں گے تو کبھی منزل پر نہیں پہنچ پائیں گے:۔

خلافِ پیمبرؐ کسے راہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

سورۃ المائدۃ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ﴾ (آیت ۴۸) کہ ہم نے تم میں سے سب کے لیے علیحدہ علیحدہ شریعتیں اور علیحدہ علیحدہ منہاج بنائے ہیں۔ اب یہ ہماری ذمہ داری

ہے کہ ہم اپنے نبی ﷺ کا منہاج تلاش کریں اور جب تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ ''جا ایں جاست!'' (جس جگہ کی ہمیں تلاش ہے وہ جگہ یہی ہے۔) یعنی ہمیں راہنمائی چاہیے' ہدایت چاہیے یا غلبۂ دین کی جدّوجہد میں کامیابی چاہیے تو یہ سب کچھ ہمیں سیرتِ محمدیؐ سے ہی ملے گا۔ اس یقین کے بعد ہمیں اپنا تن من دھن سیرتِ محمدیؐ کے اتباع میں کھپا دینے پر کمربستہ ہو جانا چاہیے اور ایسا کرتے ہوئے ہمیں زیرزمین تیل تلاش کرنے والی کمپنی کی مثال پیش نظر رکھنی چاہیے۔ ایسی کسی کمپنی کے ماہرین کو اگر کسی جگہ کے بارے میں گمان ہو کہ یہاں سے تیل ملنے کا امکان ہے تو وہ صرف اس گمان اور امکان کی بنیاد پر کروڑوں روپے اس جگہ کی ڈرلنگ پر صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن ہمارا تو ایمان ہے' ہمیں تو یقین ہے کہ ''جا ایں جاست''۔ تو پھر ہم کیوں نہ اپنا سب کچھ اس راہ میں نچھاور کر دیں!

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ ''اور وہ تمہیں بخش دے گا' اور اللہ بہت بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

اگر تم لوگوں نے منہاجِ محمدی کو اپنے لیے مشعل راہ بنالیا تو تمہارا رخ سیدھا ہو گیا' مجموعی طور پر تم سیدھے راستے پر آ گئے۔ اب اگر اس راستے پر چلتے ہوئے کوئی خطا یا کوئی لغزش ہو گی تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے:

﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰۗىِٕكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ (النساء:۱۷)

''اللہ کے ذمے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو کوئی بری حرکت کر بیٹھتے ہیں جہالت اور نادانی میں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں' تو یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔''

چنانچہ اگر تم سچے دل سے توبہ کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری خطائیں اور لغزشیں معاف کرتا رہے گا۔ وہ بہت بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿لِّـئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ ''(یہ اس لیے ہے) تاکہ اہل کتاب یہ نہ سمجھ لیں کہ اللہ کے فضل پر اب ان کا کوئی حق نہیں ہے''

گزشتہ آیت کی تشریح کے دوران میں نے ذکر کیا تھا کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ کے خطاب کا رخ اہل کتاب کی طرف بھی ہے۔ یہ بات اس آیت میں اب بالکل واضح ہو گئی ہے۔ جن مفسرین کا ذہن اس طرف نہیں گیا (کہ گزشتہ آیت میں خطاب کا رخ اہل کتاب کی طرف بھی ہے) انہیں زیر مطالعہ آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ یہاں لِـئَلَّا میں لَا زائد ہے اور اصل میں یہاں مراد لِکَیْ یَعْلَمَ ہے۔ چونکہ ان لوگوں کے نزدیک گزشتہ آیت صرف مسلمانوں سے خطاب کر رہی ہے' اس لیے انہوں نے زیر مطالعہ آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''تاکہ اہل کتاب کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اب انہیں کوئی قدرت حاصل نہیں ہے اللہ کے فضل پر۔''

بہرحال میں نے گزشتہ آیت میں اہل کتاب سے خطاب کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے زیر مطالعہ آیت کا

جو ترجمہ کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کے لیے اب اللہ کے فضل کے حصول کا کوئی راستہ رہا ہی نہیں' بلکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے لیے راستہ تو اب بھی کھلا ہے۔ وہ آئیں' خود کو محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں ڈال دیں' قرآن پر ایمان لائیں اور اللہ کے فضل میں حصہ دار بن جائیں۔ یہی بات انہیں سورۂ بنی اسرائیل میں بھی بایں الفاظ کہی گئی ہے: ﴿عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ ۚ﴾ (آیت ۸) ''ہوسکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے''۔ یعنی بے شک تم اللہ کے بہت لاڈلے تھے اور اب تم اپنے طرزِ عمل کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہو گئے ہو' لیکن تمہارا ربّ اب بھی تم پر رحمت فرمانے پر آمادہ ہے۔ بس تم آخری نبی حضرت محمد ﷺ اور آخری آسمانی کتاب قرآن پر ایمان لے آؤ اور اُس کی رحمت کے مستحق بن جاؤ۔ بلکہ اس سے اگلی آیت میں مزید واضح فرما دیا گیا: ﴿اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ یَهۡدِیۡ لِلَّتِیۡ هِیَ اَقۡوَمُ﴾ (آیت ۹) ''یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے''۔ اب ہدایت کا ''شاہ درہ'' تو بس قرآن ہی ہے' چنانچہ آؤ اور اس راستے سے ہوتے ہوئے اللہ کے قصرِ رحمت میں داخل ہو جاؤ۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ میں اہل کتاب پر واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے دروازے ان پر بند نہیں ہو گئے' یہ دروازے ان کے لیے اب بھی کھلے ہیں۔

﴿وَاَنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور فضل یقیناً اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔''

سُوْرَۃُ الْمُجَادَلَۃ

تمہیدی کلمات

سورۃ المجادلہ کا آغاز ایک خاص عائلی مسئلے سے ہوتا ہے‘ لیکن یہ مسئلہ صرف پہلی چار آیات میں ضمنی مضمون کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد اس سورت میں سورۃ الحدید کے مرکزی مضمون ہی کا تسلسل نظر آتا ہے۔ سورۃ الحدید کا مرکزی مضمون نظامِ عدل وقسط کے قیام سے متعلق ہے۔ اس نظام کے قیام کی جدوجہد کے لیے ایک منظم اور مربوط جماعت کی ضرورت ہے۔ یہ کسی اکیلے شخص یا دو چار افراد کے بس کا کام نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے تعاون کے بغیر بھی اسے سرانجام دے لیتے۔ آپ نے جب اپنی قوم کو جہاد کے لیے نکلنے کا کہا تو انہوں نے صاف جواب دے دیا:

﴿قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝۲۴﴾ (المائدۃ)

انہوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ اے موسیٰ! یہ جنگ جیسا مشکل کام ہم سے نہیں ہوتا‘ اگر یہ ایسا ہی ضروری کام ہے تو آپ اور آپ کا رب جا کر لڑ و‘ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ اُس وقت آپ بالکل اکیلے بھی نہیں تھے‘ بلکہ آپ کے ساتھ تین لوگ اور بھی تھے۔ یعنی آپ کے بھائی ہارون‘ حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا۔ اس کے باوجود آپ نے حکومت الہیہ کے قیام کا مشن ادھورا چھوڑتے ہوئے پُرحسرت انداز میں اللہ سے شکایت کی:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ۝۲۵﴾ (المائدۃ)

”موسیٰ نے عرض کیا: پروردگار مجھے تو اختیار نہیں ہے سوائے اپنی جان کے اور اپنے بھائی (ہارون کی جان) کے‘ تو اب تو تفریق کر دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان۔“

تو معلوم ہوا کہ یہ کام چند افراد کے بس کا بھی نہیں‘ بلکہ باطل نظام کو اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ نظامِ عدل وقسط کے قیام کے لیے ایک بہت مضبوط اور منظم جماعت درکار ہے۔ اب ظاہر ہے جب یہ جماعت تشکیل پائے گی اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مصروفِ عمل ہو گی تو شیطان انہیں کھلی چھٹی دے کر آرام سے تو نہیں بیٹھا رہے گا کہ جاؤ بھئی آپ اپنے دین حق کا قیام عمل میں لے آؤ‘ بلکہ وہ بھی فوری طور پر اپنے چیلے چانٹوں کے ہمراہ اس جماعت کا راستہ روکنے کے لیے میدان میں کود پڑے گا۔ اس طرح یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کے مدِمقابل صف آرا ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس سورت میں نظامِ عدل وقسط کے قیام یا اقامت دین کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت ”حزب اللہ“ اور اس کے مدمقابل شیطان کے لاؤ لشکر پر مشتمل جماعت ”حزب الشیطان“ کا بھی ذکر آیا ہے اور اس حوالے سے حزب اللہ کے کارکنوں کو کچھ مفید ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ حزب اللہ کا وجود چونکہ

شیطان کو بہت کھٹکتا ہے اس لیے وہ اس میں پھوٹ ڈالنے اور اس کی وحدت کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ایسے شیطانی حملوں کے توڑ کے لیے اہل ایمان کو قرآن میں جا بجا ہدایات دی گئی ہیں۔سورۃ الحجرات میں دی گئی معاشرتی اور اخلاقی ہدایات کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان اپنی صفوں میں اتحاد و یگانگت کو فروغ دیں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں جو ان کے اتحاد کو نقصان پہنچانے کا باعث بنے۔چنانچہ سورۃ الحجرات میں اہل ایمان کو ایک دوسرے کا تمسخر اڑانے' باہم الزام تراشی کرنے' دوسروں کو برے ناموں سے پکارنے' اپنے بھائی بندوں کے بارے میں بدگمانی کرنے' ان کے معاملات کی ٹوہ میں رہنے' افواہوں پر کان دھرنے اور ایک دوسرے کی غیبت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ظاہر ہے ایسی حرکات سے بالآخر مسلمانوں کی وحدت اور یکجہتی کو نقصان پہنچتا ہے۔اسی طرح سورۃ الحجرات میں اہل ایمان کو یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ اگر ان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی صلح کرا دی جائے تاکہ ''حزب اللہ'' مضبوط و مستحکم رہے۔بہرحال سورۃ المجادلہ کا مرکزی مضمون حزب اللہ سے متعلق ہے۔حزب اللہ بھلائی کی علامت اور نیکی کی طاقت ہے۔اگر یہ جماعت مضبوط ہوگی تو نیکی کا بول بالا ہوگا اور اگر یہ کمزور ہو جائے گی تو پھر ظاہر ہے معاشرے میں حزب الشیطان ہی کا ڈنکا بجے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

آیات ۱ تا ۴

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۭ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۭ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(الجزء الثامن والعشرون (۲۸))

آیت ۱ ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ ''اللہ نے سن لی اُس عورت کی بات (جو اے نبی ﷺ!) آپ سے جھگڑ رہی ہے اپنے شوہر کے بارے میں''

﴿وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ﴾ ''اور وہ اللہ سے بھی فریاد کر رہی ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ﴾ ''اور اللہ سن رہا ہے آپ دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ①﴾ ''یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

"قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ" کے معنی یہاں محض سن لینے کے نہیں' بلکہ قبول کر لینے اور فریاد رسی کرنے کے ہیں۔
یہ "ظہار" کے معاملے کا ذکر ہے جو ایک صحابی حضرت اوسؓ بن صامت انصاری اور ان کی بیوی حضرت خولہؓ بنت ثعلبہ کے درمیان پیش آیا۔ کسی شخص کا اپنی بیوی کو اپنی ماں یا اپنی ماں کے کسی عضو سے تشبیہہ دینا اصطلاحاً "ظہار" کہلاتا ہے' مثلاً کسی کا اپنی بیوی کو یوں کہہ دینا کہ تم میرے لیے میری ماں کی طرح ہو یا میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔ عربوں کے ہاں اس کے لیے یہ الفاظ کہے جاتے تھے: "اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّی" یعنی اب تجھ کو ہاتھ لگانا میرے لیے گویا اپنی ماں کی پیٹھ کو ہاتھ لگانا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ظہار کو طلاق ہی کی طرح سمجھا جاتا تھا' بلکہ طلاق میں تو حالات وقرائن کے مطابق پھر بھی رجوع کی گنجائش تھی' لیکن ظہار کی صورت میں میاں بیوی میں عمر بھر کے لیے علیحدگی ہو جاتی تھی اور وہ دوبارہ کبھی کسی بھی صورت میں میاں بیوی کے طور پر اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔
روایات میں مذکورہ معاملے کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ حضرت اوسؓ غصے کی حالت میں اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھے۔ اس پر ان کی بیوی حضرت خولہؓ بنت ثعلبہ فریاد لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ حضور! اوسؓ نے یہ کر دیا ہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' اب میں ان کو لے کر کہاں جاؤں گی؟ ان کو کیسے پالوں گی؟ آپؐ اس پریشانی کا کوئی حل بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ظہار کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ابھی تک کوئی حکم نازل نہیں فرمایا' اس لیے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حضور ﷺ کے توقف پر وہ بدستور اصرار کرتی رہیں کہ حضور ﷺ آپ کچھ کریں! میرا کیا بنے گا؟ میرے بچے ہلاک ہو جائیں گے! اسی کیفیت میں کبھی وہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتیں کہ اے اللہ! تو میری فریاد کو سن لے اور میرے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے! روایات کے مطابق اس اصرار وتکرار کے دوران ہی زیر مطالعہ آیات نازل ہوئیں۔ پہلی آیت کا انداز خصوصی طور پر بہت شفقت بھرا ہے کہ اے نبی ﷺ! اللہ نے اس خاتون کی اس بحث وتکرار کو سن لیا ہے جو وہ آپؐ کے ساتھ کر رہی ہے۔ حضرت خولہؓ بنت ثعلبہ کی فریاد پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دریا موج میں آیا اور ظہار کے بارے میں مستقل قانون بنا دیا گیا۔ یہ قانون اگلی تین آیات میں بیان ہوا ہے۔

آیت ۲ ﴿اَلَّذِیْنَ یُظٰھِرُوْنَ مِنْکُمْ مِّنْ نِّسَآئِھِمْ مَّا ھُنَّ اُمَّھٰتِھِمْ ؕ﴾ "(اے مسلمانو!) تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں کو مائیں کہہ بیٹھتے ہیں' وہ ان کی مائیں نہیں بن جاتی ہیں۔"
جس طرح کسی کو کوئی بیٹا کہہ دے تو وہ اس کا بیٹا نہیں بن جاتا اور جس طرح منہ بولے بیٹے کی کوئی قانونی و شرعی حیثیت نہیں اسی طرح زبان سے اگر کوئی اپنی بیوی کو اپنی ماں کہہ دے تو ایسے کسی دعوے یا جملے کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔

﴿اِنْ اُمَّھٰتُھُمْ اِلَّا الّٰٓئِیْ وَلَدْنَھُمْ ؕ﴾ "ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا ہے۔"
﴿وَاِنَّھُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْکَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ﴾ "البتہ یہ لوگ ایک نہایت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔"
یہ لوگ اپنی بیویوں کو اپنی مائیں کہہ کر ایک نہایت بے ہودہ' شرمناک اور نامعقول بات منہ سے نکالتے

ہیں۔ پھر یہ بات جھوٹی بھی ہے کہ ان کی بیویاں ان کے لیے اب مائیں ہوگئی ہیں۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲﴾ ’’اور یقیناً اللہ بہت معاف فرمانے والا‘ بہت بخشنے والا ہے۔‘‘

ان الفاظ میں یہ اشارہ دے دیا گیا کہ ظہار سے متعلق چونکہ ابھی تک کوئی قانون نازل نہیں ہوا تھا‘ اس لیے اللہ تعالیٰ مذکورہ صحابیؓ کو اس معاملے میں معاف فرما دے گا‘ بلکہ اس سے پہلے جس کسی سے بھی یہ حرکت سرزد ہوئی‘ اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے گا۔

آیت ۳ ﴿وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ ’’اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر بیٹھیں‘ پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات سے واپس لوٹنا چاہیں‘‘

﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ﴾ ’’تو ایک غلام کا آزاد کرنا ہوگا‘ اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو مس کریں۔‘‘

یعنی اس معاملے کا کفارہ ادا کرو اور پھر سے میاں بیوی کی طرح رہو!

﴿ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۳﴾ ’’یہ بات ہے جس کی تمہیں نصیحت کی جارہی ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔‘‘

آیت ۴ ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ﴾ ’’تو جو کوئی (غلام) نہ پائے وہ دو مہینوں کے روزے رکھے لگاتار‘ اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چھوئیں۔‘‘

یعنی دو ماہ کے روزے اس طرح متواتر رکھے جائیں کہ درمیان میں کسی دن کا روزہ چھوٹنے نہ پائے۔

﴿فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ﴾ ’’تو جو کوئی یہ بھی نہ کر سکتا ہو تو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔‘‘

اگر کوئی شخص کمزور ہے‘ ضعیف العمر ہے یا ایسا مریض ہے کہ دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں تو وہ ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے۔ اس کے لیے اوسط معیار وہی ہوگا جو سورۃ المائدۃ کی آیت ۸۹ میں قسم کے کفارے کے ضمن میں بیان ہوا ہے: ﴿مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ﴾ یعنی جس معیار کا کھانا متعلقہ شخص اپنے اہل وعیال کو معمول کے مطابق کھلاتا ہے‘ ویسا ہی کھانا وہ ساٹھ مسکینوں کو کھلائے۔

﴿ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ﴾ ’’یہ اس لیے تاکہ تم ایمان رکھو اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر۔‘‘

اس فقرے پر میں بہت عرصہ سوچ بچار کرتا رہا‘ بالآخر مجھے اس بارے میں یہ نکتہ سمجھ میں آیا کہ جب کوئی شخص کفارہ کو اللہ کا قانون سمجھتے ہوئے اس کی سختی برداشت کرتا ہے تو اس کے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ایمان سے عمل صالح پیدا ہوتا ہے‘ اسی طرح عمل صالح سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے‘ جیسے کہ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا:

﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ

لِلۡاِیۡمَانِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۷﴾

’’(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں! ان سے کہیے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ دھرو' بلکہ اللہ تم پر احسان دھرتا ہے کہ اُس نے تمہیں ایمان کے راستے پر ڈال دیا ہے' اگر تم سچے ہو۔‘‘

یعنی تم لوگ اسلام میں داخل ہو کر گویا ایمان کے راستے پر چل پڑے ہو۔ اس بارے میں تم اللہ کا احسان مانو کہ وہ تمہیں ایمان کے راستے پر لے آیا ہے۔ اگر تم اخلاص کے ساتھ اس راستے پر چلتے ہوئے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرتے رہو گے تو تم ایمان تک بھی ضرور پہنچ جاؤ گے۔ یہاں ﴿ذٰلِکَ لِتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ﴾ کا بھی یہی مفہوم ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص غلطی کے بعد توبہ کرتے ہوئے کفارہ ادا کرے گا تو اللہ کے قانون پر عمل درآمد کرنے کی وجہ سے اس کے دل میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول مزید راسخ اور پختہ ہو جائے گا۔

﴿وَتِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ ؕ وَلِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۴﴾﴾ ’’اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدود ہیں' اور کافروں کے لیے بہت دردناک عذاب ہے۔‘‘

آیات ۵ تا ۱۱

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ کُبِتُوۡا کَمَا کُبِتَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ وَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اٰیٰتٍۭ
بَیِّنٰتٍ ؕ وَلِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ۚ﴿۵﴾ یَوۡمَ یَبۡعَثُہُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا ؕ
اَحۡصٰہُ اللّٰہُ وَنَسُوۡہُ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ٪﴿۶﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ ع
وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَا یَکُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ہُوَ رَابِعُہُمۡ وَلَا خَمۡسَۃٍ اِلَّا ہُوَ سَادِسُہُمۡ وَلَاۤ
اَدۡنٰی مِنۡ ذٰلِکَ وَلَاۤ اَکۡثَرَ اِلَّا ہُوَ مَعَہُمۡ اَیۡنَ مَا کَانُوۡا ۚ ثُمَّ یُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ
اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۷﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نُہُوۡا عَنِ النَّجۡوٰی ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا نُہُوۡا عَنۡہُ
وَیَتَنٰجَوۡنَ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ وَمَعۡصِیَتِ الرَّسُوۡلِ ۫ وَاِذَا جَآءُوۡکَ حَیَّوۡکَ بِمَا لَمۡ یُحَیِّکَ بِہِ
اللّٰہُ ۙ وَیَقُوۡلُوۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ لَوۡلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰہُ بِمَا نَقُوۡلُ ؕ حَسۡبُہُمۡ جَہَنَّمُ ۚ یَصۡلَوۡنَہَا ۚ
فَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۸﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَنَاجَیۡتُمۡ فَلَا تَتَنَاجَوۡا بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ
وَمَعۡصِیَتِ الرَّسُوۡلِ وَتَنَاجَوۡا بِالۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰی ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡۤ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا
النَّجۡوٰی مِنَ الشَّیۡطٰنِ لِیَحۡزُنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَیۡسَ بِضَآرِّہِمۡ شَیۡئًا اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَعَلَی
اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قِیۡلَ لَکُمۡ تَفَسَّحُوۡا فِی الۡمَجٰلِسِ
فَافۡسَحُوۡا یَفۡسَحِ اللّٰہُ لَکُمۡ ۚ وَاِذَا قِیۡلَ انۡشُزُوۡا فَانۡشُزُوۡا یَرۡفَعِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ ۙ
وَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾

آیت ۵ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ”یقیناً وہ لوگ جو تُل گئے ہیں مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی“

اس مضمون کا تعلق سورۃ الحدید کے مرکزی مضمون کے ساتھ ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں انبیاء ورسل کی بعثت اور کتاب ومیزان کے نزول کا مقصد یہ بتایا گیا ہے: لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ تاکہ انسانی معاشرے میں اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے نظام عدل وقسط کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ اب ظاہر ہے اہل ایمان جونہی اس مشن کے علمبردار بن کر اٹھیں گے تو شیطانی قوتیں بھی ان کا راستہ روکنے کے لیے پوری قوت سے سرگرم عمل ہو جائیں گی۔ ان حالات میں معاشرے کا سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ نظامِ عدل وقسط کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔ یہ لوگ تو کبھی بھی نہیں چاہیں گے کہ مزدوروں اور کسانوں کو ان کے حقوق ملیں۔ چنانچہ وہ اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ روایتی (ظالمانہ) نظام کے دفاع کے لیے میدان میں کود پڑیں گے۔ اس طرح فریقین کے درمیان ایک بھرپور کشمکش کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آیت زیر مطالعہ میں انہی قوتوں کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ آئندہ آیات میں ان دونوں گروہوں کے کردار اور رویے کا ذکر حزب اللہ اور حزب الشیطان کے نام سے آئے گا۔

واضح رہے کہ لفظ يُحَآدُّوْنَ کا تعلق بھی حدید (سورۃ الحدید' آیت ۲۵) ہی سے ہے۔ یہ حدّ سے باب مفاعلہ ہے' جیسے جہد سے مُجاھدہ یا قتل سے مُقاتلہ۔ چنانچہ اس لفظ میں پوری قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کسی کی مخالفت کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے مراد اللہ کا دین ہے اور یہ مخالفت جس کا یہاں ذکر ہے وہ دراصل اللہ کے دین کی مخالفت ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکومت جو پوری دنیا میں قائم ہے اسے تو سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس حوالے سے کسی کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ سے بھی کسی کو کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ چنانچہ دنیا میں جہاں کہیں اللہ کے رسولؐ کی مخالفت کی جاتی ہے وہ بھی اللہ کے دین کی وجہ سے ہی کی جاتی ہے۔ اس نکتہ کو سورۃ الانعام کی اس آیت میں یوں واضح کیا گیا ہے: ﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ”(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلا رہے بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں“۔ چنانچہ باطل قوتوں کی اصل دشمنی اللہ کے دین سے ہے' اور یہ دین بھی جب تک کتابوں اور لائبریریوں تک محدود رہے تب تک اس پر بھی کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ دینی مسائل کے بارے میں کوئی اعلیٰ سطحی تحقیقات کرے' مقالے لکھے' کتابیں تصنیف کرے' کسی کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ لیکن جب کوئی اللہ کا بندہ یہ دعویٰ کرے کہ ہم اللہ کے دین اور اُس کے دیے ہوئے نظامِ عدل وقسط کی معاشرے میں بالفعل ترویج وتنفیذ چاہتے ہیں تو اس کی یہ بات باطل پسند قوتوں کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ لوگ ایسی کسی بھی کوشش کا راستہ روکنے کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتے ہیں۔ اب ایسے لوگوں کے انجام کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔

﴿كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ”وہ ذلیل وخوار کر دیے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے

کے لوگ ذلیل وخوار کیے جا چکے ہیں''
ان سے پہلے قومِ فرعون‘ قومِ عاد اور بہت سی دوسری اقوام نے بھی اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولوں کی مخالفت کی یہی روش اختیار کر کے اپنی بربادی کو دعوت دی تھی۔ چنانچہ جو انجام مذکورہ اقوام کا ہوا ویسے ہی انجام سے اب یہ لوگ یعنی قریش مکہ بھی دوچار ہونے والے ہیں۔

﴿وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۭ﴾ ''اور ہم اتار چکے ہیں روشن آیات۔''
یعنی قرآن میں گزشتہ اقوام کے واقعات بہت تفصیل سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر قومیں قریش مکہ کی نسبت بہت طاقتور تھیں۔ جب ایسی طاقتور اقوام بھی اپنے پیغمبروں کے انکار کی بنا پر صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں تو آج ان لوگوں کی سرکشی و نافرمانی کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ ''اور کافروں کے لیے بہت ذلت والا عذاب ہے۔''
اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مخالفین کو دنیا میں بھی ہزیمت اٹھانا پڑے گی اور آخرت میں بھی انہیں بہت رسوا کن عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔

آیت ۶ ﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ﴾ ''جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا‘ پھر انہیں جتلا دے گا ان کے اعمال کے بارے میں جو انہوں نے کیے تھے۔''

﴿اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ﴾ ''اللہ نے ان (اعمال) کو محفوظ کر رکھا ہے جبکہ وہ انہیں بھول چکے ہیں۔''
یہ لوگ تو بھول چکے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں کیسی کیسی حرام خوریاں کی تھیں اور کس کس کے ساتھ کیا کیا زیادتی کی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اللہ کے ہاں تو ہر شخص کے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت کا ریکارڈ محفوظ ہوگا۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝﴾ ''اور اللہ تو ہر چیز پر خود گواہ ہے۔''

آیت ۷ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ جانتا ہے اس سب کچھ کے بارے میں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے؟''

﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ ''نہیں ہوتے کبھی بھی تین آدمی سرگوشیاں کرتے ہوئے مگر ان کا چوتھا وہ (اللہ) ہوتا ہے''

﴿وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾ ''اور نہیں (سرگوشی کر رہے) ہوتے کوئی پانچ افراد مگر ان کا چھٹا وہ (اللہ) ہوتا ہے''
خفیہ انداز میں سرگوشیاں کرنے کو ''نجویٰ'' کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے یہاں ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیں کہ کسی تنظیم یا جماعت کے اندر نجویٰ کا رجحان یا رواج گروہ بندیوں اور فتنوں کا باعث بنتا ہے۔ کسی بھی اجتماعیت کے افراد میں باہم اختلافِ رائے کا پایا جانا تو بالکل ایک فطری تقاضا ہے‘ جہاں اجتماعیت ہوگی وہاں لوگ ایک

دوسرے کی آراء سے اختلاف بھی کریں گے۔ لیکن ایسے اختلافات کا اظہار اجتماعیت کے قواعد وضوابط کے مطابق متعلقہ فورم پر کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ تخریبی ذہنیت کے حامل کچھ ارکان اپنے اپنے اختلاف کا اظہار نجویٰ کی صورت میں دوسرے ساتھیوں سے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بات آگے بڑھتی ہے تو چند افراد پر مشتمل ایک مخصوص لابی بن جاتی ہے اور یوں تنظیم یا جماعت کے اندر باقاعدہ گروہ بندی کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ اگر اختلافات کا اظہار مناسب فورم پر ہو تو کھلی اور تعمیری بحث کا نتیجہ ہمیشہ مثبت رہتا ہے۔ اس سے غلط فہمیاں ختم ہو جاتی ہیں' ابہام دور ہو جاتا ہے اور اصل حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ بہرحال نجویٰ (سرگوشیوں) کی حیثیت اجتماعیت کے لیے سم قاتل کی سی ہے اور اگر یہ زہر کسی جماعت کی صفوں میں سرایت کر جائے تو اس کا اتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

﴿وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ﴾ ''اور نہیں ہوتے وہ اس سے کم (یعنی دو افراد سرگوشی میں مصروف) اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی وہ ہوں۔''

سورۃ الحدید کی آیت ۴ میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ﴾ ''اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔''

﴿ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ ''پھر وہ ان کو جتلا دے گا قیامت کے دن جو کچھ بھی انہوں نے عمل کیا تھا' یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

آیت ۸ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں منع کیا گیا تھا نجویٰ سے' پھر وہ اعادہ کر رہے ہیں اُسی شے کا جس سے انہیں منع کیا گیا تھا''

یہ مدینہ کے منافقین کا ذکر ہے جو یہودیوں کے ساتھ مل کر ہر وقت مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بُننے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى کے الفاظ میں سورۃ النساء کی آیت ۱۱۴ کے اس حکم کی طرف اشارہ ہے: ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ﴾ کہ ان لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ آیت زیر مطالعہ میں سورۃ النساء کی آیت کے حوالے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سورۃ المجادلہ' سورۃ النساء کے بعد نازل ہوئی۔

﴿وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۡ﴾ ''اور وہ سرگوشیاں کرتے ہیں گناہ' زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی سے متعلق۔''

قبل ازیں سورۃ النساء کے مطالعے کے دوران بھی ذکر ہو چکا ہے کہ حضور ﷺ کی ذاتی اطاعت کا حکم منافقین کو بہت برا لگتا تھا۔ اس حوالے سے ان کا موقف یہ تھا کہ ہم اللہ کی اطاعت بھی کرتے ہیں' اللہ کی کتاب کے تمام احکام بھی تسلیم کرنے کو تیار ہیں' لیکن اپنے جیسے ایک انسان کی تمام باتوں کو من وعن تسلیم کرنے کو ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی سوچ اور اسی موقف کے تحت وہ لوگ حضور ﷺ کے فیصلوں پر گاہے بگاہے اعتراضات

بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کے ایسے ہی ایک اعتراض کا ذکر سورۂ محمد کی آیت ۲۰ میں بھی آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے قتال کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تو قریش کے ساتھ خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ شروع کر کے حالات کیوں خراب کیے جا رہے ہیں؟

﴿وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ﴾ ''اور جب وہ آپؐ کے پاس آتے ہیں تو آپؐ کو اُس (کلمہ) سے دعا دیتے ہیں جس سے اللہ نے آپؐ کو دعا نہیں دی''

''تَحِيَّة'' کے لغوی معنی کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ ایک دوسرے سے ملتے وقت ''حَيَّاكَ اللّٰهُ'' کے جملے کا تبادلہ کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اچھی زندگی دے' یا اللہ تعالیٰ تمہاری زندگی دراز کرے۔ عرفِ عام میں اس دعا کو ''تحیہ'' کہا جاتا تھا۔ اسلام نے دو مسلمانوں کی ملاقات کے موقع کے لیے دعائیہ کلمہ (greetings) کے طور پر السّلام علیکم کے الفاظ کا انتخاب کیا' لیکن تحیہ کا لفظ عربوں کے ہاں چونکہ بہت معروف تھا اس لیے ''السّلام علیکم'' کو بھی اصطلاحاً ''تحیہ'' ہی کہا جانے لگا۔ سورۃ النساء کی آیت ۸۶ میں یہ لفظ ''السّلام علیکم'' ہی کے مفہوم میں آیا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں منافقین کی اس شرارت کا ذکر ہے جو وہ اس کلمہ تحیہ کے حوالے سے کرتے تھے۔ جب وہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوتے تو السّلام علیکم کہنے کے بجائے ''السّام علیکم'' کہتے۔ ''سام'' کے معنی موت کے ہیں اور اس طرح اپنی طرف سے وہ لوگ حضور ﷺ اور آپؐ کی محفل میں موجود مسلمانوں کے لیے اس دعائیہ کلمہ کو (معاذ اللہ!) بددعا میں بدل دیتے تھے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ﴾ ''اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا ہمارے اس طرح کہنے پر؟''

ایسی حرکت کرنے کے بعد وہ سوچتے کہ اگر محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہوتے تو اللہ ان کی یہ توہین کبھی برداشت نہ کرتا اور اس گستاخی پر وہ فوراً ہماری زبانیں کھینچ لیتا۔ چنانچہ ہمارے بار بار ایسا کہنے پر بھی اگر ہمیں کچھ نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔ یہ مرضِ منافقت کی وہ سٹیج ہے جس کا ذکر سورۃ الحدید کی آیت ۱۴ میں آ چکا ہے۔ اس سٹیج پر منافق شخص کے بچے کھچے ایمان میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھنے لگتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایمان کی تھوڑی بہت پونجی بھی برف کی طرح پگھلنے اور ضائع ہونے لگتی ہے۔

﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾ ''ان کے لیے تو اب جہنم ہی کافی ہے' یہ اس میں داخل ہوں گے' پس وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔''

آیت ۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ﴾ ''اے اہل ایمان! اگر تمہیں کوئی سرگوشی کرنی ہو''

﴿فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ﴾ ''تو گناہ' زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی کی باتوں سے متعلق ہرگز سرگوشی نہ کرو''

اگر تم میں سے چند لوگوں کا علیحدہ بیٹھ کر کوئی گفتگو یا منصوبہ بندی کرنا ناگزیر ہو تو یاد رکھو' تمہاری اس خفیہ

بات چیت یا سرگوشی کا موضوع ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے جس سے گناہ‘ کسی پر زیادتی یا اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

﴿وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ؕ﴾ ”ہاں تم نیکی اور تقویٰ کے بارے میں سرگوشی کر سکتے ہو۔“

کسی کو علیحدگی میں لے جا کر کوئی اچھا مشورہ دینا ہو‘ نیکی کے کسی کام کا بتانا ہو‘ یا صدقہ وخیرات کی تلقین کرنی ہو تو ایسی سرگوشیوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ⑨﴾ ”اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تمہیں جمع کیا جائے گا۔“

آیت ۱۰ ﴿اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ﴾ ”یہ نجویٰ تو شیطان کی طرف سے ہے“

منفی سرگوشیاں کرنا ایک شیطانی عمل ہے۔ جو لوگ اس میں ملوث ہوتے ہیں انہیں اس کی تحریک وترغیب شیطان ہی کی طرف سے ملتی ہے۔

﴿لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ”تاکہ وہ اہل ایمان کو رنجیدہ کرے“

ان لوگوں کی سرگوشیوں اور خفیہ ملاقاتوں کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اہل ایمان کو نقصان پہنچا کر انہیں رنجیدہ‘ دل گرفتہ اور پریشان کریں۔ آیت کے ان الفاظ سے یہ مفہوم بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی محفل سے الگ جا کر کھسر پھسر اور سرگوشیاں اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے اس عمل کو دیکھ کر مسلمان پریشان ہوں کہ یہ لوگ الگ بیٹھ کر ان کے خلاف نہ جانے کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ گویا یہ لوگ ایک نفسیاتی حربے کے طور پر بھی نجویٰ کرتے تھے۔ ظاہر ہے جب بھری محفل سے تین چار لوگ الگ جا کر بیٹھ جائیں اور کھسر پھسر کرنا شروع کر دیں تو اہل محفل کو فطری طور پر تجسس تو ہوگا کہ ہو نہ ہو یہ لوگ ضرور انہی کے خلاف باتیں کر رہے ہیں۔

﴿وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ”حالانکہ یہ (شیطان) انہیں کچھ بھی ضرر پہنچانے پر قادر نہیں مگر اللہ کے اذن سے۔“

شیطان اپنے ارادے اور اختیار سے اہل ایمان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ اگر اللہ کی طرف سے کسی کے لیے کوئی تکلیف یا آزمائش طے ہے تو وہ ضرور آئے گی‘ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑩﴾ ”اور اہل ایمان کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔“

اہل ایمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور شیطانی حربوں یا دشمنوں کی سازشوں سے ان کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ اسی بھروسے کے ساتھ انہیں ہر وقت اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے کمر بستہ رہنا چاہیے۔

آیت ۱۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ﴾ ”اے مسلمانو! جب تمہیں کہا جائے کہ مجالس میں کھل کر بیٹھو تو کھل جایا کرو‘ اللہ تمہارے لیے کشادگی پیدا کر دے گا۔“

یہ سمجھانے کا بہت عمدہ انداز ہے۔ یہ نصیحت بھی دراصل منافقین کے ایک مخصوص طرزِ عمل کی وجہ سے کی

جاری ہے۔منافقین کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ حضورﷺ کی محفلوں میں ٹولیوں کی صورت میں باہم جڑ کر بیٹھتے تھے تا کہ درمیان میں کوئی اور (سچا مسلمان) نہ بیٹھ سکے۔ایسے الگ حلقے بنا کر محفل کے دوران وہ حضورﷺ کے فرمودات پر اپنی مرضی کے تبصرے کرتے اور استہزائیہ فقرے چست کرتے رہتے۔ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ عمومی ہدایت جاری کی گئی کہ محفل میں حلقے بنا کر بیٹھنے کے بجائے کھل کر بیٹھا کرو تا کہ معلوم ہو کہ یہ ایک اجتماع ہے۔

﴿وَاِذَا قِیۡلَ انۡشُزُوۡا فَانۡشُزُوۡا﴾ ''اور جب کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ تو اُٹھ جایا کرو''

اس حکم کا باعث بھی منافقین کا طرزِ عمل ہی تھا۔ان لوگوں کا معمول تھا کہ وہ مجلس برخاست ہو جانے کے بعد بھی ٹولیوں کی صورت میں اسی جگہ پر بیٹھے محوِ گفتگو رہتے تھے۔فرض کریں حضورﷺ نے مسلمانوں کو کسی ضروری مشورے کے لیے بلایا۔اس پر سب لوگ حضورﷺ کے پاس حاضر ہوئے' ضروری گفتگو ہوئی اور صلاح و مشورے کا مرحلہ طے ہو گیا۔اس کے بعد حضورﷺ محفل کو برخاست کرنے کا حکم دے کر وہاں سے تشریف لے گئے اور آپؐ کے حکم پر سب مسلمان بھی چلے گئے' مگر یہ منافقین ہیں کہ ابھی بھی ٹولیوں کی صورت میں اسی جگہ پر بیٹھے سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ان کی یہ حرکتیں نہ صرف اجتماعیت کے نظم و ضبط کے خلاف تھیں بلکہ ان سے بہت سی غلط فہمیاں بھی جنم لے سکتی تھیں۔اس لیے یہ حکم دیا گیا کہ جب مجلس برخاست کرنے کا کہہ دیا جائے تو وہاں سے اٹھ جایا کرو۔

﴿یَرۡفَعِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ ۙ وَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ ؕ﴾ ''اللہ بلند فرما دے گا ان لوگوں کے درجات جو تم میں سے واقعی ایمان والے ہیں اور جن کو حقیقی علم عطا ہوا ہے۔''

﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾﴾ ''اور تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

آیات ۱۲'۱۳

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَاجَیۡتُمُ الرَّسُوۡلَ فَقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیۡ نَجۡوٰىکُمۡ صَدَقَۃً ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ وَاَطۡہَرُ ؕ فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشۡفَقۡتُمۡ اَنۡ تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیۡ نَجۡوٰىکُمۡ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذۡ لَمۡ تَفۡعَلُوۡا وَتَابَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمۡ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ ؕ وَاللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳﴾ ع

آیت ۱۲ ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَاجَیۡتُمُ الرَّسُوۡلَ فَقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیۡ نَجۡوٰىکُمۡ صَدَقَۃً ؕ﴾ ''اے اہلِ ایمان! جب تم رسول (ﷺ) سے تخلیہ میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس بات چیت سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔''

اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ منافقین میں سے اکثر لوگ وقتاً فوقتاً بلاوجہ حضورﷺ سے تخلیہ میں بات کرنے کا

تقاضا کرتے تھے۔ حضورﷺ مروت کے باعث ہر کسی کی بات مان تو لیتے‘ لیکن منافقین کا یہ طرزِ عمل آپؐ کے لیے زحمت کا باعث تھا۔ یہ لوگ حضورﷺ سے ایسی ملاقاتیں محض اپنی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے کرتے تھے‘ تاکہ لوگ دیکھیں کہ حضورﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے والا یہ شخص حضورﷺ کے بہت قریب ہے اور حضورﷺ کو اس پر بہت اعتماد ہے۔ جیسے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا معمول تھا کہ حضورﷺ جب خطبہ جمعہ کے لیے کھڑے ہوتے تو وہ محض اپنی چودھراہٹ جتانے کے لیے فوراً اگلی صف میں کھڑا ہو جاتا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتا کہ لوگو! یہ اللہ کے رسولؐ ہیں‘ ان کی بات غور سے سنو! یہ شخص مدینہ کے سب سے بڑے قبیلے خزرج کا سردار تھا۔ حضورﷺ کی ہجرت سے قبل اہل مدینہ کا اتفاق ہو چکا تھا کہ مدینہ میں ایک مستحکم ریاستی نظام قائم کیا جائے تاکہ روز روز کی جنگوں اور باہمی خون ریزی سے ان کی جان چھوٹ جائے۔ اس کے لیے عبداللہ بن اُبی کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس کے لیے تاج بھی تیار ہو چکا تھا۔ بس رسم تاجپوشی کا انعقاد باقی تھا کہ حضورﷺ مدینہ تشریف لے آئے اور آتے ہی مدینہ کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔ اس طرح آپﷺ کی وجہ سے عبداللہ بن اُبی کی بادشاہت کا خواب ناتمام رہ گیا۔ حالات کا رخ دیکھتے ہوئے اُس نے ظاہری طور پر تو مسلمانی کا لبادہ اوڑھ لیا لیکن عمر بھر حضورﷺ کی مخالفت کا کوئی موقع اُس نے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بہرحال حالات کی مجبوری تھی کہ ایسا شخص بھی حضورﷺ سے اپنی قربت جتلانے اور اپنی خصوصی حیثیت نمایاں کرنے کے لیے جمعہ کے اجتماع میں یہ ڈرامہ رچانا ضروری سمجھتا تھا۔

منافقین کے اس طرزِ عمل کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ذریعے حضورﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے پر ایک طرح کا ٹیکس عائد کر دیا کہ اگر تمہارا حضورﷺ سے علیحدگی میں بات کرنا ایسا ہی ضروری ہے تو پہلے اپنے مال میں سے کچھ صدقہ دو اور پھر آ کر اس مقصد کے لیے حضورﷺ سے وقت مانگو۔ منافقین چونکہ انفاق سے گھبراتے ہیں اس لیے اس حکم کے بعد ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی صدقہ دے کر حضورﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست نہ کی۔ یہ حکم البتہ بہت تھوڑی دیر نافذ رہا اور جلد ہی اسے اگلی آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا۔ حضرت علی ؓ کہتے ہیں کہ میں واحد شخص تھا جس نے اس حکم پر عمل کیا اور صدقہ دے کر حضورﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست کی۔

﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ﴾ ”یہ تمہارے لیے بہتر بھی ہے اور زیادہ پاکیزہ بھی۔“

﴿فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۱۲﴾﴾ ”البتہ اگر تم (صدقہ دینے کے لیے) کچھ نہ پاؤ تو اللہ بہت بخشنے والا‘ بہت رحم کرنے والا ہے۔“

یعنی غریب اور نادار لوگ اس حکم پر عمل نہیں بھی کر سکتے تو کوئی مضائقہ نہیں‘ اللہ تعالیٰ ان کا عذر قبول فرماتے ہوئے انہیں معاف فرمائے گا۔ لیکن ظاہر ہے جن لوگوں کی وجہ سے یہ حکم نازل ہوا وہ تو سب کے سب متموّل‘ مرفہ الحال اور بڑے لوگ تھے جو حضورﷺ سے اپنی قربت جتلا کر لوگوں کے سامنے مزید ”بڑے“ بنا چاہتے تھے۔

آیت ۱۳ ﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ﴾ ”کیا تم ڈر گئے اس سے کہ (رسولؐ کے ساتھ) اپنی تنہائی کی باتوں سے پہلے صدقات پیش کرو؟“

﴿فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ ''پھر جب تم نے یہ نہیں کیا اور اللہ نے بھی تم پر نظرِ عنایت فرمادی''

﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ﴾ ''تو بس نماز قائم رکھو' زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو۔''

﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝١٣﴾ ''اور اللہ باخبر ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔''

اس آیت کے ذریعے اس حکم کو جلد ہی منسوخ بھی کر دیا گیا' لیکن اس حکم سے ان لوگوں کی قلعی کھل گئی جو محض ریاکاری کے لیے حضورﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کے شوقین تھے۔ پہلے تو وہ اس مقصد کے لیے بار بار حضورﷺ کے پاس آتے تھے' لیکن صدقہ کے حکم کے بعد ان میں سے کسی کو بھی علیحدگی میں بات کرنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ بہرحال مذکورہ حکم کے بعد جب ان میں سے کوئی شخص بھی صدقہ دے کر حضورﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست لے کر نہ آیا تو اس حکم کی منسوخی کے بعد اپنا پرانا طرزِ عمل دہراتے ہوئے وہ شرم تو محسوس کرتے ہوں گے اور یہی دراصل اس وقتی اور عارضی حکم کا اصل مقصد تھا۔

آیات ۱۴ تا ۲۲

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝١٤ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١٥ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝١٦ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝١٧ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝١٨ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝١٩ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ۝٢٠ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝٢١ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٢٢

ع ۳

آیت ۱۴ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ ”کیا تم نے غور نہیں کیا ان لوگوں (کے طرزِ عمل) پر جنہوں نے دوستی گانٹھی ہے ان لوگوں سے جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔“

اللہ کے غضب کے حوالے سے یہاں قومِ یہود (مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ) کی طرف اشارہ ہے اور ان سے دوستیاں گانٹھنے والے اوس اور خزرج کے منافقین تھے جو ان کے ساتھ اپنے پرانے حلیفانہ تعلقات کو ابھی تک نباہے چلے جا رہے تھے۔

﴿مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ﴾ ”نہ وہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے ہیں“

منافقین کے اس دوغلے کردار کا ذکر سورۃ النساء (آیت ۱۴۳) میں اس طرح ہوا ہے: ﴿لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ﴾ ”نہ تو یہ ان کی جانب ہیں اور نہ ہی اُن کی جانب ہیں۔“

﴿وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ⑭﴾ ”اور وہ جانتے بوجھتے جھوٹ پر قسمیں اٹھاتے ہیں۔“

آیت ۱۵ ﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ﴾ ”اللہ نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے سخت عذاب۔“

﴿اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑮﴾ ”یقیناً بہت ہی برا ہے وہ طرزِ عمل جو وہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔“

آیت ۱۶ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ ”انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے“

یہ لوگ جھوٹی قسموں کو اپنی کمزوریوں کی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جہاں کہیں کسی کی کسی بات پر گرفت ہوتی، وہ فوراً قسمیں کھانا شروع کر دیتا کہ اللہ کی قسم اصل میں یہ معاملہ یوں نہیں تھا بلکہ یوں تھا۔ اس طرح اُس کا مخاطب مروّت میں آ کر خاموشی اختیار کر لیتا۔

﴿فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ⑯﴾ ”پس وہ اللہ کے راستے سے رک گئے ہیں (اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں) پس ان کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے۔“

صَدَّ يَصُدُّ کے معنی خود رکنا بھی ہیں اور دوسروں کو روکنا بھی۔

آیت ۱۷ ﴿لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ﴾ ”ان کے کچھ بھی کام نہیں آئیں گے ان کے اموال اور نہ ہی ان کی اولادیں اللہ سے بچانے کے لیے۔“

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ⑰﴾ ”یہ آگ والے ہیں، اسی میں یہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔“

مقامِ عبرت ہے کہ یہ ”نوید“ ان لوگوں کو سنائی جا رہی ہے جو بظاہر حضور ﷺ کے ماننے والے تھے، آپ ﷺ کی اقتدا میں نمازیں پڑھتے تھے، اسلام کا دم بھرتے تھے، خود کو مسلمان کہتے تھے اور زبانوں سے گواہی دیتے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ سورۃ المنافقون کی پہلی آیت میں ان کی اس ”شہادت“ کا خصوصی طور پر ذکر کر کے ان کے جھوٹے ہونے پر مہر ثبت کی گئی ہے: ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ①﴾ ”(اے نبی ﷺ!) جب آپ کے پاس منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ

آپ اُس کے رسول ہیں' اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بلاشبہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔''

آیت ۱۸ ﴿یَوۡمَ یَبۡعَثُہُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا فَیَحۡلِفُوۡنَ لَہٗ کَمَا یَحۡلِفُوۡنَ لَکُمۡ﴾ ''جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے جیسے (آج) تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں''

یعنی یہ لوگ جھوٹی قسمیں کھانے کے اس حد تک عادی ہو چکے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ عزوجل کے سامنے بھی اسی طرح جھوٹی قسمیں کھانا شروع ہو جائیں گے کہ ہم ایسے نہیں کہتے تھے اور ہم ویسے نہیں کرتے تھے۔

﴿وَیَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ ؕ﴾ ''اور وہ سمجھیں گے کہ وہ کسی بات پر ہیں۔''

اللہ کی عدالت میں کھڑے ہو کر بھی وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہمارے اعمال کی بھی کچھ نہ کچھ حیثیت تو ہے۔ آخر ہم مسلمان ہوئے تھے' ہم نے اللہ کے رسول ﷺ کی اقتدا میں نمازیں پڑھی تھیں' روزے رکھے تھے' سب مسلمانوں کے ساتھ مل کر مہمات میں حصہ لیتے رہے تھے۔ اس طرح ہم دنیا سے کچھ نہ کچھ نیک اعمال تو لے کر آئے ہی ہیں۔

﴿اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۸﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

آیت ۱۹ ﴿اِسۡتَحۡوَذَ عَلَیۡہِمُ الشَّیۡطٰنُ فَاَنۡسٰہُمۡ ذِکۡرَ اللّٰہِ ؕ﴾ ''شیطان نے ان کے اوپر قابو پا لیا ہے' پس انہیں اللہ کی یاد بھلا دی ہے۔''

شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اُس نے انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔

﴿اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ الشَّیۡطٰنِ ؕ﴾ ''یہ لوگ ہیں شیطان کی جماعت۔''

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شیطان کی یہ جماعت تین گروہوں پر مشتمل تھی۔ ان میں شیطان کا سب سے طاقتور ہتھیار مشرکین عرب تھے۔ انہوں نے اسلام کی مخالفت اور اپنے ''دین'' کی حمایت میں ہر طرح کی قربانیاں دیں' جنگیں بھی لڑیں اور اپنے باطل معبودوں کے لیے گردنیں بھی کٹوائیں۔ دوسرا گروہ یہود مدینہ کا تھا' جبکہ تیسرا گروہ منافقین پر مشتمل تھا۔ منافقین مسلمانوں کے اندر رہتے ہوئے ان کے خلاف fifth columnists کا کردار ادا کر رہے تھے۔ آیات زیر مطالعہ میں خصوصی طور پر ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ اگرچہ خود کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلمانوں کی صفوں میں بیٹھے ہیں' لیکن اصل میں یہ حزب الشیطان ہی کے ارکان ہیں۔ مسلمانوں کی مخالفت کے حوالے سے ان لوگوں کے کردار کی مزید تفصیل اگلی سورۃ یعنی سورۃ الحشر میں بیان ہوئی ہے۔

﴿اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّیۡطٰنِ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! شیطان کی جماعت کے لوگ ہی حقیقت میں خسارہ اٹھانے والے ہیں۔''

آیت ۲۰ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗۤ اُولٰٓئِکَ فِی الۡاَذَلِّیۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ ''یقیناً جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت پر تُلے بیٹھے ہیں' وہی ذلیل ترین لوگوں میں سے ہوں گے۔''

ذلت کے ذکر کے لیے اَذَلِّیۡن (ذلیل ترین) یہاں ''تفضیل کُل'' (superlative degree) کے طور پر آیا ہے۔ سورۃ النساء کی اس آیت میں بھی منافقین کے لیے بالکل یہی اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡکِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لَہُمۡ نَصِیۡرًا ﴿۱۴۵﴾﴾ ''یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے

طبقے میں ہوں گے‘اور تم نہ پاؤ گے ان کے لیے کوئی مددگار۔‘‘

آیت ۲۱ ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ﴾ ’’اللہ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔‘‘

میں اور میرے رسول لازماً غالب ہو کر رہیں گے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ الصافات کی ان آیات میں بھی آ چکا ہے: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۷۱ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝۱۷۲ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۱۷۳﴾ ’’اور ہماری یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے اپنے ان بندوں کے لیے جن کو ہم (رسول بنا کر) بھیجتے رہے ہیں‘ کہ ان کی لازماً مدد کی جائے گی‘ اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔‘‘

اس بارے میں قبل ازیں بھی متعدد بار ذکر ہو چکا ہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ یہ مضمون بھی اسی اصول کے تحت سورۃ الصّٰٓفّٰت کے بعد یہاں پھر آیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۱﴾ ’’بے شک اللہ زبردست ہے‘ زور آور ہے۔‘‘

حزب الشیطان کے ذکر کے بعد فوری تقابل (simultaneous contrast) کے طور پر اب اگلی آیت میں حزب اللہ کا ذکر ہے۔ یہ آیت حزب اللہ کی رکنیت کے معیار کے حوالے سے litmus test بھی ہے۔ اس ٹیسٹ کا تعلق انسان کے قلبی تعلقات اور قریبی رشتوں سے ہے۔ اگر کسی مسلمان کا کوئی رشتہ دار‘ چاہے وہ اس کا باپ‘ بیٹا یا بھائی ہی کیوں نہ ہو‘ کافر و مشرک ہے اور وہ اسلام کی مخالفت میں باقاعدہ سرگرم عمل ہے‘ تو اس مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اس کے ایمان کی تلوار اس دشمنِ خدا کے ساتھ موجود اپنے رشتے کو کاٹ پھینکے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور کسی ایسے فرد کے ساتھ اس کے قلبی تعلق کا پیوند بدستور استوار رہا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت میں سرگرم عمل ہے تو ایسا مسلمان حزب اللہ سے خارج سمجھا جائے گا۔

آیت ۲۲ ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ’’تم نہیں پاؤ گے ان لوگوں کو جو حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخرت پر کہ وہ محبت کرتے ہوں ان سے جو مخالفت کر رہے ہیں اللہ اور اُس کے رسولؐ کی‘‘

یہ حکم ان کفار و مشرکین کے لیے ہے جو اسلام کی مخالفت میں فعال (active) اور سرگرم عمل ہوں۔ جہاں تک ان کفار و مشرکین کا تعلق ہے جو ایسی کسی جدوجہد میں بالفعل فعال نہ ہوں‘ ان کے بارے میں حکم آگے سورۃ الممتحنہ میں آئے گا۔

﴿وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ﴾ ’’خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے رشتے دار ہوں۔‘‘

آیت کا یہ حصہ پڑھتے ہوئے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ کا مضمون بھی ذہن میں تازہ کر لیں:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۴﴾

’’(اے نبیﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ‘ تمہارے بیٹے‘ تمہارے بھائی‘ تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)‘ تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں‘ اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے‘ اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں‘ (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ‘ اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے‘ تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔‘‘

ان آیات کا پیغام بہت واضح ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے ایک بندۂ مسلمان کی محبت کا اصل امتحان عشقِ رسولؐ کے زبانی دعوے اور نعتیہ اشعار میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے سے نہیں‘ بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے سے ہوگا۔ اگر تو وہ اس آیت میں مذکور اپنی آٹھ محبتوں کو تج کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمربستہ ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسولﷺ کی محبت میں سچا ہے‘ لیکن اگر وہ اس کے لیے عملاً تیار نہیں ہے تو اس کے زبانی دعووں کی کوئی حیثیت نہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے‘‘

دلوں کے اندر ایمان لکھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان پختہ کر دیا ہے۔ یعنی ایمان اب ان کے دلوں میں نقش کالحجر (پتھر پر لکیر) کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

﴿وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ﴾ ’’اور اُس نے ان کی مدد کی ہے اپنی طرف سے روح کے ساتھ‘‘

روح سے مراد یہاں فرشتہ بھی ہوسکتا ہے‘ الہام بھی ہوسکتا ہے اور اللہ کا خصوصی فضل بھی ہوسکتا ہے۔ غرض اللہ کی طرف سے غیر مرئی انداز میں مدد کی کوئی صورت بھی ہوسکتی ہے۔

﴿وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ﴾ ’’اور وہ داخل کرے گا انہیں ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی‘ جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔‘‘

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ﴾ ’’اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اُس سے راضی ہوگئے۔‘‘

اس کا ترجمہ ایسے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ’’اللہ ان سے راضی ہوجائے گا اور وہ اس سے راضی ہوجائیں گے۔‘‘

﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ﴾ ’’یہ لوگ ہیں اللہ کی جماعت!‘‘

﴿اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! یقیناً اللہ کی جماعت کے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔‘‘

سورۃ المائدۃ میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾﴾ کہ یقیناً اللہ کی جماعت کے لوگ ہی غالب رہنے والے ہیں۔ اگر حزب اللہ کی جدوجہد کے نتیجے میں اللہ کا دین دنیا میں غالب ہو جاتا ہے تو یہ یقیناً ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ لیکن اصل اور حقیقی کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے‘ جس کی بشارت ’’حزب اللہ‘‘ والوں کو اس آیت میں دی جا رہی ہے۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! آمین یاربَّ العالمین!

سُوْرَةُ الحَشْر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱ تا ۵

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ ھُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مِنْ دِیَارِھِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ مَّانِعَتُھُمْ حُصُوْنُھُمْ مِّنَ اللّٰہِ فَاَتٰىھُمُ اللّٰہُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَھُمْ بِاَیْدِیْھِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ۝ وَلَوْلَآ اَنْ کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمُ الْجَلَاۗءَ لَعَذَّبَھُمْ فِی الدُّنْیَا ۭ وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابُ النَّارِ ۝ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ شَاۗقُّوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ۚ وَمَنْ یُّشَاۗقِّ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَۃٍ اَوْ تَرَکْتُمُوْھَا قَاۗىِٕمَۃً عَلٰٓی اُصُوْلِھَا فَبِاِذْنِ اللّٰہِ وَلِیُخْزِیَ الْفٰسِقِیْنَ ۝

آیت ۱ ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ﴾ ’’تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمان میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔‘‘

المُسَبِّحات کے سلسلے کی پہلی سورۃ یعنی سورۃ الحدید کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾۔ یہاں ’’مَا فِی‘‘ کا اضافہ ہے‘ جس سے گویا مفہوم میں مزید زور (emphasis) پیدا ہو گیا ہے۔ باقی ساری آیت کے الفاظ وہی ہیں۔

﴿وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ①﴾ ’’اور وہ زبردست ہے‘ کمال حکمت والا۔‘‘

اُس کے اختیارات مطلق ہیں‘ لیکن وہ اپنے اختیارات کا استعمال بہت حکمت سے کرتا ہے۔

آیت ۲ ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مِنْ دِیَارِھِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ﴾ ’’وہی ہے جس نے نکال باہر کیا ان کافروں کو جو اہل کتاب میں سے تھے ان کے گھروں سے‘ پہلے جمع ہونے کے وقت۔‘‘

یہ یہودی قبیلہ بنونضیر کی مدینہ منورہ سے جلاوطنی کے واقعہ کا ذکر ہے۔ اس واقعہ کا پس منظر یوں ہے کہ حضور ﷺ کی ہجرت کے وقت مدینہ (یثرب) میں تین یہودی قبائل بنوقینقاع‘ بنونُضیر اور بنوقُریظہ آباد تھے۔

حضورﷺ نے مدینہ تشریف لانے کے فوراً بعد ان قبائل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں ''میثاقِ مدینہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر یہ مدینہ کے ''مشترکہ دفاع'' کا معاہدہ تھا۔ ان میں سے قبیلہ بنوقینقاع نے تو معاہدے کے کچھ ہی دیر بعد مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ چنانچہ معاہدے کی مسلسل خلاف ورزیوں کی بنا پر حضورﷺ نے غزوۂ بدر کے بعد اس قبیلہ کو مدینہ بدر کر دیا۔ غزوۂ اُحد (۳ ہجری) کے بعد قبیلہ بنونضیر نے بھی مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی وقتی شکست سے ان کی کمزوری کا تاثر لے کر جہاں عرب کے بہت سے دوسرے قبائل نے سر اٹھانا شروع کیا' وہاں یہ قبیلہ بھی اپنے عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف مہم جوئی میں شامل ہو گیا۔ ان کے سردار کعب بن اشرف نے قریش مکہ سے گٹھ جوڑ کر کے انہیں مدینہ پر حملہ کرنے کی باقاعدہ دعوت دی اور انہیں یقین دلایا کہ تم لوگ باہر سے حملہ کرو' ہم اندر سے تمہاری مدد کریں گے۔ اسی دوران کعب بن اشرف نے حضورﷺ کو (نعوذ باللہ) شہید کرنے کی ایک سازش بھی تیار کی۔ اس کے لیے ان لوگوں نے حضورﷺ کو کسی اہم بات چیت کے بہانے اپنے ہاں بلایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ کسی دیوار کے بالکل ساتھ آپؐ کی نشست کا انتظام کیا جائے اور جب آپؐ وہاں بیٹھے ہوں تو دیوار کے اوپر سے چکی کا بھاری پاٹ آپؐ پر گرا دیا جائے۔ آپؐ ان کے بلانے پر ان کے محلے میں تشریف لے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے جب وحی کے ذریعے آپؐ کو ان کی اس گھناؤنی سازش سے آگاہ کیا تو آپؐ واپس تشریف لے آئے۔

بنونضیر کی ان ریشہ دوانیوں اور مسلسل بدعہدی کی وجہ سے بالآخر ربیع الاول ۴ ہجری میں حضورﷺ نے ان کے خلاف لشکر کشی کا حکم دے دیا۔ البتہ جب مسلمانوں نے ان کی گڑھیوں کا محاصرہ کیا تو انہوں نے چند دن محصور رہنے کے بعد لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔ اس پر حضورﷺ نے ان کی جان بخشی کرتے ہوئے انہیں مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا' بلکہ آپﷺ نے مزید نرمی فرماتے ہوئے انہیں یہ اجازت بھی دے دی کہ جاتے ہوئے وہ جس قدر سامان اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہیں' لے جائیں۔ غزوۂ احزاب (۵ ہجری) کے بعد بنوقریظہ کو بھی ان کی عہد شکنی اور سازشوں کی وجہ سے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا گیا۔ اس طرح یہودِ مدینہ کے تینوں قبائل میثاقِ مدینہ کی خلاف ورزی کے باعث ایک ایک کر کے اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

آیت میں لِاَوَّلِ الْحَشْرِ کا ایک مفہوم تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ ہی جب ان پر لشکر کشی کی تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مدینہ سے جلاوطنی تو ان لوگوں کا پہلا حشر ہے' پھر ایک وقت آئے گا جب انہیں خیبر سے بھی نکال دیا جائے گا اور اس کے بعد انہیں جزیرہ نمائے عرب کو بھی خیرباد کہنا پڑے گا (چنانچہ حضرت عمرؓ کے دور میں تمام عیسائیوں اور یہودیوں کو جزیرہ نمائے عرب سے نکال دیا گیا) اور پھر ایک حشر وہ ہوگا جو قیامت کے دن برپا ہوگا۔

﴿مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا﴾ ''(اے مسلمانو!) تمہیں یہ گمان نہیں تھا کہ وہ (اتنی آسانی سے) نکل جائیں گے''

﴿وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''اور وہ بھی سمجھتے تھے کہ ان کے قلعے انہیں اللہ (کی پکڑ) سے بچالیں گے''

﴿فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۚ﴾ ''تو اللہ نے ان پر حملہ کیا وہاں سے جہاں سے انہیں گمان بھی نہ تھا۔''

﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ ''اور ان کے دلوں میں اُس نے رعب ڈال دیا''

اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو جس طریقے سے چاہے ہزیمت سے دوچار کر دے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قدر مرعوب کر دیا کہ وہ اپنے مضبوط قلعوں کے اندر بھی خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے اور اپنے تمام تر وسائل کے باوجود بھی مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔

﴿يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ﴾ ''وہ برباد کر رہے تھے اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور اہل ایمان کے ہاتھوں سے بھی۔''

چونکہ انہیں یہ اجازت مل چکی تھی کہ اپنے سامان میں سے جو کچھ وہ اپنے ساتھ اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہیں لے جائیں اس لیے وہ اپنے گھروں کی دیواروں اور چھتوں میں سے دروازے' کھڑکیاں' کڑیاں' شہتیر وغیرہ نکالنے کے لیے خود ہی انہیں مسمار کر رہے تھے۔ ان کی اس تخریب میں مسلمانوں نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا ہوگا۔

﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝﴾ ''پس عبرت حاصل کرو اے آنکھیں رکھنے والو!''

یہ گویا پیچھے رہ جانے والے قبیلے بنی قریظہ کو سنایا جا رہا ہے کہ تم اپنے بھائی بندوں کے اس انجام سے عبرت حاصل کرو اور سازشوں سے باز آ جاؤ!

آیت ۳ ﴿وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ﴾ ''اور اگر اللہ نے پہلے سے نہ لکھ دیا ہوتا ان پر جلاوطن ہونا''

﴿لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝﴾ ''تو انہیں سخت عذاب دیتا دنیوی زندگی میں' اور آخرت میں ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔''

آیت ۴ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ﴾ ''یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی مخالفت کی۔''

﴿وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾ ''اور جو اللہ کی مخالفت پر کمر کس لے تو (سمجھ لو کہ) اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

آیت ۵ ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓي اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''تم نے کھجور کے جو درخت کاٹے یا جن کو چھوڑ دیا ان کی جڑوں پر کھڑے' تو یہ اللہ کے اذن سے ہوا''

لِینہ ایک خاص قسم کی کھجور کے درخت کو کہتے ہیں۔ یہودیوں کی گڑھیوں اور حویلیوں کے گرد یہ درخت باڑ کی شکل میں کثرت سے موجود تھے۔ مسلمانوں نے جب ان کا محاصرہ کیا تو حملہ کے لیے راستے بنانے کی غرض

سے حسبِ ضرورت ان میں سے کچھ درختوں کو انہوں نے کاٹ ڈالا۔ یہودیوں نے مسلمانوں کے اس عمل کو ہدفِ تنقید بنایا اور پروپیگنڈا کیا کہ یہ لوگ خود کو مؤمنین کہتے ہیں اور ان کے قائد اللہ کے رسول (ﷺ) ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں' لیکن ان لوگوں کی اخلاقیات کا معیار یہ ہے کہ پھل دار درختوں کو بھی کاٹنے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہودیوں کے اس پراپیگنڈے کا جواب اللہ تعالیٰ نے خود دیا۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے مذکورہ اقدام پر اپنی منظوری (sanction) کی مہر ثبت کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ مسلمانوں نے یہ درخت جنگی ضرورت کے تحت اللہ کے رسول ﷺ کی موجودگی میں کاٹے ہیں۔ چنانچہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کیا تو پھر سمجھ لو کہ اللہ کی طرف سے اس کی اجازت دی گئی تھی۔

﴿وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾ ''اور تا کہ وہ فاسقوں کو ذلیل ورسوا کرے۔''

اب اگلی آیات میں مالِ فے کا ذکر آ رہا ہے جو اس سورت کا اہم ترین مضمون ہے۔ چنانچہ ان آیات کے مطالعہ سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ مالِ فے کیا ہے اور یہ مالِ غنیمت سے کس طرح مختلف ہے۔ مالِ غنیمت تو وہ مال ہے جو باقاعدہ جنگ کے نتیجے میں حاصل ہو۔ اس سے پہلے سورۃ الانفال کی آیت ۴۱ میں مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں حکم آ چکا ہے۔ اس حکم کے مطابق مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ' اس کے رسول ﷺ' رسولؐ کے قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کے لیے مخصوص ہوگا' جبکہ باقی چار حصے اس جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کے مابین تقسیم کر دیے جائیں گے' اور اس تقسیم میں سوار کو پیدل کے مقابلے میں دو حصے ملیں گے۔ اس کے برعکس ''مالِ فے'' وہ مال ہے جو مسلمانوں کو کسی جنگ کے بغیر ہی حاصل ہو جائے' جیسے زیر مطالعہ واقعہ میں باقاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی' مسلمانوں نے بنونضیر کا محاصرہ کیا اور انہوں نے مرعوب ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ چنانچہ اس مہم کے نتیجے میں حاصل ہونے والی زمینیں اور دوسری تمام اشیاء مالِ فے قرار پائیں۔ آگے آیت ۷ میں مالِ فے کے بارے میں واضح کر دیا گیا کہ یہ مال کُل کا کُل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے۔ اس میں سے اللہ کے رسول ﷺ اپنی مرضی سے غرباء و مساکین کو تو دیں گے لیکن عام مسلمانوں کو اس میں سے حصہ نہیں ملے گا۔

آیات ۶ تا ۱۰

وَمَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَاۗءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ

الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا
يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ
خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا
ع لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

آیت ۶ ﴿وَمَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ﴾ ''اور جو مال کہ ہاتھ لگا دیا ہے اللہ نے اپنے رسولؐ کے ان (بنونضیر) سے''

﴿فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ﴾ ''تو (اے مسلمانو!) تم نے اس پر نہیں دوڑائے گھوڑے اور نہ اونٹ''

﴿وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ﴾ ''لیکن مسلط کر دیتا ہے اللہ اپنے رسولوںؑ کو جس پر چاہتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۶﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت اور قدرت سے بنونضیر کے حوصلے پست کر دیے اور انہوں نے تم لوگوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس مہم میں ان کے خلاف تمہیں جنگ تو لڑنا ہی نہیں پڑی۔ لہٰذا تم پر واضح ہونا چاہیے کہ بنونضیر کی جلاوطنی کے نتیجے میں جو مال تمہارے ہاتھ لگا ہے وہ مالِ غنیمت نہیں ہے۔ اب اگلی آیت میں اس مال کے مصارف کے بارے میں حکم دیا جا رہا ہے۔

آیت ۷ ﴿مَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى﴾ ''جو مال بھی ہاتھ لگا دے اللہ اپنے رسولؐ کے بستیوں والوں سے''

﴿فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ﴾ ''تو وہ ہے اللہ کے لیے' رسولؐ کے لیے' قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کے لیے''

واضح رہے کہ اللہ اور رسولؐ سے مراد یہاں اسلامی ریاست ہے۔ پھر چونکہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا ذاتی ذریعہ معاش تو کوئی تھا نہیں' اس لیے یہ مال آپؐ کے ذاتی اخراجات مثلاً ازواجِ مطہرات ؓ کے نان نفقہ اور دوسری معاشرتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس میں حضور ﷺ کے قرابت داروں کی مد بھی رکھی گئی تا کہ آپؐ اپنے قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کے تقاضے پورے کر سکیں۔ اسی طرح اس مال میں ان تمام اقسام کے ناداروں اور محتاجوں کا بھی حق رکھا گیا جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ﴾ ''تا کہ وہ تم میں سے مال داروں ہی کے درمیان

گردش میں نہ رہے۔''

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ معاشرے میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو اور اس کی گردش کے ثمرات معاشرے کے تمام طبقات تک پہنچیں۔ یہ اسلامی معیشت کا بہت اہم اور بنیادی اصول ہے۔ اسی اصول کے تحت اللہ تعالیٰ نے مالِ فے زیادہ تر ناداروں اور محتاجوں کی محرومیوں کے ازالے کے لیے مختص فرما دیا۔ مالِ فے بھی اگر مالِ غنیمت کی طرح تقسیم کیا جاتا تو یہاں بھی سواروں کو دوہرا حصہ ملتا اور ظاہر ہے جس شخص کے پاس گھوڑا یا اونٹ ہے وہ تو پہلے ہی سے کچھ خوشحال ہے۔ تو اس تقسیم سے مالِ فے کا بھی زیادہ تر حصہ خوشحال لوگوں کو ہی ملتا۔

واضح رہے کہ اسلام کے نظامِ عدل وقسط میں تمام انسانوں کو معاشی طور پر برابر کر دینے کا تصور نہیں پایا جاتا۔ ایسا ہونا عملی طور پر ممکن بھی نہیں۔ ظاہر ہے ایک سپاہی اور سپہ سالار کسی طرح بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونزم اپنے تمام تر دعووں اور انقلابی نعروں کے باوجود ایسی ''معاشی مساوات'' کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی دنیا کو نہیں دکھا سکا۔ اس کے برعکس اسلام کا نظامِ معیشت معاشرے سے معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے اور امیر و غریب کے درمیان فرق وتفاوت کو کم سے کم کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس کے لیے اسلام ہر وہ دروازہ بند کر دینے کا حکم دیتا ہے جس کی وجہ سے چند ہاتھوں میں ارتکازِ دولت کا خدشہ ہو اور ہر وہ راستہ کھولنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس سے گردشِ دولت کا رُخ امراء سے غرباء کی طرف پھرنے اور معاشی محرومیوں کے ازالے کا امکان ہو۔

آج معاشی پیچیدگیوں کی وجہ سے جدید معاشرے میں جو گھمبیر صورتحال جنم لے رہی ہے اس کا ادراک سب سے پہلے جس عالمِ دین کو ہوا وہ شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ تھے۔ شاہ ولی اللہؒ ایسی صورت حال کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس ملک یا معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غیر منصفانہ ہوگا وہاں کچھ لوگ دولت کے انبار جمع کر کے مسرفانہ عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں مبتلا ہو جائیں گے' جبکہ محروم طبقے کے لوگ بار برداری کے جانور بن کر رہ جائیں گے۔ ایسی ہی صورت حال کے بارے میں حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا))[1] کہ محرومی اور احتیاج انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ گویا تقسیم دولت کا غیر منصفانہ نظام ایسی دودھاری تلوار ہے جس کی دوطرفہ کاٹ سے مذکورہ دونوں طبقوں کے افراد مذہبی وانسانی اقدار سے بیگانہ و بے نیاز ہو کر عملی طور پر معاشرے کے لیے ناسور بن جاتے ہیں۔ اُمراء کو تو اپنے اللّوں تللّوں سے ہی فرصت نہیں ملتی جبکہ غریب و نادار عوام دنیا و مافیہا سے بے خبر صبح سے شام تک کمر توڑ مشقت میں مصروف رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیطان اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتا ہے اور محروم طبقے کے افراد کے دلوں میں ظالم استحصالی طبقے کے خلاف بغض وعداوت کی آگ سلگانا شروع کر دیتا ہے: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ﴾ (المائدۃ:۹۱) ''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کر دے''۔ تصور کریں اگر ایک سیٹھ صاحب کی بیٹی کی شادی کے موقع پر کروڑوں روپے کا اسراف صرف بے جا نمود ونمائش کی مد میں ہو رہا ہوگا تو یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے اس غریب ملازم کے دل میں نفرت وعداوت کے کیسے کیسے جذبات پیدا ہوں گے جس کی بیٹی گھر میں بیٹھی صرف اس لیے بوڑھی ہو رہی ہے

(۱) المقاصد الحسنۃ للسخاوی' ح:۳۶۸۔ اللآلی المنثورہ للزرکشی (بدر الدین)' ح:۲۰۹ [لہ شاھد]

کہ وہ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ پھر ہمارے معاشرے میں جب ایک کروڑ پتی کی بیٹی لاکھوں کا جہیز لے کر دوسرے کروڑ پتی کی بہو بن جاتی ہے تو دولت مال داروں ہی کے مابین گردش میں رہتی ہے۔

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ ''اور جو کچھ رسولؐ تم لوگوں کو دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔''

ان الفاظ میں گویا اہل ایمان کو ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ مالِ فے سے متعلق نئے قانون کے تحت رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو بخوشی قبول کریں۔ ظاہر ہے لشکر اسلام میں شامل لوگ تو بنو نضیر کے علاقے سے حاصل ہونے والے مال واسباب کو مالِ غنیمت سمجھتے ہوئے اس میں سے حصے کی توقع کر رہے تھے۔ اب جب مذکورہ حکم کے تحت اس مال کو مالِ فے قرار دے کر اس کی تقسیم کا نیا قانون بنا دیا گیا تو لشکر کے شرکاء کو طبع بشری کے تحت ایک دھچکا تو ضرور لگا ہوگا۔ چنانچہ اس حکم کے تحت بنو نضیر کے محاصرے میں شامل اہل ایمان کو بالخصوص اور تمام اہل ایمان کو بالعموم دین کا بنیادی اصول بتا دیا گیا کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کا ہر فیصلہ آخری حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ معاملہ چاہے کوئی بھی ہو' اللہ کے رسول ﷺ تم لوگوں کو جو دے دیں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے آپؐ منع کر دیں اس سے منع ہو جایا کرو۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑦﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

اب اگلی آیات میں مالِ فے کی تقسیم کے بارے میں مزید وضاحت کی جا رہی ہے کہ جب یہ مال مذکورہ قانون کے تحت بیت المال میں آ جائے گا تو اس کی تقسیم میں بنیادی طور پر ضرورت مندوں کی ضروریات کو ترجیح دی جائے گی۔ ظاہر ہے اللہ کے رسول ﷺ تو اس میں سے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے وہی کچھ قبول کریں گے جو آپؐ کی انتہائی بنیادی ضروریات کے لیے ناگزیر ہوگا۔ آپ ﷺ نے تو اپنی ذات اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر شروع دن سے ہی فقر طاری کر رکھا تھا۔ سورۃ الاحزاب کے چوتھے رکوع میں واقعہ ایلاء کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ازواجِ مطہراتؓ کی طرف سے نان نفقہ بڑھانے کے مطالبے پر حضور ﷺ نے انؓ سے علیحدگی اختیار فرمائی تھی۔ چنانچہ مالِ فے کا بڑا حصہ کس کے لیے مختص کیا جائے گا:

آیت ۸ ﴿لِلْفُقَرَاۗءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ﴾ ''یہ (خاص طور پر) اُن تنگ دست مہاجرین کے لیے ہے جو نکال دیے گئے اپنے گھروں اور اپنے اموال سے''

﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ﴾ ''وہ اللہ کے فضل اور اُس کی رضا کے متلاشی ہیں اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی مدد کر رہے ہیں۔''

﴿اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ⑧﴾ ''یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔''

یہاں سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کے یہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ﴾ یعنی حق و باطل کی کشمکش سے دراصل اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے (ظاہر کر دینا چاہتا ہے) کہ کون لوگ

غیب میں ہونے کے باوجود اُس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کے لیے جاں بکف ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔
آیت زیر مطالعہ میں نہ صرف مالِ فے کی تقسیم کے حوالے سے فقراء مہاجرین کی ترجیح واضح کر دی گئی بلکہ ان کی بے لوث قربانیوں کی تصدیق و توثیق بھی فرما دی گئی کہ یہ لوگ صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر گھروں سے نکلے ہیں۔ اب چونکہ ان کے پاس اپنی بنیادی ضروریات کے لیے بھی کچھ نہیں تو مالِ فے کی تقسیم میں ان کے لیے خصوصی حصہ رکھا جائے گا۔

آیت ۹ ﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''اور (اس مال میں ان کا بھی حق ہے) جو آباد تھے اپنے گھروں میں اور جن کے پاس ایمان بھی تھا ان (مہاجرین کی آمد) سے پہلے''

یہ انصارِ مدینہ کا ذکر ہے کہ مہاجرین کی آمد پر ان کا طرزِ عمل کیا تھا:

﴿يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ﴾ ''وہ محبت کرتے ہیں ان سے جنہوں نے ہجرت کی ان کی طرف''
مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے مکہ مکرمہ سے آنے والے مہاجرین کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ ان میں سے کسی کے دل میں قطعاً کوئی ایسا خیال نہیں آیا کہ ان لوگوں کے آنے سے ہماری آبادی بڑھ جائے گی اور ان کی ناداری و محرومی ہماری معیشت پر بوجھ بن جائے گی۔

﴿وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا﴾ ''اور وہ نہیں پاتے اپنے سینوں میں کوئی حاجت اس بارے میں کہ جو کچھ ان (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے''
انصارِ مدینہ کے دل اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے ایثار و قربانی کے اعلیٰ جذبات سے لبریز ہیں' اور یہ جذبات ان کے دلوں میں اس دولت ایمان کے باعث پیدا ہوئے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بہرہ ور فرمایا ہے۔ یہ آیت دراصل انصارِ مدینہ کی تسکین و تشفی کے لیے ان کے جذبہ ایمان کو اپیل کرتے ہوئے نازل ہوئی تاکہ اگر ان میں سے کچھ لوگوں کے دلوں میں بنونضیر کے چھوڑے ہوئے مال سے متوقع حصہ نہ ملنے کے باعث کچھ ملال وغیرہ کے احساسات پیدا ہوئے ہوں تو وہ ختم ہو جائیں۔

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ﴾ ''اور وہ تو خود پر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو خواہ ان کے اپنے اوپر تنگی ہو۔''
ایثار کے معنی کسی کے لیے قربانی دینے اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینے کے ہیں۔ ظاہر ہے انصارِ مدینہ میں سے بھی سب لوگ دولت مند تو نہیں تھے' ان میں بھی بہت سے لوگ نادار اور تنگ دست تھے' لیکن ان میں سے ہر ایک نے اپنی احتیاج اور ضرورت کو پس پشت ڈال کر استطاعت بھر اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کی تھی۔ ان کے اسی جذبۂ ایثار کا اعتراف یہاں اس آیت میں کیا گیا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ ''اور جو کوئی بھی بچا لیا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو وہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔''
اب اس کے بعد جو آیت آ رہی ہے وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ حضرت عمر فاروق ؓ نے ایران'

عراق‘ مصر‘ شام وغیرہ کے مفتوحہ علاقوں کی زمینوں کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے اس آیت سے استدلال کیا تھا۔ ان علاقوں کی زمینیں بہت زرخیز ہیں‘ خصوصی طور پر عراق اور شام کے درمیان صحرا میں واقع وہ علاقہ جو Fertile Crescent کہلاتا ہے‘ اپنی زرخیزی کے اعتبار سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ جب یہ وسیع وعریض علاقے فتح ہوئے تو ان کی زرعی زمینوں کے نظم ونسق کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس معاملے میں زیادہ تر صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے اصول کے مطابق پانچواں حصہ بیت المال کے لیے مختص کر کے باقی زمینیں ہر محاذ کے مجاہدین میں تقسیم کر دی جائیں۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس رائے سے متفق نہیں تھے۔ آپ کی رائے یہ تھی کہ ان ممالک کی زمینیں مالِ غنیمت کے بجائے مالِ فے کے زمرے میں آتی ہیں‘ اس لیے ان پر مالِ فے کے قانون کا اطلاق ہونا چاہیے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت یہ ہے کہ مالِ غنیمت صرف وہ مال ہے جو جنگ میں دشمن کو شکست دینے کے بعد عین محاذِ جنگ سے مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگے۔ جیسے اسلحہ‘ راشن‘ بھیڑ بکریاں‘ اونٹ گھوڑے‘ جنگی قیدی وغیرہ۔ لیکن اگر کسی ایک جنگ کے نتیجے میں کوئی پورا ملک فتح ہو جائے (جیسے ابراہیم لودھی پانی پت کے میدان میں بابر سے صرف ایک جنگ ہارا تو اس کے نتیجے میں پورے ہندوستان پر بابر کا قبضہ ہو گیا) تو میدانِ جنگ سے باہر کی اراضی‘ املاک اور آبادی کو مالِ فے شمار کیا جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں اگلی آیت کے ان الفاظ سے استدلال کیا تھا: ﴿وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِھِمْ﴾ ”اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے“۔ پچھلی آیات کے مضمون سے اس آیت کے ان الفاظ کا ربط یوں بنتا ہے کہ مالِ فے پر حق ہے اللہ ورسولؐ کا‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز واقارب کا‘ غرباء ومساکین کا‘ انصار ومہاجرین کا (بحوالہ آیات ۷ اور ۸) اور اُن لوگوں کا جو اُن کے بعد آئیں گے۔ ان آیات کے سیاق وسباق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ آج کے مالِ فے میں اس اُمت کے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کا بھی حق ہے اور اگر آج یہ زمینیں چند ہزار مجاہدین میں تقسیم کر دی گئیں تو بعد میں آنے والے مسلمان گویا اس حق سے محروم رہ جائیں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس استدلال سے بعض معتبر صحابہؓ نے اختلاف بھی کیا اور مذکورہ زمینوں کو مالِ غنیمت کے قانون کے تحت متعلقہ مجاہدین میں تقسیم کرنے پر اصرار کیا۔ اس اختلافِ رائے کے بعد حضرت عمرؓ نے اس معاملے میں غور وخوض کے لیے اوس‘ خزرج اور مہاجرین میں سے چند صحابہؓ پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دے دیا۔ کمیشن کے ارکان نے مسئلے سے متعلق مختلف آراء اور دیگر پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے متفقہ طور پر جو فیصلہ دیا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے عین مطابق تھا اور بعد میں اسی فیصلے پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہوا۔ صحابہؓ کے اس اجماع یا فیصلے کے مطابق تمام مسلم ممالک کی اراضی دو اقسام میں بٹ گئی۔ جن علاقوں کے لوگ لڑے بھڑے بغیر ایمان لے آئے ان کی زمینیں ”عُشری زمینیں“ (ایسی زمین جو انفرادی ملکیت میں ہو اور اس کی پیداوار سے باقاعدہ عُشر وصول کیا جاتا ہو) قرار پائیں۔ جبکہ بزورِ شمشیر فتح ہونے والے ممالک کی زمینوں کو ”خراجی زمینوں“ (ایسی زمینیں جو بیت المال کی ملکیت ہوں اور ان کو کاشت کرنے والے لوگ اسلامی حکومت کو خراج ادا کریں) کا درجہ دیا گیا۔ مثلاً مدینہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنگ کے نتیجے میں فتح نہیں کیا تھا بلکہ مدینہ کے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں آنے کی خود دعوت دی تھی‘ اس لیے اوس اور خزرج کی تمام زمینیں ”عشری“ قرار پائیں اور متعلقہ لوگوں کی

انفرادی ملکیت میں ہی رہیں' جبکہ ایران' عراق' مصر' شام وغیرہ ممالک کی زمینیں خراجی زمینوں کی حیثیت سے اسلامی حکومت کی تحویل میں چلی گئیں۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے اجتہاد کے نتیجے میں انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ زمین کی اجتماعی ملکیت (collective ownership of land) کا نظام متعارف ہوا۔ اس وقت مفتوحہ علاقوں کی زمینیں اگر مالِ غنیمت کی حیثیت سے چند ہزار مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتیں تو اسلامی حکومت کے تحت انسانی تاریخ کی سب سے بڑی جاگیرداری وجود میں آ جاتی۔ اور پھر یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہ ہوتا بلکہ جس ملک کی اراضی واملاک پر مالِ غنیمت کے قانون کا اطلاق ہوتا اس ملک کی پوری آبادی کو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے غلام اور لونڈیاں بنا کر تقسیم کرنے کا مطالبہ بھی آتا۔

اسی قانون کے تحت پچھلی صدی تک ہندوستان کی زمینوں کے بارے میں بھی یہاں کے علماء کا اجماع تھا کہ یہاں کی تمام زمینیں خراجی ہیں اور اس حیثیت سے یہ زمینیں یہاں کے مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہیں اور یہ کہ ہندوستان میں کوئی عشری زمین نہیں ہے۔ اس کا ذکر ہندوستان کے عظیم مفسر و محدث قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فقہ کے مسائل سے متعلق اپنے رسالے ''مَالَا بُدَّ مِنْہ'' میں بھی کیا ہے۔ قاضی صاحب موصوف بہت بڑے صوفی اور مفتی بھی تھے۔ ان کی لکھی ہوئی ''تفسیر مظہری'' جسے انہوں نے اپنے مرشد مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے نام سے منسوب کیا ہے' آج کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ قاضی صاحب کا مرتب کردہ مذکورہ رسالہ فقہ کے بنیادی اور ابتدائی مسائل پر مشتمل ہے اور برصغیر کے تمام عربی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس رسالے میں انہوں نے عُشر سے متعلق مسائل شامل ہی نہیں کیے اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جب ہندوستان میں کوئی عشری زمین ہے ہی نہیں اور عُشر سے متعلق احکام کی تنفیذ و تعمیل کا کوئی امکان ہی نہیں تو ان مسائل کو لکھنے' پڑھنے یا سمجھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس علاقے میں جب کبھی اسلامی حکومت قائم ہو تو نئے بندوبست اراضی کے تحت بڑے بڑے جاگیرداروں سے وہ زمینیں واپس لی جاسکتی ہیں جو ماضی کے بادشاہوں' انگریز حکمرانوں اور سپہ سالاروں کی ''نظر کرم'' کے باعث انہیں عطا ہوئی تھیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ﴾
''اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے (مالِ فے پر ان کا بھی حق ہے) وہ کہتے ہیں: اے ہمارے ربّ! تو بخش دے ہمیں بھی اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ایمان میں ہم سے سبقت لے گئے''

﴿وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ ''اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کدورت نہ پیدا ہونے دے' اے ہمارے رب' بے شک تو نہایت شفیق اور رحم فرمانے والا ہے۔''

اس آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ مالِ فے کی تقسیم میں حاضر و موجود لوگوں کے علاوہ بعد میں آنے والے مسلمانوں اور ان کی آئندہ نسلوں کا حصہ بھی ہے۔ مزید برآں اس میں ایک اہم اخلاقی درس بھی دیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کے دل میں کسی دوسرے مسلمان کے لیے کوئی بغض' کینہ یا کدورت نہیں ہونی چاہیے' اور

مسلمانوں کے لیے صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہیں‘ نہ یہ کہ انہیں سب وشتم کا نشانہ بنائیں۔

یہاں پر پہلا رکوع اختتام پذیر ہوا۔ اس رکوع میں بنونُضیر کے مدینہ سے انخلاء اور ان کی چھوڑی ہوئی املاک (مالِ فے) سے متعلق احکام کا ذکر تھا۔ اب اگلی آیات میں منافقین کا تذکرہ ہے کہ ان لوگوں نے غزوۂ بنونضیر کے حوالے سے کیا کردار ادا کیا۔

آیات ۱۱ تا ۱۷

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نَافَقُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ لِاِخۡوَانِهِمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ لَئِنۡ
اُخۡرِجۡتُمۡ لَنَخۡرُجَنَّ مَعَکُمۡ وَلَا نُطِیۡعُ فِیۡکُمۡ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنۡ قُوۡتِلۡتُمۡ لَنَنۡصُرَنَّکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ
یَشۡهَدُ اِنَّهُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۱﴾ لَئِنۡ اُخۡرِجُوۡا لَا یَخۡرُجُوۡنَ مَعَهُمۡ ۚ وَلَئِنۡ قُوۡتِلُوۡا لَا یَنۡصُرُوۡنَهُمۡ ۚ
وَلَئِنۡ نَّصَرُوۡهُمۡ لَیُوَلُّنَّ الۡاَدۡبَارَ ۟ ثُمَّ لَا یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲﴾ لَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ رَهۡبَةً فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ
مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَفۡقَهُوۡنَ ﴿۱۳﴾ لَا یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ جَمِیۡعًا اِلَّا فِیۡ قُرًی مُّحَصَّنَةٍ اَوۡ مِنۡ
وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاۡسُهُمۡ بَیۡنَهُمۡ شَدِیۡدٌ ؕ تَحۡسَبُهُمۡ جَمِیۡعًا وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰی ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ
لَّا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۴﴾ کَمَثَلِ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ قَرِیۡبًا ذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِهِمۡ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۵﴾
کَمَثَلِ الشَّیۡطٰنِ اِذۡ قَالَ لِلۡاِنۡسَانِ اکۡفُرۡ ۚ فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّنۡکَ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ
رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶﴾ فَکَانَ عَاقِبَتَهُمَاۤ اَنَّهُمَا فِی النَّارِ خَالِدَیۡنِ فِیۡهَا ؕ وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا
الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۷﴾ ع

آیت ۱۱ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نَافَقُوۡا﴾ ’’کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو نفاق میں مبتلا ہیں‘‘

﴿یَقُوۡلُوۡنَ لِاِخۡوَانِهِمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ﴾ ’’وہ کہتے ہیں اپنے ان بھائیوں سے جنہوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا ہے‘‘

﴿لَئِنۡ اُخۡرِجۡتُمۡ لَنَخۡرُجَنَّ مَعَکُمۡ﴾ ’’کہ اگر تم لوگوں کو (کبھی مدینہ سے) نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے‘‘

یہودیوں کے ساتھ ان منافقین کے حلیفانہ تعلقات تھے۔ ان تعلقات اور روابط کی بنیاد پر منافقین وقتاً فوقتاً انہیں یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہم آخری دم تک تمہارا ساتھ دیں گے اور اگر تم لوگوں کو کبھی مدینہ سے بے دخل کرنے کی کوشش کی گئی تو ایسی مشکل گھڑی میں ہم شانہ بشانہ تمہارے ساتھ کھڑے ہوں گے۔

﴿وَلَا نُطِیۡعُ فِیۡکُمۡ اَحَدًا اَبَدًا ۙ﴾ ’’اور تمہارے معاملے میں ہم کسی کی بھی اطاعت نہیں کریں گے‘‘

﴿وَّاِنۡ قُوۡتِلۡتُمۡ لَنَنۡصُرَنَّکُمۡ ؕ﴾ ’’اور اگر تمہارے ساتھ جنگ کی گئی تو ہم لازماً تمہاری مدد کریں گے۔‘‘

منافقین انہیں یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہم محض وقتی طور پر بعض مصلحتوں کی وجہ سے مسلمانوں میں شامل ہوئے ہیں اور یہ کہ اس وجہ سے تمہارے ساتھ ہمارے پرانے دوستانہ تعلقات بالکل متاثر نہیں ہوں گے۔ چنانچہ تمہارے ساتھ حق دوستی نبھانے میں کوئی مصلحت بھی ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ہم بعض معاملات میں رسول اللہ ﷺ کا حکم مانتے بھی ہیں' لیکن تمہارے معاملے میں ہم ان کے حکم کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ اگر مسلمانوں نے کبھی تمہارے خلاف کوئی اقدام کرنے کی کوشش کی تو ہم ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے تمہارا ساتھ دیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ⑪﴾ ''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

آیت ۱۲ ﴿لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ﴾ ''اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔''

﴿وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ﴾ ''اور اگر اُن سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے۔''

﴿وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ⑫﴾ ''اور اگر انہوں نے کبھی اُن کی مدد کی بھی تو پیٹھ دکھا دیں گے' پھر ان کی کہیں سے مدد نہیں ہو سکے گی۔''

منافقین اپنے کردار و عمل سے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ پست حوصلہ' بزدل اور جھوٹے لوگ ہیں۔ اگر ان میں جوانمردی اور غیرت وحمیت کی کوئی رمق ہوتی تو یہ دوغلا پن اختیار نہ کرتے' بلکہ ایمان لانے کے بعد سچے مسلمانوں کا طرزِ عمل اختیار کرتے کہ ع ''ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم!'' لہٰذا اپنے دعووں کے مطابق یہ کبھی بھی یہودیوں کا ساتھ نہیں دیں گے' اور اگر ان میں سے کوئی اِکا دُکا سر پھرے لوگ حقِ دوستی نبھانے کے جوش میں یہودیوں کے ساتھ کہیں کھڑے ہو بھی گئے تو مشکل وقت آنے پر وہ بھی میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

آیت ۱۳ ﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ﴾ ''(اے مسلمانو!) یقیناً تمہارا ڈر ان کے دلوں میں اللہ کی نسبت شدید تر ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا تم لوگوں سے ڈرتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ⑬﴾ ''یہ اس لیے ہے کہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں۔''

یہ لوگ سمجھ بوجھ سے عاری ہیں۔ انسان کی اصل سمجھ اور عقل تو وہ ہے جو اسے اللہ سے متعارف کرائے اور ایمان کی راہ سجھائے۔ اسی طرح انسان کے لیے علم بھی وہی فائدہ مند ہے جو اسے اس حقیقت سے آگاہ کر دے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور دنیا کی زندگی بس کھیل اور تماشا ہے۔ چونکہ منافقین ایسی عقل سے بیگانہ اور ایسے علم سے نابلد ہیں اس لیے وہ اللہ سے ڈرنے کے بجائے انسانوں سے ڈرتے ہیں اور آخرت کی قیمت پر دنیا سنوارنے کی فکر میں مگن ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ۭ﴾ ''یہ کبھی اکٹھے ہو کر تمہارے خلاف جنگ نہیں کریں گے' سوائے اس کے کہ قلعہ بند بستیوں میں (رہ کر لڑیں) یا دیواروں کے

پیچھے سے۔"

﴿بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ﴾ "ان کے آپس کے جھگڑے بہت سخت ہیں۔"

ان کے باہمی جھگڑوں اور مخاصمت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بزدلی اور خودغرضی ان میں سے ہر ایک کے مزاج کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔ ظاہر ہے اگر یہ لوگ اللہ اور رسول ﷺ سے مخلص نہیں ہیں تو آپس میں ایک دوسرے سے کیسے مخلص ہو سکتے ہیں۔

﴿تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ﴾ "تم انہیں متحد گمان کرتے ہو' حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔"

ہمارے موجودہ زمانے کے سیاسی اتحاد بھی بدقسمتی سے بالکل یہی نقشہ پیش کرتے ہیں' حتیٰ کہ "تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ" کے نام پر بننے والے متحدہ محاذ کے راہنماؤں کے بھی باہمی اختلافات اس قدر شدید تھے کہ ان میں سے کئی علماء ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز تک ادا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ⑭﴾ "یہ اس لیے کہ یہ ایک ایسا گروہ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔"

آیت ۱۵ ﴿كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ﴾ "(ان کا وہی حال ہوگا) جیسے ان لوگوں کا معاملہ ہوا جو ان سے پہلے قریب ہی اپنے کیے کی سزا چکھ چکے ہیں۔"

اس سے یہودی قبیلہ بنوقینقاع کے لوگ مراد ہیں جنہیں ۲ ہجری میں غزوۂ بدر کے بعد مدینہ سے جلاوطن کیا گیا تھا' جبکہ بنونضیر کی جلاوطنی' جس کا ذکر ہم اس سورت میں پڑھ رہے ہیں' ۴ ہجری کو عمل میں آئی۔ اسی طرح ۵ ہجری میں غزوۂ احزاب کے بعد یہودِ مدینہ کا تیسرا اور آخری قبیلہ بنوقریظہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ⑮﴾ "اور ان کے لیے بہت ہی دردناک عذاب ہے۔"

آیت ۱۶ ﴿كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ﴾ "جیسے شیطان کی مثال' جب وہ انسان کو کہتا ہے کہ کفر کر!"

﴿فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ⑯﴾ "پھر جب وہ کفر کا ارتکاب کر لیتا ہے تو وہ (شیطان) کہتا ہے میں تم سے لاتعلق ہوں' میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔"

آیت ۱۷ ﴿فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ؕ﴾ "تو ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ آگ میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔"

﴿وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ⑰﴾ "اور یہی ہے بدلہ ظالموں کا۔"

انسان اور شیطان کی اس "جوڑی" کا ذکر سورۂ ق میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ کسی کافر' مشرک اور گنہگار کا جو قرین (ساتھی) شیطان ہوگا وہ اس کے بارے میں کہے گا: ﴿وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ㉓﴾ "اور اس کا

ساتھی کہے گا: (اے پروردگار!) یہ جو میری تحویل میں تھا' حاضر ہے!'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملے گا: ﴿اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾﴾ ''جھونک دو جہنم میں ہر ناشکرے سرکش کو''۔ اس کے بعد کی دو آیات میں اس جہنمی کی مزید صفات بیان کی گئی ہیں۔ وہ شیطان پھر کہے گا: ﴿رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾﴾ ''پروردگار! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا' بلکہ یہ خود ہی بہت بڑی گمراہی میں مبتلا تھا''۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ﴿لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾﴾ ''اب میرے سامنے جھگڑ و مت' جبکہ میں پہلے ہی تمہارے پاس وعید بھیج چکا ہوں۔ میرے حضور میں بات تبدیل نہیں کی جاسکتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔''

آیات ۱۸ تا ۲۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿۲۰﴾ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾ ع

اب ہم اس سورت کے تیسرے اور آخری رکوع کا مطالعہ کرنے جارہے ہیں جو بہت اہم آیات پر مشتمل ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ جب قرآن مجید کے کسی مقام یا کسی آیت کی خصوصی اہمیت کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اس مقام یا آیت کا کوئی خاص پہلو یا خاص موضوع مراد ہوتا ہے' ورنہ قرآن مجید کا تو ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اہم ہے۔ مثلاً قرآن مجید کے بعض مقامات فلسفہ وحکمت کے اعتبار سے اہم ہیں تو بعض دوسرے مقامات سائنسی حوالے سے لائق توجہ ہیں۔ بعض آیات روحِ دین سے بحث کرتی ہیں تو بعض ایمان کی ماہیت واضح کرتی ہیں۔ اسی طرح ہر آیت اور ہر مقام کی اہمیت اپنے موضوع اور مضمون کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی اہمیت فلسفہ اور تصوف کے موضوع کی وجہ سے بھی ہے اور اسمائے حسنیٰ کے اس عظیم الشان گلدستے کے اعتبار سے بھی جو پورے قرآن میں بالکل یکتا اور منفرد ہے۔ اس سورت کی آخری تین آیات اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ذکر کے حوالے سے سورۃ الحدید کی ابتدائی

چھ آیات کے ہم وزن ہیں۔ ان تین آیات میں ایک ساتھ سولہ اسمائے حسنیٰ آئے ہیں اور ان میں سے آٹھ اسمائے حسنیٰ تو ایک ہی آیت میں ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں اسمائے حسنیٰ کے ایک مقام پر اکٹھے ہونے کی اور کوئی مثال قرآن مجید میں نہیں ملتی۔

آیت ۱۸ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ﴾ ''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر جان کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ اُس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے!''

ظاہر ہے یہ اُس کل کے دن کی بات ہے جو بعث بعد الموت کے بعد آنے والا ہے' جس دن ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ اس دن کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر اہل ایمان اپنی زندگی اللہ کے تقویٰ کے سائے میں گزارنے کا اہتمام کرے اور اپنے اعمال کا مسلسل جائزہ لیتا رہے کہ اُس نے آخرت کے حوالے سے اب تک کیا کمائی کی ہے اور کائناتی حکومت کے امپیریل بینک میں اپنے کل کے لیے اب تک کتنا سرمایہ جمع کرایا ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑱﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' یقیناً تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

اس آیت میں بنیادی طور پر دو باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کا تقویٰ اور فکر آخرت۔ بلکہ اِتَّقُوا اللّٰہَ کا حکم یہاں خصوصی تاکید کے طور پر دو مرتبہ آیا ہے۔ تقویٰ سے عام طور پر اللہ کا خوف اور ڈر مراد لیا جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں یہ اہم نکتہ ضرور مدنظر رہنا چاہیے کہ اس خوف میں شیر یا سانپ کے خوف کی طرح دہشت کا عنصر بالکل نہیں' بلکہ اس کی مثال ایسے خوف کی سی ہے جیسا خوف اولاد اپنے والد سے محسوس کرتی ہے۔ اس خوف میں محبت اور احتیاط کے جذبات غالب ہوتے ہیں کہ ہمارے والد ہم سے ناراض نہ ہو جائیں اور ہم کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ہمارے والد کے جذبات واحساسات مجروح ہوں۔ چنانچہ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ڈر رہے ـــــ تقویٰ کے لغوی معنی بچنے کے ہیں' یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ بچ کر زندگی گزارنا۔

آیت ۱۹ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ ''اور (اے مسلمانو دیکھنا!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

﴿اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ⑲﴾ ''یہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔''

ہمارے لیے اس آیت کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنا فلسفہ خودی اسی آیت سے اخذ کیا تھا۔ علامہ کے اس بیان کے راوی سید نذیر نیازی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اس حوالے سے ایک واقعہ رقم کیا ہے۔ (یہ واقعہ انہوں نے ہمارے ہاں قرآن کانفرنس میں اپنے ایک لیکچر میں بھی بیان کیا تھا۔) وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے علامہ اقبال سے ان کے فلسفہ خودی کے ماخذ کے بارے میں سوال کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے فلسفہ خودی کے ماخذ کے بارے میں بہت چہ میگوئیاں ہوتی

ہیں۔کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ آپ نے یہ فلسفہ نطشے سے لیا ہے' کوئی اس حوالے سے کسی دوسرے مغربی فلاسفر کا نام لیتا ہے۔بہتر ہو گا آپ خود واضح فرما دیں کہ آپ کے اس فلسفہ کا ماخذ کیا ہے؟ یہ سن کر علامہ اقبال نے انہیں فرمایا کہ آپ کل فلاں وقت میرے پاس آئیں' میں آپ کو اس کے ماخذ کے بارے میں بتاؤں گا۔اس پر وہ بہت خوش ہوئے کہ شاعر مشرق اور حکیم الامت انہیں یہ اعزاز بخش رہے ہیں کہ انہیں اس موضوع پر تفصیلی ڈکٹیشن دیں گے۔ لیکن اگلے دن جب وہ کاپی پنسل ہاتھ میں لیے مقررہ وقت پر حاضر خدمت ہوئے تو علامہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ ذرا قرآن مجید اٹھا لاؤ۔ پھر انہوں نے کہا کہ سورۃ الحشر کی یہ آیت (آیت ۱۹) نکال کر تلاوت کرو! اور انہیں مخاطب ہو کر کہا کہ یہ ہے میرے فلسفہ خودی کا ماخذ!

اب آیئے فَاَنْسٰـھُمْ اَنْفُسَھُمْ کے مفہوم پر غور کریں۔کیا کوئی شخص اپنے آپ کو اس طرح بھول سکتا ہے کہ وہ خود اپنی شخصیت سے ہی واقف نہ رہے؟ کیا کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے جسے اپنے پیٹ کا خیال نہ رہے؟ یا جسے اپنی کوئی بیماری یاد نہ رہے؟ ظاہر ہے کوئی انسان اپنے جسم اور اس کے تقاضوں سے غافل نہیں ہو سکتا۔تو معلوم ہوا کہ حیوانی جسم کے علاوہ انسان کی کوئی اور حیثیت بھی ہے جسے وہ بھول جاتا ہے اور وہ ہے انسان کی اصل حقیقت یعنی اس کی ''روح'' ۔ جہاں تک انسان کے اللہ کو بھلانے کا تعلق ہے اس کا ذکر سورۃ المجادلہ کی آیت ۱۹ میں بھی آیا ہے: ﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰـھُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''شیطان نے ان پر قابو پالیا ہے' پس انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے''۔اب آیت زیر مطالعہ میں ایسے لوگوں کی اس سزا کا ذکر ہے جو انہیں دنیوی زندگی میں ہی مل جاتی ہے۔یعنی جو لوگ شیطان کے بہکاوے میں آ کر اللہ کو بھول جاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ان کی اصل حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ انسان ہیں' اشرف المخلوقات ہیں یا اللہ کے بندے ہیں۔انہیں بس یہی یاد رہ جاتا ہے کہ بہت سے حیوانات کی طرح وہ بھی ایک حیوان ہیں۔

آج ہماری جدید تہذیب بھی مختلف انداز سے ہمیں یہی سبق پڑھانے کی کوشش میں ہے کہ انسان محض ایک حیوان ہے۔ اس فلسفے کو متعارف کرانے اور پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ڈارون کے نظریہ ارتقاء (Evolution Theory) نے ادا کیا ہے۔اس تھیوری کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حیوان اور انسان میں بنیادی فرق صرف ارتقاء کے مراحل اور مدارج کا ہے۔جیسے گدھے اور گھوڑے میں صرف یہ فرق ہے کہ گدھا نچلے درجے کا (rough & coarse) جانور ہے' جبکہ گھوڑا ارتقاء کا ایک مزید مرحلہ طے کر کے نسبتاً بہتر درجے میں چلا گیا ہے اور ایک refined اور تمکنت والا جانور ہے' اسی طرح کا فرق ایک گوریلے (chimpanzee) اور انسان میں ہے۔یعنی گوریلے کے مقابلے میں انسان نسبتاً بہتر قسم کا جانور ہے' باقی ان دونوں کے جبلی تقاضے (instincts) اور محرکات (motives) میں کوئی فرق نہیں ہے —— جدید سائیکالوجی بھی انہی خطوط پر چل رہی ہے۔چنانچہ آج کے سائیکالوجسٹ کو بھی محرکاتِ عمل کے حوالے سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔تو جب یہ فرق مٹ گیا اور انسان اپنی اصلیت کو بھلا کر حیوان بن گیا تو گویا وہ ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے بھی آزاد ہو گیا۔انیسویں صدی کے فرنچ لٹریچر میں بنیادی طور پر اسی نکتے کو فوکس کیا گیا ہے کہ حیوانات کی

زندگی فطرت کے عین مطابق ہے‘اس لیے ہم انسانوں کو ان سے سبق لیتے ہوئے اپنی زندگی کو خواہ مخواہ کے تکلّفات سے آزاد کر لینا چاہیے۔ مثلاً تمام حیوانات لباس سے بے نیاز ہیں‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس فطرت کا تقاضا نہیں ہے‘ انسان کی اپنی ایجاد ہے۔ اسی طرح بیوی‘ بیٹی اور ماں کی تمیز بھی حیوانات میں نہیں پائی جاتی‘ یہ پابندی بھی انسان نے اپنے اوپر خود ہی عائد کی ہے۔ یہ ہے آج کے انسان کا المیہ!

بہرحال یہ آیت ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ جو انسان اللہ کو بھلا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اُس کی حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ انسان کی روح خود اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر پھونکی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ ''انسان'' کے مرتبے پر فائز ہوا ہے۔ چنانچہ جب کوئی انسان اپنی روح اور اس کے تقاضوں سے غافل ہو جاتا ہے تو وہ انسان کے درجے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ اس حوالے سے اپنشد کا یہ جملہ بہت اہم ہے:

Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths that encompass his real self.

اسی real self کا دوسرا نام ''انا'' ہے‘ لیکن اس سے اصل مراد انسان کی ''روح'' ہی ہے‘ جسے علامہ اقبال نے فلسفیانہ انداز میں ''خودی'' کا نام دیا ہے:

؎ نقطۂ نوری کہ نامِ او خودی ست   زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی ست

؎ ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں   غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان حیوانی جسم اور روح کا مرکب ہے۔ بقول شیخ سعدی:

آدمی زادہ طرفہ معجون است   از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

یعنی آدمی ایک ایسی معجونِ مرکب ہے جس میں فرشتہ اور حیوان دونوں گُندھے ہوئے ہیں۔ فرشتے سے مراد یہاں وہ نورانی روح ہے جو عالم امر کی چیز ہے: ﴿وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ (بنی اسرائیل) ''اور (اے نبیﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں۔ آپ فرما دیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا علم مگر تھوڑا سا''۔ چنانچہ انسان کی روح نورانی چیز ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اگر انسان اللہ کو بھلا دے گا تو اپنی روح یعنی اپنی اصلیت سے بیگانہ ہو کر محض ایک حیوان بن کر رہ جائے گا۔ اس کے بعد اس کی نظر میں اچھے برے اور حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں رہے گی۔ انسانی معاشرے کے ایسے ہی افراد آیت زیر مطالعہ کے حکم ''اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ'' کے مصداق ہیں۔

آیت ۲۰ ﴿لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ؕ﴾ ''(دیکھو!) برابر نہیں ہو سکتے آگ والے اور جنت والے۔''

﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾﴾ ''یقیناً جنت والے ہی کامیاب ہوں گے۔''

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ ادْخِلْنَا الْجَنَّۃَ مَعَ الْاَبْرَارِ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ‘ یَامُجِیْرُ یَامُجِیْرُ یَامُجِیْرُ!

آیت ۲۱ ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اگر ہم

اس قرآن کو اُتار دیتے کسی پہاڑ پر تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔''

یہ قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے یہاں یہ اہم نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید کی عظمت اور قرآن مجید کی افادیت دو الگ الگ موضوعات ہیں۔ ان دو موضوعات کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں تک قرآن مجید کی افادیت کا تعلق ہے' قرآن کی متعدد آیات اس حوالے سے ہماری راہنمائی کرتی ہیں' لیکن سورۂ یونس کی یہ دو آیات اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝﴾

''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے اَمراض) کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے' تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں! وہ کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

یہ تو قرآن مجید کی افادیت کا ذکر ہے' لیکن قرآن مجید فی نفسہٖ کیا ہے؟ انسان کا محدود ذہن اس موضوع کو کماحقہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی عظمت کے تصور کو انسانی ذہن کے لیے کسی حد تک قابل فہم بنانے کے لیے آیت زیر مطالعہ میں ایک تمثیل بیان کی گئی ہے۔ اس تمثیل کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر پیش آنے والے واقعہ کی یاددہانی ضروری ہے۔ یہ واقعہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ میں بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چالیس راتوں کے لیے کوہِ طور پر گئے تو آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: ﴿رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ۭ﴾ کہ اے میرے رب! مجھے اپنا جلوہ دکھا' میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ﴿قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ ﴿وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ﴾ البتہ تم اس پہاڑ کو دیکھو' میں اپنی تجلی اس پر ڈالوں گا۔ ﴿فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ﴾ تو اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ قائم رہ سکا تو پھر تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ﴾ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر ایک تجلی ڈالی' یعنی نور کا پَرتو جب پہاڑ پر پڑا تو ﴿جَعَلَهٗ دَكًّا﴾ اُس نے اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ﴿وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۚ﴾ (الاعراف:۱۴۳) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بالواسطہ تجلی کے مشاہدہ کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش کر گر پڑے۔ اس واقعہ کے ساتھ آیت زیر مطالعہ میں بیان کی گئی تمثیل کی گہری مماثلت ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ کوہِ طور پر ''تجلی ذات'' کا معاملہ تھا اور یہاں اس تمثیل میں ''تجلی صفات'' کا ذکر ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام اپنے متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ اس لیے جو تاثیر ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلی کی ہے عین وہی تاثیر کلام اللہ کی تجلی کی ہے۔ علامہ اقبال اپنے انداز میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان یوں کرتے ہیں: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!

کہ اگر میں اپنے دل کی بات کروں تو یہ کہوں گا کہ قرآن مجید محض ایک کتاب نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہی چیز ہے۔ کیا

چیز ہے؟اس کی مزید وضاحت علامہ یوں کرتے ہیں:

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

یعنی یہ اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا حامل ہے اور اس حیثیت میں یہ پوشیدہ بھی ہے اور عیاں بھی۔ ہمیشہ زندہ رہنے والا بھی ہے اور گویا (بولتا ہوا) بھی۔ قرآن حکیم کی عظمت کے حوالے سے سورۃ الواقعہ کی آیت ﴿لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ ﴿۷۹﴾﴾ کی تشریح کے تحت یہ نکتہ بھی زیر بحث آ چکا ہے کہ قرآن مجید کی حقیقی معرفت، اصل ہدایت اور روحِ باطنی تک رسائی کے لیے انسان کے باطن کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے باطن کا تجزیہ کیے بغیر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو وہ صرف اس کی عبارت اور لغت کے ظاہری مطالب و معانی تک ہی رسائی حاصل کر پائے گا۔ یہی بات مولانا روم نے تعلی میز الفاظ میں یوں بیان کی ہے:

ما زِ قرآں مغزہا برداشتیم استخواں پیشِ سگاں انداختیم!

کہ ہم نے قرآن سے اس کا مغز لے لیا ہے اور ہڈیاں کتوں کے آگے ڈال دی ہیں۔

﴿وَتِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُہَا لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔''

اب وہ تین عظیم آیات آ رہی ہیں جن کا ذکر اس رکوع کے آغاز میں اسمائے حسنیٰ کے حوالے سے ہوا تھا۔ واضح رہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے موضوع پر سورۃ الحدید کی پہلی چھ آیات قرآن مجید کے ذروۂ سنام کا درجہ رکھتی ہیں۔ (عربی میں اونٹ کی کوہان کو سنام اور کسی چیز کی چوٹی یا بلند ترین حصے کو ذُروہ/ذِروہ کہتے ہیں۔ چنانچہ ذروۂ سنام کا مطلب ہے کوہان کی بھی چوٹی۔ یعنی سب سے اونچا مقام یا کسی چیز کا نمایاں ترین حصہ!) جبکہ اسمائے حسنیٰ کے ذکر کے اعتبار سے سورۃ الحشر کی آخری تین آیات پورے قرآن میں منفرد و ممتاز مقام کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے حوالے سے یہاں ''ایمانِ مجمل'' کے یہ الفاظ بھی اپنے حافظے میں تازہ کر لیں: اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ یعنی ہم اللہ تعالیٰ کے تمام اَسماء و صفات کے ساتھ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے تمام احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

آیت ۲۲ ﴿ہُوَ اللّٰہُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ﴾ ''وہی ہے اللہ، جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔''

﴿عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّہَادَۃِ ۚ﴾ ''وہ جاننے والا ہے چھپے کا اور کھلے کا۔''

یہ پورا مرکب اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے بھی جانتا ہے جو ہمارے سامنے ہے اور اُسے بھی جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن میں جہاں اللہ کے لیے غیب اور شہادۃ کے الفاظ آتے ہیں، وہ ہم انسانوں کے لیے ہیں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے لیے تو سب شہادہ ہی شہادہ ہے، اس کے لیے تو کوئی چیز بھی غیب نہیں۔ ہم انسانوں کے لیے کچھ چیزیں تو وہ ہیں جنہیں ہم اپنے حواسِ خمسہ سے محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسی تمام اشیاء ہمارے لیے ''ظاہر'' (الشَّہَادَۃ) کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی چیز کو ہم مائیکروسکوپ یا ٹیلی سکوپ سے بھی دیکھ لیں تو اس کی حیثیت بھی ہمارے لیے ''ظاہر'' ہی کی ہے۔ دوسری

طرف کچھ ایسے حقائق ہیں جنہیں ہم سے چھپا دیا گیا ہے' انہیں ہم کسی طرح بھی اپنے حواس کے احاطہ میں نہیں لا سکتے۔ ایسی سب چیزیں ہمارے لیے غیب کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات' فرشتے' جنت' دوزخ' عالمِ آخرت وغیرہ' سب ہمارے لیے غیب ہیں۔ یہ مضمون سورۃ الجن میں دوبارہ واضح تر انداز میں آئے گا۔

﴿هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾﴾ ''وہ بہت رحم کرنے والا' نہایت مہربان ہے۔''

سورۃ الفاتحہ کی دوسری آیت ان ہی دو اسمائے حسنیٰ پر مشتمل ہے۔ لغوی اور اشتقاقی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو متعلقہ آیت کی تشریح۔

آیت ۲۳ ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ﴾ ''وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔''

﴿اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ﴾ ''حقیقی بادشاہ' یکسر پاک' سراپا سلامتی (اور ہر اعتبار سے سالم)' امن دینے والا' پناہ میں لینے والا' زبردست (مطلق العنان)' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا' سب بڑائیوں کا مالک۔''

﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''اللہ پاک ہے ان تمام چیزوں سے جو یہ شرک کرتے ہیں۔''

اس ایک آیت میں آٹھ اسمائے حسنیٰ مسلسل' بغیر حرفِ ''و'' کے آئے ہیں اور اس لحاظ سے یہ آیت پورے قرآن مجید میں منفرد ہے۔

آیت ۲۴ ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ ''وہی ہے اللہ' تخلیق کا منصوبہ بنانے والا' وجود بخشنے والا' صورت گری کرنے والا۔''

اس آیت میں (اللہ کے علاوہ) تین اسمائے حسنیٰ آئے ہیں۔ ان تینوں اسماء کا تعلق تخلیقی عمل کے مختلف مراحل سے ہے اور اس لحاظ سے یہاں ان کا ذکر ایک فطری اور منطقی ترتیب سے ہوا ہے۔ ''خلق'' دراصل عمل تخلیق کا وہ مرحلہ ہے جب کسی چیز کا منصوبہ یا نقشہ تیار ہوتا ہے۔ بغرضِ تفہیم اگر ہم انسانوں پر قیاس کرتے ہوئے ایک بڑھئی کی مثال سامنے رکھیں تو عمل تخلیق کے مختلف مراحل اور ان تینوں اسماء کے مابین پائے جانے والے خاص ربط کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ فرض کریں کہ بڑھئی ایک میز بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے وہ مطلوبہ سائز اور مطلوبہ شکل کی میز کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے۔ یہ اس میز کی ذہنی تخلیق ہے۔ اس کے بعد بڑھئی مجوزہ نقشے کے مطابق لکڑی کا میز بنا کر اپنی ''ذہنی تخلیق'' کو عالمِ واقعہ میں ظاہر کر دیتا ہے۔ پھر تیسرے اور آخری مرحلے میں وہ اسے finishing touches دیتے ہوئے رنگ و روغن کر کے میز کو حتمی طور پر تیار کر دیتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں اسمائے حسنیٰ کا تعلق تخلیق کے ان ہی تین مراحل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کا ایک نقشہ یا نمونہ تیار فرماتا ہے۔ اس مفہوم میں وہ الخَالق ہے' پھر وہ اس تخلیق کو عدم سے عالمِ وجود میں ظاہر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ البارِئ ہے۔ (بَرَأَ کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۲ میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ ''اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔'') اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کو باقاعدہ ایک

صورت یا شکل عطا کرتا ہے۔ اس معنی میں وہ ''الْمُصَوِّر'' ہے۔

﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ﴾ ''تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔''

﴿يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ''اُسی کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔''

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾﴾ ''اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا۔''

اس سورت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے آغاز میں بھی اللہ کی تسبیح کا بیان ہے اور اس کا اختتام بھی اللہ کی تسبیح پر ہوتا ہے۔ آغاز میں تسبیح کے حوالے سے ماضی کا صیغہ (سَبَّحَ) آیا ہے جبکہ اختتام پر مضارع کا صیغہ (يُسَبِّحُ) ہے۔ اسی طرح اس کی ابتدائی آیت کے اختتام پر جو دو اسمائے حسنٰی (الْعَزِيْزُ الْحَكِيْم) آئے ہیں' آخری آیت کا اختتام بھی ان ہی اسمائے حسنٰی پر ہوتا ہے۔

سُوْرَۃُ المُمْتَحِنَۃ

تمہیدی کلمات

سورۃ الممتحنہ کا نزول فتح مکہ سے قبل اسی زمانے میں ہوا جس زمانے میں سورۃ التوبہ کے دوسرے اور تیسرے رکوع کی آیات نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ حالات تھے جب ایک طرف رسول اللہ ﷺ مکہ پر فیصلہ کن چڑھائی کی تیاری کر رہے تھے تو دوسری طرف منافقین اس ممکنہ مہم کے خلاف پراپیگنڈے میں سرگرم عمل تھے۔ (سورۃ التوبہ کے تمہیدی کلمات میں ان حالات پر تفصیل سے تبصرہ کیا جا چکا ہے۔) ان لوگوں کے بعض دلائل ایسے تھے جن سے نومسلم ضُعفاء بھی کسی نہ کسی حد تک متاثر ہو رہے تھے۔ مثلاً اس حوالے سے ان کی ایک دلیل یہ تھی کہ قریش مکہ جیسے بھی ہیں آخر وہ حرم کے متولی ہیں اور حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں' لہٰذا ان کی ان نیکیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ منافقین کے ایسے اعتراضات کے جوابات سورۃ التوبہ کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں دیے گئے ہیں۔

اسی دوران وہ واقعہ بھی رونما ہوا جس کا ذکر اس سورہ کے آغاز میں آیا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ حضور ﷺ مکہ پر چڑھائی کا منصوبہ مکمل طور پر خفیہ رکھنا چاہتے تھے' تاکہ قریش کو اس بارے میں کوئی پیشگی اطلاع نہ ملنے پائے۔ لیکن ایک صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے یہ بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے سردارانِ قریش کو ایک خفیہ خط کے ذریعے اس اہم جنگی راز کی اطلاع کرنے کی کوشش کی۔ حضرت حاطبؓ انتہائی مخلص مسلمان اور بدری صحابی تھے۔ انؓ کے اہل و عیال اور کنبے کے کچھ لوگ اس وقت تک مکہ مکرمہ میں تھے۔ انہیں پریشانی لاحق تھی کہ مسلمانوں کی مکہ پر لشکرکشی کی صورت میں قریش ان کے اہلِ خانہ کو انتقام کا نشانہ بنائیں گے۔ اس اندیشے کے پیش نظر انہوں نے حملے کی پیشگی اطلاع دے کر قریش مکہ پر گویا ایک بہت بڑا احسان کیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس احسان کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ ان کے اہل و عیال کو کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے۔ حضرت حاطبؓ نے مذکورہ خط ایک عورت کو دیا جو مکہ جا رہی تھی اور اسے تاکید کی کہ وہ اسے مکمل رازداری سے فلاں شخص تک پہنچا دے۔ اس عورت کے مدینہ سے روانہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور ﷺ کو اس بارے میں مطلع فرما دیا۔ حضور ﷺ نے حضرت علی' حضرت زبیر اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم کو اس عورت کے پیچھے روانہ کیا' انہیں تیزی سے جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ مکہ کے راستے میں روضۂ خاخ کے مقام پر آپ لوگوں کو ایک عورت ملے گی' اس کے پاس ایک خط ہے' وہ خط اس سے لے کر واپس آ جاؤ۔ حضرت علیؓ تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے حضور ﷺ کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے تو وہ عورت وہاں موجود تھی۔ آپؓ نے خط مانگا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آپؓ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی دی گئی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی' لہٰذا تم سیدھے طریقے سے خط ہمارے حوالے کر دو' ورنہ ہم تمہیں برہنہ کر کے تمہاری تلاشی لیں گے۔ اس پر عورت نے خط اپنی

رُقعہ نکال کر آپؐ کے حوالے کر دیا۔ حضور ﷺ نے جب حضرت حاطبؓ کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ ﷺ میرے معاملے میں جلدی نہ فرمائیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اہل خانہ مکہ میں مقیم ہیں۔ میں قریش کے قبیلہ کا آدمی نہیں ہوں' بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوا ہوں۔ میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے جو میرے اہل خانہ کو بچا سکے۔ اس لیے میں نے یہ خط اس خیال سے بھیجا تھا کہ قریش پر میرا ایک احسان رہے' جس کا لحاظ کر کے وہ میرے اہل وعیال کو نقصان نہ پہنچائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ موقع پر موجود تھے' انہوں نے اٹھ کر عرض کیا: یارسول اللہؐ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں' اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! حاطبؓ سے غلطی ضرور ہوئی ہے' لیکن یہ بدری صحابی ہے اور اللہ تعالیٰ بدری صحابہؓ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر چکا ہے' امید ہے وہ اس کی یہ خطا بھی معاف فرما دے گا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو دیے اور انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ زیر مطالعہ سورت کی پہلی آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

آیات ۱ تا ٦

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ عَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ وَ قَدۡ کَفَرُوۡا بِمَا جَآءَکُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَ اِیَّاکُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ رَبِّکُمۡ ؕ اِنۡ کُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِہَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ٭ۖ تُسِرُّوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ ٭ۖ وَ اَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَیۡتُمۡ وَ مَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡہُ مِنۡکُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ① اِنۡ یَّثۡقَفُوۡکُمۡ یَکُوۡنُوۡا لَکُمۡ اَعۡدَآءً وَّ یَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡکُمۡ اَیۡدِیَہُمۡ وَ اَلۡسِنَتَہُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَ وَدُّوۡا لَوۡ تَکۡفُرُوۡنَ ؕ② لَنۡ تَنۡفَعَکُمۡ اَرۡحَامُکُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ ۚۛ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚۛ یَفۡصِلُ بَیۡنَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ③ قَدۡ کَانَتۡ لَکُمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِہِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡکُمۡ وَ مِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ۫ کَفَرۡنَا بِکُمۡ وَ بَدَا بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃُ وَ الۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَحۡدَہٗۤ اِلَّا قَوۡلَ اِبۡرٰہِیۡمَ لِاَبِیۡہِ لَاَسۡتَغۡفِرَنَّ لَکَ وَ مَاۤ اَمۡلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَیۡکَ تَوَکَّلۡنَا وَ اِلَیۡکَ اَنَبۡنَا وَ اِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ ④ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَۃً لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ اغۡفِرۡ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ⑤ لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡہِمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَ الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ ؕ وَ مَنۡ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ⑥ ع

آیت ۱ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ عَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ﴾ ''اے اہلِ ایمان! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ''

یعنی تم لوگ کفار و مشرکین کی خیر خواہی اور بھلائی کا مت سوچو۔ ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے اور اچھے تعلقات بنانے کی کوشش مت کرو۔ ان آیات کا نزول اس وقت ہوا جب سردارانِ قریش کے نام حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا خط پکڑا گیا۔

﴿تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ﴾ ''تم ان کی طرف دوستی اور محبت کے پیغامات بھیجتے ہو''

﴿وَ قَدۡ کَفَرُوۡا بِمَا جَآءَکُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ﴾ ''حالانکہ انہوں نے انکار کیا ہے اُس حق کا جو تمہارے پاس آیا ہے۔''

﴿یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَ اِیَّاکُمۡ﴾ ''وہ رسولؐ کو اور تم لوگوں کو صرف اس بنا پر جلاوطن کرتے ہیں''

﴿اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ رَبِّکُمۡ ؕ﴾ ''کہ تم ایمان رکھتے ہو اللہ اپنے رب پر۔''

﴿اِنۡ کُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِهَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ٭ۖ﴾ ''اگر تم نکلے تھے میرے راستے میں جہاد کرنے اور میری رضا جوئی کے لیے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل اس کے منافی ہے)''

﴿تُسِرُّوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ ٭ۖ﴾ ''تم انہیں خفیہ پیغامات بھیجتے ہو محبت اور دوستی کے''

﴿وَ اَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَیۡتُمۡ وَ مَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ﴾ ''اور میں خوب جانتا ہوں جسے تم چھپاتے ہو اور جسے تم ظاہر کرتے ہو۔''

﴿وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡهُ مِنۡکُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ①﴾ ''اور جو کوئی بھی تم میں سے یہ کام کرے تو وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔''

یہ طویل آیت مدنی سورتوں کے عمومی مزاج کی ترجمانی کرتی ہے۔

آیت ۲ ﴿اِنۡ یَّثۡقَفُوۡکُمۡ یَکُوۡنُوۡا لَکُمۡ اَعۡدَآءً﴾ ''اگر وہ تمہیں کہیں پا لیں تو وہ تمہارے ساتھ دشمنی کریں گے''

﴿وَّ یَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡکُمۡ اَیۡدِیَهُمۡ وَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ﴾ ''اور تمہاری طرف بڑھائیں گے وہ اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برے ارادے کے ساتھ''

تم تو ان کی طرف دوستی کے پیغامات بھیج رہے ہو' لیکن اگر تم کہیں ان کے ہتھے چڑھ جاؤ تو وہ تمہارے ساتھ دشمنی کا ہر حربہ آزمائیں گے' تم پر دست درازی بھی کریں گے اور زبان درازی بھی' اور تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔

﴿وَ وَدُّوۡا لَوۡ تَکۡفُرُوۡنَ ②﴾ ''اور ان کی شدید خواہش ہوگی کہ تم بھی کافر ہو جاؤ۔''

آیت ۳ ﴿لَنۡ تَنۡفَعَکُمۡ اَرۡحَامُکُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ ۚ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚ﴾ ''تمہیں ہرگز نفع نہیں پہنچائیں گے

تمہارے رحمی رشتے اور نہ تمہاری اولادیں‘ قیامت کے دن۔“

﴿ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ ﴾ ”اللہ فیصلہ کر دے گا تمہارے مابین۔“

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ③﴾ ”اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔“

آیت ۴ ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ﴾ ”تمہارے لیے بہت اچھا نمونہ ہے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں (کے طرزِ عمل) میں۔“

﴿اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰۗؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ﴾ ”جب انہوں نے اپنی قوم سے برملا کہہ دیا کہ ہم بالکل بری ہیں تم سے اور ان سے جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا۔“

ہم تم سے بھی اور ان سے بھی اعلانِ براءت اور اظہارِ لاتعلقی کرتے ہیں۔

﴿كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاۗءُ اَبَدًا﴾ ”ہم تم سے منکر ہوئے‘ اور اب ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ہمیشہ کے لیے“

﴿حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ﴾ ”یہاں تک کہ تم بھی ایمان لے آ ؤ اللہ پر توحید کے ساتھ“

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اہل ایمان (رضی اللہ عنہم) اپنے کافر اعزہ و اقارب کے لیے ننگی تلوار بن گئے۔ یہاں یہ اہم نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ حزب اللہ والوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جدوجہد کرتے ہوئے اپنے رحمی رشتوں کو کاٹ پھینکنے کا مشکل مرحلہ بھی لازماً طے کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ المجادلہ کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے: ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۲۲) ”تم نہیں پاؤ گے ان لوگوں کو جو حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخرت پر کہ وہ محبت کرتے ہوں ان سے جو مخالفت پر کمربستہ ہیں اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی‘ خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے رشتے دار ہوں“۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے اہل ایمان ساتھیوں نے اپنی قوم‘ برادری اور رشتہ داروں سے نہ صرف اظہارِ لاتعلقی کیا بلکہ انہیں کھلم کھلا عداوت اور مخالفت کا چیلنج بھی دے دیا۔

﴿اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ﴾ ”سوائے ابراہیمؑ کے اپنے باپ سے یہ کہنے کے کہ میں آپ کے لیے ضرور استغفار کروں گا“

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد کے ساتھ اس گفتگو کا حوالہ ہے جس کی تفصیل سورۂ مریم میں آئی ہے۔ اس موقع پر باپ بیٹے کے درمیان جو آخری مکالمہ ہوا وہ یہ تھا: ﴿قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ㊻ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ㊼﴾ ”اُس نے کہا: اے ابراہیم! کیا تم کنارہ کشی کر رہے ہو میرے معبودوں سے؟ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا‘ اور تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ ایک مدت تک۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: آپ پر سلام! میں

اپنے رب سے آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا' وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے''۔آیت زیر مطالعہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسی وعدے کا حوالہ آیا ہے۔

﴿وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ''اور میں آپ کے بارے میں اللہ کے ہاں کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔''

میں آپ کے لیے دعا ضرور کروں گا' اللہ تعالیٰ دعا قبول کرے نہ کرے' وہ آپ کو معاف کرے نہ کرے' یہ اس کا اختیار ہے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ سورۂ مریم کی مذکورہ آیات ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور زیر مطالعہ آیت ۸ ہجری میں فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی۔ ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جس وعدے کا ذکر ہے اس سے متعلق آخری حکم سورۃ التوبہ کی اس آیت میں آیا ہے' جو ۹ ہجری میں ذیقعدہ کے بعد نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿١١٤﴾﴾ ''اور نہیں تھا استغفار کرنا ابراہیمؑ کا اپنے والد کے حق میں مگر ایک وعدے کی بنیاد پر جو انہوں نے اس سے کیا تھا' اور جب آپؑ پر واضح ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو آپؑ نے اس سے اعلانِ بیزاری کر دیا۔ یقیناً ابراہیمؑ بہت درد دل رکھنے والے اور حلیم الطبع انسان تھے''۔ چنانچہ سورۃ التوبہ کی یہ آیت جو ۹ ہجری میں ذیقعدہ کے بعد نازل ہوئی' محکم تصور ہوگی اور پہلی آیات اس کے تابع سمجھی جائیں گی۔

﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٤﴾﴾ ''پروردگار! ہم نے تجھ پر ہی توکل کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور ہمیں تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔''

آیت ۵ ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''پروردگار! تو ہمیں کافروں کے لیے تختۂ امتحان نہ بنا دینا''

اے ہمارے پروردگار! ایسا نہ ہو کہ تو کافروں کو ہمارے ذریعے سے آزمائے۔ ایسا نہ ہو کہ تو انہیں آزمانے کے لیے ہم پر ظلم کرنے کی چھوٹ دے دے۔ کسی کے لیے فتنہ یا تختۂ مشق بننے کے مفہوم کو حضور ﷺ کے مکی دور میں مسلمانوں اور مشرکین کی مثال سے سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مشرکینِ مکہ کی رسی دراز کر کے انہیں آزمانا چاہتا تھا کہ ٹھیک ہے تم میرے بندوں پر جتنا ظلم کر سکتے ہو کر لو! میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کس حد تک جاتے ہو! لیکن مشرکین کی اس آزمائش میں تختۂ ستم تو ظاہر ہے مسلمان بنے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے ایسی آزمائش سے بچانے کی درخواست کی گئی ہے۔

﴿وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٥﴾﴾ ''اور تو ہمیں بخش دے' اے ہمارے پروردگار! یقیناً تو ہی زبردست اور حکمت والا ہے۔''

آیت ۶ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ''تمہارے لیے یقیناً ان (کے طرزِ عمل) میں ایک بہت اچھا نمونہ ہے''

لیکن یہ نمونہ اور اُسوہ فائدہ مند کس کے لیے ہو سکتا ہے؟

﴿لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ﴾ ''اُس کے لیے جو اللہ تعالیٰ (سے ملاقات) اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہو۔''

بالکل یہی الفاظ سورۃ الاحزاب میں حضور ﷺ کے اُسوہ کے حوالے سے آئے ہیں: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾﴾ یعنی حضور ﷺ کی شخصیت اور سیرت یقیناً اُسوہ کاملہ ہے' لیکن اس سے مستفیض صرف وہی لوگ ہو سکیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہوں۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۶﴾﴾ ''اور جو کوئی منہ موڑ لے تو یقیناً اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔''

آیات ۷ تا ۹

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۞ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۞

آیت ۷ ﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ﴾ ''بعید نہیں کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے' دوستی پیدا کر دے۔''

ظاہر ہے اگر وہ بھی ایمان لے آئیں گے تو وہ تمہارے بھائی بن جائیں گے' جیسا کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱ میں فرمایا گیا: ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ﴾ ''پھر بھی اگر وہ توبہ کر لیں' نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں''۔ اور یہ مرحلہ کوئی زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ زیر مطالعہ آیات فتح مکہ سے قبل ۸ ہجری میں نازل ہوئیں اور اس سے اگلے ہی سال فتح مکہ کے بعد ۹ ہجری میں مشرکین عرب کو چار ماہ کا الٹی میٹم دے دیا گیا کہ یا ایمان لے آؤ' یا سب قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے نتیجے میں سب لوگ ایمان لا کر اسلامی بھائی چارے میں شامل ہو گئے۔ آیت زیر مطالعہ میں دوستی اور محبت کے اسی رشتے کی طرف اشارہ ہے جو ان کے درمیان ایک سال بعد بننے والا تھا۔

﴿وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷﴾﴾ ''اللہ ہر شے پر قادر ہے' اور اللہ بہت بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۸ ﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ

تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ ؕ﴾ ''اللہ تمہیں نہیں روکتا ان لوگوں سے جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے کبھی جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان کے ساتھ کوئی بھلائی کرو یا انصاف کا معاملہ کرو۔''

یعنی وہ غیر حربی کافر' جن کے ساتھ تمہاری جنگ نہیں ہے' تم لوگوں کو مکہ سے بے دخل کرنے میں بھی ان کا کوئی کردار نہیں اور نہ ہی انہوں نے تمہارے خلاف تمہارے دشمنوں کی کبھی مدد کی ہے' ایسے لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کا سلوک روا رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ دنیوی معاملات کے حوالے سے عدل وانصاف کے تمام تقاضے بھی پورے کرنے چاہئیں۔ البتہ ولایت کا رشتہ اور قلبی محبت کا تعلق ان کے ساتھ بھی قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۸﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

آیت ۹ ﴿اِنَّمَا يَنۡهٰٮكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ قَاتَلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَاَخۡرَجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ وَظٰهَرُوۡا عَلٰٓى اِخۡرَاجِكُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡهُمۡ ۚ﴾ ''وہ تو تمہیں منع کرتا ہے ان لوگوں سے جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں دوسروں کی مدد کی کہ تم ان کے ساتھ ولایت اور دوستی کا رشتہ قائم کرو۔''

﴿وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۹﴾ ''اور جو کوئی ان کے ساتھ دوستی کرے گا تو وہی لوگ ہیں جو ظالم ہیں۔''

اب اگلی آیات میں خواتین سے متعلق چند مسائل کا ذکر آ رہا ہے جو صلح حدیبیہ (۶ ہجری) کے نتیجے میں سامنے آئے تھے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ کر مدینہ آئے گا تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے' لیکن اگر مدینہ سے کوئی مسلمان اپنا دین چھوڑ کر واپس مکہ آ جائے گا تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے۔ اس معاہدے کے بعد چند مسلمان خواتین مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو قریش کی طرف سے مطالبہ آیا کہ انہیں واپس کیا جائے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ معاہدے کی متعلقہ شق مَردوں (رجال) سے متعلق ہے' اس میں عورتوں (نساء) کا ذکر نہیں ہے' اس لیے ان خواتین کو واپس نہیں کیا جائے گا۔ اس مثال کے بعد مکہ سے کچھ مزید خواتین بھی آنا شروع ہو گئیں تو ایسی مہاجر خواتین کے بارے میں تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خدشہ یہ تھا کہ ہجرت کے نام پر مشرک عورتیں جاسوسی وغیرہ کے لیے مکہ سے مدینہ آ کر آباد نہ ہو جائیں اور ان کی وجہ سے بعد میں مسلمان معاشرے میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ پھر ان میں کچھ ایسی شادی شدہ خواتین بھی تھیں جو اپنے مشرک شوہروں کو چھوڑ کر آ رہی تھیں۔ ان کے بارے میں بھی یہ سوال اپنی جگہ جواب کا متقاضی تھا کہ کیا وہ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی مشرک شوہروں کی زوجیت میں ہیں یا کہ آزاد ہو چکی ہیں؟ اور اسی معاملے سے متعلق یہ مسئلہ بھی اہم تھا کہ کسی ایسی عورت کے مدینہ آ جانے کے بعد کیا کوئی مسلمان اس سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ اگلی دو آیات میں ان مسائل سے متعلق ہدایات دی گئی

ہیں۔ جبکہ اس کے بعد ایک آیت میں مسلمان خواتین کی بیعت کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں ذکر تو مردوں کی بیعت (بیعت رضوان) کا بھی ہے، لیکن اس بیعت کے الفاظ کیا تھے، یا بیعتِ عُقبہ اولیٰ اور بیعتِ عُقبہ ثانیہ کا مضمون کیا تھا؟ یہ تفصیل ہمیں احادیث سے ملتی ہے، قرآن میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہاں خواتین کو مردوں پر ایک طرح سے فضیلت دی گئی ہے کہ آیت ۱۲ میں ان کی بیعت کے حکم کے ساتھ بیعت کا پورا متن بھی دے دیا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواتین کو یہ خصوصی انعام ان کے حقوق کے پلڑے کا توازن درست رکھنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ قوانین وضوابط اور حقوق وفرائض کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے متوازن ہیں۔ اگر کسی معاملے میں کوئی ایک حکم زیادہ سخت ہو تو اس کے پہلو میں کہیں کوئی نرم قانون بھی موجود ہوتا ہے۔ اگر کہیں کسی کے فرائض کا وزن زیادہ ہو رہا ہو تو اس کے حقوق کے پلڑے میں کچھ مزید ڈال کر اس کی میزان کو برابر کر دیا جاتا ہے۔ میاں بیوی کے حقوق وفرائض ہی کی مثال لے لیں۔ قرآن مجید نے طلاق کا حق صرف خاوند کو دیا ہے، اس کے مقابلے میں بیوی صرف خلع لے سکتی ہے، طلاق نہیں دے سکتی۔ اسی طرح اگر میاں بیوی میں طلاق ہو جائے تو اولاد قانوناً والد کی شمار ہوتی ہے۔ ان دو مثالوں سے خاوند کے حقوق یا اختیارات کا پلڑا غیر معمولی طور پر جھکتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن دوسری طرف دیکھیں تو اولاد کے لیے ماں کا حق باپ کے حق کے مقابلے میں تین گنا زیادہ رکھا گیا ہے اور جنت کی بشارت صرف ماں کے قدموں کے حوالے سے دی گئی ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنے قوانین وضوابط کو متوازن بناتے ہیں اور ہر کسی کے حقوق وفرائض کی ترازو کے ہر دو پلڑوں کو برابر رکھتے ہیں۔

آیات ۱۰، ۱۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝

آیت ۱۰ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ﴾ ”اے اہل ایمان! جب تمہارے پاس آئیں مؤمن خواتین ہجرت کر کے تو ان کا امتحان لے لیا کرو۔“

یعنی ہر خاتون سے ضروری حد تک جانچ پڑتال اور تحقیق و تفتیش کر لیا کرو کہ آیا واقعی وہ سچی اور مخلص مؤمنہ ہے۔

﴿اَللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِہِنَّ ۚ﴾ ''اللہ تو ان کے ایمان کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔''
کسی کے دل میں ایمان ہے یا نہیں' اور اگر ہے تو کتنا ایمان ہے' اس کا صحیح علم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ تم لوگ اپنے طور پر کسی کے ایمان کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے۔ لیکن محض ایک احتیاطی تدبیر کے طور پر مناسب طریقے سے کسی نہ کسی درجے میں ایک اندازہ لگانے کی کوشش ضرور کیا کرو کہ ہجرت کرنے والی خواتین کیا واقعی مؤمنات ہیں اور کیا واقعی وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہجرت کر کے مدینہ آئی ہیں۔

﴿فَاِنۡ عَلِمۡتُمُوۡہُنَّ مُؤۡمِنٰتٍ﴾ ''پھر اگر تم جان لو کہ وہ واقعی مؤمنات ہیں''

﴿فَلَا تَرۡجِعُوۡہُنَّ اِلَی الۡکُفَّارِ ؕ﴾ ''تو انہیں کفار کی طرف مت لوٹاؤ۔''

﴿لَا ہُنَّ حِلٌّ لَّہُمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحِلُّوۡنَ لَہُنَّ ؕ﴾ ''نہ اب یہ ان (کافروں) کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال ہیں۔''

﴿وَ اٰتُوۡہُمۡ مَّاۤ اَنۡفَقُوۡا ؕ﴾ ''اور ان (کافروں) کو ادا کر دو جو کچھ انہوں نے خرچ کیا تھا۔''
یعنی ان کے کافر شوہروں نے ان کو جو مہر دیے تھے وہ انہیں بھجوا دو۔ اگر کسی مشرک کی بیوی مسلمان ہو کر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئی ہے تو اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی' ان کے درمیان تعلقِ زوجیت ختم ہو چکا ہے' لیکن عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی وہ رقم جو وہ شخص اس خاتون کو اپنی بیوی کی حیثیت سے ادا کر چکا ہے وہ اسے لوٹا دی جائے۔ اس حکم سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام بلاتفریق مذہب وملت کسی حق دار کا حق اس تک پہنچانے کے معاملے کو کس قدر سنجیدگی سے لیتا ہے۔ اور یہ سنجیدگی یا تاکید صرف قانون سازی کی حد تک ہی نہیں بلکہ حضور ﷺ نے قرآنی قوانین واحکام کے عین مطابق ایسا نظامِ عدل وقسط بالفعل قائم کر کے بھی دکھا دیا جس میں حق دار کو تلاش کر کے اس کا حق اس تک پہنچایا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں شام کے محاذ پر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سپہ سالار تھے۔ انہوں نے رومیوں کے خلاف یرموک کے میدان میں صدی کی سب سے بڑی جنگ لڑی۔ جنگ یرموک کی تیاری کے دوران ایک ایسا مرحلہ بھی آیا جب مسلمانوں کو جنگی حکمت عملی کے تحت کچھ مفتوحہ علاقوں کو خالی کر کے پیچھے ہٹنا پڑا۔ ان علاقوں کی عیسائی رعایا سے مسلمان جزیہ وصول کر چکے تھے۔ جزیہ ایک ایسا ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم شہریوں سے ان کے جان ومال کی حفاظت کی ذمہ داری کے عوض وصول کرتی ہے۔ اسی لیے یہ ٹیکس ادا کرنے والے شہری ذِمّی کہلاتے ہیں۔ بہرحال مذکورہ علاقوں سے مسلمان وقتی طور پر چونکہ واپس جا رہے تھے اور اپنی غیر مسلم رعایا کے جان ومال کی حفاظت کی ذمہ داری نبھانے سے قاصر تھے' اس لیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حکم پر جزیہ کی تمام رقم متعلقہ افراد کو واپس کر دی گئی۔ مسلمانوں کے اس عمل نے عیسائیوں کو اس قدر متاثر کیا کہ ان کے واپس جانے پر وہ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ یہ ہے اس دین کے نظامِ عدل وقسط کے تحت حق دار کو اس کا حق پہنچانے کی ایک مثال' جس کے ماننے والوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کے مہر کی رقوم ان کے مشرک شوہروں کو لوٹا دیں۔

﴿وَ لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اَنۡ تَنۡکِحُوۡہُنَّ اِذَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ ؕ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) تم پر

کوئی گناہ نہیں اگر تم ان خواتین سے نکاح کر لو جبکہ تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو۔''

﴿وَلَا تُمۡسِكُوۡا بِعِصَمِ الۡكَوَافِرِ﴾ ''اور تم کافر خواتین کی ناموس کو اپنے قبضے میں نہ رکھو''

یعنی اگر تم میں سے کچھ لوگوں کی بیویاں ایمان نہیں لائیں اور ابھی تک مکہ ہی میں ہیں تو تم ان کو اپنے نکاح میں روکے نہ رکھو' بلکہ انہیں طلاق دے دو اور انہیں بتا دو کہ اب تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

﴿وَاسۡئَلُوۡا مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ وَلۡيَسۡئَلُوۡا مَاۤ اَنۡفَقُوۡا﴾ ''اور تم مانگ لو وہ مال جو تم نے (بطورِ مہر) خرچ کیا ہے' اور وہ (کافر) بھی مانگ لیں جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہے۔''

یعنی جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیے تھے وہ تم واپس مانگ لو' اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں۔

﴿ذٰلِكُمۡ حُكۡمُ اللّٰهِ ؕ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ ؕ﴾ ''یہ اللہ کا حکم ہے' وہ تمہارے مابین فیصلہ کر رہا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ⑩﴾ ''اور اللہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے۔''

آیت ۱۱ ﴿وَاِنۡ فَاتَكُمۡ شَىۡءٌ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ اِلَى الۡكُفَّارِ﴾ ''اور اگر تمہاری بیویوں (کے مہر میں) سے کچھ کفار کی طرف رہ جائے''

اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ ایک مسلمان مرد ہجرت کر کے مدینہ آ گیا اور اس کی مشرکہ بیوی مکہ میں ہی رہ گئی۔ بعد میں اس مسلمان نے اس خاتون کو پیغام بھجوایا کہ میرا تمہارا تعلق زوجیت ختم ہو چکا ہے لہٰذا تم مہر کی رقم مجھے لوٹا دو۔ اب اگر اس عورت نے مہر کی رقم واپس نہیں کی تو اس مسئلے کا حل بتایا جا رہا ہے کہ ایسی صورت میں تمہیں کیا کرنا ہے۔

﴿فَعَاقَبۡتُمۡ فَاٰتُوا الَّذِيۡنَ ذَهَبَتۡ اَزۡوَاجُهُمۡ مِّثۡلَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا ؕ﴾ ''تو جب تمہیں موقع ہاتھ آ جائے تو جن لوگوں کی بیویاں جاتی رہی ہیں انہیں اتنی رقم ادا کر دو جتنی انہوں نے خرچ کی ہے۔''

اگر کسی جنگ سے تمہیں کچھ مالِ غنیمت ملے تو اس میں سے ان لوگوں کو تلافی کے طور پر کچھ مال دے دو جن کی بیویاں ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان کی زوجیت میں نہیں رہیں اور وہ انہیں مہر کی رقوم بھی لوٹانے کو تیار نہیں' تاکہ اس رقم سے مہر ادا کر کے وہ لوگ مکہ سے ہجرت کر کے آنے والی ان خواتین سے نکاح کر سکیں جن کے مشرک خاوند مکہ میں رہ گئے ہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡۤ اَنۡتُمۡ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ⑪﴾ ''اور اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس پر تمہارا ایمان ہے۔''

آیات ۱۲' ۱۳

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا جَآءَكَ الۡمُؤۡمِنٰتُ يُبَايِعۡنَكَ عَلٰٓى اَنۡ لَّا يُشۡرِكۡنَ بِاللّٰهِ شَيۡـًٔا وَّلَا يَسۡرِقۡنَ
وَلَا يَزۡنِيۡنَ وَلَا يَقۡتُلۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ وَلَا يَاۡتِيۡنَ بِبُهۡتَانٍ يَّفۡتَرِيۡنَهٗ بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِنَّ وَاَرۡجُلِهِنَّ

وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑫ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَىِٕسَ الْكُفَّارُ
مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ⑬ ع ۸

آیت ۱۲ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ﴾ ''اے نبی (ﷺ) جب آپ کے پاس آئیں مؤمن خواتین آپ سے بیعت کرنے کے لیے''

اب آگے بیعت کا وہ متن دیا گیا ہے جس کا ذکر سطور بالا میں ہوا تھا:

﴿عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ ''اس بات پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی''

﴿وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ ''اور نہ چوری کریں گی' نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی''

﴿وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ﴾ ''اور نہ وہ کوئی بہتان باندھیں گی جو ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے مابین سے ہو''

یعنی یہ کہ وہ کسی پر زنا کی تہمت نہیں لگائیں گی' کوئی جنسی سکینڈل نہیں گھڑیں گی۔ اس تہمت کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی عورت کسی مرد پر الزام لگا دے کہ اُس نے اس کی آبرو ریزی کی ہے۔ ایسے الزامات انبیاء کرام ﷩ پر بھی لگتے رہے ہیں۔ اس بیعت کی آخری شق یہ ہے کہ:

﴿وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ﴾ ''اور وہ آپؐ کی نافرمانی نہیں کریں گی معروف میں''

﴿فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑫﴾ ''تو (اے نبی ﷺ) آپ ان سے بیعت لے لیں اور ان کے لیے استغفار کریں۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

احادیث میں بیعت عقبہ اولیٰ کا جو مضمون ملتا ہے وہ بھی خواتین کی اس بیعت کے مضمون سے ملتا جلتا ہے' اسی لیے بیعت عقبہ اولیٰ کو ''بیعت النساء'' بھی کہا جاتا ہے۔ بیعتِ عُقبہ اولیٰ کے زمانے تک اہلِ ایمان چونکہ ایک باقاعدہ جماعت کی شکل میں منظم نہیں ہوئے تھے اس لیے اس بیعت کے مضمون میں جماعتی نظم وضبط سے متعلق کوئی شق موجود نہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں صوفیاء اپنے عقیدت مندوں سے جو 'بیعتِ ارشاد' لیتے ہیں اس کا مضمون بھی تقریباً انہی نکات پر مشتمل ہوتا ہے کہ میں شرک نہیں کروں گا' چوری نہیں کروں گا' بدکاری نہیں کروں گا' وغیرہ۔ گویا بیعتِ عقبہ اولیٰ' بیعتِ خواتین اور بیعتِ ارشاد تینوں کا مضمون تقریباً ایک ہی ہے۔ البتہ وہ بیعت جس کی بنیاد پر مسلمان باقاعدہ ایک جماعت کے طور پر منظم ہوئے وہ بیعتِ عقبہ ثانیہ ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت ﷜ کی روایت کردہ ایک متفق علیہ حدیث میں اس بیعت کے مضمون کا پورا متن موجود ہے۔ حضرت عبادہؓ بن صامت روایت کرتے ہیں: (بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ) کہ ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول ﷺ سے (عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ) اس بات پر کہ ہم آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے (فِي الْعُسْرِ) تنگی

اورمشکل میں بھی (وَالْيُسْرِ) اور آسانی میں بھی (وَالْمَنْشَطِ) اس حالت میں بھی کہ ہماری طبیعتوں میں انشراح ہو کہ ہاں یہ کام واقعی بہت مفید ہے اور درست ہے (وَالْمَكْرَهِ) اور اس حالت میں بھی کہ ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے۔ یعنی ہمیں کسی فیصلے سے اتفاق نہ ہو تب بھی ہم آپ کا فیصلہ مانیں گے۔ (وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا) اور اس کے باوجود کہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دی جائے۔ یعنی ہمارے مقابلے میں اگر کسی نو وارد کو بھی امیر بنادیا جائے گا تب بھی ہم اعتراض نہیں کریں گے۔ (وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ) اور جنہیں آپؐ ذمہ دار یا امیر بنائیں گے ان سے ہم جھگڑا نہیں کریں گے' بلکہ ان کا ہر حکم مانیں گے☆۔ (وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا) اور یہ کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں گے (لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ)(۱) اور ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کے خوف سے اپنی زبان بند نہیں کریں گے۔

بیعت عقبہ ثانی کے اس مضمون کو ہم نے صرف ایک فقرے کے اضافے کے ساتھ تنظیم اسلامی کی بیعت کے لیے اختیار کیا ہے اور وہ اضافی فقرہ یہ ہے: اُبَايِعُ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَعْرُوْفِ کہ میں بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہر وہ حکم سنوں گا اور مانوں گا جو شریعت کے دائرے سے باہر نہ ہو! آج ایسی کسی بھی بیعت کے لیے اس فقرے کا اضافہ اس لیے ضروری ہے کہ حضور ﷺ کی اطاعت تو مطلق تھی' آپؐ کا تو ہر حکم ہی معروف کے دائرے میں تھا' لیکن آپؐ کے بعد کسی بھی شخصیت کی مطلق اطاعت پر بیعت کرنا درست نہیں۔ اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی خلیفہ بننے پر صحابہ کرامؓ سے جو بیعت لی وہ بھی مشروط تھی۔ یعنی آپؓ کی بیعت کرنے والا ہر شخص آپؓ کا صرف وہی حکم ماننے کا پابند تھا جو قرآن وسنت کے دائرے کے اندر ہو۔

بیعتِ عقبہ ثانیہ کے مذکورہ مضمون کا تعلق ایک جماعت اور تنظیم کے نظم ونسق سے ہے۔ چنانچہ اسی بیعت کی بنیاد پر حضور ﷺ نے ایک مضبوط جماعت منظم فرمائی اور مدینہ منورہ میں بارہ نقیب (نو قبیلہ خزرج اور تین قبیلہ اوس سے) مقرر فرما کر اہلِ ایمان کی جماعت کے ذیلی تنظیمی ڈھانچے کی بنیاد بھی رکھ دی۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی اور تمام اہلِ ایمان مکہ کی حدود میں ہی رہتے تھے۔ مکہ ایک چھوٹا سا شہر تھا اور اہلِ ایمان کے امیر یا سربراہ کی حیثیت سے حضور ﷺ خود شہر میں موجود تھے۔ اس لیے کوئی نقیب یا ذیلی امیر مقرر

☆ اطاعت اُمراء کے حوالے سے حضور ﷺ کا یہ فرمان بہت اہم ہے:

((مَنْ اَطَاعَنِيْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِيْ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ، وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِيْ فَقَدْ عَصَانِيْ))

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اُس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اُس نے گویا میری نافرمانی کی''۔ (صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب یقاتل من وراء الامام ویتقی به۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة……)

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس' وکتاب الفتن' باب قول النبی ﷺ سترون بعدی امورا تنکرونها۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة……

کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب مسلمان مکہ سے دور مدینہ میں بھی موجود تھے اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا تھا اس لیے وہاں حضورﷺ نے الگ تنظیمی ڈھانچہ تشکیل فرمایا۔

جماعتی زندگی میں عملی جدوجہد کے دوران چونکہ جہاد و قتال کے مراحل بھی آتے ہیں اور ایسے مراحل میں خواتین بالواسطہ طور پر ہی حصہ لیتی ہیں' اس لیے حضرت عبادہؓ بن صامت کے روایت کردہ متن کے مطابق خواتین سے بیعت جہاد نہیں لی گئی' بلکہ ان سے آیت زیر مطالعہ کے مضمون کے مطابق ہی بیعت لی گئی کہ وہ فلاں فلاں افعال نہیں کریں گی اور حضورﷺ جو بھی بھلائی کا حکم دیں گے اس کی نافرمانی نہیں کریں گی۔

ہمارے ہاں تنظیم اسلامی میں بھی خواتین سے بیعت کے لیے بعینہٖ یہی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو اس آیت میں آئے ہیں۔ دراصل خواتین کی بیعت سے مقصود یہ نہیں کہ وہ بھی غلبۂ دین کی جدوجہد میں مَردوں کی طرح عملی کردار ادا کریں یا جہاد و قتال میں حصہ لیں' بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جماعتی زندگی کے ساتھ تعلق کی بنا پر ﴿کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ کے حکم کی مصداق بن کر جماعتی زندگی کے فیوض و برکات سے وہ بھی بہرور ہوتی رہیں اور جماعتی زندگی کے لزوم سے متعلق احکامات پر بھی ان کا عمل ہوتا رہے۔ لزومِ جماعت کے حوالے سے حضورﷺ کی درج ذیل احادیث بہت قطعی اور واضح ہیں:

(۱) ((عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ، وَاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَةَ، فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ، وَھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ))(۱)

''تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے' اور تم تنہا مت رہو' اس لیے کہ اکیلے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے' لیکن اگر دو (مسلمان) ایک ساتھ رہیں تو وہ دُور ہو جاتا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے فرمایا:

(۲) ((یَدُ اللّٰہِ مَعَ الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ شَذَّ شَذَّ اِلَی النَّارِ))(۲)

''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے' اور جو شخص خود کو جماعت سے کاٹ لیتا ہے وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔''

جماعتی زندگی کی اہمیت اور ''جماعت'' کے ڈسپلن سے متعلق حضرت عمرؓ کا یہ فرمان بھی بہت واضح ہے:

اِنَّہٗ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ (۳)

''یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نہیں ہے بغیر جماعت کے' اور کوئی جماعت نہیں ہے بغیر امارت کے' اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت نہ ہو۔''

بہرحال جماعت سازی کا مسنون' منصوص اور ماثور طریقہ بیعت کا طریقہ ہی ہے' لیکن آج کل اکثر دینی جماعتوں نے یہ مسنون طریقہ ترک کر کے دوسرے طریقے اپنا لیے ہیں۔ اگرچہ رائج الوقت سب طریقے بھی مباح ہیں' لیکن ظاہر ہے مباح اور سنت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے ہم نے تنظیم اسلامی کی اساس بیعت کے نظام پر رکھی ہے۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے ہمیں اس اہم سنت کو زندہ کرنے

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ما جاء فی لزوم الجماعة۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ما جاء فی لزوم الجماعة۔

(۳) سنن الدارمی' المقدمة' باب فی ذھاب العلم۔

کی توفیق عطا فرمائی جو آج کل جماعت سازی کے حوالے سے بالکل متروک ہو چکی تھی۔

آیت ۱۳ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! ان لوگوں کے ساتھ دوستی مت کرو جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا ہے''

نوٹ کیجیے' جس مضمون سے سورت کا آغاز ہوا تھا اختتام پر وہی مضمون دوبارہ آ گیا ہے۔ قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ سے یہودی مراد ہیں اور یہاں اہل ایمان کو واضح طور پر منع کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ تمہاری دوستی نہیں ہونی چاہیے۔

﴿قَدْ یَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا یَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ۝۱۳﴾ ''یہ لوگ آخرت سے مایوس ہو چکے ہیں جیسے کہ کفار مایوس ہو چکے ہیں اصحابِ قبور میں سے۔''

آیت کے اس حصے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے قبروں میں پڑے ہوئے کفار اپنی نجات سے مایوس ہیں۔ ظاہر ہے مرنے کے بعد کفار پر تمام حقائق منکشف ہو چکے ہیں اور ان حقائق کو دیکھتے ہوئے انہیں سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ دوسرا مفہوم یوں ہے کہ یہ لوگ آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے کفار اصحاب القبور کے دوبارہ اٹھنے سے مایوس ہیں۔ یہ دونوں مفاہیم اپنی اپنی جگہ درست ہیں' اس لیے اس فقرے کے تراجم دونوں طرح سے کیے گئے ہیں۔

آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے بھی تو وہ ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' کے مصداق پہلے سے بڑے ظالم کے پنجے میں جا پھنسے۔ گویا کھجور سے گر کر کسی گہری کھائی میں جا گرے۔ فرانس میں بھوکوں مرتے مظلوم مزدوروں اور کسانوں نے بادشاہوں کی لوٹ کھسوٹ اور عیاشیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور جانوں کی قربانیاں دیں تو اس کا نتیجہ انقلابِ فرانس کی صورت میں سامنے آیا۔ اَن گنت قربانیوں اور خوفناک خونریزی کے نتیجے میں نظام تو بدل گیا لیکن عوام الناس کی مصیبتوں اور محرومیوں کا ازالہ نہ ہو سکا۔ کہنے کو تو بادشاہت کی جگہ عوام الناس کی اپنی حکومت (جمہوریت) نے لے لی' لیکن حقیقت میں وہ سرمایہ داروں کی آمریت ہی کا ایک بہروپ تھا۔ چنانچہ ظالمانہ ٹیکسوں کا سلسلہ جمہوری حکومت کے تحت بھی حسبِ سابق جاری رہا اور مزدور کو اس کی محنت کا منصفانہ معاوضہ ملنے کا خواب اس کی ''اپنی حکومت'' میں بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ البتہ اتنا فرق ضرور پڑا کہ پہلے اس کی خون پسینے کی کمائی پر بادشاہ اور شہزادے عیش کرتے تھے' اب ان کی جگہ کارخانہ دار اور سرمایہ دار اس کا خون نچوڑ نچوڑ کر اپنی شام کی محفلوں کو رنگین کرنے لگے۔ علامہ اقبال نے اس تلخ حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: ع ''خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب'' کہ سرمایہ دار مزدوروں کی رگوں سے خون نچوڑ کر اپنے لیے سرخ شراب تیار کرتے ہیں۔ دوسری طرف انقلابِ روس کا نتیجہ بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ وہاں کے عوام بھی زار کے آہنی شکنجے سے نکل کر یک جماعتی آمریت (one party dictatorship) کے سنہری پنجرے میں آ پھنسے۔ غرض آقا بدلتے رہے' نظاموں کے نام بدلتے رہے' لیکن نہ بدلی تو مزدور کی قسمت نہ بدلی۔ اس طبقے کی محرومیاں جیسی کل تھیں ویسی ہی آج بھی ہیں۔ کل مزدور کے بچے تختِ شاہی کے سائے تلے بھوکے سوتے تھے اور آج مزدور کے بچے شجرِ جمہوریت کی چھاؤں میں بیٹھ کر روٹی کو ترستے ہیں۔

دراصل یہ مسئلہ کسی ایک طبقے کا مسئلہ نہیں اور نہ ہی یہ کسی ایک ملک کے مزدوروں اور کسانوں کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی انصاف کا شفاف نظام پوری دنیا کی ضرورت ہے جس کی تلاش میں نسلِ انسانی صدیوں سے دربدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اُس نے دنیا میں جتنے بھی رسول بھیجے ان سب کا مشن یہی تھا کہ انسانیت کو عدل و قسط کے شفاف نظام کے ثمرات سے بہرہ ور کیا جائے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں فلسفۂ انقلاب عریاں ترین صورت میں موجود ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (الحدید:۲۵)

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔''

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ وہ قسط (عدل) کو قائم کرنے والا ﴿قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ؕ﴾ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بحیثیت اُمت اس دنیا میں جو کردار ادا کرنے کا فریضہ سونپا وہ بھی بنیادی طور پر یہی ہے کہ وہ یہاں عدل و انصاف قائم کریں: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵) ''اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''۔ سورۃ المائدۃ میں یہی حکم الفاظ کی دوسری ترتیب کے ساتھ اس

طرح آیا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدۃ:۸) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ!''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ مشن کے ساتھ انبیاء و رسلؑ تو پے در پے آتے رہے اور نسل انسانی تک اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی پہنچاتے رہے' لیکن اس کے باوجود لوگ بار بار گمراہ ہوتے رہے۔ کسی قوم نے جوشِ عقیدت میں اپنے پیغمبر کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیا تو کسی نے اپنے پیغمبر کی باقاعدہ پوجا شروع کر دی' لیکن معاشرے کے اجتماعی نظام کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کسی نے نہ کی' تاوقتیکہ اجتماعی عدل وقسط کے قیام کا یہ مشن نبی آخرالزماں ﷺ کو سونپا گیا۔ چنانچہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں ''رسالت'' کے جس مشن کا ذکر جمع کے صیغے (لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا) میں آیا ہے' حضور ﷺ کے حوالے سے سورۃ الصف کی اس آیت میں اس کے لیے واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹)

''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر۔''

بہرحال پوری انسانی تاریخ میں یہ اعزاز صرف اللہ کے آخری رسول حضرت **محمد** عربی ﷺ کو حاصل ہوا کہ آپ ﷺ نے عرب معاشرے سے ظالمانہ نظام کی بیخ کنی کر کے اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظامِ عدل وقسط بالفعل قائم کر دیا۔ گویا آپ ﷺ نے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے اس مشن کی تکمیل فرما دی جس کا ذکر سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں آیا ہے اور اسی لیے آپؐ رسولِ کامل ہیں۔ حضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد پوری دنیا کے حوالے سے نظامِ عدل وقسط کے قیام کا یہ مشن اب آپؐ کی اُمت کو منتقل ہو چکا ہے' جس کے لیے اُمت کو منظم اور مسلسل جدوجہد کرنی ہے۔

سورۃ الصف اپنے موضوع کے اعتبار سے اس قدر جامع اور پُرتاثیر سورت ہے کہ اگر کسی بندۂ مسلمان کو یہ ایک سورت بھی سمجھ میں آ جائے تو اس کے لیے زندگی کا راستہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ البتہ جہاد وقتال کے حوالے سے اس سورت کے احکام پر عمل کرنے کے لیے اُسوۂ رسولؐ اور منہج نبویؐ کا اتباع ضروری ہے۔ اگر کوئی جماعت منہج نبویؐ کی ترتیب کو پیش نظر رکھے بغیر جوشِ جہاد میں ہتھیار اٹھا کر میدان میں کود پڑے گی تو اس کا یہ عمل خودکشی کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ منہج نبویؐ سے راہنمائی لیتے ہوئے اس کٹھن راستے پر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مرحلہ وار آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ پہلے مرحلے میں دعوت وتبلیغ کے ذریعے ''مردانِ کار'' کو جمع کرنا ہوگا۔ ایسے مردانِ کار جو اللہ کی محبت کے مقابلے میں دُنیوی محبتوں کو تج کر کے واقعتاً آخرت کے طالب بن چکے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ایک ایک لفظ ان کی روحوں کی گہرائیوں میں جذب ہو چکا ہو: ﴿فَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٣٦﴾﴾ (الشوریٰ) ''پس جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا ہی کی زندگی کا ساز وسامان ہے' اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور

باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں''۔ پھر ان مردانِ کار کا تربیت کے ضروری مراحل سے گزرنا اور اپنے لیڈر کے ساتھ سمع و طاعت کے سخت ڈسپلن کے تحت مربوط ہونا بھی ضروری ہے۔ بہرحال جب مذکورہ صفات کے حامل افراد اچھی خاصی تعداد میں اکٹھے ہو جائیں اور تربیت و تنظیم کے ضروری مراحل بھی طے کر چکیں تب ان کے امیر یا لیڈر کو حالات و ماحول کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اقدام کے مرحلے میں داخل ہونے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

مختصراً یوں سمجھیں کہ منہج انقلابِ نبویؐ کے بنیادی مراحل دو ہیں‘ یعنی تیاری کا مرحلہ اور تصادم یا ٹکراؤ کا مرحلہ۔ میں نے اپنی کتاب ''منہج انقلابِ نبویؐ'' میں پہلے مرحلے کو منہج انقلابِ نبویؐ کا ''اساسی منہاج'' جبکہ دوسرے مرحلے کو ''تکمیلی منہاج'' کا نام دیا ہے اور ظاہر ہے اس پورے منہاج کا مرکز و محور تو قرآن ہی ہے۔ علامہ اقبال نے انقلابِ اسلامی کے ان دو مراحل کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے: ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن   چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

جبکہ اکبر الٰہ آبادی نے ان دو مراحل کی ترتیب کا فلسفہ بڑی سادگی اور خوبصورتی سے ان دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے: ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے   نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

گویا بدر کے میدان میں اہل ایمان نے جو کامیاب معرکہ لڑا اس کی تیاری کا آغاز بہت پہلے غارِ حرا کی تنہائیوں میں فردِ واحد کی سوچ بچار سے ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے مکہ کی گلیوں میں دعوت و تبلیغ کی صبر آزما مہم تن تنہا شروع کی۔ پھر اس دعوت پر لبیک کہنے والے ''مردانِ کار'' نے آپ ﷺ کی نگرانی و راہنمائی میں ۱۴ سال تک تزکیہ و تعلیم‘ ذہنی و نفسیاتی تربیت‘ سخت سے سخت جسمانی تشدد کی برداشت‘ ہر صورت میں ہاتھ بندھے رکھنے کی مشق اور ایسے کئی جاں گداز مراحل کامیابی سے طے کیے تو تب کہیں جا کر وہ تصادم کے مرحلے میں قدم رکھنے اور بدر و حنین جیسے معرکے سر کرنے کے قابل ہوئے۔ آج ہمیں بھی غلبہ دین کی جدوجہد کے دوران حضور ﷺ کے اسی منہج کی پیروی کا اہتمام کرنا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

آیات ۱ تا ۴

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۝

آیت ۱ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ①﴾ ''تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے‘ اور وہ بہت زبردست ہے‘ کمال حکمت والا۔''

آیت ٢ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴿۲﴾﴾ ''اے مسلمانو! تم کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟''

اس آیت میں زجر وتوبیخ اور جھنجھوڑنے کا وہی انداز پایا جاتا ہے جو اس سے قبل ہم سورۃ الحدید میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ بلکہ یہ اسلوب زیر مطالعہ مدنی سورتوں میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ قبل ازیں سورۃ الحدید کے تمہیدی کلمات میں اس اسلوب کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ ان سورتوں کے زمانہ نزول (۵ ہجری کے بعد) تک پرانے مسلمانوں کی نسبت نومسلموں کی تعداد زیادہ ہو چکی تھی۔ ایمان کی گہرائی اور جذبہ ایثار وقربانی کے حوالے سے نووارد مسلمانوں کی کیفیت چونکہ ''السابقون الاوّلون'' اور ابتدائی دور کے اہل ایمان کی سی نہیں تھی' اس لیے مسلمانوں کے ایمان وعمل کے اجتماعی معیار کے اوسط میں قدرے کمی واقع ہوئی تھی اور اسی وجہ سے انہیں اس انداز میں جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ لیکن قرآن مجید چونکہ ہر زمانے کے لوگوں سے مخاطب ہے' اس لیے اس آیت کو پڑھتے ہوئے یوں سمجھیں کہ آج یہ ہم سے سوال کر رہی ہے کہ اے ایمان کے دعوے دارو! تم کیسے مسلمان ہو؟ تمہارے قول وفعل میں اتنا تضاد کیوں ہے؟ تم اللہ پر ایمان کا اقرار بھی کرتے ہو اور دن رات اُس کے احکام کو پاؤں تلے روندتے بھی رہتے ہو! تم رسول اللہ ﷺ کی ذات سے عشق ومحبت کے دعوے بھی کرتے ہو لیکن جب عمل کے میدان میں آتے ہو تو آپؐ کی سنتوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہو! ذرا تصور کیجیے! آج اگر اللہ کا کلام نازل ہو تو ہمارے ایمان' ہمارے کردار اور ہمارے عمل پر کیا کیا تبصرہ کرے! اور اگر آج حضور ﷺ خود تشریف لا کر اپنی اُمت کی حالت دیکھ لیں تو کیسا محسوس کریں!

آیت ٣ ﴿کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴿۳﴾﴾ ''بڑی شدید بیزاری کی بات ہے اللہ کے نزدیک کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔''

یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اس سے بڑی ڈانٹ اور گرفت اور بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن اس ڈانٹ اور اظہارِ بیزاری کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا اور محبت کا معیار بھی بتا دیا ہے کہ اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کو کیسے لوگ پسند ہیں اور یہ کہ وہ کیسے لوگوں سے محبت کرتا ہے تو سنو!

آیت ٤ ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴿۴﴾﴾ ''اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں' جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں۔''

آج کے زمانے میں ''بنیانِ مرصوص'' reinforced concrete wall کو کہا جائے گا۔ ایسی دیواریں بڑے بڑے dams کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ البتہ پرانے زمانے میں اگر کسی دیوار کو غیر معمولی طور پر مضبوط کرنا مقصود ہوتا تو چنائی کرنے کے بعد اس کے اندر پگھلا ہوا تانبا ڈالا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں عام طور پر ''بنیانِ مرصوص'' کا ترجمہ ''سیسہ پلائی ہوئی دیوار'' کے الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس طریقے سے ''سیسہ پلائی ہوئی دیوار'' بنانے کا تصور سورۃ الکہف کی آیت ۹۶ میں بھی ملتا ہے۔ ذوالقرنین بادشاہ نے یاجوج ماجوج کے حملوں سے حفاظت کے لیے لوہے کے تختوں کی مدد سے دیوار کھڑی کرنے کے بعد حکم دیا

تھا: ﴿ اٰتُوۡنِیۡۤ اُفۡرِغۡ عَلَیۡہِ قِطۡرًا ﴿۹۶﴾ ﴾ ''اب لاؤ میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دوں''۔ بہرحال یہاں ''بُنیانٌ مرصوص'' سے مراد میدانِ جنگ میں مجاہدین کی ایسی صفیں ہیں جن میں کوئی رخنہ یا خلا نہ ہو اور ایک ایک مجاہد اپنی جگہ پر اس قدر مضبوطی سے کھڑا ہو کہ دشمن کے لیے صف کے کسی ایک حصے کو بھی دھکیلنا ممکن نہ ہو۔

یہاں ضمنی طور پر یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ نماز کے لیے ہماری صف بندی کی بھی یہی کیفیت ہونی چاہیے۔ ایک صف کے تمام نمازیوں کو کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونا چاہیے اور ان کے پیروں کے محاذات بھی ایک ہونے چاہئیں، یعنی تمام لوگوں کے پاؤں ایک سیدھ میں ہوں تاکہ صف سیدھی رہے۔ دو آدمیوں کے درمیان خلا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جماعت کی صف میں دو نمازیوں کے درمیان خلا کی جگہ سے شیطان گزر جاتا ہے۔ جماعت کے لیے صف بندی کا اہتمام کرانا دراصل امام کی ذمہ داری ہے، لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ائمہ مساجد اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتے۔ البتہ اس ضمن میں ضرورت سے زیادہ شدت بھی مناسب نہیں، جیسے بعض لوگ غیر معمولی طور پر ٹانگیں پھیلا کر دوسرے نمازی کے پاؤں پر اپنا پاؤں چڑھا دیتے ہیں اور دوسروں کے لیے کوفت کا باعث بنتے ہیں۔

بہرحال ہمارے لیے اس آیت کا اصل پیغام یہ ہے کہ اسلام میں سب سے بڑی نیکی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل ''قتال فی سبیل اللہ'' ہے۔ فلسفے کی اصطلاح میں سب سے اعلیٰ خیر یا نیکی کو summum bonum کہتے ہیں۔ ہر فلسفہ اخلاق میں ایک ''خیر اعلیٰ'' (summum bonum) یا بلند ترین نیکی (highest virtue) کا تصور ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے اصل پیغام کو اگر فلسفہ کی زبان میں بیان کریں تو یوں کہیں گے کہ اسلام کے نظامِ فکر اور اس کے نظریۂ اخلاق میں بلند ترین نیکی یا ''خیر اعلیٰ'' (summum bonum) قتال فی سبیل اللہ ہے۔ چنانچہ جو کوئی اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہو اُسے اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی اپنی جان اس کی راہ میں قربانی کے لیے پیش کرنا ہوگی۔ جو شخص اس قربانی کے لیے تیار نہ ہو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت و قربت کا دعویٰ بھی نہ کرے۔ بقول غالبؔ ع ''جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!''

یہاں سورت کے پہلے حصے کا مطالعہ مکمل ہو گیا۔ اب آئندہ چار آیات میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبروں کے ساتھ ان کا طرزِ عمل کیا تھا۔ یہود کی تاریخ کے حوالے سے دراصل مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ قول و عمل کا تضاد اور ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی سے پہلوتہی ہی وہ اصل جرم تھا جس کی پاداش میں یہود اس مقام اور منصب سے معزول کر دیے گئے جس پر اب تم فائز کیے گئے ہو۔

آیات ۵ تا ۸

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ لِمَ تُؤۡذُوۡنَنِیۡ وَقَدۡ تَّعۡلَمُوۡنَ اَنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ ؕ فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۵﴾ وَاِذۡ قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ وَمُبَشِّرًۢا

بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۶
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ
الْكٰفِرُوْنَ ۝۸

آیت ۵ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ﴾ ''اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم کے لوگو! تم کیوں مجھے ایذا دے رہے ہو؟''

یہ جس ایذا کا ذکر ہے وہ ذاتی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے انبیاء و رسل بھی آخر انسان تھے اور طبع بشری کے تحت ہر طرح کی تکلیف کو محسوس بھی کرتے تھے۔ جیسے سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۹ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک تکلیف دہ معاملے کا ذکر آیا ہے یا جیسے خود حضور ﷺ کو مشرکین مکہ کی طرف سے بھی ذاتی نوعیت کی تکالیف پہنچائی جاتی رہیں اور منافقین کے طرزِ عمل سے بھی شدید ذہنی و قلبی اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بنی اسرائیل کی طرف سے اصل اور سب سے بڑی ایذا وہ تھی جو حکم جہاد سے ان کے انکار کی وجہ سے آپؑ کو پہنچی تھی۔ اپنی قوم کے اس انکار کے بعد آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی تھی اس کے ایک ایک لفظ میں شدتِ تکلیف کے احساسات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہوں آپؑ کی دعا کے یہ الفاظ:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۵﴾ (المائدۃ)
''موسیٰؑ نے عرض کیا: پروردگار! مجھے تو اختیار نہیں ہے سوائے اپنی جان کے اور اپنے بھائی (ہارونؑ کی جان) کے، تو اب تفریق کر دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان۔''

﴿وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ﴾ ''جبکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔''

میرے نزدیک یہاں لفظ ''رسول'' نبی کے معنی میں آیا ہے۔ دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کی طرف ''نبی'' کی حیثیت سے تھی، بطور ''رسول'' نہیں تھی۔ جبکہ قومِ فرعون کی طرف آپؑ بحیثیت ''رسول'' مبعوث ہوئے تھے:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۶﴾ (الزخرف)
''اور ہم نے بھیجا تھا موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف تو اُس نے کہا کہ (دیکھو) میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں۔''

کسی قوم کی طرف ''رسول'' کی بعثت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون ہمیشہ یہ رہا ہے کہ متعلقہ قوم پر اپنے رسول کی فرمانبرداری لازم ہوتی تھی۔ چنانچہ جو قوم اپنے رسولؑ کی دعوت کو رد کر دیتی تھی اسے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا اطلاق بنی اسرائیل پر نہیں ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پے در پے نافرمانی کے باوجود انہیں ہلاک نہیں کیا گیا۔ دوسری طرف قوم فرعون آپؑ کی نافرمانی کی وجہ سے

ہلاک کر دی گئی۔ چنانچہ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت نبی کی تھی' جبکہ آلِ فرعون کی طرف آپ ''رسول'' مبعوث ہو کر آئے تھے۔

﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ﴾ ''پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔''

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں لوگوں کی ہدایت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ایک بنیادی اصول اور قانون بیان ہوا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں قرآن مجید کی اُن آیات کو سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو گمراہ کرنے یا ان کے دلوں پر مہر کر دینے کا ذکر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہدایت کے راستے کو پہچان لینے کے بعد بھی اسے اختیار نہ کرے بلکہ گمراہی کی روش پر ہی چلتے رہنے کو ترجیح دے' پھر وہ اس راستے پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت کی حدود پھلانگ کر ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں سے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہ ہو (point of no return) تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس پر ہدایت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا ہے' یعنی بندہ جب سمجھتے بوجھتے ہوئے ٹیڑھا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ اس کا دل ہمیشہ کے لیے ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ (اعاذنا اللّٰہ من ذلك!)

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵﴾ ''اور اللہ فاسقوں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔''

آیت ۶ ﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ﴾ ''اور یاد کرو جب عیسیٰؑ ابن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف''

اس آیت میں بنی اسرائیل کے دوسرے دور کا ذکر ہے جب ان کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول بن کر آئے۔ بحیثیت رسول آپؑ کی بعثت کا ذکر سورۂ آلِ عمران کی آیت ۴۹ کے الفاظ ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ میں آیا ہے۔

﴿مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ﴾ ''میں تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں اُس کی جو میرے سامنے موجود ہے تورات میں سے''

﴿وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِى اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ﴾ ''اور بشارت دیتا ہوا ایک رسول کی جو میرے بعد آئیں گے' ان کا نام احمد (ﷺ) ہو گا۔''

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۶﴾ ''پھر جب وہ (عیسیٰؑ) آئے ان کے پاس واضح نشانیوں کے ساتھ تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔''

اس کے بعد حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ساتھ بنی اسرائیل کا تیسرا دور شروع ہوا۔ حضور ﷺ کی رسالت کے بعد بنی اسرائیل کو واضح طور پر بتا دیا گیا: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ﴾ (بنی اسرائیل: ۸) ''ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے' اور اگر تم نے وہی روش اختیار کی تو ہم بھی وہی

کچھ کریں گے''۔یعنی اے بنی اسرائیل !تم ہمارے لاڈلے تھے'ہم نے تمہیں خود برگزیدہ کیا تھا: ﴿وَلَقَدِ اخۡتَرۡنٰهُمۡ عَلٰى عِلۡمٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ (الدخان) مگرتم نے اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو راندۂ درگاہ بنالیا۔ بہرحال ہماری رحمت اور محبت کے دروازے اب بھی تمہارے لیے کھلے ہیں ۔اگرتم لوگ توبہ کرکے اپنی روش درست کرلوتو ہم اب بھی تمہیں اپنی آغوشِ رحمت میں لینے کے لیے تیار ہیں۔لیکن اس کے لیے تمہیں خودکومحمد رسول اللہ (ﷺ) کے قدموں میں ڈالنا ہوگا اورقرآن کواپنا راہبر ماننا ہوگا:﴿اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ يَهۡدِىۡ لِلَّتِىۡ هِىَ اَقۡوَمُ وَيُبَشِّرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا كَبِيۡرًا﴾(بنی اسرائیل) ''یقیناًیہ قرآن راہنمائی کرتا ہےاُس راہ کی طرف جوسب سے سیدھی ہے اور بشارت دیتا ہےاُن اہل ایمان کو جو نیک عمل بھی کریں کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

تم پر واضح ہونا چاہیے کہ اب ہمارے قصرِرحمت کا شاہدرہ قرآن ہے۔اگرتم ہماری رحمت کی پناہ میں آنا چاہتے ہوتوتمہیں اسی شاہدرہ کی راہ سے گزرکرآنا ہوگا۔لیکن اگرتم نے اپنے طرزِعمل کی اصلاح نہ کی'اپنی نافرمانیاں اسی طرح جاری رکھیں تو پھرہم بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے جیسا کہ ماضی میں تمہارے ساتھ ہوتا رہا ہے:﴿وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا﴾۔ جیسے ماضی میں ہمارےحکم پرتم لوگ بخت نصر (Nebukadnezar)' یونانیوں' شامیوں' رومیوں' وغیرہ کے ہاتھوں بار بارنشانِ عبرت بنتے رہے ہو ویسے ہی ایک مرتبہ پھرہم تمہیں تمہاری بداعمالیوں کی سزا دلوائیں گے۔ (بیسویں صدی میں نازیوں کے ہاتھوں یہود کا جوانجام ہوا وہ بھی عبرت انگیز ہے۔ان کا اپنا دعویٰ ہے کہ''ہولوکاسٹ''میں ۶۰ لاکھ افراد مارے گئے۔)

آیت ۷ ﴿وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ﴾ ''اوراُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جواللہ پر جھوٹ تراشے''

﴿وَهُوَ يُدۡعٰٓى اِلَى الۡاِسۡلَامِ ؕ﴾ ''درآں حالیکہ اسے بلایا جارہا ہواسلام کی طرف!''

یعنی اب اللہ کے آخری رسول ﷺ تم لوگوں کودعوتِ ایمان واسلام دے رہے ہیں اورتم لوگ اس دعوت پرلبیک کہنے کے بجائے انؐ کی نبوت ورسالت اورقرآن کے بارے میں اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ﴾ ''اوراللہ ایسے ظالموں کو(زبردستی)ہدایت نہیں دیتا۔''

اب اگلی آیت میں یہودیوں کی ان کوششوں اور سازشوں کا ذکر ہے جوانہوں نے حضور ﷺ اورقرآن کے خلاف شروع کررکھی تھیں ۔یہ آیت زیرِمطالعہ مضمون کے کلائمکس کا درجہ رکھتی ہے:

﴿يُرِيۡدُوۡنَ لِيُطۡفِئُوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ﴾ ''وہ تُلے ہوئے ہیں کہ اللہ کے نورکواپنے منہ(کی پھونکوں)سے بجھا کر رہیں گے''

﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوۡرِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ﴾ ''اوراللہ اپنے نورکا اتمام فرما کررہے گا'خواہ یہ کافروں کوکتنا ہی ناگوار ہو۔''

یہ آیت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ سورۃ التوبہ میں اس طرح آئی ہے:

﴿یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَیَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَہٗ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۳۲﴾﴾

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اپنے منہ (کی پھونکوں) سے اور اللہ کو ہرگز منظور نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے' چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

اللہ کے نور کو منہ کی پھونکوں سے بجھانے کے استعارے میں یہودِ مدینہ کی ان بودی کوششوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ حضورﷺ اور مسلمانوں کے خلاف اُس وقت کر رہے تھے۔ یعنی وہ سامنے آ کر براہِ راست مقابلہ کرنے کے بجائے مسلمانوں کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا کرتے' افواہیں اڑاتے' درپردہ سازشوں کے جال بنتے رہتے' کبھی قریش کے پاس جاتے کہ تم مدینہ پر حملہ کرو اور کبھی کسی دوسرے قبیلے کو سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کے خلاف ابھارتے۔ سورۃ الحشر میں ان کی بزدلی اور اندرونی کمزوری کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿لَا یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ جَمِیۡعًا اِلَّا فِیۡ قُرًی مُّحَصَّنَۃٍ اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ (آیت ۱۴) کہ یہ لوگ کھلے میدان میں اکٹھے ہو کر تمہارا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے' ہاں چھپ چھپا کر دیواروں کی اوٹ سے وہ تم پر ضرور وار کریں گے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس آیت کے مضمون کی ترجمانی اپنے ایک شعر میں یوں کی ہے: ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن ۔۔۔ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

یہاں یہ اصولی نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس آیت اور اس مضمون کی حامل قرآن کی اور بہت سی دوسری آیات کے مفہوم کا دائرہ صرف حضورﷺ کے زمانے کے یہودیوں اور ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں تک ہی محدود نہیں' بلکہ ان میں تا قیامِ قیامت ہر زمانے کے یہودیوں اور ان کی ان سازشوں کا ذکر ہے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ موجودہ دور میں اگرچہ یہ لوگ پوری عیسائی دنیا کو اپنی مٹھی میں لے کر عالمِ اسلام کے خلاف صف آراء ہو چکے ہیں' مگر قرائن بتاتے ہیں کہ ان کے فیصلے کا وقت اب قریب آ لگا ہے۔ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ کے مطابق اللہ کے نور کا اتمام یعنی روئے ارضی پر دینِ اسلام کا غلبہ تو ایک طے شدہ امر ہے۔ اس کے لیے قیامت سے پہلے دنیا کو ایک انتہائی خوفناک جنگ کا سامنا کرنا ہے۔ اس جنگ میں یہودی اور عیسائی مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑیں گے۔ احادیث میں اس جنگ کو اَلۡمَلۡحَمَۃُ الۡعُظۡمٰی کا نام دیا گیا ہے' جبکہ عیسائیوں اور یہودیوں کی اصطلاح میں اسے ''ہرمجدون'' (Armageddon) کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں یہودی مکمل طور پر نیست و نابود ہو جائیں گے اور اسلام واحد طاقت کے طور پر پوری دنیا پر غالب آ جائے گا۔ یہ ہے آیت کے الفاظ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ کے مفہوم کا خلاصہ جس کی تفصیل ہمیں احادیث میں ملتی ہے۔

آیات ۹ تا ۱۲

ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ
الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۹﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾ ع
تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَتُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ
اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ وَیُدۡخِلۡکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ
وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۲﴾

یہاں سے اس سورت کے تیسرے حصے کا آغاز ہو رہا ہے۔ آیت ۹ میں حضورﷺ کی بعثت کا ذکر ہوا ہے:

آیت ۹ ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اس کو پورے نظامِ زندگی پر''

حضورﷺ کے مقصد بعثت کے حوالے سے یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے اور اسی اہمیت کے باعث قرآن مجید میں اسے تین بار (اس مقام کے علاوہ سورۃ التوبہ' آیت ۳۳ اور سورۃ الفتح' آیت ۲۸ کے طور پر) دہرایا گیا ہے۔ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے لیے قرآن مجید میں بشیر' نذیر' مذکّر' شاہد' معلّم وغیرہ الفاظ مشترک استعمال ہوئے ہیں' لیکن اس آیت کا مضمون اور اسلوب صرف محمدؐ رسول اللہﷺ کے لیے خاص ہے۔ الھدیٰ سے مراد یہاں وہ ہدایت نامہ (قرآن) ہے جو آپﷺ پر کامل ہو گیا' جبکہ آپ سے پہلے تمام انبیاء کو اپنے اپنے دور میں جو میزان (شریعت) عطا ہوتی رہی تھی حضورﷺ کی بعثت میں وہ کامل ہو کر ''دین الحق'' یعنی سچے اور عادلانہ نظامِ زندگی کی شکل اختیار کر گئی۔ چنانچہ آپﷺ کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ اس لیے بھیجا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل و قسط کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر دیا جائے۔ یہ تھا حضورﷺ کی بعثت کا مشن جسے تکمیل کے لیے آپؐ ہمارے سپرد فرما گئے تھے۔ لیکن ہم نے تو اس مشن کو کبھی اپنایا ہی نہیں۔ ہمارا مشن تو یہ ہے کہ حلال و حرام طریقے سے جیسے بھی ہو' دولت اکٹھی کرو' پھر اسی دولت سے صدقہ و قربانی دو' حج کرو اور رمضان میں ہر سال عمرے کے لیے چلے جایا کرو۔ ہمارا سارا زور rituals پر ہے اور دین اگر دنیا میں پامال ہے تو ہوتا رہے' ہماری بلا سے! تصور کریں' اگر آج صرف ایک سال میں حج پر اکٹھے ہونے والے افراد ہی سروں پر کفن باندھ کر غلبۂ دین کی جدوجہد کے لیے میدان میں کود پڑیں تو دنیا کو بدل سکتے ہیں۔ مگر افسوس' صد افسوس! ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی — فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالیؒ نہ رہی!

﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹﴾ ''اور خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!''

ظاہر ہے مشرکین کب چاہیں گے کہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو' نظامِ توحید کا نفاذ ہو اور اللہ کی حکومت بالفعل قائم ہو جائے۔ یہاں پر مُشْرِكُوْنَ کا لفظ خاص طور پر لائقِ توجہ ہے۔ اس سے مراد صرف وہ مشرکین ہی نہیں ہیں جو بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حضور ان کی سفارش کر دیں گے' بلکہ سب سے بڑے مشرک تو وہ ہیں جو دنیا میں خدائی کے دعوے دار بنے بیٹھے ہیں' جو نمرود اور فرعون کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) کے مالک ہم ہیں۔ فرعون بھی تو یہی کہتا تھا: ﴿اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ﴾ (الزخرف: ۵۱) کہ دیکھو! کیا یہ مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ پورا نہری نظام میرے تابع نہیں ہے؟ تو فرعون کے اس دعوے اور ''عوام کی حاکمیت'' کے نعرے میں کیا فرق رہ گیا؟ صرف یہی نا کہ وہاں اقتدار کا دعویٰ کرنے والا ایک فرد تھا اور یہاں پوری قوم حاکمیت کی دعوے دار ہے۔ اب ظاہر ہے اگر اس ماحول میں آپ اللہ کی حاکمیت کا نعرہ لگائیں گے اور اللہ کے نظامِ عدل و قسط کے قیام کے مشن کو لے کر آگے بڑھنا چاہیں گے تو ''اپنی حاکمیت'' کے یہ دعوے دار خم ٹھونک کر آپ کے مقابلے میں آ کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے موقف پر قائم رہیں گے تو ان

سے آپ کا تصادم ناگزیر ہو جائے گا اور آپ کو مال و جان کی قربانی کی صورت میں اپنے اس موقف کی قیمت چکانا پڑے گی۔ چنانچہ اب اگلی آیات میں اسی صورتِ حال کا ذکر کیا جا رہا ہے:

آیت ۱۰ ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾ ﴾ ''اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟''

آیت ۱۱ ﴿ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ﴾ ''(وہ یہ کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔''

یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایسے ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ سورۃ النساء کی یہ آیت بھی اسی مفہوم میں اہل ایمان کو ایمان لانے کا حکم دے رہی ہے: ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ...... ﴾ (آیت ۱۳۶) ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر......'' گویا یہ ایمان کے دعوے داروں کے لیے ایسا مؤمن بننے کی دعوت ہے جو سورۃ الحجرات کی اس آیت کے معیار پر پورے اترتے ہوں: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ ﴾ (آیت ۱۵) ''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔''

﴿ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ ﴾ ''یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔''

آیت ۱۲ ﴿ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ ''وہ تمہارے لیے تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں داخل کرے گا اُن باغات میں جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی''

﴿ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۲﴾ ﴾ ''اور بہت پاکیزہ مساکن عطا کرے گا رہنے کے باغات میں۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

اصل اور سب سے بڑی فوز و فلاح اور کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ دنیا کی کامیابیوں سے بے نیاز ہو کر اسی کامیابی کو اپنا ہدف بنائے۔ حتیٰ کہ غلبہ دین یا اقامت دین کے لیے جدوجہد کا نصب العین بھی آخرت کی کامیابی ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر ہم اس جدوجہد میں دُنیوی کامیابی پر نظر رکھیں گے تو اپنی کوششوں کو کامیاب نہ ہوتے دیکھ کر یا تو مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے یا الٹے سیدھے طریقے سے (by hook or by crook) مثبت نتائج حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیوی نتائج کو منزل سمجھ لینے کی وجہ سے اس راہ کی بڑی بڑی تحریکیں یا تو مایوسی کے قبرستان میں دفن ہو گئیں یا شارٹ کٹ لگانے کی کوشش میں غلط موڑ مڑ کر اصل راستہ ہی گم کر بیٹھیں۔ چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد کے دوران ہمیں صرف اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی پر نظر رکھنی چاہیے اور دنیا کی کامیابی یا ناکامی کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ہم صرف کوشش کرنے کے مکلف ہیں' اس کوشش کو کامیابی

سے ہمکنار کرنے کے ہم مکلّف نہیں۔ ہاں اپنی جدوجہد کے طریق کار پر حالات و ماحول کے مطابق نظر ثانی ضرور کرتے رہنا چاہیے‘ لیکن بنیادی طور پر ہمارا طریقہ اور راستہ وہی رہنا چاہیے جو منہجِ نبویؐ سے ماخوذ ہو۔ یہ منہج حضورﷺ کے توسط سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ﴾(المائدۃ:٤٨) ”تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل طے کر دی ہے“۔ چنانچہ ہم پر لازم ہے کہ ہم اقامت دین کی جدّوجہد کی راہیں متعیّن کرتے ہوئے روشنی اور راہنمائی منہجِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے ہی حاصل کریں۔

آیات ۱۳‘۱۴

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝ ع

اب اگلی آیت میں اس ”بونس“ کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی کبھی اس دنیا میں بھی عطا کر دیتا ہے‘ چنانچہ فرمایا:

آیت ۱۳ ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ﴾ ”اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت پسند ہے۔“

یعنی اس جہاد میں تمہیں دنیا کی کامیابی بھی مل سکتی ہے۔ اگرچہ تمہاری یہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قدر اہم نہیں جس قدر تم اسے اہم سمجھتے ہو۔ وہ غلبہ دین کے لیے تمہاری کوششوں کا محتاج نہیں۔ وہ چاہے تو آنِ واحد میں دین کو غالب کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو چیز اہم ہے وہ تمہاری جدوجہد اور اس جدوجہد میں تمہارا جذبہ ایثار و خلوص ہے‘ اور یہی تمہارا اصل امتحان ہے۔ اگر تم اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہو تو اللہ کے ہاں کامیاب ہو‘ چاہے دنیوی لحاظ سے تم ناکام ہی رہو۔ لیکن اللہ کو معلوم ہے کہ بربنائے طبع بشری تم لوگ اپنی اس جدوجہد کے مثبت نتائج اس دنیا میں بھی دیکھنا چاہتے ہو اور دُنیوی فتح حاصل ہونے پر تم لوگ بہت خوش ہوتے ہو‘ اس لیے اللہ تعالیٰ تمہاری خوشی کے لیے وہ بھی تمہیں عطا فرمائے گا۔

﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ﴾ ”اللہ کی طرف سے مدد اور قریبی فتح۔“

بس اب اللہ تعالیٰ کی مدد آیا ہی چاہتی ہے اور دنیوی فتح بھی تمہارے قدم چومنے ہی والی ہے۔ یہ کس مدد اور کونسی فتح کی بشارت ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے غزوۂ احزاب کے حالات و واقعات کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ سورۃ الصّف کی حیثیت سورۃ الاحزاب کے ضمیمے کی سی ہے۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑬﴾ ”اور (اے نبیﷺ) آپ مؤمنین کو خوشخبری سنا دیجیے۔“

غزوۂ احزاب کے بعد حضورﷺ نے صحابہؓ کو یہ خوشخبری ان الفاظ میں سنائی تھی: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ

بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ))(تفسیر ابن کثیر:٦/٣٩٦) کہ اب اس سال کے بعد قریش تم پر کبھی چڑھائی نہیں کر سکیں گے' بلکہ آئندہ تم لوگ ان پر چڑھائی کرو گے۔ یہ ان کی طرف سے آخری حملہ تھا' کفر کی کمر ٹوٹ چکی اور کفار حوصلہ ہار گئے' اب اقدام تمہاری طرف سے ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد اگلے سال ٦ ہجری میں حضورﷺ نے چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرے کی نیت سے مکہ کا سفر اختیار فرمایا' جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور قریش کے مابین حدیبیہ کے مقام پر صلح کا معاہدہ طے پایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاہدے کو فتح مبین قرار دیا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ①﴾ (الفتح) ''یقیناً ہم نے آپؐ کو ایک بڑی روشن فتح عطا فرمائی ہے۔''

دوسری طرف اس بشارت کا تعلق آخرت سے بھی ہے کہ اپنے مال و جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کے نتیجے میں مؤمنین صادقین کو جنت کی نعمتیں بھی ملیں گی اور اللہ کے ہاں انہیں ایک خاص مقام بھی عطا ہوگا۔ اور وہ ہوگا اللہ کے مددگار ہونے کا مقام!

یہاں یہ بات خصوصی طور پر لائق توجہ ہے کہ ان آیات میں عذابِ الیم سے چھٹکارے کو ایمانِ حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ آیت ١٠ میں یہ بات جس دوٹوک انداز میں واضح کی گئی ہے اسے فزیالوجی کی زبان میں ''All or none Law'' کہتے ہیں۔ یعنی ایسی صورت حال جس میں کوئی چیز واقع ہوتی ہے تو پوری ہوتی ہے اور اگر نہیں واقع ہوتی تو بالکل نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی درمیانی راستہ یا تناسب ممکن نہیں ہوتا۔ ہمارے ارادی عضلات (voluntary muscles) کے سکڑنے کا معاملہ ایسا ہی ہے' اگر محرک (stimulus) پورا مل جاتا ہے تو متعلقہ muscle کی پوری contraction ہوتی ہے اور اگر stimulus کم ہوتا ہے تو contraction بالکل نہیں ہوتی۔ اس مفہوم میں آیت ١٠ تا ١٣ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ راستہ اختیار کریں گے ان کے سب گناہ بھی معاف ہو جائیں گے (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے ایمان و عمل کو درجہ قبولیت مل جائے)' انہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا بھی ملے گا اور جنت عدن میں ٹھکانہ بھی نصیب ہوگا۔ صرف یہی نہیں' بلکہ دنیا میں انہیں اللہ کی مدد سے فتح بھی ملے گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مددگار قرار پائیں گے —— اس کے برعکس اگر ہم لوگ ایمان کے دعوے تو بہت کریں اور اللہ و رسولؐ سے محبت کے نعرے بھی لگائیں' لیکن مذکورہ دو شرائط (ایمانِ حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ) پوری کرنے میں سنجیدہ نہ ہوں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا رویہ اللہ تعالیٰ کی بیزاری کو دعوت دینے کے مترادف ہے: ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③﴾ (الصف) ''بڑی شدید بیزاری کی بات ہے اللہ کے نزدیک کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں''۔ چنانچہ جو لوگ مذکورہ شرائط کا حق ادا کیے بغیر ہی سمجھتے ہیں کہ وہ آخرت میں نجات پا جائیں گے وہ ایک خود ساختہ خیال کے سہارے زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی سوچ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان آیات کے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یعنی یہ' معاذ اللہ' کلامِ مہمل ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت ایک طویل آیت ہے اور منطقی اعتبار سے یہ اس سلسلۂ مضمون کا ایک انتہائی اہم اور بلند ترین مقام ہے جو گزشتہ آیات میں چلا آ رہا ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۴ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ ''اے اہل ایمان! تم اللہ کے مددگار بن جاؤ''
اللہ کے مددگار بننے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ کے دین کا جھنڈا سربلند کرنے پر کمربستہ ہو جاؤ۔ اور اگر تم اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے جدوجہد کرو گے تو تم محمد عربی ﷺ کے مددگار بھی بن جاؤ گے' کیونکہ غلبہ دین کا یہ مشن اصل میں تو اللہ کے رسول ﷺ کا مشن ہے۔ تو اے اہل ایمان! آؤ آگے بڑھو! اللہ کے دین کا جھنڈا اٹھاؤ! جان و مال کا سرمایہ لگاؤ اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مددگاروں میں اپنا نام لکھوا لو۔

﴿كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ﴾ ''جیسے کہا تھا عیسیٰؑ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے''

﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ ''کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف؟''

یعنی کون ہے جو میری مدد کرے اللہ کی راہ میں؟ مدد مجھے درکار ہے' لیکن مشن اللہ کا ہے۔ اس فقرے میں وہی دو نسبتیں نظر آ رہی ہیں جن کا ذکر سورۃ الفتح کی اس آیت میں حضور ﷺ کی بیعت کے حوالے سے آیا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ﴾ (آیت ۱۰)۔ یعنی بیعت حضور ﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی ہے لیکن سودا اللہ تعالیٰ سے ہے۔ گویا عملی طور پر اس بیعت میں دو کے بجائے تین ہاتھ ہیں: بیعت کرنے والے کا ہاتھ' حضور ﷺ کا ہاتھ اور اللہ کا ہاتھ۔ چنانچہ اللہ کی مدد کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آپ اس ''بندے'' کی مدد کریں جو اللہ کے مشن کو لے کر اس کے راستے پر نکلا ہو۔ اسی فلسفے کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے اللہ کی مدد کے لیے آپؑ کی آواز پر لبیک کہا تھا اور اسی جذبے کے ساتھ حضور ﷺ کے صحابہؓ نے اپنا سب کچھ آپؐ کے قدموں میں نچھاور کر کے ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ﴾ (الفتح: ۲۹) کی فہرست میں اپنے نام لکھوائے تھے۔ چنانچہ آج بھی اس مشن کو آگے بڑھانے کا یہی طریقہ ہے کہ اللہ کی توفیق سے اللہ کا کوئی بندہ خود کو اس مشن کے لیے وقف کر کے ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ کی صدا بلند کرے کہ اے اللہ کے بندو! میں نے تو یکسو ہو کر اللہ کی طرف رجوع کر لیا ہے۔ مجھے تو اب اس راستے پر چلنا ہی چلنا ہے۔ کوئی ساتھی ملے گا تب بھی چلوں گا اور اگر کوئی ساتھی نہیں ملے گا تب بھی چلوں گا۔ تو آؤ آگے بڑھو اور میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اللہ کے مددگار بن جاؤ!

﴿قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ ''حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!''

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مددگار بن گئے۔ بنیادی طور پر اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے خلوص و ایثار کا ذکر ہے کہ انہوں نے ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ کی دعوت پر بلا تامل خود کو پیش کر دیا۔

﴿فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَكَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ﴾ ''تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ (حضرت مسیح علیہ السلام پر) ایمان لے آیا اور دوسرا گروہ کفر پر اڑا رہا۔''

﴿فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ﴾ ''تو ہم نے مدد کی اُن کی جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں کے خلاف''

﴿فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ۝۱۴﴾ ''تو (بالآخر) وہی غالب ہوئے۔''

اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا دنیا میں غالب ہوئے اور اللہ کے رسولؑ کا انکار کرنے والے یہودی مغلوب ہوئے —— لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو یہ کامیابی آسانی سے نہیں ملی تھی' اس کے لیے ان لوگوں کو تین سو سال تک جاں گداز جدوجہد کرنی پڑی اور بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ (اس کے مقابل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی ابتلاء وآزمائش کا دورانیہ چند سال کے عرصے میں سمٹ گیا تھا۔) بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنے طویل عرصے تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے مخالفین کی طرف سے تکلیفیں اور سختیاں برداشت کی ہیں اس کی کوئی مثال کسی اور نبیؑ یا رسولؑ کے پیروکاروں میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں ان کی آزمائشوں اور قربانیوں کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ یٰسین کے آغاز میں جن تین رسولوں کا ذکر آیا ہے ان کے بارے میں زیادہ تر مفسرین کی رائے یہی ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے۔ یعنی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے فرستادہ (رسولؑ کے رسول) تھے۔ اسی طرح سورۃ البروج میں جن اہل ایمان کا واقعہ بیان ہوا ہے وہ بھی عیسائی تھے اور انہیں بادشاہِ وقت 'ابونواس' نے خندقوں میں ڈال کر زندہ جلا دیا تھا۔ پھر اصحاب الکہف جو رومی بادشاہ کے تشدد کے خوف سے غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے وہ بھی عیسائی تھے۔ بہرحال حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں کی تین صدیوں پر محیط لازوال قربانیوں کے بعد بالآخر ۳۰۰ عیسوی میں رومی سلطنت نے عیسائیت قبول کر لی۔ آیت میں اسی غلبے کا ذکر ہے۔

اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکار جب گمراہ ہونے پر آئے تو انہوں نے شرک بھی بدترین ایجاد کیا۔ یعنی انہوں نے اپنے پیغمبر کو بربنائے عقیدت اللہ کا صلبی بیٹا بنا ڈالا (نعوذ باللہ)۔ اس ضمن میں آج ہمیں بھی اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض نعت خواں حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت اور عشق ومحبت کے نام پر اتنا غلو کرتے ہیں کہ آپؐ کو اللہ کے برابر بٹھانے سے کم پر ان کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ ایسے لوگوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ''اوتار'' کا عقیدہ بھی گھڑ لیا ہے۔ عبرت کے لیے ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر   اُتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰؐ ہو کر!

اور:

مدینے کی مسجد میں منبر کے اوپر   بغیر عین کا اک عرب ہم نے دیکھا!

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ﴾(النساء: ۱۷۱) کہ اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم صرف یہود ونصاریٰ کے لیے ہی نہیں تھا' ہمارے لیے بھی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا اور ہر اُس گناہ اور جرم میں بے دھڑک اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کی جس کا ارتکاب کر کے پچھلی اُمتیں راندۂ درگاہ ہوئی تھیں۔ سوائے اس کے کہ قرآن کے متن میں ہم تحریف نہیں کر سکے اور وہ بھی اس لیے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی تحفظ حاصل ہے۔ ورنہ اگر ممکن ہوتا تو اس میدان میں بھی ہم کسی سے پیچھے نہ رہتے۔

سُوْرَةُ الْجُمُعَة

تمہیدی کلمات

سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا آپس میں جوڑے اور زوجیت کا تعلق بہت نمایاں ہے اس لیے کہ یہ دونوں سورتیں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے دو پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین کی تقسیم اس طرح ہے کہ سورۃ الصّف میں انقلاب کے تکمیلی منہاج (مرحلہ تصادم)' جبکہ سورۃ الجمعہ میں اساسی منہاج (مرحلہ تیاری) کا ذکر ہے۔ سورۃ الصّف کا مرکزی مضمون نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت ہے' جبکہ سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس مقصد بعثت کے حصول اور اس عظیم مشن کی تکمیل کے لیے آپ ﷺ کا بنیادی طریق کار کون سا تھا۔ اپنے مضمون کے اعتبار سے سورۃ الجمعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلی چار آیات میں قرآن کے ذریعے دعوت و تبلیغ اور مردانِ کار کی تیاری کا ذکر ہے۔ اس کے بعد چار آیات میں بنی اسرائیل کے تذکرے کے پردے میں ہمارے لیے عبرت کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ جبکہ آخری تین آیات میں نمازِ جمعہ کا فلسفہ زیر بحث آیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

آیات ۱ تا ۴

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۝ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۝

آیت ۱ ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①﴾
''تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے' جو بادشاہ ہے' (ہر عیب سے) پاک ہے' بہت زبردست ہے' بہت حکمت والا ہے۔''

یہ آیت گویا اس سورۂ مبارکہ کے لیے ایک نہایت پُرشکوہ اور پُرجلال تمہید اور آغازِ کلام ہے۔ سورۃ الصّف کے آغاز میں تسبیح باری تعالیٰ کا ذکر صیغہ ماضی میں تھا' جبکہ یہاں فعل مضارع آیا ہے۔ اس طرح تسبیح باری تعالیٰ کے ضمن میں گویا زمان و مکان کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے چار اسماء وارد ہوئے ہیں اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے' اس لیے کہ عام طور پر آیات کے اختتام پر اسماءِ باری

تعالیٰ دو دو کے جوڑوں کی صورت میں آتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ﴾ ''وہی تو ہے جس نے اٹھایا اُمیین میں ایک رسول ان ہی میں سے' جو ان کو پڑھ کر سناتا ہے اُس کی آیات اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب وحکمت کی۔''

﴿وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝﴾ ''اور یقیناً اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔''

اس سورت کی یہ آیت انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کے حوالے سے اسی طرح اہم ہے جس طرح سورۃ الصّف کی آیت ۹ تکمیلی منہاج کے اعتبار سے اہم ہے۔ سورۃ الصّف کی مذکورہ آیت میں حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان ہوا ہے تو آیت زیر مطالعہ میں آپؐ کے فرائض منصبی کا ذکر ہے۔ سورۃ الصّف کی وہ آیت اپنی اہمیت کی وجہ سے قرآن مجید میں تین مرتبہ (سورۃ الصّف کے علاوہ سورۃ التوبہ' آیت ۳۳ اور سورۃ الفتح' آیت ۲۸ کے طور پر) آئی ہے' تو اس آیت میں مذکور ''انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج'' قرآن حکیم میں چار مرتبہ (سورۃ الجمعہ کی اس آیت کے علاوہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۲۹' ۱۵۱ اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۴ میں) بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہج کے عناصرِ اربعہ بیان کیے گئے ہیں: (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیم کتاب (۴) تعلیم حکمت۔

اس آیت کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ اس میں مطلوبہ انقلاب کی تیاری اور اس کے لیے مردانِ کار کی فراہمی کا مکمل طریقہ اور نصاب بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کی تعلیم' تربیت' تذکیر' ان کا تزکیہ' ان کا انذار سب کچھ قرآن کریم کے ذریعے سے ہوگا۔ حضور ﷺ نے لوگوں کو قرآن مجید سنانا شروع کیا تو سلیم الفطرت لوگ قرآن کی مقناطیسی تاثیر کی وجہ سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔ کسی نے فوراً ہی لبیک کہہ دیا' کوئی قدرے تامل کے بعد راغب ہوا اور کسی نے نسبتاً زیادہ دیر بعد فیصلہ کیا۔ چنانچہ جس طرح دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے بالکل اسی طرح مکہ کی آبادی کو بارہ سال کے عرصے میں آیاتِ قرآن کی تلاوت کے ذریعے سے بار بار جھنجھوڑ کر تمام سلیم الفطرت (زندہ ارواح کے حامل) افراد کو چھانٹ کر الگ کر لیا گیا۔ پھر ان منتخب افراد کا تزکیہ بھی قرآن مجید کی تلاوت سے ہی ہوا۔ قرآن مجید بلاشبہ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ﴾ (یونس:۵۷) ہے۔ جیسے جیسے یہ کلام ان لوگوں کے سینوں میں اترتا گیا دلوں کی بیماریاں دور ہوتی چلی گئیں۔ یہاں پر یہ اہم نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ دل کی بیماریاں تو بے شمار ہیں لیکن ان تمام بیماریوں کو اگر کوئی ایک نام یا کوئی ایک عنوان دیا جائے تو وہ ''حُبِّ دُنیا'' ہے۔ حُبِّ دُنیا کی گندگی جب کسی دل کے اندر ڈیرہ جما لیتی ہے تو اس کے تعفن سے نت نئی بیماریاں جنم لیتی چلی جاتی ہیں' جبکہ خود حُبِّ دنیا کے جراثیم کو غذا انسان کی سوچ اور اس کے نظریے سے ملتی ہے۔ ظاہر ہے انسان کی زندگی کا انداز اور اس کی دوڑ دھوپ کا رخ اس کا نظریہ متعین کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی تعلیم کے ذریعے ان لوگوں کے نظریات درست ہو گئے تو حُبِّ دنیا سمیت تمام باطنی بیماریوں کی گویا جڑ کٹ گئی اور برے اعمال وخصائل ان کی شخصیات سے ایسے غائب ہو گئے جیسے موسم خزاں میں درختوں سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ اس آیت میں حضورﷺ کے جن فرائض منصبی کا ذکر ہوا ہے ان میں ''تعلیم حکمت'' کا تعلق عام لوگوں سے نہیں ہے' بلکہ یہ حضورﷺ کی تعلیم وتربیت کا شعبۂ تخصص (area of specialization) ہے۔ ہر کوئی اس میدان کا شہسوار نہیں بن سکتا۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیر کثیر عطا ہو گیا'' —— بہرحال یہ آیت ہم پر یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ حضورﷺ کے منہجِ انقلاب میں آلۂ دعوت اور آلۂ انقلاب قرآن مجید ہے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو دعوت بھی قرآن کے ذریعے دی۔ ان کی تذکیر وتبشیر کے لیے بھی قرآن پر ہی انحصار کیا۔ پھر اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کا تزکیہ بھی قرآن سے ہی ہوا اور ان کی تعلیم وتربیت کا ذریعہ بھی قرآن ہی بنا۔ آپ ﷺ نے قرآن کی بنیاد پر ۲۳ سال کے مختصر عرصے میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا کر کے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظامِ عدل وقسط کو بالفعل نافذ کر دیا۔ اس کے بعد پوری دنیا میں دین کو غالب کرنے کا مشن امت کے سپرد کر کے آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ مشن منتقل کرتے ہوئے بھی حضورﷺ نے اُمت کو جو وصیت کی تھی وہ بھی قرآن کے بارے میں تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ((قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ كِتَابَ اللّٰهِ))[1] ''میں تمہارے درمیان وہ شے چھوڑے جا رہا ہوں کہ جسے تم مضبوطی سے تھام لوگے تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب!''

چنانچہ آج ہمارے لیے بلکہ تا قیامِ قیامت ہر زمانے کے مسلمانوں کے لیے قرآن مجید گویا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام ہے۔ اس حیثیت میں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے کئی گنا بڑا معجزہ ہے۔ عصائے موسیٰ تو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں معجزہ تھا' آپؑ کے بعد تو وہ معجزہ نہیں رہا۔ اگر آج بھی وہ کہیں موجود ہے' جیسا کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس محفوظ ہے' تو اس کی حیثیت بس ایک لاٹھی کی سی ہے۔ اس کے برعکس حضورﷺ کا معجزۂ رسالت یعنی قرآن مجید قیامت تک کے لیے معجزہ ہے اور ہر اس شخص کے لیے معجزہ ہے جو اس کا حق پہچانے اور ادا کرے۔ اس حوالے سے میرا ایمان تو حق الیقین کی حد تک ہے کہ اگر کوئی شخص خلوص و اخلاص کے ساتھ قرآن مجید میں ایسی ''محنت'' کرے کہ قرآن اس کو possess کر لے تو پھر اسے دنیا کی ہر چیز بے وقعت نظر آئے گی اور قرآن کے علاوہ کسی اور چیز میں اس کا دل نہیں لگے گا۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت کو بالکل ہی پس پشت ڈال دیا ہے۔ ہم دنیا بھر کے علوم سیکھتے ہیں مگر اس قدر عربی نہیں سیکھ سکتے جس سے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھا جا سکے۔ اس لیے کہ یہ نہ تو ہماری ترجیح ہے اور نہ ہی اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کو نظر انداز کرنے کا ہمارا یہ انداز حیرت انگیز حد تک جسارت آمیز ہے۔ اس حوالے سے ذرا قرآن کی یہ وعید بھی سنیے: ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبی ﷺ۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب المناسک' باب صفۃ حجۃ النبی ﷺ۔

اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴿۸۲﴾(الواقعة) کہ اے اللہ کے بندو! ذرا سوچو تو! کیا تم اس عظیم الشان کلام کے بارے میں مداہنت کرتے ہو؟ اور کیا اس کی تکذیب کو تم نے اپنا وطیرہ بنالیا ہے؟

قرآن مجید تو ظاہر ہے ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ہے۔ یہ آیات اپنے نزول کے وقت تو مشرکین مکہ سے مخاطب تھیں' جبکہ آج ان کے مخاطب ہم ہیں۔ وہ لوگ تو نظریاتی طور پر قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے تھے اور اپنی زبانوں سے اس کی تکذیب کرتے تھے' جبکہ آج ہم اپنی زبانوں سے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے بعد اپنے عمل سے اس کی تکذیب کر رہے ہیں۔ مقامِ عبرت ہے! قرآن مجید کی طرف تو پلٹ کر دیکھنے کے لیے بھی ہمارے پاس وقت نہیں جبکہ دنیا کے حقیر مفادات کے لیے ہم دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں اسی لیے پیدا کیا گیا تھا؟ یہی سوال تھا جس نے ابراہیم بن ادھمؒ کی زندگی بدل دی تھی۔ ابراہیم بن ادھمؒ بادشاہ کی حیثیت سے غفلت اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن شکار کھیلنے میں مصروف تھے کہ انہوں نے ایک آواز سنی: یَاِبْرَاهِيْمُ اَلِهٰذَا خُلِقْتَ اَمْ لِهٰذَا اُمِرْتَ؟ کہ اے ابراہیم ذرا سوچو! کیا تمہیں اسی کام کے لیے پیدا کیا گیا تھا؟ اور کیا تمہیں اسی کام کا حکم ہوا تھا؟ اللہ جانے یہ کسی فرشتے کی آواز تھی یا ان کے اپنے دل کی صدا۔ بہرحال جو بھی صورت حال تھی' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بات ان کے دل میں گھر کر گئی اور ان کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔

آیت ۳ ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ﴾ ''اور ان ہی میں سے ان دوسرے لوگوں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔''

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ ''اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا ہے۔''

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ کا عطف اُمِّيّٖنَ پر ہے۔ یعنی دوسرے کچھ اور بھی ہیں جن کی طرف آپؐ کو مبعوث فرمایا گیا۔ حضورﷺ کی بعثت تو قیامت تک لیے ہے۔ ظاہر ہے آپؐ کی اُمت میں ہر نسل' ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ شامل ہوں گے۔ متفق علیہ احادیث کے مطابق حضورﷺ سے جب اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے اپنا دست مبارک حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر رکھ کر فرمایا کہ ''یہ اور اس کی قوم کے لوگ''۔ مزید فرمایا کہ دین اگر ثریا پر بھی ہوگا تو اس کی قوم کا ایک شخص اس تک پہنچ جائے گا۔ حضورﷺ کے اس فرمان کے بارے میں تمام حنفی علماء متفق ہیں کہ اس کے مصداق حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں' جو ایرانی النسل ہیں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ایرانی قوم بحیثیت مجموعی بہت ذہین ہے۔ اس قوم نے ایک سے بڑھ کر ایک فلاسفر پیدا کیا ہے' بلکہ ہمارے علمائے کلام تو سب کے سب ایرانی ہیں۔ اس حوالے سے ایرانی قوم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یوں لگتا ہے جیسے فلسفہ اور منطق ان کی گھٹی میں شامل ہے۔ ماضی میں یونان اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایران بھی فلسفہ ومنطق کے ایک اہم مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا۔ بعد میں جرمن قوم نے بھی اس میدان میں نام پیدا کیا۔ یہ سب اقوام حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت حام کی نسل سے ہیں۔ اس ضمن میں میری تحقیق یہ ہے کہ حضرت سام کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے چن لیا تھا' جبکہ حضرت حام کی نسل کو حکمت میں برگزیدہ کیا تھا۔

میں نے آیت زیر مطالعہ کو ایٹم (atom) اور اس کے مرکزہ (nucleus) کے گرد مختلف دائروں میں گھومنے والے الیکٹرانز کی مثال سے سمجھا ہے۔ اس مثال کے مطابق اُمت مسلمہ کا مرکزہ (nucleus) ''اُمیّین'' پر مشتمل ہے۔ یعنی بنو اسماعیل اور حضور ﷺ کے زمانے کے تمام اہلِ عرب جو اُس وقت آپ ؐ کے براہِ راست مخاطب تھے۔ اس کے بعد نیوکلیس کے گرد پہلا دائرہ ایرانیوں کے الیکٹرانز سے بنا۔ پھر رومی' قبطی' سندھی' ہندی وغیرہ اقوام کے الیکٹرانز کے دائرے بنے اور پھیلتے گئے۔ یہ دائرے ظاہر ہے قیامت تک مزید بھی پھیلیں گے لیکن اُمیّین (نیوکلیس) کے علاوہ باقی تمام اقوام کا شمار ''آخرین'' میں ہوگا۔ حضور ﷺ کی دعوت کے حوالے سے ''اُمیین'' اور ''آخرین'' میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اُمیین پر وہی قانون لاگو ہوا جو سابقہ رسولوں کی اقوام پر ہوا تھا۔ یعنی اِتمامِ حجت کے بعد بھی جو لوگ ایمان نہ لائیں انہیں نیست و نابود کر دیا جائے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی طرف سے اِتمامِ حجت ہو جانے کے بعد ''اُمیین'' کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی گئی۔ ۹ ہجری میں ان کو ایک اعلانِ عام (سورۃ التوبہ' رکوع اول) کے ذریعے متنبہ کر دیا گیا کہ چار ماہ کے اندر اندر ایمان لے آؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے برعکس ''آخرین'' پر مذکورہ قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان میں سے کوئی اسلام کی دعوت کو مانے یا نہ مانے' ایمان لائے یا نہ لائے اسے اختیار ہے۔ حتیٰ کہ اسلام کے مکمل غلبے کی صورت میں بھی کسی سے اس کے مذہب کے بارے میں تعرض نہیں ہوگا۔ البتہ ملک کا نظام اللہ کے قانون کے مطابق چلایا جائے گا' اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا۔

آیت ۴ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ ''اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے فضل کے بہت سے درجات ہیں اور ان میں سب سے اونچا اور اعلیٰ درجہ پوری کائنات میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے مختص ہے: ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل) ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا فضل آپ ؐ پر بہت بڑا ہے''۔ حضور ﷺ کے بعد ہر اُس شخص پر بھی اللہ کا بہت بڑا فضل ہے جو حضور ﷺ کے دامن سے وابستہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمیں اس نے اپنا یہ فضل پیدائشی طور پر عطا فرما دیا اور ہمیں ایسے گھروں میں پیدا کیا جہاں پیدا ہوتے ہی ہم نے اپنے کانوں میں اذان اور اقامت کی آوازیں سنیں۔ سورۃ الحجرات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ (آیت ۱۷) کہ تم پر یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ اب اگر ہم اپنے رویے سے اللہ کے اس فضل اور احسان کی ناقدری کریں اور اللہ کی نافرمانی کے راستے پر چل کر راندۂ درگاہ ہو جائیں تو ہم سے بڑا بدنصیب کون ہوگا!

اس حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھنے کا ہے کہ اللہ کے فضل کا تعلق دنیوی آسائش و آرام اور مال و دولت سے نہیں ہے۔ اس ضمن میں خود حضور ﷺ کی مثال ہی لے لیجیے۔ دُنیوی لحاظ سے تو آپ ؐ کو بہت سی محرومیوں کا سامنا تھا۔ آپ ؐ کو اللہ تعالیٰ نے یتیم پیدا کیا۔ آپ ؐ کی پیدائش کے وقت گھر کی مالی حالت ایسی تھی کہ کوئی دایہ

آپؐ کی پرورش کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ حلیمہ سعدیہؓ نے بھی آپؐ کو صرف اس لیے قبول کیا کہ انہیں کوئی اور بچہ ملا نہیں تھا۔ اس کے بعد آپؐ کے لڑکپن اور جوانی کا دور بھی سخت مشقت اور مزدوری میں گزرا۔ آپؐ خود فرماتے ہیں کہ میں چند ٹکوں کے عوض قریش کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ متعلقہ حدیث میں درہم یا دینار کا ذکر نہیں بلکہ ''قَرَارِیط'' کا لفظ آیا ہے جو ریزگاری کے لیے استعمال ہوتا تھا' یعنی چند ٹکے یا پیسے۔ آپؐ کی اس دور کی زندگی کی جھلک سورۃ الضحٰی کی ان آیات میں بھی نظر آتی ہے:

﴿اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۞ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۞ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۞﴾

''کیا اُس نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر آپ کو ٹھکانہ دیا! اور آپ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راہ دکھلائی! اور آپ کو نادار پایا تو مالدار کر دیا!''

اس کے بعد دورِ نبوت میں بھی آپؐ کی زندگی مسلسل فقر و فاقہ اور مصائب و مشکلات میں گزری۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپؐ کو شاعر اور مجنون کہا گیا' اوباش اور آوارہ لڑکوں نے پتھراؤ کر کے آپؐ کو لہولہان کر دیا۔ غرض آپؐ کی دنیوی زندگی مجموعی طور پر سخت مشکلات اور مشقت میں گزری۔ جبکہ دوسری طرف آپؐ کی شان یہ ہے کہ پوری کائنات میں اللہ کا سب سے بڑا فضل آپؐ پر ہے۔ چنانچہ اللہ کے فضل کے اپنے انداز اور اپنے پیمانے ہیں۔ دنیوی ناز و نعم' عیش و عشرت' عزت و شہرت وغیرہ کو اس کا معیار نہیں سمجھنا چاہیے۔

یہاں پر سورۃ کی پہلی چار آیات کا مطالعہ مکمل ہو گیا ہے۔ ان آیات میں حضور ﷺ کی بعثت کے حوالے سے آپؐ کے فرائضِ منصبی کا ذکر ہے اور اس امت کی ''آفاقی'' حیثیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی سابقہ امتِ مسلمہ (بنی اسرائیل) یک نسلی (uni racial) اُمت تھی' جبکہ موجودہ امتِ مسلمہ ملٹی نیشنل اُمت ہے' جس میں عربی' فارسی' ہندی' چینی وغیرہ ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ شامل ہیں' بلکہ اس وقت دنیا میں شاید ہی ایسی کوئی قوم یا نسل موجود ہو جس کے افراد اس امت میں شامل نہ ہوں۔ ان آیات میں دوسری بات یہ واضح کی گئی ہے کہ حضور ﷺ کا آلۂ دعوت اور آلۂ تربیت صرف اور صرف قرآن تھا۔ اسی سے آپؐ نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اسی سے انہیں انقلابی جدوجہد اور جہاد و قتال کے لیے تیار کیا۔

اب اگلی چار آیات میں بنی اسرائیل کی مثال کا آئینہ دکھا کر ہمیں ہمارے مجموعی طرزِ عمل سے آگاہ کیا جا رہا ہے:

آیات ۵ تا ۸

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۞ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۞ وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۞ قُلْ اِنَّ

الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْکُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ع ۸ ۱۱

آیت ۵ ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ﴾ ''مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے' پھر وہ اس کے حامل ثابت نہ ہوئے' اُس گدھے کی سی (مثال) ہے جو اٹھائے ہوئے ہو کتابوں کا بوجھ۔''

جب وہ لوگ حامل تورات ہو کر بھی تورات سے بے گانہ رہے تو ان میں اور اس گدھے میں کیا فرق رہ گیا جو اپنی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ ظاہر ہے ایک گدھے پر آپ مکالماتِ افلاطون لاد دیں یا انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کی تمام جلدیں رکھ دیں' اس سے اس کے اندر نہ تو کوئی فلسفیانہ بصیرت پیدا ہوگی اور نہ ہی اس کے دماغ میں کوئی معلومات منتقل ہو سکیں گی ــــــ آیت کے اس حصے میں لفظ حمل مختلف صیغوں میں تین مرتبہ آیا ہے۔ حمل ایسے بوجھ کو کہا جاتا ہے جسے آدمی اٹھا کر چل سکے۔ اسی معنی میں حمّال (قلی) اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بوجھ وغیرہ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جائے اور یہی مفہوم عورت کے حمل کا بھی ہے: ﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ﴾ (لقمن:١٤) ''اس کو اٹھائے رکھا اس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر''۔ عورت کو یہ حمل اٹھانے میں مشقت اور تکلیف کا سامنا تو کرنا پڑتا ہے' لیکن اس کے لیے اس بوجھ کو اٹھائے پھرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اِصْر (البقرة:٢٨٦' الاعراف:١٥٧) ایسا بوجھ ہے جس کا اٹھانا انسان کے لیے ممکن نہ ہو اور وہ اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ جس قوم کو اپنی کتاب عطا کرتا ہے اس قوم پر اس کتاب کے حقوق کا بوجھ بھی ڈالتا ہے۔ ان حقوق میں کتاب پر ایمان لانے' اس کے احکام پر عمل کرنے اور اس کی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کی ذمہ داری کا بوجھ بھی شامل ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَهٗ ز﴾ (آل عمران:١٨٧) ''اور یاد کرو جبکہ اللہ نے ان لوگوں سے ایک قول و قرار لیا تھا جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لازماً اُسے لوگوں کے سامنے واضح کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں''۔ یہ میثاق اہلِ تورات سے لیا گیا تھا جبکہ قرآن مجید میں اہلِ کتاب سے متعلق ایسے واقعات اور ایسی مثالوں کا ذکر ہمیں خبردار کرنے کے لیے آیا ہے' کہ اے اہلِ قرآن تمہیں بھی اپنی کتاب کے حقوق کما حقہ ادا کرنے ہیں اور اس کی تعلیمات کو لوگوں کے لیے عام کرنا ہے۔ ورنہ کتابوں کا بوجھ اٹھانے والے گدھے کی مثال کا اطلاق تم پر بھی ہوگا۔ اس حوالے سے حضرت عبیدہ الملیکی رضی اللہ عنہ کا روایت کردہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بہت اہم ہے:

((یَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ، وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ، وَافْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِیْهِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ)) (۱)

''اے قرآن والو! تم قرآن کو تکیہ (ذہنی سہارا) نہ بنالینا' بلکہ تمہیں چاہیے کہ رات اور دن کے اوقات میں

---

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان' بحوالہ مشکاۃ المصابیح' کتاب فضائل القرآن' باب آداب التلاوۃ ودروس القرآن۔

اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' اور اس کو پھیلاؤ' اور اس کو خوش الحانی سے پڑھو' اور اس میں تدبر کرو' تا کہ تم فلاح پاجاؤ۔''

مقامِ عبرت ہے! آج ہم قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کے لیے تو غور کرنے کو بھی تیار نہیں' لیکن اس کو تکیہ بنانے کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے میں ہم بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال ایوبی دور کی یادگار' سونے کی تاروں سے لکھا ہوا چالیس من وزنی قرآن مجید کا وہ نسخہ ہے جسے ہم نے پچھلے پچاس سال سے لاہور میں نمائش کے لیے رکھا ہوا ہے۔

﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''بہت بری مثال ہے اس قوم کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔''

یہ یہودیوں کی طرف سے کلام اللہ کی عملی یا حالی تکذیب کا ذکر ہے۔ قبل ازیں سورۃ الواقعہ کی آیت ۸۲ کے حوالے سے وضاحت کی جا چکی ہے کہ بالکل اسی طور سے ہم بھی قرآن مجید کو جھٹلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اپنی زبان سے نہ تو یہودی تورات کی تکذیب کرتے تھے اور نہ ہی ہم قرآن کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہیں۔ لیکن کیا ہم واقعی قرآن مجید کی عملی یا حالی تکذیب کے مرتکب ہو رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ایک ایسے تعلیم یافتہ نوجوان کا تصور کریں جو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پاکستان سے امریکہ گیا ہے۔ اس نوجوان سے اگر پوچھا جائے کہ کیا قرآن مجید اللہ کا کلام ہے تو وہ کہے گا کیوں نہیں! میں مانتا ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ لیکن اگر اس سے دوسرا سوال یہ کیا جائے کہ آپ نے اس کو کتنا پڑھا ہے اور اس کی تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے آپ نے کس قدر محنت کی ہے تو وہ (الا ماشاء اللہ) یہی جواب دے گا کہ مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ تو کیا اس نوجوان کا یہ عمل قرآن مجید کی تکذیب نہیں کر رہا ہے؟ کیا اس کا حال چیخ چیخ کر گواہی نہیں دے رہا کہ اس کے نزدیک اس کی وہ ڈگری قرآن مجید سے زیادہ اہم ہے' جس کے لیے وہ سات سمندر پار آ کر دیارِ غیر کی خاک چھان رہا ہے' لیکن قرآن مجید کو سمجھنے کی کبھی اس نے ہلکی سی کوشش بھی نہیں کی۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ''اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔''

اللہ تعالیٰ کی ہدایت معاذ اللہ کوئی ایسی حقیر شے نہیں جسے ہر شخص کی جھولی میں زبردستی ڈال دیا جائے۔ یہ تو صرف اسی شخص کو ملے گی جس کے دل میں اس کے حصول کی تمنا ہوگی اور جو اس کے حصول کے لیے تگ و دو کرے گا۔

آیت ۶ ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اے وہ لوگو جو یہودی ہو گئے ہو' اگر تمہیں واقعی یہ گمان ہے کہ بس تم ہی اللہ کے دوست ہو باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر''

زعم کا لفظ ''خیالِ خام'' کے معنی میں ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں کہ فلاں شخص کو فلاں چیز کا بڑا زعم ہے۔ تو اگر تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے چہیتے اور محبوب ہونے کا ایسا ہی زعم ہے:

﴿فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ ''تو تم موت کی تمنا کرو' اگر تم واقعی سچے ہو۔''

اگر تم واقعی اللہ کے محبوب اور دوست ہو تو تمہیں اپنے دوست سے وصل کی تمنا ہونی چاہیے اور یہ تمنا چونکہ موت کے ذریعے پوری ہو سکتی ہے اس لیے تمہارے دلوں میں ہر وقت موت کی خواہش موجزن رہنی چاہیے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ البقرۃ (آیات ۹۴'۹۵'۹۶) میں بھی آ چکا ہے۔

آیت ۷ ﴿وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ﴾ ''اور (حقیقت یہ ہے کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اپنے ان اعمال کے سبب جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ''اور اللہ ان ظالموں سے خوب واقف ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰي نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴﴾(القیامۃ) کے مصداق یہ لوگ اپنے کرتوتوں کو خوب جانتے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں چاہتے کہ انہیں موت آئے اور وہ اپنی بداعمالیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں۔

ہم مسلمانوں کے لیے بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات کی حیثیت ایک آئینے کی سی ہے۔ اس آئینے میں اگر ہم اپنی تصویر دیکھیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ زعم صرف بنی اسرائیل میں ہی نہیں پایا جاتا تھا بلکہ آج ہم مسلمانوں کی اکثریت بھی اسی سوچ کی حامل ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی کتاب سے ہمارا ذہنی و قلبی رشتہ نہ رہا تو اپنی تسلی کے لیے ہمیں خود ساختہ خوش فہمیوں (wishful thinkings) کا سہارا لینا پڑا۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے مؤثر خوش فہمی تو یہی ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے' ہم اللہ کے محبوب ترین نبی حضرت محمد ﷺ کی اُمت ہیں اور اس رشتے سے اللہ کے بہت ہی لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسے بھی گناہ گار سہی' آخرت میں ہمارے نبیؐ یقیناً ہماری شفاعت کریں گے اور دوزخ سے ہماری خلاصی کو یقینی بنائیں گے۔ اگر خدانخواستہ ہم میں سے کوئی فرد کسی بڑے جرم میں پکڑا بھی گیا تو اسے بھی بہت جلد دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارے ہاں یہ خوش فہمیاں پختہ ہو کر باقاعدہ عقائد کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ اب ایسی ضمانتوں کے ہوتے ہوئے بھلا کون احمق ہوگا جو نیک اعمال کے لیے مشقتیں اٹھائے اور رشوت' چور بازاری اور دوسری حرام کاریوں سے اجتناب کرتا پھرے: ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا' خدا فریبی کہ خود فریبی؟ عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

اقبال کا یہ شعر اس حوالے سے آج ہم پر ہو بہو صادق آتا ہے۔ پہلے تو ''مسلمان'' کے پاس عمل سے بچنے کے لیے صرف تقدیر کا بہانہ تھا' اب ہم نے مذکورہ بالا عقائد کی صورت میں بہت مضبوط سہارا بھی تلاش کر لیا ہے۔

آیت ۸ ﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی''

﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ ''پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اس ہستی کی طرف جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے''

اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے' جو کچھ تمہارے سامنے ہے اس کا بھی اور جو کچھ تمہارے پیچھے ہے اس کا

اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' اور اس کو پھیلاؤ' اور اس کو خوش الحانی سے پڑھو' اور اس میں تدبر کرو' تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔''

مقامِ عبرت ہے! آج ہم قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کے لیے تو غور کرنے کو بھی تیار نہیں' لیکن اس کو تکیہ بنانے کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے میں ہم بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال ایوبی دور کی یادگار' سونے کی تاروں سے لکھا ہوا چالیس من وزنی قرآن مجید کا وہ نسخہ ہے جسے ہم نے پچھلے پچاس سال سے لاہور میں نمائش کے لیے رکھا ہوا ہے۔

﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''بہت بری مثال ہے اس قوم کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔''

یہ یہودیوں کی طرف سے کلام اللہ کی عملی یا حالی تکذیب کا ذکر ہے۔ قبل ازیں سورۃ الواقعہ کی آیت ۸۲ کے حوالے سے وضاحت کی جا چکی ہے کہ بالکل اسی طور سے ہم بھی قرآن مجید کو جھٹلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اپنی زبان سے نہ تو یہودی تورات کی تکذیب کرتے تھے اور نہ ہی ہم قرآن کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہیں۔ لیکن کیا ہم واقعی قرآن مجید کی عملی یا حالی تکذیب کے مرتکب ہو رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ایک ایسے تعلیم یافتہ نوجوان کا تصور کریں جو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پاکستان سے امریکہ گیا ہے۔ اس نوجوان سے اگر پوچھا جائے کہ کیا قرآن مجید اللہ کا کلام ہے تو وہ کہے گا کیوں نہیں! میں مانتا ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ لیکن اگر اس سے دوسرا سوال یہ کیا جائے کہ آپ نے اس کو کتنا پڑھا ہے اور اس کی تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے آپ نے کس قدر محنت کی ہے تو وہ (الا ماشاء اللہ) یہی جواب دے گا کہ مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ تو کیا اس نوجوان کا یہ عمل قرآن مجید کی تکذیب نہیں کر رہا ہے؟ کیا اس کا حال چیخ چیخ کر گواہی نہیں دے رہا کہ اس کے نزدیک اس کی وہ ڈگری قرآن مجید سے زیادہ اہم ہے' جس کے لیے وہ سات سمندر پار آ کر دیارِ غیر کی خاک چھان رہا ہے' لیکن قرآن مجید کو سمجھنے کی کبھی اس نے ہلکی سی کوشش بھی نہیں کی۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ''اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔''

اللہ تعالیٰ کی ہدایت معاذ اللہ کوئی ایسی حقیر شے نہیں جسے ہر شخص کی جھولی میں زبردستی ڈال دیا جائے۔ یہ تو صرف اسی شخص کو ملے گی جس کے دل میں اس کے حصول کی تمنا ہو گی اور جو اس کے حصول کے لیے تگ ودو کرے گا۔

آیت ۶ ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اے وہ لوگو جو یہودی ہو گئے ہو' اگر تمہیں واقعی یہ گمان ہے کہ بس تم ہی اللہ کے دوست ہو باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر''

زعم کا لفظ ''خیال خام'' کے معنی میں ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں کہ فلاں شخص کو فلاں چیز کا بڑا زعم ہے۔ تو اگر تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے چہیتے اور محبوب ہونے کا ایسا ہی زعم ہے:

﴿فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ ''تو تم موت کی تمنا کرو' اگر تم واقعی سچے ہو۔''

اگر تم واقعی اللہ کے محبوب اور دوست ہو تو تمہیں اپنے دوست سے وصل کی تمنا ہونی چاہیے اور یہ تمنا چونکہ موت کے ذریعے پوری ہو سکتی ہے اس لیے تمہارے دلوں میں ہر وقت موت کی خواہش موجزن رہنی چاہیے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ البقرۃ (آیات ۹۴'۹۵'۹۶) میں بھی آ چکا ہے۔

آیت ۷ ﴿وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ﴾ ''اور (حقیقت یہ ہے کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اپنے ان اعمال کے سبب جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ''اور اللہ ان ظالموں سے خوب واقف ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰي نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴﴾(القیامۃ) کے مصداق یہ لوگ اپنے کرتوتوں کو خوب جانتے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں چاہتے کہ انہیں موت آئے اور وہ اپنی بداعمالیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں۔

ہم مسلمانوں کے لیے بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات کی حیثیت ایک آئینے کی سی ہے۔ اس آئینے میں اگر ہم اپنی تصویر دیکھیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ زعم صرف بنی اسرائیل میں ہی نہیں پایا جاتا تھا بلکہ آج ہم مسلمانوں کی اکثریت بھی اسی سوچ کی حامل ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی کتاب سے ہمارا ذہنی و قلبی رشتہ نہ رہا تو اپنی تسلی کے لیے ہمیں خود ساختہ خوش فہمیوں (wishful thinkings) کا سہارا لینا پڑا۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے مؤثر خوش فہمی تو یہی ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے' ہم اللہ کے محبوب ترین نبی حضرت محمد ﷺ کی اُمت ہیں اور اس رشتے سے اللہ کے بہت ہی لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسے بھی گناہگار سہی' آخرت میں ہمارے نبیؐ یقیناً ہماری شفاعت کریں گے اور دوزخ سے ہماری خلاصی کو یقینی بنائیں گے۔ اگر خدانخواستہ ہم میں سے کوئی فرد کسی بڑے جرم میں پکڑا بھی گیا تو اسے بھی بہت جلد دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارے ہاں یہ خوش فہمیاں پختہ ہو کر باقاعدہ عقائد کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ اب ایسی ضمانتوں کے ہوتے ہوئے بھلا کون احمق ہوگا جو نیک اعمال کے لیے مشقتیں اٹھائے اور رشوت' چور بازاری اور دوسری حرام کاریوں سے اجتناب کرتا پھرے: ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا' خدا فریبی کہ خود فریبی؟ عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

اقبال کا یہ شعر اس حوالے سے آج ہم پر ہو بہو صادق آتا ہے۔ پہلے تو ''مسلمان'' کے پاس عمل سے بچنے کے لیے صرف تقدیر کا بہانہ تھا' اب ہم نے مذکورہ بالا عقائد کی صورت میں بہت مضبوط سہارا بھی تلاش کر لیا ہے۔

آیت ۸ ﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی''

﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ ''پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اس ہستی کی طرف جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے''

اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے' جو کچھ تمہارے سامنے ہے اس کا بھی اور جو کچھ تمہارے پیچھے ہے اس کا

بھی۔ جو کچھ بحیثیت نوعِ انسانی تمہارے لیے واضح کر دیا گیا ہے اس کا بھی اور جو کچھ تم سے غیب میں رکھ دیا گیا ہے اس کا بھی۔

﴿فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝٨﴾ ''پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

یہاں پر چار آیات پر مشتمل سورت کے دوسرے حصے کا مطالعہ بھی مکمل ہو گیا۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت ہو چکی ہے کہ ان آیات میں تذکرہ تو یہود کا ہے لیکن یاددہانی ہماری مقصود ہے۔ چنانچہ ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے ہمیں ضرور سوچنا چاہیے کہ قیامت کے دن اگر تورات کے حقوق کے حوالے سے یہودیوں کا احتساب ہو گا تو ہم سے بھی پوچھا جائے گا کہ اللہ کے رسول ﷺ جو کتاب تم لوگوں کے حوالے کر کے گئے تھے اس کے حقوق کی ذمہ داری کو تم نے کس حد تک نبھایا؟ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر موجود لوگوں کو گواہ بنا کر قرآن مجید کے پیغام کو تمام نوعِ انسانی تک پہنچانے کی ذمہ داری امت کے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ اس حوالے سے آپؐ نے حاضرین کو مخاطب کر کے پوچھا تھا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ)) کہ کیا میں نے تم لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ تمام حاضرین مجمع نے جواب میں یک زبان ہو کر کہا تھا: اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ[1] ''ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا' حقِ امانت ادا کر دیا' حقِ نصیحت ادا کر دیا''۔ بعض روایات میں حاضرین کے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں: نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ رِسَالَاتِ رَبِّكَ ، وَنَصَحْتَ لِاُمَّتِكَ ، وَقَضَيْتَ الَّذِيْ عَلَيْكَ[2] ''ہم گواہ ہیں کہ آپ نے اپنے رب کے پیغامات کماحقہ پہنچا دیے' اور اپنی امت کے لیے حقِ نصیحت ادا کر دیا' اور اپنی ذمہ داری کماحقہ ادا کر دی!'' لوگوں کے اس جواب پر آپ ﷺ نے تین مرتبہ اللہ کو بھی گواہ بنایا: ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ)) کہ اے اللہ تو بھی گواہ رہ! یہ لوگ اعتراف کر رہے ہیں کہ میں نے تیرا پیغام ان تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))[3] کہ اب جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس طرح آپؐ نے قرآن مجید کی دعوت و تبلیغ پوری نوعِ انسانی تک پہنچانے کی بھاری ذمہ داری اپنی اُمت کی طرف منتقل فرما دی۔ ظاہر ہے اس ذمہ داری کے بارے میں کل ہم سے پوچھا تو جائے گا۔

آیات ۹ تا ۱۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبی ﷺ۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب المناسک' باب صفۃ حجۃ النبی ﷺ۔

(۲) مستدرک حاکم: ۱/۶۴۵ ' صحیح ابن خزیمہ: ۱۳۹۷ ' صحیح ابن حبان: ۲۸۵۶۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب خطبۃ ایام منی۔ وصحیح مسلم' کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات' باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

اَوْ لَهْوَا اِنْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا ۭ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ۧ ع ۱۲

سورت کے تیسرے اور آخری حصے میں نماز جمعہ کا ذکر ہے۔ نماز جمعہ دراصل ''حزب اللہ'' کا ہفتہ وار تعلیمی وتربیتی اجتماع ہے۔ ایسے اجتماعات کا انعقاد ہر انقلابی تحریک کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی زمانے میں کمیونسٹوں کے ہاں بھی اپنے کارکنوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ہفتہ وار ''سٹڈی سرکلز'' کا انعقاد بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ دراصل حزب اللہ کا نصب العین بہت عظیم اور راستہ بہت کٹھن ہے۔ اس راستے پر سفر جاری رکھنے کے لیے غیر معمولی صبر اور استقامت درکار ہے۔ اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ انقلابی کارکنوں کے ذہنوں میں ان کے بنیادی نظریے اور نصب العین کا شعور ہر لحظہ مستحضر رہے۔ چنانچہ جمعہ کے اجتماع کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ ہر سات دن کے بعد باقاعدگی کے ساتھ دور ونزدیک سے سب اہل ایمان اکٹھے ہوں اور اللہ کا کوئی بندہ نائب رسولؐ کی حیثیت سے ان کے لیے ''يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'' کا فریضہ سرانجام دے' تاکہ تعلیم وتربیت اور تزکیہ نفس کا عمل حضور ﷺ کے بعد بھی قیامت تک جاری وساری رہے۔

اجتماعِ جمعہ کے اس پہلو کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے لیے ظہر کی نماز مختصر کر دی گئی۔ یعنی ظہر کے چار فرائض کے بجائے صرف دو رکعتیں رہ گئیں اور باقی دو رکعتوں کی جگہ خطبہ یعنی ''تعلیم وتعلم'' کو لازم کر دیا گیا۔ اس لحاظ سے اجتماعِ جمعہ کو تعلیم بالغاں کا ہفتہ وار پروگرام بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس پروگرام کی اہمیت پچھلے زمانے میں اور بھی زیادہ تھی' جب نہ سکول کالج تھے' نہ یونیورسٹیاں تھیں' نہ کتابیں دستیاب تھیں' نہ اخبار چھپتے تھے اور نہ ہی آڈیو ویڈیو کی سہولیات میسر تھیں۔ برعظیم پاک وہند میں اجتماعِ جمعہ کی تعلیمی اہمیت کا شعور ماضی قریب کے زمانہ تک بھی موجود تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جمعہ کے دن شہر کی جامع مسجد میں دور دراز دیہات سے لوگ صبح سات آٹھ بجے ہی پہنچنا شروع ہو جاتے تھے۔ اس دور میں جمعہ صرف شہروں میں ادا کیا جاتا تھا' دیہات میں جمعہ نہیں ہوتا تھا۔ جمعہ کے لیے فقہاء نے ''مصرِ جامع'' کی شرط عائد کی ہے۔ یعنی جمعہ ہر بستی میں نہیں بلکہ صرف اس شہر میں ہو سکتا ہے جس میں بازار ہوں' قیامِ امن کا انتظام ہو' جامع مسجد ہو۔ لیکن جب ہر چھوٹی بڑی بستی میں جمعہ پڑھنا شروع کر دیا گیا تو مجموعی طور پر اجتماعِ جمعہ کی اہمیت کم ہونا شروع ہو گئی۔ ظاہر ہے جب ہر بستی میں جمعہ ہو رہا ہو تو لوگ اس کے لیے سفر کر کے شہر کی جامع مسجد میں بھلا کیوں جائیں گے؟

جمعہ کے اجتماعات تو آج بھی منعقد ہوتے ہیں' لوگ جوق در جوق ان میں شرکت بھی کرتے ہیں' خطبے بھی پڑھے اور سنے جاتے ہیں' لیکن یہ سب کچھ ایک ''رسمِ عبادت'' کے طور پر ہو رہا ہے' جبکہ اس اجتماع کا بنیادی فلسفہ اور اصل مقصد مجموعی طور پر ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ بقول اقبال: ؎

رہ گئی رسمِ اذاں' روحِ بلالیؓ نہ رہی   فلسفہ رہ گیا' تلقینِ غزالی نہ رہی!

بہرحال آج کل اجتماعِ جمعہ کے حوالے سے جو ظاہری اہتمام دیکھنے میں آتا ہے اس کی حیثیت اس عمارت کے کھنڈرات کی سی ہے جو عرصہ دراز سے زمین بوس ہو چکی ہے' لیکن ان کھنڈرات کو دیکھ کر اندازہ

کیا جا سکتا ہے کہ یہ عمارت بہت عظیم الشان تھی۔

آیت ۹ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ﴾ ”اے ایمان والو! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور کاروبار چھوڑ دو۔“

نماز تو بہرحال اللہ کا ذکر ہے ہی‘ لیکن یہاں اللہ کے ذکر سے خصوصی طور پر خطبہ جمعہ مراد ہے —— ”اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو“ کا مطلب یہ نہیں کہ بھاگتے ہوئے آؤ‘ بلکہ اس سے مراد مستعدی سے چل کھڑے ہونا‘ یعنی جلدی سے جلدی وہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔ نماز کے لیے بھاگ کر آنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

﴿ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ⑨﴾ ”یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔“

آیت ۱۰ ﴿فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ ”پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو“

یعنی جمعہ کے حوالے سے اسلام میں یہودیوں کے یومِ سبت جیسی سختی نہیں ہے کہ پورا دن اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص کر دو۔ بلکہ مسلمانوں سے اس دن صرف یہ تقاضا ہے کہ وہ نمازِ جمعہ سے قبل اپنے تمام کام کاج چھوڑ دیں۔ نہائیں دھوئیں‘ اچھے کپڑے پہنیں‘ خوشبو لگائیں اور بروقت مسجد میں پہنچ جائیں‘ تاکہ تعلیمی و تربیتی نشست سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ اسی لیے نمازِ جمعہ کے لیے اوّل وقت مسجد میں آنے والے کو حدیث میں اونٹ کی قربانی کے برابر ثواب کی بشارت دی گئی ہے۔ دوسری طرف نمازِ جمعہ ترک کرنے والے کے لیے حضور ﷺ نے سخت وعید سنائی ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ تَرَکَ ثَلَاثَ جُمُعَاتٍ مِنْ غَیْرِ عُذْرٍ طُبِعَ عَلٰی قَلْبِهٖ)) (۱)

”جو شخص بغیر کسی عذر کے مسلسل تین جمعے ترک کر دے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔“

اس وعیدی حکم میں بھی یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ ہو جو تعلیم و تربیت کے اس اجتماعی پروگرام سے مستقل طور پر کٹ کر رہ جائے۔ بہرحال جمعہ کے دن ”شرعی مصروفیت“ صرف نمازِ جمعہ کی ادائیگی تک ہی ہے‘ اس کے بعد ہر کوئی اپنی دنیوی مصروفیات کے لیے آزاد ہے۔ اس لیے حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ جمعہ کے دن ”آدھی چھٹی“ قرآن مجید کے مذکورہ حکم کے مطابق کرے۔ یعنی اگر جمعہ کے دن لوگوں کو آدھی چھٹی دینا ضروری ہے تو یہ چھٹی صبح کے وقت ہونی چاہیے تاکہ لوگ آسانی سے نمازِ جمعہ کی تیاری کریں‘ نماز ادا کریں اور نماز کے بعد معمول کے مطابق اپنے کام نپٹائیں۔

﴿وَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ⑩﴾ ”اور اللہ کو یاد کرو کثرت سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

آیت ۱۱ ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِ انْفَضُّوْٓا اِلَیْهَا﴾ ”اور جب انہوں نے دیکھا تجارت کا معاملہ یا کوئی کھیل تماشا تو اس کی طرف چل دیے“

---

(۱) معجم الاوسط للطبرانی: ۳/۱۶۹۔

﴿وَتَرَكُوكَ قَآئِمًا ؕ﴾ ''اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیا۔''

یہ خاص طور پر منافقین کے طرزِ عمل کا ذکر ہے کہ وہ تجارت اور کھیل تماشے کو اللہ کے ذکر پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں شام سے ایک تجارتی قافلہ عین نمازِ جمعہ کے وقت آیا اور اہلِ شہر کو اطلاع دینے کے لیے ڈھول بجانے شروع کر دیے۔ چونکہ قحط کا زمانہ تھا' لہٰذا حاضرین مسجد قافلے کی آمد کی اطلاع پا کر فوراً اس کی طرف لپکے۔ رسول اللہ ﷺ اُس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اکثر لوگ اس دوران اٹھ کر چلے گئے اور تھوڑے لوگ باقی رہ گئے جن میں عشرۂ مبشرہ بھی شامل تھے۔ واضح رہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے بعد بالکل قریبی دور کا ہے جبکہ لوگوں کو صحبتِ نبویؐ سے فیض یاب ہونے کا موقع بہت کم ملا تھا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ابتدا میں عیدین کے خطبہ کی طرح جمعہ کا خطبہ بھی نماز کے بعد ہوتا تھا' اس لیے خطبہ کے دوران اٹھ کر جانے والے لوگوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ نماز تو پڑھی جا چکی ہے اس لیے اب اُٹھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہرحال اس آیت میں بھی ڈانٹ کا انداز ہے اور اس میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس سے بھی مسلمانوں کی صفوں میں اسی کمزوری کی نشاندہی ہوتی ہے جس کا ذکر قبل ازیں سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔

﴿قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿١١﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر ہے کھیل کود اور تجارت سے۔ اور اللہ بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔''

سُوۡرَةُ الۡمُنٰفِقُوۡن

تمہیدی کلمات

زیر مطالعہ مدنی سورتوں کے گروپ میں چوتھا جوڑا سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن پر مشتمل ہے۔ ان میں سورۃ المنافقون کے آغاز میں تسبیح کا ذکر نہیں ہے جبکہ سورۃ التغابن کا آغاز تسبیح سے ہو رہا ہے۔ جہاں تک ان سورتوں کے مضامین کا تعلق ہے' سورۃ المنافقون میں نفاق اور منافقین کا تذکرہ ہے' جبکہ سورۃ التغابن کا بنیادی موضوع ایمان ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے' قرآن مجید کے وہ موضوعات جو طویل سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں ان کا خلاصہ مختصر سورتوں میں دے دیا گیا ہے۔ نفاق اور ایمان کا تعلق بھی ایسے ہی موضوعات سے ہے۔ نفاق کا ذکر تمام مدنی سورتوں میں ملتا ہے' کہیں ڈھکے چھپے انداز میں اور کہیں کھلم کھلا۔ سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ میں یہ موضوع اس لحاظ سے خصوصی طور پر نمایاں ہے۔ اسی طرح ایمان کا موضوع پورے مکی قرآن میں پھیلا ہوا ہے' بلکہ اس بحث کے خاص خاص نکات کہیں کہیں مدنی سورتوں کے اندر بھی آ گئے ہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت الآیات (آیت ۱۶۴) اور آیت الکرسی (آیت ۲۵۵) اس موضوع پر انتہائی جامع آیات ہیں۔ اس حوالے سے زیر مطالعہ دو سورتوں کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں قرآن کے ان دو اہم موضوعات پر طویل بحثوں کا خلاصہ سمو دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں سورتیں اپنے اپنے موضوع پر قرآن کی جامع ترین سورتیں ہیں۔

اس سورت کے باقاعدہ مطالعہ سے پہلے نفاق کے بارے میں چند اہم نکات کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ نکات اگرچہ قبل ازیں بھی کئی مرتبہ زیر بحث آ چکے ہیں لیکن موضوع کے حوالے سے یہاں انہیں ایک مرتبہ پھر سے دہرا لینا مفید رہے گا۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر نفاق کی دو قسمیں ہیں' یعنی شعوری نفاق اور غیر شعوری نفاق۔ شعوری نفاق یہ ہے کہ کوئی شخص سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اہل ایمان کو دھوکہ دینے کے لیے ایمان کا اقرار کرے۔ ایسا شخص تو گویا شروع سے ہی منافق ہے اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی ایمان نصیب نہیں ہوا۔ ایسے منافقین کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۷۲ میں آیا ہے۔ وہ لوگ باقاعدہ ایک سازش کے تحت صبح کے وقت ایمان لانے کا ڈھونگ رچاتے تھے اور شام کو اسلام سے پھر جانے کا اعلان کر دیتے تھے' تاکہ اسلام کی ساکھ کو نقصان پہنچا سکیں۔ ظاہر ہے ان کے دلوں میں تو ایمان ایک لمحے کے لیے بھی داخل نہیں ہوتا تھا۔ ایسے لوگوں کی کیفیت سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۱ میں یوں بیان کی گئی ہے: ﴿وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ﴾ کہ وہ کفر کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے اور کفر کے ساتھ ہی نکل گئے۔ بہرحال یہ شعوری نفاق کی مثال ہے۔ عملی طور پر اس قسم کے منافقین بہت کم پائے جاتے تھے۔

اس کے برعکس غیر شعوری نفاق کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک شخص کے پاس اسلام کی دعوت پہنچی۔ اس کے

دل نے اس کی تصدیق کی اور وہ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لے آیا۔لیکن بنیادی طور پر وہ چونکہ ایک کم ہمت شخص تھا' اس لیے ایمان کے عملی تقاضے پورے کرنے اور انقلاب کے راستے کی آزمائشوں کا سامنا کرنے سے گھبراتا رہا۔ خاص طور پر جب باقاعدہ تصادم کا مرحلہ آیا اور اہل ایمان سے تقاضا ہوا کہ وہ اپنی نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آجائیں تو ایسے کمزور لوگوں کی جان پر بن گئی۔اب ان میں سے کچھ لوگ تو اپنی کم ہمتی کے باوجود بھی سچے دل سے مسلمانوں کے ساتھ چمٹے رہے۔اس طرح کہ کبھی کوئی اچھا کام کرلیا تو کبھی کوئی نافرمانی بھی ہوگئی۔کبھی کسی تقاضے پر لبیک بھی کہہ لیا تو کہیں بہانہ بنا کر کھسک بھی گئے' لیکن جب جوابدہی ہوئی تو اپنی غلطی کو تسلیم کر کے خود کو سزا کے لیے پیش کر دیا۔سورۃ التوبہ میں ایسے لوگوں کے کردار کی کیفیت ﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا ؕ﴾ (آیت ۱۰۲) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔جن لوگوں کا معاملہ یہیں تک رہا کہ ان سے جب بھی کوئی کوتاہی ہوئی انہوں نے صاف گوئی سے اسے تسلیم کرلیا اور کوئی بہانہ نہ بنایا تو وہ نفاق سے بری رہے۔ایسے لوگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ضعفِ ایمان کے درجے میں تھے۔

البتہ ایسے معاملے میں اکثر انسان کی نام نہاد عزتِ نفس آڑے آجاتی ہے: ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ﴾ (البقرۃ:۲۰۶) یعنی جب انسان کو اللہ سے ڈرنے کا کہا جاتا ہے تو اس کی عزتِ نفس کی عصبیت اسے نافرمانی کی طرف گھسیٹ لے جاتی ہے' کہ دیکھو تم ایک عزت دار آدمی ہو' اپنی زبان سے خود ہی اپنی غلطیاں تسلیم کر کر کے کب تک لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہوگے؟ بس بہت ہوگئی' اب اس کے بعد یہ نہیں چلے گا! چنانچہ جو شخص اپنے نفس کے اس بہکاوے میں آکر خدا خوفی کی حد پار کر گیا اور اپنی غلطیاں چھپانے کے لیے جھوٹے بہانوں پر اُتر آیا اُس نے گویا نفاق کی سرحد میں پہلا قدم رکھ دیا۔بس یہ پہلا قدم رکھنے کی ہی دیر تھی' اب یوں سمجھیے کہ وہ جھوٹ کی دلدل میں پھنس گیا۔اس کے بعد وہ جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اس کے لیے اس دلدل میں مزید نیچے دھنستے جانے کا ہی سبب بنے گا۔صبح جھوٹ' دوپہر جھوٹ' شام جھوٹ' بلکہ بات بات پر جھوٹ۔پھر ایسا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کے جھوٹ بولنے اور جھوٹے بہانے بنانے پر لوگ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہیں تو وہ اپنے جھوٹے بہانوں کو سچا ثابت کرنے کے لیے جھوٹی قسموں کا سہارا لینا شروع کر دیتا ہے۔اگر نفاق کے مرض کو ٹی بی کے مہلک مرض سے تشبیہہ دیں تو قسموں کے اس مرحلے سے جان لینا چاہیے کہ اب متعلقہ شخص کا مرض دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

جب قسموں کو تکیہ کلام بنالینے سے اس کی اصل حقیقت سب پر عیاں ہونے لگتی ہے اور اسے خود بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ لوگوں نے اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے تو ردعمل کے طور پر اس کے دل میں ایمان اور اہلِ ایمان کے خلاف شدید نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔اس دشمنی کا اصل ہدف اہلِ ایمان کے قائد کی شخصیت بنتی ہے جیسے منافقینِ مدینہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اکثر ہرزہ سرائی کرتے رہتے تھے کہ دیکھیں مدینے میں سب لوگ آرام وسکون سے رہ رہے تھے۔اس ایک شخص (ﷺ) کے آجانے سے ہمارے لیے طرح طرح کے مسائل کھڑے ہوگئے ہیں' اس (ﷺ) نے بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا ہے' خاندانوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی رنجشیں پیدا کر دی ہیں۔اسی (ﷺ) کی وجہ سے یہودی قبائل کے ساتھ ہمارے حلیفانہ تعلقات ختم ہو کر رہ گئے

ہیں اور پورے عرب سے ہمیں لڑائیاں مول لینا پڑی ہیں۔ بہر حال جب یہ مرحلہ آ جائے تو سمجھ لیں کہ اب یہ مرض تیسری اور آخری سٹیج میں داخل ہو گیا ہے۔ کسی زمانے میں ٹی بی کے بارے میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ تیسری سٹیج پر پہنچ کر یہ مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔

اس بارے میں ایک اہم بات یہ بھی جان لیجیے کہ منافقین صرف انقلابی تحریک کی صفوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے آج ہمارے معاشرے کے جو لوگ دین کے تحریکی اور انقلابی تصور سے آشنا ہی نہیں وہ ضعیف الایمان تو ہو سکتے ہیں منافق نہیں۔ کیونکہ ان بے چاروں کو تو دین کا صحیح تصور دیا ہی نہیں گیا۔ انہیں تو مولویوں اور ان کے پیروں نے یہی بتایا ہے کہ دین بس نماز روزہ ہی کا نام ہے اور اگر رمضان میں لیلۃ القدر کی عبادت نصیب ہو گئی تو سمجھو زندگی بھر کے تمام گناہ دُھل گئے۔ اور جس نے حج یا عمرہ کر لیا وہ گناہوں سے بالکل ہی پاک ہو گیا' چاہے اس نے ساری عمر حرام خوریوں میں ہی کیوں نہ گزاری ہو۔ اب جس مسلمان کے ذہن میں دین کا یہ تصور ہو اس بے چارے کو منافقت سے کیا لینا دینا۔ منافقت تو وہاں جنم لیتی ہے جہاں قدم قدم پر تکلیفوں اور آزمائشوں کے پہاڑ عبور کرنے پڑتے ہیں۔ جہاں دین اپنے نام لیواؤں سے ان کے عیش و آرام اور جان و مال کی قربانیاں مانگتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص دین کے تحریکی اور انقلابی فلسفے کو اچھی طرح سے سمجھ لے اور اقامتِ دین کی جدوجہد کو فرضِ عین سمجھتے ہوئے کسی حقیقی انقلابی جماعت یا تحریک میں شمولیت اختیار کر لے اور پھر اس کے بعد امیر کے ڈانٹنے کی وجہ سے یا ایثار و قربانی کے تقاضوں سے گھبرا کر یا ایسی ہی کسی دوسری وجہ سے پیچھے ہٹ جائے تو وہ مرضِ نفاق کا شکار ہو جائے گا۔ البتہ اگر اس کے پیچھے ہٹنے کی وجہ کچھ اور ہو' مثلاً اس کو وہ تحریک اپنے مقصد سے ہٹتی ہوئی محسوس ہو یا تحریک کے طریق کار سے اسے اصولی اختلاف ہو جائے یا قائدین کے کردار میں اسے واضح خامیاں نظر آئیں تو یہ دوسری بات ہے۔ ایسی کسی صورت میں اگر وہ اس تحریک یا تنظیم کو چھوڑ دے گا تو وہ نفاق کا مرتکب نہیں ہو گا۔ لیکن ایسی صورت میں بھی وہ کسی مخصوص جماعت کو تو چھوڑ سکتا ہے' اقامتِ دین کی جدوجہد کو ترک کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ اقامتِ دین کی ضرورت' اہمیت اور فرضیت کو ایک دفعہ سمجھ لینے کے بعد اب اس جدوجہد کو جاری رکھنا اس پر فرض ہے' چاہے یہ فرض وہ کسی دوسری جماعت میں شامل ہو کر ادا کرے یا اس مقصد کے لیے خود کوئی نئی جماعت تشکیل دے۔ اس حوالے سے ہمیں حضور ﷺ کے اس فرمان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ فجر اور عشاء کی نماز باجماعت میں شریک نہ ہونے والوں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَثْقَلَ صَلَاۃٍ عَلَی الْمُنَافِقِیْنَ صَلَاۃُ الْعِشَاءِ وَصَلَاۃُ الْفَجْرِ' وَلَوْ یَعْلَمُوْنَ مَا فِیْھِمَا لَاَتَوْھُمَا وَلَوْ حَبْوًا ' وَلَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ آمُرَ بِالصَّلَاۃِ فَتُقَامَ ثُمَّ آمُرَ رَجُلًا فَیُصَلِّیَ بِالنَّاسِ ثُمَّ اَنْطَلِقَ مَعِی بِرِجَالٍ مَعَھُمْ حُزَمٌ مِنْ حَطَبٍ اِلٰی قَوْمٍ لَا یَشْھَدُوْنَ الصَّلَاۃَ فَاُحَرِّقَ عَلَیْھِمْ بُیُوْتَھُمْ بِالنَّارِ)) (۱)

''منافقوں پر سب سے بھاری نماز عشاء اور فجر کی نماز (باجماعت) ہے۔ اگر یہ ان دونوں نمازوں کی اہمیت کو جان جائیں تو ان میں شرکت کے لیے ضرور آئیں خواہ انہیں گھٹنوں کے بل آنا پڑے۔ اور

(۱) صحیح مسلم' کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ' باب فضل صلاۃ الجماعۃ ......' ح:۶۵۱۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں متعدد مقامات پر کم و بیش الفاظ کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

میں نے تو پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ نماز کھڑی کرنے کا حکم دوں' پھر کسی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے' پھر ایسے لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز (باجماعت) میں شریک نہیں ہوتے اور میرے ہمراہ ایسے ساتھی ہوں جن کے پاس لکڑیوں کے گٹھے ہوں اور میں جماعت میں نہ پہنچنے والوں کے گھروں کو ان کے سمیت آگ سے جلا دوں۔''

اگر جماعت سے نماز نہ پڑھنے والوں پر حضور ﷺ کی ناراضی کا یہ عالم ہے تو جماعتی نظم کو ترک کر کے زندگی گزارنے کے انجام کا ہمیں خود اندازہ کر لینا چاہیے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

آیات ۱ تا ۸

اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡہَدُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُ اللّٰہِ ۘ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُہٗ ؕ وَ اللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَکٰذِبُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ اِتَّخَذُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ جُنَّۃً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَفۡقَہُوۡنَ ﴿۳﴾ وَ اِذَا رَاَیۡتَہُمۡ تُعۡجِبُکَ اَجۡسَامُہُمۡ ؕ وَ اِنۡ یَّقُوۡلُوۡا تَسۡمَعۡ لِقَوۡلِہِمۡ ؕ کَاَنَّہُمۡ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ ؕ یَحۡسَبُوۡنَ کُلَّ صَیۡحَۃٍ عَلَیۡہِمۡ ؕ ہُمُ الۡعَدُوُّ فَاحۡذَرۡہُمۡ ؕ قٰتَلَہُمُ اللّٰہُ ۫ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۴﴾ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا یَسۡتَغۡفِرۡ لَکُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ لَوَّوۡا رُءُوۡسَہُمۡ وَ رَاَیۡتَہُمۡ یَصُدُّوۡنَ وَ ہُمۡ مُّسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۵﴾ سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ ؕ لَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۶﴾ ہُمُ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ لَا تُنۡفِقُوۡا عَلٰی مَنۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنۡفَضُّوۡا ؕ وَ لِلّٰہِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لٰکِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَا یَفۡقَہُوۡنَ ﴿۷﴾ یَقُوۡلُوۡنَ لَئِنۡ رَّجَعۡنَاۤ اِلَی الۡمَدِیۡنَۃِ لَیُخۡرِجَنَّ الۡاَعَزُّ مِنۡہَا الۡاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ وَ لِرَسُوۡلِہٖ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ لٰکِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸﴾ ع ۸/۱۲

آیت ۱ ﴿اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡہَدُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُ اللّٰہِ ۘ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔''

﴿وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُہٗ ؕ﴾ ''اور اللہ جانتا ہے کہ یقیناً آپ اُس کے رسول ہیں۔''

﴿وَ اللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۱﴾﴾ ''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین یقیناً جھوٹے ہیں۔''

یعنی آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی یہ لوگ صرف اپنی زبانوں سے دیتے ہیں' ان کے دل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے' اس لیے یہ لوگ جھوٹے (کٰذِبُوۡنَ) ہیں۔ جیسا کہ تمہیدی کلمات میں ذکر ہوا ہے بات بات پر جھوٹ بولنا مرضِ منافقت کی پہلی سٹیج ہے۔

آیت ۲ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور یہ اللہ کے راستے سے رُک گئے ہیں۔''

جہاد و قتال سے بچنے کے لیے یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر جھوٹے بہانے بناتے تھے کہ اللہ کی قسم میری بیوی سخت بیمار ہے' گھر میں کوئی دوسرا اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں' وغیرہ وغیرہ۔ جب نوبت قسموں تک پہنچ گئی تو گویا مرض دوسری سٹیج میں داخل ہو گیا۔

﴿اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲﴾ ''بہت ہی برا کام ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔''

آیت ۳ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ ''یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے''

یعنی ان کی منافقت شعوری نہیں ہے کہ وہ بدنیتی سے دھوکہ دینے کے لیے ایمان لائے ہوں۔ دینِ اسلام کی دعوت جب ان لوگوں تک پہنچی تھی تو ان کی فطرت نے گواہی دی تھی کہ یہ سچ اور حق کی دعوت ہے اور اس وقت وہ نیک نیتی سے ایمان لائے تھے۔ کچھ دیر کے لیے انہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی تھی' لیکن ایمان لاتے وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ ؏ ''یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے''۔ اہلِ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے:
﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۵۵)
کہ ہم تمہیں کسی قدر خوف' بھوک اور مال و جان کے نقصانات جیسی سخت آزمائشوں سے ضرور آزمائیں گے۔ لیکن منافقین کو اس صورتِ حال کا اندازہ نہیں تھا۔

منافقینِ مدینہ میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے قبیلے کے سردار کے پیچھے ایمان لے آئے تھے۔ جیسے اوس اور خزرج کے قائدین ایمان لے آئے تو پورا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ عملی طور پر ایمان کے تقاضے کیا ہیں۔ وہ تو برف کے تودے کی اوپری سطح (tip of the iceberg) ہی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس تودے کے نیچے کیا ہے۔ بہرحال ایسے لوگ ایمان تو سچے دل سے لائے تھے' لیکن ان کا ایمان تھا کمزور۔ اسی لیے تکلیفیں اور آزمائشیں دیکھ کر ان کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ البتہ ضعیف الایمان مسلمانوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ایمان کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان سے جب کوئی کوتاہی ہوئی تو انہوں نے اس کا اقرار بھی کیا اور اس کے لیے وہ معافی کے طلب گار بھی ہوئے۔ سورۃ التوبہ میں ان لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے اور وہاں ان کے ضعفِ ایمان کا علاج بھی تجویز کر دیا گیا:
﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ﴾(التوبۃ:۱۰۳) ''ان کے اموال میں سے صدقات قبول فرمایئے' اس (صدقے) کے ذریعے سے آپؐ انہیں پاک کریں گے اور ان کا تزکیہ کریں گے' اور ان کے لیے دعا کیجیے''۔ یعنی انفاق فی سبیل اللہ سے ان کے ایمان کی کمزوری دور ہو جائے گی۔ بہرحال جو لوگ ایک دفعہ ایمان لانے کے بعد مشکلات سے گھبرا کر ایمان کے عملی تقاضوں سے جی چرانے لگے اور اپنی اس خیانت کو جھوٹے بہانوں سے چھپانے لگے وہ منافقت کی راہ پر چل نکلے۔

﴿فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳﴾ ''تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی' پس یہ سمجھنے سے عاری ہو گئے۔''

ان کی منافقانہ روش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ چنانچہ اب ان کی سمجھ بوجھ کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے اور یہ حقیقی تفقہ سے عاری ہو چکے ہیں۔

آیت ۴ ﴿وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) جب آپ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کے جسم آپ کو بڑے اچھے لگتے ہیں۔''

جسمانی طور پر ان کی شخصیات بڑی دلکش اور متاثر کن ہیں۔

﴿وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ﴾ ''اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو آپؐ ان کی بات سنتے ہیں۔''

ظاہر ہے یہ لوگ سرمایہ دار بھی تھے اور معاشرتی لحاظ سے بھی صاحب حیثیت تھے۔ اس لحاظ سے ان کی گفتگو ہر فورم پر توجہ سے سنی جاتی تھی۔

﴿كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ﴾ ''(لیکن اصل میں) یہ دیوار سے لگائی ہوئی خشک لکڑیوں کی مانند ہیں۔''

حقیقت میں ان لوگوں کی حیثیت ان خشک لکڑیوں کی سی ہے جو کسی سہارے کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتیں اور انہیں دیوار کی ٹیک لگا کر کھڑا کیا جاتا ہے۔

﴿يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ ''یہ ہر زور کی آواز کو اپنے ہی اوپر گمان کرتے ہیں۔''

اندر سے یہ لوگ اس قدر بودے اور بزدل ہیں کہ کوئی بھی زور کی آواز یا کوئی آہٹ سنتے ہیں تو ان کی جان پر بن جاتی ہے۔ یہ ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں اور ہر وقت کسی ناگہانی حملے کے خدشے یا جہاد و قتال کے تقاضے کے ڈر سے سہمے رہتے ہیں۔

﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ﴾ ''(آپؐ کے) اصل دشمن یہی ہیں، آپ ان سے بچ کر رہیں!''

یہ ان کے مرضِ نفاق کی تیسری سٹیج کا ذکر ہے۔ ان کی دشمنی چونکہ دوستی کے پردے میں چھپی ہوتی ہے اس لیے یہاں خصوصی طور پر ان سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی جا رہی ہے کہ اے نبی ﷺ! یہ لوگ آستین کے سانپ ہیں۔ مشرکین مکہ کے لشکر آپ لوگوں کے لیے اتنے خطرناک نہیں جتنے یہ اندر کے دشمن خطرناک ہیں۔ لہٰذا آپؐ ان کو ہلکا نہ سمجھیں اور ان سے ہوشیار رہیں۔ ایسی صورت حال کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول بہت اہم ہے کہ ''فاختہ کی مانند بے ضرر لیکن سانپ کی طرح ہوشیار رہو''۔ منافقین اگرچہ حضور ﷺ سے دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے لیکن حضور ﷺ کی شان یہی تھی کہ آپؐ ان کی غلطیاں اور گستاخیاں مسلسل نظر انداز فرماتے رہتے تھے، بلکہ آپؐ اپنی طبعی شرافت اور مروّت کی وجہ سے ان کے جھوٹے بہانے بھی مان لیتے تھے۔ یہاں تک کہ غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقع پر جب آپ ﷺ نے بہت سے منافقین کو جھوٹے بہانوں کی وجہ سے پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ آگئی: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٤٣﴾﴾ (التوبۃ) ''(اے نبی ﷺ!) اللہ آپ کو معاف فرمائے (یا اللہ نے آپ کو معاف فرما دیا) آپ نے انہیں کیوں اجازت دے دی؟ یہاں تک کہ آپ کے لیے واضح ہو جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور آپ (یہ بھی) جان لیتے کہ کون جھوٹے ہیں!''

﴿قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۡ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ۝۴﴾ ''اللہ ان کو ہلاک کرے' یہ کہاں سے پھرائے جا رہے ہیں!''

تصور کیجیے یہ لوگ کس قدر قابل رشک مقام سے ناکام و نامراد لوٹے ہیں! ان کو نبی آخر الزماں ﷺ کا زمانہ نصیب ہوا' آپؐ کی دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے کی توفیق ملی' آپؐ کے قدموں میں بیٹھنے کے مواقع ہاتھ آئے۔ کیسی کیسی سعادتیں تھیں جو ان لوگوں کے حصے میں آئی تھیں۔ بقول ابراہیم ذوق: ع ''یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے''۔ مگر دوسری طرف ان کی بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ یہاں تک پہنچ کر بھی یہ لوگ نامراد کے نامراد ہی رہے۔ مقامِ عبرت ہے! کس بلندی پر پہنچ کر یہ لوگ کس اتھاہ پستی میں گرے ہیں: ؎

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند — دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا!

آیت ۵ ﴿وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا یَسۡتَغۡفِرۡ لَکُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ (اپنی غلطی مان لو) تاکہ اللہ کے رسول تمہارے لیے استغفار کریں''

ظاہر ہے ان کے دلوں میں تو نبی اکرم ﷺ کے خلاف بغض اور عناد پیدا ہو چکا تھا تو ان حالات میں وہ کیسے آتے اور کیونکر اپنی غلطی تسلیم کرتے؟

﴿لَوَّوۡا رُءُوۡسَہُمۡ﴾ ''تو وہ اپنے سروں کو مٹکاتے ہیں''

کہ ہاں ہاں! ٹھیک ہے ہم آئیں گے' ضرور آئیں گے۔

﴿وَ رَاَیۡتَہُمۡ یَصُدُّوۡنَ وَ ہُمۡ مُّسۡتَکۡبِرُوۡنَ ۝۵﴾ ''اور آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ رک جاتے ہیں تکبر کرتے ہوئے۔''

ان کے دلوں میں چونکہ تکبر ہے' اس لیے وہ آپؐ کے پاس آ کر معافی مانگنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں کہ دیکھیں جی آخر ہماری بھی کوئی عزت ہے' اب کون روز روز وہاں جا کر مجرموں کی طرح اقبالِ جرم کرے اور ڈانٹ سنے!

آیت ۶ ﴿سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں۔''

﴿لَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَہُمۡ ؕ﴾ ''اللہ ان کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔''

یہی مضمون اس سے زیادہ سخت الفاظ میں سورۃ التوبہ میں بھی آ چکا ہے۔ وہاں ان لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ سَبۡعِیۡنَ مَرَّۃً فَلَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَہُمۡ ؕ﴾ (آیت ۸۰) ''(اے نبی ﷺ!) آپ خواہ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں فرمائے گا''۔ لیکن حضور ﷺ کی نرم دلی اور مروّت کی اپنی شان ہے۔ آپؐ نے اس آیت کے نزول کے بعد ایک موقع پر مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ((لَوْ اَعْلَمُ اَنِّی اِنْ زِدْتُ عَلَی السَّبْعِیْنَ غُفِرَ لَهٗ لَزِدْتُ عَلَیْهَا)) (۱) ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ستر سے زیادہ

(۱) احکام الجنائز للالبانی' ح: ۱۲۱' راوی: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

مرتبہ استغفار کرنے سے اس کی معافی ہو سکتی ہے تو میں اس پر اضافہ کر لیتا''۔ واضح رہے کہ یہاں ستر کا عدد محاورے کے طور پر آیا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اب ان کے لیے آپؐ کا استغفار کرنا انہیں کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا۔ ان کے دلوں میں آپؐ کی عداوت اب اس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ ان کی بخشش ممکن ہی نہیں۔

اب آئندہ آیات میں ایک واقعہ کے حوالے سے اہل ایمان کے ساتھ منافقین کی عداوت کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔ یہ واقعہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی کے سفر میں پیش آیا تھا۔ مریسیع کے کنوئیں کے قریب جہاں لشکر کا پڑاؤ تھا' دو مسلمانوں کا پانی بھرنے پر آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک انصار کا حلیف تھا جبکہ دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خادم تھا' جس نے جذبات میں آ کر اس کو ایک لات رسید کر دی۔ اس پر منافقین نے اس کو بڑھا چڑھا کر مہاجرین اور انصار کے مابین جھگڑے کا رنگ دے دیا۔ عبداللہ بن اُبی نے' جو اس طرح کے مواقع کی ہمیشہ گھات میں رہتا' موقع سے فائدہ اٹھا کر مہاجرین کے خلاف انصار کے جذبات بھڑکانے کے لیے نہایت زہر آلود فقرے کہے۔ اس نے انصار کو مخاطب کر کے کہا کہ مدینہ والو! یہ ہمارے گھر میں پناہ پا کر اب ہمیں پر غرانے لگے ہیں۔ سچ کہا ہے جس نے کہا ہے کہ سَمِّنْ كَلْبَكَ يَأْكُلْكَ کہ تم اپنے کتے کو کھلا پلا کر خوب موٹا کرو تا کہ وہ تم ہی کو کاٹے۔ تم نے ان بے گھر لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ دی' ان کی مدد کی' انہیں کھلایا پلایا اور اپنے مال میں ان کو حصہ دار بنایا۔ یہ تمہاری اپنی غلطی کا خمیازہ ہے جو تمہیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اگر تم ان کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیتے تو یہ کب کے یہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے ــــ خدا کی قسم! اب ہم پلٹے تو جو باعزت ہیں وہ رذیلوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔ عبداللہ بن اُبی کی یہ بکواس وہاں موقع پر موجود ایک نوجوان صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سن رہے تھے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہو کر سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن اُبی کو بلا کر دریافت فرمایا تو وہ صاف مکر گیا' بلکہ اس نے الٹا احتجاج کیا کہ کیا آپؐ میرے معاملے میں اس چھوکرے (حضرت زید بن ارقمؓ) کی بات پر یقین کریں گے؟ اس طرح حضرت زیدؓ کی پوزیشن بڑی خراب ہو گئی۔ ان آیات کے نزول کے بعد جب واقعہ کی تصدیق ہو گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی خصوصی طور پر دلجوئی فرمائی اور شفقت سے ان کا کان مروڑتے ہوئے فرمایا کہ لڑکے کے کان نے غلط نہیں سنا تھا۔

اس واقعہ کے حوالے سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ عبداللہ بن اُبی کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک عملاً اسلامی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس بارے میں عام طور پر تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لے جانے کے فوراً بعد ہی وہاں باقاعدہ اسلامی ریاست وجود میں آ گئی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باقاعدہ ایک سربراہِ ریاست اور سربراہِ حکومت کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی' لیکن اُس دور کے معروضی حقائق اور واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر اسلامی لشکر کو چھوڑ کر جانے والے تین سو افراد سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ منافقین مدینہ اپنے فیصلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے یہودیوں سے کرواتے تھے۔ ظاہر ہے کسی ریاست میں تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس کی ایک تہائی فوج دشمن کے مقابلے سے بھاگ جائے اور ان میں سے کسی ایک فرد سے بھی اس بارے میں کوئی باز پرس نہ ہو' اور نہ ہی کسی ریاست کی

عملداری میں یہ ممکن ہے کہ اس کا کوئی شہری ریاست کی عدالت کو چھوڑ کر اپنا مقدمہ کہیں اور لے جائے۔ بہرحال اس حوالے سے اصل صورت حال یہ تھی کہ علاقے کی واحد منظم اور طاقتور جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے حضور ﷺ کو مدینہ میں معاشرتی و سیاسی لحاظ سے ایک خصوصی اور ممتاز مقام تو ہجرت کے فوراً بعد ہی حاصل ہو گیا تھا۔ البتہ آپؐ کے تحت ایک باقاعدہ ریاست فتح مکہ کے بعد قائم ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۹ ہجری میں غزوۂ تبوک سے رہ جانے والے لوگوں کا سخت مؤاخذہ ہوا۔

بہرحال عبداللہ بن اُبی کے معاملے میں حضور ﷺ نے بہت درگزر سے کام لیا۔ واقعہ افک میں اس کے کردار سے حضور ﷺ بہت آزردہ ہوئے تھے۔ اس دوران تو ایک موقع پر آپ ﷺ نے یہاں تک فرما دیا تھا کہ کیا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس شخص کی ایذا سے مجھے بچا سکے؟ لیکن آپؐ کا یہ فرمان بھی محض آپؐ کے جذبات کا اظہار تھا، جبکہ آپؐ نے اس کے خلاف کسی عملی اقدام کا حکم اس وقت بھی نہیں دیا۔ البتہ اس موقع پر اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ حضور! آپؐ مجھے حکم دیں، میں اس شخص کا کام تمام کرتا ہوں۔ اس پر خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے عبداللہ بن اُبی کے قتل کی بات اس لیے کی ہے کہ اس کا تعلق قبیلہ خزرج سے ہے! اور پھر حضرت سعد بن عبادہؓ ہی نے حضور ﷺ کو مشورہ دیا تھا کہ حضور! آپ اس شخص کے معاملے میں نرمی سے کام لیں۔ اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے ہم نے سونے کا تاج بھی تیار کر لیا تھا کہ اسی اثنا میں آپ مدینہ تشریف لے آئے۔ اس طرح اس کے سارے خواب بکھر گئے۔ ہمارے قبیلے پر ابھی تک اس کا اثر و رسوخ موجود ہے، اس لیے حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے خلاف سختی نہ کی جائے۔ بہرحال اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس وقت تک باقاعدہ اسلامی ریاست اور حکومت بھی وجود میں نہیں آئی تھی اور ابھی قبائلی عصبیتیں بھی کسی نہ کسی حد تک موجود تھیں۔ یعنی مجموعی طور پر حالات ایسے نہیں تھے کہ حضور ﷺ ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے عبداللہ بن اُبی کے خلاف کوئی سخت اقدام کرنے کا حکم دیتے۔ اس لیے آپؐ نے اس کا یہ جرم بھی نظر انداز کر دیا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۝۶﴾ ''یقیناً اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

آیت ۷ ﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ﴾ ''یہی ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ مت خرچ کرو ان پر جو اللہ کے رسول (ﷺ) کے گرد جمع ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ یہ منتشر ہو جائیں۔''

منافقین سمجھتے تھے کہ اگر اہل مدینہ مہاجر مسلمانوں پر خرچ کرنا بند کر دیں گے تو چند ہی دنوں میں یہ ساری بھیڑ چھٹ جائے گی۔ یہی بات عبداللہ بن اُبی نے متذکرہ بالا جھگڑے کے موقع پر انصارِ مدینہ سے کہی تھی۔

﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ۝۷﴾ ''حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے تو اللہ ہی کے ہیں، لیکن منافقین اس حقیقت کا فہم نہیں رکھتے۔''

یہاں آسمانوں اور زمین سے مراد پوری کائنات ہے۔

آیت ۸ ﴿يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ﴾ ''وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ لوٹ گئے تو جو طاقتور ہیں وہ لازماً نکال باہر کریں گے وہاں سے ان کمزور لوگوں کو۔''

عربی میں عزت کا اصل مفہوم طاقت اور غلبہ ہے' جبکہ ذلیل کے معنی کمزور اور بے حیثیت کے ہیں۔ مذکورہ واقعہ چونکہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپس آتے ہوئے راستے میں پیش آیا تھا اس لیے منافقین کے مکالمے میں یہاں مدینہ پلٹنے کا ذکر آیا ہے۔ عبداللہ بن اُبی نے لوگوں کے جذبات بھڑکاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ جب ہم مدینہ واپس پہنچیں تو بالکل متفق الرائے ہو کر یہ طے کرلیں کہ جو صاحبِ عزت ہیں' جو مدینہ کے قدیم باشندے (sons of the soil) ہیں وہ ان مہاجروں کو جو بڑے کمزور ہیں' جن کی کوئی حیثیت نہیں' مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ⑧﴾ ''حالانکہ اصل عزت تو اللہ' اُس کے رسولؐ اور مؤمنین کے لیے ہے' لیکن یہ منافق جانتے نہیں۔''

عبداللہ بن اُبی کے بیٹے کا نام بھی عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا' جو بہت مخلص' صادق القول اور صادق الایمان صحابی تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میرے باپ نے یہ بکواس کی ہے تو انہوں نے اپنے باپ کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ لشکر جب واپس مدینہ پہنچا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ تلوار سونت کر اپنے باپ کے راستے میں کھڑے ہوگئے۔ انہوںؓ نے عبداللہ بن اُبی سے کہا اب جب تک تم یہ نہیں کہو گے کہ میں ذلیل ہوں اور تمام عزت اللہ' اُس کے رسولؐ اور اہل ایمان کے لیے ہے' اُس وقت تک میں تمہیں شہر میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔ عبداللہ بن اُبی نے اُس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فریاد کی' لوگوں کے سامنے بھی دہائی دی کہ دیکھو میرا اپنا بیٹا میرے قتل کے درپے ہے۔ لیکن حضرت عبداللہؓ اپنے موقف پر قائم رہے اور انہوں نے اپنی مذکورہ شرط منوا کر ہی اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت دی۔

یہ آٹھ آیات تو نفاق کے مراحل اور اس کی تشخیص اور پیش بینی (prognosis) کے بارے میں تھیں۔ ان میں گویا مرضِ نفاق' اس کی علامات' اس کا نقطۂ آغاز' اس کا سبب' اس کے مختلف مراتب و مدارج اور اس کی ہلاکت خیزی' یہ تمام چیزیں زیر بحث آ گئیں۔ ان آیات کا خلاصہ یہی ہے کہ نفاق کی وجہ سے بالآخر انسان کے دل میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کے خلاف شدید دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بیماری انسان کو ہلاکت و بربادی کے راستے پر وہاں پر پہنچا دیتی ہے جہاں اللہ کے رسولؐ کا استغفار بھی اس کے کام نہیں آ سکتا۔

آیات ۹ تا ۱۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ⑨ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ⑩ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑪ ع

اب دوسرے رکوع کی تین آیات میں اس بیماری کا علاج بتایا گیا ہے۔ جس طرح طب میں ایک مرض کا

علاج دو طرح سے کیا جاتا ہے' ایک حفاظتی (preventive) قسم کا علاج ہے اور دوسرا معالجاتی (curative) طرز کا' اسی طرح یہاں بھی مرضِ نفاق کے علاج کے ضمن میں یہ دونوں پہلو سامنے آ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کسی بیماری کے حوالے سے انسان کی پہلی کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ وہ اس بیماری کی چھوت سے بچا رہے۔ اس کے لیے ظاہر ہے اسے پرہیزی اقدام (preventive measures) اپنانے کی ضرورت ہوگی۔ جیسے آج کل کسی بیماری سے بچنے کا مؤثر طریقہ یہی ہے کہ آپ متعلقہ ویکسی نیشن کا انجکشن لگوالیں۔ چنانچہ اب اگلی آیت میں اس اقدام کا ذکر ہے جسے نفاق کی بیماری سے بچنے کے لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنانا ضروری ہے۔

آیت ۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اے اہل ایمان! تمہیں غافل نہ کرنے پائیں تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے۔''

یہاں دو چیزوں کو معین کیا گیا ہے جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا باعث بنتی ہیں' یعنی مال اور اولاد۔ یہی مضمون آگے چل کر سورۃ التغابن میں نہایت واضح شکل میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ''جان لو تمہارے مال اور تمہاری اولاد ہی ذریعہ آزمائش ہیں''۔ یہی تو وہ کسوٹی ہے جس پر تمہیں پرکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ متنبہ کر دیا گیا کہ اہل ایمان! دیکھنا تمہیں تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ⑨﴾ ''اور جو کوئی ایسا کریں گے تو وہی خسارے میں رہیں گے۔''

یہاں اللہ کے ذکر سے مراد صرف یہی نہیں کہ انسان ہر وقت تسبیحات وغیرہ پڑھتا رہے' بلکہ اس کا وسیع تر مفہوم یہ ہے کہ انسان کو اللہ ہر وقت یاد رہے اور اسی بنا پر وہ اپنے جملہ فرائض کی ادائیگی کے لیے ہر وقت کمربستہ رہے۔ تو اے اہل ایمان! کہیں ایسا نہ ہو کہ اموال واولاد کے معاملات میں منہمک ہو کر تم لوگ اللہ ہی کو بھلا دو۔ جیسا کہ آج کل ہماری اکثریت کا حال ہے۔ آج اگر آپ لوگوں کو اللہ اور دین کی طرف بلائیں تو آپ کو عام طور پر یہی جواب ملے گا کہ کیا کریں جی وقت ہی نہیں ملتا! اب ظاہر ہے جو شخص ایک خاص ''معیارِ زندگی'' کو اپنا معبود بنا کر دن رات اس کی پوجا میں لگا ہو تو اُس کے پاس معبودِ حقیقی کی طرف رجوع کرنے کے لیے وقت کیونکر بچے گا؟ چنانچہ مرضِ نفاق کی چھوت سے بچنے کے لیے پرہیزی اقدام یہ بتایا گیا کہ اللہ کی یاد کسی وقت بھی تمہیں بھولنے نہ پائے۔ اور ساتھ ہی اللہ کی یاد کو بھلانے والے دو اہم ترین عوامل کی نشاندہی بھی کر دی گئی۔ ظاہر ہے کسی بھی بیماری کا علاج کرنے کے لیے اس کے اصل اور بنیادی سبب کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ جب بیماری کا سبب ڈھونڈ کر اس کی بیخ کنی کر دی جائے گی تو وہ بیماری دور ہو جائے گی۔ نفاق کی بیماری کا اصل سبب چونکہ دنیا کی محبت ہے اور دنیا کی محبت کا سب سے بڑا مظہر مال کی محبت ہے' لہٰذا اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دل سے مال کی محبت ختم کر دی جائے اور اس محبت کو ختم کرنے کا مؤثر طریقہ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے:

آیت ۱۰ ﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ ''اور خرچ کر دو اس میں

سے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے''

﴿فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾ ''پھر وہ اُس وقت کہے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے ایک قریب وقت تک کیوں مہلت نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا!''

گویا نفاق کی بیماری کا بالمثل علاج انفاق ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ کے تحت وضاحت کی جا چکی ہے کہ مال کی محبت کو دل سے نکالنے کے لیے دل کی زمین میں ''انفاق'' کا ہل چلانا پڑتا ہے اور جو لوگ یہ ہل چلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اصل کامیابی انہی کے حصے میں آتی ہے:

﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ......﴾

''یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیں' ان کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہوگا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر انہی میں سے صدیق اور شہداء ہوں گے اپنے رب کے پاس.....''

زیر مطالعہ آیت میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ایک بڑا حسرت کا وقت آئے گا جب انسان کفِ افسوس ملے گا کہ اے کاش! میں اس مال کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر سکتا۔ آج یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے مال جمع کر رہے ہیں اور گھروں کی آرائش و زیبائش پر بے تحاشا خرچ کر رہے ہیں' لیکن ایک وقت آئے گا جب اہل و عیال' عزیز و اقارب' مال و دولت اور جائیداد' سب کو چھوڑ کر یہاں سے جانا ہوگا۔ اُس وقت انسان حسرت سے کہے گا کہ پروردگار! کیوں نہ تو نے مجھے ذرا اور مہلت دے دی! تو اگر ذرا اس وقت کو ٹال دے تو پھر میں یہ سب کچھ تیری راہ میں لٹا دوں' سارا مال صدقہ کر دوں اور میں بالکل سچائی اور نیکوکاری کی راہ اختیار کر لوں۔ لیکن اُس وقت اس حسرت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ کی یہ سنتِ ثابتہ ہے کہ جب کسی کا وقت معین آ جائے تو پھر اسے مؤخر نہیں کیا جاتا!

آیت ۱۱ ﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ﴾ ''اور اللہ ہرگز مہلت نہیں دے گا کسی جان کو جب اُس کا وقت معین آ پہنچے گا۔''

قوموں کی ''اجل'' مؤخر ہونے کی ایک مثال تو موجود ہے' حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے معاملے میں عین وقت پر عذاب ٹالنے کا فیصلہ ہوا تھا' لیکن انسانوں کی انفرادی اجل کبھی مؤخر نہیں کی گئی۔

﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس وقت کی یہ جزع فزع اور نالہ و شیون بھی فی الحقیقت منافقانہ ہوگی۔ اگر کہیں بالفرض کوئی مہلت مل بھی جائے تو پھر دوبارہ مال کی محبت عود کر آئے گی اور پھر تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کنی کترا ؤ گے۔

سُوْرَۃُ التَّغَابُن

تمہیدی کلمات

سورۃ التغابن ایمانی مباحث کے حوالے سے قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ اس سے پہلے سورۃ المنافقون میں نفاق کا بیان تھا۔ نفاق انسان کے ''باطن'' کا منفی پہلو ہے' جبکہ اس کا مثبت پہلو ایمان ہے۔ مصحف میں سورۃ المنافقون کے بعد سورۃ التغابن کو لا کر گویا تصویر کے دونوں رخ یکجا کر دیے گئے ہیں۔ یہاں میں تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ سورۃ الحدید کے بعد دوسرے نمبر پر اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ سورت عطا کی ہے۔ اس سورت کا نظم اور اس کے اسرار و رموز اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے ذہن میں بہت واضح ہیں۔

اس سورت کے نظم کا مختصر تعارف یہ ہے کہ پہلے رکوع کی ابتدائی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ کا ذکر ہے' یعنی ایمان باللہ اور صفاتِ باری تعالیٰ' ایمان بالرسالت' اور ایمان بالآخرۃ یا ایمان بالمعاد۔ پھر اگلی تین آیات میں ایمان کی زوردار دعوت دی گئی ہے کہ یہ واقعی حقائق ہیں' ان کو قبول کرو' تسلیم کرو اور انہیں حرزِ جان بناؤ اور ان پر یقین سے اپنے باطن کو منور کرو۔ دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات اور ایمان کے نتیجے میں انسان کے فکر و نظر اور اس کی شخصیت میں جو تبدیلیاں رونما ہونی چاہئیں' ان کا بیان ہے۔ جیسے آم کا درخت اگر صحت مند ہوگا تو اس پر آم ضرور لگیں گے' اسی طرح ایمانِ حقیقی کے ظاہری و باطنی ثمرات بھی ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ ایمان کے ثمرات کے بیان کے بعد آخری تین آیات میں ایمان حقیقی کے تقاضوں کو عملی طور پر پورا کرنے کی نہایت زوردار اور مؤثر ترغیب و تشویق ہے' اور ان میں تقویٰ' سمع و طاعت اور انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ سورۂ مبارکہ چار حصوں میں منقسم ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

آیات ۱ تا ۷

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ لَہُ الۡمُلۡکُ وَلَہُ الۡحَمۡدُ ۫ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝۱ ھُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَّمِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ۝۲ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَصَوَّرَکُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَکُمۡ ۚ وَاِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ۝۳ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَیَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۴ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۫ فَذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِھِمۡ وَلَھُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝۵

ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

آیت ۱ ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ﴾ ''تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔''

سورۃ التغابن اَلْمُسَبِّحات کے سلسلے کی آخری سورت ہے۔ اس سلسلے کی سورتوں میں سے یہ دوسری سورت ہے جس کے آغاز میں یُسَبِّحُ کا صیغہ آیا ہے۔ اس سے پہلے یہ صیغہ سورۃ الجمعہ کی پہلی آیت میں آیا ہے۔ باقی تینوں اَلْمُسَبِّحات کی ابتدا میں سَبَّحَ کا صیغہ آیا ہے۔

﴿لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۡ﴾ ''اُسی کی بادشاہی ہے اور اُسی کے لیے حمد ہے۔''

کُل کائنات کی بادشاہی بھی اللہ ہی کی ہے اور کُل شکر و سپاس اور تعریف و ثنا کا مستحق حقیقی بھی صرف وہی ہے۔

﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱﴾ ''اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۲ ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ﴾ ''وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے' پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مؤمن۔''

ظاہر ہے تمام انسانوں کا خالق اللہ ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے خالق کا شکر گزار بن کر رہے' اسی کو اپنا معبود جانے اور اسی کے آگے جھکے۔ لیکن بہت سے انسان اللہ تعالیٰ کے منکر اور نافرمان ہیں۔ بظاہر تو یہ بہت عجیب بات ہے کہ مخلوق کا کوئی فرد اپنے خالق کا منکر یا نافرمان ہو لیکن واقعہ بہرحال یہی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت کے مضمون کے اعتبار سے اس جملے میں بہت بڑی وعید بھی پنہاں ہے اور ایک بشارت بھی مضمر ہے۔ یعنی اللہ ایک ایک انسان کے اعتقاد و نظریہ سے باخبر ہے۔ وہ ایک ایک انسان کی ایک ایک حرکت کو بھی دیکھ رہا ہے۔ وقت آنے پر وہ اپنے سب نافرمانوں سے نپٹ لے گا۔ ان الفاظ کا بشارت والا پہلو یہ ہے کہ جو اُس کے شکر گزار اور مطیع فرمان ہوں گے ان کو وہ انعام و اکرام سے نوازے گا۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور سب کی روش سے آگاہ ہے!

آیت ۳ ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ ''اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ''

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات عبث پیدا نہیں کی' بلکہ یہ ایک بہت ہی بامقصد اور نتیجہ خیز تخلیق ہے اور انسان اس کی تخلیق کی معراج ہے۔ چنانچہ کائنات کی تخلیق کے ذکر کے بعد خاص طور پر تخلیقِ انسانی کا ذکر فرمایا:

﴿وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ﴾ ''اور اُس نے تمہاری صورت گری کی تو بہت ہی عمدہ صورت گری کی۔''

انسانی ڈھانچے کی ساخت' جسم کی بناوٹ' چہرے کے خدوخال' غرض ایک ایک عضو کی تخلیق ہر پہلو سے کامل' انتہائی متناسب اور دیدہ زیب ہے۔

﴿وَاِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ ۝۳﴾ ''اور اُسی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے۔''

کیا تم لوگ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تخلیق کے بہترین درجے پر (فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ) بنا کر اور بہترین صلاحیتوں سے نواز کر جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کی سی بے مقصد زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا ہے؟ یا کیا تمہاری حیثیت اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک کھلونے کی سی ہے جسے اس نے صرف دل بہلانے کے لیے بنایا ہے اور اس کے علاوہ تمہاری تخلیق کا کوئی سنجیدہ مقصد نہیں ہے؟ نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اپنی نسل کے اعتبار سے تم اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی معراج ہو۔ تمہاری تخلیق ایک بامقصد تخلیق ہے۔ ابھی تم محض ایک وقفہ امتحان سے گزر رہے ہو' اس کے بعد تمہیں پلٹ کر اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے اور اپنی دنیوی زندگی کے اعمال و افعال کا حساب دینا ہے۔

اگلی آیت ''ایمان بالعلم'' کے حوالے سے قرآن کی جامع ترین آیت ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس موضوع پر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں جو تفصیلات آئی ہیں ان کا خلاصہ اس ایک آیت میں آ گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی تین جہتیں (dimensions) بیان ہوئی ہیں۔ پہلی جہت کیا ہے؟

آیت ۴ ﴿يَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے''

اب دوسری جہت ملاحظہ کیجیے:

﴿وَيَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ؕ﴾ ''اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔''

اور تیسری جہت کیا ہے؟

﴿وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۴﴾ ''اور اللہ اُس سے بھی باخبر ہے جو تمہارے سینوں کے اندر ہے۔''

اس آیت کے الفاظ اور مفہوم کے حوالے سے میں بہت عرصہ متردّد رہا کہ بظاہر تو یہاں الفاظ کی تکرار نظر آتی ہے کہ جو کچھ ہم چھپاتے ہیں وہی تو ہمارے سینوں میں ہوتا ہے' لیکن تکرارِ محض چونکہ کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے اس لیے مجھے یقین تھا کہ آیت کے تیسرے حصے میں ضرور کوئی نئی بات بتائی گئی ہے۔ پھر یکایک میرا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ مَا تُسِرُّوۡنَ کے لفظ میں ہمارے ان خیالات و تصورات کا ذکر ہے جنہیں ہم ارادی طور پر چھپاتے ہیں' جبکہ ''سینوں کے رازوں'' سے ہماری سوچوں کے وہ طوفان مراد ہیں جو ہمارے تحت الشعور (subconscious mind) میں اُٹھتے رہتے ہیں اور جن سے اکثر و بیشتر ہم خود بھی بے خبر ہوتے ہیں' بلکہ بسا اوقات ان خیالات کے بارے میں ہم دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں۔ چنانچہ آیت کے اس حصے کا مفہوم یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ تو تمہارے تحت الشعور کی تہوں میں اٹھنے والے ان خیالات کو بھی جانتا ہے جنہیں تم خود بھی نہیں جانتے' کیونکہ وہ تو

تمہارے جینز (genes) سے بھی واقف ہے: ﴿هُوَ اَعۡلَمُ بِكُمۡ اِذۡ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَاِذۡ اَنۡتُمۡ اَجِنَّةٌ فِيۡ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ ۚ﴾(النجم: ۳۲) ''وہ تمہیں خوب جانتا ہے اُس وقت سے جب اس نے تمہیں زمین سے اٹھایا تھا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں تھے۔''

آیت ۵ ﴿اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَبَؤُا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۫﴾ ''کیا تمہارے پاس خبریں آ نہیں چکی ہیں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا تھا پہلے''

قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ اور دوسری اقوام کے واقعات مکی قرآن میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔

﴿فَذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِهِمۡ﴾ ''تو انہوں نے اپنے کیے کی سزا چکھ لی''

انہوں نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا اور اس کفر کی پاداش میں انہیں ہلاک کر دیا گیا۔

﴿وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۝۵﴾ ''اور ان کے لیے دردناک عذاب بھی ہے۔''

دنیا کی سزا بھگتنے کے بعد ان اقوام کے افراد ابھی تو عالمِ بَرزخ میں ہیں، لیکن ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے وہ بھی ان کا منتظر ہے۔ اس بڑے عذاب کا سامنا انہیں آخرت میں کرنا پڑے گا۔

اب اگلی آیت میں ان کے کفر کے سبب کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔

آیت ۶ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتۡ تَّاۡتِيۡهِمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول آتے رہے واضح نشانیاں لے کر''

﴿فَقَالُوۡۤا اَبَشَرٌ يَّهۡدُوۡنَنَا ۡ فَكَفَرُوۡا وَتَوَلَّوۡا﴾ ''تو انہوں نے کہا کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟ پس انہوں نے کفر کیا اور رُخ پھیر لیا''

﴿وَّاسۡتَغۡنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيۡدٌ ۝۶﴾ ''اور اللہ نے بھی (ان سے) بے نیازی اختیار کی۔ اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز، ستودہ صفات۔''

یعنی ہر قوم کے لوگ صرف اس بنا پر اپنے رسولؑ کا انکار کرتے رہے کہ یہ تو ہماری طرح کا بشر ہے۔ یہ رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کے اس رویے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا کہ تم جدھر جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ جیسے رسالت کا انکار بر بنائے بشریت (کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا) غلط ہے، ایسے ہی بشریت کا انکار بر بنائے رسالت (کہ رسول بشر نہیں ہو سکتا) بھی غلط ہے۔ یہ دراصل ایک ہی سوچ کے دو رُخ ہیں۔ جیسے انسانی جسم کے اندر ایک بیماری کسی ایک عضو پر کینسر کی شکل میں حملہ کرتی ہے تو کسی دوسرے عضو پر اثر انداز ہونے کے لیے کسی اور روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نظریاتی بیماری کی ابتدائی صورت یہ سوچ تھی کہ ایک انسان یا بشر اللہ تعالیٰ کا رسول نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہر قوم نے اپنے رسولؑ پر بنیادی اعتراض یہی کیا کہ یہ تو بشر ہے، یہ بالکل ہمارے جیسا ہے، ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور ہماری طرح ہی چلتا پھرتا ہے۔ فلاں کا بیٹا ہے، فلاں کا پوتا ہے، ہمارے سامنے پلا بڑھا ہے۔ یہ رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ یعنی انہوں نے بشریت کی بنیاد پر رسولؑ کی رسالت کا انکار کر دیا۔ بعد میں اس بیماری نے دوسری شکل

اختیار کر لی۔ وہ یہ کہ جس کو رسول مان لیا پھر اسے بشر ماننا مشکل ہو گیا۔ کسی نے اپنے رسول کو خدا بنالیا تو کسی نے خدا کا بیٹا۔ صرف اس لیے کہ اسے بشر ماننا انہیں گوارا نہیں تھا۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں حضور ﷺ سے بار بار کہلوایا گیا: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (الکہف: ۱۱۰) کہ اے نبی ﷺ! آپ ڈنکے کی چوٹ پر کہیے اور بار بار کہیے کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ ہاں مجھے یہ امتیاز حاصل ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ لیکن قرآن مجید کے واضح اور تاکیدی احکام کے باوجود مذکورہ نظریات کے اثرات ہماری صفوں میں بھی در آئے‘ بلکہ ہمارے ہاں تو یہ بھی ہوا کہ اس مسئلے کے تدارک کے نام پر کچھ لوگ دوسری انتہا پر چلے گئے۔ چنانچہ اس حوالے سے اگر کسی نے ”بڑے بھائی“ کی مثال بیان کی یا اسی نوعیت کی کوئی دوسری دلیل پیش کی تو اس نے بھی حد ادب سے تجاوز کیا۔ ظاہر ہے جب فریقین ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے کے لیے بحث و تکرار کریں گے تو نامناسب الفاظ کا استعمال بھی ہو گا اور غلطیاں بھی ہوں گی۔

بہرحال اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر انسان ہی تھے‘ لیکن پیغمبروں کے بعض خصائص ایسے بھی ہوتے ہیں جو عام انسانوں کے نہیں ہو سکتے۔ حضور ﷺ کی سیرت میں ایسے کئی خصائص کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً جب صحابہ کرام ؓ نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ آپؐ خود تو صومِ وصال (کئی کئی دنوں کا روزہ اور اس طرح کے یکے بعد دیگرے کئی روزے رکھنے) کا اہتمام فرماتے ہیں لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتے‘ تو آپؐ نے فرمایا: ((اَيُّكُمْ مِثْلِيْ؟ اِنِّيْ اَبِيْتُ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِ))[۱] ”تم میں سے کون ہے جو مجھ جیسا ہے؟ میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے“۔ اسی طرح حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((فَوَ اللّٰهِ مَا يَخْفٰى عَلَيَّ رُكُوْعُكُمْ وَلَا سُجُوْدُكُمْ، اِنِّيْ لَاَرَاكُمْ وَرَاءَ ظَهْرِيْ))[۲] ”اللہ کی قسم! (نماز باجماعت میں) تمہارے رکوع اور تمہارے سجدے مجھ پر مخفی نہیں ہوتے‘ میں تو اپنے پس پشت بھی تمہیں دیکھ رہا ہوتا ہوں“۔ صحیح بخاری کی روایات میں وَلَا خُشُوْعُكُمْ کے الفاظ بھی ہیں کہ نماز میں تمہارا خشوع بھی مجھ سے مخفی نہیں ہوتا۔ پھر معراج کے موقع پر آپ ﷺ کا راتوں رات مکہ سے بیت المقدس تشریف لے جانا‘ اس کے بعد آسمانوں کی سیر کرنا اور سدرۃ المنتہٰی کے مقام پر خصوصی کیفیات کا مشاہدہ کرنا‘ یہ سب آپؐ کے امتیازی خصائص ہیں۔

دوسری طرف اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بنیادی طور پر آپؐ انسان تھے اور انسانی داعیات و میلانات رکھتے تھے۔ آپؐ کو چوٹ لگتی تو درد محسوس کرتے‘ جنگ اُحد میں زخم آیا تو خون کا فوارہ چھوٹ پڑا‘ بیٹا فوت ہوا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کبھی جذبات کی ایسی کیفیت بھی ہوئی کہ زبان سے بددعا بھی نکل گئی:

((كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ بِالدَّمِ!))[۳]

”اللہ تعالیٰ اُس قوم کو کیسے کامیاب کرے گا جس نے اپنے نبیؐ کا چہرہ خون سے رنگین کر دیا!“

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الصوم‘ باب التنکیل لمن اکثر الوصال ح ۱‘ ۱۹۶۵‘۶۸۵۱ء۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الصیام‘ باب النھی عن الوصال فی الصوم۔ ح:۱۱۰۳۔

(۲) صحیح مسلم‘ کتاب الصلاۃ‘ باب الامر بتحسین الصلاۃ واتمامھا والخشوع فیھا۔

(۳) صحیح ابن ماجه للالبانی‘ ح:۳۲۶۹۔

بہرحال بلاشبہ آپؐ بشر تھے‘ جیسا کہ قرآن مجید ہمیں تکرار کے ساتھ بتاتا ہے‘ لیکن آپؐ کی بشریت کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا تھا جو آپؐ کے شایانِ شان تھا ـــــ اب اگلی آیت میں ایمان بالآخرت کا ذکر ہے:

آیت ۷ ﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ﴾ ''کافروں کو یہ زعم ہے کہ وہ (مرنے کے بعد) ہرگز اٹھائے نہیں جائیں گے۔''

﴿قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: کیوں نہیں! مجھے میرے رب کی قسم ہے‘ تم لازماً اٹھائے جاؤ گے‘ پھر تمہیں لازماً جتلایا جائے گا ان اعمال کے بارے میں جو تم نے کیے ہیں۔''

اس اسلوب میں جو زور اور تاکید ہے انسانی زبان سے اس کا بیان ناممکن ہے! اللہ کا فرمان‘ رسول اللہ ﷺ کی قسم اور انتہائی تاکیدی صیغوں کا استعمال! اس سے بڑھ کر زوردار عبارت بھلا اور کونسی ہوگی۔ حضور ﷺ نے بنوہاشم کو دعوت کے سلسلے میں جو خطبہ دیا تھا اس کا مضمون اور اسلوب بھی اس جملے سے ملتا جلتا ہے۔ میرے کتابچے ''دعوت اِلی اللہ'' میں اس خطبے کا پورا متن موجود ہے۔ اس کتابچے کا انگریزی ترجمہ بھی Call to Allah کے عنوان سے ہو چکا ہے۔ اس خطبے کا اسلوب ملاحظہ ہو:

((وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءً، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا))(۱)

''خدا کی قسم تم سب مرجاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا‘ اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھائی اور برائی کا برائی‘ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی۔''

﴿وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝﴾ ''اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

یہ ابتدائی سات آیات ایمان کے بیان سے متعلق تھیں۔ ان میں پہلی چار آیات ذات وصفاتِ باری تعالیٰ پر ایمان سے متعلق ہیں۔ پھر دو آیات ایمانِ رسالت کے بارے میں ہیں‘ جبکہ ساتویں آیت کا تعلق ایمان بالآخرت سے ہے۔ اب اگلی تین آیات میں ایمان کی زوردار دعوت دی جا رہی ہے:

آیات ۸ تا ۱۰

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ع ۱۵

(۱) بحوالہ جمهرة الخطب‘ ص۵۔ وفقه السيرة للالبانی‘ ص ۹۷۔

آیت ۸ ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ’’پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول (ﷺ) پر‘‘
یہاں آیت کے آغاز کی ’’ف‘‘ بہت اہم ہے۔ گویا گزشتہ چار آیات کے مضمون کا ربط اگلی تین آیات کے مضمون کے ساتھ اس ’’ف‘‘ سے قائم ہو رہا ہے۔

﴿وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ؕ﴾ ’’اور اُس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ﴿۸﴾﴾ ’’اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔‘‘

اس آیت میں اللہ‘ رسولؐ اور آخرت سے متعلق تینوں ’’ایمانیات‘‘ کا ذکر آ گیا ہے۔ اللہ اور رسولؐ کا ذکر تو واضح ہے لیکن آخرت کا ذکر آیت کے آخری حصے ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ﴾ میں اشارتاً ہوا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہر انسان کے ایک ایک عمل کی نگرانی محض تحقیق و تدقیق کی غرض سے ہی تو نہیں کر رہا ہے‘ بلکہ آخرت میں انہیں سزا یا جزا دینے کے لیے کر رہا ہے —— اب اگلی دو آیات خاص طور پر ایمان بالآخرت کی دعوت سے متعلق ہیں:

آیت ۹ ﴿یَوْمَ یَجْمَعُكُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ﴾ ’’جس دن کہ وہ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن کے لیے‘ وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن۔‘‘

اصل جیت بھی اس دن کی جیت ہے اور اصل ہار بھی اس دن کی ہار ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہار یا جیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دنیا کی ہار جیت تو کسی ڈرامے کے کرداروں کی ہار جیت کی طرح ہے‘ جس کا متعلقہ کردار کی حقیقی زندگی سے کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا —— اب آگے وضاحت کی جا رہی ہے کہ قیامت کے دن کی جیت کس کے حصے میں آئے گی اور اس دن کی ہار کس کے گلے کا ہار بنے گی۔

﴿وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا﴾ ’’اور جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور نیک اعمال کرے‘‘
ان اعمال کی تفصیل آگے آئے گی۔

﴿یُّكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ﴾ ’’وہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اسے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی‘ وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔‘‘

﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴿۹﴾﴾ ’’یہ ہے بہت بڑی کامیابی۔‘‘

یہ جیت کی شرح ہوگئی‘ یعنی جنت میں داخلہ اور ہمیشہ کا خلود! گویا یہ ہے مستقل‘ واقعی اور حقیقی جیت! اس کے برعکس ہار کیا ہے؟ اسے اگلی آیت میں واضح فرما دیا گیا:

آیت ۱۰ ﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ﴾ ’’اور جنہوں نے انکار کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی وہی ہوں گے جہنمی‘ وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں۔‘‘

﴿وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ﴿۱۰﴾﴾ ’’اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔‘‘

گزشتہ دس آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ (ایمان باللہ‘ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت) کی بہترین اور

جامع ترین تعبیر بیان ہوئی ہے اور پھر ایمان کے لیے زوردار دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح کہ جس موضوع کا بیان مفصل ہے اس کے لیے دعوت مختصراً دی گئی ہے اور جو موضوع مختصر طور پر بیان ہوا ہے اس کی دعوت نسبتاً مفصل انداز میں آئی ہے۔ یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا بیان چھ آیات میں ہوا ہے اور ان کے لیے دعوت صرف ایک آیت (آیت ۸) میں دی گئی ہے۔ اس کے مقابل ایمان بالاخرت کا بیان صرف ایک آیت (آیت ۷) میں ہوا ہے لیکن اس کی دعوت کا ذکر دو آیات (آیت ۹ اور ۱۰) میں نسبتاً تفصیل سے ہوا ہے۔

آیات ۱۱ تا ۱۵

مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۞ وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ۞ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۞ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَاَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ ۚ وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۞ اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۞

دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ثمراتِ ایمانی کا ذکر ہے۔ ان میں سے پہلا ثمرہ یہ ہے:

آیت ۱۱ ﴿مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ”نہیں آتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اذن سے۔“

﴿وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۞﴾ ”اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اُس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔“

ایمانِ حقیقی کی بدولت انسان کے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگر اس پر کوئی مصیبت بھی آ جاتی ہے تو اس کا دل مطمئن رہتا ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے ہی آئی ہے اور یہ کہ میری بہتری اسی میں ہے: ﴿وَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـًٔـا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـًٔـا وَّهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۞﴾(البقرۃ) ”اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے“۔ چنانچہ اپنے اس ایمان اور یقین کی وجہ سے ایک بندۂ مؤمن بڑی سے بڑی تکلیف اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی نہ تو دل میں شکوہ کرتا ہے اور نہ ہی حرفِ شکایت زبان پر لاتا ہے، بلکہ وہ ہر حال میں پیکرِ تسلیم و رضا بنا رہتا ہے کہ اے اللہ! میری بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے: بِيَدِكَ الْخَيْرُ! تیری طرف سے میرے لیے خوشی آئے یا غم، مجھے قبول ہے، تیری جو بھی رضا ہو اس کے سامنے میرا سر تسلیم خم ہے! بقول غالب:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی!

ظاہر ہے اس مقامِ خاص تک صرف سچے اور مخلص اہل ایمان ہی پہنچ پاتے ہیں۔ ایمانِ حقیقی سے محروم دلوں کے نصیب میں تسلیم و رضا کی حلاوت کہاں: ؎

آیت ۸ ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ”پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول (ﷺ) پر“
یہاں آیت کے آغاز کی ”ف“ بہت اہم ہے۔ گویا گزشتہ چار آیات کے مضمون کا ربط اگلی تین آیات کے مضمون کے ساتھ اس ”ف“ سے قائم ہو رہا ہے۔

﴿وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا﴾ ”اور اُس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔“

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑧﴾ ”اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

اس آیت میں اللہ، رسولؐ اور آخرت سے متعلق تینوں ”ایمانیات“ کا ذکر آ گیا ہے۔ اللہ اور رسولؐ کا ذکر تو واضح ہے لیکن آخرت کا ذکر آیت کے آخری حصے ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ میں اشارتاً ہوا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہر انسان کے ایک ایک عمل کی نگرانی محض تحقیق و تدقیق کی غرض سے ہی تو نہیں کر رہا ہے، بلکہ آخرت میں انہیں سزا یا جزا دینے کے لیے کر رہا ہے —— اب اگلی دو آیات خاص طور پر ایمان بالآخرت کی دعوت سے متعلق ہیں:

آیت ۹ ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ ”جس دن کہ وہ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن کے لیے، وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن۔“

اصل جیت بھی اس دن کی جیت ہے اور اصل ہار بھی اس دن کی ہار ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہار یا جیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دنیا کی ہار جیت تو کسی ڈرامے کے کرداروں کی ہار جیت کی طرح ہے، جس کا متعلقہ کردار کی حقیقی زندگی سے کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا —— اب آگے وضاحت کی جا رہی ہے کہ قیامت کے دن کی جیت کس کے حصے میں آئے گی اور اس دن کی ہار کس کے گلے کا ہار بنے گی۔

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا﴾ ”اور جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور نیک اعمال کرے“

ان اعمال کی تفصیل آگے آئے گی۔

﴿يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ ”وہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اسے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی، وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔“

﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑨﴾ ”یہ ہے بہت بڑی کامیابی۔“

یہ جیت کی شرح ہوگئی، یعنی جنت میں داخلہ اور ہمیشہ کا خلود! گویا یہ ہے مستقل، واقعی اور حقیقی جیت! اس کے برعکس ہار کیا ہے؟ اسے اگلی آیت میں واضح فرما دیا گیا:

آیت ۱۰ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ”اور جنہوں نے انکار کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی وہی ہوں گے جہنمی، وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں۔“

﴿وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑩﴾ ”اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔“

گزشتہ دس آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ (ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت) کی بہترین اور

جامع ترین تعبیر بیان ہوئی ہے اور پھر ایمان کے لیے زوردار دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح کہ جس موضوع کا بیان مفصل ہے اس کے لیے دعوت مختصراً دی گئی ہے اور جو موضوع مختصر طور پر بیان ہوا ہے اس کی دعوت نسبتاً مفصل انداز میں آئی ہے۔ یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا بیان چھ آیات میں ہوا ہے اور ان کے لیے دعوت صرف ایک آیت (آیت ۸) میں دی گئی ہے۔ اس کے مقابل ایمان بالاخرت کا بیان صرف ایک آیت (آیت ۷) میں ہوا ہے لیکن اس کی دعوت کا ذکر دو آیات (آیت ۹ اور ۱۰) میں نسبتاً تفصیل سے ہوا ہے۔

آیات ۱۱ تا ۱۵

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝۱۱ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝۱۲ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۳ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۴ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝۱۵

دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ثمراتِ ایمانی کا ذکر ہے۔ ان میں سے پہلا ثمرہ یہ ہے:

آیت ۱۱ ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ”نہیں آتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اذن سے۔“

﴿وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝۱۱﴾ ”اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ اُس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔“

ایمان حقیقی کی بدولت انسان کے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگر اس پر کوئی مصیبت بھی آ جاتی ہے تو اس کا دل مطمئن رہتا ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے ہی آئی ہے اور یہ کہ میری بہتری اسی میں ہے: ﴿وَعَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶﴾ (البقرۃ) ”اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے“۔ چنانچہ اپنے اس ایمان اور یقین کی وجہ سے ایک بندۂ مؤمن بڑی سے بڑی تکلیف اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی نہ تو دل میں شکوہ کرتا ہے اور نہ ہی حرفِ شکایت زبان پر لاتا ہے، بلکہ وہ ہر حال میں پیکرِ تسلیم و رضا بنا رہتا ہے کہ اے اللہ! میری بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے: بِیَدِكَ الْخَیْرُ! تیری طرف سے میرے لیے خوشی آئے یا غم، مجھے قبول ہے، تیری جو بھی رضا ہو اس کے سامنے میرا سر تسلیم خم ہے! بقول غالب:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ـــ بے نیازی تری عادت ہی سہی!

ظاہر ہے اس مقامِ خاص تک صرف سچے اور مخلص اہل ایمان ہی پہنچ پاتے ہیں۔ ایمانِ حقیقی سے محروم دلوں کے نصیب میں تسلیم و رضا کی حلاوت کہاں: ؎

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت　　سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں مقامِ تسلیم و رضا کی برکات کا ذکر بڑے پُرشکوہ انداز میں کیا ہے: ؎

بروں کشید زپیچاکِ ہست و بود مرا　　چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!

(اس مقامِ رضا نے میرے کیسے کیسے عقدے حل کر دیے ہیں اور مجھے دنیا کی کیسی کیسی پریشانیوں سے نجات دلا دی ہے۔)

خوئے تسلیم و رضا کی وجہ سے انسان اپنا بڑے سے بڑا مسئلہ بھی اللہ کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اور جو انسان اس یقین سے محروم ہے وہ دن رات اسی پیچ و تاب میں پڑا رہتا ہے کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟ آخر یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ اگر میں اس وقت ایسا کر لیتا تو اس نقصان سے بچ جاتا! اگر میرا فلاں دوست عین وقت پر ایسا نہ کرتا تو ایسا نہ ہوتا! کاش میں یوں کر لیتا! کاش' اے کاش!...... گویا انسان اگر مقامِ تسلیم و رضا سے ناآشنا ہو تو چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اس کے دل کا روگ بن جاتے ہیں اور اس کے پچھتاوے کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ (سورۃ الصّف' سورۃ الجمعہ' سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن' یہ چاروں سورتیں ہمارے ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' میں شامل ہیں' جس کے مفصل دروس کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ مزید تفصیل کے لیے اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔)

اس حوالے سے یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اللہ کی رضا پر راضی رہنے اور ہر سختی یا تکلیف کو اس کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لینے کا تعلق انسان کے ایمان اور دل سے ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ کسی جرم کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہ کریں یا اپنے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی کا بدلہ نہ لیں۔ بہرحال ایمان کے ثمرات میں سے پہلا ثمرہ یہ ہے کہ حقیقی ایمان انسان کو مقامِ تسلیم و رضا سے آشنا کرتا ہے۔ لیکن اس کا تعلق چونکہ انسان کے احساسات سے ہے اس لیے یوں کہہ لیجیے کہ یہ وہ پھول ہے جو ایک بندۂ مؤمن کے دل کے اندر کھلتا ہے' باہر سے نظر نہیں آتا۔ باہر سے نظر آنے والے بڑے پھول کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

آیت ۱۲ ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی۔''

﴿فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ⑫﴾ ''پھر اگر تم نے پیٹھ موڑ لی تو جان لو کہ ہمارے رسول (ﷺ) کے ذمے تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچا کر اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے۔ ان احکام کے بارے میں اب ہر کوئی خود جواب دہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کے مقابلے میں اب کسی انسان کی دلیل بازی نہیں چلے گی۔ جیسے سود کی حرمت کا حکم سن کر بعض لوگوں نے کہا تھا: ﴿اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ﴾ کہ کاروبار کا منافع بھی تو ربا (سود) ہی کی مانند ہے! ایسے لوگوں کو واضح طور پر بتا دیا گیا کہ: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۷۵) کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ اب بھلا تم کون ہو اللہ کے واضح حکم کے بعد اپنی منطق بگھارنے والے؟ اگر تم اللہ کو مانتے ہو' اس کے رسولؐ کو مانتے ہو' اس کے قرآن کو مانتے ہو تو پھر اللہ' اس کے رسول ﷺ اور قرآن کے احکامات کے مقابلے میں تمہاری کوئی دلیل نہیں چلے گی۔

تمہیں سب احکام بے چون وچرا تسلیم کرنے ہوں گے۔ بقولِ اکبراللہ آبادی: ؎

رضائے حق پر راضی رہ‘ یہ حرفِ آرزو کیسا! — خدا خالق‘ خدا مالک‘ خدا کا حکم‘ تو کیسا؟

اوراگر نہیں مانتے ہو تو سیدھی طرح اقرار کرو کہ ہم نہیں مانتے۔ بس تمہارے پاس یہی دو راستے ہیں‘ یا تو اطاعت و فرمانبرداری کی روش اپناؤ یا پھر اس کے در سے اُٹھ کر چلے جاؤ! (either obey or go away)۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

آیت ۱۳ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴿۱۳﴾﴾ ’’اللہ وہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پس اہل ایمان کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔‘‘

اے اہل ایمان! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا‘ جو کچھ بھی ہوگا وہ اللہ کی مشیت اور مرضی سے ہوگا۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ محنت کرو اور اس کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اگر تم کوئی کام کرنے کی استطاعت بھی رکھتے ہو‘ تمہارے پاس تمام وسائل بھی موجود ہیں اور تم حالات کو بھی کلی طور پر سازگار دیکھتے ہو تو بھی کبھی مت کہنا کہ میں یہ کام ضرور کر لوں گا۔ اگر تم ایسا دعویٰ کر بیٹھو گے تو ایمان سے دور ہو جاؤ گے: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الکہف) ’’اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کریں کہ میں یہ کام کل ضرور کروں گا۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے!‘‘ کثرتِ وسائل کے زعم میں فتح کی امید رکھو گے تو وہی حال ہوگا جو لشکر اسلام کا وادیٔ حنین میں ہوا تھا۔ وادیٔ حنین میں دشمن کی تیراندازی کی وجہ سے اہل ایمان کی صفوں میں ایسی بھگدڑ مچی تھی کہ بارہ ہزار کے لشکر میں سے سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق تین چار سو اور ان کے استاد مولانا شبلی نعمانیؒ کے مطابق صرف تیس چالیس لوگ حضورﷺ کے ساتھ کھڑے رہ گئے تھے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۵ میں اس کا سبب بھی بتا دیا گیا: ﴿اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ﴾ (التوبۃ:۲۵) کہ اس دن اہلِ ایمان میں سے بعض لوگوں کے دلوں میں اپنی کثرتِ تعداد کا زعم پیدا ہو گیا تھا۔ بہرحال مؤمنین کو ہر طرح کے حالات میں اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے اور صادق الایمان مؤمنین ہر حالت میں بلاشبہ اللہ پر ہی توکل کرتے ہیں۔ یہ توکل علی اللہ بھی شجر ایمان کا وہ پھول ہے جو اہل ایمان کے دلوں اور ذہنوں کے اندر کھلتا ہے۔ گویا یہ ایمان کا تیسرا ثمرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تہذیب وتمدن کی گاڑی کو چلانے کے لیے ’’علائقِ دنیوی‘‘ کے ضمن میں بہت سی فطری محبتیں انسان کے دل میں ڈال دی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان محبتوں میں سب سے زیادہ قوی محبت بیویوں اور اولاد کی محبت ہے۔ اس طبعی محبت کی طرف اگلی آیت میں متنبہ فرمایا گیا کہ اگر اس میں حد اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہی محبت انسان کے لیے دشمنی کا روپ دھار لے گی۔ لہٰذا اس کے ضمن میں احتیاط کی ضرورت ہے:

آیت ۱۴ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ ’’اے ایمان کے دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں‘ سو ان سے بچ کر رہو۔‘‘

یہ بہت مشکل اور نازک معاملہ ہے۔ گزشتہ سورت میں رسول اللہ ﷺ کو منافقین کی عداوت سے بھی انہی الفاظ میں خبردار کیا گیا تھا: ﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ﴾ (المنٰفقون: ٤) کہ یہ لوگ تمہارے دشمن ہیں' ان سے بچ کر رہیے! جس طرح منافقین کی دشمنی تمہارے لیے نقصان دہ ہے' اسی طرح تمہارے بیوی بچوں کی محبت بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ نقصان بے شک کسی کی دشمنی کی وجہ سے ہو یا محبت کی وجہ سے' نقصان ہی ہے اور جو کوئی بھی آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو وہ ظاہر ہے آپ کا دشمن ہے۔ بیوی کی بے جا فرمائشیں اور بچوں کی حد سے بڑھی ہوئی ضروریات اگر حلال کی کمائی سے پوری نہیں ہوں گی تو انسان کیا کرے گا؟ ظاہر ہے حرام میں منہ مارے گا۔ اور اگر کوئی یہ نہیں کرے گا تو ڈالر اور پیٹروڈالر کمانے کے چکر میں ملک سے باہر چلا جائے گا۔ پیچھے سے بیوی بچے کیا کرتے ہیں؟ بوڑھے والدین کس حال میں ہیں؟ انہیں بیماری کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس کون لے کر جائے گا؟ اس کی بلا جانے! اس کی اپنی مجبوری ہے' مکان بنانا ہے' بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانی ہے' ان کی شادیاں کرنی ہیں اور اس سب کچھ کے لیے سرمایہ چاہیے۔ اور ظاہر ہے سرمایہ گھر بیٹھے تو نہیں ملتا' نہ ہی حلال کی کمائی سے ملتا ہے۔

اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ اور آخرت کی فکر عطا کی ہے اور وہ حرام سے بچتے ہوئے روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرنا چاہتا ہے تو اسے صبح وشام بیوی کے طعنے چین نہیں لینے دیتے کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے' تمہیں بچوں کے مستقبل کی فکر بھی نہیں۔ ذرا ہمسائے سے ہی سبق حاصل کر لیتے' کیا وہ مسلمان نہیں ہیں؟ وہ تم سے زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں' ان کی داڑھی بھی تم سے لمبی ہے' مگر وہ دین کے ساتھ ساتھ دنیا کو بھی نبھا رہے ہیں۔ ذرا دیکھو ان کے بیوی بچے کیسے عیش کر رہے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ اوپر کی کمائی سے ہو رہا ہے۔ اب تم کیا ان سے بھی بڑے دین دار ہو کہ جو سب کچھ ان کے لیے حلال ہے تم اسے اپنے اوپر خواہ مخواہ حرام کر کے بیٹھ گئے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

آج ہمارے ہاں کے روایتی مسلمانوں کو تو بیوی بچوں کی دشمنی والی یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی' لیکن اگر کوئی بندۂ مؤمن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کسی انقلابی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف ہے تو اس پر یہ حقیقت بہت جلد واضح ہو جائے گی کہ اس راستے میں بیوی بچوں کی محبت کس طرح پاؤں کی زنجیر بنتی ہے۔ یہ معاملہ چونکہ بہت نازک اور حساس ہے اس لیے اس سخت حکم کے بعد اگلے جملے میں اس ضمن میں نرمی اختیار کرنے کی ہدایت بھی کی جا رہی ہے۔ قوانین اور احکام کا یہ توازن کلامِ الٰہی کا خاص معجزہ ہے اور اس اعتبار سے یہ آیت اعجازِ قرآن کی بہت بڑی مثال ہے۔ ایک طرف متنبہ بھی کر دیا کہ تمہیں اپنے اہل وعیال کے معاملے میں سانپ کی طرح ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بیوی اور اولاد کی محبت تمہیں کسی غلط راستے پر ڈال دے۔ لیکن اگلے جملے میں عفو ودرگزر کا حکم بھی دے دیا کہ تم اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے اپنے اہل وعیال کے معاملات کو نرمی اور حکمت سے نبٹاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا گھر صبح وشام میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگے:

﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑭﴾ ''اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو اللہ بہت بخشنے والا' نہایت مہربان ہے۔''

اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بھی عفوو درگزر کا معاملہ فرمائے تو تم بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کرو۔ سورۃ النور کی اس آیت میں بھی بالکل یہی اسلوب نظر آتا ہے: ﴿وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۲﴾ ''اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا' نہایت مہربان ہے''۔ یہ آیت واقعہ افک کے حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ آپؓ نے اپنے ایک نادار رشتہ دار (حضرت مسطحؓ) کی کفالت کا ذمہ لے رکھا تھا' لیکن جب آپؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر کیچڑ اچھالنے میں اس کا بھی حصہ تھا تو آپؓ نے اس کی مدد سے ہاتھ روک لیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر تم خود اللہ سے معافی کے خواستگار رہو تو تم اسے معاف کر دو۔ بہرحال ان دونوں آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف اللہ تعالیٰ خود بہت معاف اور درگزر کرنے والا ہے بلکہ اپنے بندوں سے بھی وہ ایسے ہی رویے کو پسند کرتا ہے۔

زیر مطالعہ آیات میں اب تک ایمان کے چار ثمرات کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں سے پہلے تین کا تعلق تو ایک فرد کی انفرادی زندگی سے ہے' جبکہ چوتھا ثمرہ فرد کے گرد بننے والی اجتماعیت کے پہلے حلقے یعنی اس کے افرادِ خانہ سے متعلق ہے۔ انفرادی سطح کے تین ثمرات کو میں نے بندۂ مؤمن کی شخصیت کے چمن میں کھلنے والے خوبصورت پھولوں سے تشبیہہ دی ہے۔ ان میں سے دو پھول تو وہ ہیں جو اس کے دل کے اندر کھلتے ہیں اور باہر سے ہر کسی کو نظر نہیں آتے' یعنی خوئے تسلیم و رضا اور توکل علی اللہ۔ جبکہ تیسرا پھول اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا پھول ہے' جو شخصیت کے خارج میں کھلتا ہے۔ ظاہر ہے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کے حکم میں تو پورے کے پورے دین کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے معاشرے میں رہتے ہوئے یہ پھول بجا طور پر بندۂ مؤمن کی شخصیت کا طرۂ امتیاز بنتا ہے۔

ایمان کے چوتھے ثمرے کا تعلق بندۂ مؤمن کی عائلی زندگی سے ہے۔ اس حوالے سے آیت زیر مطالعہ ہمیں انتہائی متوازن اور معتدل رویے کا شعور عطا کرتی ہے۔ اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں اہل وعیال کی طبعی محبتوں کے منفی اثرات سے ہوشیار بھی رہنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عفوو درگزر کی حکمت عملی اپناتے ہوئے گھر کی فضا کو محاذ آرائی اور نفرت کے تکدر سے محفوظ رکھنے کی کوشش بھی کرتے رہنا ہے۔ اب اسی حوالے سے دوسری اصولی اور انتہائی اہم بات:

آیت ۱۵ ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ﴾ ''تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے امتحان ہیں۔''

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مال و دولت دنیا' یہ رشتہ و پیوند تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ﴾ (آل عمران: ۱٤) ''مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوباتِ دنیا کی محبت جیسے عورتیں اور بیٹے اور جمع کیے ہوئے خزانے سونے کے اور چاندی کے اور نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی اور کھیتی''۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں یہ محبتیں پیدا ہی ان کو آزمانے کے لیے کی ہیں۔ اس کا تو اعلان ہے کہ میرے

جس بندے کے دل میں مجھ تک پہنچنے کی تڑپ ہے' اسے ان تمام رکاوٹوں اور آزمائشوں کو عبور کر کے آنا ہوگا:

اِنہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ — مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے!

حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ)) (۱)

''جہنم کو نفس کی مرغوب چیزوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے اور جنت کو ناپسندیدہ چیزوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔''

ان ناپسندیدہ چیزوں میں مال و اولاد کی محبتوں کی قربانی سرفہرست ہے۔ آج اگر کسی شخص کے بارے میں آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کے دل میں کتنا ایمان ہے تو یہ دیکھ لیجیے کہ وہ اپنی اولاد کو کیا بنانا چاہتا ہے۔ بظاہر ایک شخص اگر بہت بڑا عالم دین' صوفی' مسند نشین اور پیر طریقت ہے لیکن اپنی اولاد کو وہ ایمان و آخرت کے راستے پر ڈالنے کے بجائے پیسے بنانے والی مشین بنانے کی کوشش میں ہے تو جان لیجیے کہ اس کے باطن میں دین اور دینی اقدار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اب اس سلسلے کی تیسری بات سنیے:

﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ ''اور اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔''

تمہارے اعمال کا اصل اجر اور بدلہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے ملے گا' لہٰذا کسی اور سے کسی اجر کی توقع نہ رکھنا۔ اولاد کے بارے میں بھی مت امید رکھنا کہ وہ تمہارے بڑھاپے کا سہارا بنے گی۔ ہوسکتا ہے یہی اولاد جس کے لیے آج تم اپنا ایمان تک داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتے ہو' بڑھاپے میں تمہیں ٹھوکریں مارے اور بعض اوقات اولاد کی زبان کی ٹھوکریں والدین کے لیے ان کی پاؤں کی ٹھوکروں سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اس تکلیف کی کیفیت اس باپ سے پوچھیں جس کا بیٹا اس کے سامنے سینہ تان کر کہتا ہے: ابا جان آپ ہمیشہ بے موقع بات کرتے ہیں' اس معاملے میں آپ خاموش رہیں' آپ کو کیا معلوم کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہے!

آیات ١٦ تا ١٨

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ع

اس سورۂ مبارکہ کی آخری تین آیات ایمان کے عملی تقاضوں کو بالفعل ادا کرنے کی دعوت پر مشتمل ہیں۔

آیت ١٦ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی حدِ امکان تک' اور سنو اور اطاعت کرو''

گویا ایمان باللہ کا عملی تقاضا یہ ہے کہ انسان میں اللہ کا تقویٰ پیدا ہو جائے' اور تقویٰ بھی تھوڑا بہت نہیں' بلکہ امکانی حد تک' جتنا اس کے حدِ استطاعت میں ہے —— البتہ کسی انسان میں کتنی استطاعت و استعداد اور وسعت

(۱) صحیح الجامع للالبانی' ح: ۳۱۲۶۔

وطاقت ہے جس کے مطابق وہ مکلّف اور جواب دہ ہے‘ اس کا صحیح شعور وادراک بسا اوقات اسے خود نہیں ہوتا اور وہ اپنے آپ کو دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں رعایتیں دیتا چلا جاتا ہے‘ حالانکہ انسان کا خالق خوب جانتا ہے کہ اس نے اس میں کتنی استطاعت‘ استعداد اور وسعت رکھی ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے مطابق ہر انسان کا محاسبہ اور مؤاخذہ فرمائے گا۔

ایمان کے بیان میں دوسرے نمبر پر ذکر تھا ایمان بالرسالت کا‘ لہٰذا یہاں ایمان کا دوسرا عملی تقاضا ''سمع و طاعت'' کے حوالے سے بیان ہوا‘ جس کا نقطۂ آغاز عملی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی ذات وشخصیت ہے — سمع وطاعت کا تعلق اصلاً ایمان باللہ سے ہے‘ لیکن عملاً اس کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے‘ اس لیے کہ اگرچہ مطاعِ حقیقی تو اللہ ہی ہے‘ مگر اللہ کا نمائندہ اور اس کے اِذن سے بالفعل ''مطاع'' بن کر رسول آتا ہے تو اس کی اطاعت گویا اللہ کی اطاعت ہی ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (آیت ٨٠) ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں پر وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا کا حکم خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ قبل ازیں آیت ١٢ میں جب وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا واضح حکم آچکا ہے تو اب یہاں کون سی اطاعت کے لیے بلایا جارہا ہے؟ اس مسئلے کو یوں سمجھئے کہ حضور ﷺ اپنی حیاتِ مبارکہ میں مختلف مواقع پر مختلف امور کے لیے امیر مقرر فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے مقرر کردہ امیر کی اطاعت بھی متعلقہ اہلِ ایمان پر اسی طرح لازم تھی جیسے کہ خود حضور ﷺ کی اطاعت۔ اس بارے میں حضور ﷺ کا یہ فرمان بہت واضح ہے:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ، وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ)) (١)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اصل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی‘ اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اُس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اُس نے گویا میری نافرمانی کی۔''

غزوۂ احد میں تیر اندازوں کی جس نافرمانی پر سورۂ آل عمران کی آیت ١٥٢ میں بھی وعید آئی اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اجتماعی سزا بھی دی گئی وہ دراصل حضور ﷺ کی براہِ راست نافرمانی نہیں تھی بلکہ آپؐ کے مقرر کردہ کمانڈر کے حکم کی نافرمانی تھی۔ اسی حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ امیر کی اطاعت صرف حضور ﷺ کی زندگی میں ہی لازم نہیں تھی بلکہ قیامت تک کے لیے لازم ہے اور آیت زیر مطالعہ میں دراصل اسی اطاعت کا ذکر ہے۔ مطلب یہ کہ دعوت واقامتِ دین کی جدوجہد کے مشن کو تو قیامت تک زندہ رہنا ہے۔ ہر زمانے میں اللہ کی مشیت اور توفیق سے اللہ کے بندے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اٹھتے رہیں گے اور اہلِ

---

(١) صحيح البخاري‘ كتاب الجهاد والسير‘ باب تعامل من وراء الامير ويتقى به۔ وصحيح مسلم‘ كتاب الامارة‘ باب وجوب طاعة الامراء في غير معصية……

ایمان کو دعوت دیتے رہیں گے۔ چنانچہ ہر دور کے اہل ایمان پر لازم ہے کہ جب بھی اللہ کا کوئی بندہ رسول اللہ ﷺ کے مشن کا علمبردار بن کر اٹھے اور مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کی صدا بلند کرے تو وہ اس کی بات سنیں۔ پھر اگر ان کا دل گواہی دے کہ اس کی دعوت خلوص و اخلاص پر مبنی ہے تو اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس کے اعوان و انصار بنیں اور اس کی اطاعت کریں۔ جیسے ماضی قریب میں سید احمد بریلویؒ حسن البناء شہیدؒ مولانا الیاسؒ اور مولانا مودودیؒ اپنے اپنے زمانے میں پورے خلوص کے ساتھ دعوت و اقامتِ دین کے علمبردار بن کر کھڑے ہوئے تھے اور بہت سے اہل ایمان نے اللہ کی توفیق سے ان کی آواز پر لبیک بھی کہا۔

یہ آیت آج ہم سے بھی تقاضا کرتی ہے کہ ہم ایسے ''داعی الی اللہ'' کی تلاش میں رہیں۔ پھر اگر ہمارا دل گواہی دے کہ اللہ کا فلاں بندہ واقعی خلوصِ نیت سے رسول اللہ ﷺ کے مشن کو لے کر کھڑا ہوا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی پکار پر لبیک کہیں' تاکہ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے سمع وطاعت کی بنیاد پر ایک مربوط و مضبوط و منظم جماعت وجود میں آسکے۔ ظاہر ہے اگر مسلمان خود کو ایک امیر کے تحت ایسی جماعت کی شکل میں منظم نہیں کریں گے تو ان کی حیثیت ایک ہجوم کی سی رہے گی۔ ذرا تصور کریں! ہر سال حج کے لیے لاکھوں مسلمانوں کا جو ''ہجوم'' اکٹھا ہوتا ہے' اگر یہ لوگ کسی ایک امیر کے تحت ایک جماعت کی شکل میں منظم ہوتے تو ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیتے۔ اس موضوع پر علامہ اقبال کا یہ شعر بہت بصیرت افروز ہے:

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں!

ایمانیات کے ضمن میں آخر میں ایمان بالآخرت کا ذکر تھا' جس کا اہم ترین عملی مظہر انفاق فی سبیل اللہ ہے:

﴿وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ؕ﴾ ''اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔''

﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑯﴾ ''اور جو کوئی اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ ہوں گے فلاح پانے والے۔''

یعنی جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھا ہے وہ اس کے راستے میں نچھاور کر دو۔ جیسا کہ سورۃ الحدید میں فرمایا گیا ہے:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑦﴾

''ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور خرچ کرو اس سب میں سے جس پر اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ تو جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے (اپنے مال و جان کو بھی) خرچ کیا' ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

آیت ۱۷ ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ﴾ ''اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ اسے تمہارے لیے کئی گنا بڑھا دے گا اور تمہیں بخش دے گا۔''

﴿وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٧﴾﴾ ''اور اللہ شکور (یعنی قدر دان) بھی ہے اور حلیم (یعنی بردبار) بھی۔''

وہ ایسا شکور ہے کہ بندہ جو کچھ بھی اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ اس کی قدر کرتا ہے اور حلیم ایسا ہے کہ اس کے بار بار ترغیب دلانے کے باوجود بھی اگر کوئی شخص کچھ نہیں دیتا وہ فوری طور پر اس کی گردن نہیں ناپتا۔

آیت ۱۸ ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٨﴾﴾ ''جاننے والا ہے چھپے اور کھلے سب کا' وہ بہت زبردست ہے' کمالِ حکمت والا ہے۔''

یعنی وہ غائب و حاضر' چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے۔ اس میں ایک جانب تقویٰ' اطاعت اور انفاق پر کاربند رہنے والے اہلِ ایمان کے لیے بشارت اور یقین دہانی مضمر ہے کہ وہ مطمئن رہیں کہ ان کی کوئی نیکی ضائع جانے والی نہیں ہے اور دوسری طرف اعراض و انکار کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے تہدید و تنبیہہ بھی ہے کہ تمہاری کوئی حرکت اللہ سے پوشیدہ نہیں اور وہ تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے کامل غلبہ و اقتدار کا مالک ہے۔ اس لیے کہ وہ ''العزیز'' ہے۔ اور اگر وہ تمہاری گرفت فوری طور پر نہیں کر رہا بلکہ تمہیں مہلت اور ڈھیل دیے جا رہا ہے تو یہ اس کی حکمتِ کاملہ کا مظہر ہے' اس لیے کہ جہاں وہ ''العزیز'' ہے وہاں وہ ''الحکیم'' بھی ہے۔

نوٹ کیجیے! اس سورت کا اختتام **الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ** پر ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ دو اسماء گزشتہ چاروں **المُسَبِّحات** (سورۃ الحدید' سورۃ الحشر' سورۃ الصف' سورۃ الجمعہ) کے آغاز میں آئے ہیں۔ گویا ان اسماء کو **المُسَبِّحات** کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ چنانچہ اس سورت (سورۃ التغابن بھی **المُسَبِّحات** میں سے ہے) کے آغاز میں یہ دونوں نام نہیں آئے تو اختتام پر آ گئے ہیں۔

سُوْرَۃُ الطَّلَاق

تمہیدی کلمات

زیر مطالعہ مدنی سورتوں کے گلدستے کا آخری اور نہایت ہی حسین جوڑا سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم پر مشتمل ہے۔ ان دونوں سورتوں کی باہمی مناسبت اور مماثلت کی ایک علامت تو یہ ہے کہ دونوں کا آغاز یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ کے کلمہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مضمون بھی مشترک ہے۔ دونوں سورتوں میں اسلام کے معاشرتی نظام بلکہ خاص طور سے عائلی نظام سے متعلق نکات زیر بحث آئے ہیں۔ عائلی قوانین اور معاشرتی اقدار کی جزئیات و تفصیلات کو قرآن مجید میں جس اہتمام سے بیان کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ موضوع خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سورۃ البقرۃ کے مسلسل چار رکوع اور سورۃ النساء کے متعدد مباحث اس موضوع کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ پھر سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں بھی اس موضوع سے متعلق تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ سورۃ المجادلہ کا آغاز بھی ایک عائلی مسئلے (ظہار) سے ہوتا ہے اور پھر سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم دو مکمل سورتیں بھی اسی مضمون سے متعلق ہیں۔

میاں بیوی کا جوڑا چونکہ انسانی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اس لیے معاشرے کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان دو افراد کے باہمی تعلقات توازن اور اعتدال کی حدود کے اندر رہیں۔ اس کی مثالی صورت تو یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی بحیثیت مسلمان ایک طرف اللہ تعالیٰ کے حقوق کماحقہ ادا کرنے والے ہوں اور دوسری طرف وہ ایک دوسرے کے ان حقوق کی ادائیگی پر بھی کمربستہ رہتے ہوں جو اسلام نے ان پر عائد کیے ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیجیے کہ مرد اور عورت پر اللہ کی طرف سے عائد کردہ بنیادی دینی فرائض تو ایک جیسے ہی ہیں' مثلاً نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج وغیرہ کی ادائیگی کا اہتمام شرعی احکام وحدود کی روشنی میں اپنی اپنی جگہ دونوں کو کرنا ہے۔ البتہ دعوت و تبلیغ کی فرضیت کے حوالے سے عورت کا دائرۂ عمل عورتوں اور محرم مَردوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ جبکہ اقامت دین کی جدوجہد (خصوصی طور پر جہاد و قتال) میں عورتیں حسبِ استطاعت بالواسطہ کردار ادا کرنے کی ہی مکلف ہیں۔ مثلاً وہ اپنے بیٹوں' بھائیوں اور شوہروں کو ایسے سازگار حالات اور مواقع فراہم کر سکتی ہیں جن میں وہ اقامتِ دین کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں یکسوئی کے ساتھ ادا کر سکیں۔ بہرحال ایک مثالی اور متوازن عائلی زندگی کا نقشہ یہی ہے کہ میاں بیوی دونوں اپنے اپنے فرائض ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے ادا کرنے والے ہوں۔

اس حوالے سے دوسری امکانی صورت یہ ہے کہ میاں بیوی کی طبیعتوں میں عدم موافقت کی وجہ سے گھر کے معاملات معمول کے مطابق نہ چل رہے ہوں اور حقوق و فرائض کی ادائیگی میں بھی مسلسل کوتاہی ہو رہی ہو۔ ظاہر ہے اس کی وجہ سے گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑے کا ماحول رہے گا' اور اگر یہ اختلاف بڑھتا جائے گا تو طلاق کی

نوبت بھی آ سکتی ہے۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال سے متعلق مسائل سورۃ الطلاق میں بیان ہوئے ہیں (واضح رہے کہ طلاق کے مسائل اور قوانین وضوابط کا ذکر سورۃ البقرۃ اور سورۃ النساء میں بھی آیا ہے)۔ گھریلو زندگی میں عدمِ توازن کی دوسری انتہا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی اور اہل وعیال کی اس حد تک دلجوئی کرے کہ اس میں شریعت کے احکام اور دعوت واقامت دین کی جدوجہد کے تقاضوں کا بھی خیال نہ رہے۔ یہ موضوع سورۃ التحریم میں آئے گا۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اگرچہ ان دونوں سورتوں میں خصوصی طور پر یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ کے الفاظ میں براہِ راست حضور ﷺ کو مخاطب کیا گیا ہے‘ لیکن اصل میں اس سے امت کی تعلیم مقصود ہے اور اس مقصد کے لیے حضور ﷺ کو اُمت کے معلم کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ سورۃ الطلاق کی پہلی آیت کے حکم سے مزید واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس حکم کا حضور ﷺ کی ذات سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ آپؐ نے نہ تو اپنی کسی زوجہ کو طلاق دی اور نہ ہی آپؐ کو طلاق دینے کی اجازت تھی۔ اس لیے کہ سورۃ الاحزاب کی آیت ٦ میں حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو اُمت کی مائیں قرار دیا گیا ہے اور سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۳ کے مطابق حضور ﷺ کے بعد بھی وہ کسی اور سے نکاح نہیں کر سکتی تھیں۔ لہٰذا آپؐ کا اپنی ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی کو طلاق دینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اسی لیے سورۃ الاحزاب ہی کی آیت ۵۰ میں آپؐ کو چار ازواج کے بعد مزید نکاح کرنے کی خصوصی اجازت مرحمت فرمائی گئی ـــــ ان دونوں سورتوں پر میرے مفصل لیکچرز کی ریکارڈنگ دستیاب ہے۔ مزید تفصیل جاننے کے خواہش مند خواتین وحضرات اس ریکارڈنگ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

آیات ا تا ۷

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحۡصُوا الۡعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمۡ ۚ لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُیُوۡتِهِنَّ وَلَا یَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ۝ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ وَّاَشۡهِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ وَاَقِیۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمۡ یُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۬ؕ وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۝ۙ وَّیَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَكَّلۡ عَلَی اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا ۝ وَالّٰٓیۡٔ یَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِیۡضِ مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشۡهُرٍ ۙ وَّالّٰٓیۡٔ لَمۡ یَحِضۡنَ ؕ وَاُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنۡ یَّضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ ؕ وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجۡعَلۡ لَّهٗ

مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَاۗرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۭ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۝ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝ ع

آیت ۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ﴾ ''اے نبی (ﷺ!) جب آپ لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے حساب سے طلاق دو اور عدت کا پورا لحاظ رکھو۔''

نوٹ کیجیے! حضور ﷺ کو صیغہ واحد میں مخاطب کرنے کے بعد فوراً جمع کا صیغہ (طَلَّقْتُمْ) آ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ خود حضور ﷺ کی ذات سے نہیں' عام اہل ایمان سے متعلق ہے اور آپ کو اہل ایمان کے نمائندہ' معلم اور ہادی کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ عدت کے حساب سے طلاق دینے اور عدت کا لحاظ رکھنے کے بہت سے پہلو ہیں۔ مجموعی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نازک اور حساس معاملے میں شریعت کی طے کردہ حدود و قیود کا لحاظ رکھو اور متعلقہ قوانین کی سختی سے پابندی کرو۔ مثلاً حیض کی حالت میں طلاق نہ دو' تینوں طلاقیں اکٹھی نہ دو' ہر طلاق کی عدت کا حساب رکھو' عدت کے دوران عورت کا نکاح نہ کرو۔ میاں بیوی کے درمیان ایک یا دو طلاقوں کے بعد ہونے والی علیحدگی کی صورت میں ان دونوں کے آپس میں دوبارہ نکاح کے حق کو تسلیم کرو' وغیرہ وغیرہ۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جو تمہارا ربّ ہے۔''

﴿لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ﴾ ''انہیں مت نکال باہر کرو ان کے گھروں سے''

ایسا نہ ہو کہ غصے میں طلاق دی اور کہا کہ نکل جاؤ میرے گھر سے' ابھی اور اسی وقت! یہ طریقہ قطعاً غلط ہے۔

﴿وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ﴾ ''اور وہ خود بھی نہ نکلیں' سوائے اس کے کہ وہ ارتکاب کریں کسی کھلی بے حیائی کا۔''

عام حالات میں تو طلاق کے فوراً بعد عورت کو گھر سے نہیں نکالا جا سکتا' اور نہ ہی اسے از خود نکلنے کی اجازت ہے۔ لیکن اس دوران اگر وہ بدکاری وغیرہ میں ملوث ہو جائے تو ایسی صورت میں اسے اس گھر سے نکالا جا سکتا ہے۔

﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور یہ اللہ کی حدود ہیں۔''

﴿وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ﴾ ''اور جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو اُس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا۔''

﴿لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ①﴾ ''تمہیں نہیں معلوم کہ شاید اس کے بعد اللہ

کوئی نئی صورت پیدا کر دے۔"

طلاق کے بعد اگر عورت شوہر کے گھر میں ہی عدت گزار رہی ہو تو حالات بہتر ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ کیا معلوم اللہ تعالیٰ ان دونوں میں بہتری کی کوئی صورت پیدا کر دے اور وہ پہلی طلاق کے بعد ہی رجوع کر لیں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مشیت سے حالات ہمیشہ کے لیے ساز گار ہو جائیں۔

آیت ۲ ﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ "پھر جب وہ اپنی (عدت کی) میعاد کو پہنچنے لگیں تو اب ان کو یا تو (اپنے نکاح میں) روک رکھو معروف طریقے سے' یا جُدا کر دو معروف طریقے سے"

یعنی ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدت پوری ہو جانے سے پہلے مرد کو حتمی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اگر تو وہ رجوع کرنا چاہتا ہے تو شریعت کے طے کردہ طریقے سے رجوع کر لے اور اگر اس نے طلاق ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر بھلے طریقے سے عورت کو گھر سے رخصت کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسے ستانے کی غرض سے روکے رکھے۔

﴿وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ "اور اپنے میں سے دو معتبر اشخاص کو گواہ بنا لو"

یعنی اگر کوئی طلاق کے بعد رجوع کرنا چاہے تو وہ اپنے لوگوں میں سے کم از کم دو معتبر اشخاص کی موجودگی میں ایسا کرے۔

﴿وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۭ﴾ "اور گواہی قائم کرو اللہ کے لیے۔"

﴿ذٰلِكُمْ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ڛ﴾ "یہ ہے جس کی نصیحت کی جا رہی ہے ہر اُس شخص کو کہ جو ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور یومِ آخر پر۔"

اس سے ملتے جلتے الفاظ سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۱ میں حضور ﷺ کے اُسوہ اور سورۃ الممتحنہ کی آیت ۶ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھیوں کے اُسوہ کے بارے میں بھی آئے ہیں۔ مطلب یہ کہ حضور ﷺ کا اُسوۂ کاملہ تو اپنی جگہ پر موجود ہے' اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھیوں کی زندگی بھی مثالی نمونہ ہے' لیکن کس کے لیے؟ ﴿لِمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ﴾۔ یعنی حضور ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُسوۂ حسنہ سے استفادہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور یومِ آخرت کی حاضری کی امید رکھتا ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے اس جملے کا مفہوم بھی یہی ہے کہ مسائل طلاق سے متعلق یہ وعظ اور نصیحت صرف اسی شخص کے لیے فائدہ مند ہو سکتی ہے جو واقعی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔

﴿وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۲﴾ "اور جو شخص اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا' اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا۔"

اللہ کے تقویٰ کا مقام و مرتبہ واضح کرنے کا یہ بہت حسین اور دلکش انداز ہے اور اس اعتبار سے یہ قرآن مجید کا منفرد مقام ہے۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ سمجھ لیں کہ حقیقی تقویٰ دل کا تقویٰ ہے' جس کے بارے میں

حضورﷺ نے ایک مرتبہ اپنے دست مبارک سے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ((اَلتَّقْوٰی ھٰهُنَا، اَلتَّقْوٰی ھٰهُنَا، اَلتَّقْوٰی ھٰهُنَا))(۱) کہ اصل تقویٰ یہاں (دل کے اندر) ہوتا ہے۔ آپؐ نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کا براہِ راست تعلق انسان کے دل کے ساتھ ہے۔ اگر دل میں تقویٰ نہیں تو جبّہ ودستار کا اہتمام اور متقیانہ وضع قطع کی حیثیت بہروپ سے زیادہ کچھ نہیں۔ چنانچہ اس آیت میں اہل تقویٰ کو بہت بڑی بشارت سنائی جا رہی ہے کہ اگر کسی بندۂ مؤمن کا تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مقبول ومنظور ہوا تو اس کے لیے مشکل سے مشکل صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور پیدا کر دیا جائے گا' جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو فرعون نے انہیں ساحل سمندر پر جا لیا۔ اب آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ بظاہر بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا' مگر اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پھاڑ کر ان کے لیے راستہ پیدا کر دیا۔

اسی طرح جب حضورﷺ غارِ ثور میں تشریف فرما تھے تو مشرکین مکہ میں سے کچھ لوگ آپؐ کے کھوج میں غار کے دہانے پر پہنچ گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضورﷺ! اگر ان لوگوں نے نیچے اپنے قدموں کی طرف بھی دیکھ لیا تو ہم انہیں نظر آ جائیں گے۔ حضورﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ﴾ (التوبۃ: ۴۰) کہ آپ فکر مت کریں' اللہ ہمارے ساتھ ہے! اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی صورتِ حال پیدا فرما دی کہ مشرکین آپؐ کو نہ دیکھ سکے۔ حضورﷺ کے سفر طائف کی مثال لیں تو بظاہر وہاں سے آپؐ خالی ہاتھ واپس آئے تھے' لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے مدینہ سے کھڑکی کھول دی اور ایسے حالات پیدا فرما دیے کہ آپؐ کے مدینہ تشریف لے جانے سے پہلے ہی وہاں انقلاب آ گیا۔ یہ مثالیں گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے متقی بندوں کے لیے ضرور ''مخرج'' پیدا فرماتا ہے۔ چنانچہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف اہلِ ایمان کے لیے آیت زیر مطالعہ کے ان الفاظ میں یہ خوشخبری ہے کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے اپنی کوششیں پورے خلوص سے جاری رکھیں۔ جب اللہ تعالیٰ کو ان کوششوں کی کامیابی منظور ہوگی تو حیرت انگیز طریقے سے منزل خود چل کر ان کے سامنے آ جائے گی۔

آیت ۳ ﴿وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ؕ﴾ ''اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا۔''

اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رزق یعنی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا ہے۔ اس لیے جب کوئی اللہ کا بندہ اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فرمانِ الٰہی: ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) کو اپنا نصب العین بنانا چاہتا ہے تو اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ اندیشہ بنتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کیسے پوری ہوں گی؟ چنانچہ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے کہ اے میرے بندو! تمہارا رازق تو میں ہوں اور تمہیں رزق دینے کے

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ.....وسنن الترمذی' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب ما جاء فی شفقۃ المسلم علی المسلم۔

لیے میں وسائل و اسباب کا محتاج نہیں ہوں۔ تم لوگ ایمان و یقین کے ساتھ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو‘ میں تمہیں وہاں سے رزق دوں گا جہاں سے تمہیں گمان بھی نہیں ہوگا۔

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ﴾ ”اور جو کوئی اللہ پر توکّل کرتا ہے تو اس کے لیے وہ کافی ہے۔“

جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکّل کر کے اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات و حاجات کو اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ اسی بات کو کسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے: ؎

کار سازِ ما بہ فکرِ کارِ ما فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

کہ ہمارا کارساز تو اللہ ہے‘ اور وہ ہمارے کاموں کی فکر میں مصروف ہے‘ اس لیے ہم اپنے کاموں کی فکر کے جھنجھٹ میں کیوں پڑیں! ظاہر ہے اگر ہم خود اپنے کاموں کی فکر کریں گے تو غلطیاں بھی کریں گے‘ نقصان بھی اٹھائیں گے اور ٹھوکریں بھی کھائیں گے‘ تو کیوں نہ ہم اپنے کام اسے سونپ کر خود کو اس کے کام (اقامت دین کی جدوجہد) میں لگا دیں۔ اللہ تو ایسا قدر دان ہے کہ اگر اس کا کوئی بندہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا ہے تو وہ بدلے میں اس کا مددگار بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ))[1] کہ جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی کوئی ضرورت پوری کرنے میں اپنا وقت صرف کرتا ہے تو اللہ اس کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔ تو اگر اللہ کا کوئی بندہ اپنی ذاتی ترجیحات کو پس پشت ڈال کر خود کو براہِ راست اللہ تعالیٰ کے کام میں لگا دے گا تو کیا اللہ اس کے معاملات کو خراب ہونے کے لیے چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں! ایسا تو دنیا میں ہم انسانوں کے ہاں بھی نہیں ہوتا‘ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس انسان میں تھوڑی سی بھی شرافت اور مروت ہوتی ہے وہ دوسرے انسان کی وفاداری کا بدلہ ضرور چکاتا ہے۔ چنانچہ جب ایک انسان بھی دوسرے انسان کی وفاشعاری کا صلہ دینا ضروری سمجھتا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک وفاشعار اور متوکّل بندے کی کس کس انداز سے دست گیری فرمائے گا۔ یاد رکھیں! توکل کا تعلق بندے کے ایمان سے ہے۔ جس قدر گہرا اور پختہ کسی کا ایمان ہوگا‘ اسی قدر مضبوط اس کا توکل ہوگا۔ آج ہمارے لیے اللہ تعالیٰ پر بھرپور توکّل کرنا اس لیے مشکل ہے کہ ہمارا ایمان کمزور ہے۔ تو آیئے! ہم اپنا ایمان مضبوط کر کے اللہ پر توکّل کریں۔ اپنے معاملات کی منصوبہ بندیوں کا دردِ سر مول لینے کے بجائے تفویض الامر الی اللّٰہ کی حکمت عملی اپنائیں۔ اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیں اور اس کے کام کو اپنا کام سمجھ کر اس کے لیے اپنا تن من دھن کھپا دیں!۔۔۔۔ ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾﴾ (المؤمن)

﴿اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ﴾ ”اللہ تو یقیناً اپنا کام پورا کر کے ہی رہتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے تو اپنے دین کو غالب کرنا ہی ہے‘ لیکن اس عظیم الشان کام کے لیے جدوجہد کی سعادت وہ اپنے بندوں کے نام کرنا چاہتا ہے۔ اب اس کے لیے ہر انسان کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اس منافع بخش ”کاروبار“ میں شریک ہونا چاہتا ہے یا اپنی محرومی پر قناعت کر کے بیٹھے رہنے کو پسند کرتا ہے۔ جیسے ابوبکر‘ عمر‘

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب المظالم والغصب‘ باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمہ‘ ح:۲۴۴۲ و ۶۹۵۱۔ وصحیح مسلم‘ کتاب البر والصلۃ والآداب‘ باب تحریم الظلم‘ ح:۲۵۸۰۔

عثمان‘ علی‘ عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے ساتھی (رضی اللہ عنہم) اس جدوجہد میں شریک ہو کر ہمیشہ کے لیے سرخرو ہو گئے‘ جبکہ ابوجہل‘ ابولہب اور ان کے ہم نواؤں نے اس سے بے اعتنائی دکھائی اور ابدی محرومیاں اپنے نام کرا لیں۔
آج ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قیامِ قیامت سے پہلے پہلے اس کرۂ ارضی پر دینِ اسلام کو غالب تو ہونا ہے اور یقیناً ہم جیسے انسانوں کی کوششوں اور قربانیوں سے ہی ہونا ہے‘ تو کیا ہم اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کو تیار ہیں یا محرومین کی صفوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا تن من دھن غرض سب کچھ اس جدوجہد میں کھپ جائے اور ہماری ہڈیاں چورا بن کر بھی اسلام کی تعمیرِ نو میں کام آ جائیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی اور خوش قسمتی ہوگی۔

﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝﴾ ”اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔“

یہ بہت خوبصورت اور سبق آموز جملہ ہے۔ غلبہ دین کی جدوجہد کے تناظر میں دیکھیں تو اس کا مفہوم واضح تر ہو جاتا ہے‘ کہ اے راہِ حق کے مسافرو! تمہاری محنت اور جدوجہد کس کس گھاٹی سے ہوتی ہوئی کب‘ کہاں پہنچے گی اور اللہ کی مدد کب تمہارے شاملِ حال ہوگی‘ اللہ کے ہاں یہ سب کچھ طے ہے۔ یقیناً اس راستے میں کامیابی کا دارومدار اللہ کی مدد پر ہے‘ لیکن اللہ کی مدد تو تبھی آئے گی جب تم خود کو اس کا اہل ثابت کرو گے۔ اس کے لیے تمہیں منہجِ نبویؐ کو اپناتے ہوئے ہر اُس راستے سے گزرنا ہوگا جس راستے سے حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین گزرے اور ہر وہ سختی برداشت کرنا ہوگی جو آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر برداشت کی۔ جب ان تمام امتحانات سے سرخرو ہو کر آگے بڑھو گے تو خود کو ایک ایسے میدان میں کھڑا پاؤ گے جس کے نشیب و فراز سرزمینِ بدر کے نشیب و فراز سے ملتے جلتے ہوں گے۔ اس میدان کی مخالف سمت سے اسلحہ کی جھنکار اور لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ کے نعروں کی گونج سنائی دے رہی ہوگی‘ جبکہ اس کی فضا ملکوتی تقدس کے احساس سے معمور ہوگی۔ جب تم یہ سب کچھ دیکھو اور محسوس کرو تو جان لینا کہ تمہاری جدوجہد کا فیصلہ کن موڑ آ پہنچا ہے۔ بس اس موقع پر تم سجدے میں گر جانا اور رو رو کر دعا کرنا کہ اے اللہ! ہم نے تیرے داعی کی دعوت پر لبیک کہا! ہم تیرے پیغام کو لے کر قریہ قریہ گھومے! گلی گلی پھرے! ایک عرصہ تک ہم نے اپنی صبحیں اور اپنی شامیں اسی فکر میں بتا دیں! ہم نے اس راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پھلانگنے اور ہر مشکل گھاٹی کو عبور کرنے کی کوشش کی! اے اللہ! ہم نے یہ سب کچھ تیری رضا کے لیے کیا‘ اور تیری ہی توفیق اور مشیت سے کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں معلوم ہے کہ اس راستے پر چلتے ہوئے ہم کوشش‘ محنت‘ ایثار اور قربانی کا حق ادا نہیں کر سکے! لیکن ہم سے جو ہو سکا وہ ہم نے پوری دیانت داری اور اخلاص سے کیا۔ پروردگار! ہم نے اپنی سالہا سال کی محنت کو آج اس میدان میں تیرے حضور پیش کر دیا ہے! اے گناہوں کو معاف کرنے والے! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہماری اس حقیر سی کمائی کو قبول فرما لے......!

اگر یہ دعائیں مذکورہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد مانگی جائیں گی تو ضرور قبول ہوں گی‘ تب اللہ کی مدد بھی آئے گی‘ فرشتے بھی اتریں گے اور دنیوی کامیابی بھی نصیب ہوگی۔ لیکن اگر کوئی سمجھتا ہے کہ کاروبار بھی چلتا رہے‘ معیارِ زندگی بھی برقرار رہے‘ معمولاتِ زندگی میں بھی خلل نہ پڑے‘ مال و جان بھی محفوظ رہے‘ بچوں کے کیریئرز بھی

بن جائیں اور ہمارے ہی ہاتھوں سے اقامتِ دین کا ''کارنامہ'' بھی انجام پا جائے تو یہ اس کی خوش فہمی ہے۔ ایسے لوگ کسی جماعت کے اراکین کی فہرست میں نام لکھوا کر سمجھتے ہیں کہ بس انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی مدد آئے گی' دین غالب ہو جائے گا اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کے مستحق ٹھہریں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہی نہیں کہ کس نے کیا قربانی دی ہے' کس نے کتنا وقت لگایا ہے' کس نے کس مرحلے پر کس مہم میں کتنا حصہ ڈالا ہے۔ نہیں! یہ کوئی اندھیر نگری نہیں! اللہ کے ہاں ہر چیز اور ہر انسان کے ہر عمل کا حساب موجود ہے! قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا اس نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے!

اب آئندہ آیات میں پھر طلاق سے متعلق مسائل کا ذکر ہے:

آیت ۴ ﴿وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ﴾ ''اور تمہارے ہاں کی خواتین میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں''

یعنی ایسی عمر رسیدہ خواتین جن کے حیض کا سلسلہ بند ہو چکا ہو۔

﴿اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ﴾ ''اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہوگی''

ایسی خواتین کے معاملے میں چونکہ تین طہر اور تین حیض کا حساب کرنا ممکن نہیں' اس لیے ان کی عدت کا شمار مہینوں میں کیا جائے گا۔ چنانچہ ان کی عدت کی مدت تین ماہ ہوگی۔

﴿وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ۭ﴾ ''اور (ان کی بھی) جن کو ابھی حیض آیا ہی نہیں۔''

اگر کسی لڑکی کا کم سنی میں نکاح ہو گیا اور ابھی اسے حیض آنا شروع نہیں ہوا تھا کہ طلاق ہو گئی تو اس کی عدت بھی تین ماہ ہی شمار ہوگی۔

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۭ﴾ ''اور حاملہ خواتین کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔''

ایسی صورت میں وضع حمل جب بھی ہو جائے گا عدت ختم ہو جائے گی' چاہے اس میں نو ماہ لگیں یا ایک ماہ بعد ہی وضع حمل ہو جائے — اس کے بعد پھر سے تقویٰ کے بارے میں یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔ اس سے قبل پہلی اور دوسری آیت میں بھی تقویٰ کا ذکر آ چکا ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝﴾ ''اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے وہ اُس کے کاموں میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔''

جیسا کہ سورۃ الیل میں فرمایا گیا ہے:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝﴾

''تو جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور (اللہ کی نافرمانی سے) پرہیز کیا' اور بھلائی کو سچ مانا' اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔''

آیت ۵ ﴿ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ۭ﴾ ''یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے نازل کر دیا ہے تمہاری طرف۔''

یعنی اس حکم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری لے لی ہے کہ میرے بندوں میں سے جو کوئی میرا تقویٰ اختیار کرے گا میں اس کے معاملات میں ضرور آسانیاں پیدا فرماؤں گا۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ﴾ ''اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا وہ اُس کی برائیوں کو اس سے دُور فرما دے گا''

اس حکم کا تعلق خصوصی طور پر آخرت سے ہے۔ یعنی اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والے شخص کے دنیوی معاملات میں بھی آسانیاں پیدا کر دی جائیں گی اور آخرت کے احتساب کے حوالے سے بھی اس کے نامہ اعمال کو گناہوں سے پاک کر دیا جائے گا۔

﴿وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝﴾ ''اور اسے بہت بڑا اجر و ثواب عطا کرے گا''

آیت ۶ ﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ﴾ ''اور ان عورتوں کو وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو اپنی حیثیت کے مطابق''

پہلی آیت میں واضح حکم آ چکا ہے: ﴿لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ﴾ کہ طلاق کے بعد انہیں فوری طور پر گھر سے مت نکالو اور نہ ہی وہ از خود نکلیں۔ اسی حوالے سے اس آیت میں مزید وضاحت کی جا رہی ہے کہ عدت کے دوران مطلقہ خاتون کو بدستور ویسی ہی رہائش فراہم کی جائے جیسی کہ تمہارے اپنے استعمال میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اسے گھر سے تو نہ نکالو لیکن کسی ملازمہ کی کوٹھڑی میں ڈال دو۔

﴿وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ﴾ ''اور انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ' انہیں تنگ کرنے کے لیے۔''

گھر سے نکالنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حیلے بہانے سے اسے بار بار اس قدر ستایا جائے کہ وہ تنگ آ کر خود ہی گھر سے نکل جائے۔ چنانچہ بدنیتی پر مبنی یہ طریقہ استعمال کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔

﴿وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ﴾ ''اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ حمل سے فارغ ہو جائیں۔''

دین اسلام' ہمدردی اور غم گساری کا دین ہے اور اس کا ایک ثبوت مندرجہ بالا حکم ہے۔ حاملہ عورت کو انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے' اس لیے یہاں خصوصی طور پر حکم دیا گیا کہ طلاق دینے کے بعد بھی حاملہ عورت کا خیال رکھتے ہوئے اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے رہو۔

﴿فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ﴾ ''پھر اگر وہ تمہارے لیے (تمہارے بچے کو) دودھ پلائیں تو انہیں ان کا معاوضہ ادا کرو۔''

﴿وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ﴾ ''اور آپس میں مشورہ کر لیا کرو بھلے طریقے سے۔''

یعنی دودھ پلانے کی اجرت اور عدت سے متعلق معاملات مناسب طور سے آپس کے مشورے سے طے کیے جانے چاہئیں۔ اگر طلاق کے بعد وہ دونوں میاں بیوی نہیں رہے تو کیا ہوا' آخر دونوں انسان تو ہیں۔ چنانچہ انہیں چاہیے کہ تمام معاملات باہمی گفت و شنید سے طے کریں اور ایک دوسرے سے ایسا رویہ اختیار کریں جیسا

کہ ایک شریف انسان کو دوسرے شریف انسان سے اختیار کرنا چاہیے۔

﴿وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ﴾ ''اور اگر تم ایک دوسرے سے تنگی محسوس کرو''

مثلاً خاتون ضد میں آ کر دودھ پلانے سے انکار کر دے یا اس قدر معاوضہ مانگے جو مرد ادا نہ کر سکے' یا مرد معاوضہ دینے سے انکار کر دے' یا کسی اور طریقے سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرنے کی ٹھان لے:

﴿فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۝﴾ ''تو پھر کوئی اور عورت اس کے لیے دودھ پلائے گی۔''

آیت ۷ ﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ﴾ ''چاہیے کہ خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق۔''

﴿وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ﴾ ''اور جس پر اس کا رزق تنگ کر دیا گیا ہے وہ خرچ کرے اس میں سے جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔''

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ﴾ ''اللہ کسی جان کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا مگر اسی قدر جو اُس نے اسے دے رکھا ہے۔''

یعنی عدت کے دوران مطلقہ کی رہائش' حمل کے دوران اس کا نان نفقہ' رضاعت کی اجرت وغیرہ کے معیار کا انحصار مرد کی مالی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر کشادگی ہے تو مطلقہ پر بھی اسے اسی انداز سے خرچ کرنا چاہیے اور اگر تنگ دستی کی کیفیت ہے تو ظاہر ہے وہ اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اس کی استطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کے حالات سے باخبر ہے۔

﴿سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝﴾ ''عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی بھی پیدا کر دے گا۔''

آیات ۸ تا ۱۲

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۖ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ۙ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ۧ ع ۵ ۱۸

آیت ۸ ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ﴾ ''اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہیں جنہوں نے اپنے رب کے حکم اور اُس کے رسولوں سے سرکشی کی''

﴿فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ⑧﴾ ''تو ہم نے ان کا محاسبہ کیا بہت شدید محاسبہ اور ہم نے ان کو عذاب دیا بہت ہولناک عذاب۔''

آیت ۹ ﴿فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا﴾ ''تو انہوں نے اپنے معاملے کی پوری سزا بھگت لی''

﴿وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ⑨﴾ ''اور ان کے کام کا انجام خسارہ ہی تھا۔''

آیت ۱۰ ﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ﴾ ''اللہ نے ان کے لیے بہت شدید عذاب تیار کر رکھا ہے''

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ﴾ ''تو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اے ہوش مندو! جو ایمان بھی لائے ہو!''

نوٹ کیجیے! یہاں پھر تقویٰ کے بارے میں تاکید کی جا رہی ہے۔ قبل ازیں پہلے رکوع میں چار مرتبہ تقویٰ کا ذکر آ چکا ہے۔

﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ⑩﴾ ''اللہ نے تمہاری طرف ذکر نازل کر دیا ہے۔''

آیت ۱۱ ﴿رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ﴾ ''(یعنی) ایک رسولؐ جو اللہ کی آیاتِ بینات تم لوگوں کو پڑھ کر سنا رہا ہے' تاکہ وہ نکالے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے اندھیروں سے نور کی طرف۔''

یہاں وضاحت کر دی گئی کہ ذکر سے مراد اللہ کا رسولؐ اور اللہ کی کتاب (اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ) ہے۔ سورۃ البینہ میں اس موضوع کی مزید وضاحت آئی ہے۔

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا﴾ ''اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے''

دین کے تقاضوں کا درست فہم نہ ہونے کی وجہ سے آج ہمارے ہاں ''اعمالِ صالحہ'' کا تصور بھی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اعمالِ صالحہ سے اصل مراد یہ ہے کہ ایک بندۂ مؤمن ایمان کے جملہ تقاضوں کو پورا کرے۔ مکی دور میں جبکہ ابھی شراب' جوا' سود وغیرہ کی حرمت نہیں آئی تھی اور نماز' روزہ' جہاد و قتال وغیرہ کا حکم نہیں آیا تھا' اُس دَور میں اہلِ ایمان کے لیے ''اعمالِ صالحہ'' یہی تھے کہ وہ ایمان کی دعوت دیں اور اس راستے پر جو تکلیفیں اور آزمائشیں آئیں انہیں استقامت سے برداشت کریں۔ پھر مدنی دَور میں جیسے جیسے مزید احکام آتے گئے ویسے ویسے ایمان کے تقاضے بھی بڑھتے گئے اور رفتہ رفتہ نماز' روزہ' زکوٰۃ' عشر' حج' انفاق' جہاد و قتال وغیرہ بھی اعمالِ صالحہ میں شامل ہو گئے۔ گویا جس وقت ایمان کا جو تقاضا ہو اسے پورا کرنے کا نام ''عمل صالحہ'' ہے۔ آج ایک عام مسلمان جب قرآن میں ''عمل صالحہ'' کی اصطلاح پڑھتا ہے تو اس سے اس کے ذہن میں صرف نماز' روزہ اور ذکر اذکار کا تصور ہی آتا ہے' جبکہ منکرات کے خلاف جدوجہد اور اقامت دین کے لیے محنت جیسے اہم تقاضوں کو آج اعمالِ صالحہ کی فہرست سے ہی خارج کر دیا گیا ہے۔ تو جو کوئی ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں کو بھی پورا کرے گا:

﴿يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ﴾ ''وہ اُسے داخل کرے گا ان باغات میں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی' جن میں وہ لوگ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

﴿قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ⑪﴾ ''اللہ نے اس کے لیے بہت عمدہ رزق فراہم کیا ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ﴾ ''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے ہیں اور زمین میں سے بھی انہی کی مانند۔''

یہ آیت ''آیاتِ متشابہات'' میں سے ہے۔ ابھی تک انسان سات آسمانوں کی حقیقت سے بھی واقف نہیں ہو سکا۔ ''زمین میں سے انہی کی مانند'' کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جتنے آسمان بنائے اتنی ہی زمینیں بھی بنائیں' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے اُس نے متعدد آسمان بنائے ہیں ویسے ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ قرآن حکیم کے بعض مقامات پر ایسے اشارے ملتے ہیں کہ جاندار مخلوقات صرف زمین پر ہی نہیں ہیں' عالمِ بالا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مفسرین نے اپنے اپنے اندازوں سے اس آیت کی تفسیر کی ہے' لیکن اس کا قطعی مفہوم ہم ابھی نہیں جان سکتے۔ بہر حال کسی وقت اس کی حقیقت انسان پر منکشف ہو جائے گی۔

﴿يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ﴾ ''ان کے درمیان (اللہ کا) امر نازل ہوتا ہے''

اس سے مراد تدبیرِ کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اس بارے میں مزید وضاحت سورۃ السجدۃ کی اس آیت میں ملتی ہے:

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ⑤﴾

''وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف (یہ سارا معاملہ طے پاتا ہے) ایک دن میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار برس ہے۔''

گویا یہ اللہ تعالیٰ کی ہزار سالہ منصوبہ بندی سے متعلق احکام کا ذکر ہے جو زمین کی طرف ارسال کیے جاتے ہیں۔ متعلقہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ان احکام کی تنفیذ عمل میں لاتے رہتے ہیں' یہاں تک کہ ہزار سال کے اختتام پر یہ ''امر'' اٹھا لیا جاتا ہے اور اگلے ہزار سال کا امر نازل کر دیا جاتا ہے۔

﴿لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ﴾ ''تاکہ تم یقین رکھو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

اس دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران کئی مرتبہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں دو صفات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں اور قرآن مجید میں ان دو صفات کی بہت تکرار ملتی ہے۔ یعنی اللہ کا عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اور بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ہونا۔ لہٰذا ان دو صفات کے بارے میں ایک بندۂ مؤمن کا مراقبہ بہت گہرا ہونا چاہیے' تاکہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اختیار کے بارے میں اس کے یقین میں کسی لمحے کوئی کمزوری نہ آنے پائے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات کا ذکر آیا ہے۔

﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ⑫﴾ ''اور یہ کہ اللہ نے اپنے علم سے ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔''

پہلے اللہ کی قدرت کے بارے میں بتایا گیا اور اب اس کے علم کا ذکر آ گیا۔ یعنی کائنات کی کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ ہے۔

سُوْرَةُ التَّحْرِيْم

تمہیدی کلمات

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الطلاق کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے‘ سورۃ الطلاق میں میاں بیوی کے اختلافات کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جبکہ سورۃ التحریم کے آغاز میں عائلی زندگی کے دوسرے رخ کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یعنی شوہر اپنی بیوی کی محبت یا اس کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے کوئی ایسا کام کر بیٹھے جو شریعت میں جائز نہ ہو یا بیوی کی دلجوئی کے لیے کوئی ایسا کام نہ کرنے کی قسم کھا لے جو کہ شریعت کے مطابق جائز ہو۔ اگرچہ یہ مضمون یہاں پر حضور ﷺ کی ذات کے حوالے سے بیان ہوا ہے لیکن اصل مقصد اس سے امت کی تعلیم ہے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کے لیے تو یہ قطعاً ممکن نہیں تھا کہ آپ اپنی کسی بیوی کی دلجوئی کے لیے کوئی خلافِ شریعت عمل کرتے۔ البتہ آپ کی سیرت میں دو تین واقعات ایسے ملتے ہیں کہ آپ نے اپنی بیویوں کی دلجوئی کے لیے کوئی ایسی چیز نہ کھانے کی قسم کھائی تھی جو کہ آپ کے لیے حلال تھی۔ سورت کی ابتدائی آیات میں یہی موضوع زیر بحث آیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

آیات ۱ تا ۵

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ
اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ
عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ اِنْ تَتُوْبَآ
اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا
مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰۗىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰۗىِٕحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝

آیت ۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ﴾ ”اے نبی (ﷺ!) آپ کیوں حرام ٹھہرا رہے ہیں (اپنے اوپر) وہ شے جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہے؟“

﴿تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ﴾ ''آپ چاہتے ہیں اپنی بیویوں کی رضا جوئی!''

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ①﴾ ''اور اللہ بہت معاف کرنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

یعنی اللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی' لیکن اُس نے معاف فرما دیا ہے۔

آیت ۲ ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ﴾ ''اللہ نے تمہارے لیے اپنی قسموں کو کھولنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔''

یعنی کفارہ دے کر قسموں کی پابندی سے نکلنے کا جو طریقہ سورۃ المائدۃ کی اس آیت میں بتایا گیا ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾﴾

''اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرے گا تم سے تمہاری ان قسموں میں جو لغو ہوتی ہیں لیکن وہ (ضرور) مؤاخذہ کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم نے پختہ کیا ہے' سو اس کا کفارہ ہے کھانا کھلانا دس مساکین کو' اوسط درجے کا کھانا جیسا تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو' یا ان کو کپڑے پہنانا' یا کسی غلام کو آزاد کرنا۔ پھر جو کوئی اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم کھا (کر توڑ) بیٹھو۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح فرما رہا ہے تاکہ تم شکر کرو۔''

گویا آپ اپنی یہ قسم توڑ دیجیے اور اس ضمن میں کفارہ ادا کیجیے۔ بعض مترجمین نے یہاں ''قَدْ فَرَضَ'' کا ترجمہ ''فرض کر دیا ہے'' بھی کیا ہے اور اس کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ خلافِ شرع قسم کا توڑنا فرض ہے۔

﴿وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ②﴾ ''اور اللہ تمہارا مددگار ہے' اور وہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے۔''

آیت ۳ ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ﴾ ''اور جب نبی (ﷺ) نے رازداری سے اپنی کسی زوجہ کو ایک بات بتائی۔''

یہاں اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں کہ حضور ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ ؓ کو راز کی کون سی بات بتائی تھی یا آپؐ نے کن حالات میں کس چیز کو استعمال نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ تفاسیر میں ان آیات سے متعلق واقعات بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ مزید معلومات کے لیے کسی بھی تفسیر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہاں جو اصل بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی ایک زوجہ محترمہ ؓ کو ایک بات بتائی اور فرمایا کہ یہ میرا راز ہے کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرنا۔

﴿فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ﴾ ''تو جب اُس نے اس کو ظاہر کر دیا''

عورتوں کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ راز چھپانے کے حوالے سے طبعی طور پر کمزور ہوتی ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ کمزوری بہت سے مردوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بہرحال ''نہ ہرزن زن است ونہ ہر مرد مرد''۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ کمزوری انسان میں طبعی طور پر پائی جاتی ہے اور اسی بنا پر اس کا صدور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے بھی ہوا۔ چنانچہ جس زوجہ محترمہؓ کو وہ بات بتائی گئی تھی انہوںؓ نے اس کا اظہار آپؐ کی کسی دوسری زوجہ محترمہؓ سے کر دیا۔

﴿وَاَظۡهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيۡهِ﴾ ''اور اللہ نے اس بارے میں انؐ کو مطلع کر دیا''

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو آگاہ کر دیا کہ آپؐ کا وہ راز اب راز نہیں رہا۔

﴿عَرَّفَ بَعۡضَهٗ وَاَعۡرَضَ عَنۡۢ بَعۡضٍ ۚ﴾ ''تو نبی (ﷺ) نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے چشم پوشی کی۔''

یعنی حضور ﷺ نے اس بات کا جزوی انداز سے ذکر فرما کر اپنی زوجہ محترمہؓ کو اشارتاً بتا دیا کہ مجھے اس راز کے افشا ہونے کا علم ہو چکا ہے۔

﴿فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ﴾ ''تو جب آپؐ نے اسے یہ خبر دی''

﴿قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَكَ هٰذَا ؕ﴾ ''اُس نے کہا کہ آپؐ کو یہ کس نے بتایا؟''

عام میاں بیوی کے درمیان تو ایسے مکالمے میں کوئی حرج نہیں، لیکن یہاں معاملہ اللہ کے رسول ﷺ کا تھا۔ اس حوالے سے سورۃ الحجرات میں یہ تنبیہہ ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِيۡكُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۷) ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسولؐ ہیں''۔ یعنی آپؐ کے ساتھ تم لوگ دنیوی تعلقات اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر معاملہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس معاملے میں محتاط طرزِ عمل تو یہی تھا کہ فوراً معذرت کر لی جاتی کہ حضور ﷺ مجھ سے واقعتاً غلطی ہو گئی، بس بے دھیانی میں بات میرے منہ سے نکل گئی......

﴿قَالَ نَبَّاَنِيَ الۡعَلِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ ③﴾ ''آپؐ نے کہا: مجھے اس نے بتایا ہے جو العلیم ہے اور الخبیر ہے۔''

مجھے اس اللہ نے بتایا ہے جو سب کچھ جاننے والا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ اس جواب کے اسلوب اور انداز میں حضور ﷺ کے اظہارِ ناراضی کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔

آیت ۴ ﴿اِنۡ تَتُوۡبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدۡ صَغَتۡ قُلُوۡبُكُمَا ۚ﴾ ''اگر تم دونوں اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو (یہی تمہارے لیے بہتر ہے، کیونکہ) تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں۔''

اس آیت کی تعبیر میں اہل تشیع کا نقطہ نظر یقیناً انتہا پسندانہ ہے، لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ہمارے بعض مترجمین اور مفسرین نے بھی انہی کی روش اختیار کی ہے۔ البتہ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے عربی اسلوب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کی جو وضاحت کی ہے میری رائے میں وہ بہت جامع اور بالکل درست ہے۔ اس حوالے سے میں ذاتی طور پر خود کو مولانا صاحب کا احسان مند مانتا ہوں کہ ان کی اس تحریر کی بدولت مجھے قرآن کے اس مقام کا درست فہم اور شعور نصیب ہوا۔

اہل تشیع کے ہاں ﴿فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ تم دونوں کے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں۔ دراصل صَغَتْ ایسا لفظ ہے جس میں منفی اور مثبت دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ جیسے مَالَ اِلٰی کے معنی ہیں کسی طرف میلان یا توجہ ہونا جبکہ مَالَ عَنْ کے معنی ہیں کسی سے نفرت ہو جانا۔ اسی طرح لفظ رَغِبَ اِلٰی راغب ہونا، محبت کرنا اور رَغِبَ عَنْ ناپسند کرنا کے معنی دیتا ہے۔ صَغٰی کا معنی ہے جھک جانا، مائل ہو جانا۔ جب ستارے ڈوبنے لگتے ہیں تو عرب کہتے ہیں: صَغَتِ النُّجُوم ۔ چنانچہ یہاں اس لفظ کا درست مفہوم مائل ہو جانا ہی ہے کہ اب تمہارے دل میں تو یہ بات آ ہی چکی ہے اور تمہارے دل تو خطا کو تسلیم کر ہی چکے ہیں، بس اب تم زبان سے بھی اس کا اعتراف کر لو۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی خطا کا احساس ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اعتراف اور توبہ کے الفاظ بھی سکھا دیے: ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ (البقرۃ:۳۷) اور آپؑ نے سکھائے ہوئے طریقے سے توبہ کر لی۔

اس بارے میں عام رائے یہ ہے کہ مذکورہ بات حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتائی تھی۔ چونکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو دربارِ رسالت میں خصوصی مقام و مرتبہ حاصل تھا اسی نسبت سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں ممتاز تھیں۔

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ﴾ ''اور اگر تم دونوں نے ان کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے''

یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ قرآن مجید کے ایسے مقامات کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ ، وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی ۔ اور یہ بھی کہ جن کے مراتب جتنے بلند ہوں ان کا ہلکا سا سہو بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ گرفت ہو جاتا ہے۔ جیسے عربی کا مقولہ ہے: حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْن یعنی عام لوگوں کے لیے جو کام بڑی نیکی کا سمجھا جائے گا ہو سکتا ہے کہ وہی کام اللہ تعالیٰ کے مقربین اولیاء اور محبوب بندوں کے لیے تقصیر قرار پائے اور ان کے مرتبہ کے اعتبار سے قابلِ گرفت شمار ہو جائے۔ اسی قاعدہ اور اصول کے تحت یہاں یہ سخت الفاظ آئے ہیں کہ اگر آپ لوگوں نے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو سن لو:

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝﴾ ''ان کا پشت پناہ تو خود اللہ ہے اور جبریل اور تمام صالح مؤمنین، اور مزید برآں تمام فرشتے بھی انؐ کے مددگار ہیں۔''

لہٰذا بہتر تو یہ ہے کہ تم لوگ ہمارے رسولؐ کے ساتھ جو بھی معاملہ کرو ان کے مقام و مرتبے کی مناسبت سے کیا کرو۔ تمہارا میاں بیوی کا رشتہ اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت کسی لمحہ بھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور تم سب لوگ اُمتی ہو۔ تمہارا انؐ کے ساتھ بنیادی تعلق یہی ہے۔ اس تعلق کے مقابلے میں تمہارے باقی تمام رشتوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس کے بعد آگے مزید سخت الفاظ آ رہے ہیں:

آیت ۵ ﴿عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ﴾ ''بعید نہیں کہ اگر وہ تم سب کو طلاق دے دیں تو ان کا رب انہیں تم سے کہیں بہتر بیویاں عطا کر دے''

﴿مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝﴾ ''اطاعت شعار' ایمان والیاں' فرمانبردار' توبہ کرنے والیاں' عبادت گزار' لذاتِ دنیوی سے بیگانہ' شوہر دیدہ بھی اور کنواری بھی۔''

ان الفاظ میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی سامنے آتی ہے کہ تمہارے اندر جو یہ اوصاف ہیں کہ تم اطاعت شعار ہو' ایمان والیاں ہو' فرماں بردار ہو' توبہ کرنے والیاں ہو' زہد و قناعت کرنے والیاں ہو' ان پر تمہیں نازاں نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ان اوصاف کی حامل تم سے بہتر خواتین اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ازواج کے طور پر فراہم کر سکتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ مذکورہ اوصاف کے درمیان ''و'' بطور حرف عطف نہیں آیا' سوائے ایک ''و'' کے جو کہ آخر میں آیا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی اسلوب ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خواتین ایسی شخصیات ہوں گی جن میں یہ تمام اوصاف بیک وقت موجود ہوں گے۔ سوائے آخری دو اوصاف کے کہ وہ دونوں اوصاف ایک شخصیت میں بیک وقت اکٹھے نہیں ہو سکتے' اس لیے ان کے درمیان میں ''و'' عطف آ گئی ہے ---- ثَيِّبٰتٍ سے مراد ایسی عورتیں ہیں جنہیں نکاح کے بعد طلاق ہو گئی ہو یا وہ بیوہ ہو گئی ہوں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے باقی تمام ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ثیبات ہی کی حیثیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔

ان ابتدائی پانچ آیات کا تعلق عائلی زندگی سے ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان روزمرہ زندگی کے معاملات کو حدِ اعتدال میں رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال بھی رکھا جائے اور دوسرے کے حوالے سے اپنے فرائض کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے' لیکن اللہ تعالیٰ کے حقوق کو تمام معاملات پر فوقیت دی جائے۔ اگر میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو جائیں اور اصلاح کی کوئی صورت نہ رہے تو قواعد و ضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے شرافت کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ لیکن اگر گھر کے ماحول میں محبت و یگانگت کا رنگ غالب ہو تو بھی محتاط رہا جائے کہ کہیں بے جا محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود نہ ٹوٹنے پائیں اور ایسا نہ ہو کہ بیوی بچوں کی محبت انسان کو غلط راستے پر لے جائے۔

اس کے بعد کی تین آیات کا تعلق خصوصی طور پر مردوں سے ہے اور یہ دراصل سورۃ الحدید ہی کے مضمون کا تسلسل ہے جو یہاں اس گروپ کی آخری سورت کے اختتام پر آ گیا ہے۔

آیات ٦ تا ٨

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ
غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا
ع ١٩ تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً
نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ
وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۸

آیت ٦ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ ''اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اُس آگ سے''

اس سے پہلے سورۃ التغابن میں اہل ایمان کو ان کے اہل وعیال کے بارے میں اس طرح متنبہ کیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۴) ''اے ایمان کے دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے بچ کر رہو''۔ سورۃ التغابن کے اس حکم کے تحت اہل ایمان کو منفی انداز میں متنبہ کیا گیا ہے' جبکہ آیت زیر مطالعہ میں انہیں ان کے اہل وعیال کے بارے میں مثبت طور پر خبردار کیا جا رہا ہے کہ بحیثیت شوہر اپنی بیویوں کو اور بحیثیت باپ اپنی اولاد کو دین کے راستے پر ڈالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ان کے حوالے سے تمہاری ذمہ داری صرف ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی حد تک ہے' بلکہ ایک مؤمن کی حیثیت سے اپنے اہل وعیال کے حوالے سے تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ تم انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرو جس سے ان کے قلوب واذہان میں دین کی سمجھ بوجھ' اللہ کا تقویٰ اور آخرت کی فکر پیدا ہو جائے تاکہ تمہارے ساتھ ساتھ وہ بھی جہنم کی اس آگ سے بچ جائیں:

﴿وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ ''جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر''

﴿عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ ''اس پر بڑے تندخو' بہت سخت دل فرشتے مامور ہیں''

وہ فرشتے مجرموں کو جہنم میں جلتا دیکھ کر ان پر رحم نہیں کھائیں گے' اور نہ ہی وہ ان کے نالہ وشیون سے متاثر ہوں گے۔ تو کیا ہم ناز ونعم میں پالے ہوئے اپنے لاڈلوں کو جہنم کا ایندھن بننے کے لیے ان سخت دل فرشتوں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں؟ بہرحال ہم میں سے ہر ایک کو اس زاویے سے اپنی ترجیحات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم اپنے اہل وعیال کو جنت کی طرف لے جا رہے ہیں یا جہنم کا راستہ دکھا رہے ہیں؟ اپنے بہترین وسائل خرچ کر کے اپنی اولاد کو ہم جو تعلیم دلوا رہے ہیں کیا وہ ان کو دین کی طرف راغب کرنے والی ہے یا ان کے دلوں میں دین سے بغاوت کے بیج بونے والی ہے؟ اگر تو ہم اپنے اہل وعیال کو اچھے مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کر رہے اور ان کے لیے ایسی تعلیم وتربیت کا اہتمام نہیں کر رہے جو انہیں دین کی طرف راغب کرنے اور فکر آخرت سے آشنا کرنے کا باعث بنے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ ہم محبت کے نام پر ان سے عداوت کر رہے ہیں۔

﴿لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ﴾ ''اللہ ان کو جو حکم دے گا وہ فرشتے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے''

اللہ تعالیٰ جس کو جیسا عذاب دینے کا حکم دے گا وہ فرشتے اسے ویسا ہی عذاب دیں گے۔ کسی کے رونے دھونے کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتیں گے۔

﴿وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ⑥﴾ ''اور وہ وہی کریں گے جس کا انہیں حکم دیا جائے گا۔''

آیت ۷ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ﴾ ''(اُس دن کہہ دیا جائے گا:) اے کافرو! آج تم عذر مت پیش کرو۔''

آج تم معذرتیں نہ تراشو' بہانے مت بناؤ!

﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ⑦﴾ ''آج تمہیں بدلے میں وہی کچھ دیا جا رہا ہے جو تم عمل کر کے لائے ہو۔''

آیت ۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ﴾ ''اے اہل ایمان! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔''

یہ آیت اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے زیر مطالعہ سورتوں کے گروپ میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں پل صراط کے اس ماحول کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے جس کی تفصیل سورۃ الحدید میں آئی ہے۔ اس آیت کے ابتدائی حصے میں اہل ایمان کو توبہ سے متعلق جو حکم دیا گیا ہے اس حکم میں بہت جامعیت ہے۔ اس سے مراد صرف کسی ایک برے عمل کی توبہ نہیں کہ کوئی شخص شراب نوشی سے توبہ کر لے یا کوئی رشوت خوری سے باز آ جائے' بلکہ اس سے مراد غفلت کی زندگی اور معصیت کی روش سے توبہ ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ زندگی کا رخ بدلنے کا حکم ہے' کہ اے ایمان کے دعوے دارو! ذرا اپنی زندگی کے شب و روز پر غور تو کرو کہ تمہارا رخ کس طرف ہے؟ تمہاری زندگی کے سفر کی منزل کیا ہے؟ تم محمد رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چل رہے ہو یا کسی اور کی پیروی کر رہے ہو؟ ﴿فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ㉖﴾ (التکویر) ـــــ تو اے اللہ کے بندو! اپنی زندگی کے شب و روز اور معمولات کا جائزہ لو' اپنی دوڑ دھوپ اور اپنی ترجیحات پر غور کرو۔ پھر اگر تم محسوس کرو کہ تم غلط رخ پر جا رہے ہو تو اپنے بڑھتے ہوئے قدم فوراً روک لو ﴿فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ﴾ (الذاریات: ۵۰) اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ! تمہارے پلٹنے کے لیے اللہ کی رحمت کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے جب تک تمہاری موت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ چنانچہ ابھی موقع ہے کہ اس کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرو' زندگی کے جو ماہ و سال غفلت کی نذر ہو گئے ہیں ان پر اشک ندامت بہاؤ' صدقِ دل اور اخلاصِ نیت سے معافی مانگو اور غلط روش کو ترک کرنے کے بعد زندگی کا سفر از سرِ نو شروع کرو۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ سفر زندگی کی سمت درست کرنے کے لیے فرائض دینی کا درست فہم اور ادراک بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے دین صرف نمازیں پڑھنے اور رمضان کے روزے رکھنے ہی کا نام نہیں' بلکہ ایک بندۂ مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی معاشرت اور معیشت کو بھی ''مسلمان'' کرے۔ پھر یہ کہ جو ہدایت اسے نصیب ہوئی ہے اسے دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرے اور کسی جماعت میں شامل ہو کر دین کے سب سے اہم فرض کی ادائیگی یعنی باطل نظام کے خاتمے اور اللہ تعالیٰ کی حکومت کے قیام کی جدوجہد میں سرگرمِ عمل

ہوجائے۔ اس کے لیے انقلابِ نبویؐ کے منہج کو سمجھنا اور اس منہج کی پیروی کرنا بہت ضروری ہے۔ آج ہماری جدوجہد میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محنت اور کوشش کی سی کیفیت تو پیدا نہیں ہوسکتی کہ ع ''وہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!'' لیکن ہمیں آپ کے منہج پر چلنے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں سہی آپ کی تحریک کے ساتھ اپنی جدوجہد کی کچھ نہ کچھ مماثلت اور مشابہت تو پیدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد تک دعوت پہنچانے کا اہتمام' دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تنظیم وتربیت کا انتظام' صبر ومصابرت کی حکمت عملی' جیسے ضروری مراحل ہمیں اسی طریقے سے طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس طریقے سے خود حضور ﷺ نے یہ مراحل طے فرمائے تھے۔ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے میری کتاب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' اور اسی عنوان سے تقاریر کی ریکارڈنگ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

﴿عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّکَفِّرَ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ﴾ ''امید ہے تمہارا رب تم سے تمہاری برائیوں کو دور کردے گا''

تمہارے توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارے نامۂ اعمال سے تمام دھبے دھوڈالے گا اور تمہارے دامنِ کردار کے تمام داغ صاف کردے گا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنۡبِ کَمَنۡ لَا ذَنۡبَ لَہٗ))[1] کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہوجاتا ہے جیسے اس نے وہ گناہ کبھی کیا ہی نہ ہو۔

﴿وَیُدۡخِلَکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۙ﴾ ''اور تمہیں داخل کرے گا ایسے باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''

﴿یَوۡمَ لَا یُخۡزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ ۚ﴾ ''جس دن اللہ اپنے نبی (ﷺ) کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔''

﴿نُوۡرُہُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَبِاَیۡمَانِہِمۡ﴾ ''(اُس دن) ان کا نور دوڑتا ہوگا ان کے سامنے اور ان کے داہنی طرف''

یہ مضمون اس سے پہلے انہی الفاظ میں سورۃ الحدید کی آیت ۱۲ میں بھی آچکا ہے۔ نورِ ایمان ان کے سامنے ہوگا جبکہ اعمالِ صالحہ کا نور داہنی طرف ہوگا۔

﴿یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا﴾ ''وہ کہتے ہوں گے: اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارے نور کو کامل کردے''

﴿وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۸﴾﴾ ''اور تو ہمیں بخش دے' یقیناً تو ہر شے پر قادر ہے۔''

ہر بندۂ مؤمن کا نور اس کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی مناسبت سے ہوگا۔ حضرت قتادہؒ سے مرسلاً روایت

---

(۱) سنن ابن ماجہ' کتاب الزھد' باب ذکر التوبۃ- صحیح الجامع للالبانی' ح:۳۰۰۸۔ راوی: عبداللہ بن مسعود وابوسعید الخدری رضی اللہ عنہما۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۵۴/۱۰۔

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی کا نور اتنا تیز ہوگا کہ مدینہ سے عدن تک کی مسافت کے برابر فاصلے تک پہنچ رہا ہوگا اور کسی کا نور مدینہ سے صنعاء تک‘ اور کسی کا اس سے کم‘ یہاں تک کہ کوئی مؤمن ایسا بھی ہوگا جس کا نور اس کے قدموں سے آگے نہ بڑھے گا۔'' (ابن جریر)(۱)

حضور ﷺ کے اس فرمان کے مطابق تصور کریں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نور کا کیا عالم ہوگا۔ بہرحال ہم جیسے مسلمانوں کو اس دن اگر ٹارچ کی روشنی جیسا نور بھی مل جائے تو غنیمت ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہاں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس دن کچھ لوگوں کا نور کم کیوں ہوگا۔ یقیناً وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کے ایمان میں کسی پہلو سے کوئی کمزوری رہ گئی ہوگی اور اعمال میں کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔ یقیناً انہوں نے اپنی استعداد کو‘ اپنے مال کو اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بچا بچا کر رکھا ہوگا اور اللہ کے راستے میں انہیں اس حد تک خرچ نہیں کیا ہوگا جس حد تک خرچ کرنے کے وہ مکلّف تھے۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کی یہ نصیحت ہمیں حرزِ جاں بنا لینی چاہیے:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے‘ ترا آئینہ ہے وہ آئینہ ۔۔۔ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں!

بہرحال پل صراط کے کٹھن اور نازک راستے پر جن اہل ایمان کا نور کم ہوگا وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ اے اللہ! تو اپنے فضل اور اپنی شانِ غفاری سے ہماری کوتاہیوں کو ڈھانپ لے اور ہمارے نور کو بھی مکمل فرما دے۔

آیت ۹

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

آیت ۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ ''اے نبی (ﷺ!) جہاد کیجیے کافروں سے بھی اور منافقوں سے بھی اور ان پر سختی کیجیے۔''

یہ آیت جوں کی توں سورۃ التوبہ میں (آیت ۷۳ کے طور پر) بھی آ چکی ہے۔ منافقین چونکہ بظاہر کلمہ گو اور

---

(۱) اس ضمن میں ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

((۔۔۔ فَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى نُوْرَهٗ مِثْلَ الْجَبَلِ الْعَظِيْمِ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ‘ وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى نُوْرَهٗ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ ‘ وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى مِثْلَ النَّخْلَةِ بِيَدِهٖ‘ وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطٰى اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ‘ حَتّٰى يَكُوْنَ آخِرُهُمْ يُعْطٰى نُوْرَهٗ عَلٰى اِبْهَامِ قَدَمِهٖ يُضِيْءُ مَرَّةً وَيُطْفَاُ مَرَّةً۔۔۔)) [الترغيب والترهيب للمنذری:۲۹۶/۴ راوی: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ امام البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔]

''۔۔۔ پس ان میں سے بعض کو اتنا نور عطا کیا جائے گا جو بہت بڑے پہاڑ کی مانند ہوگا اور وہ ان کے دائیں طرف دوڑتا ہوگا‘ اور کسی کو اس سے کم نور عطا کیا جائے گا۔ اور ان میں کسی کو اتنا نور عطا کیا جائے گا گویا اس کے ہاتھ میں کھجور کا درخت ہے اور کسی کو اس سے کم نور عطا ہوگا۔ حتیٰ کہ ان میں سے سب سے آخری شخص کا حال یہ ہوگا کہ اس کو بس اتنا سا نور عطا کیا جائے گا جو اس کے پاؤں کے انگوٹھے پر ہوگا‘ جو کبھی جلتا اور کبھی بجھتا ہوگا ۔۔۔'' (حاشیہ از مرتب)

قانونی لحاظ سے مسلمان تھے‘ اس لیے حضورﷺ ان سے مسلمانوں جیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ حضورﷺ اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے ان کی بہت سی شرارتوں کو نظرانداز بھی فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ اپنی مسلسل سازشوں پر جواب دہی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ حضورﷺ کے بارے میں گستاخانہ جملے بھی کستے رہتے تھے۔ مثلاً کہتے: ﴿هُوَ اُذُنٌ﴾ (التوبہ:٦١) کہ آپ تو نرے کان ہیں۔ ہر بات سن لیتے ہیں‘ سمجھتے کچھ بھی نہیں (معاذ اللہ!)۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں حضورﷺ کو ان لوگوں پر سختی کرنے کا کہا جا رہا ہے۔

﴿وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑨﴾ ’’ان کا ٹھکانہ جہنم ہے‘ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔‘‘

آیات ١٠ تا ١٢

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ⑩ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ⑪ۙ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ⑫ۧ ع

ان آیات میں عورتوں کا معاملہ ایک اور پہلو سے زیر بحث آ رہا ہے۔ واضح رہے کہ ان دونوں سورتوں (الطلاق اور التحریم) کی ایک مشترک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں عورتوں کے معاملات بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب عورتوں پر واضح کیا جا رہا ہے کہ وہ خود کو اپنے شوہروں کے تابع سمجھتے ہوئے آخرت کے حساب سے نچنت نہ ہو جائیں۔ اسلام میں عورت اور مرد کا درجہ انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہے۔ لہٰذا عورتیں اپنے دین و ایمان اور اعمال و فرائض کی خود ذمہ دار ہیں۔ اگر ان کا ایمان درست ہوگا اور اعمالِ صالحہ کا پلڑا بھاری ہوگا تبھی نجات کی کوئی صورت بنے گی۔ ان کے شوہر خواہ اللہ کے کتنے ہی برگزیدہ بندے کیوں نہ ہوں اس معاملے میں وہ ان کے کچھ کام نہیں آ سکیں گے۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ان آیات میں چار خواتین کی مثالیں دی گئی ہیں:

آیت ١٠ ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ﴾ ’’اللہ نے مثال بیان کی ہے کافروں کے لیے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی۔‘‘

﴿كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ﴾ ’’وہ دونوں ہمارے دو بہت صالح بندوں کے عقد میں تھیں‘‘

﴿فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا﴾ ''تو انہوں نے ان سے خیانت کی' تو وہ دونوں اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے''

وہ جلیل القدر پیغمبر علیہم السلام اپنی بیویوں کو اللہ کے عذاب سے نہ تو دنیا میں بچا سکے اور نہ ہی آخرت میں بچا سکیں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی سیلاب میں غرق ہوگئی اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ پتھراؤ کے عذاب سے ہلاک ہوئی۔ واضح رہے کہ یہاں جس خیانت کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد کردار کی خیانت نہیں ہے' اس لیے کہ کسی نبیؑ کی بیوی کبھی بدچلن اور بدکار نہیں رہی ہے۔ ان کی خیانت اور بے وفائی دراصل دین کے معاملے میں تھی کہ وہ دونوں اپنے شوہروں کی جاسوسی کرتی تھیں اور ان کے راز اپنی قوم کے لوگوں تک پہنچاتی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک شادی شدہ عورت کی عصمت اس کے شوہر کی عزت و ناموس ہے جس کی حفاظت کرنا شوہر کی طرف سے اس پر فرض ہے' لیکن اس کے علاوہ ایک بیوی اپنے شوہر کے رازوں اور اس کے مال وغیرہ کی محافظ بھی ہوتی ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۳۴ میں نیک اور مثالی بیویوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک صفت حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بھی ہے۔ اس کا مفہوم یہی ہے کہ نیک بیویاں اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں ان کے گھر بار اور حقوق کی محافظ ہوتی ہیں۔ اب ظاہر ہے اس حفاظت میں شوہر کی عزت و ناموس کے ساتھ ساتھ اس کے مال اور اس کے رازوں وغیرہ کی حفاظت بھی شامل ہے۔ چنانچہ یہاں خیانت سے صرف عزت و ناموس ہی کی خیانت مراد لینا درست نہیں۔

﴿وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ⑩﴾ ''اور (آخرت میں) کہہ دیا جائے گا کہ تم دونوں داخل ہو جاؤ آگ میں دوسرے سب داخل ہونے والوں کے ساتھ۔''

ان دو عبرت انگیز مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جانی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ اولوالعزم پیغمبرؑ جنہوں نے ساڑھے نو سو سال اللہ تعالیٰ کے پیغام کی دعوت میں صرف کیے وہ اگر اپنی بیوی کو برے انجام سے نہیں بچا سکے تو اور کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے کسی عزیز رشتے دار کی سفارش کر سکے گا؟ نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں قبیلہ قریش بالخصوص اپنے قریبی عزیز و اقارب کو جمع کر کے فرمایا تھا:

((يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ! اشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ اللّٰهِ لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا' يَا بَنِيْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ! لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا عَبَّاسَ بْنَ عَبْدِالْمُطَّلِبِ! لَا اُغْنِيْ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! سَلِيْنِيْ بِمَا شِئْتِ لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا))(۱)

''اے قریش کے لوگو! اپنے آپ کو اللہ (کی گرفت) سے بچانے کی کوشش کرو' میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔ اے بنی عبدالمطلب! میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الوصایا' باب هل یدخل النساء والولد فی الاقارب' ح:۲۷۵۳ و ۴۷۷۱۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب فی قوله تعالیٰ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ' ح:۲۰٦ (واللفظ له)

آ سکوں گا۔ اے عباس بن عبد المطلب! میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔ اے صفیہ' اللہ کے رسول کی پھوپھی! میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔ اے فاطمہ' اللہ کے رسولؐ کی بیٹی! تم مجھ سے (میرے مال میں سے) جو چاہو طلب کر لو' لیکن میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

((یَافَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ (ﷺ) اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ' فَاِنِّیْ لَا اَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا))[1]

''اے محمد (ﷺ) کی لختِ جگر فاطمہؓ! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ' کیونکہ مجھے تمہارے بارے میں اللہ کے ہاں کوئی اختیار نہیں ہوگا۔''

آیت ۱۱ ﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ﴾ ''اور اہلِ ایمان (خواتین) کے لیے اللہ نے مثال بیان کی ہے فرعون کی بیوی کی۔''

اُن کا نام حضرت آسیہؓ (بنت مزاحم) بیان کیا جاتا ہے۔ دریائے نیل سے حضرت موسیٰؑ کا صندوق ان ہی نے نکالا تھا اور حضرت موسیٰ کی پرورش کا اہتمام کیا تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہو گئی تھیں اور ہمیشہ فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف داری کیا کرتی تھیں۔ جب فرعون کو پتا چل گیا کہ آسیہ اسے خدا نہیں مانتی اور موسیٰ پر ایمان لا چکی ہے تو اُس نے ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔

﴿اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ﴾ ''جب اُس نے کہا: اے میرے پروردگار! تُو میرے لیے بنا دے اپنے پاس ایک گھر جنت میں''

﴿وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ﴾ 'اور مجھے نجات دے دے فرعون سے بھی اور اس کے عمل سے بھی''

﴿وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ⑪﴾ ''اور مجھے اس ظالم قوم سے (جلد از جلد) چھٹکارا دلا دے۔''

حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کی اس دعا سے ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے مطلق العنان فرمانروا کی بیوی تھیں۔ اس حیثیت سے انہیں عزت' دولت' شہرت اور محلات میں ہر طرح کی آسائشیں حاصل تھیں۔ لیکن ان کے ایمان اور اللہ تعالیٰ سے ان کی محبت کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے شوہر اور اس کے کافرانہ اعمال سے بیزار ہو کر موت کی آرزومند تھیں۔

ان دو مثالوں میں دو انتہاؤں کی تصویر دکھا دی گئی ہے۔ یعنی ایک طرف بہترین شوہروں کے ہاں بدترین انجام والی بیویاں ہیں اور دوسری طرف ایک بدترین مرد کے گھر میں بہترین سیرت و کردار کی حامل بیوی ہے۔ ظاہر ہے حضرت آسیہؓ قیامت کے دن حضرت مریمؑ' حضرت خدیجہؓ' حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہن جیسی عظیم مراتب کی حامل خواتین میں شامل ہوں گی۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب فی قولہ تعالیٰ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ' ح:۲۰۴۔ وصحیح ابن حبان' ح:۶۴۶ (واللفظ لہ)

آیت ۱۲ ﴿وَمَرۡیَمَ ابۡنَتَ عِمۡرٰنَ الَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا﴾ ''اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی''

یہ تیسری مثال ایسی خاتون کی ہے جو خود بھی نیک تھیں اور ان کی تربیت بھی انتہائی پاکیزہ ماحول میں ہوئی: ﴿وَکَفَّلَهَا زَکَرِیَّا﴾(آل عمران:۳۷)۔ یعنی انہوں نے اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت زکریاؑ کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی اور یوں ان کی سیرت نورٌ علیٰ نور کی مثال بن گئی۔

﴿فَنَفَخۡنَا فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِنَا﴾ ''تو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا''

﴿وَصَدَّقَتۡ بِکَلِمٰتِ رَبِّهَا وَکُتُبِهٖ﴾ ''اور اُس نے تصدیق کی اپنے رب کی تمام باتوں کی اور اُس کی کتابوں کی''

حضرت مریم سلامٌ علیہا کو وحی کے ذریعے فرشتے جو کچھ بتاتے رہے انہوں نے وہ سب باتیں دل و جان سے تسلیم کیں۔ مثلاً یہ کہ اللہ نے تمہیں دنیا بھر کی عورتوں میں سے چن لیا ہے اور یہ کہ اللہ کے حکم سے تمہارے ہاں بیٹا ہو گا۔ اسی طرح حضرت مریم نے زبور' تورات اور عہد نامہ قدیم سمیت تمام الہامی کتب اور صحائف کی تصدیق بھی کی۔

﴿وَکَانَتۡ مِنَ الۡقٰنِتِیۡنَ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور وہ بہت ہی فرمانبرداروں میں سے تھیں۔''

ان تین مثالوں کے ذریعے خواتین کے حوالے سے تین ممکنہ صورتیں بیان کی گئی ہیں' یعنی بہترین شوہر کے ہاں بدترین بیوی' بدترین شوہر کے ہاں بہترین بیوی' اور بہترین ماحول میں بہترین خاتون۔ چوتھی ممکنہ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ شوہر بھی بدطینت ہو اور اس کی بیوی بھی بدطینت ہو۔ یعنی میاں بیوی دونوں کا ظاہر و باطن ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ﴾(النور:۴۰) کا نقشہ پیش کرتا ہو اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ ان دونوں میں کون زیادہ بدطینت اور بدسرشت ہے۔ اس ممکنہ صورت کی مثال سورۃ اللھب میں ابولہب اور اُس کی بیوی (اُمِ جمیل) کی بیان ہوئی ہے۔

سُوۡرَۃُ الۡمُلۡک

تمہیدی کلمات

سورۃ التحریم مکی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی آخری سورت تھی۔ یاددہانی کے لیے ایک مرتبہ پھر نوٹ کر لیجیے کہ اس گروپ کا آغاز سورۂ قٓ سے ہوتا ہے (سورۂ قٓ سے ہی قرآن مجید کی ساتویں اور آخری منزل کا آغاز بھی ہوتا ہے)۔ اس گروپ میں سورۂ قٓ سے سورۃ الواقعہ تک سات مکی سورتیں اور سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک دس مدنی سورتیں شامل ہیں۔ اب سورۃ الملک کے مطالعہ کے آغاز کے ساتھ ہم پھر سے قرآن کی ''مکی جنت'' میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس سورت سے مکی سورتوں کے آخری گروپ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس گروپ کی پہلی چھ سورتیں دو ضمنی گروپس میں تقسیم ہیں۔ ہر ضمنی گروپ میں تین سورتیں ہیں‘ جن میں ایک منفرد ہے اور دو جوڑے کی شکل میں ہیں۔ سورۃ الملک پہلے ضمنی گروپ کی منفرد سورت ہے۔ اپنے مضمون کی جامعیت کے اعتبار سے اس گروپ میں اس سورت کا وہی مقام ہے جو پچھلے گروپ میں سورۂ قٓ کا تھا۔ سورۃ الملک نبی اکرم ﷺ کو بہت عزیز تھی۔ رات کو سونے سے پہلے اس سورت کی تلاوت کرنا حضور ﷺ کا مستقل معمول تھا۔ آپ نے اُمت کو بھی اس عمل کی خصوصی تلقین فرمائی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

آیات ۱ تا ۱۴

الجزء التاسع والعشرون (٢٩)

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرُۨ ۝۱ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ
لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۝۲ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ
طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ۝۳
ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ ہُوَ حَسِیۡرٌ ۝۴ وَ لَقَدۡ زَیَّنَّا السَّمَآءَ
الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ وَ جَعَلۡنٰہَا رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ وَ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابَ السَّعِیۡرِ ۝۵
وَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ عَذَابُ جَہَنَّمَ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ۝۶ اِذَاۤ اُلۡقُوۡا فِیۡہَا سَمِعُوۡا لَہَا
شَہِیۡقًا وَّ ہِیَ تَفُوۡرُ ۝۷ تَکَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الۡغَیۡظِ ؕ کُلَّمَاۤ اُلۡقِیَ فِیۡہَا فَوۡجٌ سَاَلَہُمۡ خَزَنَتُہَاۤ
اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَذِیۡرٌ ۝۸ قَالُوۡا بَلٰی قَدۡ جَآءَنَا نَذِیۡرٌ ۬ۙ فَکَذَّبۡنَا وَ قُلۡنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ ۚۖ
اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ کَبِیۡرٍ ۝۹ وَ قَالُوۡا لَوۡ کُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡ نَعۡقِلُ مَا کُنَّا فِیۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ ۝۱۰

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ۝ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۝ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۝ ع

آیت ۱ ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ﴾ ''بہت ہی بابرکت ہے وہ ہستی جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے''

یہ دین اسلام کے سیاسی منشور کی بنیادی شق ہے۔ یعنی پوری کائنات کا اقتدار اور اختیار کُلّی طور پر اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ دنیا میں اگر انسانوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کے احکام سے کہیں بغاوت دکھائی دیتی ہے تو وہ بھی دراصل اسی کے عطا کردہ اختیار کی وجہ سے ہے۔ اس میں ایمان کے دعوے داروں کا امتحان بھی ہے کہ وہ بھلا اللہ کے اقتدار کو چیلنج کرنے والوں کے مقابلے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ ورنہ سورج' چاند' ستارے' کہکشائیں' ہوائیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند اور تابع ہے۔

پوری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حکومت اور قدرت کی کیفیت یہ ہے کہ کہیں کوئی ایک ذرہ بھی اس کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا اور حرکت کرتا ہوا کوئی ذرہ اس کی مشیت کے بغیر ساکن نہیں ہو سکتا۔ اپنی تمام مخلوق میں صرف انسان کو اس نے ایک حد تک ارادے اور عمل کا اختیار دیا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ اس میں انسان کی آزمائش مقصود ہے۔ لیکن انسان ہے کہ ہلدی کی یہ گانٹھ مل جانے پر پنساری بن بیٹھا ہے۔ اب کہیں وہ فرعون بن کر اللہ کے مقابلے میں ''میری حکومت' میرا ملک اور میرا مثالی نظام'' جیسے دعووں کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے تو کہیں کسی فرعون کی چاکری اور وفاداری کی دھن میں مقتدرِ حقیقی کے احکام کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت میں انسان کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ خود اپنے جسم پر بھی اسے کوئی اختیار نہیں۔ ظاہر ہے انسان کے جسم کی فزیالوجی اور اناٹومی کا سارا نظام بھی تو اللہ تعالیٰ کے طے کردہ قانون کے تابع ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ وہ اپنے دل کو آرام دینے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے بند کر دے اور پھر اپنی مرضی سے دوبارہ رواں کر لے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں۔

﴿وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ۝۱﴾ ''اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۲ ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾ ''جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔''

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝۲﴾ ''اور وہ بہت زبردست بھی ہے اور بہت بخشنے والا بھی۔''

یہ ہے انسانی زندگی اور موت کی تخلیق کا اصل مقصد۔ جو کوئی اس فلسفے کو نہیں سمجھے گا اسے زندگی' موت اور موت کے بعد پھر زندگی کی یہ باتیں محض افسانہ معلوم ہوں گی۔ جیسے ایک معروف جاہلی شاعر نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے کہا تھا:

حَيَاةٌ ثُمَّ مَوْتٌ ثُمَّ بَعْثٌ حَدِيْثُ خَرَافَةٍ يَا أُمَّ عَمْرٍو!

''کہ یہ زندگی' پھر موت' پھر زندگی' اے اُم عمرو! یہ کیا حدیث خرافات ہے؟'' (معاذ اللہ!) انسانی زندگی کا سفر دراصل عالم ارواح سے شروع ہو کر ابدالآباد کی سرحدوں تک جاتا ہے۔ انسان کی دنیوی زندگی' موت اور بعث

بعد الموت اس طویل سلسلۂ حیات کے مختلف مراحل ہیں۔ جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے: ﴿وَكُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡيَاكُمۡ‌ۚ ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡكُمۡ ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ﴿۲۸﴾﴾ (البقرۃ) ''اور تم مردہ تھے پھر اُس نے تمہیں زندہ کیا' پھر وہ تمہیں مارے گا' پھر جلائے گا' پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے''۔ زندگی کے اس تسلسل کے اندر موت کے مرحلے کی توجیہہ میر تقی میر نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

موت اک زندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

بہرحال انسان کی دُنیوی زندگی ایک وقفہ امتحان ہے اور موت اس وقفے کے اختتام کی گھنٹی ہے: ﴿نَحۡنُ قَدَّرۡنَا بَيۡنَكُمُ الۡمَوۡتَ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِيۡنَ﴿۶۰﴾﴾ (الواقعۃ)۔ اس وقفہ امتحان کا انداز بالکل اسکولوں اور کالجوں کے امتحانات جیسا ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ ان امتحانات کے لیے چند گھنٹوں کا وقت دیا جاتا ہے' جبکہ انسانی زندگی کے حقیقی امتحان کا دورانیہ اوسطاً تیس چالیس برس پر محیط ہے۔ ظاہر ہے انسان کی زندگی کے ابتدائی بیس پچیس برس تو بچپنے اور غیر سنجیدہ رویے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر کسی کو بڑھاپا دیکھنا نصیب ہو تو اپنی آخری عمر میں وہ ﴿لِكَيۡلَا يَعۡلَمَ مِنۡۢ بَعۡدِ عِلۡمٍ شَيۡـًٔا﴾ (الحج: ۵) کی عبرت ناک تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ لے دے کر ایک انسان کو عمل کے لیے شعور کی عمر کے اوسطاً تیس چالیس سال ہی ملتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم خضر راہ میں ''زندگی'' کے عنوان کے تحت زندگی کے اس فلسفے پر کمالِ مہارت سے روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی!

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب — اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

ان اشعار میں علامہ اقبال نے دراصل قرآنی آیات ہی کی ترجمانی کی ہے۔ مندرجہ بالا آخری شعر (قلزمِ ہستی......) آیت زیر مطالعہ کے مفہوم کا ترجمان ہے' جبکہ پہلے شعر میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۴ ﴿وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ يُّقۡتَلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتٌ ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ......﴾ کا بنیادی فلسفہ بیان ہوا ہے۔ ظاہر ہے عام طور پر تو زندہ جان کو ہی زندگی کا نام دیا جاتا ہے' لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقیقی اور دائمی زندگی جان دے دینے (تسلیمِ جاں) سے حاصل ہوتی ہے۔

آیت ۳ ﴿الَّذِىۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا‌ ؕ﴾ ''(وہ اللہ کہ) جس نے بنائے سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر۔''

یہ آیت آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔ ابھی تک انسان سات آسمانوں کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

﴿مَا تَرٰى فِىۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ‌ ؕ﴾ ''تم نہیں دیکھ پاؤ گے رحمٰن کی تخلیق میں کہیں کوئی فرق۔''

اس کائنات کا نظام اور اس میں موجود ایک ایک چیز کی تخلیق اس قدر خوبصورت' محکم' مربوط اور کامل ہے

کہ اس میں کسی خلل، نقص، رخنے، بدنظمی یا عدمِ تناسب کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اس حقیقت کی گواہی نسلِ انسانی نے اپنے اجتماعی علم کی بنیاد پر ہر زمانے میں دی ہے۔ ہر زمانے کے سائنس دانوں نے فلکیات، ارضیات، طبیعیات، حیوانیات، نباتات غرض سائنس کے تمام شعبوں میں حیران کن تحقیقات کی ہیں، لیکن آج تک کوئی ایک محقق یا سائنسدان یہ نہیں کہہ سکا کہ قدرت کی بنائی ہوئی فلاں چیز میں فلاں نقص ہے یا یہ کہ فلاں چیز اگر ایسے کی بجائے ویسے ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتی۔

﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ③﴾ ''پھر لوٹاؤ نگاہ کو' کیا تمہیں کہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟''

آیت ۴ ﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ④﴾ ''پھر لوٹاؤ نگاہ کو بار بار (کوئی رخنہ ڈھونڈنے کے لیے)' پلٹ آئے گی نگاہ تمہاری طرف ناکام تھک ہار کر۔''

اندازہ کیجیے کہ کس قدر پُر زور اسلوب ہے اور کتنا بڑا چیلنج ہے! بار بار دیکھو، ہر پہلو اور ہر زاویے سے دیکھو! اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تمہیں کہیں کوئی خلل، نقص یا رخنہ نظر نہیں آئے گا! ظاہر ہے یہ چیلنج پوری انسانیت کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ بہر حال آج تک کوئی سائنس دان اور کوئی دانشور اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکا۔ گویا اب تک پوری نوعِ انسانی اس نکتے پر متفق ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ایک ایک تخلیق مثالی اور کامل ہے۔ دراصل دنیا بھر کے داناؤں اور دانشوروں کی توجہ اس مثالی تخلیق کی طرف دلا کر انہیں پیغام تو یہ دینا مقصود ہے کہ اے عقل کے اندھو! کائنات کی خوبصورتی اور کاملیت کو دیکھ کر اس پر حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے اس کے خالق کو پہچانو اور اس کی عظمت کے سامنے اپنا سر نیاز خم کرو۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ستاروں اور کہکشاؤں کی دنیا کے اسرار و عجائب کا کھوج لگانے والے بڑے بڑے سائنسدان اور ماہرینِ فلکیات بھی اس معاملے میں اپنے ناک تلے کے پتھر سے ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ان لوگوں نے اپنی تحقیقات کے دوران بہت کچھ دریافت بھی کیا اور بہت کچھ دیکھا بھی۔ لیکن اس ساری چھان بین میں انہیں اگر نہیں نظر آیا تو اس کائنات کا خالق کہیں نظر نہیں آیا۔ بقول اقبال: ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!

آیت ۵ ﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ﴾ ''اور ہم نے سب سے قریبی آسمان کو سجا دیا ہے چراغوں سے''

یعنی زمین سے قریب ترین آسمان کو ستاروں سے مزین کر دیا گیا ہے۔

﴿وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ ''اور ان کو بنا دیا ہے ہم نے شیاطین کو نشانہ بنانے کا ذریعہ''

ان ستاروں میں ایسے میزائل نصب کر دیے گئے ہیں جو غیب کی خبروں کی ٹوہ میں عالمِ بالا کی طرف جانے والے شیاطینِ جن کو نشانہ بناتے ہیں۔

﴿وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ⑤﴾ ''اور ان کے لیے ہم نے تیار کر رکھا ہے جلا دینے والا عذاب۔''

آیت ۶ ﴿وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑥﴾ ''اور جو لوگ اپنے رب کا

کفر کریں (چاہے وہ انسان ہوں یا جِنّات) ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے' اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔''

آیت ۷ ﴿اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝﴾ ''جب وہ اس میں جھونکے جائیں گے تو اسے سنیں گے دھاڑتے ہوئے اور وہ بہت جوش کھا رہی ہوگی۔''

جہنم انہیں دیکھ کر غصے سے دھاڑ رہی ہوگی جیسے کوئی بھوکا بھیڑیا اپنے شکار پر جھپٹتے ہوئے غراتا ہے۔ سورۃ قٓ میں جہنم کے غیظ و غضب کی ایک کیفیت یوں بیان ہوئی ہے: ﴿يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝﴾ ''جس دن کہ ہم پوچھیں گے جہنم سے کہ کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے؟''

آیت ۸ ﴿تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۭ﴾ ''قریب ہوگا کہ وہ غصے سے پھٹ جائے۔''

ایسے معلوم ہوگا کہ ابھی شدتِ غضب سے پھٹ پڑے گی۔

﴿كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝﴾ ''جب بھی ڈالا جائے گا اس میں کسی ایک گروہ کو تو اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟''

قیامت کے دن ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ حساب ہوگا' جیسا کہ سورۃ النمل کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے: ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝﴾ ''اور ذرا تصور کرو اُس دن کا جس دن ہم جمع کریں گے ہر اُمت میں سے ایک فوج اُن لوگوں میں سے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے' پھر ان کی درجہ بندی کی جائے گی''۔ گویا جیسے جیسے حساب ہوتا جائے گا' اسی ترتیب سے ہر قوم کے مجرمین کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔ ہر گروہ کے پہنچنے پر جہنم پر متعین فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟

آیت ۹ ﴿قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۥ﴾ ''وہ کہیں گے کیوں نہیں! ہمارے پاس خبردار کرنے والا آیا تھا''

﴿فَكَذَّبْنَا﴾ ''لیکن ہم نے اسے جھٹلا دیا''

﴿وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ﴾ ''اور ہم نے کہا کہ اللہ نے کوئی شے نہیں اتاری۔''

ہم نے اپنے رسولوںؑ سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف کوئی کتاب وغیرہ نہیں بھیجی' بلکہ ہم نے تو انہیں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ:

﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝﴾ ''تم تو کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہو۔''

آیت ۱۰ ﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ﴾ ''اور وہ کہیں گے کہ اگر ہم سنتے اور عقل سے کام لیتے''

﴿مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝﴾ ''تو ہم نہ ہوتے ان جہنم والوں میں سے۔''

اس آیت میں انبیاء و رسل ﷺ کی تکذیب کرنے والوں کے اصل گناہ کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کا یہ مقام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسے تمام لوگوں کا بنیادی اور اصل جرم یہ تھا کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی دعوت سنی اَن سنی کر دی تھی۔ اس دعوت پر انہوں نے کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہ کیا اور نہ ہی

پیغمبروں کی باتوں کو کبھی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت گوارا کی۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے‘ سننے‘ سمجھنے وغیرہ کی صلاحیتیں اسی لیے تو دی ہیں کہ وہ ان صلاحیتوں کو کام میں لائے اور اپنے نفع ونقصان کے حوالے سے درست فیصلے کرے۔ اسی بنیاد پر آخرت میں انسان کی ان تمام صلاحیتوں کا احتساب بھی ہوگا: ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل) ”یقیناً سماعت‘ بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں باز پرس کی جائے گی“۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو یہ صلاحیتیں استعمال میں لانے کے لیے دی ہیں‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حق کی دعوت کے جواب میں اکثر لوگ ان صلاحیتوں سے بالکل بھی کام نہیں لیتے۔ بلکہ اگر بات سمجھ میں آ بھی جائے اور دل اس کی صداقت کی گواہی بھی دے دے‘ تب بھی عملی طور پر قدم آگے نہیں بڑھتا۔ صرف اس لیے کہ آباء واَجداد کے اعتقادات ونظریات ہیں‘ برادری کے رسم و رواج ہیں! انہیں کیسے چھوڑ دیں؟ اور اگر چھوڑیں گے تو لوگ کیا کہیں گے؟ اسی نوعیت کی ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ پرانے مسلک سے روگردانی بھلا کیونکر ممکن ہے؟ اتنے عرصے سے اس جماعت میں ہیں‘ اب یکدم اس سے کیسے بے وفائی کردیں؟

آیت ۱۱ ﴿فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ﴾ ”پس وہ اپنے اصل گناہ کا اعتراف کرلیں گے۔“

﴿فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ ”پس پھٹکار ہے جہنمی لوگوں کے لیے۔“

اب تقابل کے طور پر آگے اہل جنت کا تذکرہ آ رہا ہے۔

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ ”بے شک وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں رہتے ہوئے“

﴿لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ﴾ ”ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔“

آیت ۱۳ ﴿وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ﴾ ”اور (دیکھو!) چاہے تم اپنی بات کو چھپا کر بیان کرو یا بلند آواز سے بیان کرو (وہ اس کو جانتا ہے)۔“

﴿اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ”وہ تو اس سے بھی واقف ہے جو تمہارے سینوں کے اندر پنہاں ہے۔“

آیت ۱۴ ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ ”کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟“

یہ آیت اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ ہم میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دعوت کا فریضہ ادا کرنے کی توفیق دی ہے‘ انہیں ایسی آیات ازبر ہونی چاہئیں۔ ایک شخص نے اگر گھڑی بنائی ہے تو ظاہر ہے اس سے بڑھ کر بھلا اور کون اس گھڑی کے بارے میں جان سکتا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ جو انسان کا خالق ہے‘ اس سے اس کے ظاہر اور باطن کا کوئی پہلو بھلا کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے!

﴿وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ ”اور وہ بہت باریک بین ہے‘ ہر شے کی خبر رکھنے والا ہے۔“

آیات ۱۵ تا ۳۰

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۭ وَاِلَيْهِ
النُّشُوْرُ ۝١٥ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝١٦ اَمْ اَمِنْتُمْ
مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۭ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ۝١٧ وَلَقَدْ كَذَّبَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝١٨ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰۗفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ؔ
مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ۝١٩ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ
يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ۭ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۝٢٠ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ
اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ۝٢١ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰي وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ
يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٢٢ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ
وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝٢٣ قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ۝٢٤ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٢٥ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ
اللّٰهِ ۠ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝٢٦ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْۗـــــَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا
الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ۝٢٧ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ
يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٢٨ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ
فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝٢٩ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاۗؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ
يَّاْتِيْكُمْ بِمَاۗءٍ مَّعِيْنٍ ۝٣٠ ع ٢

آیت ۱۵ ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا﴾ ’’وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنا دیا ہے زمین کو پست‘‘
اُس نے زمین کو تمہارے ماتحت اور تابع حکم کر رکھا ہے۔

﴿فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا﴾ ’’تو تم چلو پھرو اس کے کندھوں کے مابین‘‘
زمین کے کندھوں سے مراد اس کے وہ میدان ہیں جو انسان کو بہت وسیع اور کشادہ نظر آتے ہیں۔ جیسے ایک چیونٹی اگر ہاتھی کے کندھوں کے درمیان چل پھر رہی ہو گی تو ظاہر ہے اس جگہ کو وہ بہت وسیع میدان سمجھے گی۔

﴿وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۭ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ۝١٥﴾ ’’اور اُس کے (دیے ہوئے) رزق سے کھاؤ پیو اور (یاد رکھو کہ تم نے) اسی کی طرف زندہ ہو کر جانا ہے۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝١٦﴾ ’’کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اُس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے اور وہ یکا یک لرزنے لگے۔‘‘

کیا تم اس بات سے خائف نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر زلزلہ آ جائے' زمین شق ہو جائے اور تم اس کے اندر دھنس جاؤ؟

آیت ۱۷ ﴿اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ؕ﴾ ''کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اُس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی آندھی بھیج دے؟''

﴿فَسَتَعْلَمُوْنَ کَیْفَ نَذِیْرِ ﴿۱۷﴾﴾ ''پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرا خبردار کرنا کیسا تھا!''

آیت ۱۸ ﴿وَلَقَدْ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور یقیناً ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا تھا' تو کیسا ہوا (ان پر) میرا عذاب؟''

آیت ۱۹ ﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ ؕ﴾ ''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں پرندوں کو اپنے اوپر (اڑتے ہوئے) کبھی پروں کو پھیلائے ہوئے اور کبھی سمیٹے ہوئے؟''

﴿مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ﴾ ''نہیں روکے ہوئے انہیں کوئی (فضا میں) مگر رحمٰن!''

﴿اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍۢ بَصِیْرٌ ﴿۱۹﴾﴾ ''یقیناً وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے!''

یعنی اس کائنات کی ایک ایک مخلوق اور ایک ایک چیز جس قانونِ طبعی پر چل رہی ہے وہ اللہ ہی کا وضع کردہ ہے۔

آیت ۲۰ ﴿اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّکُمْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ﴾ ''بھلا وہ کون ہے جو تمہارا لشکر بن کر تمہاری مدد کرے رحمٰن کے مقابلہ میں؟''

﴿اِنِ الْکٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ﴿۲۰﴾﴾ ''نہیں ہیں یہ کافر مگر دھوکے میں مبتلا ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین صرف دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔

آیت ۲۱ ﴿اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُکُمْ اِنْ اَمْسَکَ رِزْقَهٗ ۚ﴾ ''پھر بھلا کون ہے وہ جو تمہیں رزق دے سکے اگر اللہ اپنے رزق کو روک لے؟''

﴿بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾﴾ ''بلکہ یہ لوگ اپنی سرکشی اور حق سے گریز میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔''

اگلی آیت فلسفہ وحکمتِ قرآن کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔

آیت ۲۲ ﴿اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۲﴾﴾

''تو کیا وہ شخص جو اپنے منہ کے بل گھسٹ رہا ہے زیادہ ہدایت پر ہے یا وہ جو سیدھا ہو کر چل رہا ہے ایک سیدھے راستے پر؟''

اس آیت میں دو قسم کے انسانوں کے ''طرزِ زندگی'' کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ایک قسم کے انسان وہ ہیں جو انسان ہوتے ہوئے بھی حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جیسے ان کی حیوانی جبلت انہیں چلا رہی ہے بس اسی طرح وہ چلے جا رہے ہیں۔ بظاہر تو وہ اپنی زندگی کی منصوبہ بندیاں بھی کرتے ہیں' معاشی دوڑ دھوپ میں بھی

سرگرمِ عمل رہتے ہیں' کھاتے پیتے بھی ہیں اور دوسری ضروریات بھی پوری کرتے ہیں' لیکن یہ سب کچھ وہ اپنے جبلی داعیات کے تحت کرتے ہیں۔ جبلی داعیات کی تعمیل و تکمیل کے علاوہ ان کے سامنے زندگی کا کوئی اور مقصد ہے ہی نہیں۔ ان لوگوں کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص فاصلہ طے کرنے کے لیے چوپایوں کی طرح اوندھا ہو کر منہ کے بل خود کو گھسیٹ رہا ہو۔ ظاہر ہے ایسا شخص نہ تو راستہ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اسے اپنی منزل کی کچھ خبر ہوتی ہے۔ دوسری مثال اُس شخص کی ہے جو سیدھے راستے پر انسانوں کی طرح سیدھا کھڑے ہو کر چل رہا ہے۔ اس مثال کے مصداق وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی منزل طے کر رکھی ہے۔ وہ طے شدہ منزل پر پہنچانے والے درست راستے کا تعین بھی کر چکے ہیں اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس راستے پر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ ظاہر ہے دنیا میں ان لوگوں کی منزل اقامتِ دین ہے جبکہ آخرت کے حوالے سے وہ رضائے الٰہی کے حصول کے متمنی ہیں۔

آیت زیرِ مطالعہ میں جو فلسفہ بیان ہوا ہے اس کی وضاحت قبل ازیں سورۃ الحج کی آیت ۷۳ کے تحت بھی کی جا چکی ہے۔ اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز انسان کو حیوانات سے ممیز و ممتاز کرتی ہے وہ اس کا نظریہ اور اس کی سوچ ہے۔ گویا انسان حقیقت میں وہی ہے جس کا کوئی نظریہ ہو' کوئی آئیڈیل اور کوئی نصب العین ہو۔ جو انسان کسی نظریے اور نصب العین کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ (الاعراف:۱۷۹) کے مصداق ہیں' یعنی وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ ظاہر ہے جانوروں کو تو شعور کی اس سطح پر پیدا ہی نہیں کیا گیا کہ وہ اپنی زندگی کا کوئی نصب العین متعین کر سکیں۔ ان کی تخلیق کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کسی نہ کسی طور پر انہیں اپنے کام میں لائیں اور بس۔ سورۃ الحج کی مذکورہ آیت (آیت ۷۳) میں بتوں اور ان کے پجاریوں کی تمثیل کے پردے میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ جس انسان کا نظریہ یا آئیڈیل بلند ہو گا اس کی شخصیت بھی بلند ہو گی' جبکہ گھٹیا آئیڈیل کے پیچھے بھاگنے والے انسان کی سوچ اور شخصیت بھی گھٹیا ہو کر رہ جائے گی۔

آیت ۲۳ ﴿قُلْ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَکُمْ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ ؕ﴾ ''کہہ دیجیے کہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے کان' آنکھیں اور دل بنائے۔''

لغوی اعتبار سے لفظ 'اَنْشَاَ' اٹھانے اور پرورش کرنے کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ لفظ ''فواد'' کے مفہوم کی وضاحت سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کے تحت گزر چکی ہے۔ عام طور پر اس لفظ کا ترجمہ ''دل'' کیا جاتا ہے لیکن اصل میں اس سے مراد انسان کی وہ صلاحیت ہے جس کی مدد سے وہ دستیاب معلومات کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرتا ہے۔ چنانچہ اس لفظ میں عقل یا سمجھ بوجھ کا مفہوم بھی شامل ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید میں جب انسان کی طبعی صلاحیتوں یا حواس کا تذکرہ ہوتا ہے تو السَّمْع (سماعت) کا ذکر پہلے آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی علم کے ذرائع میں پہلا اور بنیادی ذریعہ اس کی سماعت ہے۔ پچھلی نسلوں کے علمی آثار اور تجرباتی علم سے استفادہ کرنا ہر دور کے انسان کی ضرورت رہی ہے۔ اس علم کو بھی نسل در نسل منتقل کرنے کا بنیادی ذریعہ انسان کی سماعت ہی ہے۔ دوسرے حواس یا ذرائع اس

میں اپنا اپنا حصہ بعد کے مراحل میں شامل کرتے ہیں۔

﴿قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾ ''بہت ہی کم شکر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔''

آیت ۲۴ ﴿قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ ''کہہ دیجیے اُسی نے تمہیں پھیلا دیا ہے زمین میں اور اُسی کی طرف تم اکٹھے کر دیے جاؤ گے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ''وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ وعدہ؟ اگر تم سچے ہو (تو بتاؤ)!''

آیت ۲۶ ﴿قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''کہہ دیجیے کہ یہ علم تو اللہ ہی کے پاس ہے''

قیامت کے وقوع کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی کچھ نہیں جانتا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (لقمان: ٣٤) ''یقیناً اللہ ہی ہے جس کے پاس ہے قیامت کا علم۔''

﴿وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ ''اور میں تو بس ایک واضح طور پر خبردار کر دینے والا ہوں۔''

آیت ۲۷ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''پھر جب وہ دیکھیں گے اس کو اپنے قریب آتے تو ان کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے''

﴿وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ﴾ ''اور کہا جائے گا' یہ ہے وہ چیز جس کا تم مطالبہ کرتے تھے۔''

ہماری وعیدوں اور تنبیہات کے جواب میں تم لوگ طنزیہ انداز میں کہا کرتے تھے کہ لاؤ دکھاؤ کیسی ہے وہ جہنم! لاؤ ابھی لے آؤ ہمارے اوپر وہ عذابِ موعود! تو لو دیکھ لو اب' یہ ہے جہنم! تمہارا اصل اور دائمی ٹھکانہ!

آیت ۲۸ ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کہ اگر اللہ مجھے اور جو لوگ میرے ساتھ ہیں' ان کو ہلاک کر دے یا وہ ہم پر رحم کرے' تو کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا؟''

یعنی ہم نے تو اپنا معاملہ اپنے اللہ کے سپرد کر رکھا ہے۔ ہم اللہ کے بتائے ہوئے جس راستے پر چل رہے ہیں اس میں یا تو ہماری جانیں چلی جائیں گی یا ہم فتح یاب ہوں گے۔ ان میں سے جو صورت بھی ہو' ہمارے لیے تو کامیابی ہی کامیابی ہے۔ بلکہ ہماری اصل اور ابدی کامیابی تو وہ ہے جسے تم ہلاکت سمجھتے ہو۔ بہر حال صورتِ حال جو بھی ہو' ان دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی (اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ) (التوبة: ٥٢) تو ہمیں مل کر ہی رہے گی۔ ہمارے غلبے اور فتح کی صورت میں تو تم بھی ہمیں کامیاب قرار دو گے' لیکن ہم اگر بقول تمہارے ہلاک بھی ہو گئے تو تم اپنے بارے میں بھی تو سوچو کہ تم لوگوں کو اللہ کے عذاب سے کون بچائے گا؟

آیت ۲۹ ﴿قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ وہ تو رحمن ہے' ہم اس پر ایمان لا چکے ہیں اور اُسی پر ہمارا توکل ہے۔''

یاد رہے کہ زیر مطالعہ مکی سورتیں بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھیں' اسی لیے ان میں حضور ﷺ اور اہل ایمان کے ساتھ کفار و مشرکین کی بالکل ابتدائی ردّ و قدح کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کشمکش کا نقطہ عروج سورۃ الانعام' سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں دیکھا جاسکتا ہے۔

﴿فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ هُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ﴿۲۹﴾﴾ ''تو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کھلی گمراہی میں کون تھا!''

آنے والا وقت واضح کر دے گا کہ ہم گمراہ تھے یا تم۔

آیت ۳۰ ﴿قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَصۡبَحَ مَآؤُکُمۡ غَوۡرًا فَمَنۡ یَّاۡتِیۡکُمۡ بِمَآءٍ مَّعِیۡنٍ﴿۳۰﴾﴾ ''آپؐ کہیے کہ ذرا سوچو! اگر تمہارا پانی گہرائی میں اُتر جائے تو کون ہے جو لائے گا تمہارے پاس صاف' نتھرا ہوا پانی؟''

آج کے دور میں اس آیت کا مفہوم واضح تر ہو کر دنیا کے سامنے آیا ہے۔ آج متعلقہ ماہرین بار بار اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ پانی کے بڑھتے ہوئے استعمال اور بارشوں کی کمی کے باعث مستقبل قریب میں زیر زمین پانی کی سطح خطرناک حد تک نیچے جاسکتی ہے۔ بیشتر علاقوں میں انسانی' حیوانی اور نباتاتی زندگی کا زیادہ تر دارو مدار زیر زمین پانی پر ہی ہے جو عموماً آسانی سے دستیاب بھی ہے۔ صاف شفاف اور میٹھے پانی کا یہ عظیم الشان ذخیرہ ''زندگی'' کے لیے قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے۔ اگر یہ پانی واقعی ایسی گہرائی میں چلا جائے جہاں سے اس کا نکالنا ناممکن یا مشکل ہو جائے تو اس کے نتائج کا تصور بھی روح فرسا ہے۔

سُوْرَةُ الْقَلَم

تمہیدی کلمات

جیسا کہ سورۃ الملک کے تعارف میں بھی بیان ہو چکا ہے' زیر مطالعہ مکی سورتوں میں سے پہلی چھ سورتیں دو ضمنی گروپس پر مشتمل ہیں۔ ہر ضمنی گروپ میں تین سورتیں ہیں' جن میں ایک سورت منفرد ہے اور دو جوڑے کی شکل میں ہیں۔ پہلے ضمنی گروپ کی پہلی سورت یعنی سورۃ الملک منفرد تھی' جبکہ اس کے بعد کی دو سورتیں یعنی سورۃ القلم اور سورۃ الحاقہ جوڑے کی شکل میں ہیں۔ ان دونوں سورتوں میں انباء الرسل کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ سورۃ القلم اپنے گروپ کی تمام سورتوں میں اس اعتبار سے نمایاں ہے کہ اس میں حضورﷺ کی دعوت کے بالکل ابتدائی دور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے بعد حضورﷺ پر نازل ہونے والی دوسری وحی اس سورت کی ابتدائی سات آیات پر مشتمل تھی۔ ذاتی طور پر مجھے بھی اس رائے سے اتفاق ہے۔ ان سات آیات میں اہلِ مکہ کے اس ردِّعمل کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے جس کا اظہار انہوں نے حضورﷺ کی پہلی وحی کی خبر پر کیا تھا۔ جب حضورﷺ نے پہلی مرتبہ لوگوں کو بتایا کہ میرے پاس اللہ کی طرف سے فرشتہ وحی لے کر آیا ہے تو لوگوں کا پہلا تاثر یہی تھا کہ آپؐ پر کسی جن یا بدروح کا اثر ہو گیا ہے۔ ان میں بیشتر لوگ اپنی اس رائے کا اظہار آپؐ سے ہمدردی کی بنا پر بھی کرتے تھے کہ دیکھیں بیاچھے بھلے آدمی تھے' بیٹھے بٹھائے ان کے ساتھ یہ کیا معاملہ پیش آ گیا ہے۔ البتہ کچھ لوگ یہی باتیں آپؐ کو تنگ کرنے کے لیے طنزیہ اور استہزائیہ انداز میں بھی کرتے تھے۔ ظاہر ہے حضورﷺ کے لیے یہ صورتِ حال بہت تکلیف دہ تھی کہ آپؐ کی اپنی ہی برادری کے وہ لوگ جو کل تک آپؐ کے قدموں میں نگاہیں بچھاتے تھے اور آپؐ کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے تھے آج آپؐ کو دیوانہ اور مجنون کہہ رہے تھے۔ چنانچہ اس تکلیف دہ صورت حال میں حضورﷺ کی دلجوئی کے لیے یہ آیات نازل فرمائی گئیں۔ اس سورت کا آغاز اکیلے حرف ''ن'' سے ہوتا ہے۔ سورۂ ص اور سورۂ ق کے بعد ایک حرف سے شروع ہونے والی یہ تیسری اور آخری سورت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

آیات ۱ تا ۳۳

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ اِنَّ

رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۠ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝
وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ۝ مَّنَّاعٍ
لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ
اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ
الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۝ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ۝ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ
رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۝ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ۝ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۝ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ
مِّسْكِيْنٌ ۝ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ
مَحْرُوْمُوْنَ ۝ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا
ظٰلِمِيْنَ ۝ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝ عَسٰى
رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ
اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ ع

آیت ۱ ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝١﴾ ”ن، قسم ہے قلم کی اور جو کچھ یہ لکھتے ہیں۔“

یعنی قلم بھی اور جو علمی ذخیرہ قلم کے ذریعہ نوعِ انسانی کے ہاں اب تک وجود میں آیا ہے وہ بھی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ:

آیت ۲ ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝٢﴾ ”آپ اپنے رب کے فضل و کرم سے مجنون نہیں ہیں۔“

اے نبی ﷺ! جو لوگ آپ کو مجنون کہہ رہے ہیں وہ خود احمق ہیں جو یہ تک نہیں جانتے کہ مجنون کیسے ہوتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو آپ کی پاکیزہ اور اعلیٰ اخلاق کی حامل سیرت نظر نہیں آتی؟ کیا یہ لوگ واقعتاً سمجھتے ہیں کہ مجنون لوگوں کی زندگی کا نقشہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟ تو اے نبی ﷺ! آپ ان لوگوں کی فضول اور لایعنی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں۔

آیت ۳ ﴿وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝٣﴾ ”اور یقیناً آپ کے لیے تو وہ اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔“

آیت ۴ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝٤﴾ ”اور آپ یقیناً اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔“

آپ اپنے اخلاق اور کردار کے بلند ترین معیار کے باعث پہلے سے ہی معراجِ انسانیت کے مقام پر فائز تھے جبکہ اب آپ معراجِ نبوت و رسالت کے سفر کا آغاز کر رہے ہیں۔

آیت ۵ ﴿فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝٥﴾ ”تو عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔“

یہ بڑا پیارا اور ناصحانہ انداز ہے۔ جیسے کوئی بڑا کسی چھوٹے کو سمجھاتا ہے کہ آپ مخالفانہ باتوں پر آزردہ نہ ہوں' کچھ ہی دنوں کی بات ہے' اصل حقیقت بہت جلد کھل کر سامنے آ جائے گی۔ پھر کسی کو کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا:

آیت ۶ ﴿بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ۝۶﴾ ''کہ تم میں سے کون فتنے میں مبتلا تھا!''

بہت جلد دنیا پر واضح ہو جائے گا کہ تم دونوں فریقوں میں سے کون فتنے میں مبتلا ہو گیا تھا اور کون راہِ راست پر تھا۔ کیا محمد بن عبداللہ (ﷺ) کو جنون کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا (معاذ اللہ!) یا آپؐ کے مخالفین جوشِ تعصب میں پاگل ہو گئے تھے؟

آیت ۷ ﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ ''یقیناً آپؐ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون اُس کی راہ سے بھٹک گیا ہے''

﴿وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۝۷﴾ ''اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں۔''

یہ وہ آیات تھیں جو اکثر مفسرین کے نزدیک دوسری وحی میں نازل ہوئی تھیں۔ یہاں سے آگے نیا مضمون شروع ہو رہا ہے۔

آیت ۸ ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ۝۸﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان جھٹلانے والوں کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔''

آیت ۹ ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ۝۹﴾ ''وہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ ذرا ڈھیلے پڑیں تو وہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔''

باطل کا تو وطیرہ ہے کہ پہلے وہ حق کو جھٹلاتا ہے' پھر جب اس کے مقابلے میں کھڑے ہونا مشکل نظر آتا ہے تو مداہنت (compromise) پر اتر آتا ہے۔ لیکن حق کسی قسم کی مداہنت یا کسی درمیانی راستے کو نہیں جانتا۔ بقول اقبال ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے ۔۔۔ شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

اگلی آیات میں نام لیے بغیر انتہائی سخت الفاظ میں ایک کردار کا ذکر ہوا ہے۔ کسی معتبر روایت سے تو ثابت نہیں لیکن زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیات کا مصداق ولید بن مغیرہ تھا:

آیت ۱۰ ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ۝۱۰﴾ ''اور آپؐ مت مانیے کسی ایسے شخص کی بات جو بہت قسمیں کھانے والا انتہائی گھٹیا ہے۔''

ان دونوں خصوصیات کا آپس میں فطری تعلق ہے۔ اپنی شخصیت کے ہلکے پن کی تلافی کرنے کے لیے بات بات پر قسمیں کھانا ہر گھٹیا آدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لفظ ''مَهِيْن'' ذلیل وحقیر اور گھٹیا آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔

آیت ۱۱ ﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ۝۱۱﴾ ''رُو در رُو طعنے دیتا ہے' چغلیاں کھاتا پھرتا ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ⑫﴾ ''خیر سے روکنے والا' حد سے بڑھنے والا' گنہگار۔''

آیت ۱۳ ﴿عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ⑬﴾ ''بالکل گنوار ہے' اس کے بعد یہ کہ بداصل بھی ہے۔''

یعنی مذکورہ بالا خصلتیں تو اس کی شخصیت میں ہیں ہی' سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بےنسب بھی ہے۔

آیت ۱۴ ﴿اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ⑭﴾ ''صرف اس گھمنڈ پر کہ وہ مال ودولت اور بیٹوں والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ولید بن مغیرہ کو کثیر مال ودولت کے علاوہ بہت سے بیٹوں سے بھی نواز رکھا تھا۔ اور بیٹے بھی ایسے کہ ان میں سے ایک کو قبولِ اسلام کے بعد ''سَيْفٌ مِنْ سُيُوْفِ اللّٰهِ'' کا مرتبہ ملا۔ یعنی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ!

آیت ۱۵ ﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ⑮﴾ ''جب اسے ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

آیت ۱۶ ﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ⑯﴾ ''ہم عنقریب اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے۔''

ممکن ہے اس کی ناک زیادہ لمبی اور نمایاں ہو۔ وہ خود بھی از راہِ تکبر اپنے آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا تھا' جس کے لیے حقارت کے طور پر سونڈ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ناک پر داغ لگانے سے مراد تذلیل ہے۔

اب آئندہ آیات میں ایمان بالآخرت کے حوالے سے بہت عمدہ اور عام فہم تمثیل کے طور پر باغ والوں کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے۔

آیت ۱۷ ﴿اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ﴾ ''یقیناً ہم نے ان (اہل مکہ) کو اسی طرح آزمایا ہے جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا۔''

اللہ تعالیٰ لوگوں کو طرح طرح کے امتحانات سے آزماتا رہتا ہے۔ ایک انسان کو اگر دولت کی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے' تو کسی دوسرے کو غربت کے امتحان سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔ سورۃ الملک کی اس آیت میں تو انسان کی زندگی اور موت کی تخلیق کا مقصد ہی آزمائش بتایا گیا ہے: ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ②﴾ ''اس نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔ اور وہ بہت زبردست بھی ہے اور بہت بخشنے والا بھی۔''

﴿اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ⑰﴾ ''جبکہ انہوں نے قسم کھائی کہ وہ ضرور اس کا پھل اُتار لیں گے صبح سویرے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ⑱﴾ ''اور انہوں نے (اس پر) ان شاء اللہ بھی نہ کہا۔''

باغ کے پھل پک کر تیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایک رات پروگرام طے کر لیا کہ وہ صبح سویرے جائیں گے اور سارا پھل اتار لائیں گے۔ گویا وہ اپنے اسباب ووسائل کے گھمنڈ میں مسبّبِ حقیقی کو بالکل ہی بھول گئے۔

آیت ۱۹ ﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ⑲﴾ ''پس ایک پھرنے والا پھر گیا اس (باغ) پر آپ کے رب کی طرف سے جبکہ وہ ابھی سوئے ہوئے ہی تھے۔''

آیت ۲۰ ﴿فَاَصۡبَحَتۡ کَالصَّرِیۡمِ ﴿۲۰﴾﴾ ''تو وہ ایسے ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔''

یعنی رات کو وہ باغ کسی بگولے کی زد میں آیا اور جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

آیت ۲۱ ﴿فَتَنَادَوۡا مُصۡبِحِیۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اب صبح ہی صبح انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا۔''

آیت ۲۲ ﴿اَنِ اغۡدُوۡا عَلٰی حَرۡثِکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰرِمِیۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''کہ صبح سویرے چلو اپنے کھیت کی طرف اگر تم پھل توڑنا چاہتے ہو۔''

وہ صبح سویرے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق پھل توڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے' جبکہ ان کا باغ رات کو جل کر تباہ ہو چکا تھا۔ اسی طرح انسان اپنی دھن میں مگن طرح طرح کے منصوبے بناتا رہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ایک فیصلے کے سامنے اس کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو کوئی جان لیوا مرض لاحق ہو چکا ہوتا ہے' مگر وہ اس سے بے خبر اپنی لمبی لمبی امیدوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے رات دن ایک کیے رہتا ہے۔ پھر جب مرض کی تشخیص ہوتی ہے تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

آیت ۲۳ ﴿فَانۡطَلَقُوۡا وَہُمۡ یَتَخَافَتُوۡنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''چنانچہ وہ چلے اور آپس میں چپکے چپکے یہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔''

آیت ۲۴ ﴿اَنۡ لَّا یَدۡخُلَنَّہَا الۡیَوۡمَ عَلَیۡکُمۡ مِّسۡکِیۡنٌ ﴿۲۴﴾﴾ ''کہ دیکھو آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں ہرگز داخل نہ ہونے پائے۔''

دراصل انہوں نے پھل اتارنے کے لیے منہ اندھیرے جانے کا پروگرام بنایا ہی اس لیے تھا تا کہ ایسے مواقع پر آ جانے والے غرباء و مساکین کو چکمہ دے سکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ باغ پر سارا سال محنت ہم نے کی ہے' اس کی حفاظت کی ہے' اب پھل اتارنے کے موقع پر ہم اس میں سے غرباء و مساکین کو کس لیے دیں؟ وہ ہمارے کیا لگتے ہیں؟ یہ تھا ان کا اصل جرم جس کی انہیں سزا ملی۔ انسان کے کردار میں ایسی پستی آخرت پر یقین نہ ہونے کی وجہ سے آتی ہے۔

آیت ۲۵ ﴿وَّغَدَوۡا عَلٰی حَرۡدٍ قٰدِرِیۡنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''اور وہ صبح سویرے چلے جلدی جلدی (یہ سمجھتے ہوئے) کہ وہ اس ارادہ پر پوری طرح قادر ہیں۔''

یہ آیت لفظی تصویر کشی کی بہترین مثال ہے۔ اس وقت ان لوگوں کی جو ذہنی' نفسیاتی اور ظاہری کیفیت تھی ان الفاظ میں اس کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ انہیں زعم تھا کہ انہوں نے بڑی کامیاب منصوبہ بندی کی ہے' ابھی تھوڑی ہی دیر میں وہ پھل اتار کر لے جائیں گے اور بھیک منگوں کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ [حَرۡد کا معنی قصد اور ارادہ ہے۔ یعنی انہوں نے جو یہ ارادہ کیا تھا کہ آج کسی غریب کو باغ میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور صبح سویرے باغ کا پھل اتار لیں گے' وہ خیال کر رہے تھے کہ ہم اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی قدرت رکھتے ہیں۔]

آیت ٢٦ ﴿فَلَمَّا رَاَوۡهَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَضَآلُّوۡنَ﴾ ''پھر جب انہوں نے اس (باغ) کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو کہیں بھٹک گئے ہیں۔''

فوری طور پر تو وہ یہی سمجھے کہ وہ اندھیرے میں راستہ بھول کر کسی اور جگہ آ گئے ہیں اور یہ ان کا باغ نہیں ہے۔ پھر جب انہیں اصل صورت حال کا ادراک ہوا تو کہنے لگے:

آیت ٢٧ ﴿بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ﴾ ''نہیں نہیں (باغ تو یہی ہے) ہم تو محروم ہو گئے ہیں۔''

ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔

آیت ٢٨ ﴿قَالَ اَوۡسَطُهُمۡ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ لَوۡلَا تُسَبِّحُوۡنَ﴾ ''ان کے درمیان والے نے کہا: میں تمہیں کہتا نہ تھا کہ تم (اپنے رب کی) تسبیح کیوں نہیں کرتے؟''

یہ انہی کے کسی نیک فطرت بھائی کا ذکر ہے جو گاہے بگاہے انہیں روکتا ٹوکتا تھا اور انہیں یاددہانی کراتا رہتا تھا کہ تم اللہ کو بھولے ہوئے ہو اور اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے سے پہلوتہی کرتے ہو۔

آیت ٢٩ ﴿قَالُوۡا سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ﴾ ''انہوں نے کہا (واقعی تم ٹھیک کہتے ہو) ہمارا رب پاک ہے' بے شک ہم ہی ظالم تھے۔''

آیت ٣٠ ﴿فَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَلَاوَمُوۡنَ﴾ ''پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔''

اب وہ اپنی گمراہی اور شومئ قسمت کی ذمہ داری آپس میں ایک دوسرے کے سر تھوپنے لگے۔

آیت ٣١ ﴿قَالُوۡا يٰوَيۡلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيۡنَ﴾ ''(بالآخر اعتراف کرتے ہوئے) وہ کہنے لگے: ہائے ہماری بدبختی! اصل میں ہم سب ہی اپنی حدود سے تجاوز کرنے والے تھے۔''

آیت ٣٢ ﴿عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَنَا خَيۡرًا مِّنۡهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوۡنَ﴾ ''اُمید ہے ہمارا رب ہمیں اس سے بہتر عطا کر دے گا' اب ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔''

اب ہم نے توبہ کر لی ہے۔ اب ہم اپنی روش تبدیل کر لیں گے اور آئندہ باقاعدگی سے اللہ تعالیٰ کے تمام حقوق ادا کیا کریں گے۔ ہمیں اُمید ہے ہمارا رب ہمارے گناہوں کو معاف کرتے ہوئے ہمارے نقصان کی بھی تلافی کر دے گا اور اگلے سال ہمارا باغ اس سے بہتر پیداوار دے گا۔

رَغِبَ جب اِلٰی کے صلے کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی کی طرف رغبت کرنے کے ہوتے ہیں لیکن جب یہی لفظ عَنْ کے صلے کے ساتھ آئے تو بالکل متضاد معنی دیتا ہے۔ چنانچہ رَغِبَ عَنْ کے معنی ہوں گے: رُخ پھیر لینا اور پہلوتہی کرنا۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ١٣٠ میں آیا ہے: ﴿وَمَنۡ يَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ﴾ ''اور کون ہوگا جو ابراہیم کے طریقے سے منہ موڑے؟ سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو حماقت ہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو!''

اب اگلی آیت میں گویا اس تمثیل یا واقعہ کا اخلاقی سبق (moral lesson) بیان ہوا ہے:

آیت ۳۳ ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ﴾ ’’اسی طرح آتا ہے عذاب! اور آخرت کا عذاب تو یقیناً بہت ہی بڑا ہے۔‘‘

اس واقعے میں تو دنیا کے عذاب کا ذکر ہے۔ لیکن یاد رکھو دنیا کے عذاب تو نسبتاً چھوٹے اور وقتی ہوتے ہیں اور توبہ کرنے پر ٹل بھی جاتے ہیں۔ مثلاً ایک سال اگر کسی کی پکی فصل برباد ہو گئی تو اللہ کی طرف رجوع کرنے سے ہو سکتا ہے اگلے سال اس کی تلافی ہو جائے، لیکن آخرت کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ آخرت کا عذاب بہت بڑا ہوگا اور اس وقت پلٹنے کا راستہ اور توبہ کا دروازہ بھی بند ہو چکا ہوگا۔

﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ’’کاش کہ یہ لوگ (اس حقیقت کو) جانتے!‘‘

آیات ۳۴ تا ۵۲

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۣ
كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ
اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۝ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ۝
اَمْ لَهُمْ شُرَكَاۗءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَاۗىِٕهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ
وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ وَقَدْ كَانُوْا
يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ۝ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۭ
سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝ اَمْ تَسْـَٔــلُهُمْ
اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ
وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ
بِالْعَرَاۗءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝ فَاجْتَبٰىهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ
ع لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

آیت ۳۴ ﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾﴾ ’’متقین کے لیے یقیناً ان کے رب کے پاس نعمت والے باغات ہیں۔‘‘

آیت ۳۵ ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ’’کیا ہم اپنے فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟‘‘

اگر بعث بعد الموت کے منکرین کی منطق درست تسلیم کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیکوکار اور

مجرمین میں مرنے کے بعد کوئی فرق نہیں ہے۔ طبعی طور پر تو موت بلاشبہ سب کو برابر کر دیتی ہے‘ جیسا کہ مشہور انگریزی نظم Death the Leveller میں بتایا گیا ہے۔ یعنی کوئی بادشاہ ہو کوئی فقیر‘ کوئی شریف ہو کوئی مجرم ہو‘ مرنا سبھی کو ہے۔ اس اعتبار سے تو یقیناً موت کے سامنے سب انسان برابر ہیں‘ مگر یہ سمجھنا کہ موت آنے پر اخلاقی لحاظ سے بھی سب انسان برابر ہو جائیں گے انتہائی غیر منطقی اور احمقانہ سوچ ہے۔

آیت ۳۶ ﴿مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝۳۶﴾ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے‘ تم کیسے حکم لگا رہے ہو؟“

کیا تمہاری مت ماری گئی ہے جو ایسی رائے بناتے ہو؟ کیا اللہ کے ہاں ایسا ہی اندھیر مچا ہوا ہے کہ وہاں مسلمین اور مجرمین برابر ہو جائیں گے؟ کیا دنیا میں کہیں ایسا ہوتا ہے کہ کوئی حکومت اپنے باغیوں اور اپنے وفاداروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے؟

آیت ۳۷ ﴿اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝۳۷﴾ ”کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو؟“

آیت ۳۸ ﴿اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۝۳۸﴾ ”کہ اس (آخرت) میں تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جو تم پسند کرو گے!“

آیت ۳۹ ﴿اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۝۳۹﴾ ”کیا تم نے ہم سے کوئی قسم لے رکھی ہے جو باقی رہنے والی ہو قیامت کے دن تک‘ کہ تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا جو تم فیصلہ کرو گے؟“

آیت ۴۰ ﴿سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ۝۴۰﴾ ”(اے نبی ﷺ!) ذرا ان سے پوچھیے کہ ان میں سے کون ہے جو اس کا ضامن ہو؟“

آیت ۴۱ ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكَاۗءُ ۚ﴾ ”کیا ان کے کوئی شریک ہیں؟“

﴿فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَاۗىِٕهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝۴۱﴾ ”تو لائیں یہ اپنے شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں!“

آیت ۴۲ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ ”جس دن پنڈلی کھولی جائے گی“

پنڈلی کھولے جانے کا مفہوم ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ ممکن ہے یہ اللہ تعالیٰ کی کسی خاص تجلی کا ذکر ہو جس کا ظہور میدانِ محشر کے کسی مرحلے پر لوگوں کی چھانٹی کرنے کے لیے ہونا ہو۔ واللہ اعلم! اس اعتبار سے یہ آیت آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔[1]

---

(۱) عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آ پڑنے کو بھی کشفِ ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً گھمسان کی لڑائی شروع ہونے پر کہا جاتا ہے: شَمَّرَتِ الْحَرْبُ عَنْ سَاقِهَا کہ جنگ نے اپنی پنڈلی سے تہبند اوپر اٹھا لیا۔ بعض مفسرین نے کشفِ ساق سے مراد حقائق سے پردہ اٹھانا بھی لیا ہے۔ یعنی جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ (حاشیہ از مرتب)

﴿وَّیُدۡعَوۡنَ اِلَی السُّجُوۡدِ فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''اور انہیں پکارا جائے گا (اللہ کے حضور) سجدے کے لیے تو وہ کر نہیں سکیں گے۔''

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الحدید کی آیت ۱۱ کے تحت بھی ذکر ہو چکا ہے' میدانِ حشر میں اچھے اور برے لوگوں کو الگ الگ کرنے کے لیے بنی نوع انسان کو مختلف مراحل میں سے گزارا جائے گا۔ ''پنڈلی کا ظہور'' بھی ایسا ہی کوئی مرحلہ ہوگا۔ وہ صاحبِ ایمان لوگ جو اپنی دُنیوی زندگی میں نماز کی پابندی کرتے رہے تھے اس تجلی کو دیکھتے ہی سجدے میں گر جائیں گے' لیکن وہ لوگ جن کی گردنیں اکڑی رہتی تھیں اور جو نماز کی پابندی کا اہتمام نہیں کرتے تھے وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اس وقت سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ گویا اس مرحلے پر ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے والے لوگوں سے الگ کر لیا جائے گا۔

آیت ۴۳ ﴿خَاشِعَۃً اَبۡصَارُہُمۡ﴾ ''ان کی نگاہیں زمین پر گڑی رہ جائیں گی''

﴿تَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ ؕ﴾ ''ان (کے چہروں) پر ذلت چھا رہی ہوگی۔''

﴿وَ قَدۡ کَانُوۡا یُدۡعَوۡنَ اِلَی السُّجُوۡدِ وَ ہُمۡ سٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور ان کو (دنیا میں) پکارا جاتا تھا سجدے کے لیے جبکہ یہ صحیح سالم تھے۔''

دنیا میں وہ لوگ اذان کی آواز پر کبھی توجہ ہی نہیں کرتے تھے اور کوئی مجبوری و معذوری نہ ہونے کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز نہیں ہوتے تھے۔ قیامت کے دن میدانِ حشر میں وہ سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن نہیں کر سکیں گے۔

آیت ۴۴ ﴿فَذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ یُّکَذِّبُ بِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ ؕ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ چھوڑ دیجیے مجھے اور ان لوگوں کو جو اس کلام کی تکذیب کر رہے ہیں۔''

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے اس گروپ کی سورتوں میں یہ کلمہ (ذَرۡنِیۡ ' فَذَرۡنِیۡ) اور یہ اسلوب بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں ایک طرف حضور ﷺ کی دلجوئی کا پہلو ہے تو دوسری طرف آپ کے مخالفین کے لیے بہت بڑی وعید ہے' کہ اے نبی ﷺ! آپ ان لوگوں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں' ان کا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے' ان سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔

﴿سَنَسۡتَدۡرِجُہُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''ہم انہیں رفتہ رفتہ وہاں سے لے آئیں گے جہاں سے انہیں علم تک نہیں ہوگا۔''

علماء کے ہاں ''استدراج'' کا لفظ بطور اصطلاح استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد ایسا عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی ڈھیل سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے باعث کسی قوم یا کسی فرد پر درجہ بدرجہ (درجہ' تدریج اور استدراج کا مادہ ایک ہی ہے) مسلط ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے غلط راستے پر جا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کچھ دیر کے لیے ڈھیل دیتا ہے' بلکہ بعض اوقات اس راستے پر اسے طرح طرح کی کامیابیوں سے بھی نوازتا ہے تاکہ اس کے اندر کی خباثت پوری طرح سے ظاہر ہو جائے۔ جب وہ شخص اپنی روش کو کامیاب دیکھتا ہے تو سرکشی میں مزید دیدہ دلیری دکھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی مہلت کا وقت پورا ہو جاتا ہے اور پھر اچانک اسے عذاب

کے شکنجے میں کس لیا جاتا ہے۔

استدراج کی مثال کانٹے کے ذریعے مچھلی کے شکار کی سی ہے۔ شکاری جب دیکھتا ہے کہ مچھلی نے کانٹا نگل لیا ہے تو وہ ڈور کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے اور پھر جب چاہتا ہے ڈور کھینچ کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ لفظ استدراج کی وضاحت کرتے ہوئے یہاں مجھے مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا وہ قول یاد آ گیا ہے جس میں انہوں نے قیامِ پاکستان کے بارے میں کہا تھا کہ یہ استدراج بھی ہوسکتا ہے۔ مولانا صاحب رمضان ہمیشہ سلہٹ میں گزارتے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے رمضان میں انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ملاءِ اعلیٰ میں پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس کے ٹھیک ایک سال بعد اگلے رمضان (لیلۃ القدر) میں پاکستان کا قیام واقعتاً عمل میں آ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا مدنیؒ کو بذریعہ کشف قیامِ پاکستان کے بارے میں جس فیصلے کا علم ہوا تھا' ملاءِ اعلیٰ میں وہ فیصلہ ۱۹۴۶ء کی لیلۃ القدر میں اس اصول کے تحت ہوا تھا جس کا ذکر سورۃ الدخان کی آیت ۴ میں آیا ہے۔ اس آیت میں لیلۃ القدر (لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ) کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴﴾ کہ اس رات میں آئندہ سال کے دوران رونما ہونے والے اہم امور کے فیصلے کر دیے جاتے ہیں۔

مولانا صاحب نظریاتی طور پر قیامِ پاکستان کے مخالف تھے۔ ان کے اس انکشاف کے بعد ان کے عقیدت مندوں نے بجا طور پر ان سے پوچھا کہ اس فیصلے کا علم ہو جانے کے باوجود بھی آپ قیامِ پاکستان کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں؟ اس پر مولانا صاحبؒ نے جو جواب دیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی (کائنات کی سلطنت کا انتظامی) فیصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس سے کیا منظور ہے' اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہمیں چیزوں کے ظاہر اور سامنے نظر آنے والے حالات کو دیکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے سننے' سمجھنے وغیرہ کی صلاحیتیں اسی لیے دی ہیں کہ وہ ان صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے فیصلے کرے۔ چنانچہ اس معاملے میں ہمیں وہی موقف اپنانا چاہیے جس میں ہمیں مسلمانانِ برصغیر کی بہتری نظر آتی ہو۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق کیا ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ ''استدراج'' کی غرض سے کیا گیا ہو۔ یعنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خطے کے مسلمانوں کو ڈھیل دے کر انہیں عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہو۔

قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مدنیؒ کا خدشہ کافی حد تک درست تھا۔ اہلِ پاکستان پر عذاب کا ایک کوڑا تو ۱۹۷۱ء میں برسا تھا۔ اس کے بعد بھی ملک کی مجموعی صورت حال کبھی تسلی بخش نہیں رہی' بلکہ پاکستان کے موجودہ حالات کو دیکھ کر تو یوں لگتا ہے کہ اب ایک فیصلہ کن عذاب ہمارے سر پر آیا کھڑا ہے۔ لیکن میری رائے میں اس کا سبب ''قیامِ پاکستان نہیں'' بلکہ بحیثیت قوم ہمارا وہ مجموعی طرزِ عمل ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے نظامِ اسلام کے حوالے سے اختیار کیا ہے۔

آیت ۴۵ ﴿وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ﴾ ''اور میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں۔''

﴿اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝۴۵﴾ ''بے شک میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔''

آیت ۴۶ ﴿اَمْ تَسْـَٔــلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝۴۶﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کیا آپ ان سے

کوئی اجرت مانگتے ہیں جس کے تاوان کے بوجھ تلے یہ دبے جا رہے ہیں؟''

ان لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے آپؐ سالہا سال سے دن رات محنت کر رہے ہیں۔ اپنی اس محنت کے عوض جب آپؐ ان سے کسی معاوضے یا اجرت کے طلب گار بھی نہیں ہیں تو یہ لوگ آخر کس لیے پریشان ہیں؟

آیت ۴۷ ﴿اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝۴۷﴾ ''یا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہیں؟''

یہ دونوں آیات (۴۶، ۴۷) جوں کی توں سورۃ الطور میں (آیات ۴۰ اور ۴۱ کے طور پر) بھی آ چکی ہیں۔

آیت ۴۸ ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا''

﴿وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ﴾ ''اور دیکھئے' آپؐ اُس مچھلی والے کی طرح نہ ہو جایئے گا!''

''مچھلی والے'' سے یہاں حضرت یونس علیہ السلام مراد ہیں۔ آپؑ کی قوم پر جب عذاب کا فیصلہ ہو گیا تو آپؑ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی اپنی قوم کا علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کا ذکر سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں اس طرح آیا ہے: ﴿اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا﴾ ''جب وہ چل دیا غصے میں بھرا ہوا''۔ آپؑ کا یہ غصہ حمیت حق میں تھا اور قوم کی طرف سے مسلسل ہٹ دھرمی اور کفر کی وجہ سے تھا۔ لیکن اس میں خطا کا پہلو یہ تھا کہ آپؑ نے ہجرت کرنے سے متعلق اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار نہ کیا۔

﴿اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝۴۸﴾ ''جب اُس نے پکارا (اپنے رب کو) اور وہ اپنے غم کو اندر ہی اندر پی رہا تھا۔''

حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں انتہائی رنجیدہ حالت میں اللہ سے فریاد کر رہے تھے: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۷﴾ (الانبیاء) ''تیرے سوا کوئی معبود نہیں' تو پاک ہے اور یقیناً میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔''

آیت ۴۹ ﴿لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝۴۹﴾ ''اگر اُس کی دست گیری نہ کرتا اُس کے رب کا ایک انعام (اور احسان) تو وہ ملامت زدہ ہو کر پھینک دیا جاتا کسی چٹیل زمین پر۔''

حضرت یونس علیہ السلام قدیم عراق کے شہر نینوا میں مبعوث ہوئے تھے۔ یہ شہر بعلبک کے شمال میں واقع تھا۔ دریائے فرات اور دریائے دجلہ اس علاقہ سے گزرتے ہوئے خلیج فارس میں آ کر گرتے ہیں۔ آج کل تو یہ دونوں دریا سکڑ کر چھوٹی چھوٹی ندیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں' لیکن پرانے زمانے میں تو ظاہر ہے یہ بہت بڑے بڑے دریا ہوں گے۔ حضرت یونس علیہ السلام نینوا شہر سے نکل کر ان میں سے کسی دریا کو پار کرنے کے لیے کشتی میں سوار ہوئے۔ کشتی میں آپؑ کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اشارتاً سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت ۱۴۱ میں آیا ہے۔ اس کے نتیجے میں آپؑ کو کسی وہیل مچھلی نے نگل لیا۔ وہ مچھلی خلیج فارس سے ہوتی ہوئی مکران کے ساحل پر پہنچی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ساحل کے کسی مقام پر اس نے آپؑ کو اُگل دیا۔ اس وقت آپؑ کی حالت بہت خراب تھی۔ اس موقع پر آپؑ کو سایہ اور غذا وغیرہ فراہم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے 'یقطین' کا وہ پودا اگایا جس کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت' آیت ۱۴۶ میں آیا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اسی پودے کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت آپؑ کے

لیے واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ یَقْطِین کے بارے میں مزید تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الصّٰفّٰت' آیت ۱۴۶ کی تشریح۔

آیت ۵۰ ﴿فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝۵۰﴾ ''تو اُس کے ربّ نے اُس کو چن لیا اور اسے پھر صالحین میں سے کر دیا۔''

حضرت یونس علیہ السلام کے ذکر کے حوالے سے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان بھی سن لیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ((لَا تُفَضِّلُوْنِيْ عَلٰى يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى))(۱) ''کہ مجھے یونس ابن متیٰ پر بھی فضیلت نہ دو''۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہہ ہے جو اپنا جوشِ خطابت اور زورِ قلم دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ پوری نوعِ انسانی سے افضل اور سید الانبیاء والمرسلین ہیں۔ لیکن ع ''حاجت مشاطہ نیست صورتِ دل آرام را''۔ آج پوری دنیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی قائل ہے۔ اس حقیقت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آج ایک عیسائی دانشور مائیکل ہارٹ اپنی کتاب ''The 100'' میں یہ لکھنے پر مجبور ہے:

> *"My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."*
>
> ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دنیا کی با اثر ترین شخصیات میں سرفہرست رکھنے کے میرے اس فیصلے پر کچھ قارئین کو حیرت ہوگی اور بعض اس پر سوال بھی اٹھائیں گے لیکن پوری انسانی تاریخ میں صرف اور صرف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی واحد شخص ہیں جو مذہبی اور سیکولر دونوں محاذوں پر پوری طرح کامیاب رہے۔''

آیت ۵۱ ﴿وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ﴾ ''اور یہ کافر تو تُلے ہوئے ہیں اس پر کہ اپنی نگاہوں کے زور سے آپ کو پھسلا دیں گے جب وہ قرآن سنتے ہیں''

مشرکینِ مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ ارادی کو توڑنے کے لیے ہر ممکن طریقہ آزمایا اور اس مقصد کے لیے آپؐ کے خلاف ہر حربہ استعمال کیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک مرحلے پر انہوں نے اس مقصد کے لیے ایسے عاملوں کی خدمات بھی حاصل کیں جو اپنی نگاہوں کی خصوصی طاقت کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ شاید طبعی طور پر ایسا ممکن ہو۔ ہوسکتا ہے کوئی شخص خصوصی مشقوں (exercises) کے ذریعے اپنی آنکھوں میں اپنی قوتِ ارادی کو اس انداز میں مجتمع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہو کہ اس کے بعد جب وہ کسی دوسرے شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے تو وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکے۔ بہرحال اس آیت میں مشرکینِ مکہ کے ایسے ہی اوچھے ہتھکنڈوں کا ذکر ہے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ۝۵۱﴾ ''اور کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے۔''

سورت کے آغاز اور اختتام کا باہمی ربط نوٹ کیجیے۔ جس مضمون سے سورت کا آغاز ہوا تھا اسی پر اس کا

---

(۱) تخریج الکشاف للزیلعی: ۲۶۴/۱ (غریب جدا)

اختتام ہو رہا ہے۔ کفار حضور ﷺ کو مجنون کہتے تھے۔ ان کے اس الزام کی تردید سورت کے ابتدا میں بھی کی گئی اور آخر میں بھی۔ پھر یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اس سورت کے آغاز میں حرف نٓ کیوں آیا ہے۔ دراصل ن کے معنی ''مچھلی'' کے ہیں' جیسا کہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ذُوالنُّون (مچھلی والے) کے لقب سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ حرف ن کا معنوی ربط سورت کی ان اختتامی آیات کے ساتھ ہے جن میں صَاحِبِ الْحُوت (حضرت یونسؑ) کا ذکر آیا ہے۔

آیت ۵۲ ﴿وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ''اور نہیں ہے وہ' مگر ایک یاد دہانی تمام جہان والوں کے لیے۔''

یہاں پر هُوَ کی ضمیر قرآن کے لیے بھی ہے اور حضور ﷺ کے لیے بھی۔ قرآن مجید کے ذکر (یاددہانی اور نصیحت) ہونے کا تذکرہ تو قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے' جبکہ اپنی ذات میں حضور ﷺ بھی قیامت تک کے لوگوں کے لیے یاد دہانی ہیں' بلکہ آپ ﷺ اپنی ذات میں مجسم قرآن ہیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے: ((كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ)) ''آپ ﷺ کا اخلاق قرآن ہی تو تھا۔''

[بعض مترجمین نے یہاں ''ذِکر'' کا ترجمہ ''شرف'' بھی کیا ہے۔ یعنی آپ ﷺ سارے جہانوں کے لیے وجہ عزّ وشرف ہیں۔ (مرتب)]

سُوْرَةُ الْحَآقَّةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

آیات ۱ تا ۳۷

الْحَآقَّةُ ۝١ مَا الْحَآقَّةُ ۝٢ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝٣ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝٤ فَاَمَّا
ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝٥ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝٦ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ
سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ
خَاوِيَةٍ ۝٧ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝٨ وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ
بِالْخَاطِئَةِ ۝٩ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝١٠ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ
حَمَلْنٰكُمْ فِى الْجَارِيَةِ ۝١١ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝١٢ فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ
نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝١٣ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝١٤ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ
الْوَاقِعَةُ ۝١٥ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِىَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۝١٦ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ
عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝١٧ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝١٨ فَاَمَّا
مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۝١٩ اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ
حِسَابِيَهْ ۝٢٠ فَهُوَ فِىْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝٢١ فِىْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝٢٢ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ۝٢٣ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا
هَنِيْٓـئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝٢٤ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ
لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۝٢٥ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝٢٦ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝٢٧ مَآ اَغْنٰى عَنِّىْ مَا
لِيَهْ ۝٢٨ هَلَكَ عَنِّىْ سُلْطٰنِيَهْ ۝٢٩ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝٣٠ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝٣١ ثُمَّ فِىْ سِلْسِلَةٍ
ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝٣٢ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝٣٣ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى
طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣٤ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝٣٥ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝٣٦ لَّا
يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ۝٣٧ ع ٥

آیت ۱ ﴿الْحَآقَّةُ ۝١﴾ ”وہ حق ہو جانے والی!“

یعنی قیامت جس کا وقوع پذیر ہونا حق ہے‘ اس کا واقع ہونا ایک مسلّمہ صداقت اور اٹل حقیقت ہے جس میں

قطعاً کوئی شک نہیں۔

آیت ۲ ﴿مَا الْحَآقَّةُ ۝﴾ ''کیا ہے وہ حق ہو جانے والی؟''

آیت ۳ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝﴾ ''اور تم نے کیا سمجھا کہ وہ حق ہونے والی کیا ہے؟''

آیت ۴ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝﴾ ''جھٹلایا تھا ثمود نے بھی اور عاد نے بھی اس کھڑکھڑا دینے والی کو۔''

القارعة سے مراد بھی قیامت ہے۔ قَرَعَ کا معنی ہے ایک سخت چیز کو دوسری چیز سے ٹکرانا' کوٹنا' ریزہ ریزہ کر دینا' کھڑکھڑا دینا' یا بہت زور سے کھٹکھٹانا۔ الحاقّة اور القارعة ان دونوں الفاظ کے مابین ایک نسبت یہ بھی ہے کہ یہ دو سورتوں کے نام ہیں اور ان دونوں سورتوں کے آغاز کا انداز بھی ایک جیسا ہے۔ چنانچہ سورۃ القارعة کا آغاز بھی بالکل اسی طرح ہو رہا ہے: ﴿اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝﴾

آیت ۵ ﴿فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝﴾ ''پس ثمود تو ہلاک کر دیے گئے ایک حد سے بڑھ جانے والی آفت سے۔''

الطاغية کے لغوی معنی حد سے گزر جانے والی چیز کے ہیں۔ یعنی انتہائی شدت والی چیز۔ اس کے لیے قرآن حکیم کے مختلف مقامات پر الرَّجفة (زبردست زلزلہ) 'الصَّیحة (زور کا دھماکہ یا کڑک)' صَاعِقَة (گرج) الفاظ مذکور ہیں' جو عذاب کی مختلف کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔

آیت ۶ ﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝﴾ ''اور عاد ہلاک کر دیے گئے ایک جھکڑ والی تیز آندھی سے۔''

آیت ۷ ﴿سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝﴾ ''اللہ نے مسلط کر دیا اسے اُن پر مسلسل سات راتوں اور آٹھ دنوں تک' ان کی بیخ کنی کے لیے' تو تم دیکھتے ان لوگوں کو کہ وہاں ایسے پچھڑے پڑے ہیں جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔''

قوم عاد کے لوگ بہت قد آور تھے' اس لیے انہیں کھجور کے تنوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

آیت ۸ ﴿فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝﴾ ''تو کیا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو باقی بچا ہوا؟''

آیت ۹ ﴿وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝﴾ ''اور (اسی طرح) فرعون اور اس سے پہلے والوں نے' اور الٹ دی جانے والی بستیوں (کے باسیوں) نے بھی خطا کاری کی روش اختیار کی تھی۔''

الٹائی جانے والی بستیوں سے مراد قوم لوط کی بستیاں ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ﴾ ''تو انہوں نے نافرمانی کی اپنے رب کے رسولوں کی''

﴿فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝﴾ ''تو اللہ نے ان کو اپنی سخت گرفت میں دبوچ لیا۔''

آیت ۱۱ ﴿اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾﴾ ''جب (سیلابِ نوحؑ کا) پانی طغیانی پر آیا تھا تو ہم نے تمہیں سوار کرا لیا تھا کشتی پر۔''

اُس سیلاب کے بعد نوعِ انسانی کی نسل حضرت نوح علیہ السلام کے انہی تین بیٹوں سے چلی جو اس کشتی میں سوار تھے' اس لیے آیت کے اسلوب سے یہ تاثر ملتا ہے جیسے پوری نوعِ انسانی کشتی میں سوار تھی۔

آیت ۱۲ ﴿لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾﴾ ''تاکہ ہم اس کو تمہارے لیے ایک یاددہانی بنادیں اور وہ کان جو حفاظت کرنے والے ہیں اس کو پوری حفاظت سے یاد رکھیں۔''

ان آیات میں ''التَّذْكِير بِاَيَّامِ الله'' کا بیان تھا۔ اس کے بعد اب آخرت کا ذکر آ رہا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ بھی اَيَّام الله ہی کے تذکرے کا حصہ ہے' کیونکہ وقت کی ڈور میں ایک طرف اگر گزشتہ اقوام کے عبرت ناک واقعات پروئے ہوئے ہیں تو اسی ڈور کا دوسرا سرا آخرت ہے۔

آیت ۱۳ ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾﴾ ''تو جب صور میں پھونکا جائے گا یکبارگی۔''

یعنی اُس وقت کو یاد رکھو جب ایک ہی بار صور میں پھونک ماردی جائے گی۔

آیت ۱۴ ﴿وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾﴾ ''اور جب زمین اور پہاڑوں کو اُٹھا کر ایک ہی بار میں پاش پاش کر دیا جائے گا۔''

آیت ۱۵ ﴿فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾﴾ ''تو اُس روز وہ واقعہ رونما ہو جائے گا۔''

آیت ۱۶ ﴿وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ﴾ ''اور آسمان پھٹ جائے گا''

﴿فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾﴾ ''تو وہ اُس دن بہت بودا سا ہو جائے گا۔''

آیت ۱۷ ﴿وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ؕ﴾ ''اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر۔''

﴿وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور اُس دن تیرے رب کے عرش کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے آٹھ فرشتے۔''

آیت ۱۸ ﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ﴾ ''اُس دن تمہاری پیشی ہوگی''

﴿لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾﴾ ''تمہاری کوئی مخفی سے مخفی بات بھی چھپی نہیں رہے گی۔''

آیت ۱۹ ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ﴾ ''تو وہ شخص جس کو اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا اس کے داہنے ہاتھ میں''

﴿فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾﴾ ''تو وہ کہے گا: آؤ آؤ! دیکھو میرا اعمال نامہ!''

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! آمین!

آیت ۲۰ ﴿اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾﴾ ''(وہ کہے گا:) مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنے حساب سے

دوچار ہونا ہے۔"
مجھے یقین تھا کہ مجھے میرے اعمال کا بدلہ ضرور ملے گا۔
آیت ۲۱ ﴿فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴿٢١﴾﴾ "پس وہ پسندیدہ زندگی بسر کرے گا۔"
وہ خوش نصیب دل پسند عیش میں ہوگا۔ اسے ایسی زندگی عطا کی جائے گی جس میں ہر طرح کی رضا ہی رضا ہوگی۔
آیت ۲۲ ﴿فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ﴿٢٢﴾﴾ "بڑے ہی بلند باغ میں۔"
آیت ۲۳ ﴿قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿٢٣﴾﴾ "اس کے خوشے جھکے ہوئے ہوں گے۔"
آیت ۲۴ ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا ۢبِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴿٢٤﴾﴾ "(کہہ دیا جائے گا) کھاؤ اور پیو رچتا پچتا ان اعمال کے صلے میں جو تم نے گزرے دنوں میں کیے۔"
آیت ۲۵ ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ﴾ "اور جس شخص کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا"
﴿فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ﴿٢٥﴾﴾ "وہ کہے گا: اے کاش! مجھے میرا اعمال نامہ دیا ہی نہ گیا ہوتا۔"
ع "مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے" کاش! میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا!
آیت ۲۶ ﴿وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿٢٦﴾﴾ "اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے!"
آیت ۲۷ ﴿يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ﴿٢٧﴾﴾ "اے کاش کہ وہی موت قصہ پاک کر دینے والی ہوتی!"
کاش کہ وہی موت جو مجھے دنیا میں آئی تھی فیصلہ کن ہوتی' اُس موت کے بعد میں معدوم ہو گیا ہوتا اور میرے دوبارہ زندہ ہونے کی نوبت نہ آتی۔
آیت ۲۸ ﴿مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ﴿٢٨﴾﴾ "میرا مال و اسباب کچھ بھی میرے کام نہ آیا۔"
آیت ۲۹ ﴿هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ﴿٢٩﴾﴾ "میرا اقتدار بھی مجھ سے چھن گیا۔"
میرے دُنیوی اختیار و اقتدار اور میری شان و شوکت میں سے کچھ بھی باقی نہ بچا' سب کچھ نیست و نابود ہو گیا۔ ایسے شخص کے لیے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا:
آیت ۳۰ ﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ﴿٣٠﴾﴾ "پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو!"
آیت ۳۱ ﴿ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ﴿٣١﴾﴾ "پھر اسے جہنم کے اندر جھونک دو!"
آیت ۳۲ ﴿ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ﴿٣٢﴾﴾ "پھر ایک زنجیر میں اس کو باندھ دو جس کا طول ستر گز ہے۔"
آیت ۳۳ ﴿اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ﴿٣٣﴾﴾ "یہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا جو عظمت والا ہے۔"

آیت ۳۴ ﴿وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ﴿۳۴﴾﴾ ''اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔''
اسے خود تو کسی مسکین کو کھانا کھلانے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی' کسی دوسرے شخص کو بھی اس نے بھلائی کے اس کام کی کبھی ترغیب نہیں دی۔

آیت ۳۵ ﴿فَلَیْسَ لَہُ الْیَوْمَ ھٰھُنَا حَمِیْمٌ ﴿۳۵﴾﴾ ''تو اس کے لیے یہاں کوئی گرم جوش دوست نہیں ہے۔''

آیت ۳۶ ﴿وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ ﴿۳۶﴾﴾ ''اور نہ ہی کچھ کھانے کو ہے سوائے زخموں کے دھوون کے۔''

آیت ۳۷ ﴿لَّا یَاْکُلُہٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''نہیں کھائیں گے اس کو مگر وہی جو خطا کار تھے۔''

آیات ۳۸ تا ۵۲

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا ھُوَ بِقَوْلِ
شَاعِرٍ ؕ قَلِیْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ کَاھِنٍ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْہُ بِالْیَمِیْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا
مِنْہُ الْوَتِیْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْکُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْہُ حٰجِزِیْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِنَّہٗ لَتَذْکِرَۃٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ
اَنَّ مِنْکُمْ مُّکَذِّبِیْنَ ﴿۴۹﴾ وَاِنَّہٗ لَحَسْرَۃٌ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنَّہٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ
رَبِّکَ الْعَظِیْمِ ﴿۵۲﴾ ع ۱۵

سورۃ الحاقۃ کے دوسرے رکوع کی سورۃ الواقعہ کے آخری رکوع سے گہری مشابہت ہے۔ چنانچہ اگلی آیات کو پڑھتے ہوئے سورۃ الواقعہ کی ان آیات کو بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ﴿۷۷﴾﴾ ''تو نہیں! قسم ہے مجھے ان مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔ اور یقیناً یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! یقیناً یہ بہت عزت والا قرآن ہے۔''

آیت ۳۸ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''تو میں قسم کھاتا ہوں اُس کی جو تم دیکھتے ہو۔''

آیت ۳۹ ﴿وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور اُس کی بھی جو تم نہیں دیکھتے ہو۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ﴿۴۰﴾﴾ ''یہ قول ہے ایک رسولِ کریم کا۔''
اصل میں تو یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے حضرت جبرائیلؑ نے سنا۔ پھر حضرت جبرائیل سے حضرت محمد ﷺ نے سنا اور اب وہ لوگوں کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ ایک لحاظ سے یہ جبرائیلؑ کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے حضور ﷺ کا قول۔

آیت ۴۱ ﴿وَّمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ﴾ ''اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔''

﴿قَلِیْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾﴾ ''کم ہی ہے جو تم یقین کرتے ہو۔''

آیت ۴۲ ﴿وَلَا بِقَوْلِ کَاهِنٍ ؕ﴾ ''اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا کلام ہے۔''

﴿قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''کم ہی ہے جو تم غور کرتے ہو۔''

آیت ۴۳ ﴿تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''اس کا اتارا جانا ہے تمام جہانوں کے رب کی طرف سے۔''

یہ آیت جوں کی توں سورۃ الواقعہ (آیت ۸۰) میں بھی ہے۔

آیت ۴۴ ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور اگر یہ (نبی ﷺ) خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کرتا۔''

تَقَوَّلَ باب تفعل ہے' اس باب میں تکلف کے معنی پائے جاتے ہیں' یعنی ارادے' محنت اور کوشش سے کوئی بات کہنا۔

آیت ۴۵ ﴿لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ﴿۴۵﴾﴾ ''تو ہم پکڑتے اس کو داہنے ہاتھ سے۔''

اس فقرے کے مفہوم میں دو امکانات ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اپنے دائیں ہاتھ سے اسے پکڑتے' یا یہ کہ ہم اسے اس کے داہنے ہاتھ سے پکڑتے۔

آیت ۴۶ ﴿ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''پھر اس کی گردن کاٹ ڈالتے۔''

اس اسلوب اور لہجے میں جو سختی ہے یہ دراصل ان لوگوں کے لیے ہے جو قرآن کو کلام اللہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اور کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) خود اپنی طرف سے باتیں بنا کر اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ بدبختو! تم ہمارے رسول کریم ﷺ کے مرتبے کو کیا سمجھو! کسی رسول کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ اپنے رب کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی ملاوٹ کرے۔ وہ تم لوگوں تک ٹھیک وہی کچھ پہنچا رہے ہیں جو ہمارا کلام ہے۔ بفرضِ محال اگر وہ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیں تو یہ کوئی معمولی سا جرم نہیں ہے جس کا نوٹس نہ لیا جائے۔

آیت ۴۷ ﴿فَمَا مِنْکُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔''

آیت ۴۸ ﴿وَاِنَّهٗ لَتَذْکِرَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور یقیناً یہ تو ایک یاد دہانی ہے متقین کے لیے۔''

یہ کلام ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور نیکی و بدی میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

آیت ۴۹ ﴿وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْکُمْ مُّکَذِّبِیْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ تم میں کچھ لوگ جھٹلانے والے بھی ہیں۔''

وہ ہمارے کلام کو جھٹلانے پر کمربستہ ہو چکے ہیں کہ جو چاہے ہو وہ اسے اللہ کا کلام نہیں مانیں گے۔

آیت ۵۰ ﴿وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝۵۰﴾ ''اور یقیناً یہ کافروں کے لیے حسرت کا باعث بن جائے گا۔''

ایک وقت آئے گا جب قرآن ان جھٹلانے والوں کے لیے حسرت اور پچھتاوے کا سبب بن جائے گا۔ حضورﷺ کا فرمان ہے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ))(1)۔ کہ یہ قرآن حجت ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف۔ اگر تو تم اس کے حقوق ادا کرو گے' اس پر ایمان لاؤ گے' اسے اپنا امام بنا کر اس کے پیچھے چلو گے اور اس کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرو گے تو یہ قیامت کے دن تمہاری شفاعت کرے گا اور اگر تم اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرو گے تو قیامت کے دن یہ تمہارے خلاف گواہ بن کر کھڑا ہو گا۔

آیت ۵۱ ﴿وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ۝۵۱﴾ ''اور یقیناً یہ (قرآن) بالکل یقینی حق ہے۔''

یہ ایسا یقین ہے جو سراسر حق ہے' جس میں باطل کی ذرا ملاوٹ تک نہیں۔

آیت ۵۲ ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ۝۵۲﴾ ''پس آپ تسبیح کیجیے اپنے رب کے نام کی جو کہ بہت عظمت والا ہے۔''

نوٹ کیجیے' سورۃ الواقعہ کا اختتام بھی اسی آیت پر ہوتا ہے۔

---

(1) صحیح مسلم' کتاب الطھارۃ' باب فضل الوضوء۔ وسنن الترمذی' ابواب الدعوات' باب منہ۔

سُوْرَةُ الْمَعَارِج

سورۃ المعارج تین سورتوں پر مشتمل دوسرے ضمنی گروپ کی پہلی سورت ہے۔ اس گروپ میں پہلی دو سورتیں یعنی سورۃ المعارج اور سورۂ نوح جوڑے کی شکل میں ہیں‘ جبکہ تیسری سورت (سورۃ الجن) منفرد ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

آیات ۱ تا ۳۵

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝١ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۝٢ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۝٣ تَعْرُجُ
الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝٤ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝٥
اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝٦ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝٧ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝٨ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ
كَالْعِهْنِ ۝٩ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝١٠ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ
يَوْمِىِٕذٍۢ بِبَنِيْهِ ۝١١ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝١٢ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝١٣ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ
ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝١٤ كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝١٥ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝١٦ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝١٧ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝١٨
اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝١٩ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝٢٠ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝٢١ اِلَّا
الْمُصَلِّيْنَ ۝٢٢ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝٢٣ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝٢٤
لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝٢٥ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝٢٦ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ
رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝٢٧ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝٢٨ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝٢٩
اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝٣٠ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاۗءَ ذٰلِكَ
فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝٣١ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝٣٢ وَالَّذِيْنَ هُمْ
بِشَهٰدٰتِهِمْ قَاۗىِٕمُوْنَ ۝٣٣ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝٣٤ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ جَنّٰتٍ
مُّكْرَمُوْنَ ۝٣٥ ع

آیت ۱، ۲ ﴿سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝١ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۝٢﴾ ”مانگا ایک مانگنے والے نے ایک ایسا عذاب جو واقع ہونے والا ہو‘ کافروں کے لیے‘ جس کو کوئی ٹال نہ سکے گا۔“

یہاں سَاَلَ سَآئِلٌ سے کون مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ میری رائے بہت پہلے سے یہ تھی کہ یہ عذاب طلب کرنے والے خود حضور ﷺ ہیں' لیکن مجھے اپنی رائے پر اطمینان اس وقت ہوا جب مجھے معلوم ہوا کہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ عام مفسرین میں سے بہت کم لوگ شاہ صاحبؒ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ اس آیت میں حضور ﷺ کی خواہش یا دعا کا ذکر ہے۔

اس آیت کو سمجھنے کے لیے دراصل اس دور کا نقشہ ذہن میں لانا ضروری ہے جب حضور ﷺ پر ہر طرف سے طرح طرح کے الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور مکے کی گلیوں میں آپ کو شاعر' مجنون' ساحر اور کذاب جیسے ناموں سے پکارا جا رہا تھا (معاذ اللہ)۔ اعلانِ نبوت کے بعد تین سال تک تو یوں سمجھئے کہ پورے شہر کی مخالفت کا نشانہ صرف حضور ﷺ کی ذات تھی۔ مشرکین کا خیال تھا کہ اگر وہ آپ کی قوتِ ارادی اور ہمت توڑنے یا کسی بھی طریقے سے آپ کو آپ کے موقف سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ تحریک خود بخود ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اس دور میں عام اہل ایمان کو نظر انداز کر کے صرف آپ ﷺ کی ذات کو نشانے پر رکھا گیا تھا۔ اس دوران اگرچہ آپ کو کوئی جسمانی اذیت تو نہ پہنچائی گئی لیکن باقاعدہ ایک منظم مہم کے تحت آپ ﷺ کے خلاف ذہنی' نفسیاتی اور جذباتی تشدد کی انتہا کر دی گئی۔ ان لوگوں کی اس مذموم مہم کی وجہ سے حضور ﷺ مسلسل ایک کرب اور تکلیف کی کیفیت میں تھے۔ اس کا اندازہ ان الفاظ اور جملوں سے بھی ہوتا ہے جو اس دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں آپ کی تسلی کے لیے جگہ جگہ آئے ہیں۔

بہرحال حضور ﷺ بھی تو آخر انسان تھے۔ مسلسل شدید ذہنی اذیت کا سامنا کرتے ہوئے ردِّعمل کے طور پر آپ کے دل میں ایسی خواہش کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا کہ اب ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جانا چاہیے۔ چنانچہ ان آیات میں آپ ﷺ کی اسی خواہش یا دعا کا ذکر ہے۔ اس حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی مدنظر رہے کہ اس سورت کا سورۂ نوح کے ساتھ جوڑے کا تعلق ہے اور سورۂ نوح میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر ہے جس میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لیے سخت عذاب مانگا تھا۔ گویا ان دونوں سورتوں کے اس مضمون کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق میں یہ مناسبت بھی بہت اہم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول اور حضور ﷺ آخری رسول ہیں۔ (۱)

---

(۱) اس مقام پر جمہور مفسرین کی رائے حضرت شاہ صاحب اور محترم ڈاکٹر صاحب رحمہما اللہ کی رائے سے مختلف ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں ''سَاَلَ'' کو دریافت کرنا کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب جس کی ہمیں خبر دی جا رہی ہے' کن لوگوں پر نازل ہوگا؟ تو اس سوال کا جواب دیا گیا کہ وہ کفار پر نازل ہوگا اور جب نازل ہوگا تو کوئی اس کو ٹال نہیں سکے گا۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ ''سَاَلَ'' کو مانگنے اور طلب کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک ان الفاظ میں نضر بن حارث کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو سورۃ الانفال میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾﴾ ''اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری ہی طرف سے برحق ہے تو برسا دے ہم پر پتھر آسمان سے یا بھیج دے ہم پر کوئی دردناک عذاب۔''

آیت ۳ ﴿مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾﴾ ''(وہ عذاب اپنے وقت پر آئے گا) اُس اللہ کی طرف سے جو بہت بلند درجات والا ہے۔''

آیت ۴ ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾﴾ ''چڑھتے ہیں فرشتے اور روح اس کی جانب ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔''

یہ آیت ہمارے لیے آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کے ''ذِی الْمَعَارِجِ'' ہونے کی وضاحت ہے کہ اس کی بارگاہِ بلند تک پہنچنے کے لیے فرشتوں اور جبریلؑ کو بھی پچاس ہزار سال کی مسافت کے برابر فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ پچاس ہزار برس کے دن سے یہاں قیامت کا دن مراد ہے جو کفار کے لیے تو بہت طویل اور سخت ہوگا' البتہ اہل ایمان کو وہ دن ایسے محسوس ہوگا جیسے انہوں نے دن کا کچھ حصہ یا ایک فرض نماز ادا کرنے کے برابر وقت گزارا ہو۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے بارے میں پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ اِنَّهٗ لَیُخَفَّفُ عَلَی الْمُؤْمِنِ حَتّٰی یَكُوْنَ اَهْوَنَ عَلَیْهِ مِنْ صَلَاةٍ مَكْتُوْبَةٍ یُصَلِّیْهَا فِی الدُّنْیَا)) ''اُس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے! یہ دن مؤمن کے لیے بہت مختصر کر دیا جائے گا' یہاں تک کہ جتنے وقت میں وہ دنیا میں ایک فرض نماز ادا کرتا ہے اس سے بھی اسے مختصر معلوم ہوگا۔''

آیت ۵ ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا ﴿۵﴾﴾ ''تو آپؐ بڑی خوبصورتی سے صبر کیجیے۔''

یہ ہے وہ اصل پیغام جو ان آیات کے ذریعے حضور ﷺ کو دینا مقصود تھا' کہ ابھی تو سفر کا آغاز ہوا ہے' آنے والا وقت اور بھی کٹھن ہوگا۔ لہٰذا آپؐ اپنے راستے میں آنے والی ہر مشکل کا صبر اور استقامت کے ساتھ سامنا کریں۔ اس سے پہلے سورۃ القلم میں بھی آپؐ کو ایسی ہی ہدایت کی گئی ہے: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ (آیت ۴۸) ''تو آپؐ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا' اور دیکھئے! آپؐ اُس مچھلی والے کی طرح نہ ہو جایئے گا!''

آیت ۶' ۷ ﴿اِنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ قَرِیْبًا ﴿۷﴾﴾ ''یہ لوگ تو اس (عذاب) کو دور سمجھ رہے ہیں' اور ہم اسے نہایت قریب دیکھ رہے ہیں۔''

ظاہر ہے انسان تو صرف اپنے سامنے کی چیز کو ہی دیکھ سکتا ہے' مستقبل میں جھانکنا تو اس کے بس میں نہیں ہے۔ اسی لیے مستقبل کی چیزیں یا خبریں اسے عام طور پر دور محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے تو

◀ مزید برآں قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر کفارِ مکہ کے اس چیلنج کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس عذاب سے آپ ہمیں ڈراتے رہتے ہیں وہ لے کیوں نہیں آتے! اس مطالبے کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ عذاب کفار کے لیے تیار ہے' وہ ضرور انہیں چکھایا جائے گا' لیکن اپنے وقت پر۔ اور جب وہ مقررہ گھڑی آ جائے گی تو دنیا کی کوئی طاقت اس عذاب کو ٹال نہیں سکے گی۔ (حاشیہ از مرتب)

مستقبل وغیرہ کچھ نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اس سے غائب ہے۔ وہ تو ہر چیز کو بیک وقت اپنے سامنے دیکھ رہا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایک شخص صرف اسی شہر یا مقام کو دیکھ سکتا ہے جو اس کے سامنے ہے جبکہ اس سے اگلا شہر مستقبل میں ہونے کی وجہ سے اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو شخص ہوائی جہاز پر سفر کر رہا ہے وہ ان دونوں شہروں کو بیک وقت اپنے سامنے دیکھ سکتا ہے۔ بقول آئن سٹائن every thing is relative کہ دنیا کی ہر چیز کسی دوسری چیز سے متعلق و مشروط ہے۔ چنانچہ کسی بھی چیز یا صورت حال کو صرف ایک ہی زاویے سے دیکھ کر کوئی رائے قائم نہیں کر لینی چاہیے۔ دنیا میں ہمارے اعتبار سے بھی قریب اور بعید relative ہیں' جبکہ اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی شے بھی بعید نہیں' ہر چیز اُس کے سامنے ہے۔ ماضی' حال اور مستقبل آنِ واحد میں اس کے سامنے موجود ہیں۔

آیت ۸ ﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ⑧﴾ ''جس دن آسمان ہو جائے گا جیسے پگھلا ہوا تانبا۔''

آیت ۹ ﴿وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ⑨﴾ ''اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی روئی (یا رنگی ہوئی اُون)۔''

آیت ۱۰ ﴿وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ⑩﴾ ''اور کوئی دوست کسی دوسرے دوست کا حال نہیں پوچھے گا۔''

آیات ۱۱ تا ۱۴ ﴿يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ﴾ ''وہ سب انہیں دکھائے جائیں گے۔''

وہاں مشکل میں پھنسے ہوئے ہر شخص کو اس کے دوست احباب' والدین' بیوی بچے غرض اس کے سب پیارے دکھا بھی دیے جائیں گے تاکہ اس کی حسرت میں مزید اضافہ ہو۔

﴿يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۢ بِبَنِيْهِ ⑪ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ⑫ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ⑬ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ⑭﴾ ''اُس روز مجرم چاہے گا کہ کاش وہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے فدیے میں دے دے اپنے بیٹوں کو' اور اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی کو' اور اپنے کنبے کو جو اسے پناہ دیتا تھا' اور روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو' پھر یہ (فدیہ) اس کو بچا لے!''

یہ اس کیفیت کی ایک جھلک ہے جس کے بارے میں ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس روز نفسانفسی کا عالم ہوگا۔ ہر شخص کو اپنی فکر ہوگی اور وہ چاہے گا کہ خواہ اس کے بیوی بچوں اور عزیز واقارب سمیت سب کو عذاب میں جھونک دیا جائے لیکن اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس کیفیت کا بالکل ایسا ہی نقشہ سورۂ عبس کی ان آیات میں بھی دکھایا گیا ہے: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ㉞ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ㉟ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ㊱ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ㊲﴾ ''اُس دن بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے' اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے' اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ اُس دن ان میں سے ہر انسان کی ایسی حالت ہوگی جو اسے دوسروں سے بے خبر کر دے گی''۔ احادیث میں آتا ہے کہ اُس روز اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ﷺ بھی نَفْسِیْ نَفْسِیْ پکار رہے ہوں گے۔

آیت ۱۵ ﴿كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ⑮﴾ ''ہرگز نہیں! اب تو یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہی ہے۔''

آج تم سے نہ تو کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا' اور نہ ہی کوئی تمہاری مدد کو آئے گا۔ آج جہنم کی اس شعلہ فشاں آگ کا سامنا تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ مریم کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾﴾ ''اور قیامت کے دن سب کے سب آنے والے ہیں اس کے پاس اکیلے اکیلے۔''

آیت ۱۶ ﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿١٦﴾﴾ ''جو کلیجوں کو کھینچ لے گی۔''

شدت کے اعتبار سے جہنم کی آگ کا دنیا کی آگ سے کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ سورۃ الہمزہ میں جہنم کی آگ کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے: ﴿تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ﴿٧﴾﴾ کہ وہ براہِ راست دلوں میں جلن پیدا کرے گی۔ آج کل اس کیفیت کو ultra violet rays کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان شعاعوں کی حرارت کھال کے اندر پہنچ کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

آیت ۱۷ ﴿تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ﴿١٧﴾﴾ ''وہ پکارے گی ہر اُس شخص کو جس نے پیٹھ موڑ لی تھی اور رُخ پھیر لیا تھا۔''

جہنم کی آگ ہر اُس شخص کو پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر شکار کرے گی جس نے حق سے اعراض کیا تھا اور اللہ کے کلام کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ دین کی دعوت اور نبی کریم ﷺ کے مشن کو بھی لائق اعتناء نہیں سمجھا تھا۔

آیت ۱۸ ﴿وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿١٨﴾﴾ ''اور جو مال جمع کرتا رہا پھر اسے سینت سینت کر رکھتا رہا۔''

جس نے اپنی ساری زندگی مال جمع کرنے اور اسے سنبھال سنبھال کر رکھنے میں بتا دی تھی۔

آیت ۱۹ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿١٩﴾﴾ ''یقیناً انسان پیدا کیا گیا ہے تھڑدلا۔''

یہ انسان کی فطری اور جبلی کمزوری ہے کہ وہ تھڑدلا اور بے صبرا ہے۔ قرآن مجید میں انسان کی کئی اور کمزوریوں کا ذکر بھی آیا ہے' مثلاً: ﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿٢٨﴾﴾ (النساء) کہ انسان فطری طور پر کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۲ میں انسان کو ظَلُوْمًا جَهُوْلًا قرار دیا گیا ہے' جبکہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۷ میں انسان کی طبعی عجلت پسندی کا ذکر آیا ہے: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾۔ ظاہر ہے ایک انسان جسم اور روح سے مرکب ہے۔ انسان کے جسم کا تعلق عالمِ خلق سے ہے' جبکہ انسانی روح کا تعلق عالمِ امر سے ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (بنی اسراء یل: ۸۵) ''اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں۔ آپ فرما دیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے''۔ چنانچہ مذکورہ سب کمزوریوں کا تعلق انسان کی جسمانی خلقت سے ہے۔ جہاں تک انسانی وجود کے اصل حصے یعنی اس کی روح کا تعلق ہے بنیادی طور پر اس کا مقام بہت بلند ہے اور اس میں ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ انسان کی تخلیق کے اس پہلو کا ذکر سورۃ التین کی اس آیت میں آیا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴿٤﴾﴾ ''بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا''۔ لیکن افسوس کہ ہم انسانوں کی اکثریت اپنی روح سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اللہ کی یاد سے غفلت ہے۔ جو انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ

سزا کے طور پر اسے خود اپنی ذات (روح) سے غافل کر دیتا ہے۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اہل ایمان کو اس حوالے سے یوں متنبہ کیا گیا ہے: ﴿وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنۡسٰهُمۡ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ﴾ ''(اے مسلمانو دیکھنا!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

اگلی دو آیات هَلُوۡعًا کی وضاحت پر مشتمل ہیں:

آیت ۲۰ ﴿اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ﴿۲۰﴾﴾ ''جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔''

جب کوئی انسان اپنی روح سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو وہ نرا حیوان بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے حیوان نما انسان کو جب کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ صبر کرنے کی بجائے فوراً چیخنا چلانا شروع کر دیتا ہے اور جزع فزع کرنے لگتا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿وَّاِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا ﴿۲۱﴾﴾ ''اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت بخیل بن جاتا ہے۔''

جب اسے کشادگی حاصل ہوتی ہے تو سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی پاس رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب اگلی آیات میں ان انسانی کمزوریوں پر قابو پانے کے لیے راہنمائی فراہم کی گئی ہے۔ اپنے مضمون کے اعتبار سے ان آیات (آیت ۲۲ تا ۳۵) کا سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ قرآن مجید کے یہ دو مقامات نہ صرف باہم مشابہ ہیں بلکہ ''اَلۡقُرۡاٰنُ يُفَسِّرُ بَعۡضُهٗ بَعۡضًا'' کے اصول کے مطابق ایک مقام کی بعض آیات دوسرے مقام کی بعض آیات کی وضاحت بھی کرتی ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ ہمارے ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' کے تیسرے حصے کا پہلا سبق ان ہی دو مقامات کی آیات (سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور زیر مطالعہ سورۃ کی آیت ۲۲ سے آیت ۳۵ تک چودہ آیات) پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں دراصل بندۂ مؤمن کی سیرت و کردار کے ان اوصاف کی فہرست دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مطلوب اور پسندیدہ ہیں۔ گویا یہ اوصاف وہ اینٹیں ہیں جنہیں کام میں لا کر ایک بندۂ مؤمن کو اپنی سیرت کی عمارت تعمیر کرنا ہے۔ اگر یہ اینٹیں کچی ہوں گی تو ان سے بنائی گئی عمارت کمزور اور بودی ہونے کے باعث کفر و الحاد کے سیلاب کا سامنا نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ سیل باطل کی بلاخیزیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان ''اینٹوں'' کو خوب پختہ کر کے اپنی سیرت کی عمارت استوار کریں۔ بقول اکبر الہ آبادی:

تو آگ میں جل اور خاک میں مل، جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ، تعمیر نہ کر!

بہرحال گزشتہ آیات میں جن انسانی کمزوریوں کا ذکر ہے، عمومی طور پر انسان ان میں مبتلا ہو کر ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ پیدائشی کمزوریاں ناقابلِ تغیر و تبدّل نہیں، بلکہ انسان ان سے نجات پا سکتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اوصاف کے حامل لوگ ان سے مستثنیٰ ہیں:

آیت ۲۲ ﴿اِلَّا الۡمُصَلِّيۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''سوائے نمازیوں کے۔''

ان کمزوریوں اور خامیوں سے محفوظ رکھنے والی ایک چیز نماز ہے۔ گویا نماز تعمیر سیرت کی بنیاد کا پہلا پتھر

ہے۔لیکن صرف وہ نماز جو خاص اہتمام سے مداومت کے ساتھ ادا کی جاتی ہو۔ چنانچہ مذکورہ استثناء کے اہل صرف وہی نمازی ہوں گے:

آیت ۲۳ ﴿الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ ''جو اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں۔''

یعنی وہ لوگ جو اپنے روزمرہ معمولات میں نماز کو اوّلین ترجیح دیتے ہیں اور کبھی اس میں کوتاہی نہیں کرتے۔ چنانچہ ایسے ''نمازی'' اس وصف کے مصداق نہیں بن سکتے جو ''فارغ وقت'' میں تو نماز ادا کر لیتے ہیں لیکن جب کوئی اور مصروفیت ہو تو انہیں نماز کا خیال تک نہیں آتا' اور نہ ہی انہیں نماز کے ضائع ہو جانے کا دکھ ہوتا ہے۔اس آیت کے مشابہ سورۃ المؤمنون میں یہ آیت ہے: ﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ﴾ ''وہ جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔''

آیت ۲۴'۲۵ ﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ ''اور وہ جن کے اموال میں معین حق ہے' مانگنے والے کا اور محروم کا۔''

ایسے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ جو کچھ انہوں نے کمایا ہے یا جو کچھ بھی انہیں مل گیا ہے وہ سب ان کا ہے' بلکہ وہ اپنے اموال میں سے ایک معین حصہ معاشرے کے ان محروم اور نادار افراد کے لیے مختص کیے رکھتے ہیں جو اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔ دراصل اللہ تعالیٰ آزمائش کے لیے بعض لوگوں کے حصے کا کچھ رزق بعض دوسرے لوگوں کے رزق میں شامل کر دیتا ہے۔ چنانچہ متمول افراد کو چاہیے کہ وہ اپنے اموال میں سے مساکین وفقراء کا حصہ الگ کر کے ''حق بہ حق دار رسید'' کے اصول کے تحت خود ان تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔ یاد رہے سورۃ المؤمنون میں اس آیت کے مقابل یہ آیت ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾ ''اور وہ جو ہر دم اپنے تزکیے کی طرف متوجہ رہنے والے ہیں''۔ان دونوں آیات پر غور کرنے سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ (غرباء ومساکین کا حق) ادا کر دینے سے نہ صرف بقیہ مال پاک ہو جاتا ہے بلکہ یہ انفاق انسان کے تزکیہ باطن کا باعث بھی بنتا ہے۔اس نکتے کی وضاحت سورۃ الحدید کی آیت ۱۷ اور ۱۸ کے ضمن میں بھی کی جا چکی ہے۔ دراصل مال کی محبت جب کسی دل میں گھر جاتی ہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ اس دل میں گندگی کے انبار لگ جاتے ہیں۔ایسی صورت میں دل کی صفائی یعنی تزکیہ باطن کا مؤثر ترین طریقہ یہی ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے مال کی محبت کو دل سے نکالا جائے۔لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنے مال کو تو سینت سینت کر رکھتا ہے اور محض مراقبوں کے بل پر اپنے باطن اور نفس کا ''تزکیہ'' چاہتا ہے وہ گویا سراب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر خود کو ہلکان کر رہا ہے۔

آیت ۲۶ ﴿وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ''اور جو فیصلے کے دن کی تصدیق کرتے ہیں۔''

زیر مطالعہ آیات کی سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کے ساتھ مناسبت کے حوالے سے اس آیت کا تعلق سورۃ المؤمنون کی اس آیت سے ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾ ''اور جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں''۔گویا زیر مطالعہ آیت سورۃ المؤمنون کی مذکورہ آیت کی وضاحت کر رہی ہے۔اللہ تعالیٰ کے

نیک بندے لغویات سے اعراض کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ قیامت اور جزا و سزا کے دن پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے لیے تو اس زندگی کا ایک ایک لمحہ اَمر (کبھی نہ مرنے والا' دائمی) ہے۔ بظاہر تو انسان کی یہ زندگی فانی (finite) ہے' لیکن درحقیقت بالقوہ (potentially) یہ دائمی (infinite) ہے۔ اس لیے کہ اس فانی زندگی کے اعمال کا نتیجہ آخرت کی دوامی زندگی میں نکلے گا۔ دنیا میں انسان اچھے برے جو اعمال بھی کمائے گا' ان اعمال کے اثرات ونتائج آخرت کی زندگی میں ہمیشہ ہمیش کے لیے ہوں گے۔ چنانچہ آخرت کی دوامی زندگی کے لیے جو پونجی انسان کو درکار ہے وہ تو دنیوی زندگی کے ''اوقات'' میں ہی کمائی جا سکتی ہے۔ سورۃ العصر کی پہلی آیت میں تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کی قسم کے پردے میں بھی دراصل یہی فلسفہ بیان ہوا ہے۔ گویا انسان کا اصل سرمایہ اس کی مہلتِ عمر یعنی زندگی کے وہ قیمتی لمحات ہیں جو تیزی سے اس کے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی!

آیت ۲۷ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور جو اپنے رب کے عذاب سے لرزاں وترساں رہتے ہیں۔''

آیت ۲۸ ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾﴾ ''یقیناً ان کے رب کا عذاب ایسا نہیں ہے کہ کوئی اس سے نڈر ہو جائے۔''

آیت ۲۹ ﴿وَّالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

آیت ۳۰ ﴿اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾﴾ ''سوائے اپنی بیویوں یا اپنی لونڈیوں کے' تو ان لوگوں پر کوئی ملامت نہیں۔''

آیت ۳۱ ﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾﴾ ''تو جو کوئی بھی اس کے علاوہ کچھ چاہے گا تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

آیت ۳۲ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾﴾ ''اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرنے والے ہیں۔''

یہ چاروں آیات سورۃ المؤمنون میں بھی (آیت ۵'۶'۷ اور ۸ کے طور پر) جوں کی توں آئی ہیں۔ البتہ اگلی آیت میں اہل ایمان کی سیرت کی ایک اضافی صفت کا ذکر ہے جو سورۃ المؤمنون کی مذکورہ آیات میں بیان نہیں ہوئی:

آیت ۳۳ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں۔''

دراصل گواہی بھی ایک امانت ہے اور جو شخص غلط گواہی دیتا ہے یا گواہی کو چھپا لیتا ہے وہ امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ

اللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۱۴۰) ''اور (کان کھول کر سن لو) اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی تھی جسے اس نے چھپا لیا؟'' علمائے یہود کے پاس نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کے بارے میں اللہ کی طرف سے گواہی تھی' انہوں نے اس گواہی کو چھپا کر اللہ کی امانت میں خیانت کی۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں اسی گواہی کو چھپانے کا ذکر ہے۔

آیت ۳۴ ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۳۴﴾﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو اپنی نماز کی محافظت کرتے ہیں۔''

آیت ۳۵ ﴿اُولٰٓئِكَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّكۡرَمُوۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''یہی لوگ ہیں جو جنتوں میں ہوں گے اور وہاں ان کا اعزاز واکرام ہو گا۔''

آیات ۳۶ تا ۴۴

فَمَالِ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا قِبَلَكَ مُهۡطِعِیۡنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِیۡنَ ﴿۳۷﴾ اَیَطۡمَعُ كُلُّ امۡرِیٴٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ یُّدۡخَلَ جَنَّةَ نَعِیۡمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقۡنٰهُمۡ مِّمَّا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۹﴾ فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَالۡمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ خَیۡرًا مِّنۡهُمۡ ۙ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرۡهُمۡ یَخُوۡضُوۡا وَیَلۡعَبُوۡا حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَهُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۴۲﴾ یَوۡمَ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمۡ اِلٰی نُصُبٍ یُّوۡفِضُوۡنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الۡیَوۡمُ الَّذِیۡ كَانُوۡا یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۴۴﴾ ع

آیت ۳۶ ﴿فَمَالِ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا قِبَلَكَ مُهۡطِعِیۡنَ ﴿۳۶﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ آپ کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔''

آیت ۳۷ ﴿عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِیۡنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''دائیں اور بائیں سے غول درغول۔''

دراصل مشرکین کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جس کسی نے بھی حضور ﷺ سے قرآن سن لیا وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اس لیے حضور ﷺ جب لوگوں کو قرآن سنانے کے لیے کہیں کھڑے ہوتے تو وہ ہر طرف سے دوڑیں لگا کر آپؐ کے پاس پہنچ جاتے۔ ایسا دراصل وہ لوگوں کو حضور ﷺ کے گرد جمع ہونے سے روکنے کے لیے کرتے تھے' تاکہ وہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن نہ سن سکیں۔

آیت ۳۸ ﴿اَیَطۡمَعُ كُلُّ امۡرِیٴٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ یُّدۡخَلَ جَنَّةَ نَعِیۡمٍ ﴿۳۸﴾﴾ ''کیا ان میں سے ہر ایک واقعتاً اس کا خواہش مند ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کیا جائے گا؟''

آیت ۳۹ ﴿كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقۡنٰهُمۡ مِّمَّا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''ہرگز نہیں! ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اُس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں۔''

یعنی ہر انسان جانتا ہے کہ اس کی تخلیق گندے پانی کی ایک بوند سے ہوئی ہے۔

آیت ۴۰ ﴿فَلَآ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَالۡمَغٰرِبِ﴾ ''تو نہیں! قسم ہے مجھے مشرقوں اور مغربوں کے ربّ کی''

قرآن مجید میں صیغہ واحد کے طور پر تو مشرق اور مغرب کا ذکر بہت مرتبہ آیا ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی آیت ۱۷ میں رَبُّ الۡمَشۡرِقَیۡنِ وَرَبُّ الۡمَغۡرِبَیۡنِ بھی ہے، جبکہ آیت زیر مطالعہ میں دونوں سمتوں کے لیے جمع کے صیغے آئے ہیں۔ مشرق و مغرب سے متعلق ان تینوں صیغوں (واحد، تثنیہ اور جمع) کی وضاحت سورۃ الرحمٰن کی آیت ۱۷ کے تحت کی جا چکی ہے۔

﴿اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''یقیناً ہم قادر ہیں۔''

آیت ۴۱ ﴿عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ خَیۡرًا مِّنۡہُمۡ ۙ﴾ ''اس پر کہ ہم ان کو ہٹا کر ان سے بہتر لوگ لے آئیں''

یعنی ہم انہیں ختم کر کے ان کی جگہ کسی اور قوم کے افراد کو لے آئیں گے، جو ان سے بہتر ہوں گے۔ جیسے قومِ نوح کو ختم کر کے قومِ عاد کو پیدا کیا گیا اور پھر قومِ عاد کے بعد قومِ ثمود کو عروج بخشا گیا۔ اس فقرے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آخرت میں ہم انہیں جو جسم دیں گے وہ ان کے موجودہ جسموں سے بہتر ہوں گے۔ اس بارے میں سورۃ الواقعہ، آیت ۶۱ اور سورۃ الدھر، آیت ۲۸ میں تو یہ اشارہ ملتا ہے کہ آخرت میں انسانوں کو جو جسم دیے جائیں گے وہ ان کے دنیا والے جسموں جیسے ہوں گے، لیکن زیر مطالعہ آیت کے مذکورہ مفہوم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کو آخرت میں دیے جانے والے جسم ان کے دنیا والے جسموں سے بہتر ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو وہ جسم ان کے دنیا والے جسموں جیسے ہی ہوں گے، لیکن برداشت وغیرہ کے حوالے سے ان سے کہیں بڑھ کر ہوں گے۔ مثلاً جہنم کی آگ جو دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ گرم اور شدید ہو گی جب انسانوں کو جلائے گی تو وہ جل کر راکھ نہیں بن جائیں گے، بلکہ اس کی تپش کو برداشت کریں گے۔ اہلِ جہنم کے جسموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہو گی کہ ان کی کھالیں جل جانے کے بعد پھر سے اپنی اصل حالت پر آ جائیں گی۔ بہرحال آخرت میں ان لوگوں کو جو جسم دیے جائیں گے وہ خصوصی طور پر آخرت کی سختیاں جھیلنے کے لیے بنائے جائیں گے۔ وہ سختیاں جو دنیا کی سختیوں سے کہیں بڑھ کر ہوں گی۔

﴿وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور (اس معاملے میں) ہم ہارے ہوئے نہیں ہیں۔''

ہم ان کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں، وہ ہماری گرفت سے نکل نہیں سکیں گے۔

آیت ۴۲ ﴿فَذَرۡہُمۡ یَخُوۡضُوۡا وَیَلۡعَبُوۡا﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ چھوڑ دیجیے انہیں، یہ لگے رہیں بے ہودہ باتوں اور کھیل کود میں''

﴿حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَہُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''یہاں تک کہ یہ ملاقات کریں اپنے اُس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔''

قبل ازیں سورۃ الطور، آیت ۴۵ میں بھی ہم یہی الفاظ ﴿فَذَرۡہُمۡ حَتّٰی یُلٰقُوۡا﴾ پڑھ آئے ہیں۔ یہ

اسلوب ابتدائی دور کی سورتوں میں عام ملتا ہے۔ اس میں ایک طرف حضور ﷺ کی دلجوئی اور تسلی کا پہلو ہے تو دوسری طرف مشرکین سے نفرت اور غصے کا اظہار بھی ہے۔

آیت ۴۳ ﴿ یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا کَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ ﴾ ”جس دن وہ نکلیں گے اپنی قبروں سے دوڑتے ہوئے' جیسے کہ وہ مقرر نشانوں کی طرف بھاگے جا رہے ہوں۔“

”نُصُب“ سے مراد وہ نشان ہیں جو دوڑ کا مقابلہ کرنے کے لیے لگائے جاتے ہیں تا کہ ہر دوڑنے والا دوسرے سے پہلے مقرر نشان پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

آیت ۴۴ ﴿ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ﴾ ”ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں گی' ذلت ان پر چھائی ہوئی ہوگی۔“

﴿ ذٰلِكَ الْیَوْمُ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ ﴾ ”یہ ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔“

سُوْرَةُ نُوْح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ تا ۲۰

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ قَالَ
يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ
وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ قَالَ
رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ
لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا
اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ فَقُلْتُ
اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ
وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ
خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ
نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا
وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝ ع

آیت ۱ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ﴾ ”ہم نے بھیجا تھا نوح کو اُن کی قوم کی طرف“

﴿اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ①﴾ ”کہ خبردار کر دو اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ آ دھمکے ان پر ایک دردناک عذاب۔“

آیت ۲ ﴿قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ②﴾ ”آپ نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے واضح طور پر ایک خبردار کرنے والا ہوں۔“

آیت ۳ ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ③﴾ ”کہ تم لوگ اللہ کی بندگی کرو، اُس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔“

یہاں نبی اور رسول میں فرق کے حوالے سے یہ نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے اپنی

اطاعت کا مطالبہ اللہ کے ''رسول'' کی حیثیت سے کیا تھا۔ کسی نبی علیہ السلام نے اپنی قوم سے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم لوگ میری اطاعت کرو۔ سورۂ یوسفؑ میں ہم حضرت یوسف علیہ السلام کے تفصیلی حالات پڑھ چکے ہیں۔ حضرت یوسفؑ نبی تھے۔ آپؑ نے مصر کے بادشاہ کو یہ نہیں کہا کہ میں نبی ہوں' تم میری اطاعت کرو' اور نہ ہی آپؑ نے مصر کے لوگوں سے مخاطب ہو کر یوں کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ ورنہ تم پر اللہ کی طرف سے عذاب آ جائے گا۔ بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دورِ نبوت میں بادشاہ اپنی جگہ پر بادشاہ رہا۔ آپؑ اس کی بادشاہی میں ایک بڑے عہدے پر کام بھی کرتے رہے اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے۔ گویا انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت عمومی نوعیت کی تھی کہ تم لوگ اللہ کے نیک بندے بنو' اللہ کا حق مانو' وغیرہ۔ لیکن جب کسی نبی کو کسی قوم کی طرف کوئی خاص مشن دے کر بھیجا گیا تو وہ اللہ کے ''رسولؑ'' اور اللہ کے نمائندے بن کر اُس قوم کی طرف گئے اور اسی حیثیت سے انہوں نے متعلقہ قوم سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کیا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (النساء: ٦٤) ''ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیے کہ اُس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے''۔ اس لحاظ سے رسول کی اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء: ٨٠) ''جس نے اطاعت کی رسول کی اُس نے اطاعت کی اللہ کی۔''

آیت ۴ ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ﴾ ''اللہ تمہارے کچھ گناہ معاف کر دے گا''

یہاں پر حرف مِنْ (تبعیضیہ) بہت معنی خیز ہے۔ یعنی سب کے سب گناہ معاف ہونے کی ضمانت نہیں' البتہ کچھ گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق تو جسے چاہے گا اور جب چاہے گا معاف کر دے گا' لیکن حقوق العباد کے تنازعات کے حوالے سے وہ انصاف کے تقاضے پورے کرے گا۔ اس کے لیے روزِ محشر متعلقہ فریقوں کے درمیان باقاعدہ لین دین کا اہتمام کرایا جائے گا۔ مثلاً کسی شخص نے اگر کسی کا حق غصب کیا ہو گا' کسی کی عزت پر حملہ کیا ہو گا یا کسی بھی طریقے سے کسی پر ظلم کیا ہو گا تو ایسے ظالم کی نیکیوں کے ذریعے سے متعلقہ مظلوم کی تلافی کی جائے گی۔ اس لین دین میں اگر کسی ظالم کی نیکیاں کم پڑ جائیں گی تو حساب برابر کرنے کے لیے اس کے ظلم کا شکار ہونے والے مظلوموں کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے۔

﴿وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ﴾ ''اور تمہیں مہلت دے دے گا ایک وقت معین تک۔''

یعنی اگر تم لوگ اللہ کو معبود مانتے ہوئے اس کا تقویٰ اختیار کرو گے اور میرے احکام کی تعمیل کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ کچھ مدت کے لیے تمہیں بحیثیت قوم دنیا میں زندہ رہنے کی مزید مہلت عطا فرما دے گا۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مہلت بھی ایک وقت معین تک ہی ہو گی۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے قوانین بہت سخت اور اٹل ہیں۔

﴿اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴﴾ ''اللہ کا مقرر کردہ وقت جب آ جائے گا تو اسے مؤخر نہیں کیا جا سکے گا۔ کاش کہ تمہیں معلوم ہوتا!''

جب کوئی قوم اپنے رسول کی دعوت کو ٹھکرا دیتی ہے اور اسے غور وفکر کرنے کے لیے جو مہلت دی گئی ہو وہ ختم ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق اس قوم کو نیست و نابود کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر کوئی طاقت اس فیصلے کو مؤخر نہیں کر سکتی۔

آئندہ آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کے اندازِ دعوت کا پورا نقشہ نظر آتا ہے کہ آپؑ نے اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کے لیے خود کو کس کس طرح سے ہلکان کیا۔ قوم کو دعوت و تبلیغ کرتے اور پیغامِ حق سناتے ہوئے نوصدیاں بیت گئیں لیکن قوم اس دعوتِ حق پر کان دھرنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ جب آپؑ کو ان کے ایمان لانے کی امید نہ رہی تو آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ عرض داشت پیش کی۔

آیت ۵ ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝۵﴾ ''نوح نے عرض کیا: پروردگار! میں نے تو اپنی اس قوم کو رات دن دعوت دی ہے۔''

آیت ۶ ﴿فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝۶﴾ ''لیکن میری اس دعوت نے ان میں کچھ اضافہ نہیں کیا سوائے فرار کے۔''

یعنی میری اس شب و روز کی دعوتی مساعی کے نتیجے میں ان کے گریز اور فرار ہی میں اضافہ ہوا۔ جتنا جتنا میں ان کو پکارتا گیا اتنے ہی زیادہ یہ دور بھاگتے گئے۔

آیت ۷ ﴿وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ﴾ ''اور میں نے جب بھی انہیں پکارا تاکہ تو ان کی مغفرت فرما دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں''

﴿وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ﴾ ''اور اپنے کپڑے بھی اپنے اوپر لپیٹ لیے''

﴿وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝۷﴾ ''اور وہ ضد پر اَڑ گئے' اور انہوں نے استکبار کیا بہت بڑا استکبار۔''

اَصَرَّ یُصِرُّ اِصْرَارًا کے معنی اپنی روش پر اَڑ جانے کے ہیں۔ کفر کی روش پر اَڑ جانے اور جم جانے کے علاوہ ان کا رویہ اپنے رسولؑ کے ساتھ ازحد متکبرانہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم کیسے آپ کو اپنا پیشوا تسلیم کر لیں جبکہ نچلے درجے کے رذیل قسم کے لوگ آپ کے متبعین ہیں! ـــــ اردو میں لفظ اصرار اسی معنی میں مستعمل ہے۔

آیت ۸ ﴿ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝۸﴾ ''پھر (اے پروردگار) میں نے انہیں بلند آواز سے بھی پکارا۔''

آیت ۹ ﴿ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝۹﴾ ''پھر میں نے انہیں علانیہ دعوت بھی دی اور خفیہ طور پر بھی سمجھایا۔''

اَسَرَّ یُسِرُّ اِسْرَارًا کے معنی بھید ہیں چھپانا یا چپکے سے بیان کرنا۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو کھلم کھلا تبلیغ بھی کرتے اور لوگوں سے تنہائی میں انفرادی ملاقاتیں کر کے بھی ایک ایک کو سمجھاتے۔

آیت ۱۰ ﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ﴾ ''پس میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے رب سے استغفار کرو۔''

﴿اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰﴾ ”یقیناً وہ بہت بخشنے والا ہے۔“

آیت ۱۱ ﴿يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱﴾ ”وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔“

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے بن کر رہو گے تو وہ تمہاری دنیوی زندگی میں بھی تمہارے لیے آسانیاں پیدا کر دے گا اور تمہارے علاقے میں خوب بارشیں برسائے گا جس سے تمہارے رزق میں اضافہ ہوگا۔ ان الفاظ سے یوں لگتا ہے جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے بعد کسی دور میں اس قوم پر خشک سالی اور قحط کا عذاب آیا تھا۔ جیسے قومِ فرعون پر قحط اور دوسرے عذاب بھیجے گئے تھے (الاعراف: رکوع ۱۶)۔ یا جیسے حضور ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں بہت سخت قحط پڑا تھا (سورۃ الدخان: رکوع ۱)۔ ایسے چھوٹے چھوٹے عذاب دراصل ہر رسول کی بعثت کے بعد متعلقہ قوم کے لوگوں پر وقتاً فوقتاً اس لیے مسلط کیے جاتے تھے تاکہ وہ خوابِ غفلت سے جاگ جائیں اور اپنے رسول کی دعوت کو سنجیدگی سے سنیں۔

آیت ۱۲ ﴿وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ ”اور وہ بڑھا دے گا تمہیں مال اور بیٹوں سے“

﴿وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝۱۲﴾ ”اور تمہیں باغات عطا کرے گا اور تمہارے لیے (چشمے اور) نہریں رواں کر دے گا۔“

آیت ۱۳ ﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝۱۳﴾ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت کے امیدوار نہیں ہو؟“

اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ اور دوسرا یہ کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی عظمت و سطوت سے خوف کیوں نہیں آتا؟ فی الحال اللہ تعالیٰ تمہیں ڈھیل دے رہا ہے‘ لیکن اس کی ڈھیل کی بھی ایک حد ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے: ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝۱۲﴾ (البروج) کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو پکڑنے پر آتا ہے تو اس کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔ تم ان سب باتوں کا خیال کیوں نہیں کرتے ہو؟ آخر تم لوگ اس کی نافرمانیاں کرتے ہوئے اور اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہوئے اس کے غصے اور اس کی گرفت سے بے خوف کیوں ہو گئے ہو؟

آیت ۱۴ ﴿وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝۱۴﴾ ”اور اس نے تمہیں پیدا کیا ہے درجہ بدرجہ۔“

اللہ تعالیٰ نے رحم مادر کے اندر تمہیں خلقت کے کئی مراحل سے گزار کر انسانی صورت میں ڈھالا ہے۔

آیت ۱۵ ﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝۱۵﴾ ”کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کیسے پیدا کیا ہے سات آسمانوں کو تہ بر تہ!“

آیت ۱۶ ﴿وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝۱۶﴾ ”اور ان کے اندر اُس نے چاند کو روشنی اور سورج کو (درخشاں) چراغ بنایا!“

آیت ۱۷ ﴿وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝۱۷﴾ ”اور اللہ نے تمہیں اُگایا ہے زمین سے جیسے (سبزہ)

اُگایا جاتا ہے۔‘‘

اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔ نہ صرف تمہارے جسم کے تمام اجزاء زمین سے لیے گئے ہیں بلکہ اس جسم کی پرورش اور بقا کے لیے تمہیں خوراک بھی اسی زمین سے مل رہی ہے۔ نظریہ ارتقاء (evolution theory) کے ماننے والے لوگ اس آیت کو اپنے حق میں دلیل کے طور پر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زمین سے اُگانے کے مفہوم میں پہلے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تخلیق کے آغاز اور پھر رفتہ رفتہ اس مخلوق کے مختلف ارتقائی مراحل سے گزار کر انسانی نسل (Homo sapiens) تک پہنچنے کا اشارہ موجود ہے۔

آیت ۱۸ ﴿ثُمَّ یُعِیۡدُکُمۡ فِیۡہَا وَ یُخۡرِجُکُمۡ اِخۡرَاجًا﴿۱۸﴾﴾ ’’پھر وہ تمہیں لوٹا دے گا اسی میں اور پھر نکالے گا تمہیں جیسے نکالا جاتا ہے۔‘‘

آیت ۱۹ ﴿وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ بِسَاطًا﴿۱۹﴾﴾ ’’اور اللہ نے تمہارے لیے زمین کو بچھا دیا ہے بچھونے کی طرح۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿لِّتَسۡلُکُوۡا مِنۡہَا سُبُلًا فِجَاجًا﴿۲۰﴾﴾ ’’تاکہ تم چلو پھرو اس میں کشادہ راستوں پر۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی عرضداشت اور روداد الم پیش کرتے ہوئے آخر کار حضرت نوح علیہ السلام یوں فریاد کناں ہوئے:

آیات ۲۱ تا ۲۸

قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ اِنَّہُمۡ عَصَوۡنِیۡ وَ اتَّبَعُوۡا مَنۡ لَّمۡ یَزِدۡہُ مَالُہٗ وَ وَلَدُہٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿ۚ۲۱﴾ وَ مَکَرُوۡا مَکۡرًا کُبَّارًا ﴿ۚ۲۲﴾ وَ قَالُوۡا لَا تَذَرُنَّ اٰلِہَتَکُمۡ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۬ۙ وَّ لَا یَغُوۡثَ وَ یَعُوۡقَ وَ نَسۡرًا ﴿ۚ۲۳﴾ وَ قَدۡ اَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا ۬ۚ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾ مِمَّا خَطِیۡٓـٰٔتِہِمۡ اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا ۬ۙ فَلَمۡ یَجِدُوۡا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡصَارًا ﴿۲۵﴾ وَ قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّکَ اِنۡ تَذَرۡہُمۡ یُضِلُّوۡا عِبَادَکَ وَ لَا یَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِمَنۡ دَخَلَ بَیۡتِیَ مُؤۡمِنًا وَّ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾ ع ۲ ۸ ۱۰

آیت ۲۱ ﴿قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ اِنَّہُمۡ عَصَوۡنِیۡ﴾ ’’نوحؑ نے کہا: پروردگار! انہوں نے میری نافرمانی کی‘‘

﴿وَ اتَّبَعُوۡا مَنۡ لَّمۡ یَزِدۡہُ مَالُہٗ وَ وَلَدُہٗۤ اِلَّا خَسَارًا﴿۲۱﴾﴾ ’’اور انہوں نے ان لوگوں کی پیروی کی جن کے مال اور اولاد نے ان کے لیے سوائے خسارے کے اور کچھ نہیں بڑھایا۔‘‘

پروردگار! تو نے مجھے ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور ان پر کسی پس و پیش کے بغیر میری اطاعت لازم تھی، لیکن انہوں نے تو میری جی بھر کر نافرمانی کی اور اپنے ان سرداروں اور وڈیروں کی پیروی کرتے رہے جن

کے مال واولاد کی کثرت نے انہیں غرور وتکبر میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ لوگ میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں۔

آیت ۲۲ ﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾﴾ ''اور ان لوگوں نے ایک چال بھی چلی بہت بڑی چال۔''

یہ قومِ نوحؑ کے بڑے بڑے سرداروں کی اس چال کا ذکر ہے جس کے تحت انہوں نے مذہبی اور نسلی عصبیت کا سہارا لے کر عوام کو حضرت نوح علیہ السلام کے خلاف بھڑکایا تھا۔ انہوں نے اپنے اسلاف میں سے بڑے بڑے اولیاء اللہ کے بُت بنا کر رکھے ہوئے تھے اور انہی بُتوں کی وہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے انہیں ان بتوں کو چھوڑنے اور ایک اللہ کو معبود ماننے کی دعوت دی تو قوم کے سرداروں کو آپؑ کے خلاف یہ دلیل مل گئی کہ آپؑ ان کے بزرگوں اور اولیاء اللہ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ چنانچہ اس ''مضبوط اور موثر'' دلیل کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنے عوام کو اس نعرے پر متحد کر لیا کہ اب جو ہو سو ہو ہم اپنے ان معبودوں کو نہیں چھوڑیں گے۔

آیت ۲۳ ﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ﴾ ''اور انہوں نے کہا کہ تم اپنے ان معبودوں کو ہرگز چھوڑ نہ بیٹھنا۔''

اس سے ملتا جلتا نعرہ سردارانِ قریش نے بھی حضور ﷺ کے خلاف اپنے عوام کو سکھایا تھا: ﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ﴿۶﴾﴾ (صٓ) ''اور چل پڑے ان کے سردار (یہ کہتے ہوئے) کہ چلو جاؤ اور جمے رہو اپنے معبودوں پر' یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض پوشیدہ ہے۔''

﴿وَّلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾﴾ ''ہرگز مت چھوڑنا وَدّ کو' سُواع کو' یَغُوث کو' یَعُوق کو اور نَسر کو۔''

یہ سب اس قوم کے بتوں کے نام ہیں اور ان میں سے بیشتر اولیاء اللہ کی شخصیات کے بت تھے۔ یَغُوث کے تلفظ میں ''غیاث'' یا ''غوث'' کی مشابہت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اولیاء اللہ میں سے کسی ایسی شخصیت کا بت تھا جسے وہ لوگ اپنا فریاد رس سمجھتے تھے۔ دراصل حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیانی زمانے میں بہت سے انبیاء کرام گزرے ہیں۔ حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السلام اسی دور کے نبی ہیں۔ ظاہر ہے ان پیغمبروں کے پیروکاروں میں بہت سے نیک لوگ اور اولیاء اللہ بھی ہوں گے۔ چنانچہ بعد کی نسلوں کے لوگوں نے عقیدت واحترام کے جذبے کے تحت ان اولیاء اللہ کی مورتیاں بنالیں۔ شروع شروع میں وہ ان مورتیوں کو احتراماً سلام کرتے ہوں گے' لیکن بعد میں رفتہ رفتہ ان کی باقاعدہ پوجا شروع کر دی گئی۔ اسی طرح آج ہمارے ہاں بھی بعض لوگ اپنے گھروں میں اولیاء اللہ اور پیروں کی تصاویر بڑے اہتمام کے ساتھ آویزاں کرتے ہیں' بلکہ ان تصویروں کے گلوں میں باقاعدہ ہار بھی ڈالے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک صاحب کے گھر میں ایک تصویر آویزاں دیکھی جس میں خواجہ معین الدین اجمیری' حضرت بختیار کاکی اور بابا فرید شکر گنج رحمہم اللہ تینوں بیک وقت جمع تھے اور تصویر پر ہار ڈالے گئے تھے۔ ایسی روایات جب نسل در نسل آگے بڑھتی ہیں تو تدریجاً بت پرستی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ظاہر ہے عقائد ونظریات میں بگاڑ ایک دم تو پیدا نہیں ہوتا بلکہ ملتان کی زبان میں اس عمل کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''بندہ تھیندا تھیندا تھی ویندا اے''۔ بہرحال بعض اوقات انسان نظریاتی طور پر رفتہ رفتہ اس قدر بدل جاتا ہے کہ اسے خود بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

آیت ۲۴ ﴿وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾﴾ ”اور انہوں نے تو بہتوں کو بہکا دیا ہے۔ اور (اے اللہ!) اب تُو ان ظالموں کے لیے سوائے گمراہی کے اور کسی چیز میں اضافہ نہ فرما!“

حضرت نوح علیہ السلام کے ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر آپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب آپ کی حمیت دینی کو اس ناہنجار قوم کا ایمان لانا بھی گوارا نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کناں ہیں کہ پروردگار! اب تو ان گمراہوں کی گمراہی میں ہی اضافہ فرما—— بالکل ایسی ہی کیفیت کی جھلک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا میں بھی نظر آتی ہے:

﴿وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾﴾ (یونس)

”اور موسیٰ نے عرض کیا: اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو سامانِ زیب و زینت اور اموال عطا کر دیے ہیں دنیا کی زندگی میں۔ پروردگار! اس لیے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں تیرے راستے سے! اے ہمارے رب! اب ان کے اموال کو برباد کر دے اور ان کے دلوں میں سختی پیدا کر دے کہ یہ ایمان نہ لائیں جب تک کہ یہ کھلم کھلا دیکھ نہ لیں عذابِ الیم کو۔“

آیت ۲۵ ﴿مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ﴾ ”اپنی خطاؤں کی وجہ سے ہی وہ غرق کیے گئے اور داخل کر دیے گئے آگ میں“

﴿فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾﴾ ”تو نہ پایا انہوں نے اپنے لیے اللہ کے مقابل کوئی مددگار۔“

حضرت نوح علیہ السلام کی اس فریاد کا سخت ترین حصہ آگے آ رہا ہے:

آیت ۲۶ ﴿وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾﴾ ”اور نوحؑ نے کہا: اے میرے پروردگار! اب تُو اس زمین پر کافروں کا بستا ہوا ایک گھر بھی مت چھوڑ۔“

آیت ۲۷ ﴿اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾﴾ ”اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسلوں میں بھی اب فاجر اور کافر لوگوں کے سوا اور کوئی پیدا نہیں ہوگا۔“

ان لوگوں کی فطرتیں مسخ ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے ان کی آئندہ نسلوں سے بھی کسی خیر کی توقع نہیں ہے۔ اس لیے ان کا نیست و نابود ہو جانا ہی بہتر ہے۔ انسانی تاریخ میں اللہ کے کسی بندے نے شاید ہی ایسی سخت دعا مانگی ہو۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک جس طرح صبر و استقامت کے ساتھ اپنی قوم کی زیادتیوں کو برداشت کیا' اس پس منظر میں آپ کا یہ غصہ حق بجانب تھا۔

آیت ۲۸ ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا﴾ ”پروردگار! مغفرت فرما دے میری

اور میرے والدین کی اور جو کوئی بھی میرے گھر میں داخل ہو جائے ایمان کے ساتھ اس کی بھی''

﴿وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ﴾ ''اور تمام مؤمن مَردوں اور مؤمن عورتوں کی بھی (مغفرت فرما دے)''

یہ دعا اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں اگلے اور پچھلے زمانوں کے تمام اہلِ ایمان شامل ہو گئے ہیں۔

﴿وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور ان ظالموں کے لیے تو اب کسی چیز میں اضافہ مت کر سوائے تباہی اور بربادی کے۔''

سورۃ المعارج اور سورۂ نوح کے مطالعے کے بعد یہ نکتہ بھی اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ اگر ''نظمِ قرآن'' کو مدنظر رکھتے ہوئے ان دونوں سورتوں کا مطالعہ جوڑے کی حیثیت سے کیا جائے تو نہ صرف سورۃ المعارج کی پہلی آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے' بلکہ سورۂ نوح کے نزول کا سبب اور حضرت نوح علیہ السلام کی مذکورہ دعا کا جواز بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بہرحال اس پہلو سے ان دونوں سورتوں پر غور کرنے سے یہ نکتہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ سورۃ المعارج کی ابتدائی آیت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے متعلق ہے اور یہ بھی کہ سورۃ المعارج کی آیت ۵ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ﴿۵﴾﴾ کی تلقین بھی اسی حوالے سے کی گئی' بلکہ اس کے بعد ایک پوری سورت (سورۂ نوح) نازل کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کے حالات و مصائب کا نقشہ بھی دکھا دیا گیا کہ آپؐ کی دعوتی مہم کو شروع ہوئے تو ابھی چار پانچ سال ہی ہوئے ہیں' آپؐ ہمارے اس بندے کی ہمت اور استقامت کو بھی مدنظر رکھیں جو ایسے مشکل حالات کا سامنا ساڑھے نو سو سال تک کرتا رہا۔

سُوْرَۃُ الجِنّ

تمہیدی کلمات

سورۃ الجن منفرد سورت ہے' اس کا کوئی جوڑا نہیں ۔ یہ قرآن مجید کی واحد سورت ہے جس میں جنات کا تفصیلی ذکر آیا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الاحقاف میں بھی جنات کا تذکرہ ہے۔ سورۃ الاحقاف میں ان جنات کے بارے میں بتایا گیا ہے جو حضور ﷺ سے قرآن مجید سن کر ایمان لے آئے تھے' جبکہ سورۃ الرحمٰن میں انسانوں اور جنوں کو ﴿یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ...﴾ ایک ساتھ مسلسل مخاطب کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الرحمٰن کی ترجیعی آیت ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ پوری سورت میں اکتیس (۳۱) مرتبہ دہرائی گئی ہے۔

زیر مطالعہ سورت میں جنات کے ایک گروہ کے کچھ افراد کی باہمی گفتگو کا ذکر ہے۔ ممکن ہے یہ وہی گروہ ہو جس کا ذکر سورۃ الاحقاف میں آ چکا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی دوسرا گروہ ہو۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱ تا ۱۵

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ یَّھْدِیْٓ اِلَی
الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِکَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ وَّاَنَّہُ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّلَا
وَلَدًا ۙ وَّاَنَّہُ کَانَ یَقُوْلُ سَفِیْھُنَا عَلَی اللّٰہِ شَطَطًا ۙ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ
وَالْجِنُّ عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ۙ وَّاَنَّہُ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ
فَزَادُوْھُمْ رَھَقًا ۙ وَّاَنَّھُمْ ظَنُّوْا کَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ اَحَدًا ۙ وَّاَنَّا لَمَسْنَا
السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰھَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّشُھُبًا ۙ وَّاَنَّا کُنَّا نَقْعُدُ مِنْھَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ
فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَہٗ شِھَابًا رَّصَدًا ۙ وَّاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ
اَرَادَ بِھِمْ رَبُّھُمْ رَشَدًا ۙ وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِکَ ۭ کُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۙ وَّاَنَّا
ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰہَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَہٗ ھَرَبًا ۙ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْھُدٰٓی اٰمَنَّا بِہٖ ۭ
فَمَنْ یُّؤْمِنْ بِرَبِّہٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَھَقًا ۙ وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ۭ
فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِکَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَکَانُوْا لِجَھَنَّمَ حَطَبًا ۙ

آیت ۱ ﴿قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے بڑے غور سے سنا''

جنّات کی جماعت نے کیا سنا؟ اس کا جواب اگلے جملے میں ہے۔

﴿فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ①﴾ ''تو انہوں نے (جا کر دوسرے جنّات سے) کہا کہ ہم نے سنا ہے ایک بہت ہی دل کو لبھانے والا قرآن۔''

آیت ۲ ﴿يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ﴾ ''جو راہِ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے' تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔''

قرآن کے بارے میں جنّات کا یہ ردِّعمل ہم انسانوں کے لیے باعث عبرت اور لمحہ فکر یہ ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ قرآن سنا اور وہ اس پر فوراً ایمان لے آئے' بلکہ قرآن کو سن کر نہ صرف اس پر فوراً ایمان لے آئے بلکہ داعی بن کر اس کا پیغام اپنی قوم تک پہنچانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ دوسری طرف ہم ہیں کہ قرآن کو بار بار پڑھتے ہیں' بار بار سنتے ہیں' لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو اس نیت سے اور اس انداز سے پڑھتے یا سنتے ہی نہیں کہ وہ ہمارے دلوں میں اُترے۔ ہم تو رمضان کے قیام اللیل کے لیے بھی اس مسجد کا انتخاب کرتے ہیں جہاں کے قاری صاحب کم سے کم وقت میں ''منزل'' طے کر لیتے ہوں۔ بلکہ آج کل تو باقاعدہ اشتہارات کے ذریعے مختلف مساجد میں ایک سے بڑھ کر ایک ''پُرکشش پیکج'' پیش کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں صرف اتنے دنوں میں قرآن ختم کرا دیا جاتا ہے...... ہماری مسجد میں نماز تراویح صرف تیس منٹ میں پڑھا دی جاتی ہے' وغیرہ وغیرہ — اندازہ کیجیے! جہاں قرآن مجید کم از کم وقت میں ختم کرنے کے لیے دوڑیں لگی ہوں وہاں سمجھنے' سمجھانے کی فرصت کیسے ہوگی؟ اب ذرا اس طرزِعمل کے مقابلے میں مذکورہ جنّات کے رویّے کا تصور کریں جو ایک ہی مرتبہ قرآن مجید کو سن کر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ قرآن پر ایمان لانے کا اعلان کرنے کے بعد انہوں نے کہا:

﴿وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ②﴾ ''اور اب ہم کبھی بھی اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔''

آیت ۳ ﴿وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ③﴾ ''اور یہ کہ ہمارے ربّ کی شان بہت بلند ہے' اُس نے اپنے لیے نہ کوئی بیوی بنائی ہے اور نہ کوئی اولاد۔''

آیت ۴ ﴿وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ④﴾ ''اور یقیناً ہمارا بے وقوف (سردار) اللہ کے بارے میں خلافِ حقیقت باتیں کہتا رہا ہے۔''

اپنے ''بے وقوف'' سے ان کا اشارہ اپنے سب سے بڑے جن عزازیل (ابلیس) کی طرف ہے۔

آیت ۵ ﴿وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ⑤﴾ ''اور یہ کہ ہم تو اس گمان میں

رہے کہ جن اور انسان اللہ پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں باندھیں گے۔''

وہ بد بخت اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا رہا اور ہم اس خوش فہمی میں اس کی باتوں کو مانتے رہے کہ کوئی انسان یا جن اللہ کے بارے میں کبھی کوئی خلافِ حق بات نہیں کر سکتا۔

آیت ۶ ﴿وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝﴾ ''اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ مرد جنات میں سے کچھ مَردوں کی پناہ پکڑتے تھے' تو انہوں نے ان (جنات) کی سرکشی میں مزید اضافہ کیا۔''

عربوں کے ہاں جنات سے پناہ طلب کرنے کا رواج عام تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر جنگل اور ہر ویرانے میں جنات کا بسیرا ہوتا ہے۔ اس لیے جب ان کا کوئی قافلہ صحرا میں کہیں پڑاؤ کرتا تو قافلے کا سردار بآوازِ بلند پکارتا کہ ہم اس وادی کے سردار جن کی پناہ میں آتے ہیں۔ اب ظاہر ہے جنات تو انسانوں کی ایسی حماقتوں پر ہنستے ہوں گے کہ دیکھو! آج اسی آدمؑ کی اولاد ہمیں معبود بنائے بیٹھی ہے جسے سجدہ نہ کرنے پر ہمارے جدامجد کو جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ چنانچہ انسانوں کی ایسی حرکتوں سے جنات کے غرور اور سرکشی میں اور بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

آیت ۷ ﴿وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝﴾ ''اور یہ کہ انہوں نے بھی ایسا ہی سمجھا جیسا کہ تم نے سمجھا ہوا ہے کہ اللہ کسی کو ہرگز نہیں اٹھائے گا۔''

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی مرنے کے بعد دوبارہ نہیں اٹھائے گا' یعنی بعث بعد الموت کے عقیدے میں کوئی حقیقت نہیں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کسی کو بھی رسول بنا کر نہیں بھیجے گا۔ سورۃ الاحقاف میں جنات کے تذکرے کے حوالے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنات تورات سے واقف تھے اور وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ پچھلے چھ سو برس سے دنیا میں کوئی رسول نہیں آیا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کے درمیان تقریباً چھ سو برس کا زمانہ انسانی تاریخ میں سلسلہ رسالت کے انقطاع کا طویل ترین وقفہ ہے)۔ چنانچہ اپنی ان معلومات کی بنیاد پر جنات یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ رسالت کا دروازہ اب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے اور یہ کہ اب دنیا میں کوئی رسول نہیں آئے گا۔

آیت ۸ ﴿وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ﴾ ''اور یہ کہ ہم نے ٹٹولا آسمان کو''

ہم نے غیب کی خبروں کی ٹوہ میں آسمان کی پہنائیوں میں حسب معمول بھاگ دوڑ کی۔

﴿فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝﴾ ''تو ہم نے دیکھا کہ وہ سخت پہروں اور انگاروں سے بھرا ہوا ہے۔''

ہم نے دیکھا کہ آسمان میں اب جگہ جگہ پہرے مقرر کر دیے گئے ہیں اور شہابِ ثاقب کی قسم کے میزائل نصب کر کے حفاظتی انتظامات غیر معمولی طور پر سخت کر دیے گئے ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی کئی مرتبہ ذکر ہو چکا ہے' آگ اور نور کی کچھ خصوصیات مشترک ہونے کے باعث جنات اور فرشتوں کے مابین تخلیقی اعتبار سے کچھ نہ کچھ قربت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے جب عالم بالا سے احکام لے کر زمین کی طرف آتے ہیں تو

شیاطین جن ان سے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور احکام سے متعلق پیشگی خبریں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی خبریں وہ اپنے ان انسان ساتھیوں تک پہنچانے کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں جو دنیا میں کاہنوں اور جادوگروں کے روپ میں شرک وضلالت کی دکانیں کھولے بیٹھے ہیں۔ عام حالات میں تو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے شاید ان جنات کو ایسی خبروں تک کسی نہ کسی حد تک رسائی ہو جاتی ہو مگر نزولِ وحی کے زمانے میں انہیں حساس حدود کے قریب بھی پھٹکنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ آیات زیر مطالعہ میں اسی حوالے سے جنات کی چہ میگوئیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔

آیت ۹ ﴿وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ﴾ ''اور یہ کہ (اس سے پہلے) ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں بیٹھا کرتے تھے کچھ سن گن لینے کے لیے۔''

﴿فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ﴾ ''لیکن اب اگر کسی نے کچھ سننے کی کوشش کی''

﴿يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝﴾ ''تو وہ پائے گا اپنے واسطے ایک انگارہ گھات میں لگا ہوا۔''

آیت ۱۰ ﴿وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ ''اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے لیے کسی شر کا ارادہ کیا جا رہا ہے''

﴿اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝۱۰﴾ ''یا ان کے لیے ان کے رب نے کسی بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔''

جنات کی اس بات سے ایسے لگتا ہے جیسے وہ تورات کے عالم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب کسی قوم کی طرف کوئی رسول مبعوث ہوتا ہے تو اس کے دو امکانی نتائج میں سے ایک نتیجہ ضرور سامنے آتا ہے۔ یا تو متعلقہ قوم اپنے رسول پر ایمان لا کر ہدایت کے راستے پر چل پڑتی ہے یا اس کا انکار کر کے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی قوم پر عذاب بھیجنا چاہتا ہے تو اس قوم میں رسول مبعوث کر کے اتمام حجت ضرور کرتا ہے' جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝۱۵﴾ ''اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ کسی رسول کو نہ بھیج دیں''۔ چنانچہ آسمانوں پر غیر معمولی سخت حفاظتی انتظامات دیکھ کر جنات یہ تو سمجھ گئے کہ اہل زمین کے لیے وحی و رسالت کا سلسلہ پھر سے شروع ہو چکا ہے' لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سلسلے کا حتمی نتیجہ کیا نکلے گا۔ کیا اللہ تعالیٰ کو اپنے اس فیصلے سے انسانوں کی بھلائی مطلوب ہے یا اس نے اہل زمین کو قوم نوحؑ' قوم ہودؑ اور قوم صالحؑ کی طرح ایک مرتبہ پھر تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ان پر عذاب بھیجنے سے پہلے رسول مبعوث کر کے وہ ان لوگوں پر اتمام حجت کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے نبوت و رسالتِ محمدی ﷺ تو انسانیت کے حق میں سراسر خیر ہی خیر ہے' لیکن ان جنات کو اس وقت تک اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

آیت ۱۱ ﴿وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ۭ﴾ ''اور یہ کہ ہم میں نیک لوگ بھی ہیں اور کچھ اس سے مختلف قسم کے بھی ہیں۔''

یہاں نیک کے مقابل میں ان کا اشارہ تو ظاہر ہے سرکش اور فسادی جنات ہی کی طرف ہے' لیکن انہوں

نے ان کا ذکر ایسے الفاظ کے ساتھ نہیں کیا۔ یہ دراصل حکمت تبلیغ کا اہم اصول ہے کہ برے کو بھی برا نہ کہو۔

﴿كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾﴾ ''ہم مختلف راستوں پر پھٹے ہوئے تھے۔''

طَرَائِق جمع ہے طَرِيْقَة کی اور قِدَد جمع ہے قِدَّةٌ کی' یعنی مختلف الرائے فرقے۔ قَدَّ يَقُدُّ قَدًّا کے معنی پھاڑنے یا کاٹنے کے ہیں۔ جیسے سورۂ یوسف کی آیت ۲۵ میں آیا ہے: ﴿قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ﴾ ''اُس (عورت) نے پھاڑ دی آپ کی قمیص پیچھے سے۔''

آیت ۱۲ ﴿وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾﴾ ''اور یہ کہ ہمیں یقین ہوگیا تھا کہ ہم زمین میں اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ بھاگ کر اُسے ہرا سکتے ہیں۔''

آیت ۱۳ ﴿وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ﴾ ''اور یہ کہ ہم نے جونہی اس ہدایت (الھدیٰ) کو سنا ہم اس پر ایمان لے آئے۔''

﴿فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾﴾ ''تو جو کوئی بھی ایمان لائے گا اپنے رب پر اسے نہ تو کسی نقصان کا خوف ہوگا اور نہ زیادتی کا۔''

اللہ تعالیٰ ہر کسی کے نیک اعمال کا پورا پورا اجر دے گا' کسی کے ساتھ کوئی زیادتی یا حق تلفی کا معاملہ نہیں ہوگا۔

آیت ۱۴ ﴿وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ﴾ ''اور یہ کہ ہم میں فرمانبردار بھی ہیں اور بے انصافی کرنے والے بھی۔''

قَسَطَ (ثلاثی مجرد میں) عدل اور ناانصافی دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور قَاسِط (اسم فاعل) کے معنی ''ناانصاف'' کے ہوتے ہیں' لیکن اَقْسَطَ (باب افعال میں) صرف عدل وانصاف کے معنی میں مستعمل ہے۔

﴿فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾﴾ ''تو جن لوگوں نے اطاعت قبول کر لی تو انہوں نے ڈھونڈ نکالی نیکی کی راہ۔''

آیت ۱۵ ﴿وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾﴾ ''اور جو بے انصاف ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن بن کر رہیں گے۔''

یہ تو تھا جنات کی اس تقریر کا اقتباس جو انہوں نے قرآن سننے کے بعد اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے تبلیغ کی غرض سے کی تھی۔ اس کے بعد خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام کیا گیا ہے۔

آیات ۱۶ تا ۲۸

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَمَنْ يُّعْرِضْ
عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ وَّاَنَّهٗ
لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ ع

اَحَدًا۝ قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا۝ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ۬
وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۝ۙ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا۝ؕ حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ
اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا۝ قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ
اَمَدًا۝ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا۝ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ
یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا۝ۙ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ
ع بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا۝

آیت ۱۶ ﴿وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَی الطَّرِیْقَةِ لَاَسْقَیْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا۝﴾ ''اور (اے نبی ﷺ! آپ کہیے کہ مجھ پر یہ وحی بھی کی گئی ہے) کہ اگر یہ لوگ درست طریقے پر چلتے رہتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے۔''

یعنی اگر نسل انسانی کے لوگ انبیاء ورسل ؑ کے راستے پر چلتے رہتے تو آخرت کی نجات کے ساتھ ساتھ ہم انہیں دنیا میں بھی خوب نوازتے۔ یہاں پر جس مفہوم میں لفظ ''طَرِیْقَة'' آیا ہے عین وہی مفہوم لفظ ''شَرِیْعَة'' اس آیت میں ادا کر رہا ہے: ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ﴾ (الجاثیۃ:۱۸) ''پھر (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو قائم کر دیا دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر''۔ گویا ان دونوں الفاظ کا مفہوم تو ایک ہی ہے لیکن ہمارے ہاں عام طور پر لفظ ''شریعت'' دین کے ظاہری اور قانونی پہلو کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ ''طریقت'' سے دین کا باطنی پہلو مراد لیا جاتا ہے۔ مثلاً نماز کے فرائض اور واجبات کیا ہیں؟ مختلف ارکان کی ادائیگی کا درست طریقہ کیا ہے؟ کن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے؟ یہ شریعت کا موضوع ہے۔ ظاہر ہے ایسے مسائل معلوم کرنے کے لیے آپ کو کسی فقیہ یا مفتی سے رجوع کرنا ہوگا۔ لیکن نماز کی اصل روح کیا ہے؟ نماز میں خشوع وخضوع اور حضورِ قلب کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اور اس کے اثرات کیا ہیں؟ اس قسم کے سوالات طریقت سے متعلق ہیں اور ان کے جوابات آپ کو کسی صوفی سے ملیں گے۔ اوّلین اَدوار کے بزرگانِ دین تو جامع الصفات تھے۔ جو صوفی تھے وہ بہت بڑے عالم اور مفتی بھی ہوا کرتے تھے۔ برصغیر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ ایسی ہی ایک جامع شخصیت تھے۔ آپ مفتی، مفسر اور محدث بھی تھے اور بہت بڑے صوفی اور مرشد بھی۔ آپ مرزا مظہر جانِ جاناں شہید ؒ (آپ اہل تشیع کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے) کے خلیفہ تھے۔ آپ کا تعلق شیخ احمد سرہندی ؒ کے سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ سے تھا۔ بہرحال ایسی شخصیات کی موجودگی میں تو شریعت اور طریقت کے درمیان کوئی بُعد نہیں تھا، لیکن آج بدقسمتی سے دین کے ان دونوں پہلوؤں کو پھاڑ کر بالکل الگ الگ کر دیا گیا ہے۔

آیت ۱۷ ﴿لِّنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ﴾ ''تاکہ ہم اس (فراوانی) میں ان کی آزمائش کریں۔''

یعنی ہم لوگوں کو خوب سیراب کر کے اور انہیں مختلف النوع نعمتوں سے نواز کر ان کا امتحان لیتے ہیں۔

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی آزمائش کے انداز مختلف ہیں' وہ کسی کو تونگری اور خوشحالی میں آزماتا ہے تو کسی کو فاقوں میں مبتلا کر کے اس کا امتحان لیتا ہے۔

﴿وَمَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ﴾ ''اور جو کوئی بھی اعراض کرے گا اپنے رب کے ذکر سے''

﴿یَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿١٧﴾﴾ ''تو وہ ڈال دے گا اس کو چڑھتے عذاب میں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ایسے عذاب میں ڈالے گا جس کی شدت ہر لمحہ بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

آیت ۱۸ ﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ﴾ ''اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں''

یہاں ''مساجد'' سے مراد سجدہ کرنے کی جگہیں یعنی عبادت گاہیں بھی ہیں اور سجدے کے اعضاء (پیشانی' ناک' ہاتھ' پاؤں' گھٹنے) بھی۔ یعنی تمام مساجد اور انسانوں کے اعضائے سجدہ سب اللہ کی ملکیت ہیں۔

﴿فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿١٨﴾﴾ ''تو تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو!''

آیت ۱۹ ﴿وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ﴾ ''اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے''

﴿كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا ﴿١٩﴾﴾ ''تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس پر ہجوم کر کے آ جائیں گے۔''

اللہ کے بندے سے مراد یہاں رسول اللہ ﷺ ہیں۔ جب آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور اس میں قرآن کی تلاوت فرماتے تو مشرکین یہ کلام سننے کے لیے آپ ﷺ کے گرد بڑے تجسس سے جمع ہو جاتے تھے' لیکن ایمان لانے کو تیار نہیں تھے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین آپ ﷺ کو نماز میں کھڑا دیکھتے تو ان کے عناد کی آگ بھڑکنے لگتی اور ان کا جی چاہتا کہ آپ ﷺ پر ہلہ بول دیں اور اس شمع ہدایت کو گُل کر دیں۔

آیت ۲۰ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں''

﴿وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٠﴾﴾ ''اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔''

آیت ۲۱ ﴿قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿٢١﴾﴾ ''آپؐ کہہ دیجیے کہ مجھے کوئی اختیار نہیں تمہارے لیے کسی نقصان کا اور نہ راہ پر لانے کا۔''

سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے' میں خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتا۔ اس حوالے سے سورۃ القصص کی یہ آیت بہت واضح ہے: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ﴾ (آیت ۵۶) ''آپؐ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو چاہیں' بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

آیت ۲۲ ﴿قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ﴾ ''آپؐ کہہ دیجیے کہ مجھے اللہ (کی پکڑ) سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا''

﴿وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾﴾ ''اور نہ ہی میں اس کے علاوہ سر چھپانے کی کوئی جگہ پاؤں گا۔''

آیت ۲۳ ﴿اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ﴾ ''بس (میرا فرض) اللہ کی طرف سے تبلیغ اور اس کے

پیغامات کا پہنچا دینا ہے۔‘‘

یعنی اگر میں نے یہ فریضہ انجام دینے میں کوتاہی کی تو میری جواب دہی ہوگی۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف کی اس آیت میں اپنا قانون واضح طور پر بیان فرما دیا ہے: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾ ’’پس ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف ہم نے رسولوں کو بھیجا اور لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔‘‘

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ’’اور جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کرے گا‘‘

﴿فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝۲۳﴾ ’’تو اُس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہے گا۔‘‘

آیت ۲۴ ﴿حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ﴾ ’’یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے وہ چیز جس کی انہیں دھمکی دی جا رہی ہے‘‘

﴿فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ۝۲۴﴾ ’’اُس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون کمزور ہے مددگاروں کے اعتبار سے اور کون اقلیت میں ہے تعداد کے لحاظ سے۔‘‘

سردارانِ قریش کے طعنوں میں سے حضور ﷺ کے لیے ایک طعنہ یہ بھی تھا کہ آپؐ کی محفل کے مقابلے میں ہماری محفلیں زیادہ باوقار اور پُررونق ہوتی ہیں۔ آپؐ تو نچلے طبقے کے چند غریب، کمزور اور نادار افراد کو لے کر بیٹھے ہوتے ہیں جبکہ ہماری محفلوں میں بڑے بڑے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے اس طعنے کا جواب دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اپنے حمایتیوں کی طاقت اور تعداد کے لحاظ سے کس کی کیا حیثیت ہے۔ سورۂ مریم میں یہ مضمون زیادہ واضح انداز میں آیا ہے۔

آیت ۲۵ ﴿قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ۝۲۵﴾ ’’آپؐ یہ بھی کہہ دیجیے کہ مجھے معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکی ہے یا میرا رب اس کی مدت اور لمبی کر دے گا۔‘‘

مَا تُوْعَدُوْنَ کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ وہ چیز جس کی تم لوگوں کو وعید یا دھمکی دی جا رہی ہے۔ وعدہ اور وعید دونوں الفاظ ایک ہی مادہ (وعد) سے مشتق ہیں۔ اس لحاظ سے وعید (دھمکی) کی حیثیت بھی گویا ایک وعدے کی سی ہے۔ اس آیت کا مضمون ملتے جلتے الفاظ میں سورۃ الانبیاء کی اس آیت میں بھی آ چکا ہے: ﴿وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۝۱۰۹﴾ کہ اے نبی (ﷺ) آپ انہیں بتا دیں کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکی ہے یا ابھی دور ہے۔

آیت ۲۶ ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ﴾ ’’وہی ہے غیب کا جاننے والا‘‘

﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۶﴾ ’’پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔‘‘

آیت ۲۷ ﴿اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ ''سوائے اُس کے جس کو اُس نے پسند فرما لیا ہو اپنے رسولوں میں سے''

اس آیت میں علم غیب کے بارے میں بہت اہم اصول بتا دیا گیا ہے۔ یعنی غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہ اپنے رسولوںؑ میں سے جسے چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے اس بارے میں مطلع فرماتا ہے۔ اس اصول کے تحت دیکھا جائے تو حضورﷺ کی ذات سے متعلق علم غیب کا مسئلہ خواہ مخواہ متنازعہ بنا دیا گیا ہے۔ اگر تو کوئی شخص علم غیب سے مراد ایسا علم لیتا ہے جو بغیر کسی کے بتائے ہوئے حاصل ہو تو ایسا کوئی علم اللہ کی مخلوق میں سے کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہر کسی کو جو بھی علم ملا ہے کسی نہ کسی کے سکھانے سے ہی ملا ہے۔ حضورﷺ کا علم بھی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ حضرت جبرائیلؑ کو بھی علم اللہ تعالیٰ نے ہی عطا کیا ہے۔ ہم جیسے عام انسان بھی اپنے والدین' اساتذہ اور بڑوں سے ہی سیکھتے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے علم غیب کی درست تعریف (definition) طے کرنا ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ ''غیب'' کا تعلق مخلوق سے ہے' اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی چیز ''غیب'' ہے ہی نہیں' ہر شے ہر آن اُس کے سامنے موجود ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں یا خبریں ہم انسانوں سے پوشیدہ رکھی ہیں وہ ہمارے لیے ''عالم غیب'' ہے۔ مثلاً جنت' دوزخ' فرشتے وغیرہ۔ اس بارے میں بھی کسی کو کوئی اختلاف نہیں کہ انبیاء و رسل ؈ کو غیب کی خبریں بھی دی جاتی ہیں اور کسی حد تک انہیں عالم غیب کا مشاہدہ بھی کرایا جاتا ہے:
﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝﴾ (الانعام) ''اور اسی طرح ہم دکھاتے رہے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت تاکہ وہ پوری طرح یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے''۔ حضورﷺ کو معراج کے موقع پر جنت' دوزخ اور بہت سی دوسری کیفیات کا مشاہدہ کرایا گیا' بلکہ غیب سے متعلق ایسے مشاہدات آپؐ کو عام معمول کی زندگی میں بھی کرائے جاتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ آپؐ نمازِ استسقاء پڑھا رہے تھے تو نماز کے دوران آپؐ اچانک ایک دفعہ آگے بڑھے اور پھر اسی انداز میں پیچھے ہٹے۔ بعد میں صحابہ کرام ؓ نے آپؐ کے اس عمل کا سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میرے سامنے اچانک جنت لے آئی گئی تو میں نے چاہا کہ اس کا پھل توڑ لوں۔ چنانچہ میرا ہاتھ بے اختیار اس کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے بعد میرے سامنے دوزخ لے آئی گئی تو اس کی تپش کی وجہ سے میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ بہرحال علم کے اعتبار سے ایک عام انسان اور ایک نبی میں بنیادی طور پر یہی فرق ہے کہ نبی کو عالم غیب کا علم بھی دیا جاتا ہے۔ ورنہ جہاں تک امورِ دنیا کے علم کا تعلق ہے اس بارے میں حضورﷺ کا واضح فرمان موجود ہے۔ ایک موقع پر آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْيَاكُمْ))(۱) کہ دنیاداری کے اپنے معاملات کے بارے میں تم لوگ بہتر جانتے ہو۔ چنانچہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل ؈ کو جب چاہے جس قدر چاہے عالم غیب کا مشاہدہ کرا دے یا غیب کے علم میں سے جتنا علم چاہے عطا فرما دے۔ البتہ جو کوئی یہ مانے کہ نبی مکرمﷺ کو کُل غیب کا علم تھا وہ کافر ہے۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب وجوب امتثال ماقالہ شرعًا...... ح:۲۳۶۳' عن انس ابن مالک ؓ۔

حضورﷺ کے علم غیب کے بارے میں بریلوی مکتبہ فکر کے علماء کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ذاتی طور پر متعدد بریلوی علماء سے ملاقاتیں کیں۔ میں جتنے علماء سے ملا ان سب کو میں نے مندرجہ ذیل تین نکات پر متفق پایا:

(۱) حضورﷺ کا علم ذاتی نہیں' عطائی ہے' یعنی اللہ کا عطا کردہ ہے۔

(۲) آپؐ کا علم قدیم نہیں حادث ہے۔ یعنی پہلے نہیں تھا' جب اللہ نے عطا کیا تو آپؐ کو علم ہو گیا۔

(۳) آپﷺ کا علم لامحدود نہیں' محدود ہے۔

دراصل ان تین نکات کے بارے میں مسلمانوں کے کسی مکتبہ فکر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ سرے سے بحث طلب ہے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیﷺ کو علم غیب عطا فرمایا' جب چاہا اور جتنا چاہا عطا فرمایا۔ اب کیا میں اور آپ اس بارے میں بحث کریں گے کہ حضورﷺ کو کس چیز کا علم تھا اور کس چیز کا علم نہیں تھا؟ میری اور آپ کی حیثیت ہی کیا ہے کہ ہم حضورﷺ کے علم کے بارے میں ناپ تول کریں۔ معاذ اللہ!

﴿فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿٢٧﴾﴾ ''تو اُس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے۔''

یعنی جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے غیب کے حقائق کا علم رسول کے پاس بھیجتا ہے تو اس کی حفاظت کے لیے ہر طرف فرشتے مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ علم نہایت محفوظ طریقے سے رسول تک پہنچ جائے۔

آیت ۲۸ ﴿لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ﴾ ''تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے واقعتاً اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں''

یعنی اللہ تعالیٰ یہ بات واضح کر دے۔ اسی حوالے سے اتمامِ حجت کے لیے حضورﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر حاضرین سے پوچھا تھا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) ''کیا میں نے اللہ کا پیغام تم لوگوں تک پہنچا دیا؟'' اس پر تمام حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا تھا: نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ (۱)

﴿وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾﴾ ''اور وہ احاطہ کیے ہوئے ہے اس سب کچھ کا جو اُن کے پاس ہے اور اُس نے ہر چیز کا حساب کتاب رکھا ہوا ہے گنتی کے ساتھ۔''

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبیﷺ' ح:۱۲۱۸۔

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّل

سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے' بلکہ اس سے آگے سورۃ الناس تک تمام (۴۰) سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے آغاز کی آیات لفظی اور معنوی اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

آیات ۱ تا ۱۹

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ
الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ
قِيْلًا ۝۶ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸ رَبُّ
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝۹ وَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا
جَمِيْلًا ۝۱۰ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝۱۱ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝۱۲
وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۳ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا
مَّهِيْلًا ۝۱۴ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۥ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝۱۵
فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ۝۱۶ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ
الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۝۱۷ السَّمَاۗءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۝۱۸ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَاۗءَ ع ۱۹/۱۲
اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝۱۹

آیت ۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱﴾ ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)!''

فداہ آباؤنا وامھاتنا۔

آیت ۲ ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲﴾ ''آپ کھڑے رہا کریں رات کو (نماز میں) سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔''

آیت ۳ ﴿نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳﴾ ''(یعنی) اس کا آدھا یا اس سے تھوڑا کم کر لیجیے۔''

یعنی آپ اللہ تعالیٰ کے حضور آدھی رات یا ایک تہائی رات کا قیام کریں۔

آیت ۴ ﴿اَوْ زِدْ عَلَيْهِ﴾ ''یا اس پر تھوڑا بڑھا لیں''
یا پھر رات کا دو تہائی حصہ قیام میں گزاریں۔ گویا آپ ﷺ کے قیام اللیل کا دورانیہ یا نصاب ایک تہائی رات سے لے کر دو تہائی رات تک ہونا چاہیے۔ اس نصاب میں ہمارے لیے رمضان کے قیام اللیل کے حوالے سے بھی راہنمائی موجود ہے۔ رمضان کی راتوں کے قیام کے بارے میں حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ' وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ' وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (۱)

''جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے' اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ' اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے' اور جو لیلۃ القدر میں کھڑا رہا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کی بھی سابقہ تمام خطائیں بخش دی گئیں!''

اب ظاہر ہے ''قیام اللیل'' کی اصطلاح کا اطلاق رات کے ایک بڑے حصے کے قیام پر ہی ہوسکتا ہے۔ گھنٹے بھر میں جیسے تیسے بیس رکعتیں پڑھ کر سو جانے کو تو قیام اللیل نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ بیس رکعتوں کا نصاب تو اصل میں ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے سارا دن محنت و مشقت میں گزارنا ہے۔ ایسے لوگوں کی مجبوری کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت عمر فاروق ؓ نے ان کے لیے قیام اللیل کا ایک کم سے کم معیار مقرر فرما دیا تھا۔ البتہ جن لوگوں کے حالات موافق ہوں انہیں رمضان المبارک میں بہرصورت زیر مطالعہ آیات کے مفہوم و مدعا کے مطابق قیام اللیل کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی طرح وہ حضرات جو اپنی ملازمت وغیرہ سے ایک ماہ کی رخصت لے سکتے ہوں انہیں بھی چاہیے کہ وہ اپنی سالانہ چھٹیاں سیر سپاٹوں پر ضائع کرنے کے بجائے رمضان کے لیے بچا کر رکھا کریں' تاکہ قیام اللیل کی برکتوں سے کما حقہ مستفید ہوسکیں۔

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾﴾ ''اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے جایئے۔''
تَرْتِیْل کے معنی قرآن مجید کو خوب ٹھہر ٹھہر کر اور سمجھ کر پڑھنے کے ہیں۔ گویا قیام اللیل کا اصل لازمہ قرآن مجید کی تلاوت ہے اور وہ بھی ترتیل کے ساتھ۔ واضح رہے کہ حضور ﷺ کو یہ حکم نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں دے دیا گیا تھا۔ بعد میں جب باقاعدہ پانچ نمازیں فرض ہوگئیں تو قیام اللیل کو مختصر کر کے تہجد کی شکل دے دی گئی' لیکن اس میں بھی قرآن کی تلاوت پر زور دیا گیا: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ (بنی اسرائیل: ۷۹) یعنی تہجد بھی قرآن کے ساتھ (بِهٖ) ادا کریں۔ تہجد کا حق یوں ادا نہیں ہوتا کہ چند مختصر سورتوں کے ساتھ آٹھ رکعتیں ادا کیں اور پھر بیٹھ کر دوسرے اذکار میں مشغول ہوگئے۔ بہرحال جسے اللہ تعالیٰ نے تہجد کی توفیق دی ہو اس کے لیے

(۱) صحیح البخاری' کتاب صلاۃ التراویح' باب فضل لیلۃ القدر۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فی قیام رمضان وھو التراویح۔

لازم ہے کہ وہ اتنا قرآن ضرور یاد کرے جس سے تہجد کا کچھ نہ کچھ حق ادا ہو سکے۔

آیت ۵ ﴿اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ۝۵﴾ ''ہم عنقریب آپؐ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔''

اس سے مراد رسالت (انذار و تبلیغ) کی ذمہ داری ہے' جس کے بارے میں پہلا حکم سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات میں آیا تھا۔ واضح رہے کہ سورۃ المزمل کی زیر مطالعہ آیات (غالباً ابتدائی نو آیات) تیسری وحی کی صورت میں نازل ہوئیں' جبکہ اس کے بعد نازل ہونے والی چوتھی وحی سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات پر مشتمل تھی۔

اس آیت میں حضورﷺ کو اس عظیم ذمہ داری کے بارے میں بتایا جا رہا ہے جس کا بوجھ عنقریب آپؐ کے کندھوں پر پڑنے والا تھا۔ اخلاق و کردار کے اعتبار سے تو حضورﷺ پہلے ہی انسانیت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے' لیکن اب رسالت کی کٹھن ذمہ داریوں کے حوالے سے آپؐ کو مزید ریاضت کرنے کی ہدایت کی گئی کہ اب آپؐ رات کا بیشتر حصہ اپنے رب کے حضور کھڑے ہو کر قرآن مجید پڑھنے میں گزارا کریں اور اس طرح قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر جذب کریں۔

آیت ۶ ﴿اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیۡلِ ہِیَ اَشَدُّ وَطۡاً﴾ ''یقیناً رات کا جاگنا بہت مؤثر ہے نفس کو زیر کرنے کے لیے''

﴿وَّ اَقۡوَمُ قِیۡلًا ۝۶﴾ ''اور بات کو زیادہ درست رکھنے والا ہے۔''

یہ نہایت سکون و اطمینان کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت بندے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔

آیت ۷ ﴿اِنَّ لَکَ فِی النَّہَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا ۝۷﴾ ''یقیناً دن کے اوقات میں تو آپؐ کے لیے بڑی مصروفیات ہیں۔''

دن کے اوقات میں تو آپؐ کو بہت سی دوسری مصروفیات کا سامنا ہوتا ہے۔ دعوت کے سلسلے میں طرح طرح کے لوگوں سے ملنا اور ان کی کڑوی کسیلی باتیں سننا بذاتِ خود ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ ان مصروفیات میں آپؐ کی توجہ بٹی رہتی ہے۔ لیکن رات کی تنہائیوں میں تو بس آپؐ ہیں اور آپؐ کا رب ہے۔ اس وقت آپؐ پوری توجہ اور دلجمعی سے اپنے رب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

آیت ۸ ﴿وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلۡ اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا ۝۸﴾ ''اور آپؐ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کریں اور ہر طرف سے کٹ کر بس اُسی کے ہو رہیں۔''

تبتّل کا معروف مفہوم تو یہی ہے کہ سب سے کٹ کر کسی ایک کا ہو جانا' لیکن عملی طور پر اس حکم کے ذریعے ایک بندۂ مؤمن سے ''بے ہمہ و باہمہ'' کی کیفیت مطلوب ہے۔ یعنی رشتوں اور تعلقات کے ہجوم میں بظاہر سب کے ساتھ نظر آؤ' لیکن حقیقت میں تمہارا تعلق کسی کے ساتھ بھی نہ ہو۔ جیسے قیامت کے دن ہر انسان کو انفرادی حیثیت سے اللہ کے حضور کھڑے ہونا ہو گا۔ اس وقت ماں باپ' اولاد' بیوی' شوہر کوئی بھی ساتھ نہیں ہو گا۔ بہرحال ایک بندۂ مؤمن کو فریضہ دعوت و تبلیغ کی ادائیگی کے لیے بظاہر تو معاشرے میں رہنا ہے اور خود سے متعلقہ لوگوں کے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہے' لیکن باطنی طور پر اسے تمام لوگوں سے ذہنی و قلبی رشتے' دوستیاں' امیدیں اور توقعات توڑ کر صرف اللہ تعالیٰ سے رشتہ استوار کرنا چاہیے۔ یہ ہے وَتَبَتَّلۡ اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا کے حکم کا اصل مدعا۔

آیت ۹ ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ ''وہ رب ہے مشرق کا بھی اور مغرب کا بھی''

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝۹﴾ ''اس کے سوا کوئی معبود نہیں' بس آپ اسی کو بنا لیجیے اپنا کارساز۔''

آیت ۱۰ ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ ''اور جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجیے''

﴿وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝۱۰﴾ ''اور ان کو چھوڑ دیجیے بڑی خوبصورتی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے۔''

یہ لوگ آپ کے لیے شاعر' جادوگر اور مجنون جیسے نام رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال آپ کے لیے بلاشبہ نہایت تکلیف دہ ہے' لیکن آپ ان لوگوں کی باتوں پر صبر کریں اور خوبصورت انداز میں ان کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔ سورۃ الفرقان میں اللہ کے نیک بندوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝۶۳﴾ کہ جب جاہل لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے گزر جاتے ہیں۔

دعوت و تبلیغ کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے اس حکمت عملی کو اپنانا بہت ضروری ہے۔ ظاہر ہے انسان کے حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ ہوسکتا ہے آج جن لوگوں کو آپ کی دعوت سے چڑ ہے کل انہیں آپ کی یہی باتیں اچھی لگنے لگیں۔ اس لیے لوگوں سے دوبارہ بات کرنے کا راستہ کھلا رکھنا ضروری ہے۔ یہ آیات نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھیں۔ اگلے بارہ سال کے دوران مکہ کے حالات نے ابھی کئی نشیب و فراز دیکھنے تھے۔ اس لیے حضور ﷺ کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ اہل مکہ کی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے آپ ان کو نظر انداز تو کریں' لیکن تعلقات میں اس قدر تلخی نہ آنے دیں کہ دوبارہ انہیں دعوت دینا ممکن نہ رہے۔

آیت ۱۱ ﴿وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ﴾ ''آپ مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو چھوڑ دیں' جو بڑی نعمتوں سے نوازے گئے ہیں''

ان کو مال و اولاد' بڑی بڑی جائیدادیں اور طرح طرح کی دوسری نعمتیں بھی میں نے ہی عطا کی ہیں اور اب ان کی سرکشی کا مزہ بھی انہیں میں ہی چکھاؤں گا' لہٰذا ان کا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ نوٹ کیجیے ابتدائی دور کی ان سورتوں میں ذَرْنِيْ اور ذَرْهُمْ کے صیغے بار بار آ رہے ہیں۔

﴿وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝۱۱﴾ ''اور ابھی آپ انہیں تھوڑی سی مہلت دیں۔''

قبل ازیں ہم سورۂ مریم میں اس سے ملتا جلتا یہ حکم بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۝۸۴﴾ ''تو آپ ان کے خلاف (فیصلے کے لیے) جلدی نہ کیجیے۔ ہم ان کی پوری پوری گنتی کر رہے ہیں''۔ سورۃ الطارق کی اس آیت میں بھی بالکل یہی مضمون بیان ہوا ہے: ﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝۱۷﴾ ''تو آپ کافروں کو مہلت دیں' بس تھوڑی سی مزید مہلت۔''

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝۱۲﴾ ''ہمارے پاس ان کے لیے بھاری بیڑیاں اور بھڑکتی آگ ہے۔''

آیت ۱۳ ﴿وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ﴾ ''اور وہ کھانا جو حلق میں اَٹک جائے گا''

اس سے مراد ''زقوم'' ہے جس کا ذکر قرآن میں متعدد بار ہوا ہے۔ (اس کی تفصیل سورۃ الواقعۃ' آیت ۵۲ کے ضمن میں دیکھی جا سکتی ہے۔)

﴿وَّعَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۳﴾﴾ ''اور دردناک عذاب ہے۔''

یعنی یہ لوگ جہنم کا ایندھن بننے اور اس کے دردناک عذابوں کا مزہ چکھنے کے لیے کشاں کشاں اس کی طرف جا رہے ہیں، لیکن ابھی ہم کچھ دیر کے لیے انہیں مہلت دینا چاہتے ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَکَانَتِ الْجِبَالُ کَثِیْبًا مَّهِیْلًا ﴿۱۴﴾﴾ ''جس دن کہ زمین اور پہاڑ لرزنے لگیں گے اور پہاڑ ریت کے بکھرتے تودے بن جائیں گے۔''

کوہ ہمالیہ جیسے بڑے بڑے پہاڑ اس دن ریزہ ریزہ ہو کر ریت کے ٹیلوں (sand dunes) کی طرح ہو جائیں گے۔ پھر ان ٹیلوں کے پھسلنے اور بکھرنے کے باعث زمین کے تمام نشیب و فراز برابر ہو جائیں گے۔ اس طرح کہ: ﴿لَا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾﴾ (طٰہٰ) ''آپ نہ تو اس میں کوئی ٹیڑھ دیکھیں گے اور نہ کوئی ٹیلا۔''

آیت ۱۵ ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا ۬ شَاهِدًا عَلَیْکُمْ﴾ ''(اے لوگو!) ہم نے تمہاری طرف ایک رسولؐ بھیج دیا ہے تم پر گواہ بنا کر۔''

ہمارا یہ رسولؐ دنیا میں تمہارے سامنے اپنے قول و عمل سے حق کی گواہی دے گا اور قیامت کے دن تمہارے خلاف گواہی دے گا' کہ اے اللہ! میں نے تو تیرا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا' اب اس حوالے سے یہ لوگ خود جواب دہ ہیں۔

﴿کَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾﴾ ''جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا فرعون کی طرف بھی ایک رسول۔''

اسی طرح اس سے پہلے ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رسول کی حیثیت سے فرعون کے پاس بھیجا تھا۔

آیت ۱۶ ﴿فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ﴾ ''پس فرعون نے نافرمانی کی ہمارے رسولؑ کی''

﴿فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلًا ﴿۱۶﴾﴾ ''تو ہم نے پکڑ لیا اس کو بڑے وبال والی پکڑ۔''

اب تم خود ہی سوچو کہ اللہ کے رسولؑ کو جھٹلا کر اگر فرعون جیسا مطلق العنان بادشاہ نہیں بچ پایا تھا اور اسی جرم کی پاداش میں اگر عاد و ثمود جیسی طاقتور قوموں کو نیست و نابود کر دیا گیا تھا تو تم لوگ اللہ کے رسولؐ کو جھٹلا کر کیسے بچے رہو گے!

آیت ۱۷ ﴿فَکَیْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ کَفَرْتُمْ یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا﴾ ''اب اگر تم کفر کرو گے تو تم کیسے بچ جاؤ گے اس دن' جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا''

قیامت کا دن اللہ کے نافرمانوں کے لیے بہت سخت ہوگا۔

آیت ۱۸ ﴿ۣالسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ کَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾﴾ ''آسمان اس سے پھٹ پڑنے والا ہے' اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔''

قیامت اس کائنات پر کہیں باہر سے نہیں آئے گی' وہ اس وقت بھی اس کے اندر موجود ہے' جیسے کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا ہے: ﴿ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (آیت ۱۸۷) کہ وہ آسمان و زمین پر بہت بھاری ہے۔

چنانچہ قیامت کا ''بھاری پن'' کائنات کے لیے ناقابلِ برداشت ہوا جا رہا ہے اور اب اس کے ظہور سے متعلق اللہ کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا ہی چاہتا ہے۔

آیت ۱۹ ﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ﴾ ''یقیناً یہ ایک یاددہانی ہے۔''

﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ⑲﴾ ''تو جو کوئی بھی چاہے وہ اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کر لے۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو قرآن مجید کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔ آمین!

آیت ۲۰

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑳ ع

یہ رکوع صرف ایک آیت پر مشتمل ہے۔ اس آیت کے زمانہ نزول کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں ان میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوئی روایت بتاتی ہے کہ یہ آیت اس سورت کے پہلے حصے کے نزول کے آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی اور اس سے قیام اللیل کا پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ کچھ روایات میں یہ مدت ایک سال اور کچھ میں ۱۶ ماہ بتائی گئی ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ آیت مدنی ہے اور پہلی آیات کے گیارہ سال بعد نازل ہوئی۔ اس آیت کو سمجھنے اور اس سے متعلق روایات میں پائے جانے والے غیر معمولی اختلاف کی وجہ جاننے کے لیے میں ایک عرصہ تک پریشان رہا۔ اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ اس حوالے سے کسی تفسیر سے بھی مجھے کوئی واضح راہنمائی نہ مل سکی۔ پھر کسی زمانے میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' کا مطالعہ کرتے ہوئے اتفاقاً مجھے اس بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا یہ قول مل گیا کہ یہ ایک نہیں دو آیات ہیں۔ چنانچہ اس قول کی روشنی میں اس نکتے پر میرا دل مطمئن ہو گیا کہ اس کلام کا نزول تو دو حصوں میں' دو الگ الگ مواقع پر ہوا' لیکن حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق اسے ایک آیت شمار کیا گیا۔

آیت ۲۰ ﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یقیناً آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ قیام کرتے ہیں کبھی دو تہائی رات کے قریب' کبھی نصف رات اور کبھی

ایک تہائی رات''

﴿وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ﴾ ''اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں ان میں سے بھی ایک جماعت آپ کے ساتھ (کھڑی) ہوتی ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ﴾ ''اور اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے۔''

رات دن کے اوقات بھی اللہ نے بنائے ہیں اور انسانوں کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے' اس لیے وہ اپنے بندوں کی استعداد سے خوب واقف ہے۔

﴿عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ﴾ ''اللہ جانتا ہے کہ تم اس کی پابندی نہیں کر سکو گے''

یعنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس انداز سے یہ مشقت زیادہ عرصے تک نہیں جھیلی جا سکتی۔

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو اُس نے تم پر مہربانی فرمائی ہے''

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ﴾ ''تو اب قرآن سے جتنا بآسانی پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مذکورہ قول کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ اس آیت کا یہ حصہ پہلی آیات کے گیارہ ماہ یا ایک سال بعد نازل ہوا۔ اس حکم کے ذریعے دو تہائی یا نصف یا ایک تہائی رات تک قیام کرنے کی پابندی ختم کر دی گئی اور یہ سہولت دے دی گئی کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق قیام اللیل میں جتنا ممکن ہو اتنا قرآن پڑھ لیا کرے۔ البتہ آیت کا دوسرا (درج ذیل) حصہ جس میں قتال کا ذکر ہے' اس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہجرت سے متصلاً قبل یا ہجرت کے متصلاً بعد نازل ہوا۔ چنانچہ گیارہ سال کے وقفے والی روایت اس حصے سے متعلق ہے۔

﴿عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ﴾ ''اللہ کے علم میں ہے کہ تم میں کچھ لوگ مریض ہوں گے''

﴿وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ﴾ ''اور بعض دوسرے زمین میں سفر کریں گے اللہ کے فضل کو تلاش کرتے ہوں گے''

﴿وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ﴾ ''اور کچھ اللہ کی راہ میں قتال کر رہے ہوں گے''

اب ظاہر ہے ایسے لوگوں کے لیے رات کو طویل قیام کرنا ممکن نہیں۔

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ﴾ ''چنانچہ جس قدر تمہارے لیے آسان ہو اس میں سے پڑھ لیا کرو''

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

اب اس حکم میں نماز پنجگانہ کی تاکید ہے اور نماز پنجگانہ ظاہر ہے ۱۰ نبوی میں معراج کے موقع پر فرض ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے بھی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ آیت کا یہ حصہ ۱۰ نبوی کے بعد ہجرت سے پہلے یا ہجرت کے فوراً بعد نازل ہوا۔ اس حکم میں پانچ نمازوں کو قیام اللیل کا بدل قرار دے دیا گیا' البتہ رمضان میں قیام اللیل کا معاملہ اس سے مستثنیٰ رہا۔ رمضان چونکہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾

(البقرۃ:۱۸۵) ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا'' چنانچہ قرآن سے تعلق کی تجدید کے لیے اس مہینے میں قیام اللیل کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے رمضان کی آمد پر حضور ﷺ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے' جس میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا))(۱) ''اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہِ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نمازِ تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے)''۔ یعنی رمضان کے روزے تو اہلِ ایمان پر فرض کر دیے گئے کہ اہلِ ثروت' نادار' مزدور' کسان وغیرہ سبھی روزہ رکھیں اور بھوک پیاس کی سختیاں برداشت کرنے کے عادی بن کر خود کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رکھیں۔ جبکہ رمضان کی راتوں کے قیام کے لیے اختیار دے دیا گیا کہ جو کوئی اس کا اہتمام کر سکتا ہو وہ ضرور اس کی برکتوں سے مستفیض ہو۔ بعد میں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسے اجتماعی شکل دے دی گی۔ چنانچہ اجتماعی قیام اللیل کا وہ سلسلہ جس کا اہتمام ہمارے ہاں باجماعت تراویح کی صورت میں ہوتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وساطت سے امت تک پہنچا ہے۔ یہ دراصل قیام اللیل کا ''عوامی'' پروگرام ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ قیام اللیل کی برکتوں سے کوئی شخص بھی محروم نہ رہنے پائے۔ قرونِ اولیٰ کے مخصوص ماحول اور حالات میں اس باجماعت قیام اللیل کی افادیت بہت زیادہ تھی۔ قرآن مجید کی زبان چونکہ ان لوگوں کی اپنی زبان تھی اس لیے امام کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق تمام سامعین کے دلوں میں اترتا چلا جاتا تھا' لیکن آج ہمارے ہاں کی تراویح کے اکثر و بیشتر مقتدی تو ''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم'' کی تصویر بنے سارا وقت رکعتوں کے حساب میں مشغول رہتے ہیں (اِلا ماشاء اللہ)۔ چنانچہ اس عظیم الشان فورم پر بھی اب قرآن کا سننا بس سننے کی حد تک ہی ہے اور تفہیم و تذکیر کے حوالے سے اس استماع کی افادیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔

﴿وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ﴾ ''اور اللہ کو قرضِ حسنہ دو۔''

﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ﴾ ''اور جو بھلائی بھی تم آگے بھیجو گے اپنی جانوں کے لیے' اسے موجود پاؤ گے اللہ کے پاس بہتر اور اجر میں بڑھ کر۔''

جو نیک اعمال تم نے آگے بھیجے ہوں گے انہیں اللہ تعالیٰ کے پاس تم بہت ہی بہتر حالت میں پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ان اعمال کو نہ صرف سات سو گنا تک بڑھا کر تمہیں لوٹائے گا بلکہ اپنے فضلِ خاص سے اس کے بدلے خصوصی اجر بھی تمہیں عطا فرمائے گا۔

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ﴾ ''اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا' رحمت فرمانے والا ہے۔''

---

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ المصابیح' کتاب الصوم' الفصل الثالث۔

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّر

تمہیدی کلمات

سورۃ المدثر اور سورۃ المزمل کی باہمی مشابہت و مناسبت ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات کے الفاظ (یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ① قُمِ اور یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ① قُمْ) سے واضح ہے۔ ان دونوں آیات میں حضور ﷺ کو چادر، کمبل یا لحاف چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ المزمل میں قیام اللیل کے اہتمام کی ترغیب ہے تو اس سورت میں قیام النہار (عملی محنت اور مشقت) کی تیاری کا حکم ہے۔ حضور ﷺ اگرچہ پہلے سے ہی معراجِ انسانیت کے درجے پر فائز تھے اور اس حوالے سے آپؐ کو ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ④﴾ (ن) کی سند بھی عطا ہو چکی تھی، لیکن قیام اللیل کی ریاضت کا مقصد یہ تھا کہ رات کی تنہائیوں میں ترتیل قرآن کی مشق سے قرآن مجید آپ ﷺ کے پورے وجود میں سرایت کر جائے اور رسالت کی بھاری ذمہ داری اٹھانے کے لیے آپ ﷺ کی روحانی طاقت میں مزید اضافہ ہو جائے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس مصرعے میں قرآن کی تاثیر کے اسی پہلو کا ذکر کیا ہے: ''چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود'' کہ قرآن مجید جس انسان کی روح میں سرایت کر جاتا ہے اس کی پوری شخصیت ہی بدل جاتی ہے۔

سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات کے بارے میں اگرچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ حضور ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی وحی تھی، لیکن تمام اہل علم کی متفقہ رائے بہر حال یہی ہے کہ پہلی وحی سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات پر مشتمل تھی۔ (پہلی وحی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات، دوسری وحی سورۂ ن کی ابتدائی سات آیات اور تیسری وحی سورۃ المزمل کی ابتدائی دس آیات پر مشتمل تھی۔) اس مغالطے اور اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ فترتِ وحی کے بعد وحی کا دوبارہ آغاز سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات سے ہوا تھا۔ دراصل تیسری وحی کے بعد کئی ماہ تک نزولِ وحی کا سلسلہ بند رہا۔ اس وقفے کو سیرت نگاروں نے ''فترتِ وحی'' کا نام دیا ہے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کے ذریعے حضور ﷺ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور خصوصی علوم کے بیش بہا خزانے آپؐ کو عطا فرمائے۔ نزولِ وحی میں مذکورہ وقفے کی وجہ سے آپ ﷺ اکثر رنجیدہ اور پریشان رہتے تھے۔ اسی کیفیت میں ایک دن آپ ﷺ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی مَلکی شکل میں نظر آئے۔ اس واقعے کی تفصیل جو احادیث سے ملتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن آپؐ غارِ حرا سے نیچے اتر رہے تھے تو آپؐ کو ایک آواز سنائی دی۔ ''یا محمد'' (ﷺ)! آپؐ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو آپؐ کو کہیں کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ آپؐ چند قدم آگے گئے تو پھر آواز آئی ''یا محمد'' (ﷺ)! اس مرتبہ بھی جب پکارنے والا نظر نہ آیا تو آپؐ کو بجا طور پر گھبراہٹ اور تشویش ہوئی۔ اسی کیفیت میں جب آپ ﷺ مزید آگے بڑھے تو تھوڑی دیر بعد وہی

آواز تیسری مرتبہ سنائی دی۔ اس پر جب آپ ﷺ کی نگاہ اٹھی تو سامنے اُفق پر آپؐ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی ملکی شکل میں اس طرح نظر آئے کہ پورا افق ان کی موجودگی کی وجہ سے بھرا ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد آپؐ گھبرا گئے اور آپؐ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ بالکل اسی کیفیت کا سامنا آپ ﷺ کو پہلی وحی کے وقت بھی کرنا پڑا تھا۔ گھر پہنچنے پر آپؐ کمبل یا لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے تو اسی حالت میں آپؐ پر سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات نازل ہوئیں۔ چونکہ یہ ''فترت'' کے بعد پہلی وحی تھی اس لیے بعض روایات میں اس کا ذکر پہلی وحی کے طور پر بھی آیا ہے۔ بہرحال اس وحی کی ایک خصوصی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے حضور ﷺ کی ''رسالت'' کا آغاز ہوا' جبکہ سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات کے نزول کے ساتھ آپؐ کی ''نبوت'' کا ظہور ہوا تھا۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی واضح رہے کہ نبی پیدائشی طور پر نبی ہوتا ہے' البتہ نبی کی نبوت کا ظہور پہلی وحی کے نزول کے وقت ہوتا ہے۔

ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات (یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ اور یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ) کے مفہوم کا ایک پہلو اور بھی ہے جسے سمجھنے کے لیے حضور ﷺ کی قبل از بعثت زندگی کے شب و روز کا مطالعہ ضروری ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کے اس دور کا نقشہ ذہن میں لائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کا بچپن اور لڑکپن عسرت اور مشقت میں گزرا۔ باقاعدہ طور پر عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد آپؐ نے دوسروں کے سرمائے سے تجارت شروع کی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد جب آپ ﷺ کو مالی اعتبار سے فراغت ملی تو آپؐ نے بھرپور انداز میں تجارت کی۔ سائیکالوجی کی اصطلاح میں بات کریں تو ابتدائی زندگی کے دور میں آپ ﷺ کسی حد تک بیروں بین (extroward) شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت کے مطابق لگ بھگ چالیس سال کی عمر میں آپؐ خلوت گزینی کو پسند فرمانے لگے تھے۔ یعنی اس عمر میں آپ ﷺ کی طبیعت رفتہ رفتہ غور و فکر اور سوچ بچار یعنی دروں بین (introward) رویے کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ غارِ حرا میں آپ ﷺ کا آنا جانا بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ یوں سائیکالوجی کی ان دو اصطلاحات کے حوالے سے آپؐ کی شخصیت میں توازن کا رنگ پیدا ہو گیا۔ اس حوالے سے میری رائے یہ ہے کہ پوری نسل انسانی میں صرف ایک ہی شخصیت ایسی ہے جو بیروں بینی اور دروں بینی کے رجحانات میں کلیتاً متوازن ہے اور وہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت!

اب سوال یہ ہے کہ غارِ حرا میں جا کر آپ ﷺ کیا کرتے تھے؟ اس سوال کا جواب بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ روایت میں موجود ہے۔ آپؓ فرماتی ہیں کہ غارِ حرا میں آپؐ عبادت کیا کرتے تھے (حضرت عائشہؓ نے ''تحنّث'' کا لفظ استعمال کیا ہے' جس کی تشریح امام زہریؒ نے ''تعبد'' سے کی ہے۔) اس حوالے سے شارحین حدیث نے آپ ﷺ کے تحنث یا تعبد کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ غارِ حرا کی خلوت میں بیٹھ کر آپؐ اپنا وقت غور و فکر اور سوچ بچار (التفکر والاعتبار) میں گزارتے تھے۔ ان ہی حالات میں جب آپؐ پر وحی نازل ہوئی تو ذمہ داری کے شدید احساس کی وجہ سے آپ ﷺ کی سوچ بچار اور تشویش میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات میں آپ ﷺ کی چادر یا کمبل اوڑھنے کی کیفیت کا تذکرہ گویا آپ ﷺ کی زندگی کے اس مخصوص دور کا تذکرہ ہے' جس دور میں آپؐ ہر وقت فکر و تدبر کی چادر میں لپٹے رہتے تھے۔ اس حوالے سے ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات (یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ① قُمِ...... اور یٰۤاَیُّهَا

الْمُدَّثِّرُ① قُمْ......) کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے نبی (ﷺ!) آپ کے سوچ بچار کا دور اب ختم ہوا چاہتا ہے‘ اب آپ اٹھئے اور عملی جدوجہد کا آغاز کیجیے۔

مضمون کے اعتبار سے یہ سورت تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے سورۃ العلق کے ساتھ اس کی خاص مناسبت اور مشابہت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱ تا ۷

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝

آیت ۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ①﴾ ”اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)!“

آیت ۲ ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ②﴾ ”آپ اٹھئے اور (لوگوں کو) خبردار کیجیے۔“

یہ ہے وہ کٹھن ذمہ داری جس کے بارے میں سورۃ المزمل کی آیت ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا⑤﴾ میں حضور ﷺ کو بہت پہلے اشارہ دے دیا گیا تھا‘ یعنی انذارِ آخرت کی ذمہ داری‘ جس کے لیے تمہیدی کلمات میں قیام اللیل کے مقابلے میں ”قیام النہار“ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ دراصل انبیاء ورسل ؑ کی دعوت کے حوالے سے جو اصطلاح قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آئی ہے وہ ”انذار“ ہی ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کو بھی بار بار حکم دیا گیا کہ آپ قرآن کے ذریعے سے لوگوں کو خبردار کریں: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ﴾ (الانعام: ۱۹) اے نبی (ﷺ!) آپ ان لوگوں کو بتائیں کہ قرآن مجھ پر نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تم لوگوں کو خبردار کردوں۔ تم اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین مخلوق ہو‘ تمہارے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی ہے۔ یہ روح اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم امانت ہے جس کی ذمہ داری کے بوجھ سے زمین‘ پہاڑ اور آسمان تک ڈر گئے تھے۔ اسی امانت کے حوالے سے تمہارا احتساب ہونا ہے۔ اس احتساب کے لیے مرنے کے بعد تمہیں پھر سے زندہ کیا جائے گا:

((وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءً، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا))(۱)

”اللہ کی قسم تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا‘ اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھائی اور برائی کا برائی‘ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی!“

بہرحال آیت زیر مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی دعوت کا نقطہ آغاز ”انذارِ آخرت“ ہے۔ اب

(۱) بحوالہ جمهرة الخطب‘ ص ۵۔ وفقه السيرة للالبانی‘ ص ۹۷۔

اگلی آیت میں اس دعوت کے ہدف کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے حضورﷺ کی دعوت کا ہدف نہ تو خانقاہی نظام کی تشکیل ہے اور نہ ہی صرف تعلیم وتعلّم کے نظام کا قیام ہے' بلکہ اس کا ہدف یہ ہے:

آیت ۳ ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ "اور اپنے رب کو بڑا کرو!"

غور کیجیے! رب کو بڑا کرنے کا کیا مطلب ہے؟ وہ تو اپنی ذات میں خود ہی سب سے بڑا ہے۔ ہم انسان اس کو بھلا کیا بڑا کریں گے؟ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اس زمین میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی عملاً تسلیم نہیں کی جا رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو محدود اختیار عطا فرمایا تھا اس کے بل پر اس نے اسی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ ظلم اور فساد کا بازار گرم ہو گیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم: ۴۱) "بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے' لوگوں کے اعمال کے سبب"۔ چنانچہ اب جو کوئی بھی اللہ کو اپنا الٰہ اور اپنا رب مانتا ہے' اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پارٹی (حزب اللہ) کا ممبر اور اس کی فوج کا سپاہی بن کر لوگوں سے اُس کی بڑائی کو منوانے اور اس کی کبریائی کو عملی طور پر دنیا میں نافذ کرنے کی جدوجہد میں اپنا تن من اور دھن کھپا دے' تاکہ اللہ کی بات سب سے اونچی ہو: ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: ۳۹) "اور دین کل کا کل اللہ کے لیے ہو جائے"۔ یہ ہے "تکبیرِ رب" یا رب کو بڑا کرنے کے مفہوم کا خلاصہ۔ گویا ان دو لفظوں میں حضورﷺ کی بعثت کا مقصد اور آپؐ کے مشن کا پورا فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے "تکبیرِ رب" کی اصطلاح کی حیثیت ایک ایسی گٹھلی کی ہے جس میں سے اقامتِ دین' غلبۂ دین' اظہارِ دینِ حق' حکومتِ الٰہیہ وغیرہ اصطلاحات کی کونپلیں پھوٹی ہیں۔

سورت کی ان ابتدائی تین آیات میں حضورﷺ کی زندگی کے اس دور کی جھلک بھی نظر آتی ہے جب آپؐ پر تفکر و تدبر بلکہ تشویش اور فکرمندی کا غلبہ تھا۔ غارِ حرا کے اندر پہلی وحی کا نزول آپؐ کے لیے بالکل ایک نیا تجربہ تھا جس پر آپؐ بجا طور پر فکرمند تھے۔ پھر ورقہ بن نوفل نے آپﷺ کے آئندہ حالات کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا اس کی وجہ سے آپؐ کی تشویش میں مزید اضافہ ہوا۔ ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ پہلی وحی کے واقعہ کے بعد حضرت خدیجہؓ حضورﷺ کو خصوصی طور پر ان کے پاس لے کر گئیں۔ وہ صاحبِ بصیرت عیسائی راہب تھے۔ انہوں نے آپؐ سے غارِ حرا میں پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد کہا کہ آپؐ کے پاس وہی ناموس آیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپؐ کی قوم آپؐ کو اس شہر سے نکال دے گی۔ حضورﷺ نے ورقہ بن نوفل کی اس بات پر پریشانی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا میری قوم مجھے یہاں سے نکال دے گی؟ آپﷺ کا مطلب تھا کہ وہ سب لوگ تو مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں' مجھے صادق اور امین مانتے ہیں' اور میرے قدموں میں اپنی نگاہیں بچھاتے ہیں' بھلا وہ مجھے کیوں شہر بدر کریں گے؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے جواب دیا کہ اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی یہ ذمہ داری جس کسی کو بھی ملی اس کی قوم اس کی دشمن بن گئی' ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتا آیا ہے اور اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ حضورﷺ سے اس ملاقات کے بعد جلد ہی ورقہ بن نوفل کا انتقال ہو گیا۔

اس واقعہ سے حضور ﷺ کی نبوت اور رسالت کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق تو کر دی تھی لیکن اُس وقت تک حضور ﷺ کو اپنی دعوت کی تبلیغ کا حکم نہیں ملا تھا۔ یعنی اس وقت تک صرف آپؐ کی نبوت کا ظہور ہوا تھا' رسالت کی ذمہ داری ابھی آپؐ کو نہیں ملی تھی۔ اسی لیے حضور ﷺ نے انہیں ایمان کی دعوت بھی نہیں دی اور اسی لیے ورقہ بن نوفل کا شمار صحابہ میں بھی نہیں ہوتا۔

آیت ۴ ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿٤﴾﴾ ''اور اپنے کپڑوں کو صاف رکھنے کا اہتمام کیجیے۔''

جس طرح آپؐ کی زندگی کا مقصد پاکیزہ ہے اسی طرح آپؐ کا لباس بھی پاک اور صاف ہونا چاہیے۔ اس آیت کی صوفیانہ انداز میں ایک تعبیر یہ بھی کی گئی ہے کہ ''ثیاب'' سے صرف کپڑے ہی نہیں بلکہ اخلاق و کردار بھی مراد ہے۔ گویا اس حکم میں ظاہری طہارت کے ساتھ ساتھ باطنی طہارت بھی شامل ہے۔

آیت ۵ ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿٥﴾﴾ ''اور ہر قسم کی گندگی سے دور رہیے۔''

یعنی ظاہری اور باطنی نجاستوں سے خود کو بچا کر رکھئے۔ ظاہر ہے باطنی گندگیوں میں سب سے بڑی گندگی شرک ہے۔ (اسی لیے بعض مترجمین نے الرُّجْزَ کا ترجمہ ''بتوں کی گندگی'' کیا ہے۔)

آیت ۶ ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴿٦﴾﴾ ''اور زیادہ لینے کے لیے کسی پر احسان نہ کیجیے۔''

اس آیت کا عام اور معروف مفہوم تو یہی ہے کہ کسی پر احسان کرتے ہوئے بدلے کی توقع نہ رکھو' بلکہ احسان برائے احسان کرو۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر اس آیت کا وہ ترجمہ پسند ہے جو مولانا اصلاحی صاحب نے کیا ہے: ''اور اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے منقطع نہ کر!'' مَنَّ یَمُنُّ مَنًّا کے معانی احسان کرنا اور احسان جتلانا کے علاوہ توڑنے اور کاٹنے کے بھی ہیں۔ اصلاحی صاحب نے اپنے ترجمے میں اسی معنی کو اپنایا ہے۔ چنانچہ اس معنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے نبی ﷺ! آپ اپنے فرضِ منصبی سے متعلق جدوجہد کو منقطع نہ کرنا' یقیناً آپؐ کی اس دعوت کے بڑے بڑے نتائج نکلیں گے۔ کچھ عرصے تک آپؐ کو انتظار تو ضرور کرنا پڑے گا لیکن بالآخر آپؐ کی تحریک کامیاب ہوگی اور آپؐ کو ڈھیروں کامیابیاں ملیں گی۔

آیت ۷ ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴿٧﴾﴾ ''اور اپنے رب کے لیے صبر کرو۔''

یہ اس آیت کا وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ لیکن میں قبل ازیں متعدد بار یہ وضاحت کر چکا ہوں کہ صبر کے ساتھ جب ''ل'' آتا ہے تو اس کے معنی میں انتظار کا مفہوم آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ آپؐ اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجیے اور جو بھی حکم آئے اس پر عمل کیجیے۔ سورت کا پہلا حصہ ان ابتدائی سات آیات پر مشتمل ہے اور اس حصے میں حضور ﷺ سے خطاب تھا۔ اب اگلی آیت سے اس سورت کے دوسرے حصے کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ حصہ تین مختصر آیات پر مشتمل ہے اور ان آیات میں قیامت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

آیات ۸ تا ۱۰

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ﴿٨﴾ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ﴿٩﴾ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ﴿١٠﴾

آیت ۸ ﴿فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ ۝﴾ ''جب صور میں پھونکا جائے گا۔''

آیت ۹ ﴿فَذٰلِكَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ ۝﴾ ''تو وہ دن بہت سخت دن ہوگا۔''

آیت ۱۰ ﴿عَلَی الْكٰفِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ ۝﴾ ''کافروں پر وہ ہلکا نہیں ہوگا۔''

اس کے مقابل سورۃ المزمل میں قیامت کے دن کا ذکر اس طرح آیا تھا: ﴿فَكَیْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبَا ۝ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۝﴾ ''اب اگر تم بھی کفر کرو گے تو تم کیسے بچ جاؤ گے اس دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ آسمان اس کے ساتھ پھٹ پڑنے کو ہے۔ اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔''

اس کے بعد سورت کے تیسرے حصے کا آغاز ہو رہا ہے۔ ان آیات کا لہجہ اور انداز بہت سخت ہے۔

آیات ۱۱ تا ۳۱

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ۝ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ۝ كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا ۝ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝ عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓىِٕكَةً وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیَسْتَیْقِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَیَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِیْمَانًا وَّلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ وَمَا هِیَ اِلَّا ذِكْرٰی لِلْبَشَرِ ۝ ع ۱۵

آیت ۱۱ ﴿ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ۝﴾ ''آپ چھوڑ دیجیے مجھے اور جس کو میں نے اکیلا پیدا کیا۔''

ذَرْنِیْ کا یہ انداز ہم قبل ازیں سورۂ نٓ اور سورۃ المزمل میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ خَلَقْتُ وَحِیْدًا کا مفہوم یہ ہے کہ جب میں نے اسے پیدا کیا تھا اُس وقت یہ تنہا تھا' کوئی مال' اولاد یا جائیداد وغیرہ لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان آیات کے بارے میں مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ اس شخص کی مکہ اور طائف دونوں شہروں میں بڑی بڑی جائیدادیں تھیں۔ اللہ نے اسے بہت سے بیٹوں سے بھی نواز رکھا تھا۔

آیت ۱۲ ﴿وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝﴾ ''اور اسے میں نے بہت سا مال دیا پھیلا ہوا۔''

ان الفاظ میں اشارہ ہے اس شخص کی ان جائیدادوں کی طرف جو زمینوں' باغوں' گھروں وغیرہ کی صورت

میں مکہ اور طائف دونوں شہروں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

آیت ۱۳ ﴿وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾﴾ ''اور نگاہوں کے سامنے رہنے والے بیٹے دیے۔''

کسی کے بیٹوں کا گھر میں حاضر وموجود رہنا بھی اس کی تونگری اور خوشحالی کی علامت ہے۔ ورنہ فکر معاش جوان بیٹوں کو گھر میں چین سے کہاں بیٹھنے دیتی ہے۔ آج ''حاضر باش'' بیٹوں جیسی نعمت کی قدر پوچھنی ہو تو ان والدین سے پوچھیں جن کے نوجوان بیٹے روزی کی تلاش میں امریکہ اور یورپ میں دھکے کھا رہے ہیں اور وہ محض انہیں ایک نظر دیکھنے کی امید پر جی رہے ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿۱۴﴾﴾ ''اور میں نے اس کے لیے ہر قسم کا سامان خوب اچھی طرح سے تیار کر دیا۔''

آیت ۱۵ ﴿ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ﴿۱۵﴾﴾ ''پھر وہ چاہتا ہے کہ میں اسے اور بھی دوں!''

آیت ۱۶ ﴿كَلَّا ۭ﴾ ''ہرگز نہیں!''

﴿اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿۱۶﴾﴾ ''وہ تو ہماری آیات کا مخالف (اور دشمن بن گیا) ہے۔''

آیت ۱۷ ﴿سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾﴾ ''میں اسے عنقریب ایک سخت چڑھائی چڑھواؤں گا۔''

اس سے مراد ایسا عذاب ہے جس کی شدت ہر آن بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی نوعیت کے عذاب کا ذکر سورۂ جن میں بھی آ چکا ہے: ﴿يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾﴾ ''تو وہ ڈال دے گا اس کو چڑھتے عذاب میں۔''

ولید بن مغیرہ بنیادی طور پر بہت ذہین اور سمجھ دار شخص تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ قرآن اللہ ہی کا کلام ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں' لیکن اپنے ضمیر کی اس آواز پر لبیک کہہ کر وہ اپنی چودھراہٹ اور دُنیوی ٹھاٹھ باٹھ کی قربانی نہیں دے سکتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ واقعتاً بہت مشکل میں تھا۔ اپنی اس مشکل کا حل اسے کسی درمیانی راہ میں نظر آتا تھا۔ چنانچہ قریش میں سب سے بڑھ کر اس شخص نے حضور ﷺ پر سمجھوتے (compromise) کے لیے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لیے اس نے حضور ﷺ کو ہمدردانہ انداز میں بھی سمجھایا' پُرکشش پیشکش کا حربہ بھی آزمایا اور برادری کے معاملات کا واسطہ بھی دیا کہ قریش اگر آپس میں تقسیم ہو جائیں گے تو ان کی بنی بنائی ساکھ ختم ہو کر رہ جائے گی۔ غرض اس نے ہر طرح سے کوشش کی کہ حضور ﷺ کچھ اپنی بات منوا لیں' کچھ قریش کی مان لیں اور اس طرح فریقین کے اختلافات کو مذاکرات کے ذریعے ختم کر دیا جائے۔

آئندہ آیات میں ایک خاص واقعہ کے حوالے سے اس شخص کی ایک خاص کیفیت کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ تفاسیر میں اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ ایک محفل میں قریش کے بڑے بڑے سردار جمع تھے۔ زیر بحث موضوع یہ تھا کہ محمد (ﷺ) کے بارے میں ہمیں ایک متفقہ موقف اپنانا چاہیے۔ جب ہم میں سے کوئی اسے شاعر سمجھتا ہے' کوئی جادوگر کہتا ہے' کوئی کاہن قرار دیتا ہے تو اس سے خود ہمارا موقف کمزور ہو جاتا ہے کہ ہم خود کسی بات پر متفق نہیں۔ بحث مباحثے کے بعد انہوں نے ولید بن مغیرہ کو حضور ﷺ کے پاس بھیجا کہ وہ جائے اور آپؐ سے تفصیلی بات چیت کر کے انہیں اپنی حتمی رائے سے آگاہ کرے۔ جب وہ حضور ﷺ سے ملاقات

کر کے واپس آیا تو انہوں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا پایا۔ دراصل حضور ﷺ سے گفتگو کرنے کے بعد وہ پوری طرح قائل ہو چکا تھا کہ آپؐ واقعی اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو کلام آپؐ پیش کر رہے ہیں وہ بلاشبہ اللہ ہی کا کلام ہے۔ لیکن یہ بات سردارانِ قریش کے سامنے تسلیم کرنا اُسے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس نتیجے پر پہنچا ہے؟ کیا ہم محمد (ﷺ) کو محض ایک شاعر سمجھیں؟ تو اس نے کہا: نہیں ان (ﷺ) کا کلام شعر نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا تو کیا پھر ہم اسے (ﷺ) کاہن کہہ سکتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: نہیں، کاہنوں کے قول و کردار کو میں خوب جانتا ہوں۔ وہ ذو معنی باتیں کرتے ہیں جبکہ یہ (ﷺ) تو دوٹوک اور سیدھی بات کرتے ہیں۔ اس پر سردارانِ قریش نے کہا کہ لو جی! یہ تو گیا! اس پر بھی محمد (ﷺ) کا جادو چل گیا! اب اس نے اہل محفل کے جو تیور دیکھے تو فوراً پینترا بدل کر بولا کہ ہاں اس کے کلام کے بارے میں آپ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جادو ہے، جو پچھلے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

اب ظاہر ہے ولید بن مغیرہ جیسے معتبر اور مدبر شخص کا ایک بات پر پوری طرح سے قائل ہونے کے بعد زبان سے اس کی علی الاعلان نفی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ اس موقع پر وہ اپنے ضمیر کی آواز کو دباتے ہوئے، زبان سے جھوٹ کہتے ہوئے اور اس دوران اپنی پریشانی اور خفت کو چھپاتے ہوئے جس کرب سے گزرا ہے، ان آیات میں اس کی اس پوری کیفیت کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کا یہ مقام فصاحت و بلاغت کی معراج اور لفظی منظر کشی کی بہترین مثال ہے۔

آیت ۱۸ ﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝۱۸﴾ ''اس نے غور کیا اور کچھ اندازہ کیا۔''

اس نے سوچا کہ دل کی بات زبان پر لانے یعنی حق کو مان لینے سے کیا ہوگا اور نہ ماننے کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ پھر جب اسے اپنے دُنیوی مفادات خطرے میں پڑتے نظر آئے تو اس نے ضمیر کی آواز کو دبا لینے کا فیصلہ کر لیا۔

آیت ۱۹ ﴿فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۱۹﴾ ''پس ہلاک ہو جائے، اُس نے کیسا غلط اندازہ ٹھہرایا۔''

اس کے اندازے کے مطابق تو حق کو مان لینے میں سراسر نقصان ہی نقصان تھا، لیکن اسے اس حقیقت کا تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس نے حق کو حق سمجھتے ہوئے ماننے سے انکار کر کے کتنے بڑے گھاٹے کا سودا کیا تھا۔

آیت ۲۰ ﴿ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۲۰﴾ ''پھر ہلاک ہو جائے، اس نے کیسا غلط اندازہ ٹھہرایا۔''

آیت ۲۱ ﴿ثُمَّ نَظَرَ ۝۲۱﴾ ''پھر اُس نے دیکھا۔''

یعنی کچھ دیر توقف کیا اور ایسے ظاہر کیا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔

آیت ۲۲ ﴿ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝۲۲﴾ ''پھر تیوری چڑھائی اور منہ بسورا۔''

آیت ۲۳ ﴿ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝۲۳﴾ ''پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔''

آیت ۲۴ ﴿فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝۲۴﴾ ''پھر اُس نے کہا کہ یہ تو بس جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔''

آیت ۲۵ ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝۲۵﴾ ''یہ نہیں ہے مگر انسان کا کلام۔''

یعنی اس کلام میں جادو کا سا اثر تو ہے، لیکن محمد (ﷺ) کا یہ دعویٰ کہ یہ اللہ کا کلام ہے اسے میں نہیں مانتا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ انسانی کلام ہی ہے —— اب اگلی آیات کو پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے حق کو پہچانتے ہوئے جھٹلا کر اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دے دی۔

آیت ۲۶ ﴿سَاُصۡلِيۡهِ سَقَرَ ۝۲۶﴾ ''میں عنقریب اسے ڈالوں گا سقر (دوزخ) میں!''

آیت ۲۷ ﴿وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝۲۷﴾ ''اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ سقر کیا ہے؟''

آیت ۲۸ ﴿لَا تُبۡقِىۡ وَلَا تَذَرُ ۝۲۸﴾ ''وہ نہ تو باقی رہنے دے گی اور نہ چھوڑے گی!''

آیت ۲۹ ﴿لَوَّاحَةٌ لِّلۡبَشَرِ ۝۲۹﴾ ''انسان کی کھال کو جھلسا ڈالنے والی۔''

نہ تو اس کا عذاب ختم ہو گا اور نہ ہی اس میں جلتے ہوئے انسان کو موت آئے گی۔

آیت ۳۰ ﴿عَلَيۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ ۝۳۰﴾ ''اس پر انیس (۱۹) داروغے مقرر ہیں۔''

آغازِ سورت سے یہاں تک پورا کلام ایک ہی اسلوب میں ہے، یعنی چھوٹی چھوٹی آیات اور تیز ردھم۔ لیکن اب آگے ایک طویل آیت آ رہی ہے۔ ایسی ہی ایک طویل آیت ہم سورۃ المزمل میں بھی پڑھ آئے ہیں، بلکہ سورۃ المزمل کا دوسرا رکوع اسی ایک آیت پر مشتمل ہے۔ جس طرح سورۃ المزمل کی مذکورہ آیت باقی سورت سے الگ بعد میں نازل ہوئی، اسی طرح اس سورت کی یہ ایک آیت بھی بعد میں نازل ہوئی تھی۔ اس آیت میں دراصل مشرکین کی ان استہزائیہ باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ جہنم کے داروغوں کی تعداد کے بارے میں کرتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ جہنم کے داروغوں کی تعداد کے معاملے کو انہوں نے مذاق بنا لیا تھا اور وہ اپنی محفلوں میں اٹھتے بیٹھتے اس بارے میں طرح طرح کے فقرے کستے رہتے تھے۔ ایک محفل میں ابوجہل نے کہا تھا: بھائیو! تم نے سن لیا، اس نبی کے خدا کی فوج صرف انیس سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تم میں سے دس دس آدمی مل کر بھی ایک ایک سپاہی سے نمٹ نہ لیں گے؟ اس پر بنی جُمَح کا ایک زور آور پہلوان یوں گویا ہوا کہ ان میں سے سترہ کو تو میں اکیلا سنبھال لوں گا، باقی دو سے تم سب مل کر نمٹ لینا۔ غرض وہ لوگ طرح طرح کی باتیں کر کے اللہ کے کلام کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب اس آیت میں ان کی ان باتوں کا جواب دیا جا رہا ہے:

آیت ۳۱ ﴿وَمَا جَعَلۡنَاۤ اَصۡحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪﴾ ''اور ہم نے نہیں مقرر کیے جہنم کے داروغے مگر فرشتے''

ان لوگوں کو فرشتوں کی طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ فرشتوں کی قوتوں کو انسانی قوتوں پر قیاس کرنا ان کی حماقت ہے۔

﴿وَّمَا جَعَلۡنَا عِدَّتَهُمۡ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۙ﴾ ''اور ہم نے نہیں ٹھہرائی ان کی یہ تعداد مگر کافروں کی آزمائش کے لیے''

﴿لِيَسۡتَيۡقِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ﴾ ''تاکہ جنہیں کتاب دی گئی تھی انہیں یقین آ جائے''

جامع ترمذی کی ایک روایت کے مطابق جہنم کے انیس داروغوں کا ذکر تورات میں بھی ہے۔ اب ظاہر

ہے اہلِ کتاب کے لیے تو قرآن کے حق میں یہ بہت بڑی دلیل ہے۔

﴿وَیَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِیْمَانًا﴾ ''اور جو اہل ایمان ہیں وہ ایمان میں بڑھیں''

اہل ایمان کے لیے تو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر وحی ایمان میں اضافے کا باعث ہی بنتی ہے۔

﴿وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴾ ''اور نہ شک میں پڑیں اہل کتاب اور اہل ایمان''

﴿وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْکٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ﴾ ''اور تا کہ کہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور کفار بھی کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے؟''

یعنی منافقین اور کفار اپنے من پسند تبصرے کرتے رہیں کہ جہنم کے فرشتوں کی تعداد بتانے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصد ہے۔

﴿کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۭ﴾ ''اسی طرح اللہ گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''

﴿وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا هُوَ ۭ﴾ ''اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو سوائے اُس کے۔''

﴿وَمَا هِیَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْبَشَرِ ۝۳۱﴾ ''اور یہ آیات صرف انسانوں کی یاد دہانی کے لیے ہیں۔''

اس کے بعد سورت کے آخر تک تمام آیات کا اسلوب اور آہنگ وہی ہے جو شروع سورت سے چلا آ رہا ہے۔ یعنی چھوٹی چھوٹی آیات اور تیز ردھم۔

آیات ۳۲ تا ۵۶

کَلَّا وَالْقَمَرِ ۝ۙ وَالَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۝ۙ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۝ۙ اِنَّهَا لَاِحْدَی الْکُبَرِ ۝ۙ نَذِیْرًا لِّلْبَشَرِ ۝ۙ
لِمَنْ شَآءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّتَقَدَّمَ اَوْ یَتَاَخَّرَ ۝ۭ کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ۝ۙ اِلَّآ اَصْحٰبَ
الْیَمِیْنِ ۝ۭ فِیْ جَنّٰتٍ ۛ یَتَسَآءَلُوْنَ ۝ۙ عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ ۝ۙ مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَکُ
مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ۝ۙ وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ ۝ۙ وَکُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ ۝ۙ وَکُنَّا نُکَذِّبُ
بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝ۙ حَتّٰٓی اَتٰىنَا الْیَقِیْنُ ۝ۭ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیْنَ ۝ۭ فَمَا لَهُمْ عَنِ
التَّذْکِرَةِ مُعْرِضِیْنَ ۝ۙ کَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝ۙ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝ۭ بَلْ یُرِیْدُ کُلُّ امْرِئٍ
مِّنْهُمْ اَنْ یُّؤْتٰی صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ۙ کَلَّا ۭ بَلْ لَّا یَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ۭ کَلَّآ اِنَّهٗ تَذْکِرَةٌ ۝ۚ فَمَنْ
شَآءَ ذَکَرَهٗ ۝ۭ وَمَا یَذْکُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰی وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝۵۶ ع

آیت ۳۲ ﴿کَلَّا وَالْقَمَرِ ۝۳۲﴾ ''کیوں نہیں، قسم ہے چاند کی۔''

آیت ۳۳ ﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿٣٣﴾﴾ ''اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔''
یعنی جب رات رخصت ہو رہی ہو۔

آیت ۳۴ ﴿وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿٣٤﴾﴾ ''اور قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو جائے۔''
یہاں چاند کی قسم اور پھر رخصت ہوتی ہوئی رات اور روشن صبح کے ذکر کے پردے میں بہت اہم مضمون بیان ہوا ہے۔ رات کی قسم میں فترتِ وحی کے طویل دور کی طرف اشارہ ہے' یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوتِ محمدیؐ کے ظہور تک چھ سو برس پر محیط وہ عرصہ جس میں وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس دوران دنیا میں بلاشبہ جہالت کی تاریکی کا راج تھا۔ سابقہ نبوتوں کی تعلیمات زیادہ تر مسخ ہو چکی تھیں اور مجموعی طور پر دنیا کے اندر ہدایتِ آسمانی کی روشنی بہت مدھم پڑ چکی تھی۔ چاند کی قسم اسی مدھم اور مستعار روشنی کا اشارہ دے رہی ہے' جبکہ صبح کی روشنی نبوت و رسالتِ محمدیؐ کا استعارہ ہے۔ گویا علامات کے پردے میں ان تین آیات میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ پچھلے چھ سو برس سے دنیا پر جہالت وضلالت کی تاریک رات مسلط تھی' ہدایتِ خداوندی کی روشنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی' مگر اب رسالتِ محمدیؐ کا خورشید طلوع ہونے سے تاریکی کا دور ختم ہو چکا ہے۔
ان تین قسموں کا حوالہ سورۃ الانشقاق (پارہ تیس) کی آیات ۱۶ تا ۱۹ کے مطالعہ کے دوران دوبارہ آئے گا۔

آیت ۳۵ ﴿اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾﴾ ''یقیناً یہ بہت بڑی باتوں میں سے ایک بات ہے۔''
ظاہر ہے نوعِ انسانی کی تاریخ میں نبوتِ محمدیؐ کے ظہور سے بڑا واقعہ اور کون سا ہوگا۔

آیت ۳۶ ﴿نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾﴾ ''خبردار کرنے کے لیے انسانوں کو۔''

آیت ۳۷ ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿٣٧﴾﴾ ''جو بھی تم میں سے چاہے کہ وہ آگے بڑھے یا پیچھے رہ جائے۔''
اب کامیابی کا دارومدار ہر کسی کی ہمت اور کوشش پر ہے۔ جس کی ہمت جوان ہو وہ سب سے آگے بڑھ کر صدیقیت کا مقام اور ''السابقون الاولون'' کا درجہ حاصل کر لے۔ جو کوئی دوسروں کا انتظار کر کے ذرا دیر سے چلنے میں عافیت سمجھے وہ وَاتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ والوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا لے اور جس کسی کی ہمت اور قسمت ساتھ نہ دے وہ خود کو مستقل طور پر محروم کر لے۔

آیت ۳۸ ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿٣٨﴾﴾ ''ہر جان رہن ہے اُس کے عوض جو کچھ کہ اُس نے کمایا ہے۔''
ہر انسان نے اپنی دنیا کی زندگی میں جو کچھ کمایا ہے قیامت کے دن وہ سب کچھ اسے وصول کرنا ہوگا۔

آیت ۳۹ ﴿اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿٣٩﴾﴾ ''سوائے ان لوگوں کے جو داہنے والے ہوں گے۔''
یعنی جن کا نامہ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

آیت ۴۰ ﴿فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٤٠﴾﴾ ''وہ جنتوں میں ہوں گے' پوچھتے ہوں گے۔''

آیت ۴۱ ﴿عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٤١﴾﴾ ''گنہگاروں کے بارے میں۔''

آیت ۴۲ ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ﴿۴۲﴾﴾ ''تم لوگوں کو کس چیز نے جہنم میں ڈالا؟''

آیت ۴۳ ﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ﴿۴۳﴾﴾ ''وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔''

آیت ۴۴ ﴿وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ﴿۴۴﴾﴾ ''اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔''

آیت ۴۵ ﴿وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ﴿۴۵﴾﴾ ''اور ہم کٹ حجتیاں کرنے والوں کے ساتھ مل کر کٹ حجتیاں کیا کرتے تھے۔''

ہم تو دنیا میں بس کھیل تماشوں میں ہی لگے رہے۔ حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے۔ ہم نے اپنی زندگی کے مقصد اور انجام کے بارے میں تو کبھی سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں تھا۔

آیت ۴۶ ﴿وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ﴿۴۶﴾﴾ ''اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) ہم جزاء و سزا کے دن کا انکار کرتے رہے۔''

آیت ۴۷ ﴿حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ﴿۴۷﴾﴾ ''یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا۔''

آیت ۴۸ ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ﴿۴۸﴾﴾ ''تو اب ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوگی شفاعت کرنے والوں کی کوئی شفاعت۔''

آیت ۴۹ ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ﴿۴۹﴾﴾ ''تو انہیں کیا ہوگیا ہے کہ یہ اس یاددہانی (قرآن) سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں؟''

آیت ۵۰ ﴿كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۵۰﴾﴾ ''گویا وہ بدکے ہوئے جنگلی گدھے ہیں۔''

آیت ۵۱ ﴿فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾﴾ ''جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔''

یہ لوگ ایک اللہ' قرآن اور آخرت کے ذکر سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے جنگلی گدھے شیر کی آہٹ پا کر جان بچانے کے لیے بھاگتے ہیں۔ ایسے مناظر اب ٹیلی ویژن پر عام دکھائے جاتے ہیں کہ افریقہ کے جنگلوں میں زیبروں کے غول کے غول شیر کی آہٹ محسوس کر کے بگٹٹ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

آیت ۵۲ ﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾﴾ ''بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کو پکڑا دیے جائیں کھلے صحیفے۔''

یہ ان کی استہزائیہ گفتگو کا ذکر ہے۔ وہ لوگ حضور ﷺ کی دعوت کے جواب میں اکثر ایسی باتیں کرتے تھے کہ یہ حساب کتاب کا معاملہ قیامت پر کیوں ٹالا جا رہا ہے؟ آپ اپنے اللہ سے کہیں کہ وہ مہربانی فرما کر ہمارے اعمالنامے ابھی ہمارے ہاتھوں میں پکڑا دے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم قرآن کو اللہ کا کلام تب مانیں گے جب ہم میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایک صحیفہ پکڑا دیا جائے گا۔

آیت ۵۳ ﴿كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾﴾ ''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ وہ آخرت کا خوف

نہیں رکھتے۔"

جب ان کے دلوں میں آخرت کا خوف نہیں رہا تو اب وہ جیسی چاہیں باتیں بنائیں۔ فارسی کا مشہور محاورہ ہے: "بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن!" کہ ایک دفعہ حیا کا پردہ اٹھا دو پھر جو چاہو کرو۔ چنانچہ آخرت سے بےخوف ہو کر وہ ہر طرح کی باتیں بنانے میں آزاد ہیں۔

آیت ۵۴ ﴿كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۝۵۴﴾ "ہرگز نہیں! یہ تو بس ایک یاددہانی ہے۔"

آیت ۵۵ ﴿فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝۵۵﴾ "اب جو چاہے اس سے نصیحت اخذ کر لے۔"

آیت ۵۶ ﴿وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ "اور یہ لوگ نصیحت اخذ نہیں کریں گے، مگر یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔"

﴿هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝۵۶﴾ "وہی ڈرنے کے لائق ہے اور وہی مغفرت کا مجاز۔"

یہ اُسی کا حق ہے کہ اس کا تقویٰ اختیار کیا جائے، اُس کے احکام کی پاسداری کی جائے اور وہی اس کا اہل ہے کہ جس کی چاہے مغفرت فرما دے۔

سُوْرَۃُ الْقِیٰمَۃ

تمہیدی کلمات

سورتوں کے نظم کے اعتبار سے سورۃ القیامہ کا جوڑے کا تعلق سورۃ الدھر کے ساتھ ہے۔ سورۃ القیامہ ادبی و لسانی محاسن اور زورِ خطابت کے اعتبار سے قرآن کے عمومی اسلوب کی بھرپور نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ قرآن کا عمومی اسلوب دراصل خطابت کا اسلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت اپنی جگہ پر ایک خوبصورت خطبے کی حیثیت رکھتی ہے' بلکہ بعض سورتیں تو کئی کئی خطبات پر مشتمل ہیں۔ اس اعتبار سے ہم قرآن کو ''مجموعہ خطباتِ الٰہیہ'' (A Collection of Divine Orations) بھی کہہ سکتے ہیں۔ قرآن مجید کے اس اسلوب کا رنگ حضور ﷺ کے خطبات میں بھی نظر آتا ہے۔ حضور ﷺ جب قرآن مجید پڑھ کر لوگوں کو سناتے تھے تو بھی آپ کا انداز خطیبانہ ہوتا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ خطبہ دیتے وقت آپ کی آواز بلند ہو جاتی تھی' آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں اور آپ کے اندازِ خطابت سے ایسے لگتا تھا جیسے کوئی سپہ سالار اپنے سپاہیوں کو للکار رہا ہے۔ بہرحال سورۃ القیامہ کی ایک ایک آیت میں خطابت کا بہت گہرا رنگ نظر آتا ہے۔

سورت کا آغاز اس انداز میں ہوتا ہے جیسے پس منظر میں کچھ لوگ وقوعِ قیامت کو جھٹلانے کے لیے دلیل بازی کر رہے ہوں اور یہ سورت ان کے سلسلہ بحث کو منقطع کرتے ہوئے جواب کے طور پر نازل ہوئی ہو۔ لیکن چند آیات کے بعد ابتدائی انداز اور خطاب کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے۔ صوتی آہنگ اور خطاب کے رخ کی یہ تبدیلی (تحویلِ خطاب) سورت میں تقریباً ہر چار یا چھ آیات کے بعد ہوتی نظر آتی ہے۔ اس طرح پوری سورت چھوٹے چھوٹے کئی حصوں کا مجموعہ نظر آتی ہے جس میں ہر حصے کی آیات کا ردھم اور ہم آواز الفاظ سے پیدا ہونے والا صوتی آہنگ جدا ہے۔ غرض یہ سورت زورِ خطابت' روانی' غنا' فصاحت و بلاغت اور بہت سی دوسری لسانی و ادبی خوبیوں کا مرقع ہے اور اس حیثیت سے یہ قرآن میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

آیات ۱ تا ۳۰

لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۝ۙ وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ۝ؕ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ
عِظَامَہٗ ۝ؕ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ۝ بَلۡ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَہٗ ۝ۚ یَسۡـَٔلُ
اَیَّانَ یَوۡمُ الۡقِیٰمَۃِ ۝ؕ فَاِذَا بَرِقَ الۡبَصَرُ ۝ۙ وَ خَسَفَ الۡقَمَرُ ۝ۙ وَ جُمِعَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ ۝ۙ

يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿١٠﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿١١﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ﴿١٢﴾ يُنَبَّأُ
الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ﴿١٣﴾ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ﴿١٤﴾ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ﴿١٥﴾
لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ﴿١٦﴾ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ﴿١٧﴾ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ﴿١٨﴾ ثُمَّ
إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴿١٩﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ﴿٢١﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾
إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ
التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ
يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ ع

آیت ۱ ﴿لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ①﴾ ''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔''

لَا یہاں پر معترضین کے دلائل کی نفی کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ کہ تمہیں تو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ناممکن نظر آرہا ہے اور اس بنیاد پر تم لوگ وقوعِ قیامت کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کر رہے ہو' مگر مجھے اس کے وقوع کے بارے میں اس قدر یقین ہے کہ میں اس کی قسم کھا رہا ہوں۔ موقف کے مؤکد اور مؤثر ہونے کے اعتبار سے یہ آیت سورۃ التغابن کی اس آیت سے گہری مشابہت رکھتی ہے: ﴿قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۚ﴾ (آیت ۷) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: کیوں نہیں! مجھے میرے رب کی قسم ہے' تم لازماً اٹھائے جاؤ گے' پھر تمہیں لازماً جتا دیا جائے گا ان اعمال کے بارے میں جو تم نے کیے ہیں''۔ سورۃ التغابن کی اس آیت کا اسلوب اور انداز بہت پرزور ہے' لیکن دیکھا جائے تو اس میں خارجی دلیل اور منطق کوئی بھی نہیں۔ البتہ ایک شخص اپنے موقف کے حق میں اپنی شخصیت اور اپنے یقین کو دلیل کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ لیکن یہ شخصیت وہ ہے جس کے قول وکردار کی سچائی کو اپنے پرائے سب نے مثالی مانا ہے اور یہی اس قول کے سچا ہونے کی سب سے قوی دلیل ہے۔ چنانچہ آیت زیرِ مطالعہ کے معاملے میں بھی وقوعِ قیامت کے دعوے کی دلیل محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپؐ کی سیرت ہے۔

آیت ۲ ﴿وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ②﴾ ''اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوامہ کی۔''

نفسِ لوّامہ کے لغوی معنی ہیں ملامت کرنے والا نفس۔ اس سے مراد انسان کا وہ نفس ہے جسے ہم عرفِ عام میں ضمیر (conscience) کہتے ہیں۔ اس آیت میں نفسِ لوامہ یا انسانی ضمیر کو قیامِ قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انسانی نفسِ لوّامہ یا ضمیر ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی مسلمان' کافر یا دہریہ انکار نہیں کر سکتا۔ ''میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے'' یا ''My conscience is biting me'' جیسے جملے دنیا بھر کے انسانوں کے ہاں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ اگر آپ کوئی غلط یا بُرا کام کریں تو اندر سے کوئی چیز کیوں بار بار آپ کے دل ودماغ میں چبھن پیدا کرتی ہے؟ اور بعض اوقات اس چبھن کے تسلسل و تکرار کی وجہ سے آپ کی نیند تک کیوں اُڑ جاتی ہے؟ اگر کوئی نیکی نیکی نہیں اور کوئی برائی برائی نہیں تو برے کام پر

آپ کے اندر کی یہ چبھن یا خلش آخر آپ کو کیوں تنگ کرتی ہے؟ چنانچہ نیکی اور بدی کے الگ الگ وجود کا سب سے بڑا اور آفاقی سطح پر مسلّمہ ثبوت انسانی نفس کی ملامت یا ضمیر کی خلش ہے۔ اور اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے کہ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانوں کے نیک اور برے اعمال کا حتمی اور قطعی نتیجہ نکلنا بھی ناگزیر ہے۔ دوسری طرف اس حوالے سے زمینی حقائق سب کے سامنے ہیں۔ یعنی دنیا میں ایسا کوئی حتمی اور قطعی نتیجہ نہ تو نکلتا ہے اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ اس دلیل کی روشنی میں اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ہر انسان کو اس کے اچھے برے اعمال کی پوری پوری جزا یا سزا دینے کے لیے ایک دوسری دنیا یعنی آخرت کا وجود میں لایا جانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ قیامت' آخرت یا بعث بعد الموت کی سب سے بڑی دلیل خود انسان کے اندر موجود ہے' اور وہ ہے انسان کا نفس لوامہ یا اس کا ضمیر۔

آیت ۳ ﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؀۳﴾ ''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر سکیں گے؟''

آیت ۴ ﴿بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ؀۴﴾ ''کیوں نہیں! ہم تو پوری طرح قادر ہیں اس پر بھی کہ ہم اس کی ایک ایک پور درست کر دیں۔''

یہاں پر بلٰی کے بعد لفظ کُنَّا محذوف ہے' گویا تقدیر عبارت یوں ہے: بلٰی کُنَّا قَادِرِیْن ......

آیت ۵ ﴿بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ ؀۵﴾ ''بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ فسق و فجور آگے بھی جاری رکھے۔''

انسانوں کے ہاں آخرت کے انکار کی سب سے بڑی اور اصل وجہ یہ ہے کہ وہ نیکی و بدی اور جائز و ناجائز کی تمیز ختم کر کے عیش و عشرت کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حرام خوریاں چھوڑ کر راہِ راست پر آنے کے مقابلے میں انہیں آخرت کا انکار کر دینا آسان محسوس ہوتا ہے۔ آخرت کے بارے میں انسان کا یہ رویہ ایسے ہی ہے جیسے بِلّی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن جس طرح کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلی اپنا فیصلہ نہیں بدلتی اسی طرح ان کے انکار کر دینے سے قیامت کے وقوع میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔ وہ ایک حقیقت ہے اور حقیقت کے طور پر اپنے معین وقت پر آدھمکے گی۔

آیت ۶ ﴿یَسْـَٔلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ؀۶﴾ ''وہ پوچھتا ہے: کب آئے گا قیامت کا دن؟''

مشرکین مکہ حضور ﷺ سے یہ سوال طنزیہ طور پر پوچھتے تھے۔ اسی لیے اس کا جواب بھی بہت تیکھے انداز میں دیا گیا ہے۔ سوال و جواب کا یہی انداز اور اسلوب سورۃ الذاریات کی ان آیات میں بھی پایا جاتا ہے: ﴿یَسْـَٔلُوْنَ اَیَّانَ یَوْمُ الدِّیْنِ ؀۱۲ یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ یُفْتَنُوْنَ ؀۱۳﴾ ''وہ پوچھتے ہیں کب آئے گا وہ جزا و سزا کا دن؟ جس دن یہ لوگ آگ پر سینکے جائیں گے''۔ مذکورہ سوال کا جواب بھی بالکل اسی انداز میں دیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

آیت ۷ ﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ؀۷﴾ ''پس جب نگاہیں چندھیا جائیں گی۔''

آیت ۸ ﴿وَخَسَفَ الْقَمَرُ﴾ ''اور چاند بے نور ہو جائے گا۔''
اِس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ چاند سورج کے اندر دھنس جائے گا۔
آیت ۹ ﴿وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ﴾ ''اور سورج اور چاند یکجا کر دیے جائیں گے۔''
اِس وقت سورج چاند سمیت تمام اجرامِ فلکی کششِ ثقل کے قانون کے تحت اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں۔ جب یہ نظام ڈھیلا پڑے گا تو تمام کُرے آپس میں ٹکرا جائیں گے۔
آیت ۱۰ ﴿یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ﴾ ''اُس دن انسان کہے گا: کہاں ہے کوئی بھاگ جانے کی جگہ؟''
آیت ۱۱ ﴿کَلَّا لَا وَزَرَ﴾ ''(کہا جائے گا:) ہرگز نہیں' کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔''
آیت ۱۲ ﴿اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ ۨالْمُسْتَقَرُّ﴾ ''اس روز تمہارے ربّ ہی کے حضور میں جا کر کھڑے ہونا ہے۔''
آیت ۱۳ ﴿یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ﴾ ''جتلا دیا جائے گا انسان کو اُس دن جو کچھ اس نے آگے بھیجا ہوگا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہوگا۔''
تقدیم و تاخیر کے اس فلسفے کو یوں سمجھیں کہ ہمارے اچھے برے اعمال کے بدلے کا ایک حصہ تو ہماری زندگیوں میں ہی آخرت کے لیے ہمارے اعمال نامے میں جمع (credit) ہوتا رہتا ہے' جبکہ ان اعمال کا ایک دوسرا حصہ اچھے یا برے اثرات کی صورت میں اسی دنیا میں رہ جاتا ہے۔ یہ ''اثرات'' اس دنیا میں جب تک موجود رہتے ہیں' ان کے بدلے میں بھی ثواب یا گناہ متعلقہ شخص کے اعمال نامے میں متواتر شامل ہوتا رہتا ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کو واضح طور پر بتا دیا جائے گا کہ تمہاری یہ نیکیاں یا بدیاں تو وہ ہیں جو تم نے براہِ راست خود اپنے لیے آگے بھیجی تھیں اور یہ ثواب یا وبال وہ ہے جو تمہارے اعمال کے پیچھے رہ جانے والے اثرات کی وجہ سے تمہارے حساب میں جمع ہوتا رہا۔
آیت ۱۴ ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ﴾ ''بلکہ انسان تو اپنے نفس کے احوال پر خود ہی خوب بصیرت رکھتا ہے۔''
قیامت کے دن تو کسی کو بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہر انسان کو خود ہی معلوم ہوگا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ دنیا سے وہ کیا کچھ لے کر آیا ہے اور یہ کہ وہ کیسے سلوک کا مستحق ہے۔
آیت ۱۵ ﴿وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ﴾ ''اور چاہے وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔''
ظاہر ہے دنیا میں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چرب زبان شخص خود ساختہ عذر پیش کر کے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ ایسا کرنے سے ممکن ہے وہ وقتی طور پر متعلقہ لوگوں کو مطمئن کر لے لیکن اس کا ضمیر اس کو مسلسل یاد دلاتا رہتا ہے کہ تم جھوٹے ہو۔

اب آئندہ آیات میں خطاب کا رخ حضورﷺ کی طرف ہوگیا ہے اور ساتھ ہی کلام کا صوتی آہنگ بھی تبدیل ہوگیا ہے۔ ان آیات کے آخر میں قُرْاٰنَهٗ' بَیَانَهٗ جیسے الفاظ آرہے ہیں۔ جیسے کہ آغاز میں ذکر ہوا تھا' یہ سورت اپنے اسلوب اور صوتی آہنگ کے اعتبار سے چھوٹے چھوٹے کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر حصے کی خوبصورتی اور انفرادیت آیات کے آخر میں آنے والے ہم آواز الفاظ کی وجہ سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ مثلاً ابتدائی آیات کا اختتام قِیَامَه' لَوَّامه' عِظَامَه' بَنَانَه' اَمَامَه جیسے الفاظ پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد چند آیات کے آخر میں اَلْبَصَرُ' اَلْقَمَرُ' الْمَفَرُ' وَزَرَ' الْمُسْتَقر جیسے الفاظ آئے۔ جبکہ گزشتہ دو آیات کے اختتامی الفاظ (بصیرة ، معاذیره) آپس میں ہم آواز ہیں۔ صوتی آہنگ اور اسلوب کی یہ تبدیلی سورت کی آئندہ آیات میں بھی مسلسل نظر آئے گی۔

آیت ۱۶ ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾﴾ ''آپ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔''

حضور اکرمﷺ کا معمول تھا کہ جونہی حضرت جبرائیلؑ وحی لے کر آتے آپؐ نئے کلام کو فوری طور پر یاد کرنے کی کوشش کرتے۔ اس پس منظر میں یہاں آپؐ کو تسلی دی جارہی ہے کہ اس ضمن میں آپؐ فکرمند نہ ہوں:

آیت ۱۷ ﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾﴾ ''اسے جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔''

یعنی آپؐ خاطر جمع رکھیں' قرآن مجید میں سے کوئی آیت یا کوئی لفظ آپؐ بھولیں گے نہیں۔ اس پورے کلام کی حفاظت اور ترتیب ہمارے ذمہ ہے۔

آیت ۱۸ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾﴾ ''پھر جب ہم اسے پڑھوا دیں تو آپ اس کی قراءت کی پیروی کیجیے۔''

اس میں ترتیبِ مصحف کی طرف اشارہ ہے' یعنی وہ ترتیب جس کے مطابق قرآن مجید کتابی صورت میں مرتب کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے قرآن مجید کے نزول کی ترتیب اور تھی اور مصحف کی ترتیب اور ہے۔ لیکن اس حوالے سے یہ اہم نکتہ مدنظر رہنا چاہیے کہ ترتیبِ مصحف بھی توقیفی ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی طے ہوئی ہے' اور یہ کہ ہر وحی کے ساتھ نئے کلام کی ترتیب کا حکم بھی آتا تھا۔ یعنی ہر وحی میں نازل ہونے والی سورت یا آیات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح کیا جاتا تھا کہ پہلے سے نازل شدہ قرآن کے اندران کی جگہ کون سی ہوگی۔

آیت ۱۹ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ﴿١٩﴾﴾ ''پھر ہمارے ہی ذمے ہے اس کو واضح کر دینا بھی۔''

قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق یہ بہت اہم وضاحت ہے۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے اصل پیغام کی تبیین و تفہیم بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ عملی طور پر اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ قرآن حسب ضرورت خود ہی اپنے احکام کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں دو احکام کے بارے میں آیا ہے: یَسْتَفْتُوْنَكَ...... (آیت ۱۲۷ اور آیت ۱۷۶) کہ اے نبی (ﷺ) یہ لوگ آپ سے فلاں مسئلے کی وضاحت چاہتے ہیں' تو انہیں بتائیں کہ اگر انہیں اس بات کی پوری طرح سمجھ نہیں آئی تو اللہ تعالیٰ اس معاملے کی

مزید وضاحت کر دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنی احکام کی تبیین وتشریح خود قرآن نے بھی کی ہے اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام زبانِ رسالت سے بھی کرایا ہے۔ اس کی ضرورت اور اہمیت قرآن میں یوں بیان کی گئی ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ﴾ (النحل:٤٤) کہ اے نبی (ﷺ) ہم نے یہ ذکر آپ پر اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ اس کو واضح کر دیں لوگوں کے لیے کہ ان پر کیا کچھ نازل ہوا ہے۔ یعنی اگر قرآن کے سمجھنے میں لوگوں کو کہیں کوئی ابہام یا اشکال محسوس ہو تو آپؐ اس کی وضاحت کر دیا کریں اور اگر انہیں کہیں کوئی حکم اجمال کے پردے میں لپٹا نظر آئے تو آپؐ اس کی تفصیل بیان کر دیا کریں — آئندہ آیات میں خطاب کا رخ اور کلام کا آہنگ ایک مرتبہ پھر تبدیل ہو رہا ہے۔

آیت ۲۰ ﴿کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ ﴿۲۰﴾﴾ ''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی ملنے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت کرتے ہو۔''

آیت ۲۱ ﴿وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

یہاں خطاب کا رخ کفار کی طرف ہے۔ یعنی تمہارا اصل مرض ہی یہ ہے کہ تم لوگ ''حُبِّ عاجلہ'' میں مبتلا ہو اپنی دنیا کی زندگی اور دنیا کے مال واسباب سے محبت کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں آخرت کو بالکل ہی نظر انداز کیے ہوئے ہو۔

آیت ۲۲ ﴿وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ﴿۲۲﴾﴾ ''بہت سے چہرے اُس دن تر وتازہ ہوں گے۔''

ان آیات میں اب میدانِ محشر میں موجود لوگوں کی کیفیت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ اس نقشے کو دیکھنے سے یوں لگتا ہے کہ ہر انسان کو اپنے اعمال کے مطابق اپنے نتیجے کا پہلے سے ہی علم ہو گا۔ جیسے سکول میں اعلانِ نتائج کے موقع پر کچھ بچے پہلے سے مطمئن اور کچھ پہلے سے پریشان ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ہر بچہ اپنے بارے میں خوب جانتا ہے کہ اس نے امتحان میں کیا کچھ کیا تھا۔

آیت ۲۳ ﴿اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ ﴿۲۳﴾﴾ ''اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔''

بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ مفہوم مراد لیا ہے کہ وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں گے۔ اس لیے کہ رؤیتِ باری تعالیٰ میدانِ حشر میں نہیں ہو گی' بلکہ اہل جنت' جنت میں داخلے کے بعد جس سب سے بڑی نعمت سے سرشار ہوں گے وہ دیدارِ الٰہی ہو گی۔ لیکن کچھ علماء کا خیال ہے اور میری رائے بھی یہی ہے کہ اہلِ ایمان کو میدانِ محشر میں بھی کسی نہ کسی درجے میں رؤیت باری تعالیٰ سے مشرف کیا جائے گا۔ سورۃ المُطَفِّفِیْن میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ آئے گا۔

آیت ۲۴ ﴿وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ بَاسِرَۃٌ ﴿۲۴﴾﴾ ''اور بہت سے چہرے اُس روز اُترے ہوئے ہوں گے۔''

آیت ۲۵ ﴿تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِھَا فَاقِرَۃٌ ﴿۲۵﴾﴾ ''ان کو یقین ہو گا کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہونے والا ہے۔''

اس کے بعد اب قیامتِ صغریٰ یعنی انسان کی موت کے وقت کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔ قیامتِ کبریٰ کا ذکر تو

قبل ازیں ان آیات میں آ چکا ہے: ﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ ......﴾۔ لیکن انفرادی سطح پر تو ہر انسان کی موت ہی اس کی قیامت ہے۔ اسی لیے قیامت کبریٰ کے مقابلے میں ہر انسان کی موت کو اس کی ''قیامت صغریٰ'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر انسان کو اپنی 'قیامت صغریٰ' کا تصور اپنے ذہن میں مستحضر رکھنا چاہیے۔

آیت ۲۶ ﴿كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝﴾ ''ہرگز نہیں! جب کہ جان آ کر پھنس جاتی ہے ہنسلیوں میں۔''

آیت ۲۷ ﴿وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝﴾ ''اور کہا جاتا ہے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟''

یہ اس کیفیت کا نقشہ ہے جب بڑے بڑے ڈاکٹر جواب دے دیتے ہیں' حکماء واطباء معذرت کر لیتے ہیں اور عزیز و اقارب کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ بس جی اب دعا کریں۔ اس وقت بڑے سے بڑا عقلیت پسند شخص بھی چاہتا ہے کہ کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کو بلا لیا جائے یا کسی تعویذ گنڈے والے کو پوچھ لیا جائے۔ شاید کہ ایسی کسی ترکیب سے اس کا پیارا موت کے منہ میں جانے سے بچ جائے۔

آیت ۲۸ ﴿وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝﴾ ''اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ اب جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔''

آدمی کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب اہل و عیال سے بچھڑنے اور بڑے ارمانوں سے بنائے ہوئے گھر اور مال و اسباب کو چھوڑنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝﴾ ''اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے۔''

یہ عین جان کنی کے وقت کی اس کیفیت کا ذکر ہے جب جسم کے نچلے حصے سے انسان کی جان نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ ناقابل بیان کرب اور شدید تکلیف کی کیفیت میں ہوتا ہے۔

آیت ۳۰ ﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨالْمَسَاقُ ۝﴾ ''اُس دن تو تیرے رب ہی کی طرف دھکیلے جانا ہے۔''

نوٹ کیجیے' گزشتہ آیات کے بعد ہم آواز الفاظ سے بننے والا مخصوص صوتی آہنگ ایک مرتبہ پھر تبدیل ہو رہا ہے۔

آیات ۳۱ تا ۴۰

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝ ع ۱۸

آیت ۳۱ ﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝﴾ ''پس اُس نے نہ تو تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔''

آیت ۳۲ ﴿وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝﴾ ''بلکہ اس نے جھٹلا دیا اور پیٹھ موڑ لی۔''

آیت ۳۳ ﴿ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝۳۳﴾ ’’پھر چل دیا اپنے گھر والوں کے پاس اَکڑتا ہوا۔‘‘

ان آیات میں ایک شخص کی حق دشمنی‘ ڈھٹائی اور اکڑفوں کی لفظی تصویر دکھائی گئی ہے۔ یہ تصویر سردارانِ قریش میں سے کسی خاص شخص کی بھی ہو سکتی ہے اور مجموعی طور پر ان کے عمومی کردار کی بھی۔ سردارانِ قریش کے اس رویے کی جھلک سورۂ صٓ کی اس آیت میں بھی دکھائی دیتی ہے:﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝۶﴾ ’’اور چل پڑے ان کے سردار (یہ کہتے ہوئے) کہ چلو جاؤ اور جمے رہو اپنے معبودوں پر‘ یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض پوشیدہ ہے۔‘‘

آیت ۳۴ ﴿اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝۳۴﴾ ’’افسوس ہے تجھ پر‘ افسوس ہے!‘‘

آیت ۳۵ ﴿ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝۳۵﴾ ’’پھر افسوس ہے تجھ پر‘ افسوس ہے!‘‘

آیت ۳۶ ﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝۳۶﴾ ’’کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟‘‘

کیا یہ لوگ اپنی دنیوی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھے بیٹھے ہیں؟ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا اور ان کا حساب کتاب نہیں ہوگا؟ اور انہیں ان کے کرتوتوں کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑے گا؟

آیت ۳۷ ﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝۳۷﴾ ’’کیا وہ حقیر پانی کی ایک بوند نہیں تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکائی جاتی ہے؟‘‘

آیت ۳۸ ﴿ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً﴾ ’’پھر وہ ایک علقہ بنا‘‘

یعنی پانی کی اس بوند نے جونک جیسی شکل اختیار کر لی جو رحم مادر کی دیوار کے ساتھ چمٹی رہی۔

﴿فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝۳۸﴾ ’’پھر اللہ نے اس کو بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے علقہ کو گوشت کے لوتھڑے (مضغہ) میں تبدیل کیا اور پھر اس کا جسم بنایا‘ جس میں آنکھیں‘ ناک‘ کان اور اپنی اپنی جگہ پر دوسرے تمام اعضاء بنا دیے۔ اور یہ سب کچھ ہوتا رہا: ﴿فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ﴾ (الزمر:٦) شکم مادر کے تین پردوں کے اندر۔

آیت ۳۹ ﴿فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝۳۹﴾ ’’پھر اسی سے اُس نے دو زوج بنائے‘ نر اور مادہ۔‘‘

کسی کو اُس نے مرد بنا دیا اور کسی کو عورت۔

آیت ۴۰ ﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝۴۰﴾ ’’تو کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟‘‘

کیا تم لوگ جانتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گندے پانی کی بوند سے پیدا کیا ہے؟ اولادِ آدمؑ میں سے افلاطون‘ بُقراط اور سُقراط کی تخلیق بھی اسی بوند سے ہوئی اور تمام انبیاء اور اولیاء اللہ بھی ایسے ہی پیدا

ہوئے۔صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے استثناء کے علاوہ نسل انسانی کے تمام افراد اللہ تعالیٰ نے اسی طریقے سے پیدا کیے۔ ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ﴾(ق:۱۵)''تو کیا پہلی مرتبہ تم لوگوں کو پیدا کرنے کے بعد اب ہم عاجز آ گئے ہیں؟''تو اے عقل کے اندھو! کیا تم یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو ذات پانی کی ایک بوند سے زندہ سلامت' خوبصورت' بہترین صلاحیتوں کے مالک انسان کو پیدا کر سکتی ہے' کیا وہ مُردہ انسانوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہوگی؟ اس آیت کا انداز چونکہ سوالیہ ہے اس لیے اسے سن کر یا پڑھ کر ہماری زبانوں پر بے ساختہ یہ الفاظ آ جانے چاہئیں: ''کیوں نہیں! اے ہمارے پروردگار! تیری ذات پاک ہے۔ہم گواہ ہیں کہ تو مُردوں کو زندہ کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔''

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب اس آیت کو پڑھتے تو اس سوال کے جواب میں کبھی بَلٰی (کیوں نہیں!) اور کبھی سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ فَبَلٰی (پاک ہے تیری ذات' اے اللہ! کیوں نہیں!) جیسے الفاظ فرمایا کرتے تھے۔

سُوْرَۃُ الدَّھْر

سورۃ الدھر اور سورۃ القیامہ کے مابین جوڑے کا تعلق ہے۔ اس تعلق کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ دونوں سورتیں مضمون کے تسلسل کی بنا پر باہم جڑی ہوئی ہیں۔ سورۃ القیامہ کا اختتام انسان کی تخلیق کے ذکر سے ہوا اور اسی مضمون سے سورۃ الدھر کا آغاز ہو رہا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

آیات ۱ تا ۲۲

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴿١﴾ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ
نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿٢﴾ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا
كَفُوْرًا ﴿٣﴾ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ﴿٤﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ
كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ﴿٥﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٦﴾ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ
وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ﴿٧﴾ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا
وَّاَسِيْرًا ﴿٨﴾ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ﴿٩﴾ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا
يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ﴿١٠﴾ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ﴿١١﴾ وَجَزٰىهُمْ
بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿١٢﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا
زَمْهَرِيْرًا ﴿١٣﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿١٤﴾ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ
فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ﴿١٥﴾ قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿١٦﴾ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا
كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴿١٧﴾ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ﴿١٨﴾ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ
مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿١٩﴾ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا
كَبِيْرًا ﴿٢٠﴾ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۡ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ
رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿٢١﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿٢٢﴾ ع ٢٢ ١٩

آیت ۱ ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ①﴾ ''کیا انسان پر اس

زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا؟''

''دَھْر'' سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتدا انسان کو معلوم ہے نہ انتہا' جبکہ ''حِیْن'' سے مراد وہ خاص وقت ہے جو اس لامتناہی زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو — چنانچہ ''دَھْر'' دراصل وقت کا وہ سمندر ہے جس کے اندر سے کائنات میں رونما ہونے والے ہر قسم کے واقعات و حادثات جنم لیتے ہیں۔ وقت کے اسی سمندر میں سے ہم انسان بھی نکلے ہیں۔ ع ''قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب'' (اقبال)۔ چنانچہ اس قلزم ہستی کے اندر ہر انسان پر ایک وقت ایسا بھی آیا ہے جب اس کا وجود حقیر پانی کی ایک ایسی بوند کی شکل میں تھا جس کا ذکر کرنا اور نام لینا بھی کوئی پسند نہیں کرتا۔

آیت ۲ ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ﴾ ''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے ملے جلے نطفے سے''

موجودہ دور میں سائنس نے اس آیت کا مفہوم بہت اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ مرد کی طرف سے spermatozoon اور ماں کی طرف سے ovum ملتے ہیں تو zygote وجود میں آتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے پندرہ سو سال پہلے صحرائے عرب کا ایک بدو تو لفظ ''اَمْشَاج'' کو اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق ہی سمجھا ہوگا۔ گویا قرآن مجید کے اعجاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے الفاظ کا مفہوم ہر زمانے کے ہر قسم کے انسانوں کے لیے قابل فہم رہا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کے معانی و مطالب میں نئی نئی جہتیں بھی دریافت ہوتی رہتی ہیں۔

﴿نَّبْتَلِيْهِ﴾ ''ہم اس کو اُلٹتے پلٹتے رہے''

یعنی رحم مادر میں ہم نے اس ''نُطْفَةٍ اَمْشَاج'' کو مختلف مراحل سے گزارا۔ نطفہ سے اسے علقہ بنایا۔ علقہ کو مغضہ کی شکل میں تبدیل کیا اور پھر اس کے اعضاء درست کیے۔ ''نَبْتَلِيْهِ'' کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے'' تاکہ ہم اس کو آزمائیں''۔ یعنی ہم نے انسان کو امتحان اور آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے۔

﴿فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ۝﴾ ''پھر ہم نے اس کو بنا دیا سننے والا' دیکھنے والا۔''

آیت ۳ ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ﴾ ''ہم نے اس کو راہ سجھا دی''

اس سے مراد ''ایمان'' سے متعلق وہ شعور یا وہ ہدایت اور راہنمائی ہے جو ہر انسان کی فطرت کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یعنی انسان اندھا اور بہرہ پیدا نہیں ہوا' بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہری اور باطنی طور پر بہترین صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ جسمانی حواس بھی دیے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے روح کی بصیرت بھی عطا کی ہے۔

﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝﴾ ''اب چاہے تو وہ شکر گزار بن کر رہے' چاہے ناشکرا ہو کر۔''

اب ظاہر ہے جس انداز اور طریقے سے انسان زندگی گزارے گا' اسی کے مطابق آخرت میں اس کو بدلہ دیا جائے گا۔

آیت ۴ ﴿اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝﴾ ''یقیناً کافروں کے لیے ہم نے تیار کر رکھی ہیں زنجیریں اور طوق اور دہکتی ہوئی آگ۔''

آیت ۵ ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا﴾ ''یقیناً نیکوکار بندے ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں کافور کی ملونی ہوگی۔''

ایک طرف کفار و مشرکین زنجیروں اور طوقوں میں جکڑے جہنم کی آگ میں جل رہے ہوں گے تو دوسری طرف اللہ کے فرمانبردار اور نیکوکار بندے جنت کی نعمتوں میں دادِ عیش دے رہے ہوں گے۔ جنت میں انہیں آبِ کافور کی آمیزش والی شرابِ طہور بھی پیش کی جائے گی۔ آگے اس چشمۂ کافور کی مزید وضاحت ہے:

آیت ۶ ﴿عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا﴾ ''یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور جدھر چاہیں گے اس کی شاخیں نکال لے جائیں گے۔''

یعنی اگر وہ چاہیں گے تو اس چشمے میں سے اپنی مرضی سے نہریں نکال کر اپنے اپنے علاقے کی طرف لے جائیں گے۔

آیت ۷ ﴿یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا﴾ ''وہ نذر کو پورا کرتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں اُس دن سے جس کا شر ہر سُو پھیل جائے گا۔''

آیت ۸ ﴿وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا﴾ ''اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین کو، یتیم کو اور قیدی کو۔''

عَلٰی حُبِّهٖ کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ مال کی محبت کے علی الرغم کھانا کھلاتے ہیں۔ یعنی ایک مفہوم تو یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی محبت میں بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اگرچہ ان کے دلوں میں بھی مال سے محبت کا جذبہ ہے اور ان کا جی بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے مال کو سنبھال کر رکھیں، لیکن اپنے ان جذبات کے باوجود وہ محض اللہ کی رضا کے لیے مستحقین کو کھانا کھلانے میں اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ حُبِ مال کا علاج ہی انفاق فی سبیل اللہ ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو قرآن مجید میں جگہ جگہ بشارتیں دی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۃ الحدید کی یہ آیت:

﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ﴾

''یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیں، ان کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہوگا۔''

آیت ۹ ﴿اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ﴾ ''(اور کہتے ہیں کہ) ہم تو آپ کو یہ کھانا کھلا رہے ہیں صرف اللہ (کی رضا) کے لیے۔''

﴿لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا﴾ ''ہم آپ سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکریہ۔''

آیت ۱۰ ﴿اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا﴾ ''ہم تو ڈرتے ہیں اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے جس کی اداسی بڑی ہولناک ہوگی۔''

عَبُوْس کا لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہ آتی ہو' بلکہ غصہ اور وحشت برستی ہو۔ جب کہ قمطریر کا معنی ہے بہت سخت' بہت کرخت' ہولناک اور طویل۔ چنانچہ یہاں اس سے مراد میدانِ محشر کی وہ کیفیت ہے جس کی وجہ سے کھرب ہا کھرب انسان متفکر اور پریشان ہوں گے اور ان میں سے کسی ایک کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کے آثار تک نظر نہیں آئیں گے۔

آیت ۱۱ ﴿فَوَقٰـهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ﴾ ''تو اللہ انہیں بچا لے گا اُس دن کے شر سے''

﴿وَلَقّٰـهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ﴿١١﴾﴾ ''اور بخش دے گا انہیں تروتازگی اور مسرت۔''

یعنی چہروں کی تازگی اور دلوں کا سرور۔

آیت ۱۲ ﴿وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿١٢﴾﴾ ''اور بدلے میں دے گا انہیں ان کے صبر کے سبب جنت اور ریشم کا لباس۔''

دنیا میں وہ لوگ سے مشکل حالات میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں لگے رہے۔ انہوں نے فاقوں سے رہنا گوارا کر لیا لیکن حرام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے انہوں نے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ ان کے اس صبر کے بدلے میں اللہ تعالیٰ انہیں رہنے کے لیے جنت اور پہننے کے لیے ریشم کی پوشاکیں عطا کرے گا۔

آیت ۱۳ ﴿مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ﴾ ''وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اس میں تختوں کے اوپر۔''

﴿لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿١٣﴾﴾ ''نہیں دیکھیں گے وہ اس میں دھوپ کی حدت اور نہ سخت سردی۔''

زَمْهَرِير ایسی سخت سردی کو کہتے ہیں جو انسان پر زبردست کپکپی طاری کر دے۔ چنانچہ جنت میں اہلِ جنت کو نہ تو دھوپ کی تپش تنگ کرے گی اور نہ ہی انہیں ٹھٹھرنے والی سردی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گویا جنت میں مسلسل معتدل موسم کا سماں ہوگا۔

آیت ۱۴ ﴿وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا﴾ ''اور جنت کے سائے ان کے اوپر جھکے ہوئے ہوں گے''

﴿وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿١٤﴾﴾ ''اور اس کے پھلوں کے خوشے نیچے جھکے ہوئے لٹک رہے ہوں گے۔''

آیت ۱۵ ﴿وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ﴿١٥﴾﴾ ''اور گردش میں ہوں گے ان پر (خُدّامِ جنت) چاندی کے برتنوں اور شیشے کے پیالوں کے ساتھ۔''

آیت ۱۶ ﴿قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ﴾ ''ایسا شیشہ جو چاندی کا ہوگا''

دراصل وہ آب خورے یا جام انتہائی نفیس اور شفاف (crystal clear) چاندی سے بنے ہوں گے' لیکن دیکھنے میں وہ شیشے جیسے ہوں گے۔

﴿قَدَّرُوۡهَا تَقۡدِيۡرًا ⑯﴾ ”ان کو (ساقیانِ جنت نے) بھرا ہو گا بھرپور اندازے کے مطابق۔“

آیت ۱۷ ﴿وَيُسۡقَوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنۡجَبِيۡلًا ⑰﴾ ”اور ان کو پلایا جائے گا اس میں ایسا جام کہ جس میں ملونی ہوگی سونٹھ کی۔“

آیت ۱۸ ﴿عَيۡنًا فِيۡهَا تُسَمّٰى سَلۡسَبِيۡلًا ⑱﴾ ”یہ ایک چشمہ ہے اس (جنت) میں جس کا نام سلسبیل ہے۔“

آیت ۱۹ ﴿وَيَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ۚ﴾ ”اور ان پر گردش میں رہیں گے ایسے لڑکے (خُدامِ جنت) جو ہمیشہ اسی عمر (اور شکل) میں رہیں گے۔“

﴿اِذَا رَاَيۡتَهُمۡ حَسِبۡتَهُمۡ لُؤۡلُؤًا مَّنۡثُوۡرًا ⑲﴾ ”جب تم انہیں دیکھو گے تو محسوس کرو گے کہ جیسے وہ موتی ہیں بکھرے ہوئے۔“

یعنی وہ نوعمر خادم نہایت خوبصورت ہوں گے۔

آیت ۲۰ ﴿وَاِذَا رَاَيۡتَ ثَمَّ رَاَيۡتَ نَعِيۡمًا وَّمُلۡكًا كَبِيۡرًا ⑳﴾ ”اور تم جہاں بھی دیکھو گے وہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور بہت بڑی بادشاہی دیکھو گے۔“

آیت ۲۱ ﴿عٰلِيَهُمۡ ثِيَابُ سُنۡدُسٍ خُضۡرٌ وَّاِسۡتَبۡرَقٌ ۫﴾ ”ان کے اوپر لباس ہوں گے باریک سبز ریشم کے اور گاڑھے ریشم کے۔“

﴿وَّحُلُّوۡۤا اَسَاوِرَ مِنۡ فِضَّةٍ ۚ﴾ ”اور انہیں کنگن پہنائے جائیں گے چاندی کے۔“

﴿وَسَقٰهُمۡ رَبُّهُمۡ شَرَابًا طَهُوۡرًا ㉑﴾ ”اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ مشروب۔“

آیت ۲۲ ﴿اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمۡ جَزَآءً وَّكَانَ سَعۡيُكُمۡ مَّشۡكُوۡرًا ㉒﴾ ”(اور کہا جائے گا:) یہ تم لوگوں کے لیے بدلہ ہے اور تمہاری جدوجہد مقبول ہو چکی ہے۔“

تم لوگ اپنی دنیوی زندگی میں غلبہ دین کے لیے جو جدّوجُہد کرتے رہے تھے وہ اللہ کے ہاں قبول کر لی گئی ہے اور اس کی قدر دانی کے طور پر تم لوگوں کو جنت اور اس کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ!

آیات ۲۳ تا ۳۱

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِيۡلًا ۚ فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ اٰثِمًا اَوۡ كَفُوۡرًا ۚ
وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ۚۖ وَمِنَ الَّيۡلِ فَاسۡجُدۡ لَهٗ وَسَبِّحۡهُ لَيۡلًا طَوِيۡلًا ۝ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ
يُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَةَ وَيَذَرُوۡنَ وَرَآءَهُمۡ يَوۡمًا ثَقِيۡلًا ۝ نَحۡنُ خَلَقۡنٰهُمۡ وَشَدَدۡنَاۤ اَسۡرَهُمۡ ۚ وَاِذَا
شِئۡنَا بَدَّلۡنَاۤ اَمۡثَالَهُمۡ تَبۡدِيۡلًا ۝ اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ ۚ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا ۝ وَمَا
تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۚ يُّدۡخِلُ مَنۡ يَّشَآءُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ
وَالظّٰلِمِيۡنَ اَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۝ ع

آیت ۲۳ ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِیۡلًا ﴿۲۳﴾﴾ ''(اے نبیﷺ) ہم نے ہی نازل کیا ہے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے۔''

آیت ۲۴ ﴿فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ﴾ ''تو آپ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا''

ربطِ مضمون کے اعتبار سے یوں سمجھئے کہ ان آیات کا تعلق سورۃ القیامہ کی ان آیات سے ہے: ﴿لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ ﴿ؕ۱۶﴾ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ ﴿ۚ۱۷﴾﴾ ''آپؐ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اسے جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے''۔ یعنی ہم نے قرآن مجید کو بطرزِ تنزیل (تھوڑا تھوڑا کر کے) ہی نازل کرنا ہے' ہماری مشیت اسی میں ہے۔ ہمارا ہر حکم اور ہر فیصلہ اسی وقت پر نازل ہوگا جو وقت ہم نے اس کے نزول کے لیے طے کر رکھا ہے۔ چنانچہ آپؐ کو نہ صرف نزولِ قرآن کے حوالے سے صبر کرنا ہے بلکہ مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے بھی آپؐ کو اپنے رب کے احکام کا منتظر رہنا ہے۔

﴿وَ لَا تُطِعۡ مِنۡہُمۡ اٰثِمًا اَوۡ کَفُوۡرًا ﴿ۚ۲۴﴾﴾ ''اور آپؐ ان میں سے کسی گناہگار یا ناشکرے کی باتوں پر دھیان نہ دیجیے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَ اذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا ﴿ۖۚ۲۵﴾﴾ ''اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیجیے صبح وشام۔''

آیت ۲۶ ﴿وَ مِنَ الَّیۡلِ فَاسۡجُدۡ لَہٗ﴾ ''اور رات کے ایک حصے میں اس کے لیے سجدہ کیا کیجیے''

﴿وَ سَبِّحۡہُ لَیۡلًا طَوِیۡلًا ﴿۲۶﴾﴾ ''اور رات کے بڑے حصے میں اُس کی تسبیح کیا کیجیے۔''

یہ اسی حکم کا تسلسل ہے جو سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ یعنی آپؐ رات کا بیشتر حصہ اللہ کے حضور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنے' اس کے حضور سربسجود رہنے اور اس کی تسبیح کرنے میں صرف کیا کریں۔ اُس وقت تک چونکہ ابھی نمازِ پنجگانہ کا حکم نہیں آیا تھا' اس لیے سارا زور رات کی عبادت پر تھا۔ بعد میں جب نمازِ پنجگانہ کی فرضیت کا حکم آ گیا تو اس ''قیام اللیل'' کو مختصر کر کے تہجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ بھی سب کے لیے نہیں صرف حضورﷺ کے لیے: ﴿وَ مِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ﴾ (بنی اسراء یل:۷۹)۔ نَافِلَۃ کے لفظی معنی اضافی اور زائد کے ہیں۔ یعنی حضورﷺ کے لیے نمازِ تہجد باقی فرض نمازوں کے علاوہ اضافی فرض کے درجے میں تھی' جبکہ اُمت کے لیے اس کی حیثیت نفل کی ہے۔

آیت ۲۷ ﴿اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ یُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ وَ یَذَرُوۡنَ وَرَآءَہُمۡ یَوۡمًا ثَقِیۡلًا ﴿۲۷﴾﴾ ''یقیناً یہ لوگ فوری ملنے والی چیز (دنیا) سے محبت کرتے ہیں اور ایک بھاری دن جو ان کے پیچھے آنے والا ہے' اس کا دھیان چھوڑے بیٹھے ہیں۔''

یعنی قیامت کا سخت دن: ﴿یَوۡمًا یَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِیۡبَا ﴿٭ۖ۱۷﴾﴾ (المزمل) ''وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا''۔ اس آیت کے مضمون کا ربط سورۃ القیامہ کی ان آیات کے ساتھ ہے: ﴿کَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ ﴿ۙ۲۰﴾ وَ تَذَرُوۡنَ الۡاٰخِرَۃَ ﴿ؕ۲۱﴾﴾ ''ہرگز نہیں! اصل میں تم لوگ عاجلہ (جلد ملنے والی چیز) سے محبت کرتے

ہو۔ اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

آیت ۲۸ ﴿نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ﴾ ''ہم نے ہی ان کو تخلیق فرمایا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں۔''

﴿وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ۝۲۸﴾ ''اور ہم جب چاہیں گے ان جیسے بدل کر اور لے آئیں گے۔''

عام طور پر اس آیت کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے ایک قوم کو ختم کر کے اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے۔ لیکن اس سے پہلے چونکہ انسانی تخلیق اور انسانی جسم کے جوڑ بند درست کرنے کا ذکر ہوا ہے اس لیے میرے نزدیک اس جملے کا درست مفہوم یہ ہے کہ آخرت میں ہم ان لوگوں کو ان کے دنیوی زندگی والے جسموں جیسے اور جسم عطا کر دیں گے۔ واضح رہے کہ یہ مضمون قبل ازیں سورۂ بنی اسرائیل: ۹۹، سورۃ الواقعہ: ۶۱ اور سورۂ یٰسٓ: ۸۱ میں بھی آ چکا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ﴾ ''یقیناً یہ تو ایک یاد دہانی ہے۔''

﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝۲۹﴾ ''تو جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کر لے۔''

یعنی جس کا جی چاہے اپنے رب کے قرب کا راستہ اختیار کر لے۔ اس مضمون کے حوالے سے صوفیاء کے ہاں سیر الی اللہ، تقرب الی اللہ، سلوک الی اللہ وغیرہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

آیت ۳۰ ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ﴾ ''اور تمہارے چاہے کچھ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۳۰﴾ ''یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

آیت ۳۱ ﴿يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ﴾ ''وہ داخل کرے گا اپنی رحمت میں جس کو چاہے گا۔''

ظاہر ہے دنیا و آخرت کا کوئی کام بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہم اللہ کے حکم اور اذن کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص ایک کام کرنے پر بظاہر قادر بھی ہو تو وہ اس کام کو اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک اس کی مشیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی شامل نہ ہو۔ اہلِ سُنّت کا عقیدہ ہے کہ جس طرح ہم خود اللہ کی مخلوق ہیں اسی طرح ہمارے تمام اعمال بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ سورۃ الصّافّات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۶﴾ کہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی۔ اس مفہوم میں ہر انسان اپنی نیت اور اپنے ارادے کی بنا پر ''کاسبِ اعمال'' ہے، جبکہ ''خالق اعمال'' اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا اسے ایسے اعمال کی توفیق دے گا جن کی بنا پر وہ اس کی رحمت کا مستحق ٹھہرے گا۔

اس جملے کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ داخل کرے گا اپنی رحمت میں، اسے جو چاہے گا۔ یعنی وہ صرف اسی شخص کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے گا جو اس کی رحمت کا مستحق بننے کے لیے کوشاں ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ

مَّشۡكُوۡرًا ﴿۱۹﴾ یعنی جس شخص نے آخرت کو اپنا اصل مقصود بنالیا اور اس کے لیے اس نے مقدور بھر محنت بھی کی اور وہ مؤمن بھی ہو تو اس کی وہ محنت اور کوشش اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول و مشکور ہوگی۔

﴿وَالظّٰلِمِيۡنَ اَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۳۱﴾﴾ ''اور رہے ظالم' تو ان کے لیے اُس نے بہت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اَللّٰهُمَّ اَعِذۡنَا مِنۡ ذٰلِكَ ! اَللّٰهُمَّ اَجِرۡنَا مِنۡ ذٰلِكَ!

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰت

تمہیدی کلمات

سورۃ المرسلات انتیسویں پارے کی آخری سورت ہے۔ جوڑے کے اعتبار سے اس کا تعلق تیسویں پارے کی پہلی سورت یعنی سورۃ النبا کے ساتھ ہے۔ دونوں سورتوں کے مضمون' اسلوب اور آیات کی ترتیب میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ سورۃ المرسلات پچاس آیات پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے رکوع میں چالیس جبکہ دوسرے رکوع میں دس آیات ہیں۔ سورۃ النبا کی کل چالیس آیات ہیں۔ اس کے پہلے رکوع میں تیس آیات ہیں' جبکہ سورۃ المرسلات کی طرح اس کا بھی دوسرا رکوع دس آیات پر مشتمل ہے۔ اس سورت کے آغاز میں پے در پے قسموں کا ذکر ہے۔ اس خصوصی انداز کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی تیسری سورت ہے۔ اس سے پہلے ہم ایسی دو سورتوں کا مطالعہ کر چکے ہیں جن کا آغاز اسی طرح پے در پے قسموں سے ہوتا ہے۔ یعنی تیئیسویں پارے کی سورۃ الصافات اور چھبیسویں پارے کی سورۃ الذاریات۔ سورۃ الصافات کے آغاز کی قسموں کا مفہوم تو بالکل واضح ہے کہ ان میں فرشتوں کی خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ اسی طرح سورۃ الذاریات کی قسموں کے بارے میں بھی مفسرین کا اجماع ہے کہ ان سے ہوائیں مراد ہیں' لیکن زیر مطالعہ سورت کی قسموں کے بارے میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ کچھ مفسرین ان سے ہوائیں مراد لیتے ہیں' جبکہ کچھ کا خیال ہے کہ ان میں فرشتوں کا ذکر ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

آیات ۱ تا ۴۰

وَالۡمُرۡسَلٰتِ عُرۡفًا ۝۱ فَالۡعٰصِفٰتِ عَصۡفًا ۝۲ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشۡرًا ۝۳ فَالۡفٰرِقٰتِ فَرۡقًا ۝۴
فَالۡمُلۡقِیٰتِ ذِکۡرًا ۝۵ عُذۡرًا اَوۡ نُذۡرًا ۝۶ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَوَاقِعٌ ۝۷ فَاِذَا النُّجُوۡمُ طُمِسَتۡ ۝۸
وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتۡ ۝۹ وَاِذَا الۡجِبَالُ نُسِفَتۡ ۝۱۰ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتۡ ۝۱۱ لِاَیِّ یَوۡمٍ
اُجِّلَتۡ ۝۱۲ لِیَوۡمِ الۡفَصۡلِ ۝۱۳ وَمَاۤ اَدۡرٰکَ مَا یَوۡمُ الۡفَصۡلِ ۝۱۴ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ۝۱۵
اَلَمۡ نُہۡلِکِ الۡاَوَّلِیۡنَ ۝۱۶ ثُمَّ نُتۡبِعُہُمُ الۡاٰخِرِیۡنَ ۝۱۷ کَذٰلِکَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝۱۸ وَیۡلٌ
یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ۝۱۹ اَلَمۡ نَخۡلُقۡکُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ ۝۲۰ فَجَعَلۡنٰہُ فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ ۝۲۱ اِلٰی
قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ۝۲۲ فَقَدَرۡنَا ٭ۖ فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ ۝۲۳ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ۝۲۴

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿٢٥﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿٢٦﴾ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ
مَّآءً فُرَاتًا ﴿٢٧﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٢٨﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى
ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿٣٠﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿٣١﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾
كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٤﴾ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ
فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾
ع فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿٣٩﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٠﴾

آیت ۱ ﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ①﴾ ”قسم ہے ان ہواؤں کی جو چلائی جاتی ہیں بڑی آہستگی سے۔“

اللہ تعالیٰ ان ہواؤں کو خاص مقاصد کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت چلاتا ہے۔

آیت ۲ ﴿فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ②﴾ ”پھر تیز و تند جھکڑ کی صورت میں چلتی ہیں۔“

آیت ۳ ﴿وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ③﴾ ”اور ان ہواؤں کی قسم جو (بادلوں کو) پھیلا دیتی ہیں۔“

آیت ۴ ﴿فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ④﴾ ”پھر تقسیم کرتی ہیں جدا جدا۔“

سورۃ الذاریات میں ہواؤں کی اس خصوصیت کا ذکر ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ④﴾ کے الفاظ میں ہوا ہے۔ یعنی ہوائیں سمندر سے بخارات کو بادلوں کی صورت میں دور دراز علاقوں تک لے جاتی ہیں' پھر وہ اس پانی کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مختلف علاقوں میں بارش کی صورت میں تقسیم کرتی ہیں۔ اس تقسیم میں ان کا معاملہ ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا بلکہ جُدا جُدا ہوتا ہے۔ کہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت سے جَل تھَل ہو جاتا ہے اور کوئی علاقہ خشک رہ جاتا ہے۔

آیت ۵ ﴿فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ⑤﴾ ”پھر قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو ذکر کا القاء کرتے ہیں۔“

گزشتہ چار آیات کے بارے میں تقریباً تمام مفسرین متفق ہیں کہ ان میں ہواؤں کا ذکر ہے۔ البتہ اس آیت کے حوالے سے زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے فرشتے مراد ہیں' جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لے کر آتے ہیں۔ البتہ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں بھی ہواؤں ہی کا تذکرہ ہے۔ اس حوالے سے ان مفسرین کا استدلال یہ ہے کہ کسی نبی یا کسی داعی کی آواز بھی تو ہوا ہی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچتی ہے۔ یعنی پیغامات و معلومات کی ترسیل و تقسیم کا ذریعہ (medium) تو بہرحال ہوا ہی ہے۔

آیت ۶ ﴿عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ⑥﴾ ”عذر کے طور پر یا خبردار کرنے کے لیے۔“

وحی یا ذکر (یاددہانی) کا ابلاغ یا تو اس لیے ہوتا ہے کہ لوگوں پر اتمامِ حجت ہو اور ان کا عذر ختم ہو جائے۔ جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۱۶۵ میں انبیاء و رسل ﷺ کی بعثت کا مقصد واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ﴾ ”تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی

حجت (دلیل) رسولوںؑ کے آنے کے بعد''۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوںؑ کو دنیا میں اسی لیے بھیجا تھا کہ ان کی بعثت کے بعد لوگوں کے پاس اُس کے ہاں پیش کرنے کے لیے کوئی عذر نہ رہ جائے۔ وحی یا یاددہانی کا دوسرا مقصد یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگوں کو خبردار کرنے (نُذْرًا) کے لیے ہوتی ہے کہ اگر وہ جاگنا چاہیں تو جاگ جائیں اور راہِ راست پر آنا چاہیں تو آ جائیں۔

اب اگلی آیت میں ان قسموں کے مقسم علیہ کا ذکر ہے کہ یہ قسمیں کس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کھائی گئی ہیں:

آیت ۷ ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ واقع ہو کر رہے گی۔''

یعنی جس قیامت کے بارے میں تم لوگوں کو بار بار متنبہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور آ کر رہے گی۔ واضح رہے کہ سورۂ قٓ سے لے کر سورۃ الناس تک مکی سورتوں کا موضوع انذارِ آخرت ہے۔ اس لیے سورۃ الذاریات کی قسموں کا مقسم علیہ بھی انذارِ آخرت ہی سے متعلق تھا: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ ''جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔ اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی''۔ البتہ سورۃ الصافات کے آغاز میں مذکور قسموں کا انداز تو بالکل ایسا ہی ہے لیکن وہاں ان قسموں کے مقسم علیہ کا تعلق توحید سے ہے: ﴿اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝﴾ ''یقیناً تمہارا الٰہ ایک ہی ہے''۔ اس لیے کہ سورۃ الصافات کا تعلق سورتوں کے جس گروپ سے ہے اس گروپ کا مرکزی مضمون ہی توحید ہے۔

آیت ۸ ﴿فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝﴾ ''پس جب ستارے مٹا دیے جائیں گے۔''

یعنی بے نور کر دیے جائیں گے اور ان کی روشنی ختم ہو جائے گی۔

آیت ۹ ﴿وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝﴾ ''اور جب آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے۔''

ایسی آیات ہمارے لیے آیات متشابہات کا درجہ رکھتی ہیں۔ البتہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جیسے جیسے سائنسی ترقی کی بدولت انسان کی معلومات بڑھیں گی' ان آیات کا مفہوم بتدریج واضح ہوتا چلا جائے گا۔

آیت ۱۰ ﴿وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝﴾ ''اور جب پہاڑ (ریت بنا کر) اُڑا دیے جائیں گے۔''

قیامت کے زلزلے کے باعث پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ریت کے ٹیلوں کی مانند ہو جائیں گے اور ان ٹیلوں کے ذرّات ہوا میں اُڑتے پھریں گے۔

آیت ۱۱ ﴿وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝﴾ ''اور جب رسولوںؑ (کے کھڑے ہونے) کا وقت آ پہنچے گا۔''

جب انبیاء و رسل ﷺ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں شہادتیں دینے کے لیے کھڑے ہوں گے۔

آیت ۱۲ ﴿لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝﴾ ''(یہ معاملہ) کس دن کے لیے مؤخر کیا گیا ہے؟''

آیت ۱۳ ﴿لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۝﴾ ''فیصلے کے دن کے لیے۔''

یعنی انبیاء و رسل ﷺ کی اپنی اپنی قوموں کے خلاف گواہی (کہ اے اللہ! ہم نے تیرا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا' اب یہ لوگ خود جوابدہ ہیں) اور خود متعلقہ اقوام کے افراد سے پوچھ گچھ جیسے معاملات اسی فیصلے کے

دن کے لیے مؤخر کیے گئے ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ ۝۱۴﴾ ''اور تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟''

آیت ۱۵ ﴿وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۱۵﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

لفظ ''ویل'' کے معنی تباہی اور بربادی کے بھی ہیں اور یہ جہنم کی ایک وادی کا نام بھی ہے' جس کی سختیوں سے خود جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔

آیت ۱۶ ﴿اَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝۱۶﴾ ''کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟''

آیت ۱۷ ﴿ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِيۡنَ ۝۱۷﴾ ''پھر ہم ان کے پیچھے لگاتے رہے بعد میں آنے والوں کو۔''

اس سے نوعِ انسانی کی مختلف نسلوں کا یکے بعد دیگرے معمول کے مطابق دنیا میں آنا بھی مراد ہے اور ایک قوم کی تباہی کے بعد اس کی جگہ دوسری قوم کا اٹھایا جانا بھی۔ جیسے قومِ نوحؑ کی ہلاکت کے بعد قومِ عاد اور قومِ عاد کی بربادی کے بعد قومِ ثمود کو پیدا کیا گیا۔

آیت ۱۸ ﴿كَذٰلِكَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِيۡنَ ۝۱۸﴾ ''اسی طرح ہم کرتے رہے ہیں مجرموں کے ساتھ۔''

آیت ۱۹ ﴿وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۱۹﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

یہ اس سورت کی ترجیعی (بار بار دہرائی جانے والی) آیت ہے جو اس میں دس مرتبہ آئی ہے۔

آیت ۲۰ ﴿اَلَمۡ نَخۡلُقۡكُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ ۝۲۰﴾ ''کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟''

انسان کا مادۂ تخلیق ایسی گھٹیا چیز ہے کہ جس کا نام بھی کوئی اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتا۔ سورۃ الدھر میں اس حقیقت کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿هَلۡ اَتٰى عَلَى الۡاِنۡسَانِ حِيۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ يَكُنۡ شَيۡـًٔا مَّذۡكُوۡرًا ۝۱﴾ ''کیا انسان پر اس زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا؟''

آیت ۲۱ ﴿فَجَعَلۡنٰهُ فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ۝۲۱﴾ ''پھر ہم نے اس (نطفے) کو رکھ دیا ایک محفوظ مقام میں۔''

یعنی اس حقیر پانی کی بوند کو مختلف مراحل سے گزارنے کے لیے ہم نے اسے ایک محفوظ مقام یعنی رحمِ مادر میں رکھا جو اس کے لیے ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے۔

آیت ۲۲ ﴿اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ۝۲۲﴾ ''ایک طے شدہ مدت تک۔''

آیت ۲۳ ﴿فَقَدَرۡنَا ۖ فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ ۝۲۳﴾ ''تو ہم نے اندازہ مقرر کیا' اور ہم کیا ہی اچھے ہیں اندازہ مقرر کرنے والے!''

اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم نے یہ سب کچھ اپنی قدرت سے کیا اور ہم کیا ہی اچھی قدرت رکھنے والے ہیں!

آیت ۲۴ ﴿وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۲۴﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں

دن کے لیے مؤخر کیے گئے ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ﴾ ’’اور تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟‘‘

آیت ۱۵ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ ’’(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔‘‘

لفظ ’’ویل‘‘ کے معنی تباہی اور بربادی کے بھی ہیں اور یہ جہنم کی ایک وادی کا نام بھی ہے‘ جس کی سختیوں سے خود جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔

آیت ۱۶ ﴿اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ ’’کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟‘‘

آیت ۱۷ ﴿ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ ’’پھر ہم ان کے پیچھے لگاتے رہے بعد میں آنے والوں کو۔‘‘

اس سے نوعِ انسانی کی مختلف نسلوں کا یکے بعد دیگرے معمول کے مطابق دنیا میں آنا بھی مراد ہے اور ایک قوم کی تباہی کے بعد اس کی جگہ دوسری قوم کا اٹھایا جانا بھی۔ جیسے قومِ نوحؑ کی ہلاکت کے بعد قومِ عاد اور قومِ عاد کی بربادی کے بعد قومِ ثمود کو پیدا کیا گیا۔

آیت ۱۸ ﴿كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴾ ’’اسی طرح ہم کرتے رہے ہیں مجرموں کے ساتھ۔‘‘

آیت ۱۹ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ ’’(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔‘‘

یہ اس سورت کی ترجیعی (بار بار دہرائی جانے والی) آیت ہے جو اس میں دس مرتبہ آئی ہے۔

آیت ۲۰ ﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ ’’کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟‘‘

انسان کا مادۂ تخلیق ایسی گھٹیا چیز ہے کہ جس کا نام بھی کوئی اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتا۔ سورۃ الدھر میں اس حقیقت کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴾ ’’کیا انسان پر اس زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہیں تھا؟‘‘

آیت ۲۱ ﴿فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴾ ’’پھر ہم نے اس (نطفے) کو رکھ دیا ایک محفوظ مقام میں۔‘‘

یعنی اس حقیر پانی کی بوند کو مختلف مراحل سے گزارنے کے لیے ہم نے اسے ایک محفوظ مقام یعنی رحم مادر میں رکھا جو اس کے لیے ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے۔

آیت ۲۲ ﴿اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ ’’ایک طے شدہ مدت تک۔‘‘

آیت ۲۳ ﴿فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴾ ’’تو ہم نے اندازہ مقرر کیا‘ اور ہم کیا ہی اچھے ہیں اندازہ مقرر کرنے والے!‘‘

اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم نے یہ سب کچھ اپنی قدرت سے کیا اور ہم کیا ہی اچھی قدرت رکھنے والے ہیں!

آیت ۲۴ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ ’’(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں

کے لیے۔"

آیت ۲۵ ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾﴾ "کیا ہم نے زمین کو نہیں بنادیا سمیٹ لینے والی؟"

آیت ۲۶ ﴿اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾﴾ "زندوں کو بھی اور مُردوں کو بھی!"

اللہ تعالیٰ نے یہ زمین ایسی بنائی ہے کہ یہ اپنے اوپر موجود ہر زندہ وجود کی تمام ضروریات پوری کر رہی ہے اور ہر قسم کے مردہ کو بھی تحلیل کر کے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اس حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں ایسی گنجائش رکھی ہے کہ یہ تا قیامِ قیامت تمام زندوں اور تمام مُردوں کے لیے کفایت کرے گی۔

آیت ۲۷ ﴿وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾﴾ "اور ہم نے اس کے اندر بنادیے خوب جمے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ اور ہم نے تمہیں پلایا (اس میں سے) تسکین بخش پانی۔"

آیت ۲۸ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾﴾ "(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔"

ان تمام آیات میں تذکیر بآلاء اللہ کا انداز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں، نعمتوں اور اس کے احسانات کے ذکر سے یاددہانی کرائی جارہی ہے۔

آیت ۲۹ ﴿اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ "چلو اب اُسی چیز کی طرف جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔"

یعنی جہنم کی آگ کی طرف۔ یہ وہ حکم ہے جو میدانِ محشر میں اہل جہنم کو سنایا جائے گا۔

آیت ۳۰ ﴿اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾﴾ "چلو اُس تین شاخوں والے سائے کی طرف!"

میدانِ محشر کی چلچلاتی دھوپ اور شدید گرمی میں جب وہ لوگ جہنم کو دیکھیں گے تو دور سے وہ انہیں تین اطراف میں پھیلے ہوئے سائے والی کسی جگہ کی طرح نظر آئے گی۔ چنانچہ انہیں کہا جائے گا کہ اگر تمہیں وہ سایہ نظر آتا ہے تو چلو اس سائے کی طرف! لیکن اس "سائے" کی حقیقت یہ ہوگی کہ:

آیت ۳۱ ﴿لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾﴾ "نہ تو وہ سایہ دار ہے اور نہ ہی آگ کی تپش سے بچانے والا۔"

آیت ۳۲ ﴿اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾﴾ "وہ آگ اتنے بڑے بڑے انگارے پھینک رہی ہوگی جیسے کہ وہ محل ہوں۔"

آیت ۳۳ ﴿كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾﴾ "(یا) جیسے وہ زرد رنگ کے اونٹ ہوں۔"

آیت ۳۴ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ "(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔"

آیت ۳۵ ﴿هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ "یہ ہے وہ دن جس میں یہ بول نہیں سکیں گے۔"

آیت ۳۶ ﴿وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾ "اور نہ ہی انہیں اجازت دی جائے گی کہ وہ کوئی عذر تراشیں۔"

آیت ۳۷ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾﴾ "(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔"

آیت ۳۸ ﴿هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ﴾ ''یہ ہے فیصلے کا دن''
﴿جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''ہم نے جمع کرلیا تمہیں بھی اور پہلوں کو بھی۔''

آیت ۳۹ ﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾﴾ ''اب اگر تمہارے پاس کوئی چال ہے تو میرے خلاف وہ چال چل دیکھو۔''

آیت ۴۰ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیات ۴۱ تا ۵۰

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ۗ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًۢا بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا
اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝ وَيْلٌ
يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝ ع

اب دوسرے رکوع کی دس آیات میں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا جا رہا ہے۔ یہاں شروع میں اہل ایمان کا احوال بیان ہوا ہے اور آخر میں انتہائی اختصار کے ساتھ کفار کا ذکر آیا ہے۔

آیت ۴۱ ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾﴾ ''(اس دن) متقین یقیناً سائے اور چشموں کے ماحول میں ہوں گے۔''

آیت ۴۲ ﴿وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''اور ایسے پھلوں کے اندر جو انہیں پسند ہوں گے۔''
انہیں ایسے پھل دیے جائیں گے جنہیں کھانا انہیں بہت مرغوب ہوگا۔

آیت ۴۳ ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''(اور ہم ان سے کہہ دیں گے) کھاؤ پیو مزے سے رچتا پچتا' ان اعمال کے انعام کے طور پر جو تم کرتے رہے تھے۔''

آیت ۴۴ ﴿اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''یقیناً ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں اپنے محسن بندوں کو۔''

آیت ۴۵ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''
اس کے بعد اب روئے سخن پھر کفار و مشرکین کی طرف ہو گیا ہے۔

آیت ۴۶ ﴿كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''(اے کفار و مشرکین!) تم کھا پی لو تھوڑی دیر کے لیے' یقیناً تم لوگ مجرم ہو۔''
تم لوگ اپنی دُنیوی زندگی میں عیش کر رہے ہو تو کرتے جاؤ۔ بالآخر قیامت کے دن تمہیں مجرمون

حیثیت سے ہمارے سامنے پیش ہونا ہے۔

آیت ۴۷ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۝﴾ ”جس دن ہلاکت اور بربادی ہوگی (تمہارے جیسے تمام) جھٹلانے والوں کے لیے۔“

آیت ۴۸ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ۝﴾ ”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اپنے رب کے سامنے) جھکو تو یہ جھکتے نہیں ہیں۔“

آیت ۴۹ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۝﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

آیت ۵۰ ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ۝﴾ ”تو اب اس (قرآن) کے بعد یہ اور کس کلام پر ایمان لائیں گے؟“

قرآن جیسا کلام سن کر بھی جس انسان کی آنکھیں نہیں کھلیں، تو اس کے بعد اس کی آنکھیں بھلا کب کھلیں گی؟

سُوْرَةُ النَّبَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ تا ۳۰

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝١ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝٢ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝٣ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٤ ثُمَّ
كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٥ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝٦ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝٧ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝٨
وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝٩ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝١٠ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝١١ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ
سَبْعًا شِدَادًا ۝١٢ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝١٣ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝١٤ لِّنُخْرِجَ بِهٖ
حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝١٥ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝١٦ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۝١٧ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ
فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝١٨ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝١٩ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝٢٠ اِنَّ
جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝٢١ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ۝٢٢ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝٢٣ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا
وَّلَا شَرَابًا ۝٢٤ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۝٢٥ جَزَآءً وِّفَاقًا ۝٢٦ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۝٢٧ وَّكَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۝٢٨ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۝٢٩ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝٣٠ ع

آیت ۱ ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝١﴾ ”کس چیز کے بارے میں یہ لوگ آپس میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟“

یہ منظر کشی کا بہت خوبصورت انداز ہے۔ ان دو الفاظ میں گویا اس بے چینی اور ہلچل کی تصویر کھینچ دی گئی ہے جو اہل مکہ کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے سبب پیدا ہوگئی تھی۔ جیسے ہر شخص کے ذہن میں ایک ہی سوال ہو کہ محمد (ﷺ) نے یہ کیا نئی بات کر دی ہے؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو جائے گی! پھر قیامت برپا ہو گی! تمام انسانوں کو پھر سے زندہ کر لیا جائے گا! ہر انسان سے اس کے ایک ایک عمل کا حساب ہوگا! وہاں کوئی کسی کا پرسانِ حال اور مددگار نہیں ہوگا! بھلا یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ مرنے کے بعد سب کا پھر سے زندہ ہو جانا؟ اتنے انسانوں کا حساب کتاب؟ ایک ایک عمل کا محاسبہ؟ نہیں' نہیں عقل نہیں مانتی! گویا مکہ کے ہر گھر میں یہی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں' ہر محفل اور ہر چوپال میں انہی سوالات پر تبصرے ہو رہے ہیں' پورے شہر کی فضا میں ایک ہی موضوع گردش کر رہا ہے۔ غرض جہاں کہیں چار لوگ اکٹھے ہوتے ہیں ان کی گفتگو کی تان یہیں پر آ کر ٹوٹتی ہے۔

آیت ۲ ﴿عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝٢﴾ ”اُس بڑی خبر کے بارے میں۔“

یعنی قیامت کی خبر کے بارے میں۔ جیسے سورۃ المدثر میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾﴾ ''یقیناً یہ بہت بڑی باتوں میں سے ایک بات ہے۔''

آیت ۳ ﴿الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ﴿٣﴾﴾ ''جس کے بارے میں یہ اختلافِ رائے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔''

قیامت کے بارے میں تفصیلات سن کر ان میں سے کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد انسانوں کا دوبارہ زندہ ہونا بالکل بعید از قیاس ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہمارے معبودوں کے ہوتے ہوئے ہم سے کوئی محاسبہ نہیں ہو سکتا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں! ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا ہے۔

آیت ۴ ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴿٤﴾﴾ ''نہیں! عنقریب یہ جان لیں گے۔''

عنقریب اصل حقیقت ان لوگوں پر منکشف ہو جائے گی۔ وقت آنے پر یہ لوگ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیں گے۔ سورۂ قٓ میں اس کیفیت کا ذکر اس طرح ہوا ہے: ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِىْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿٢٢﴾﴾ ''(اللہ فرمائے گا: اے انسان!) تو اس دن سے غفلت میں رہا تھا نا! تو آج ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے' تو آج تمہاری نگاہ کتنی تیز ہو گئی ہے۔''

آیت ۵ ﴿ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴿٥﴾﴾ ''ہاں کوئی بات نہیں! عنقریب یہ جان لیں گے۔''

عالمِ دنیا اور عالمِ برزخ کے درمیان صرف موت کا پردہ حائل ہے۔ جونہی کسی انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے یہ پردہ اٹھ جاتا ہے۔ قبر عالمِ برزخ کی پہلی منزل ہے۔ اس منزل پر پہنچتے ہی ہر انسان اصل حقیقت کو جان جاتا ہے۔ چنانچہ وہ وقت دور نہیں جب ان میں سے ہر شخص پر اصل حقائق عیاں ہو جائیں گے۔

آیت ۶ ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ﴿٦﴾﴾ ''کیا ہم نے نہیں بنا دیا زمین کو بچھونا؟''

آیت ۷ ﴿وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴿٧﴾﴾ ''اور پہاڑوں کو میخیں؟''

زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لیے پہاڑوں کو اس میں میخوں کی طرح گاڑ دیا۔

آیت ۸ ﴿وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ﴿٨﴾﴾ ''اور تمہیں ہم نے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔''

آیت ۹ ﴿وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ﴿٩﴾﴾ ''اور تمہاری نیند کو بنا دیا ہم نے تھکان دور کرنے والی۔''

آیت ۱۰ ﴿وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿١٠﴾﴾ ''اور رات کو ہم نے بنا دیا ڈھانپ لینے والی۔''

آیت ۱۱ ﴿وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿١١﴾﴾ ''اور دن کو ہم نے بنا دیا معاش (کی جدوجہد) کے لیے۔''

آیت ۱۲ ﴿وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴿١٢﴾﴾ ''اور تمہارے اوپر بنا دیے ہم نے سات مضبوط آسمان۔''

آیت ۱۳ ﴿وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿١٣﴾﴾ ''اور ہم نے (سورج کو) بنا دیا ایک روشن چراغ۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿١٤﴾﴾ ''اور ہم نے اتار دیا نچڑنے والی بدلیوں سے چھاجوں پانی۔''

یعنی ہم پانی سے لبریز بادلوں سے موسلا دھار بارش برساتے ہیں۔

آیت ۱۵ ﴿لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝۱۵﴾ ”تاکہ اس کے ذریعے سے ہم نکالیں اناج اور دوسرے نباتات۔“

آیت ۱۶ ﴿وَّجَنّٰتٍ اَلۡفَافًا ۝۱۶﴾ ”اور بڑے گھنے باغات بھی۔“

آیت ۱۷ ﴿اِنَّ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ كَانَ مِيۡقَاتًا ۝۱۷﴾ ”یقیناً فیصلے کا دن ایک معین وقت ہے۔“

یہ ہے وہ اصل بات جس کے لیے بطور تمہید گزشتہ آیات میں اللہ کی رنگارنگ نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے اپنی نعمتوں کا اس قدر وسیع دستر خوان بچھایا ہے تو اس نے انسانوں پر لازماً کچھ ذمہ داریاں بھی ڈالی ہوں گی۔ جب خود انسانوں کے ہاں اصول ہے کہ ذمہ داریاں (responsibilities) اور مراعات (privileges) ایک ساتھ چلتی ہیں تو یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان پر اپنی عطاؤں کی بارش تو کرتا رہے اور اس پر ذمہ داری کوئی بھی نہ ڈالے۔ اس لیے تم لوگ یہ مت سمجھو کہ تم من مانی زندگی گزارتے رہو گے اور تم سے کوئی جوابدہی نہیں ہوگی۔ نہیں‘ تم سے ایک ایک ذمہ داری اور ایک ایک نعمت کا حساب ہوگا اور اس کے لیے ہم نے فیصلے کا ایک دن پہلے سے مقرر کر رکھا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿يَّوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا ۝۱۸﴾ ”جس دن پھونکا جائے گا صور میں تو تم سب چلے آؤ گے فوج در فوج۔“

اس کیفیت کا نقشہ سورۃ المعارج میں اس طرح دکھایا گیا ہے: ﴿يَوۡمَ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمۡ اِلٰى نُصُبٍ يُّوۡفِضُوۡنَ ۝۴۳﴾ ”جس دن وہ نکلیں گے اپنی قبروں سے دوڑتے ہوئے‘ جیسے کہ نشان زدہ اہداف کی طرف بھاگے جا رہے ہوں۔“

آیت ۱۹ ﴿وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتۡ اَبۡوَابًا ۝۱۹﴾ ”اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس میں دروازے ہی دروازے بن جائیں گے۔“

آیت ۲۰ ﴿وَّسُيِّرَتِ الۡجِبَالُ فَكَانَتۡ سَرَابًا ۝۲۰﴾ ”اور پہاڑ چلا دیے جائیں گے تو وہ ہو جائیں گے چمکتی ہوئی ریت۔“

آیت ۲۱ ﴿اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتۡ مِرۡصَادًا ۝۲۱﴾ ”یقیناً جہنم گھات میں ہے۔“

جہنم تو مجرم انسانوں کی صورت میں اپنے ایندھن کا انتظار کر رہی ہے۔

آیت ۲۲ ﴿لِّلطّٰغِيۡنَ مَاٰبًا ۝۲۲﴾ ”وہ ٹھکانہ ہے سرکش لوگوں کا۔“

آیت ۲۳ ﴿لّٰبِثِيۡنَ فِيۡهَآ اَحۡقَابًا ۝۲۳﴾ ”وہ رہیں گے اس میں قرن ہا قرن۔“

آیت ۲۴ ﴿لَا يَذُوۡقُوۡنَ فِيۡهَا بَرۡدًا وَّلَا شَرَابًا ۝۲۴﴾ ”وہ نہیں چکھیں گے اس میں کوئی ٹھنڈی شے اور نہ کوئی مشروب۔“

آیت ۲۵ ﴿اِلَّا حَمِيۡمًا وَّغَسَّاقًا ۝۲۵﴾ ”سوائے کھولتے ہوئے پانی اور بہتی ہوئی پیپ کے۔“

آیت ۲۶ ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا ۝۲۶﴾ ”بدلہ (ان کے اعمال کا) پورا پورا۔“

ان لوگوں نے جیسے اعمال کیے ہوں گے' ویسا ہی ان لوگوں کے ساتھ وہاں سلوک کیا جائے گا۔

آیت ۲۷ ﴿اِنَّهُمۡ کَانُوۡا لَا یَرۡجُوۡنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾﴾ ''یہ لوگ کسی حساب کتاب کی کوئی توقع نہیں رکھتے تھے۔''

آیت ۲۸ ﴿وَّ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا کِذَّابًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور انہوں نے جھٹلا دیا تھا ہماری آیات کو دھڑلے کے ساتھ۔''

آیت ۲۹ ﴿وَ کُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰهُ کِتٰبًا ﴿۲۹﴾﴾ ''اور ہم نے تو ہر چیز کو گن گن کر لکھ رکھا ہے۔''

آیت ۳۰ ﴿فَذُوۡقُوۡا فَلَنۡ نَّزِیۡدَکُمۡ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾﴾ ''تو اب چکھو! ہم ہرگز اضافہ نہیں کریں گے تمہارے لیے مگر عذاب ہی میں۔''

تمہارے اس عذاب کی شدت ہر لحظہ بڑھتی چلی جائے گی ـــــ اب اگلی آیات میں اہلِ جنت کا ذکر ہے:

آیات ۳۱ تا ۴۰

اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا ۙ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَ اَعۡنَابًا ۙ﴿۳۲﴾ وَّ کَوَاعِبَ اَتۡرَابًا ۙ﴿۳۳﴾ وَّ کَاۡسًا دِهَاقًا ﴿ؕ۳۴﴾ لَا یَسۡمَعُوۡنَ
فِیۡهَا لَغۡوًا وَّ لَا کِذّٰبًا ﴿ۚ۳۵﴾ جَزَآءً مِّنۡ رَّبِّکَ عَطَآءً حِسَابًا ۙ﴿۳۶﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا
بَیۡنَهُمَا الرَّحۡمٰنِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مِنۡهُ خِطَابًا ﴿ۚ۳۷﴾ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَ الۡمَلٰٓئِکَةُ صَفًّا ؕ﴿ۙ۳۸﴾ لَّا
یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِکَ الۡیَوۡمُ الۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ
اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّاۤ اَنۡذَرۡنٰکُمۡ عَذَابًا قَرِیۡبًا ۚۖ یَّوۡمَ یَنۡظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ یَدٰهُ وَ یَقُوۡلُ
الۡکٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾ ع

آیت ۳۱ ﴿اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾﴾ ''یقیناً اہلِ تقویٰ کے لیے کامیابی ہوگی۔''

آیت ۳۲ ﴿حَدَآئِقَ وَ اَعۡنَابًا ﴿۳۲﴾﴾ ''(ان کے لیے) باغ اور انگور ہوں گے۔''

آیت ۳۳ ﴿وَّ کَوَاعِبَ اَتۡرَابًا ﴿۳۳﴾﴾ ''اور نو جوان ہم عمر بیویاں۔''

آیت ۳۴ ﴿وَّ کَاۡسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾﴾ ''اور جام چھلکتے ہوئے۔''

آیت ۳۵ ﴿لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا وَّ لَا کِذّٰبًا ﴿۳۵﴾﴾ ''وہ نہیں سنیں گے اس میں کوئی لغو بات اور نہ جھوٹ۔''

آیت ۳۶ ﴿جَزَآءً مِّنۡ رَّبِّکَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾﴾ ''یہ بدلہ ہوگا آپ کے رب کی طرف سے' دیا ہوا حساب سے۔''

یہ سب کچھ ان لوگوں کی محنت اور قربانیوں کے بدلے کے طور پر انہیں عطا کیا جائے گا۔

آیت ۳۷ ﴿رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَهُمَا الرَّحۡمٰنِ﴾ ''جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے مابین ہے' جو الرحمٰن ہے۔''

﴿لَا یَمۡلِکُوۡنَ مِنۡهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾﴾ ''ان (میں سے کسی) کو ہمت نہیں ہوگی اس سے بات کرنے کی۔''

آیت ۳۸ ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۗ﴾ ''جس دن کھڑے ہوں گے جبرائیل اور تمام فرشتے صفیں باندھے۔''

﴿لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ﴾ ''وہ کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اُس کے جسے رحمٰن کی طرف سے اجازت مل جائے''

﴿وَقَالَ صَوَابًا ۝﴾ ''اور وہ بات بھی درست کرے۔''

آیت ۳۹ ﴿ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ﴾ ''یہ دن حق ہے!''

یعنی قیامت کا دن ایک اٹل حقیقت ہے' جیسا کہ سورۃ الواقعہ میں فرمایا گیا: ﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝﴾ ''جب وہ ہونے والا واقعہ رونما ہو جائے گا۔ (اور جان لو) اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے''۔ سورۃ الحاقہ میں قیامت کے اٹل ہونے کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿اَلْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاقَّةُ ۝﴾ ''وہ حق ہو جانے والی۔ کیا ہے وہ حق ہو جانے والی؟ اور تم نے کیا سمجھا کہ وہ حق ہونے والی کیا ہے؟''

﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝﴾ ''تو جو چاہے اپنے رب کی طرف اپنا ٹھکانہ بنا لے۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ﴾ ''دیکھو! ہم نے تو تمہیں خبردار کر دیا ہے اس عذاب سے جو بالکل قریب ہے۔''

تصور کیجیے' یہ عذاب انسان کے کتنا قریب ہے! ادھر انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے' ادھر اسے قبر میں اتارنے کا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔ اور قبر کیا ہے؟ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ((اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ))(۱) ''قبر یا تو جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا''۔ گویا ہر زندہ انسان اس باغیچے یا گڑھے سے صرف چند گھنٹوں کے فاصلے پر بیٹھا ہے۔

﴿يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ﴾ ''جس دن انسان دیکھ لے گا جو اُس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا''

﴿وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝﴾ ''اور کافر کہے گا: کاش کہ میں مٹی ہوتا!''

کاش مجھے شرفِ انسانیت ملا ہی نہ ہوتا! ''مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے!'' کاش میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا!(۲)

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب صفة القیامة والرقائق والورع' باب منه' ح:۲٤٦٠' راوی: ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ۔

(۲) بعض روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ حیوانات کے درمیان بھی عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا' حتیٰ کہ ایک سینگ والی بکری نے بے سینگ والی پر کوئی زیادتی کی ہوگی تو اس کا بھی بدلہ دلائے گا۔ اس سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ جانوروں کو حکم دے گا کہ مٹی ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ مٹی ہو جائیں گے۔ اس وقت کافر بھی آرزو کریں گے کہ کاش وہ بھی حیوان ہوتے اور آج مٹی بن جاتے۔ (تفسیر ابن کثیر)

سُوْرَةُ النّٰزِعٰت

سورۃ الصافات، سورۃ الذاریات اور سورۃ المرسلات کے بعد سورۃ النازعات پے در پے قسموں سے شروع ہونے والی قرآن مجید کی چوتھی سورت ہے۔ اس سورت کے آغاز میں مذکور قسموں کے بارے میں اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ ان میں فرشتوں کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ تا ۲۶

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ
اَمْرًا ﴿۵﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۶﴾ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ﴿۷﴾ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾ اَبْصَارُهَا
خَاشِعَةٌ ﴿۹﴾ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿۱۱﴾ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا
كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ
مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ
هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ
وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ
الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾ ع

آیت ۱ ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو غوطہ لگا کر کھینچتے ہیں۔''

نزع کے معنی سختی سے کھینچنے کے ہیں۔ یعنی ان فرشتوں کی قسم جو انسان کے وجود کی گہرائی میں اتر کر بڑی سختی اور شدت سے اس کی جان کو کھینچ نکالتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ﴿۲﴾﴾ ''اور ان (فرشتوں) کی قسم جو گرہیں کھولتے ہیں آسانی سے۔''

یہ بھی انسان کی جان قبض ہونے کی ہی ایک کیفیت کا ذکر ہے۔ حضور ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ جب فرشتہ بندۂ مؤمن کی جان قبض کرتا ہے تو اسے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے مشک کے بند منہ سے پانی کا ایک قطرہ ٹپک گیا ہے اور جب وہ کسی کافر کی جان قبض کرتا ہے تو اسے ایسی سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے سیخ پر سے کباب کھینچا جا رہا ہے (اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک)۔ بہرحال یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان دونوں کیفیات کا تعلق

انسان کی روح سے ہے اس کے ظاہری جسم سے نہیں۔ جسمانی طور پر تو اللہ تعالیٰ کے بہت سے نیک بندوں پر بھی نزع کا وقت سخت انداز میں وارد ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ظاہری تکلیف تو خود حضور ﷺ پر بھی طاری ہوئی تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت فاطمہ ؓ حضور ﷺ کی تکلیف کو دیکھ کر بار بار روتی تھیں اور انؓ کے منہ سے بے اختیار یا ابتاہ! یا ابتاہ! (ہائے میرے ابا جانؐ کی یہ تکلیف!) کے الفاظ نکلتے تھے۔ حضور ﷺ یہ سن کر فرماتے کہ بیٹی آج کے بعد تیرے باپ کے لیے کوئی سختی نہیں ہے۔ فداہ آبائنا وامھاتنا!

آیت ۳ ﴿وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ③﴾ ''اور ان (فرشتوں) کی قسم جو تیزی سے تیرتے ہوئے جاتے ہیں۔''

فرشتے تیرتے ہوئے ان ارواح کو لے کر کہاں جاتے ہیں اور انہیں کہاں رکھا جاتا ہے؟ اس بارے میں وضاحت آگے سورۃ المُطفِّفین میں آئے گی۔

آیت ۴ ﴿فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ④﴾ ''پھر وہ (تعمیلِ ارشاد میں) ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

آیت ۵ ﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ⑤﴾ ''پھر (حسبِ حکم) معاملات کی تدبیر کرتے ہیں۔''

یعنی ہر مرنے والے کی روح کو فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سِجّین یا عِلّیّین میں لے جاتے ہیں۔ یہاں پر ان قسموں کا جواب یا مقسم علیہ چونکہ محذوف ہے اس لیے ان قسموں کا مقسم علیہ بھی وہی تصور ہوگا جو سورۃ الذاریات اور سورۃ المرسلات میں مذکور ہے۔ یعنی: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ⑤ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ⑥﴾ (الذّٰریٰت) ''جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔ اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی''۔ اور ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ⑦﴾ (المرسلٰت) ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً واقع ہو کر رہے گی۔''

آیت ۶ ﴿یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ ⑥﴾ ''جس دن کانپے گی کانپنے والی۔''

یعنی قیامت کے دن شدید زلزلے کی وجہ سے پوری زمین لرز اٹھے گی۔ قیامت کے زلزلے اور اس دن کی ہولناک کیفیات کا ذکر قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ الحج کی ابتدائی آیات کا یہ انداز بہت عبرت آموز ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ① یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰی وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰی وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ②﴾

''اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے رب کا' یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہوگا۔ جس دن تم اُس کو دیکھو گے اس دن (حال یہ ہوگا کہ) بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی جسے وہ دودھ پلاتی تھی اور (دہشت کا عالم یہ ہوگا کہ) ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور تم دیکھو گے لوگوں کو جیسے وہ نشے میں ہوں' حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی بہت سخت ہے۔''

آیت ۷ ﴿تَتْبَعُهَا الرَّادِفَۃُ ⑦﴾ ''اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا آئے گا۔''

اس سے نفخہ ثانیہ مراد ہے‘ جس کے بعد سب مُردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔

آیت ۸ ﴿قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ﴾ ”کتنے ہی دل اس دن (خوف کے مارے) دھڑک رہے ہوں گے۔“

آیت ۹ ﴿اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ﴾ ”ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔“

فرطِ خوف سے آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں گی‘ اوپر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوگی۔

آیت ۱۰ ﴿يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ﴾ ”یہ لوگ کہتے ہیں: کیا ہمیں لوٹا دیا جائے گا اُلٹے پاؤں؟“

کہ کیا مرنے کے بعد ہمیں پھر سے زندہ کر دیا جائے گا؟

آیت ۱۱ ﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾ ”کیا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو چکے ہوں گے؟“

آیت ۱۲ ﴿قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ﴾ ”کہتے ہیں: تب تو یہ لوٹنا بہت گھاٹے کا سودا ہوگا۔“

قیامت سے متعلق خبروں پر وہ لوگ طنزیہ انداز میں ایسے تبصرے کرتے تھے۔

آیت ۱۳ ﴿فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ ”حالانکہ یہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی۔“

آیت ۱۴ ﴿فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾ ”تو وہ سب کے سب ایک چٹیل میدان میں ہوں گے۔“

نفخہ ثانیہ کے بعد سب کے سب انسان زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

آیت ۱۵ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى﴾ ”کیا آپ تک موسیٰ کی خبر پہنچی ہے؟“

آیت ۱۶ ﴿اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ ”جب اُس کو پکارا تھا اُس کے پروردگار نے طویٰ کی مقدس وادی میں۔“

یہ واقعہ سورۃ الاعراف‘ سورۂ طٰہٰ اور سورۃ القصص میں بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ یہاں اس چھوٹی سورت میں اس کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ آیا ہے۔

آیت ۱۷ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ ”کہ جاؤ فرعون کے پاس‘ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حکم کے تحت اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے فرعون کے پاس گئے تھے۔

آیت ۱۸ ﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰى اَنْ تَزَكّٰى﴾ ”اور اسے کہو کہ کیا تو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے؟“

آپؑ اس کے پاس جا کر اسے باقاعدہ دعوت دیں‘ تا کہ اگر وہ راہِ راست پر آنا چاہے تو آ جائے اور اپنے عقائد و اعمال کو درست کر لے۔

آیت ۱۹ ﴿وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى﴾ ”اور میں تمہاری راہنمائی کروں تمہارے رب کی طرف تاکہ تمہارے اندر خشیت پیدا ہو؟“

آیت ۲۰ ﴿فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى﴾ ”تو موسیٰؑ نے اس کو دکھائی بہت بڑی نشانی۔“

حضرت موسٰیؑ نے فرعون کو اپنی رسالت کے بارے میں بھی بتایا' اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی اس تک پہنچایا اور عصا کے اژدھا بن جانے والا معجزہ بھی اسے دکھا دیا۔

آیت ۲۱ ﴿فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾﴾ ''لیکن اُس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی۔''

آیت ۲۲ ﴿ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾﴾ ''پھر وہ پلٹا بھاگ دوڑ کرنے کے لیے۔''

حضرت موسٰیؑ کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے ملک بھر سے ماہر جادوگروں کو اکٹھا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

آیت ۲۳ ﴿فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾﴾ ''پھر اس نے (اپنی رعیت کو) جمع کیا اور اعلان کیا۔''

آیت ۲۴ ﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾﴾ ''پس کہا کہ میں ہوں تمہارا سب سے بڑا ربّ!''

ظاہر ہے فرعون نے خود کو ''ربّ'' اس معنی میں نہیں کہا تھا کہ وہ اس کائنات کا یا اپنے ملک کے لوگوں کا خالق ہے' بلکہ وہ تو خود باطل معبودوں کو پوجتا تھا (سورۃ الاعراف کی آیت ۱۲۷ سے ثابت ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں نے پوجا پاٹ کے لیے اپنے کچھ معبود بھی بنا رکھے تھے)۔ پھر اس کی رعیت میں بہت سے بڑے بوڑھے لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کے سامنے وہ پیدا ہوا ہوگا اور جنہوں نے اس کا بچپن بھی دیکھا ہوگا۔ گویا اسے خود بھی معلوم تھا اور اس کی رعیت کے تمام لوگ بھی جانتے تھے کہ وہ عام انسانوں کی طرح پیدا ہوا ہے اور بحیثیت انسان وہ دوسرے عام انسانوں جیسا ہی ہے۔ چنانچہ اس کا مذکورہ دعویٰ دراصل حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہونے کا دعویٰ تھا۔ اپنے اس دعوے کی مزید وضاحت اس نے ان الفاظ میں کی تھی: ﴿يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ﴾ (الزخرف: ۵۱) ''اے میری قوم کے لوگو! کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟'' کہ دیکھو اس پورے ملک پر میرا حکم چلتا ہے' پورے ملک کا نہری نظام بھی میرے تابع ہے' میں جسے جو چاہوں عطا کروں اور جسے چاہوں محروم رکھوں' میں مطلق اختیار اور اقتدار کا مالک ہوں۔ یہ تھا اس کا اصل دعویٰ اور یہی دعویٰ اپنے زمانے میں نمرود کا بھی تھا۔

یہ دعویٰ دراصل اللہ تعالیٰ کے اقتدار و اختیار کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے اور اس لحاظ سے بہت بڑا شرک ہے۔ آج بدقسمتی سے یہ سیاسی شرک ''عوام کی حکومت'' کے لیبل کے ساتھ پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ نمرودی اور فرعونی دور میں تو شرک کی گندگی کا یہ ٹوکرا کوئی ایک شخص اٹھائے پھرتا تھا' یعنی ''حاکمیت'' کا دعوے دار کوئی ایک شخص ہوا کرتا تھا' جبکہ آج اس گندگی کو تولوں اور ماشوں میں بانٹ کر ملک کے ہر شہری کو اس میں حصہ دار بنا دیا گیا ہے۔ ''جدید دور'' میں اس سیاسی شرک کو نئے بھیس میں متعارف کرانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی تعبیر علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کی زبان سے اس طرح کی ہے: ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

آیت ۲۵ ﴿فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾﴾ ''تو پکڑ لیا اس کو اللہ نے آخرت اور دنیا کی

سزائیں۔''

دنیا کی سزا کے طور پر تو اسے اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق کر دیا گیا۔ جہاں تک اس کی آخرت کی سزا کا تعلق ہے اس کا ذکر قرآن میں جا بجا ہوا ہے کہ وہ بہت بھیانک ہوگی۔

آیت ۲۶ ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی ؀﴾ ''یقیناً اس میں عبرت ہے اس کے لیے جو ڈرتا ہے۔''

اشتقاقی اعتبار سے لفظ ''عبرت'' کا تعلق ''عبور'' سے ہے' اور عبور کے معنی ہیں دریا وغیرہ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانا۔ اس حوالے سے لفظ عبرت کے معنی ایک چیز کو دیکھ کر اس سے ملتی جلتی کسی دوسری چیز کی حقیقت کو سمجھنے اور اس خاص معاملے میں سبق حاصل کرنے کے ہیں۔

آیات ۲۷ تا ۴۶

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ؀ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ؀ وَاَغْطَشَ لَیْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ؀ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؀ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ؀ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ؀ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؀ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰی ؀ یَوْمَ یَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی ؀ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی ؀ فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ؀ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؀ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ؀ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ؀ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ؀ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا ؀ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ؀ اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ؀ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰىهَا ؀ كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ؀ ع

اب اگلی آیات میں بعث بعد الموت کے حوالے سے مشرکین کے طنزیہ تبصروں کا تفصیلی جواب دیا جا رہا ہے:

آیت ۲۷ ﴿ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ؀﴾ ''(اے لوگو! ذرا سوچو!) کیا تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمان کی؟ اس نے اسے تخلیق کیا۔''

آیت ۲۸ ﴿رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ؀﴾ ''اس کے گنبد کو بلند کیا' پھر اسے ہر طرح سے درست کیا۔''

آیت ۲۹ ﴿وَاَغْطَشَ لَیْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ؀﴾ ''اور اس کی رات کو اندھیرا کر دیا اور اس کے دن کو ظاہر کر دیا۔''

آیت ۳۰ ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؀﴾ ''اور زمین کو اس کے بعد بچھا دیا۔''

آیت ۳۱ ﴿اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ؀﴾ ''اس میں سے نکالا اس کا پانی اور اس کا چارہ۔''

یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر لائق توجہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جتنا پانی موجود ہے اس کا منبع خود زمین ہے۔

آج سائنسی معلومات کی روشنی میں ہم اس کی وضاحت یوں کر سکتے ہیں کہ ابتدا میں زمین آگ کا ایک گولا تھی۔ جوں جوں یہ ٹھنڈی ہوتی گئی اس کے بخارات نکل کر فضا میں جمع ہوتے رہے۔ اس طرح زمین کے اردگرد مختلف گیسوں پر مشتمل ایک غلاف سا بن گیا' جسے آج ہم فضا (atmosphere) کہتے ہیں۔ پھر کسی مرحلے پر فضا میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پانی بنا۔ یہ پانی فضا سے بارش کی شکل میں سالہا سال تک زمین پر برستا رہا۔ اس کے بعد سورج کی تپش سے بخارات اٹھنے' بادل بننے اور بارش برسنے کے معمول پر مشتمل پانی کا وہ مربوط نظام بنا جسے آج کی سائنس نے واٹر سائیکل (water cycle) کا نام دیا ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقدار کے مطابق دنیا میں پانی پیدا فرما کر زمین پر موجود ''زندگی'' کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کی رسد اور ترسیل کا ایک خوبصورت نظام (cycle) تشکیل دے دیا ہے۔ اس نظام کے تحت سمندروں کے بخارات سے بادل بنتے ہیں۔ ان بادلوں سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کے تحت مختلف علاقوں میں بارش برستی ہے اور برفباری ہوتی ہے۔ پھر پہاڑوں پر برف کے وسیع ذخائر سے نالوں اور دریاؤں کے ذریعے نشیبی علاقوں کو سارا سال پانی کی سپلائی جاری رہتی ہے۔ گویا بارشوں اور پہاڑی گلیشیرز کے overhead tanks سے حاصل ہونے والے پانی سے پوری دنیا میں زیر زمین پانی کے ذخیرے کو رسد بھی مہیا ہوتی رہتی ہے اور ہر طرح کی ''زندگی'' کی تمام ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جو پانی بچ رہتا ہے وہ واپس سمندر میں چلا جاتا ہے۔

آیت ۳۲ ﴿وَالۡجِبَالَ اَرۡسٰىهَا ۝۳۲﴾ ''اور پہاڑوں کو اس میں گاڑ دیا۔''

آیت ۳۳ ﴿مَتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ ۝۳۳﴾ ''سامانِ زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے۔''

آیت ۳۴ ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الۡكُبۡرٰى ۝۳۴﴾ ''پھر جب برپا ہوگا وہ بڑا ہنگامہ۔''

آیت ۳۵ ﴿يَوۡمَ يَتَذَكَّرُ الۡاِنۡسَانُ مَا سَعٰى ۝۳۵﴾ ''اس دن انسان یاد کرے گا جو کچھ اُس نے بھاگ دوڑ کی تھی۔''

اُس دن انسان کی آنکھیں کھلیں گی اور جس شخص نے اپنی ساری زندگی دنیا کے مال و متاع کے پیچھے بھاگتے بھاگتے برباد کر دی تھی اسے معلوم ہو جائے گا کہ اب آخرت کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سورۃ الکہف کی اس آیت میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے: ﴿قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ۝۱۰۳ اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ۝۱۰۴﴾ ''آپ کہیے: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی سعی و جہد دُنیا ہی کی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔''

آیت ۳۶ ﴿وَبُرِّزَتِ الۡجَحِيۡمُ لِمَنۡ يَّرٰى ۝۳۶﴾ ''اور کھول کر رکھ دی جائے گی جہنم ہر دیکھنے والے کے لیے۔''

آیت ۳۷ ﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰى﴿۳۷﴾﴾ ”پس جس نے سرکشی کی تھی۔“

آیت ۳۸ ﴿وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴿۳۸﴾﴾ ”اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی۔“

آیت ۳۹ ﴿فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى﴿۳۹﴾﴾ ”تو یقیناً اس کا ٹھکانہ اب جہنم ہی ہے۔“

ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ یہ تین آیات ہمیشہ کے لیے اپنی گرہ میں باندھ لے اور اپنی عملی زندگی میں ان کے مفہوم اور پیغام کو اپنے دل و دماغ میں ہر وقت مستحضر رکھے۔ طَغٰی کے معنی ہیں کسی کا اپنی حدود سے تجاوز کرنا۔ اسی معنی میں ہمارے ہاں طغیانی کا لفظ معروف ہے اور اسی مفہوم میں اس مادہ سے لفظ ”طاغوت“ مشتق ہے۔ چنانچہ ان آیات کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت) یعنی جنوں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ اس کے ”بندے“ بن کر رہیں۔ اب جب کوئی انسان ”بندگی“ کی حدود سے آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے قانون' اپنے اختیار اور اپنی مرضی کی بات کرے گا تو وہ ”بندے“ کے بجائے ”طاغوت“ بن جائے گا۔ چنانچہ جو ”بندہ“ بندگی کی حدود سے تجاوز کر کے طاغوت بن گیا اور پھر اس نے اپنی سوچ' اپنی مرضی' اپنی منصوبہ بندی اور اپنے فیصلوں میں آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دینے کی روش اپنالی تو آخرت میں اس کے لیے جہنم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔

آیت ۴۰ ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ﴾ ”اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے (کے خیال) سے“

سورۃ الحاقہ میں اس پیشی کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے: ﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ﴿۱۸﴾﴾ ”جس دن تم پیش کیے جاؤ گے تمہاری کوئی مخفی سے مخفی شے بھی چھپی نہیں رہے گی۔“

﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾﴾ ”اور اُس نے روکے رکھا اپنے نفس کو خواہشات سے۔“

اس نے اپنی زندگی میں اپنے نفس کی باگیں ہمیشہ کھینچ کر رکھیں اور غلط خواہشات کے معاملے میں اسے منہ زوری نہ کرنے دی۔

آیت ۴۱ ﴿فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى﴿۴۱﴾﴾ ”تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ جنت ہی ہے۔“

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ ' اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ ۔ آمین!

آیت ۴۲ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا﴿۴۲﴾﴾ ”(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں قیامت کے بارے میں کہ وہ کب آکر ٹھہرے گی؟“

آیت ۴۳ ﴿فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا﴿۴۳﴾﴾ ”آپ کا کیا تعلق ہے اس کے بیان کرنے سے؟“

آپ کو اس لیے تو نہیں بھیجا گیا کہ آپ قیامت کے دن اور تاریخ کا تعین کر کے انہیں بتائیں' بلکہ آپ تو بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

آیت ۴۴ ﴿اِلٰی رَبِّکَ مُنۡتَہٰہَا ﴿ؕ۴۴﴾﴾ ''اس کا انجام تو آپ کے رب ہی کی طرف ہے۔''
یہ معاملہ تو آپؐ کے رب ہی کے حوالے ہے۔ اُس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کہ قیامت کب آئے گی۔

آیت ۴۵ ﴿اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ یَّخۡشٰہَا ﴿ؕ۴۵﴾﴾ ''آپؐ تو بس خبردار کرنے والے ہیں' ہر اُس شخص کو جو اس سے ڈرتا ہو۔''

جو لوگ قیامت کے تصور سے ڈرتے ہوں یا جو اس کے ذکر سے ڈر جائیں آپؐ انہیں خبردار کرتے رہیں' آپؐ کے خبردار کرنے سے ایسے لوگوں کا خوف اور تقویٰ مزید بڑھے گا۔ ظاہر ہے جس شخص کی روح میں زندگی کی کوئی رمق موجود ہے اس کے دل میں قیامت کے ذکر سے ضرور خشیت پیدا ہوگی۔

آیت ۴۶ ﴿کَاَنَّہُمۡ یَوۡمَ یَرَوۡنَہَا لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوۡ ضُحٰہَا ﴿۴۶﴾﴾ ''جس دن وہ اسے دیکھیں گے (انہیں یوں لگے گا) گویا وہ نہیں رہے (دنیا میں) مگر ایک شام یا اس کی ایک صبح۔''

قیامت کے دن انسان جب اپنی دنیوی زندگی کو یاد کرے گا تو اسے اپنی پوری زندگی ایسے نظر آئے گی جیسے وہ ایک دن کی بھی صرف چند گھڑیاں دنیا میں رہا تھا۔

سُوْرَۃُ عَبَسَ

تمہیدی کلمات

سورۂ عبس کی ابتدائی آیات میں ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے۔ سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے کہ ایک موقع پر حضورﷺ کے پاس قریش کے چند بڑے سردار (عتبہ‘ شیبہ‘ ابوجہل‘ اُمیہ بن خلف‘ ولید بن مغیرہ اور عباس بن عبدالمطلب وغیرہ) بیٹھے تھے اور آپؐ ان کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ عین اُس وقت جب آپؐ ان سے محوِ گفتگو تھے ایک نابینا صحابی عبداللہ بن اُمّ مکتوم ؓ وہاں آئے اور آدابِ مجلس کی رعایت کیے بغیر آپؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ عرض کر رہے تھے: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَرْشِدْنِیْ ''یارسول اللہ! مجھے سیدھا راستہ بتایئے''۔ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ عَلِّمْنِیْ مِمَّا عَلَّمَکَ اللّٰہُ ''یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے جو علم آپ کو سکھایا ہے اس میں سے مجھے بھی سکھایئے''۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ صورتِ حال کو سمجھتے اور آپؐ کی گفتگو ختم ہونے کا انتظار کرتے۔ ظاہر ہے وہ دیکھ تو نہیں سکتے تھے لیکن سن تو سکتے تھے کہ حضورﷺ گفتگو میں مصروف ہیں۔ بہرحال انؓ کی بار بار خللِ اندازی کی وجہ سے آپﷺ کے چہرۂ انور پر کچھ ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ بعض لوگوں نے محض یہ سمجھتے ہوئے ان آیات کی تاویلات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضورﷺ کے مقامِ رفیع کی مناسبت سے ایسا ممکن ہی نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ واقعہ بالکل اسی طرح سے پیش آیا تھا جس طرح یہاں ان آیات میں مذکور ہے۔

اس معاملے کی اصل حقیقت اور منطق کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر یہ نکتہ مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ حضورﷺ اپنے فرائضِ رسالت کی ادائیگی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہوئے ہر وہ طریقہ اور راستہ اختیار فرمانے کی کوشش میں رہتے تھے جو انسانی دائرۂ اختیار کی حد تک بہتر سے بہتر ہوتا۔ اب ظاہر ہے عرب کے قبائلی معاشرے میں دعوت و تبلیغ کے کام کو آگے بڑھانے کا مؤثر ترین طریقہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ اہم قبائل کی سرکردہ شخصیات کو اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے حضورﷺ مسلسل کوشش بھی کرتے‘ سردارانِ قریش کو مختلف انداز سے بار بار دعوت بھی دیتے اور دعا بھی فرماتے۔ آپؐ کے نزدیک یہ معاملہ اس حد تک اہم تھا کہ ایک مرتبہ آپؐ نے جھولی پھیلا کر بہت ہی غیر معمولی انداز میں دعا کی تھی کہ اے اللہ عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے کسی ایک کے ذریعے اسلام کو تقویت عطا فرما! ظاہر ہے معاشرے کے سرکردہ لوگوں میں سے اگر کوئی شخص ایمان لے آتا تو وہ اکیلا عوام الناس کے سینکڑوں افراد سے زیادہ اہم ہوتا۔ ایسی کسی شخصیت کی وجہ سے مجموعی طور پر اسلامی تحریک کو بھی تقویت ملتی اور مکہ کے ان نادار اور بے سہارا اہلِ ایمان کے مصائب میں بھی ضرور کچھ کمی واقع ہوتی جنہیں اس دور میں دن رات تشدد کا نشانہ بنایا جا

رہا تھا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر حضور ﷺ مکہ کے صاحبِ حیثیت لوگوں سے اپنی دعوتی ملاقاتوں کو خصوصی اہمیت دیتے تھے اور مذکورہ واقعہ کے وقت بھی آپؐ نے اسی وجہ سے سردارانِ قریش کے ساتھ اپنی گفتگو کو اہم خیال فرمایا۔ اس کے علاوہ اس معاملے کا ایک منطقی اور فطری پہلو یہ بھی ہے کہ ایسے مواقع پر بعض اوقات اپنوں کے مقابلے میں باہر کے لوگوں کو اس لیے بھی ترجیح دے دی جاتی ہے کہ وہ تو اپنے ہیں' وہ ساری صورتِ حال کو سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے وہ اپنے آپ کو نظر انداز کیے جانے پر برا نہیں منائیں گے۔

بہرحال نبی بھی آخر انسان ہوتا ہے اور اگر انسانی نفسیات و جذبات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ مذکورہ واقعہ پر حضور ﷺ کا ردِعمل بالکل فطری تھا اور یہ بھی کہ آپ کا یہ ردِعمل اعلیٰ تر مقصد کے لیے تھا۔ پھر اس معاملے کو حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْن کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں جتنا بلند کسی کا مقام ہوتا ہے اس کے لیے کردار و عمل کا معیار بھی اسی نسبت سے اعلیٰ رکھا جاتا ہے۔

ان آیات کے بارے میں حضور ﷺ نے خود بھی ''عتاب'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد جب بھی حضرت عبداللہ بن اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہ آپؐ کے پاس حاضر ہوتے تو آپؐ انہیں مخاطب کر کے فرماتے: ((مَرْحَبًا بِمَنْ عَاتَبَنِیْ فِیْهِ رَبِّیْ))(۱) ''مرحبا اس شخص کے لیے جس کے معاملے میں میرے رب نے مجھ پر عتاب فرمایا''۔ بہرحال اس واقعہ سے متعلق اگر مذکورہ تمام پہلوؤں کو مدِنظر رکھا جائے تو سارا معاملہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے اور متعلقہ آیات کی تاویل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۭ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۭ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۭ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ۭ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۭ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۭ مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۙ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۙ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۭ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۭ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۙ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۭ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۡ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۙ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۭ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ

(۱) علوم القرآن' اسباب النزول' ابوالحسن علی بن احمد بن محمد بن علی الواحدی۔

مُّسْفِرَةٌ ۙ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۚ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ؑ ع

آیت ۱ ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ①﴾ ''تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔''

یعنی حضرت عبداللہ کی بار بار خلل اندازی پر حضور ﷺ کے چہرۂ انور پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے اور آپ نے چہرۂ مبارک دوسری طرف کر لیا۔

آیت ۲ ﴿اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ②﴾ ''اس بات پر کہ آیا اُس کے پاس نابینا۔''

آیت ۳ ﴿وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ③﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ تزکیہ حاصل کرتا۔''

ممکن ہے آپ کی گفتگو سے استفادہ کر کے وہ بلند درجات تک پہنچ جاتا۔

آیت ۴ ﴿اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ④﴾ ''یا وہ نصیحت حاصل کرتا اور وہ نصیحت اس کے لیے مفید ہوتی۔''

آیت ۵ ﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ⑤﴾ ''لیکن وہ جو بے نیازی دکھاتا ہے۔''

ایک ایسا شخص جو آپ کی بات سننے کو تیار نہیں ہے۔

آیت ۶ ﴿فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ⑥﴾ ''آپ اُس کی تو فکر میں رہتے ہیں۔''

آیت ۷ ﴿وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ⑦﴾ ''اور اگر وہ پاکی اختیار نہیں کرتا تو آپ پر کوئی الزام نہیں۔''

آیت ۸ ﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ⑧﴾ ''اور وہ جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا ہے۔''

آیت ۹ ﴿وَهُوَ يَخْشٰى ⑨﴾ ''اور اس کے دل میں خشیت بھی ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ⑩﴾ ''تو اس سے آپ استغناء برت رہے ہیں۔''

آیت ۱۱ ﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ⑪﴾ ''ایسا ہرگز نہ کیجیے' یہ تو ایک یاد دہانی ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ⑫﴾ ''تو جو چاہے اس سے نصیحت اخذ کرلے۔''

آپ ان لوگوں کے پیچھے خود کو ہلکان نہ کریں' اگر ابوجہل اور ابولہب اس ہدایت سے مستفید نہیں ہونا چاہتے تو نہ ہوں آپ بھی ان کی پروا نہ کریں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ جیسے سورۃ الکہف میں فرمایا گیا:

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ㉘﴾

''اور اپنے آپ کو روکے رکھیے اُن لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کو پکارتے ہیں صبح و شام' وہ اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور آپ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں' (جس سے لوگوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ) آپ دُنیوی زندگی کی آرائش و زیبائش چاہتے ہیں! اور مت کہنا مانیے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے

غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے۔"

ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سردارانِ قریش کی طرف التفات (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ!) کسی ذاتی غرض کی وجہ سے تو نہیں تھا بلکہ آپؐ اسلام کی تقویت کے لیے ان کے قبولِ اسلام کے آرزو مند تھے ـــ لیکن ان کی موجودگی میں اپنے کسی ساتھی سے بے اعتنائی لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی تھی کہ آپؐ ان لوگوں کی دولت و ثروت کی وجہ سے ان کی طرف ملتفت ہیں اور اپنے نادار ساتھیوں سے مغائرت برت رہے ہیں۔

اگلی آیات عظمتِ قرآن کے ذکر کے حوالے سے پورے قرآن میں منفرد اور ممتاز حیثیت کی حامل ہیں۔ سیاق و سباق کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان آیات کے بین السطور میں یہ پیغام بھی ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے ان "بڑے لوگوں" کے پیچھے اپنے آپ کو جس انداز میں ہلکان کر رہے ہیں اور یہ لوگ جس "بے نیازی" سے قرآن کو نظر انداز کر رہے ہیں اس سے قرآن کے استخفاف کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ لہٰذا آپؐ ان لوگوں کے پیچھے پڑ کر انہیں دعوت مت دیں۔ ظاہر ہے یہ پیغام قیامت تک کے داعیانِ حق کے لیے بھی ہے۔ اس ضمن میں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ گو معاشرے کے صاحبِ حیثیت لوگوں کا کسی جماعت میں شامل ہونا اس جماعت کے مشن کی ترویج و ترقی کے لیے بہت مفید ہے، لیکن ایسے لوگوں کو خصوصی اہتمام سے دعوت دینے اور پھر خصوصی اہتمام سے اپنی جماعت میں خوش آمدید کہنے کا انداز ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے اپنے "نظریے" کی بے توقیری کا تاثر ملے یا پرانے کارکنوں کے دلوں میں مغائرت کا احساس پیدا ہو۔ لہٰذا کسی بھی جماعت کے امیر کے لیے اصولوں پر سمجھوتہ کیے بغیر صاحبِ حیثیت لوگوں کو اپنی جماعت کی طرف راغب کرنے کی کوشش دراصل اس پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے خودداری اور تکبر کے درمیان یا خوش اخلاقی اور خوشامد کے مابین بہت باریک سا فرق ہے، لیکن اگر کوئی انسان اس باریک سے فرق کو ملحوظ نہ رکھے تو اس کی ایک بہت اعلیٰ صفت کو لوگ اس کی بہت بڑی خامی پر بھی محمول کر سکتے ہیں۔ لہٰذا حکمتِ تبلیغ کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے حساس فرض کی ادائیگی دو انتہاؤں کے درمیان رہتے ہوئے بہت محتاط انداز میں سرانجام دی جائے۔

آیت ۱۳ ﴿فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ﴿۱۳﴾﴾ "(یہ قرآن) ایسے صحیفوں میں (درج ہے) جو باعزت ہیں۔"

یہ مضمون مختلف انداز اور مختلف الفاظ میں قرآن حکیم کے متعدد مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ الزخرف میں فرمایا گیا: ﴿وَ اِنَّہٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ﴿۴﴾﴾ "اور یہ اُمّ الکتاب میں ہے ہمارے پاس بہت بلند و بالا بہت حکمت والی!" سورۃ الواقعہ میں ارشاد ہوا کہ یہ قرآن ایک مخفی کتاب (کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ) میں درج ہے: ﴿اِنَّہٗ لَقُرۡاٰنٌ کَرِیۡمٌ ﴿ۙ۷۷﴾ فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ ﴿ۙ۷۸﴾﴾ "یقیناً یہ بہت عزت والا قرآن ہے۔ ایک چھپی ہوئی کتاب میں ہے"۔ پھر سورۃ البروج میں فرمایا گیا: ﴿بَلۡ ہُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ﴿ۙ۲۱﴾ فِیۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴿۲۲﴾﴾ "بلکہ یہ تو قرآن ہے بہت عزت والا، لوحِ محفوظ میں"۔ بہرحال اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک خاص مقام پر محفوظ ہے۔ صحفِ مکرمہ، اُمّ الکتاب، کتابِ مکنون اور لوحِ محفوظ اسی مقامِ خاص کے مختلف

نام ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾﴾ ''بلند و بالا' نہایت پاک۔''

آیت ۱۵ ﴿بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾﴾ ''ان لکھنے والوں کے ہاتھوں میں۔''

آیت ۱۶ ﴿كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾﴾ ''جو بڑے معزز اور نیک ہیں۔''

اس سے ملتی جلتی بات ہم سورۃ الواقعہ کی اس آیت میں بھی پڑھ آئے ہیں: ﴿لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾﴾ ''اسے چھونہیں سکتے مگر وہی جو بالکل پاک ہیں''۔ مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کا مقام بہت بلند ہے۔ تو اے نبی (ﷺ) آپ قرآن مجید کے مقام اور مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان لوگوں سے معاملہ کیجیے اور جو شخص قرآن مجید سے اعراض کرتا ہے آپ بھی اس کو منہ نہ لگایئے۔ ان کے مقابلے میں آپ زیادہ توجہ ان لوگوں پر دیجیے جو ہدایت کی تلاش میں آپ کے پاس چل کر خود آتے ہیں۔

آیت ۱۷ ﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿١٧﴾﴾ ''ہلاک ہو جائے انسان' یہ کس قدر ناشکرا ہے!''

آیت ۱۸ ﴿مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿١٨﴾﴾ ''(ذرا سوچے کہ) کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے؟''

آیت ۱۹ ﴿مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ ''ایک بوند سے۔''

﴿خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿١٩﴾﴾ ''اُس نے اسے پیدا کیا اور اس کا ایک اندازہ مقرر کر دیا۔''

''اندازے'' سے مراد یہاں ہر انسان کا ''شاکلہ'' ہے' جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۴ میں آیا ہے۔ انسان کا شاکلہ دراصل اس کی فطری یا جبلی خصوصیات اور اس کے ماحول کے اس کی شخصیت پر مرتب ہونے والے اثرات کے مجموعے سے تشکیل پاتا ہے۔ یعنی ہر انسان کی وہ شخصیت جو اسے پیدائشی طور پر جینز (genes) کی صورت میں اپنے والدین کی طرف سے ملتی ہے' عملی زندگی میں آ کر اپنے ماحول کے مخصوص اثرات کی وجہ سے ایک خاص ''قالب'' میں ڈھل جاتی ہے۔ انسانی شخصیت کے اسی قالب کو اس انسان کا شاکلہ کہا جائے گا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تشریح آیت ۸۴' سورۂ بنی اسرائیل)

آیت ۲۰ ﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿٢٠﴾﴾ ''پھر آسان کر دیا اس پر راستہ۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں ایسا ماحول فراہم کیا ہے اور اسے ایسی سہولیات سے نوازا ہے جس کی وجہ سے دنیا میں زندگی بسر کرنا اس کے لیے بہت آسان ہو گیا ہے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ماں کے پیٹ سے انسان کے دنیا میں آنے کا راستہ اللہ تعالیٰ نے آسان کر دیا ہے۔ یعنی وضع حمل کا بظاہر انتہائی پیچیدہ اور مشکل مرحلہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آسان ہو گیا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿٢١﴾﴾ ''پھر اس پر موت وارد کی اور اسے قبر میں داخل کر دیا۔''

آیت ۲۲ ﴿ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿٢٢﴾﴾ ''پھر جب وہ چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔''

دراصل یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ جس ہستی نے انسان کی تخلیق اور اس کی زندگی سے متعلق یہ سب کچھ کیا ہے اس کے لیے انسان کو دوبارہ اٹھانا کیا مشکل ہے۔ چنانچہ اگر انسان خود اپنی تخلیق کے پورے عمل پر غور کر لے

تو اس کے پاس بعث بعد الموت سے انکار کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔

آیت ۲۳ ﴿کَلَّا لَمَّا یَقۡضِ مَاۤ اَمَرَہٗ ﴿ؕ۲۳﴾﴾ ''نہیں! اس نے تا حال وہ بات پوری نہیں کی جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔''

آیت ۲۴ ﴿فَلۡیَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰی طَعَامِہٖۤ ﴿ۙ۲۴﴾﴾ ''تو انسان ذرا اپنے کھانے ہی کو دیکھ لے۔''

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں اگر پھر بھی کسی کو شک ہو تو وہ اپنی غذا پر ہی غور کر لے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کرنے کے بعد کس کس انداز میں اس کی غذا کا انتظام کیا ہے۔

آیت ۲۵ ﴿اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا ﴿ۙ۲۵﴾﴾ ''کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا جیسے کہ برسایا جاتا ہے۔''

آیت ۲۶ ﴿ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا ﴿ۙ۲۶﴾﴾ ''پھر ہم نے زمین کو پھاڑا جیسے کہ وہ پھٹتی ہے۔''

زمین پھٹتی ہے اور اس میں سے کونپلیں برآمد ہوتی ہیں' جو رفتہ رفتہ پورے پودے بلکہ تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

آیت ۲۷ ﴿فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا حَبًّا ﴿ۙ۲۷﴾﴾ ''پھر ہم نے اُگا دیے اس میں اناج۔''

آیت ۲۸ ﴿وَّ عِنَبًا وَّ قَضۡبًا ﴿ۙ۲۸﴾﴾ ''اور انگور اور مختلف ترکاریاں۔''

آیت ۲۹ ﴿وَّ زَیۡتُوۡنًا وَّ نَخۡلًا ﴿ۙ۲۹﴾﴾ ''اور زیتون اور کھجوریں۔''

آیت ۳۰ ﴿وَّ حَدَآئِقَ غُلۡبًا ﴿ۙ۳۰﴾﴾ ''اور بڑے گھنے باغات۔''

آیت ۳۱ ﴿وَّ فَاکِہَۃً وَّ اَبًّا ﴿ۙ۳۱﴾﴾ ''اور میوے اور چارہ۔''

آیت ۳۲ ﴿مَّتَاعًا لَّکُمۡ وَ لِاَنۡعَامِکُمۡ ﴿ؕ۳۲﴾﴾ ''ضرورت کا سامان تمہارے لیے بھی اور تمہارے مویشیوں کے لیے بھی۔''

یہ آیت ہو بہو سورۃ النازعات میں (آیت ۳۳ کے طور پر) بھی آ چکی ہے۔ جوڑا ہونے کے اعتبار سے ان دونوں سورتوں کے مضمون اور اسلوب میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔

آیت ۳۳ ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّۃُ ﴿۫۳۳﴾﴾ ''تو جب وہ آ جائے گی کان پھوڑنے والی (آواز)۔''

یعنی جب قیامت برپا کرنے کے لیے صور میں پھونکا جائے گا تو اس کی آواز سے کان پھٹ جائیں گے۔ اس آیت کی مشابہت سورۃ النازعات کی اس آیت سے ہے: ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّۃُ الۡکُبۡرٰی ﴿۫۳۴﴾﴾ ''پھر جب وہ آ جائے گا بڑا ہنگامہ۔''

آیت ۳۴ ﴿یَوۡمَ یَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِیۡہِ ﴿ۙ۳۴﴾﴾ ''اُس دن بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے۔''

آیت ۳۵ ﴿وَ اُمِّہٖ وَ اَبِیۡہِ ﴿ۙ۳۵﴾﴾ ''اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے۔''

آیت ۳۶ ﴿وَ صَاحِبَتِہٖ وَ بَنِیۡہِ ﴿ؕ۳۶﴾﴾ ''اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔''

آیت ۳۷ ﴿لِکُلِّ امۡرِیًٔ مِّنۡہُمۡ یَوۡمَئِذٍ شَاۡنٌ یُّغۡنِیۡہِ ﴿ؕ۳۷﴾﴾ ''اُس دن ان میں سے ہر شخص کو ایسی فکر لاحق

ہوگی جو اسے (ہر ایک سے) بے پروا کردے گی۔''

اس دن ہر انسان نفسانفسی کی کیفیت میں ہوگا۔ ہر انسان کو اپنی پریشانی کی وجہ سے اپنے عزیز ترین رشتوں سمیت کسی دوسرے کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔

آیت ۳۸ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝۳۸﴾ ''کچھ چہرے اُس دن روشن ہوں گے۔''

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ القیامہ کی ان آیات میں بھی آ چکا ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۢ بَاسِرَةٌ ۝۲۴ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝۲۵﴾ ''بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے' وہ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ اور بہت سے چہرے اس روز اُترے ہوئے ہوں گے۔ ان کو یقین ہوگا کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہوگا۔''

آیت ۳۹ ﴿ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝۳۹﴾ ''مسکراتے ہوئے خوش و خرم۔''

آیت ۴۰ ﴿وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝۴۰﴾ ''اور کچھ چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے۔''

آیت ۴۱ ﴿تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝۴۱﴾ ''ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔''

آیت ۴۲ ﴿اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝۴۲﴾ ''یہی ہوں گے وہ کافر اور فاجر لوگ۔''

یہ وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں اپنے نفس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

سُوْرَةُ التَّكْوِيْر

تمہیدی کلمات

سورۃ التکویر اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے اپنے بعد والی تینوں سورتوں سے گہری مشابہت رکھتی ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے یہ چاروں سورتیں (سورۃ التکویر‘ سورۃ الانفطار‘ سورۃ المطففین اور سورۃ الانشقاق) ایک ضمنی گروپ کی حیثیت سے بھی پہچانی جاتی ہیں۔ البتہ جوڑوں کے نظم کے حوالے سے سورۃ التکویر کا تعلق سورۃ الانفطار سے ہے‘ جبکہ سورۃ المطففین اپنے بعد والی سورت یعنی سورۃ الانشقاق کے ساتھ مل کر جوڑا بناتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ۙ وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ ۙ وَاِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ ۙ وَاِذَا الۡعِشَارُ
عُطِّلَتۡ ۙ وَاِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۙ وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۙ وَاِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۙ وَاِذَا
الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ ۙ بِاَىِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۚ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ۙ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتۡ ۙ
وَاِذَا الۡجَحِيۡمُ سُعِّرَتۡ ۙ وَاِذَا الۡجَنَّةُ اُزۡلِفَتۡ ۙ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ؕ فَلَاۤ اُقۡسِمُ
بِالۡخُنَّسِ ۙ الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ ۙ وَالَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ۙ وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ
كَرِيۡمٍ ۙ ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ ؕ وَمَا صَاحِبُكُمۡ
بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ وَلَقَدۡ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِيۡنِ ۚ وَمَا هُوَ عَلَى الۡغَيۡبِ بِضَنِيۡنٍ ۚ وَمَا هُوَ بِقَوۡلِ
شَيۡطٰنٍ رَّجِيۡمٍ ۙ فَاَيۡنَ تَذۡهَبُوۡنَ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۙ لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ
يَّسۡتَقِيۡمَ ؕ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۚ ع

آیت ۱ ﴿اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ۝۱﴾ ”جب سورج لپیٹ لیا جائے گا۔“

آیت ۲ ﴿وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ ۝۲﴾ ”اور جب ستارے ماند پڑ جائیں گے۔“

آیت ۳ ﴿وَاِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ ۝۳﴾ ”اور جب پہاڑ چلا دیے جائیں گے۔“

آیت ۴ ﴿وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۝۴﴾ ”اور جب گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی۔“

اِلعِشار سے دس مہینوں کے حمل والی اونٹنیاں مراد ہیں‘ یعنی ایسی اونٹنیاں جن کے وضع حمل کا وقت بہت

قریب ہو۔ عربوں کے ہاں ایسی اونٹنی بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی اور اس لحاظ سے وہ لوگ اس کی خصوصی حفاظت اور خدمت کرتے تھے۔ آیت میں اس حوالے سے قیامت کی ہولناک کیفیت کی تصویر دکھائی گئی ہے کہ جب قیامت برپا ہوگی تو بہت قیمتی اونٹنیاں بھی لاوارث ہو جائیں گی، انہیں کوئی سنبھالنے والا نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے اُس وقت جبکہ خود عورتوں کو اپنے حمل کی کوئی فکر نہیں ہوگی تو اونٹنیوں کی کسے ہوش ہوگی۔

آیت ۵ ﴿وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴿٥﴾﴾ ”اور جب وحشی جانور جمع کر دیے جائیں گے۔“

عام طور پر جنگلی جانور ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں، لیکن اس دن خوف کے مارے ان کی وحشت بھی بدل جائے گی اور مختلف اقسام کے جانور بھی اکٹھے ہو جائیں گے۔

آیت ۶ ﴿وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿٦﴾﴾ ”اور جب سمندر دہکا دیے جائیں گے۔“

اگلی سورت یعنی سورۃ الانفطار میں سمندروں کے پھاڑے جانے ﴿وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿٣﴾﴾ کا ذکر ہے۔ ان دونوں آیات پر غور کریں تو یوں لگتا ہے کہ جب زمین کو کھینچ کر پھیلایا جائے گا ﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿٣﴾﴾ (الانشقاق) کے مصداق تو زمین کی اندرونی تپش اوپر کی سطح پر آ جائے گی۔ چنانچہ دہکتے ہوئے لاوے کے عین اوپر سمندر اُبل رہے ہوں گے اور اس طرح سمندروں کا پانی بخارات بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ واللہ اعلم!

آیت ۷ ﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴿٧﴾﴾ ”اور جب جانوں کے جوڑ ملائے جائیں گے۔“

یعنی پوری نسل انسانی کے مختلف افراد کی گروہ بندی کر دی جائے گی۔ یہ گروہ بندی لوگوں کے اعمال اور عقائد کے حوالے سے ہوگی جیسے سورۃ النمل، آیت ۸۳ اور سورۃ حٰمٓ السجدۃ، آیت ۱۹ میں اہلِ جہنم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیے جانے کا ذکر آیا ہے۔ اس آیت کا مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ جب جانیں جسموں کے ساتھ جوڑ دی جائیں گی۔

آیت ۸ ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴿٨﴾﴾ ”اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔“

آیت ۹ ﴿بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿٩﴾﴾ ”کہ وہ کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی تھی؟“

یہ تذکیر و انذار کا بہت لطیف انداز ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿١٠﴾﴾ ”اور جب اعمال نامے کھول دیے جائیں گے۔“

آیت ۱۱ ﴿وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿١١﴾﴾ ”اور جب آسمان کی کھال اُتار لی جائے گی۔“

یعنی آسمان پر سے پردہ اُٹھا دیا جائے گا اور اس کے وہ سب رموز اور مناظر جو انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے ان پر ظاہر ہو جائیں گے۔ اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ آسمان اس دن کھال اُترے ہوئے کسی جانور کے جسم کی طرح سرخ نظر آئے گا، جیسا کہ سورۃ الرحمٰن کی اس آیت میں بھی بتایا گیا ہے: ﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿٣٧﴾﴾ ”پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی، تیل کی تلچھٹ جیسا۔“

آیت ۱۲ ﴿وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ ﴿١٢﴾﴾ ”اور جب جہنم دہکائی جائے گی۔“

آیت ۱۳ ﴿وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿١٣﴾﴾ ”اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی۔“

ان تیرہ آیات میں قیامت کے دن کی مختلف کیفیات کا ذکر کرنے کے بعد جو اہم اور اصل بات بتانا مقصود ہے وہ یہ ہے:

آیت ۱۴ ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ⑭﴾ ''(اُس دن) ہر جان جان لے گی کہ اس نے کیا کچھ حاضر کیا ہے۔''

یعنی ہر انسان کے تمام اعمال کی پوری تفصیل اس کے سامنے آ جائے گی۔

آیت ۱۵، ۱۶ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ⑮ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ⑯﴾ ''تو نہیں! میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے' چلنے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی۔''

یعنی ایسے ستارے جو سیدھا چلتے چلتے پھر پیچھے ہٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''کئی سیاروں (مثلاً زحل' مشتری' مریخ' زہرہ' عطارد) کی چال اس ڈھب سے ہے کہ کبھی مغرب سے مشرق کو چلیں' یہ سیدھی راہ ہوئی' کبھی ٹھٹک کر اُلٹے پھریں اور کبھی سورج کے پاس آ کر کتنے دنوں تک غائب رہیں۔''

بہر حال یہ آیات آج کے ماہرین فلکیات کو دعوتِ تحقیق دے رہی ہیں کہ وہ جدید معلومات کی روشنی میں ان الفاظ (الْخُنَّس اور الْجَوَارِ الْكُنَّس) کے لغوی معانی کے ساتھ ستاروں کی دنیا کے رموز و حقائق کی مطابقت ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔

آیت ۱۷ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ⑰﴾ ''قسم ہے رات کی جب وہ روانہ ہونے لگے۔''

یہ آیت اور سورۃ المدثر کی یہ آیت باہم مشابہ اور ہم معنی ہیں: ﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ㉝﴾ ''اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ⑱﴾ ''اور صبح کی جب وہ سانس لے۔''

یعنی صبح صادق کا وہ وقت جب رات کے سناٹے میں سے زندگی انگڑائی لیتی ہوئی آہستہ آہستہ بیدار ہوتی ہے۔

آیت ۱۹ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ⑲﴾ ''یقیناً یہ (قرآن) ایک بہت باعزت پیغامبر کا قول ہے۔''

یہاں ''رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ'' سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ یہ آیت قبل ازیں سورۃ الحاقہ میں بھی (بطور آیت ۴۰) آ چکی ہے اور وہاں ''رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ'' سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ سورۃ الحج (آیت ۷۵) میں فرمایا گیا ہے: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ﴾ ''اللہ چن لیتا ہے اپنے پیغامبر فرشتوں میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی''۔ چنانچہ فرشتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو چُنا اور انسانوں میں سے حضرت محمد ﷺ کو اور یوں ان دو ہستیوں کے ذریعے سے ''رسالت'' کا سلسلہ تکمیل پذیر ہوا۔ زیر مطالعہ آیات میں رسولِ کریم بشر (محمد رسول اللہ ﷺ) اور رسولِ کریم ملک (حضرت جبرائیل علیہ السلام) کی ملاقات کا ذکر بھی آ رہا ہے کہ رسالت کی ان دو کڑیوں کے ملنے کا ثبوت فراہم ہو جائے۔ یہ مضمون اس سے پہلے

سورۃ النجم میں بھی آ چکا ہے۔

آیت ۲۰ ﴿ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ﴾ ''جو (جبرائیل) بہت قوت والا ہے' صاحب عرش کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔''

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقربین میں سے ہیں۔

آیت ۲۱ ﴿مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ﴾ ''جس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہ امانت دار بھی ہے۔''

حضرت جبرائیل علیہ السلام تمام فرشتوں کے سردار ہیں۔ اس لحاظ سے آپؑ تمام فرشتوں کے مطاع ہیں یعنی تمام فرشتے آپ کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور آپؑ امانت دار ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام جوں کا توں انبیاء و رسل علیہم السلام تک پہنچاتے رہتے ہیں۔

آیت ۲۲ ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ ''اور تمہارے یہ ساتھی (محمدﷺ) کوئی مجنون نہیں ہیں۔''

زیر مطالعہ آیات سورۃ النجم کی ابتدائی آیات کے ساتھ خصوصی مناسبت اور مشابہت رکھتی ہیں۔ وہاں بھی اس مضمون کا آغاز ستارے کی قسم (وَالنَّجْم) سے ہوا ہے اور یہاں بھی اس موضوع پر بات شروع کرنے سے پہلے آیات ۱۵ اور ۱۶ میں ستاروں کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ وہاں صَاحِبُكُمْ سے بات شروع ہو کر حضرت جبرائیلؑ کے ذکر تک آئی ہے' جبکہ یہاں حضرت جبرائیلؑ کا ذکر پہلے اور صَاحِبُكُمْ کا بیان بعد میں آیا ہے۔ وہاں حضرت جبرائیلؑ کا ذکر شَدِیْدُ الْقُوٰی کے لقب سے ہوا ہے جبکہ یہاں انؑ کی شان میں ذِیْ قُوَّةٍ کے الفاظ آئے ہیں۔

آیت ۲۳ ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ﴾ ''اور انہوں نے دیکھا ہے اس کو کھلے اُفق پر۔''

یعنی ہمارے نبی (ﷺ) نے جبریلؑ کو کھلے اور روشن اُفق پر دیکھا ہے' اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ کے لیے سورۃ النجم میں 'بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی' (آیت ۷) کی ترکیب آئی ہے۔

آیت ۲۴ ﴿وَمَا هُوَ عَلَی الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ﴾ ''اور وہ غیب کے معاملے میں حریص یا بخیل نہیں ہیں۔''

'ضَنِیْن' کا ترجمہ حریص بھی کیا گیا ہے اور بخیل بھی۔ دراصل بخل اور حرص دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک ہی مفہوم کے دو پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔ حریص کے معنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہمارے نبی (ﷺ) کی پوری زندگی تم لوگوں کے سامنے ہے۔ کیا انہوںؐ نے کاہنوں اور نجومیوں کے ساتھ کبھی دوستی رکھی ہے؟ یا غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے کیا انہوںؐ نے کبھی ریاضتیں وغیرہ کرنے کی کوشش کی ہے؟ ظاہر ہے انؐ کی زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ تم لوگ یہ نہیں کہہ سکتے ہو کہ وہ غیب کی خبروں کے معاملے میں شروع ہی سے ''حریص'' تھے۔ اسی طرح وہ اس بارے میں بخیل بھی نہیں ہیں اور اس حقیقت کے بھی تم خود گواہ ہو۔ انہیںؐ غیب کی جو خبریں معلوم ہوتی ہیں وہ تم لوگوں کو بتاتے ہیں۔ کیا کاہن اور نجومی بھی غیب کی خبریں اسی طرح کھلے عام لوگوں کو بتاتے ہیں؟ کسی کاہن کے پاس تو غیب کا علم ہوتا ہی نہیں اور جو کسی قیاس آرائی یا ظن و تخمین کی بنا پر وہ کچھ جانتا ہے اس پر وہ اپنا کاروبار چمکاتا ہے۔ گویا ''ہلدی کی گانٹھ'' مل جانے پر وہ پنساری بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی ایک ایک بات کے عوض منہ مانگے نذرانے وصول کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے رسول (ﷺ) نے اگر

فرشتے کو دیکھا ہے، تو انہوں نے سرِعام تم لوگوں کو بتا دیا ہے۔ اللہ کی طرف سے انہیں غیب کا جو علم دیا جا رہا ہے وہ من وعن تم لوگوں کو بتاتے ہیں اور اس معاملے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ (1)

آیت ۲۵ ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝۲۵﴾ ''اور یہ کسی شیطانِ مردود کا قول نہیں ہے۔''

شیاطینِ جن چونکہ غیب کے نام پر جھوٹی سچی خبریں کاہنوں تک پہنچاتے رہتے تھے اس لیے یہاں اس امکان کی بھی تردید کر دی گئی ہے۔ یعنی تم لوگ یہ مت سمجھو کر جنوں میں سے کسی شیطان نے انہیں کوئی پٹی پڑھا دی ہے (معاذ اللہ)۔ یہی مضمون سورۃ الحاقہ میں زیادہ وضاحت اور زیادہ پُرزور انداز میں یوں بیان ہوا: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝۳۸ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝۳۹﴾ ''میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جو تم نہیں دیکھتے ہو۔'' (یہاں پر مَا تُبْصِرُوْنَ سے شاعروں وغیرہ مراد ہے، اس لیے کہ شاعر لوگ اپنی سوچ اور فکر سے شعر کہتے ہیں، جبکہ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ کے الفاظ میں شیاطینِ جن کی خبروں کی طرف اشارہ ہے جو کاہنوں تک پہنچاتے تھے)۔ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝۴۰ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝۴۱ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝۴۲﴾ ''یہ قول ہے رسولِ کریم کا۔ اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ کم ہی ہے جو تم یقین کرتے ہو۔ اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا کلام ہے۔ کم ہی ہے جو تم غور کرتے ہو۔''

آیت ۲۶ ﴿فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝۲۶﴾ ''تو تم کدھر چلے جا رہے ہو؟''

تمہاری بھلائی اور کامیابی تو اس میں تھی کہ تم لوگ ہمارے رسول (ﷺ) پر ایمان لاتے اور ان پر جو وحی آ رہی ہے اس کے نور سے اپنے دلوں کو منور کرتے، لیکن تم لوگوں نے اس کے بجائے ان کی تکذیب اور مخالفت کی روش اپنا رکھی ہے۔ تم لوگ کبھی سنجیدگی سے غور تو کرو کہ اللہ کے کلام سے منہ موڑ کر تم لوگ کس طرف جا رہے ہو۔

آیت ۲۷ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۲۷﴾ ''نہیں ہے یہ مگر تمام جہان والوں کے لیے ایک یاددہانی۔''

قرآن مجید اس مفہوم میں ذکر یعنی یاددہانی ہے کہ یہ انسان کی فطرت میں پہلے سے موجود حقائق کی یاددہانی کرتا ہے۔ دراصل انسان فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات اور توحید کے تصور سے آشنا ہے مگر دنیا میں رہتے ہوئے اگر انسان کی فطرت پر غفلت کے پردے پڑ جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اس حوالے سے ہم اللہ تعالیٰ کا یہ حکم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ کہ اے اہل ایمان! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے ہی غافل کر دیا۔ بہرحال اس غفلت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایمان باللہ سے متعلق وہ حقائق جو ہر انسان کی فطرت

---

(1) اس آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ کا تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو:

''یعنی یہ پیغمبر ہر قسم کے غیوب کی خبر دیتا ہے، ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے، یا اللہ کے اسماء وصفات سے یا احکامِ شرعیہ سے یا مذاہب کی حقیقت و بطلان سے یا جنت و دوزخ کے احوال سے یا واقعات بعد الموت سے، اور ان چیزوں کے بتلانے میں ذرا بخل نہیں کرتا نہ اجرت مانگتا ہے۔''

میں مضمر ہیں پسِ پردہ چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآنی تعلیمات انسانی فطرت میں موجود ان تمام حقائق کو خفتہ (dormant) حالت سے نکال کر پھر سے فعال (active) کرنے میں اس کی مدد کرتی ہیں۔

آیت ۲۸ ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿٢٨﴾﴾ ''ہر اُس شخص کے لیے جو تم میں سے سیدھے راستے پر چلنا چاہے۔''

یعنی قرآن ہر اس شخص کے لیے یاددہانی ہے جو ہدایت کا طالب ہو اور پورے خلوص سے چاہتا ہو کہ وہ گمراہی سے نکل کر ہدایت کے راستے پر آجائے۔

آیت ۲۹ ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٩﴾﴾ ''اور تمہارے چاہے بھی کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔''

یہ مضمون قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے' یعنی کسی انسان کو ہدایت تبھی ملے گی جب وہ خود بھی اس کے لیے ارادہ کرے اور پھر اللہ بھی اسے ہدایت دینا چاہے۔ ظاہر ہے ہر کام اللہ ہی کے اذن اور اسی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ لیکن ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ انسان کی اپنی خواہش اور طلب کا شامل ہونا بہت ضروری ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ زبردستی کسی پر ہدایت مسلّط نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہو تو پھر سزا اور جزا کا سارا فلسفہ ہی غلط ہو جاتا ہے۔

سُوْرَةُ الاِنْفِطَار

تمہیدی کلمات

سورۃ الانفطار اور سورۃ التکویر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے اور یہ تعلق اس حد تک گہرا ہے کہ ان دونوں کا مضمون بھی ایک ہے' بلکہ متعلقہ مضمون دونوں سورتوں کے ملنے سے مکمل ہوتا ہے۔ دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات میں قیامت کے حالات کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ سورۃ التکویر میں ان حالات کی تفصیل تیرہ آیات میں بیان ہوئی ہے جبکہ سورۃ الانفطار میں وہی مضمون صرف چار آیات میں سمٹ گیا ہے۔ اس مضمون کے بعد سورۃ التکویر میں جو اہم خبر دی گئی ہے وہ یہ ہے: ﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ﴿۱۴﴾﴾ جبکہ سورۃ الانفطار میں اس کے مقابلے یہ آیت آئی ہے: ﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ ﴿۵﴾﴾۔ یہاں تک تو دونوں سورتوں کا مضمون ایک جیسا ہے۔ اس کے بعد سورۃ التکویر میں قرآن کی صداقت کا حوالہ دے کر مخاطبین سے یہ چبھتا ہوا سوال کیا گیا ہے: ﴿فَاَیۡنَ تَذۡہَبُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ کہ تم لوگ نہ اللہ کے رسول کی سیرت کو دیکھتے ہو' نہ حق کو پہچاننے کی زحمت گوارا کرتے ہو۔ آخر تم لوگ جا کدھر رہے ہو؟ لیکن وہاں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ جب قیامت برپا ہو جائے گی اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے گا تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ چنانچہ اس موضوع پر روشنی یہاں سورۃ الانفطار میں ڈالی گئی ہے کہ اگر یہ راستہ اختیار کرو گے تو اس منزل پر پہنچو گے اور اگر دوسرا طرزِ عمل اپناؤ گے تو اس انجام سے دوچار ہو گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ﴿۳﴾ وَ اِذَا الۡقُبُوۡرُ
بُعۡثِرَتۡ ۙ﴿۴﴾ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ ؕ﴿۵﴾ یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الۡکَرِیۡمِ ۙ﴿۶﴾
الَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ۙ﴿۷﴾ فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ؕ﴿۸﴾ کَلَّا بَلۡ تُکَذِّبُوۡنَ
بِالدِّیۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۙ﴿۱۰﴾ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ۙ﴿۱۱﴾ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ
لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ﴿ۚ۱۳﴾ وَ اِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ ﴿ۚۖ۱۴﴾ یَّصۡلَوۡنَہَا یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿۱۵﴾ وَ مَا ہُمۡ عَنۡہَا بِغَآئِبِیۡنَ ؕ﴿۱۶﴾
وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ﴿ۙ۱۷﴾ ثُمَّ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ﴿ؕ۱۸﴾ یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ
ع شَیۡئًا ؕ وَ الۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ ﴿۱۹﴾

آیت ۱ ﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ﴿۱﴾﴾ ''جب آسمان پھٹ جائے گا۔''

آیت ۲ ﴿وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ ﴿۲﴾﴾ ''اور جب تارے بکھر جائیں گے۔''

آیت ۳ ﴿وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۳﴾ ’’اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔‘‘

آیت ۴ ﴿وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝۴﴾ ’’اور جب قبریں تلپٹ کر دی جائیں گی۔‘‘

آیت ۵ ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝۵﴾ ’’(اُس وقت) ہر جان، جان لے گی کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔‘‘

اس دن ہر شخص کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اس نے کیا کیا اچھے یا برے اعمال آگے بھیجے تھے اور ان کے آثار و نتائج کی شکل میں کیا کچھ وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا۔ اس مضمون کی وضاحت قبل ازیں سورۃ القیامہ کی آیت ۱۳ کے تحت بھی کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن ہر انسان کو بتا دیا جائے گا کہ اس نے کس شے کو آگے کیا تھا اور کس شے کو پیچھے رکھا تھا۔ یعنی دنیا اور آخرت میں سے اس نے کس کو مقدم رکھا تھا اور کس کو مؤخر کیا تھا۔ آیت کے اس مفہوم سے واضح ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کسی انسان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار کلی طور پر اس ''طرزِ عمل'' پر ہے جو وہ اپنی زندگی میں دنیا اور آخرت کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ یعنی انسان کا ایک طرزِ عمل یہ ہو سکتا ہے کہ میرا اصل مطلوب و مقصود تو آخرت ہے، دنیا کا کیا ہے جو مل گیا وہی غنیمت ہے اور اگر کبھی نہ بھی ملے تب بھی کوئی بات نہیں۔ دوسرا ممکنہ رویہ یہ ہے کہ میرا اصل مقصود تو دنیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اگر آخرت بھی مل جائے تو اچھا ہے، چاہے وہ کسی کی سفارش سے مل جائے یا کسی اور حیلے سے۔ لیکن میری پہلی ترجیح (1st priority) بہرحال دنیا اور اس کا مال و متاع ہے، اور زندگی میں میری ساری تگ و دو اسی کے لیے ہے۔

آیت ۶ ﴿یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۝۶﴾ ’’اے انسان! تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا ہے اپنے ربّ کریم کے بارے میں۔‘‘

ظاہر ہے یہ کام شیطان لعین ہی کرتا ہے۔ وہی انسان کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکے میں ڈالتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید میں بنی نوعِ انسان کو بار بار خبردار کیا گیا ہے، مثلاً سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۳۳﴾ کہ وہ بڑا دھوکے باز تم لوگوں کو اللہ کے بارے میں کہیں دھوکے میں مبتلا نہ کر دے! لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام تر تنبیہات کے باوجود اکثر انسان شیطان کے اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے شیطان مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف چالیں اور حربے آزماتا ہے۔ مثلاً ایک دیندار شخص کو اہم فرائض سے ہٹانے کے لیے وہ نوافل اور ذکر و اذکار کا پرکشش پیکج پیش کر سکتا ہے کہ تم اقامت دین اور دوسرے فرائض دینی کا خیال چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے راتوں کو جاگنے اور تہجد کی پابندی پر توجہ دو۔ عام مسلمانوں کے لیے اس کی بہت ہی تیر بہدف چال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ کوئی خوردہ گیر نہیں کہ اپنے مؤمن بندوں کو چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر پکڑے۔ وہ تو بہت بڑے بڑے گناہگاروں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں بے عملی کی سب سے بڑی وجہ شیطان کی یہی چال ہے، بلکہ اس دلیل کے سہارے اکثر لوگ گناہوں کے بارے میں حیران کن حد تک جری اور بے باک ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت زیر مطالعہ ہم

میں سے ہر ایک کو دعوتِ فکر دے رہی ہے کہ اے اللہ کے بندے! تمہاری بے عملی کی وجہ کہیں یہ تو نہیں ہے کہ شیطان نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کے نام پر دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے؟

آیت ۷ ﴿اِلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ⑦﴾ ''جس نے تمہیں تخلیق کیا' پھر تمہارے نوک پلک سنوارے' پھر تمہارے اندر اعتدال پیدا کیا۔''

اللہ تعالیٰ نے تمہارے قوائے جسمانی اور قوائے نفسیاتی میں ہر طرح سے اعتدال اور توازن پیدا کیا ہے۔ گویا تمہاری تخلیق اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کی مظہر ہے۔ تمہاری تخلیق کے اندر توازن اور خوبصورتی کا یہ پہلو گویا اس حقیقت پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں عدل و اعتدال کو پسند فرماتا ہے اور یہ کہ وہ تم انسانوں کے ساتھ آخرت میں بھی عدل و انصاف کا معاملہ فرمائے گا' تاکہ گناہگاروں کو قرار واقعی سزا مل سکے اور نیکوکار اپنی نیکیوں کا پورا پورا بدلہ پائیں۔ تمہاری مبنی بر اعتدال تخلیق و ترکیب کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمہارے خیالات و اعمال بھی اعتدال اور توازن کا مظہر ہوتے' مگر تم لوگ ہو کہ اپنے خالق کے بارے میں ہی دھوکے میں مبتلا ہو گئے ہو۔ تم اس کی شانِ غفاری کو تو بہت اہتمام سے یاد رکھتے ہو جبکہ اس کی صفت عدل سمیت بہت سی دوسری صفات کو بالکل ہی بھولے ہوئے ہو۔ تمہاری یہ بے اعتدالی تمہارے اس خالق کو بالکل پسند نہیں ہے جس نے تمہاری تخلیق کا خمیر ہی اعتدال سے اٹھایا ہے۔

آیت ۸ ﴿فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ⑧﴾ ''پھر جس شکل میں اُس نے چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔''

اللہ تعالیٰ ہر انسان کی شکل اور اس کے مختلف اعضاء اپنی مرضی و مشیت کے مطابق بناتا ہے۔ ظاہر ہے اس معاملے میں کسی انسان کو کوئی اختیار نہیں۔ اس موضوع کی مناسبت سے مجھے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نعتیہ اشعار یاد آ گئے ہیں۔ آپؓ حضور ﷺ کی شان میں فرماتے ہیں:

وَاَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِيْ ۔۔۔ وَاَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّءًا مِنْ كُلِّ عَيْبٍ ۔۔۔ كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

''آپ ﷺ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور آپؐ سے بڑھ کر جمیل عورتوں نے جنا ہی نہیں۔ آپؐ ہر عیب اور نقص سے مبرا پیدا ہوئے ہیں۔ گویا آپؐ اس طرح پیدا ہوئے ہیں جس طرح آپؐ نے خود چاہا۔''

آیت ۹ ﴿كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ⑨﴾ ''ہرگز نہیں! بلکہ اصل میں تم جزا و سزا کا انکار کر رہے ہو۔''

تم لوگ یہ جو اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کے قصیدے پڑھ رہے ہو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم اس کی رحمت اور بخشش پر واقعتاً بہت پختہ یقین بھی رکھتے ہو' بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اپنے اس فلسفے کی آڑ میں تم جزا و سزا کا انکار کرنا چاہتے ہو۔ اسی طرح کے ایک ''قصیدے'' کی یہ جھلک ملاحظہ کیجیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شانِ غفاری کا اقرار ہے یا اس کے فلسفہ جزا و سزا کا مذاق: ؎

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا ۔۔۔ پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر ۔۔۔ لیکن تیری رحمت نے گوارا نہ کیا!

اگر کوئی شخص واقعی پوری دیدہ دلیری سے جہنم کی تدبیر اور کوشش کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا تو یہی ہے

کہ اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے اسے جہنم میں جھونک دیا جائے۔ چنانچہ ایسے خیالات ونظریات کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شانِ غفاری کی من مانی تشریح کر کے نہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں بلکہ عملی طور پر جزا و سزا کے فلسفہ کا ہی انکار کر رہے ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ⑩﴾ ”حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں۔“

آیت ۱۱ ﴿كِرَامًا كَاتِبِيْنَ⑪﴾ ”جو بڑے باعزت لکھنے والے ہیں۔“

آیت ۱۲ ﴿يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ⑫﴾ ”وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو۔“

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے بطور نگران مقرر کر رکھے ہیں جو اس کا ایک ایک عمل لکھ رہے ہیں۔ اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں کا محاسبہ کرنا منظور نہیں ہے تو گویا وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس کا فرشتوں کو بطور نگران مقرر کرنا اور ان فرشتوں کا ایک ایک انسان کے ایک ایک عمل کا ریکارڈ مرتب کرنا سب کارِ عبث ہے۔ ایسے خیالات کے حامل لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ”کارِ عبث“ اللہ کے شایانِ شان نہیں، وہ احتساب ضرور کرے گا اور اس احتساب کے نتائج بھی ضرور نکلیں گے، جن کا ذکر اگلی آیات میں ہے:

آیت ۱۳ ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ⑬﴾ ”یقیناً نیکوکار بندے نعمتوں میں ہوں گے۔“

آیت ۱۴ ﴿وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ⑭﴾ ”اور یقیناً فاسق و فاجر جہنم میں ہوں گے۔“

آیت ۱۵ ﴿يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ⑮﴾ ”داخل ہوں گے اس میں جزا و سزا کے فیصلے کے دن۔“

آیت ۱۶ ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ⑯﴾ ”اور وہ اس سے کہیں غائب نہیں ہو سکیں گے۔“

ظاہر ہے جہنم سے بھاگ نکلنے کا نہ کوئی راستہ ہوگا اور نہ ہی کسی میں بھاگ جانے کی طاقت ہوگی۔

آیت ۱۷ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ⑰﴾ ”اور کیا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ روزِ جزا کیا ہے؟“

آیت ۱۸ ﴿ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ⑱﴾ ”پھر کیا تمہیں کچھ اندازہ ہوا ہے کہ روزِ جزا کیا ہے؟“

آیت ۱۹ ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ⑲﴾ ”جس روز کسی جان کو کسی دوسری جان کے لیے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا، اور امر کُل کا کُل اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔“

اُس دن سرِ محشر پکارا جائے گا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ﴾ (المؤمن ۱۶) کہ اے نسلِ انسانی کے لوگو! دیکھو! آج حکومت، اختیار اور اقتدار کس کے ہاتھ میں ہے؟ اور اس سوال کا جواب بھی پھر خود ہی دیا جائے گا: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (المؤمن:۱۶) یعنی آج کے دن اختیار کل کا کل اللہ ہی کے پاس ہے جو اکیلا ہے اور سب پر غالب ہے۔ اس دن انسانوں کی اکثریت کو بے بسی اور نفسا نفسی کی جس کیفیت کا سامنا ہوگا، سورۃ البقرۃ میں اس کا نقشہ یوں دکھایا گیا ہے: ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ⑱﴾ ”اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کسی سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔“

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ
يُخْسِرُوْنَ ۝۳ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝۷ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝۸ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝۹
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۱۱ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ
اَثِيْمٍ ۝۱۲ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ۝۱۴ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝۱۵ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝۱۶ ثُمَّ يُقَالُ
هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۷ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝۱۸ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا
عِلِّيُّوْنَ ۝۱۹ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝۲۰ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۲۱ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝۲۲ عَلَى الْاَرَآئِكِ
يَنْظُرُوْنَ ۝۲۳ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝۲۴ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝۲۵ خِتٰمُهٗ
مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝۲۶ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝۲۷ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا
الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۲۸ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۝۲۹ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ
يَتَغَامَزُوْنَ ۝۳۰ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۝۳۱ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ
لَضَاۗلُّوْنَ ۝۳۲ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ۝۳۳ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝۳۴
ع عَلَى الْاَرَاۗئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ۝۳۵ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶

آیت ۱ ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝۱﴾ ”ہلاکت ہے کمی کرنے والوں کے لیے۔“

وَیْل کے معنی تباہی‘ بربادی اور ہلاکت کے بھی ہیں اور یہ جہنم کی ایک وادی کا نام بھی ہے۔ ’طَف‘ لغوی اعتبار سے حقیری چیز کو کہا جاتا ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ کم تولنے یا کم ماپنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مُطَفِّف وہ ہے جو حق دار کو اس کا پورا حق نہیں دیتا بلکہ اس میں کمی کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص ماپ تول میں کمی کرتا ہے وہ اپنے اس عمل کے ذریعے متعلقہ چیز کی بہت تھوڑی سی مقدار ہی ناحق بچا پاتا ہے۔ اس کے باوجود اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اتنی حقیری چیز کے لیے اپنا ایمان فروخت کر رہا ہے۔ بہرحال اس آیت میں کم

تولنے یا کم ماپنے والوں کو آخرت میں بربادی اور جہنم کی نوید سنائی گئی ہے۔

آیت ۲ ﴿اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ۝﴾ ''وہ لوگ کہ جب دوسروں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں۔''

آیت ۳ ﴿وَاِذَا کَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ ۝﴾ ''اور جب خود انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں۔''

آیت ۴ ﴿اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝﴾ ''کیا ان کو یہ گمان نہیں کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے والے ہیں۔''

آیت ۵ ﴿لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝﴾ ''ایک بڑے دن کے لیے۔''

آیت ۶ ﴿یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ ''جس دن کہ لوگ کھڑے ہوں گے تمام جہانوں کے رب کے سامنے۔''

ناپ تول میں کمی کرتے ہوئے ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دینا بظاہر تو ایک معمولی سا عمل ہے لیکن ''تل کی اوٹ میں پہاڑ'' کے مصداق ایسا کرنے والے کی اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو اس کا بعث بعد الموت پر یقین نہیں یا پھر اسے اس کی پروا نہیں کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

آیت ۷ ﴿کَلَّآ اِنَّ کِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ ۝﴾ ''ہرگز نہیں! یقیناً گناہ گاروں کے اعمال نامے سجین میں ہوں گے۔''

عام طور پر کتاب سے یہاں اعمال نامہ ہی مراد لیا گیا ہے کہ کافر و فاجر لوگوں کے اعمال نامے ''سِجِّین'' میں' جبکہ نیک لوگوں کے اعمال نامے ''عِلِّیِّین'' (بحوالہ آیت ۱۸) میں ہوں گے۔ تاہم بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ ''سجین'' ایک مقام ہے جہاں اہل دوزخ کی روحیں محبوس ہوں گی' جبکہ اہل جنت کی ارواح ''علیین'' میں ہوں گی۔ چنانچہ سجین اور علیین کا یہ فرق صرف اعمال ناموں کو رکھنے کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا۔ اس حوالے سے میرے غور و فکر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کے خاکی جسم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو روح پھونکی گئی ہے وہ ایک نورانی چیز ہے۔ انسان اچھے برے جو بھی اعمال کرتا ہے اس کے اثرات اس کی روح پر مترتب ہوتے رہتے ہیں' جیسے آواز کی ریکارڈنگ کرتے ہوئے ٹیپ کے فیتے' سی ڈی یا مائیکرو کارڈ وغیرہ پر اس آواز کے اثرات نقش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انسانوں کی ارواح جب اس دنیا سے جاتی ہیں تو اعمال کے اثرات اپنے ساتھ لے کر جاتی ہیں۔ ان ''اثرات'' کی وجہ سے ہر روح دوسری روح سے مختلف ہو جاتی ہے اور یوں نیک اور برے انسانوں کی ارواح میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میری رائے میں انسانی ارواح پر ثبت شدہ اثراتِ اعمال کو یہاں لفظ ''کتاب'' سے تعبیر کیا گیا ہے' یعنی انسانی ارواح اعمال کے اثرات لیے ہوئے جب اس دنیا سے جائیں گی تو برے اعمال کے اثرات والی ارواح کو سجین میں رکھا جائے گا۔ سجن کے معنی ''جیل خانہ''

کے ہیں۔ گویا برے لوگوں کی ارواح کو وہاں کسی جیل نما جگہ میں بند کر دیا جائے گا' جیسے ضلعی انتظامیہ کے ''محافظ خانے'' میں پرانی فائلوں کے انبار لگے ہوتے ہیں۔

آیت ۸ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝﴾ ''اور تم نے کیا سمجھا کہ سجین کیا ہے؟''

آیت ۹ ﴿كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝﴾ ''لکھا ہوا دفتر۔''

اس ''کتاب'' سے مراد ایک انسان کی جان اور روح کا وہ ملفوب ہے جس میں اس کے اعمال کے اثرات بھی ثبت ہوتے ہیں۔ کسی برے انسان کے مرنے پر متعلقہ فرشتہ وہ ملفوبہ لا کر سجین میں ''جمع'' کرا دیتا ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝﴾ ''تباہی اور ہلاکت ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیت ۱۱ ﴿الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ ''جو جھٹلا رہے ہیں جزا و سزا کے دن کو۔''

آیت ۱۲ ﴿وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝﴾ ''اور نہیں جھٹلاتا اس دن کو مگر وہی کہ جو حد سے بڑھنے والا گناہگار ہے۔''

ایسا شخص سزا و جزا کے دن کو دراصل اس لیے جھٹلاتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں اور حرام خوریوں کی وجہ سے اس دن کے احتساب کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ جس طرح بلی سے بچنے کے لیے کبوتر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اسی طرح یوم حساب کی جواب دہی سے بچنے کے لیے ایسے لوگ اس دن کے وقوع کا ہی انکار کر دیتے ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝﴾ ''جب اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ہماری آیات تو کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

یعنی یہ تو وہی باتیں ہیں جو پچھلے زمانے کے لوگوں سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾ ''نہیں! بلکہ (اصل صورتِ حال یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر زنگ آ گیا ہے ان کے اعمال کی وجہ سے۔''

اس 'زنگ' کی تشریح رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمائی ہے کہ ''بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے' اس گناہ سے باز آ جائے اور استغفار کرے تو اس کے دل کا یہ داغ صاف ہو جاتا ہے' لیکن اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہی چلا جائے تو وہ داغ بڑھتے جاتے ہیں' یہاں تک کہ سارے دل کو گھیر لیتے ہیں۔'' (مسند احمد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ)

گناہگار اہلِ ایمان کے دلوں کے اندر ان کی روحوں کا ''نور'' تو موجود ہوتا ہے لیکن دلوں کے ''شیشے'' زنگ آلود ہو جانے کی وجہ سے یہ نور خارج میں اپنے اثرات نہیں دکھا سکتا۔ جیسے کسی فانوس یا لالٹین کا شیشہ اگر دھوئیں سے سیاہ ہو جائے تو اس کے اندر جلنے والے شعلے کی روشنی باہر نہیں آ سکتی اور باہر کی روشنی اندر نہیں جا سکتی۔ انسانی دل کی اس کیفیت کی وضاحت کرتے ہوئے حضور ﷺ نے اس کا علاج بھی تجویز فرما دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِيْلَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جِلَاءُ هَا؟

قَالَ : ((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ))(۱)

''ان دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہا پانی پڑنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے''۔ دریافت کیا گیا: یارسول اللہ! اس زنگ کو دور کس چیز سے کیا جائے؟ فرمایا:''موت کی بکثرت یاد اور قرآن مجید کی تلاوت!''

آیت ۱۵ ﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ⑮﴾ ''نہیں! یقیناً یہ لوگ اُس دن اپنے رب سے اَوٹ میں رکھے جائیں گے۔''

قیامت کے دن یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محروم کر دیے جائیں گے۔ اس کے برعکس نیکوکار لوگوں کے لیے سورۃ القیامہ میں یہ خوشخبری سنائی گئی ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ㉒ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ㉓﴾ کہ اس دن کچھ چہرے تر و تازہ ہوں گے اور وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میدانِ حشر میں اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کے دیدار یا اس کی کسی خاص شان کے مشاہدے سے سرفراز فرمایا جائے گا جس کے باعث اس دن کے سخت مراحل ان کے لیے آسان ہو جائیں گے۔ اس حوالے سے ہمارے عام مفسرین کی رائے بھی یہی ہے کہ میدانِ حشر میں بھی مؤمنین صادقین کو اللہ تعالیٰ کا دیدار کرایا جائے گا۔ آیت زیر مطالعہ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اس وقت میدانِ حشر میں کفار و مشرکین بھی کھڑے ہوں گے لیکن انہیں اس نعمت سے محروم کر دیا جائے گا۔ میدانِ حشر کے ایسے ہی ایک منظر کی جھلک سورۂ نٓ کی اس آیت میں بھی دکھائی گئی ہے: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ㊷﴾ ''جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور انہیں پکارا جائے گا (اللہ کے حضور) سجدے کے لیے' لیکن وہ کر نہیں سکیں گے''۔ یعنی اہل ایمان جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے کرتے تھے وہ تو اس حکم کو سنتے ہی سجدے میں گر جائیں گے لیکن دوسرے لوگوں کی کمریں تختہ ہو کر رہ جائیں گی' وہ تمام تر خواہش اور کوشش کے باوجود سجدہ نہیں کر سکیں گے۔

آیت ۱۶ ﴿ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ⑯﴾ ''پھر انہیں جھونک دیا جائے گا جہنم میں۔''

اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ مرحلہ دوزخ میں داخلے سے پہلے کا ہے' یعنی دیدارِ الٰہی سے محروم رکھے جانے کا واقعہ میدانِ حشر میں ہی رونما ہو گا۔

آیت ۱۷ ﴿ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ⑰﴾ ''پھر ان سے کہا جائے گا: یہ ہے وہ چیز جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے!''

دنیا میں تم لوگ جنت' دوزخ اور جزا و سزا کو بڑے شد و مد سے جھٹلایا کرتے تھے۔ اب دیکھ لو! دوزخ اور اس کی سزائیں حقیقت بن کر تمہارے سامنے آ گئی ہیں۔

آیت ۱۸ ﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ⑱﴾ ''نہیں! یقیناً نیکوکاروں کے کتاب یا اعمال نامے علیین میں ہوں گے۔''

آیت ۱۹ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ⑲﴾ ''اور تمہیں کچھ اندازہ ہے وہ علیون کیا ہے؟''

(۱) رواه البيهقي في شعب الايمان۔ مشكوٰة المصابيح' كتاب فضائل القرآن' الفصل الثالث۔

آیت ۲۰ ﴿كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾﴾ ''لکھا ہوا دفتر۔''

یعنی ان لوگوں کی ارواح کا مقام جن پر ان کے نیک اعمال کے اثرات بھی ثبت ہوں گے۔

آیت ۲۱ ﴿يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''وہاں موجود ہوں گے ملائکہ مقربین۔''

ان لوگوں کی ارواح کو ملائکہ مقربین کی صحبت میسر ہوگی۔ اس بلند مقام پر انہیں قیامِ قیامت تک رکھا جائے گا۔

آیت ۲۲ ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾﴾ ''یقیناً نیکوکار نعمتوں میں ہوں گے۔''

آیت ۲۳ ﴿عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''وہ تختوں پر بیٹھے (مناظرِ جنت) دیکھ رہے ہوں گے۔''

آیت ۲۴ ﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾﴾ ''تم دیکھو گے ان کے چہروں پر تر وتازگی کی علامات۔''

جیسے دنیا میں انسان کی خوشحالی اور آسودگی کے اثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں اسی طرح قیامت کے دن اہلِ جنت اپنے تر وتازہ چہروں سے صاف پہچانے جائیں گے۔

آیت ۲۵ ﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾﴾ ''انہیں پلائی جائے گی خالص شراب جس پر مہر لگی ہوگی۔''

ہندوستان کے معروف اہلِ حدیث عالمِ دین مولانا صفی الرحمن مبارکپوری نے احادیث کے حوالے سے سیرت پر ایک بہت عمدہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام انہوں نے اس آیت سے اخذ کیا ہے۔ انہیں اس کتاب پر شاہ فیصل ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ الرحیق المختوم کے نام سے یہ کتاب اردو میں ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

آیت ۲۶ ﴿خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ﴾ ''اس کی مہر ہوگی مشک کی۔''

﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''اس چیز کے لیے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے۔''

اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ دنیا کی حقیر چیزوں کے پیچھے دوڑنے کے بجائے ان دوامی نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے محنت اور مسابقت کریں۔

آیت ۲۷ ﴿وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور اس کی ملونی ہوگی تسنیم سے۔''

اس شراب یعنی رحیق مختوم میں تسنیم کا مشروب بھی ملایا گیا ہوگا۔ اور یہ تسنیم کیا ہے؟

آیت ۲۸ ﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''یہ ایک چشمہ ہے جس پر جام نوشی کریں گے مقربینِ بارگاہ۔''

آیت ۲۹ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ ''یقیناً جو مجرم تھے وہ اہلِ ایمان پر ہنسا کرتے تھے۔''

وہ اہلِ ایمان کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ دیکھو ان بے وقوفوں کو جنہوں نے آخرت کے موہوم وعدوں پر اپنی زندگی کی خوشیاں اور آسائشیں قربان کر دی ہیں۔

آیت ۳۰ ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ۝۳۰﴾ ”اور جب یہ ان کے قریب سے گزرتے تھے تو آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔“

کہ دیکھو! یہ ہیں وہ احمق جو جنت کی حوروں کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔

آیت ۳۱ ﴿وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۝۳۱﴾ ”اور جب وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے تھے تو باتیں بناتے ہوئے لوٹتے تھے۔“

آیت ۳۲ ﴿وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝۳۲﴾ ”اور جب وہ ان (اہل ایمان) کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ یقیناً یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں۔“

مخالفین کے ایسے تبصرے طنزیہ بھی ہو سکتے ہیں اور ان میں ہمدردی کا پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے آج کل بھی ہمیں ایسے فقرے اکثر سننے کو مل جاتے ہیں کہ دیکھیں! یہ اچھا بھلا ذہین نوجوان تھا۔ بورڈ ٹاپ کیا' یونیورسٹی میں گولڈ میڈل لیا' ملازمت بھی بہت اچھی ملی' لیکن پھر اچانک خدا جانے اسے کیا ہوا کہ اس کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا' اس کے بعد تو اس کی ترجیحات ہی بدل گئی ہیں' اب اسے نہ اپنا خیال ہے اور نہ ملازمت کی فکر' بس رات دن اس کے سر پر تبلیغ کی دھن سوار ہے۔ بے چارہ' اچھا خاصا کیریئر تباہ کر کے بیٹھ گیا ہے۔

آیت ۳۳ ﴿وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ۝۳۳﴾ ”جب کہ انہیں نہیں بھیجا گیا تھا ان پر نگران بنا کر۔“

آیت ۳۴ ﴿فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝۳۴﴾ ”تو آج (قیامت) کے دن اہل ایمان ان کفار پر ہنس رہے ہیں۔“

آیت ۳۵ ﴿عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ۝۳۵﴾ ”وہ تختوں پر بیٹھے (ان کا حشر) دیکھ رہے ہیں۔“

کہ ابوجہل پر کیا بیت رہی ہے اور ابولہب کو کیسے عذاب کا سامنا ہے۔

آیت ۳۶ ﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶﴾ ”بدلہ مل گیا نا کافروں کو اس کا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے!“

سُوْرَةُ الاِنْشِقَاق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۲﴾ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا
وَتَخَلَّتْ ﴿۴﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿۶﴾
فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿۷﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ﴿۸﴾ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ
مَسْرُوْرًا ﴿۹﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ
كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾ بَلٰٓى اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ فَلَآ اُقْسِمُ
بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا
السجدۃ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاللّٰهُ
اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ
ع اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

آیت ۱ ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾﴾ ''جب آسمان پھٹ جائے گا۔''

نوٹ کیجیے! ان تمام سورتوں کا بنیادی موضوع ''تذکیر آخرت'' ہے۔

آیت ۲ ﴿وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۲﴾﴾ ''اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اسے یہی زیب دیتا ہے۔''

اَذِنَتْ لِرَبِّهَا کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا کہ وہ اپنے رب کے حکم پر کان لگائے ہوئے ہے اور جو بات کان لگا کر سنی جائے اس کے مطابق عمل بھی کیا جاتا ہے۔ اَذِنَتْ کا معنی اِسْتَمَعَتْ وَانْقَادَتْ کیا گیا ہے۔ یعنی اُس نے غور سے سنا اور تعمیل کی۔ حُقَّتْ یہاں مجہول ہے حَقَّ یَحِقُّ سے۔ یعنی وہ اسی لائق ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ بے چون وچرا اپنے خالق کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرے۔

آیت ۳ ﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾﴾ ''اور جب زمین کو پھیلا دیا جائے گا۔''

آیت ۴ ﴿وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴿۴﴾﴾ ''اور وہ نکال باہر کرے گی جو کچھ اس کے اندر تھا اور خالی ہو جائے گی۔''

سورۃ الزلزال میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے: ﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴿۲﴾﴾ ''اور جب زمین اپنے سارے بوجھ نکال کر باہر پھینک دے گی''۔ قیامت کے دن زمین اپنے اندر مدفون تمام انسانوں کے اجسام

اوران کے تمام اجزاء کو نکال کر باہر کرے گی۔ اس کے علاوہ بھی زمین میں جو کچھ معدنیات اور خزانے مخفی ہیں وہ قیامت کے دن نکال کر باہر پھینک دے گی۔

آیت ۵ ﴿وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ ۝۵﴾ ''اور وہ بھی اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اسے یہی زیب دیتا ہے۔''

جس طرح اطاعت وانقیاد کا مظاہرہ آسمان کرے گا' اسی طرح زمین بھی حکم الٰہی بجالائے گی۔

آیت ۶ ﴿یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ ۝۶﴾ ''اے انسان! تو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف' پھر تو اس سے ملنے والا ہے۔''

یہ دنیا انسان کے لیے دار المِحن یعنی مشقتوں کا گھر ہے۔ انسانی زندگی کی اس تلخ حقیقت کو سورۃ البلد میں یوں بیان فرمایا گیا: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ۝۴﴾ کہ انسان تو پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے۔ گویا مشقتیں برداشت کرنا' دکھ اٹھانا اور سختیاں جھیلنا انسان کا مقدر ہے۔ اس سے کسی انسان کو رستگاری نہیں۔ مزدور ہے تو وہ صبح سے شام تک جسمانی سختیاں سہہ رہا ہے۔ کارخانہ دار ہے تو انتظامی گتھیوں کو سلجھانے میں جگر خون کر رہا ہے۔ اگر کوئی کسی دفتر کی کرسی پر بیٹھا ہے تو ذہنی مشقت کی چکی میں پس رہا ہے۔ پھر اپنی اور اہل وعیال کی بیماریاں' معاشی مشکلات' معاشرتی الجھنیں' مال و جان کی حفاظت کی فکر وغیرہ کی صورت میں ذہنی ونفسیاتی پریشانیاں الگ ہیں جو ہر انسان کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہیں۔ دوسروں سے مسابقت اور مقابلے کا غم اس کے علاوہ ہے جو ہر انسان نے اپنے دل ودماغ میں کسی نہ کسی سطح پر ضرور پال رکھا ہے۔ پیدل چلنے والا سائیکل سوار کو رشک بھری نظروں سے دیکھتا ہے' سائیکل سوار کار والے کے حسد میں مبتلا ہے۔ چھوٹی کار والا بڑی کار والے سے جلن کا شکار ہے۔ غرض مشقت' تکلیف یا غم کی نوعیت تو مختلف ہو سکتی ہے مگر کوئی انسان ایسا نہیں جو کسی نہ کسی دکھ' پریشانی یا مشقت میں مبتلا نہ ہو۔ ان مشقتوں' تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا انسان کو روزِ اوّل سے ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا۔ جیتے جی کوئی انسان اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ مرزا غالبؔ نے اس حوالے سے بڑے پتے کی بات کہی ہے: ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

ان مشقتوں اور مصیبتوں میں گھری انسانی زندگی کی یہ سختیاں اور پریشانیاں اپنی جگہ' لیکن انسان کا اصل مسئلہ اس سے کہیں زیادہ گھمبیر اور پریشان کن ہے۔ اور وہ مسئلہ ہے کہ: ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

(ابراہیم ذوق)

انسان کے اخروی احتساب کا تصور ذہن میں لائیں اور پھر موازنہ کریں کہ باقی جانداروں کے مقابلے میں ''انسان'' کس قدر مشکل میں ہے۔ ایک بار بردار جانور کی زندگی کا معمول چاہے جتنا بھی مشکل ہو لیکن اس کی مشقت اور تکلیف اس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایک بیل جب ہل یا رہٹ چلاتے چلاتے

مر جاتا ہے تو اس مشقت سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک انسان جب جو کوفت پر کوفت برداشت کرتا اور تکلیف پر تکلیف جھیلتا جب اس دنیا سے جائے گا تو اسے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی دنیوی زندگی کے ایک ایک پل کا حساب دینا ہوگا۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا أَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا أَبْلَاهُ، وَمَالِهٖ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَ أَنْفَقَهٗ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ)) (۱)

''ابن آدم کے پاؤں قیامت کے روز اپنے رب کے حضور اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں فنا کی؟ اس کی جوانی (کی قوتوں، صلاحیتوں اور اُمنگوں) کے دور کے بارے میں کہ کیسے گزارا؟ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ (حلال ذرائع سے کمایا یا حرام طریقے سے اور اللوں تللوں میں خرچ کیا یا ادائے حقوق کے لیے؟) اور جو علم حاصل ہوا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟''

یعنی دنیا میں بار برداری بھی کرو، جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی اذیتیں بھی برداشت کرو۔ مال و جان اور اولاد سے متعلق رنگا رنگ صدمے جھیلتے جھیلتے زندگی بھر کانٹوں پر بھی لوٹتے رہو اور پھر مرنے کے بعد ایک ایسی ہستی کے سامنے کھڑے ہو کر پل پل کا حساب بھی دو جس سے تمہارے قلوب و اذہان کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والے جذبات و خیالات بھی پوشیدہ نہیں۔ یہ ہے ''انسان'' کی اصل ٹریجڈی!

یہ مرحلہ ایک انسان کے لیے ایسا مشکل ہے کہ اسے یاد کر کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اکثر رویا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کاش میں ایک چڑیا ہوتا!

دیکھا جائے تو حضور ﷺ کے درج بالا فرمان میں مذکور سوالات میں سے آخری سوال سب سے مشکل ہے۔ جس کسی نے دین اور قرآن کا علم جس قدر زیادہ سیکھا اس کے لیے اس کا حساب دینا اسی قدر مشکل ہوگا۔ اگر کسی انسان تک قرآن کی یہ دعوت پہنچ ہی نہیں پائی تو ممکن ہے کہ اس کی طرف سے کوئی عذر بھی قبول ہو جائے۔ (ایسی صورت میں اس کوتاہی کا کچھ نہ کچھ بوجھ ان لوگوں پر بھی ضرور پڑے گا جنہوں نے اسے دعوت پہنچانے میں تساہل برتا) لیکن جن لوگوں تک قرآن کی دعوت پہنچ گئی اور انہوں نے اپنی استعداد کے مطابق قرآن کے پیغام کو سمجھ بھی لیا تو ظاہر ہے ان کے لیے اس آخری سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہوگا۔

آیت ۷ ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۝﴾ ''تو جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں۔''

آیت ۸ ﴿فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۝﴾ ''تو اس سے لیا جائے گا بہت ہی آسان حساب۔''

اس حساب کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کی وضاحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ بخاری و مسلم کی اس حدیث میں آئی ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ حُوْسِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عُذِّبَ)) ''قیامت کے روز جس کا حساب لیا جائے گا اسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا''۔ اس پر میں نے عرض

(۱) سنن الترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع، باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص۔ ح: ۲۴۱۶۔ راوی: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

کیا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا﴾ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ((لَيْسَ ذَاكِ الْحِسَابُ، اِنَّمَا ذَاكِ الْعَرْضُ، مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عُذِّبَ)) (۱) ''یہ حساب نہیں ہوگا' یہ تو محض (اعمال نامہ) پیش کیا جانا ہوگا' روزِ قیامت جس کے حساب کی جانچ پڑتال کی گئی اسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا۔''

یعنی جس خوش قسمت انسان کا اعمالنامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا' اس سے نہ تو کوئی سوال ہوگا اور نہ ہی اس کے مواخذے اور مناقشے کی نوبت آئے گی۔ بس اس کے اعمال نامے کو ایک نظر دیکھ کر اس کی خطاؤں کو معاف کر دیا جائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص سے نرمی کا معاملہ فرمائے گا۔

آیت ۹ ﴿وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ ''اور وہ لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف شاداں وفرحاں۔''

عدالت کے کٹہرے سے وہ شخص جب اپنے ان اہل وعیال' رشتہ دار اور ساتھیوں کی طرف واپس لوٹے گا جو اسی کی طرح معاف کیے گئے ہوں گے تو بہت خوش ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے میری بھی خلاصی ہوگئی۔

آیت ۱۰ ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾ ''اور جس کو دیا جائے گا اس کا اعمالنامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے۔''

قرآن کریم کی اکثر آیات میں ایسے لوگوں کو بائیں ہاتھ میں اعمالنامے دیے جانے کا ذکر ہے۔ اس سیاق وسباق میں یہاں وَرَآءَ ظَهْرِهٖ کے الفاظ سے یوں لگتا ہے کہ فرشتہ ایک مجرم شخص کو جب اس کا اعمالنامہ پکڑانے لگے گا تو وہ اس سے بچنے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ اپنی کمر کے پیچھے چھپالے گا۔ چنانچہ اسی حالت میں اعمالنامہ پیچھے سے اس کے بائیں ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔

آیت ۱۱ ﴿فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا﴾ ''تو اب وہ موت کی طلب کرے گا۔''

اس وقت اس کی ایک ہی خواہش ہوگی کہ مجھے موت آجائے اور میں مر کر ختم ہو جاؤں۔

آیت ۱۲ ﴿وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا﴾ ''لیکن وہ داخل ہوگا جہنم میں۔''

آیت ۱۳ ﴿اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ ''یقیناً (دنیا میں) وہ اپنے اہل وعیال میں بہت خوش وخرم تھا۔''

دنیا میں وہ حرام کی کمائی سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ عیش کرتا رہا اور آخرت کے محاسبے کا کبھی تصور بھی ذہن میں نہ لایا۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ اگر کوئی شخص اپنی روزی تو سو فیصد حلال ذرائع سے کمار ہا ہے لیکن وہ اللہ کے دین کا حق ادا نہیں کر رہا تو ایسے شخص کی حلال ذرائع سے کمائی ہوئی وہ روزی بھی حلال نہیں۔ اس لیے کہ اس نے اپنی روزی کمانے کی اس تگ ودو میں جو وقت' صلاحیتیں اور وسائل صرف کیے ہیں ان میں دین کے حقوق کا حصہ بھی شامل تھا۔ گویا اپنے وقت' وسائل اور اپنی صلاحیتوں کا وہ حصہ جو اسے اللہ کے دین کے

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب من سمع شیئا فلم یفهمه ..... ح:۱۰۳۔ وصحیح مسلم' کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها' باب اثبات الحساب' ح:۲۸۷۶ واللفظ له۔

لیے خرچ کرنا چاہیے تھا اس حصے کو غصب کر کے وہ اپنے ذاتی استعمال میں لے آیا ہے۔ تو دین کے حقوق کو غصب کر کے کمائی ہوئی ایسی روزی حلال کیسے ہو سکتی ہے؟ دراصل حلال و حرام کے معاملے کو بہت دقت نظری سے جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس معاملے کو عام طور پر بہت سطحی انداز میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک عام مسلمان سؤر کا گوشت کھانے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن وہ اس بکری کا گوشت بہت مزے اور رغبت سے کھا لیتا ہے جو اس نے کسی کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر خریدی ہوتی ہے۔ اب ایسی بکری کے بارے میں کون کہے گا کہ وہ حلال ہے اور حرام نہیں ہے!

اس موضوع کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان باطل کے غلبے کے تحت اطمینان وسکون سے زندگی بسر کر رہا ہے اور اس نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کر رہا تو وہ بزعم خویش بے شک ناپ تول کر حلال ہی کیوں نہ کھا رہا ہو اس کا کھانا پینا حتیٰ کہ اس ماحول میں سانس لینا سب حرام ہے۔ ایسے شخص کو خود سوچنا چاہیے کہ وہ کس نظام کی چاکری کر رہا ہے؟ کس کے اقتدار کو کندھا دے رہا ہے؟ تنخواہ کہاں سے لے رہا ہے؟ اور اپنا کاروبار کس کی مدد سے آگے بڑھا رہا ہے؟ ظاہر ہے وہ یہ سب کچھ باطل نظام کے لیے کر رہا ہے اور طاغوت کی فراہم کردہ چھتری کے سائے میں کر رہا ہے۔ چنانچہ کسی مسلمان کا کسی باطل نظام کے تحت ہنسی خوشی زندگی گزارنا کسی طور پر جائز نہیں۔ اِلّا یہ کہ ایسی صورت حال میں وہ کراہت اور بے چینی میں زندگی بسر کرے‘ اپنی ضروریات کو کم سے کم سطح پر رکھے اور باطل نظام کو بدلنے کے لیے اپنا تن من دھن کھپا دینے پر ہمہ وقت کمربستہ رہے۔ اس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ اس کی یہ سوچ اور جدوجہد باطل نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے گناہ کا کفارہ بن جائے گی۔

آیاتِ زیر مطالعہ میں دو انسانی کرداروں کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ان میں ایک کردار تو اللہ کے اُس بندے کا ہے جو دُنیوی زندگی کے دوران آخرت کی جواب طلبی کے احساس سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتا تھا۔ ایسے لوگوں کے اعصاب پر آخرت کے احتساب کا خوف اس حد تک مسلط ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس کیفیت کو جنت میں پہنچ کر بھی یاد کریں گے: ﴿قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِیْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ۝۲۶﴾ (الطور) ”وہ کہیں گے کہ ہم پہلے (دنیا میں) اپنے اہل وعیال میں ڈرتے ہوئے رہتے تھے“۔ ایسے ہی ایک شخص کے بارے میں یہاں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عدالت سے اپنی کامیابی کی نوید سننے کے بعد اپنے گھر والوں کی طرف شاداں وفرحاں لوٹے گا۔ اس کے مقابلے میں ایک کردار وہ ہے جو آخرت اور آخرت کے محاسبے سے بے خبر اپنے اہل وعیال کے ساتھ عیش وعشرت میں مست رہا۔ ایسے شخص نے دنیا میں بلاشبہ ایک خوشحال اور خوشیوں بھری زندگی گزاری‘ لیکن آخرت میں اس کے لیے جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

آیت ۱۴ ﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ۝۱۴﴾ ”اسے گمان ہو گیا تھا کہ کبھی لوٹ کر نہیں آنا ہے۔“

آیت ۱۵ ﴿بَلٰۤى ۚۛ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا۝۱۵﴾ ”کیوں نہیں! یقیناً اس کا رب تو اسے خوب دیکھ رہا تھا۔“

اگلی تین آیات میں تین قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے یہ آیات سورۃ المدثر

کی ان آیات کے ساتھ خاص مناسبت اور بہت گہری مشابہت رکھتی ہیں: ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿٣٣﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿٣٤﴾﴾ ''کیوں نہیں' قسم ہے چاند کی۔ اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔ اور قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو جائے''۔ ان دونوں مقامات کے مابین ایک مشابہت یہ بھی ہے کہ ان دونوں سورتوں میں قسموں پر مشتمل مذکورہ آیات سے بالکل نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ سورۃ المدثر میں بھی ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾﴾ سے ایک نئے مضمون کا آغاز ہو رہا ہے اور بالکل ایسی ہی صورت حال زیر مطالعہ سورت کے اس مقام پر بھی نظر آتی ہے۔

آیت ۱۶ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿١٦﴾﴾ ''تو نہیں' مجھے قسم ہے شام کی سرخی کی۔''

آیت ۱۷ ﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿١٧﴾﴾ ''اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ سمیٹے ہوئے ہے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿١٨﴾﴾ ''اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاتا ہے۔''

میری خالص ذاتی رائے کے مطابق (واللہ اعلم!) سورۃ المدثر کی مذکورہ آیات (۳۲' ۳۳' ۳۴) میں بعثت محمدیؐ کی خبر دی گئی ہے' جبکہ زیر مطالعہ آیات میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ المدثر کے مطالعے کے دوران اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ رات ﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿٣٣﴾﴾ سے مراد چھ سو سال (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے حضور ﷺ کی نبوت کے ظہور تک) کا وہ طویل عرصہ ہے جس کے دوران وحی و نبوت کا سلسلہ منقطع رہا اور دنیا پر مجموعی طور پر کفر و شرک اور ضلالت و جہالت کے اندھیرے چھائے رہے۔ چاند کی قسم ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾﴾ میں علم و ہدایت کی اس مدھم روشنی کا استعارہ ہے جو جن و انس کے نیک افراد کی صورت میں اس دوران کہیں کہیں موجود رہی' جبکہ صبح کی قسم ﴿وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿٣٤﴾﴾ کے پردے میں نبوت محمدیؐ کے خورشید کے طلوع ہونے کی خبر دی گئی ہے' اور اس کے بارے میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے: ﴿اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾﴾ کہ یہ بلاشبہ ایک بہت عظیم واقعہ ہے۔ ظاہر ہے نوع انسانی کی تاریخ میں نبوتِ محمدی ﷺ کے ظہور سے بڑا کوئی اور واقعہ کیا ہوگا۔

بہر حال نبوت و رسالتِ محمدیؐ کے خورشید جہاں تاب کی تابانیوں سے چھ سو سال کی تاریکیاں چھٹ گئیں۔ حضور ﷺ کی وساطت سے اَبنائے آدم کو ''اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' کی خصوصی سند بھی عطا ہوئی' جزیرہ نمائے عرب میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب بھی رونما ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس انقلاب کی فتوحات و برکات تین براعظموں تک پھیل گئیں۔ لیکن چند ہی دہائیوں کے بعد مشیت خداوندی سے نہ صرف مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے' بلکہ رفتہ رفتہ وہ پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ پسپائی کا یہ عمل جب شروع ہوا تو صرف جنگی محاذوں سے پیچھے ہٹنے تک ہی محدود نہ رہا بلکہ مسلمان بحیثیت قوم زندگی کے ہر شعبے اور ہر میدان سے دست بردار ہو کر نکبت و ادبار کی پستیوں میں لڑھکتے چلے گئے۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے اور ابھی اس کے رکنے کے بظاہر کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے۔ یہ گھمبیر صورت حال اپنی جگہ پر ایک زمینی حقیقت ہے' لیکن دوسری طرف ہمارا ایمان ہے کہ قیامت سے پہلے اسلام پوری دنیا پر غالب آئے گا۔ اس بارے میں حضور ﷺ کے فرمودات بہت واضح ہیں (اس مضمون کی احادیث ''نوید خلافت'' کے عنوان سے ایک کتابچے میں جمع کر دی گئی ہیں۔ تفصیل جاننے

کے لیے اس کتابچے سے استفادہ کیا جا سکتا ہے)۔ میں سمجھتا ہوں کہ زیر مطالعہ آیات میں اسلام کے اسی غلبے کی بشارت دی گئی ہے جس کی تفصیل حضورﷺ کے فرمودات میں ملتی ہے۔

میرے نزدیک یہاں پہلی قسم ﴿فَلَآ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿١٦﴾﴾ میں اسلام کے رفتہ رفتہ زوال پذیر ہونے کی صورت حال کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ یعنی سورج غروب ہو چکا ہے اور اب اُفق پر صرف شفق کی سرخی نظر آ رہی ہے۔ دوسری قسم ﴿وَالَّيۡلِ وَمَا وَسَقَ ﴿١٧﴾﴾ میں حالات کے مزید گھمبیر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ دین پر عمل کے اعتبار سے دنیا میں ایک دفعہ پھر تاریکی چھا جائے گی' صرف مدھم سی روشنی باقی رہے گی جو وقت آنے پر آہستہ آہستہ بڑھتی جائے گی۔ درجہ بدرجہ بڑھتے ہوئے چاند کی قسم: ﴿وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿١٨﴾﴾ اسی مدھم اور تدریجاً بڑھتی ہوئی روشنی کا استعارہ ہے۔ ظاہر ہے جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس کی چاندنی ایک حد تک رات کو روشن کر دیتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

آیت ۱۹ ﴿لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿١٩﴾﴾ ''(اسی طرح) تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ۔''

یعنی جس طرح چاند درجہ بدرجہ بڑا ہو کر مرحلہ وار رات کو روشن کرتا ہے بالکل اسی طرح تم مرحلہ وار کوششوں سے غلبہ دین کی منزل تک پہنچو گے۔ واضح رہے کہ لَتَرۡكَبُنَّ کے صیغے میں زور اور تاکید بھی ہے کہ تم لوگ اس منزل تک ضرور پہنچو گے۔ ظاہر ہے ہمیں یہ خبر محمد رسول اللہﷺ نے دی ہے وَهُوَ الصَّادِقُ وَالۡمَصۡدُوۡق! آپؐ کی دی ہوئی خبر غلط نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا دنیا پر اسلام کا مکمل غلبہ ہو کر رہے گا۔ البتہ اسلام کے پہلے غلبے کی شان اور تھی اور دوسرے غلبے کا انداز اور ہوگا۔ یہ فرق سورۃ المدثر کی آیت ۳۴ اور زیر مطالعہ سورت کی آیت ۱۸ پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اسلام کے پہلے غلبے کا ظہور صبح کے اُجالے کی طرح ہوا تھا: ﴿وَالصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿٣٤﴾﴾ (المدثر)۔ اس اُجالے کی شان یہ تھی کہ ادھر آفتابِ نبوت طلوع ہوا اور اُدھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا ماحول منور ہو گیا۔ یعنی حضورﷺ کی دعوت کے آغاز کے بعد صرف تیئیس (۲۳) برس کے مختصر عرصے میں تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب میں اسلام پوری طرح غالب آ گیا۔ ظاہر ہے سورج کے طلوع ہونے کے بعد روشنی ہونے میں زیادہ دیر تو نہیں لگتی۔

البتہ اسلام کے دوسرے غلبہ کی روشنی چاند کی چاندنی کی طرح مرحلہ وار اور تدریجاً پھیلے گی۔ یعنی اب اقامتِ دین اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام کسی ایک داعی یا کسی ایک تحریک کی کوششوں اور کسی ایک نسل کے زمانے میں نہیں بلکہ نسل در نسل جدوجہد سے قائم ہوگا۔ جیسے برعظیم پاک و ہند میں علامہ اقبال نے ایک فکر کو واضح کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے اور ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ کہ ''جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''۔ یعنی مسلمان اس ضابطہ حیات کو ایک ''وحدت'' کے طور پر زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے ''حزب اللہ'' اور مولانا مودودی نے ''جماعت اسلامی'' کے پلیٹ فارم سے اقامت دین کے لیے جدوجہد کی۔ اسی طرح آئندہ ادوار میں بھی اللہ کی توفیق سے اس کے بندے اس جدوجہد کا علم سنبھالے رہیں گے۔ مختلف تحریکیں اس مشن کی ترویج و ترقی کے لیے مختلف انداز میں

کردار ادا کرتی رہیں گی اور بالآخر ان اجتماعی اور مرحلہ وار کوششوں کے نتیجے میں جب اللہ کو منظور ہو گا اسلام بطور دین پوری دنیا میں غالب ہو جائے گا۔

آیت ۲۰ ﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ ''تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے؟''

آیت ۲۱ ﴿وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۝﴾ ''اور جب انہیں قرآن پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو یہ سجدہ نہیں کرتے؟''

آیت ۲۲ ﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۝﴾ ''بلکہ یہ کافر تو جھٹلا رہے ہیں۔''

اس آیت کے الفاظ سے یہ اہم نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کفر اور تکذیب باہم مترادفات نہیں بلکہ الگ الگ معنی کے حامل دو الفاظ ہیں۔ کفر کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں۔ اس مفہوم میں کسی انسان کا ''کفر'' یہ ہے کہ اس کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی معرفت سے متعلق جو گواہیاں رکھی ہیں وہ جانتے بوجھتے ان گواہیوں کو چھپا دے اور لوگوں کے سامنے ان کا اقرار و اظہار نہ کرے۔ جبکہ تکذیب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ان آیات کو جھٹلانا ہے جو انسانی فطرت میں موجود گواہیوں کو اجاگر (activate) کرنے کے لیے اس کی طرف سے نازل ہوئیں۔ اس لحاظ سے کفر اور تکذیب دو الگ الگ جرائم ہیں۔ بلکہ اس وضاحت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کفر کے مقابلے میں تکذیب بڑا جرم ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو جو چارٹر عطا کیا گیا تھا اس میں بھی ان دونوں جرائم کا ذکر الگ الگ ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو اس چارٹر کی عبارت:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾

''ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اُتر جاؤ۔ تو جب کبھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔ اور جو کفر کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ والے (جہنمی) ہوں گے' اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

ان دونوں جرائم میں سے پہلے جرم یعنی کفر کے بارے میں تو شاید کوئی عذر بھی قبول ہو جائے۔ مثلاً یہ عذر کہ ماحول کے منفی اثرات کی وجہ سے کسی انسان کی روح یا فطرت پر غفلت یا جہالت کے پردے پڑ گئے تھے اور اس وجہ سے اس کی فطرت کے آئینے میں اللہ تعالیٰ کی معرفت پوری طرح سے منعکس نہ ہو سکی۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کی واضح آیات کی صورت میں انسان کے سامنے باقاعدہ روشنی آ گئی اور اس روشنی سے بھی اس کو وہی پیغام ملا جو عین اس کی اپنی فطرت کی پکار تھی تو اس کا جانتے بوجھتے ان آیات کو جھٹلا دینا یقیناً بہت بڑی ڈھٹائی اور بہت بڑا جرم ہے جس کے خلاف کوئی عذر قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

آیت ۲۳ ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝﴾ ''اور اللہ کو خوب معلوم ہے کہ یہ لوگ (اپنے اندر) کیا بھرے ہوئے ہیں۔''

عام طور پر اس آیت کے بارے میں یہی سمجھا گیا ہے کہ اس میں انسان کے مال و دولت جمع کرنے کی طرف اشارہ ہے' لیکن دراصل اس سے دلوں اور سینوں کی گندگی مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان لوگوں کے سینے کفر' عداوت' بغض' حسد' تکبر وغیرہ کی غلاظتوں سے بھرے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے یہ اللہ کی آیات کو پہچان لینے کے بعد بھی ان کی تکذیب کر رہے ہیں۔

آیت ۲۴ ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) ان کو بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔''

آیت ۲۵ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ ''البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے' ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔''

مَنَّ يَمُنُّ مَنًّا کے لغوی معنی کسی چیز کو کاٹ دینے کے ہیں۔ ظاہر ہے جب کسی چیز کو کاٹ دیا جاتا ہے تو اس کی انتہا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ سے مراد ایسا اَجر ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْج

تمہیدی کلمات

سورۃ البروج اور اس کے بعد والی سورت یعنی سورۃ الطارق کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ اس سورت کی ابتدائی آیات میں ایک تاریخی واقعہ کا ذکر ہوا ہے جو یمن میں ۵۲۳ عیسوی کے لگ بھگ‘ حضورﷺ کی ولادت سے تقریباً پچاس سال قبل پیش آیا۔ قدیم یمن میں بہت عرصہ تک عیسائی بادشاہ برسراقتدار رہے۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی کے آغاز کے زمانے میں وہاں ’ذونواس‘ نامی یہودی بادشاہ کی حکومت قائم ہوگئی جو عیسائیوں کا شدید مخالف تھا۔ یہودی اور عیسائی دراصل شروع ہی سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے ہیں۔ ان کے باہمی اختلافات کی نوعیت ایسی ہے کہ اصولی طور پر ان کے درمیان کبھی بھی صلح نہیں ہوسکتی۔ ظاہر ہے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے ہیں بلکہ ان کی اکثریت تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتی ہے‘ جبکہ یہودی آپ کو مرتد‘ جادوگر اور ولد الزنا قرار دیتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں ان لوگوں کے باہمی اختلافات کیسے ختم ہوسکتے ہیں۔

البتہ آج کل اس حوالے سے بہت غیر معمولی صورت حال دیکھنے کو مل رہی ہے۔ آج پوری عیسائی دنیا یہودیوں کی مٹھی میں ہے اور عیسائیوں کی مدد سے انہوں نے یہودی ریاست بھی قائم کر لی ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ عیسائیوں کی معاشی اور جنگی طاقت کو جہاں اور جیسے چاہتے ہیں استعمال کر رہے ہیں۔ یہ دراصل یہودی ذہانت اور محنت کا جادو ہے جو آج پوری دنیا کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس غیر معمولی صورت حال کی وجوہات اور ممکنہ نتائج کے بارے میں میری تقاریر کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ مزید معلومات کے لیے ان تقاریر سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے عیسائی دشمنی کے جنون میں یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بڑی بڑی خندقیں کھدوا کر ان میں ایندھن بھرا اور پھر وسیع پیمانے پر آگ جلا کر بیس ہزار کے لگ بھگ بے گناہ عیسائیوں کو زندہ جلا دیا۔ اس سورت کی ابتدائی آیات میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

یہ سورۂ مبارکہ مکہ معظمہ کے اُس دور میں نازل ہوئی جب کفارِ مکہ مسلمانوں کو سخت سے سخت عذاب دے کر ایمان سے پھیر دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ اس میں کفار کو ان کے ظلم و ستم کے برے انجام سے خبردار کیا گیا ہے اور اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر وہ ان مظالم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے تو ان کو اس کا بہترین اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بدلہ ضرور لے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝1 وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝2 وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝3 قُتِلَ اَصْحٰبُ
الْاُخْدُوْدِ ۝4 النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝5 اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝6 وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ
شُهُوْدٌ ۝7 وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝8 الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝9 اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ
يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝10 اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝11 اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝12 اِنَّهٗ
هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ۝13 وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝14 ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝15 فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝16 هَلْ
اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝17 فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ۝18 بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۝19 وَّاللّٰهُ مِنْ
وَّرَاۗىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ ۝20 بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝21 فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝22 ع

آیت ۱ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝1﴾ ’’قسم ہے آسمان کی جو برجوں والا ہے۔‘‘

برجوں سے مراد آسمان کے عظیم الشان ستارے اور سیارے لیے گئے ہیں۔

آیت ۲ ﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝2﴾ ’’اور قسم ہے اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔‘‘

یعنی قیامت کا دن‘ جو آکر رہے گا۔

آیت ۳ ﴿وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝3﴾ ’’اور قسم ہے حاضر ہونے والے کی اور اس کی جس کے پاس حاضر ہوا جائے۔‘‘

اس آیت کی بہت سی تعبیرات کی گئی ہیں‘ جن میں سے ایک تعبیر یہ ہے کہ شَاهِد سے مراد جمعہ کا دن ہے‘ جو شہر شہر بستی بستی لوگوں کے پاس حاضر ہوتا ہے‘ جبکہ مَشْهُوْد عرفہ (۱۰ ذی الحجہ) کا دن ہے جس کے پاس لوگوں کو خود میدانِ عرفات میں جا کر حاضر ہونا پڑتا ہے۔

آیت ۴ ﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝4﴾ ’’ہلاک ہو گئے وہ کھائیوں والے۔‘‘

’’اصحاب الاخدود‘‘ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خندقیں کھودیں اور اہل ایمان کو ان خندقوں میں ڈال کر جلایا۔ بظاہر تو وہاں اہل ایمان ہلاک ہوئے تھے لیکن وہ تو اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر کے آخرت کی نعمتوں اور کامیابیوں کے مستحق ٹھہرے اور واقعتاً ہلاکت اور بربادی ان لوگوں کے حصے میں آئی جنہوں نے خندقیں کھود کر اہل ایمان کو ان میں ڈال کر جلایا۔

آیت ۵ ﴿النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝5﴾ ’’وہ آگ جو بڑی ایندھن والی تھی۔‘‘

یعنی وہ خوفناک آ گ جسے بہت زیادہ ایندھن جمع کر کے بھڑکایا گیا تھا۔

آیت ۶ ﴿اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝﴾ ''جبکہ وہ اس (کے کناروں) پر بیٹھے ہوئے تھے۔''

آیت ۷ ﴿وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝﴾ ''اور مؤمنین کے ساتھ وہ جو کچھ کر رہے تھے خود اس کا نظارہ بھی کر رہے تھے۔''

ان صاحبِ اقتدار و اختیار لوگوں نے اہلِ ایمان کو زندہ جلانے کے احکام جاری کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان خندقوں کے کناروں پر انہوں نے باقاعدہ براجمان ہو کر اس دلدوز منظر کا نظارہ کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ اسی طرح پچھلی صدی میں ہٹلر نے بھی بہت ''پرتکلف'' منصوبہ بندی کے ساتھ یہودیوں کے قتلِ عام کا اہتمام کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بڑے بڑے گیس چیمبرز نصب کیے اور انسانی لاشوں کو سائنٹیفک انداز میں ٹھکانے لگانے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیے۔

آیت ۸ ﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝﴾ ''اور وہ نہیں انتقام لے رہے تھے ان سے مگر اس لیے کہ وہ ایمان لے آئے تھے اللہ پر جو زبردست ہے اور اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔''

آیت ۹ ﴿الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''جس کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں کی اور زمین کی۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝﴾ ''اور اللہ تو ہر چیز پر خود گواہ ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا﴾ ''یقیناً جن لوگوں نے ظلم و ستم توڑا مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں پر پھر انہوں نے توبہ بھی نہیں کی''

اگر ان میں سے کسی نے مرنے سے پہلے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا تو اس کا یہ جرم معاف ہو سکتا ہے۔

﴿فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝﴾ ''تو ان کے لیے ہوگا جہنم کا عذاب اور جلا ڈالنے والا عذاب۔''

آیت ۱۱ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے''

﴿لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ﴾ ''ان کے لیے وہ باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔''

﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝﴾ ''یہ ہے اصل بڑی کامیابی۔''

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝﴾ ''یقیناً تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔''

اللہ تعالیٰ حلیم بھی ہے' وہ انسان کو ڈھیل بھی دیتا ہے اور اس کی رسّی دراز بھی کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر اگلی سورت میں آئے گا) لیکن جب وہ کسی فرد یا قوم کی گرفت کرتا ہے تو اس کی گرفت بہت سخت

ہوتی ہے۔

آیت ۱۳ ﴿اِنَّهٗ هُوَ يُبۡدِئُ وَيُعِيۡدُ ۝۱۳﴾ ''وہی ہے جو پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی اعادہ بھی کرے گا۔''

جب اس نے انسان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے تو دوسری مرتبہ وہ اسے پیدا کرنے پر بھلا کیونکر قادر نہیں ہوگا؟

آیت ۱۴ ﴿وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُ ۝۱۴﴾ ''اور وہ بخشنے والا بھی ہے' محبت کرنے والا بھی ہے۔''

آیت ۱۵ ﴿ذُو الۡعَرۡشِ الۡمَجِيۡدُ ۝۱۵﴾ ''عرش کا مالک ہے' بڑی شان والا ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيۡدُ ۝۱۶﴾ ''وہ جو ارادہ کرلے' کرگزرنے والا ہے۔''

ظاہر ہے اس کے ارادے کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

آیت ۱۷ ﴿هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ الۡجُنُوۡدِ ۝۱۷﴾ ''کیا آپ کے پاس لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟''

آیت ۱۸ ﴿فِرۡعَوۡنَ وَثَمُوۡدَ ۝۱۸﴾ ''فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی؟''

آیت ۱۹ ﴿بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِىۡ تَكۡذِيۡبٍ ۝۱۹﴾ ''لیکن یہ کافر جو ہیں یہ جھٹلانے ہی میں لگے رہیں گے۔''

آیت ۲۰ ﴿وَّاللّٰهُ مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ مُّحِيۡطٌ ۝۲۰﴾ ''جبکہ اللہ ان کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔''

آیت ۲۱ ﴿بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌ ۝۲۱﴾ ''بلکہ یہ تو قرآن ہے بہت عزت والا۔''

آیت ۲۲ ﴿فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ۝۲۲﴾ ''لوحِ محفوظ میں (نقش ہے)۔''

یعنی اصل قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے پاس لوحِ محفوظ میں ہے۔ جس مقام کا ذکر یہاں لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ کے نام سے ہوا ہے' سورۃ الزخرف کی آیت ۴ میں اسے اُمُّ الۡكِتٰبِ' سورۃ الواقعہ کی آیت ۷۸ میں كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍ اور سورۂ عبس کی آیات ۱۳ اور ۱۴ میں اسے صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ کہا گیا ہے۔

سُوْرَةُ الطَّارِق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ① وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ② النَّجْمُ الثَّاقِبُ ③ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا
عَلَيْهَا حَافِظٌ ④ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ⑤ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ⑥ يَّخْرُجُ مِنْ
بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ⑦ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ⑧ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ⑨ فَمَا لَهٗ مِنْ
قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ⑩ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ⑪ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ⑫ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ
فَصْلٌ ⑬ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ⑭ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ⑮ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ⑯ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ
اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ⑰ ع

آیت ۱ ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ①﴾ ''قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔''

آیت ۲ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ②﴾ ''اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟''

آیت ۳ ﴿النَّجْمُ الثَّاقِبُ ③﴾ ''وہ ستارہ ہے چمکدار۔''

آیت ۴ ﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ④﴾ ''کوئی جان ایسی نہیں جس پر کوئی نگہبان نہ ہو۔''

سورۃ الانفطار کی ان آیات میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے: ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ⑩ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ⑪ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ⑫﴾ ''جبکہ ہم نے تمہارے اوپر محافظ (فرشتے) مقرر کر رکھے ہیں۔ بڑے باعزت لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو''۔ انسان کے محافظ فرشتوں کا ذکر سورۃ الانعام کی اس آیت میں بھی ہے: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ﴾ (آیت ۶۱) ''اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب ہے اور وہ تم پر نگہبان بھیجتا رہتا ہے''۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ متعدد فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان میں سے کچھ اس کے اعمال کا ریکارڈ مرتب کرنے میں مصروف ہیں جبکہ کچھ کو اس کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

آیت ۵ ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ⑤﴾ ''تو انسان کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔''

آیت ۶ ﴿خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ⑥﴾ ''وہ پیدا کیا گیا ہے اچھلتے ہوئے پانی سے۔''

آیت ۷ ﴿يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ⑦﴾ ''جو نکلتا ہے پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے۔''

مرد کے مادہ منویہ کا اصل منبع ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہے۔ یہاں سے پیدا ہو کر یہ مادہ ان

غدودوں تک پہنچتا ہے جو اس کے لیے مخصوص ہیں۔

آیت ۸ ﴿اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝۸﴾ ''یقیناً وہ اسے لوٹانے پر بھی قادر ہے۔''

جس اللہ نے پانی کی ایک بوند سے انسان کی تخلیق کی ہے وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے اسے اپنے پاس واپس بلا لے۔ اور یقیناً وہ اس کے مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کر دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

آیت ۹ ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝۹﴾ ''جس دن تمام چھپے ہوئے رازوں کی جانچ پڑتال ہوگی۔''

آیت ۱۰ ﴿فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝۱۰﴾ ''تو نہیں ہوگی کسی انسان کے لیے کوئی طاقت اور نہ ہوگا اس کا کوئی مددگار۔''

آیت ۱۱ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝۱۱﴾ ''قسم ہے اس آسمان کی جو بارش برساتا ہے وقفے وقفے سے۔''

آیت ۱۲ ﴿وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝۱۲﴾ ''اور قسم ہے اس زمین کی جو پھوٹ پڑتی ہے۔''

آسمان سے بارش ہوتی ہے اور بارش کی وجہ سے نباتات زمین کو پھاڑتے ہوئے اُگ آتے ہیں۔ یعنی آسمان اور زمین اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ:

آیت ۱۳ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝۱۳﴾ ''یہ (قرآن) قولِ فیصل ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝۱۴﴾ ''اور یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے۔''

جیسے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾ (آیت ۱۰۵) ''اور اس (قرآن) کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے۔''

آیت ۱۵، ۱۶ ﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝۱۵ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝۱۶﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ اپنی سی چالیں چل رہے ہیں اور میں بھی اپنی چال چل رہا ہوں۔''

آیت ۱۷ ﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝۱۷﴾ ''تو آپ ان کافروں کو ذرا مہلت دے دیجیے' تھوڑی دیر انہیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے!''

ابتدائی مکی دور کی سورتوں میں حضور ﷺ کے لیے یہ ہدایت بہت تکرار کے ساتھ آئی ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے لیے جلدی نہ کریں' ان کے بارے میں تھوڑی دیر انتظار کریں: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ﴾ (الاحقاف: ۳۵) ''تو (اے محمد ﷺ!) آپ بھی صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسول صبر کرتے رہے ہیں اور ان کے لیے جلدی نہ کیجیے!'' اس دور میں چونکہ مشرکینِ مکہ نے اہلِ ایمان پر عرصہ حیات تنگ کیا ہوا تھا' اس لیے ان آیات کے ذریعے حضور ﷺ کی وساطت سے اہلِ ایمان کو بھی بار بار تسلی دی جاتی تھی اور سمجھایا جاتا تھا کہ ابھی ہم ان لوگوں کو کچھ مزید مہلت دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ لوگ ان کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر کرتے ہوئے ہمارے فیصلے کا انتظار کریں۔

سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی

تمہیدی کلمات

سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ مل کر جوڑا بناتی ہیں۔ حضور ﷺ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی پہلی رکعت میں اکثر سورۃ الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے اس انتخاب کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان دونوں سورتوں میں تذکیر کا خصوصی حکم ہے (سورۃ الاعلیٰ آیت ۹ اور سورۃ الغاشیہ آیت ۲۱) جبکہ ان دونوں نمازوں میں بھی تذکیر کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں مواقع پر خطبات کا اہتمام خصوصی طور پر تذکیر کے لیے ہی کیا جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیْۤ اَخْرَجَ
الْمَرْعٰی ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَہٗ غُثَآءً اَحْوٰی ؕ﴿۵﴾ سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰۤی ۙ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ اِنَّہٗ یَعْلَمُ الْجَہْرَ
وَ مَا یَخْفٰی ؕ﴿۷﴾ وَ نُیَسِّرُکَ لِلْیُسْرٰی ۚ﴿۸﴾ فَذَکِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّکْرٰی ؕ﴿۹﴾ سَیَذَّکَّرُ مَنْ یَّخْشٰی ۙ﴿۱۰﴾
وَ یَتَجَنَّبُہَا الْاَشْقَی ۙ﴿۱۱﴾ الَّذِیْ یَصْلَی النَّارَ الْکُبْرٰی ۚ﴿۱۲﴾ ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْہَا وَ لَا یَحْیٰی ؕ﴿۱۳﴾ قَدْ اَفْلَحَ
مَنْ تَزَکّٰی ۙ﴿۱۴﴾ وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ؕ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ۫ۖ﴿۱۶﴾ وَ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ؕ﴿۱۷﴾
اِنَّ ہٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۙ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰہِیْمَ وَ مُوْسٰی ﴿۱۹﴾ ع ۱۲

آیت ۱ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی ①﴾ ''پاکی بیان کرو اپنے رب کے نام کی جو بہت بلند و بالا ہے۔''
یہ حکم یوں بھی ہو سکتا تھا کہ ''اپنے رب کی پاکی بیان کرو'' لیکن یہاں خصوصی طور پر اسم (نام) کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے تصور سے وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ اس کی ذات کے ساتھ ہمارا ذہنی و قلبی تعلق صرف اور صرف اس کے ناموں کے حوالے سے ہے۔ اسی لیے ہمیں حکم دیا گیا ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا ۪﴾ (الاعراف: ۱۸۰) ''اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، تو پکارو اُسے اُن (اچھے ناموں) سے''۔ چنانچہ ہم انسان اگر اللہ کا ذکر کرنا چاہیں یا اس کی تسبیح و تحمید کرنا چاہیں تو ظاہر ہے اس کے اسماء کے حوالے سے ہی کر سکتے ہیں۔

آیت ۲، ۳ ﴿الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ② وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ③﴾ ''جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا، پھر

تناسب قائم کیا۔ اور جس نے (ہر شے کا) اندازہ مقرر کیا' پھر اسے (فطری) ہدایت عطا فرمائی۔''

ان چار الفاظ (خَلَقَ' فَسَوّٰی' قَدَّرَ' فَهَدٰی) میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان بھی ہے اور تخلیقی عمل کے مختلف مراحل کا ذکر بھی۔ اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کے حوالے سے تین اسمائے حسنیٰ (اَلْخَالِقُ' اَلْبَارِیُٔ' اَلْمُصَوِّرُ) کا ایک ساتھ ذکر قبل ازیں سورۃ الحشر کی آخری آیت میں بھی آ چکا ہے۔ سورۃ الحشر کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی یہ تین صفات ایک خاص منطقی ترتیب سے بیان ہوئی ہیں۔ یہ ترتیب دراصل تخلیقی عمل کے مرحلہ وار ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے کسی چیز کا نقشہ یا نمونہ بناتا ہے' اس لحاظ سے وہ اَلْخَالِقُ ہے۔ پھر وہ مطلوبہ چیز کو طے شدہ نمونے کے مطابق عدم سے عالم وجود میں ظاہر فرماتا ہے' اس اعتبار سے وہ اَلْبَارِیُٔ ہے۔ تیسرے مرحلے میں وہ اس تخلیق کو ظاہری صورت یا شکل عطا فرماتا ہے' اس مفہوم میں وہ اَلْمُصَوِّرُ ہے۔

سورۃ الحشر کی مذکورہ آیت میں تخلیقی عمل کے جن تین مراحل کا ذکر ہوا ہے ان کا تعلق چیزوں کے ظاہری یا مادی وجود سے ہے' جبکہ زیر مطالعہ آیات میں مادی وجود کی تخلیق کے ساتھ ساتھ چیزوں کے باطنی خصائص کی تخلیق کا ذکر بھی ہے۔ (خَلَقَ فَسَوّٰی کے الفاظ میں چیزوں کے مادی وجود کی تخلیق کے مراحل کا بیان ہے' جبکہ قَدَّرَ فَهَدٰی کے الفاظ کسی تخلیق کے باطنی پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔)

اب ہم ان الفاظ کے معانی و مفہوم کو انسانی ماحول کی مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ پہلے دو مراحل (تخلیق اور تسویہ) کو ایک عمارت کی مثال کے حوالے سے یوں سمجھئے کہ کسی عمارت کا ڈھانچہ کھڑا کر دینا اس کی ''تخلیق'' ہے' جبکہ اس کو سجانا' سنوارنا (finishing) وغیرہ اس کا ''تسویہ'' ہے۔ تخلیق کا تیسرا مرحلہ جس کا یہاں ذکر ہوا ہے وہ ''قدر'' ہے۔ قدر کے لغوی معنی اندازہ مقرر کرنے کے ہیں' جسے عرفِ عام میں ہمارے ہاں تقدیر کہا جاتا ہے۔ اس مفہوم میں کسی تخلیق کے معیار' اس کی صلاحیت' استعداد اور حدود (limitations) سمیت جملہ خصوصیات کو اس کی قدر یا تقدیر کہا جائے گا۔ مثلاً انسان اشرف المخلوقات تو ہے لیکن وہ ہوا میں اڑنے سے معذور ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی چڑیا آسانی سے ہوا میں اڑتی پھرتی ہے۔ تو گویا ہوا میں اڑنے کی یہ صلاحیت رکھنا چڑیا کی تقدیر کا خاصہ ہے اور اس اعتبار سے معذور ہونا انسان کی تقدیر کا حصہ ہے۔ اس کے بعد تخلیق کے اگلے مرحلے کے طور پر یہاں ''ہدایت'' کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد وہ فطری اور جبلی ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو پیدائشی طور پر عطا کر رکھی ہے۔ اسی ''ہدایت'' کی روشنی میں بکری کو معلوم ہوا ہے کہ اسے گھاس کھانا ہے اور شیر جانتا ہے کہ اس کی غذا گوشت ہے۔ غرض ہر جاندار اپنی زندگی اسی طریقے اور اسی لائحہ عمل کے مطابق گزار رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے طے کر دیا ہے۔

تخلیق کے ان چار مراحل کے حوالے سے اگر ہم انسانی زندگی کا جائزہ لیں تو پہلے دو مراحل یعنی تخلیق اور تسویہ کے اعتبار سے تو انسان میں اور اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوقات میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اگلے دو مراحل (تقدیر اور ہدایت) کے حوالے سے انسان کا معاملہ دوسری مخلوقات سے الگ ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان کی قدر' صلاحیت اور استعداد اللہ تعالیٰ کے ہاں دو طرح سے طے پاتی ہے۔ اس کا ایک پہلو یا ایک حصہ تو وہ ہے جو اسے پیدائشی طور پر جینز (genes) کی صورت میں عطا ہوا (given) ہے اور دوسرا پہلو یا دوسرا حصہ اس کے ماحول کا

ہے جس میں وہ آنکھ کھولتا اور پرورش پاتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کے اچھے برے اور مثبت و منفی عوامل کے ملنے سے ہر انسان کی شخصیت کا ایک سانچہ تیار ہوتا ہے جسے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۴ میں ''شاکلہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت کے تحت اس اصطلاح کی وضاحت کی جا چکی ہے۔) اسی سانچہ یا شاکلہ سے ہر انسان کی استعداد کی حدود متعین ہوتی ہیں۔ اور کوئی انسان انگریزی محاورہ "one cannot out grow ones skin" (کوئی انسان اپنی کھال سے باہر نہیں نکل سکتا) کے مصداق ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ ہر انسان نیکی کرے گا تو اپنی اسی استعداد کے مطابق کرے گا اور اگر برائی کمائے گا تو انہی حدود کے اندر رہ کر ایسا کرے گا۔ غرض ہر انسان کی عملی زندگی کی ساری محنت' کوشش اور بھاگ دوڑ اپنے شاکلہ کے مطابق ہی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جانچ (evaluation) بھی اسی حوالے سے کی جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کی صلاحیت پچاس درجے تک پہنچنے کی تھی' اگر وہ چالیس درجے تک پہنچ گیا تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ کامیاب قرار پائے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص جو سو درجے تک جانے کی استعداد رکھتا تھا' وہ ممکن ہے پچاس درجے تک پہنچنے کے بعد بھی ناکام رہے۔ بہرحال اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے ایک اصول طے فرما دیا کہ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اس کی وسعت کے مطابق۔''

اسی طرح انسان کی ''ہدایت'' کے بھی دو درجے ہیں۔ پہلا درجہ تو جبلی ہدایت کا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو جبلی ہدایت سے نواز رکھا ہے اسی طرح اس نے ہر انسان کو بھی فطری اور جبلی طور پر ہدایت کا ایک حصہ عطا فرمایا ہے۔ جبکہ انسان کی ہدایت کا دوسرا حصہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے وحی کے ذریعے عطا فرمایا ہے۔ یعنی انسان کی فطرت میں پہلے سے ودیعت شدہ بنیادی ہدایت کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیغمبر بھی بھیجے اور کتابیں بھی نازل کیں۔

آیت ۴ ﴿وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝۴﴾ ''اور جس نے (زمین سے) چارہ نکالا۔''

آیت ۵ ﴿فَجَعَلَهٗ غُثَاۗءً اَحْوٰى ۝۵﴾ ''پھر اس کو کر دیا سیاہ چورا۔''

یعنی اس کے طے کردہ نظام کے تحت گھاس اور نباتات وغیرہ زمین سے اُگتے ہیں اور پھر گل سڑ کر ختم ہو جاتے ہیں۔

آیت ۶ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝۶﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم آپ کو پڑھا دیں گے' پھر آپ بھولیں گے نہیں۔''

یعنی قرآن مجید میں سے کوئی چیز آپ کو بھولے گی نہیں۔ یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ القیامہ کی ان آیات میں آیا ہے: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝۱۸﴾ ''آپ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اسے جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھوا دیں تو آپ اس کی قراءت کی پیروی کیجیے۔''

آیت ۷ ﴿اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ﴾ ''سوائے اس کے کہ جو اللہ چاہے۔''

یہاں یہ کلمہ استثناء صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اظہار کے لیے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے' اس

کے حکم اور اذن کے بغیر کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کے حافظہ سے کوئی چیز محو کرنا چاہے تو وہ لاکھ اسے یاد کرتا رہے‘ یاد نہیں رکھ سکے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن مجید کی کوئی آیت حضور ﷺ بھول بھی گئے تھے۔ اس لحاظ سے اس جملے کی مثال سورۃ الزخرف کی اس آیت جیسی ہے: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ۝﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے کہیے کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا تو سب سے پہلا اس کی عبادت کرنے والا میں ہوتا‘‘۔ ظاہر ہے یہ کلام پر زور دینے کا ایک انداز ہے اور اس کا مقصد انتہائی پُرزور انداز میں یہ ثابت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہرگز ہرگز کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا۔

﴿اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝﴾ ’’یقیناً وہ جانتا ہے اونچی آواز میں کہی گئی بات کو بھی اور جو مخفی رکھی جائے اسے بھی۔‘‘

آیت ۸ ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝﴾ ’’اور ہم رفتہ رفتہ پہنچا دیں گے آپ کو آسانی تک۔‘‘

تَیْسِیْر یُسر سے باب تفعیل ہے۔ اس باب میں تدریج کے معنی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی ﷺ! ہم مشکلات میں سے رفتہ رفتہ آپ کے لیے راستہ بناتے چلے جائیں گے اور اس آسان راستے پر آپ کو تدریجاً ایک بڑی آسانی کی طرف لے جائیں گے۔ اس سے مراد اس دنیا میں غلبۂ دین کی جدوجہد کی کامیابی اور آخرت میں جنت اور اس کی آسائشیں ہیں۔ ہم چاہیں تو آنِ واحد میں آپ کے تمام دشمنوں کو آپ کے سامنے سرنگوں کر دیں اور تمام جن وانس کو ایمان کی توفیق بخش دیں‘ لیکن ہماری حکمت اور مشیت میں اس معاملے کی ایک تدریج ہے۔ چنانچہ ہم آپ کی جدوجہد کو مرحلہ وار اور رفتہ رفتہ کامیابی سے ہمکنار کریں گے۔ اس فلسفے کی مزید وضاحت آگے چل کر سورۃ الشّمس میں آئے گی۔

آیت ۹ ﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝﴾ ’’تو آپ یاد دہانی کراتے رہیے‘ اگر یاد دہانی فائدہ دے۔‘‘

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ انذار و تذکیر کا فریضہ تبھی سر انجام دیں جب مخاطب کو اس سے کچھ فائدہ ہو رہا ہو یعنی وہ اس تذکیر کا اثر قبول کر رہا ہو۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس حوالے سے وضاحت کر دی گئی ہے۔

آیت ۱۰ ﴿سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝﴾ ’’وہ نصیحت حاصل کر لے گا جو ڈرتا ہے۔‘‘

آپ لوگوں کو تذکیر و نصیحت کرتے جایئے‘ جس کے دل میں اللہ کا خوف ہوگا وہ اس کا اثر ضرور قبول کرے گا اور اسے فائدہ بھی ہوگا۔ چنانچہ اے نبی ﷺ جب بھی آپ پر کوئی نئی وحی آئے تو آپ وہ نیا کلام پڑھ کر لوگوں کو ضرور سنائیں۔ آپ کے اہل ایمان ساتھیوں کے علم اور ایمان میں اس سے ضرور اضافہ ہوگا۔

آیت ۱۱ ﴿وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝﴾ ’’البتہ جو شقی (بدبخت) ہے وہ اس سے پہلوتہی کرے گا۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝﴾ ’’جو (آخر کار) داخل ہوگا بڑی آگ میں۔‘‘

آیت ۱۳ ﴿ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝﴾ ’’پھر نہ اس میں وہ مرے گا نہ زندہ رہے گا۔‘‘

جہنم کی یہی خصوصیت سورۃ المدثر میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝﴾ ’’وہ انسان کو نہ تو باقی رہنے دے گی اور نہ ہی اسے چھوڑے گی۔‘‘

آیت ۱۴ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿١٤﴾﴾ ”یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے خود کو پاک کر لیا۔“

ان آیات میں بہت اہم اور بنیادی نوعیت کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔ اگلی سورتوں میں مختلف مقامات پر ان مضامین کی مزید وضاحت آئے گی۔ تَزَکّٰی سے مراد یہاں روح کی پاکیزگی ہے۔ بنیادی طور پر انسان کی روح بہت بلند اور اعلیٰ چیز ہے۔ سورۃ التین کی اس آیت میں دراصل انسان کی روح کی تخلیق ہی کا ذکر ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴿٤﴾﴾ کہ ہم نے انسان کو بہت عمدہ تخلیق پر بنایا ہے۔ لیکن جب اس روح کو جسدِ حیوانی میں قید کر کے دنیا میں بھیجا گیا تو وقتی طور پر روح اپنے اعلیٰ مقام سے گر کر پستی میں چلی گئی، جس کا ذکر سورۃ التین کی اگلی آیت میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ﴿٥﴾﴾ کہ پھر ہم نے اس کو پست ترین حالت کی طرف لوٹا دیا۔ چنانچہ انسان کی دُنیوی زندگی کا اصل ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ خود کو پستی سے نکال کر دوبارہ بلندی کی طرف لے جائے۔ اگر تو اس نے یہ ہدف حاصل کر لیا تو وہ کامیاب ہے ورنہ ناکام۔ اس کامیابی کے لیے اسے ایک طرف جسدِ حیوانی کے داعیات یعنی اپنی نفسانی خواہشات کو دبانا ہوگا اور دوسری طرف اپنی روح کو زیادہ سے زیادہ غذا فراہم کرنے کا سامان کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے حیوانی داعیات کمزور ہوں گے تو تبھی روح کو تقویت ملے گی۔ ماہِ رمضان کے چوبیس گھنٹے کے معمولات کے ذریعے سے اہل ایمان کو دراصل اسی ”دو طرفہ“ پروگرام کی مشق کرائی جاتی ہے کہ دن کو روزہ رکھ کر حیوانی جسم اور اس کے داعیات کو کمزور کرو اور رات کو قیام اللیل کے دوران انوارِ قرآن کی بارش سے اپنی روح کو سیراب کرو تا کہ تمہاری روح کو ترفع اور اللہ کا قرب حاصل ہو سکے۔ یہ ہے تَزَکّٰی کا اصل مفہوم اور اس کا بنیادی فلسفہ۔

آیت ۱۵ ﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿١٥﴾﴾ ”اور اُس نے اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔“

اس آیت کے الفاظ کی عملی تصویر جمعہ کا اجتماع ہے۔ اجتماعِ جمعہ میں بھی پہلے خطبہ کی صورت میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے پھر نماز پڑھی جاتی ہے۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں اجتماعِ جمعہ کے حوالے سے حضور ﷺ کا یہ معمول نقل ہوا ہے:

((كَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ خُطْبَتَانِ كَانَ يَجْلِسُ بَيْنَهُمَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيُذَكِّرُ النَّاسَ))[1]

”اللہ کے رسول ﷺ کے دو خطبے ہوتے تھے ان کے دوران آپ بیٹھا کرتے تھے۔ آپ قرآن حکیم پڑھ کر سناتے اور لوگوں کو نصیحت فرماتے۔“

حضور ﷺ کے دونوں خطبات بہت مختصر ہوتے تھے۔ اس لیے صاف ظاہر ہے کہ ان کے درمیان حضور ﷺ تھکان کی وجہ سے تو نہیں بیٹھتے تھے۔ میری رائے اس حوالے سے یہ ہے کہ یہ دو خطبات نمازِ ظہر کی دو رکعتوں کے قائم مقام ہیں۔ (نمازِ ظہر میں فرضوں کی چار رکعتیں ہیں جبکہ نمازِ جمعہ میں دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں) چنانچہ اس دوران حضور ﷺ کا بیٹھنا دراصل اپنے خطاب کو باقاعدہ دو خطبوں کی شکل دینے کے لیے ہوتا تھا۔ ان

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب ذکر الخطبتین قبل الصلاة وما فیهما من الجلسة۔ و سنن ابی داوٗد، کتاب الصلاة، باب الخطبة قائماً، ح:۱۰۹۴۔ راوی: جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ۔

خطبات میں جیسا کہ حدیث میں ذکر ہوا ہے' حضور ﷺ آیاتِ قرآنی کے ذریعے تذکیر فرماتے تھے۔ آپ کے تمام سامعین چونکہ قرآن کی زبان کو بخوبی سمجھتے تھے اس لیے ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق قرآن مجید کا مفہوم بغیر کسی وضاحت اور تشریح کے دلوں میں اترتا چلا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں چونکہ عام سامعین عربی خطبہ کو نہیں سمجھ سکتے اس لیے ان کی تذکیر کے لیے خطبہ سے پہلے ''خطاب'' کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اجتماعِ جمعہ کے موقع پر ذکر و تذکیر کی اسلام میں کیا اہمیت ہے' اس کا اندازہ درج ذیل حدیث سے ہوتا ہے۔ اجتماعِ جمعہ میں بروقت حاضری کو یقینی بنانے کی ترغیب دیتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا كَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ كَانَ عَلٰى كُلِّ بَابٍ مِنْ اَبْوَابِ الْمَسْجِدِ الْمَلَائِكَةُ، يَكْتُبُوْنَ الْاَوَّلَ فَالْاَوَّلَ، فَاِذَا جَلَسَ الْاِمَامُ طَوَوُا الصُّحُفَ، وَجَاءُوْا يَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ))(۱)

''جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو مسجد کے دروازوں میں سے ہر دروازے پر فرشتے کھڑے ہو جاتے ہیں' وہ پہلے آنے والوں کو پہلے لکھتے ہیں۔ پھر جب امام (منبر پر) بیٹھ جاتا ہے تو فرشتے اپنے رجسٹر سمیٹ لیتے ہیں اور ذکر سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔''

حضور ﷺ کے دوسرے فرمان میں جمعہ کے لیے جلدی مسجد آنے والوں کے لیے درجہ بدرجہ فضیلت کی وضاحت بھی ملتی ہے:

((مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ غُسْلَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ رَاحَ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بَدَنَةً، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّانِيَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بَقَرَةً، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ كَبْشًا اَقْرَنَ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الرَّابِعَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ دُجَاجَةً، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الْخَامِسَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بَيْضَةً فَاِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ حَضَرَتِ الْمَلَائِكَةُ يَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ))(۲)

''جو آدمی جمعہ کے دن غسل جنابت (کی طرح اہتمام کے ساتھ غسل) کرے پھر وہ صبح صبح مسجد میں جائے تو وہ اس طرح ہے گویا اس نے ایک اونٹ قربان کیا' اور جو آدمی دوسری ساعت میں جائے تو گویا اس نے ایک گائے قربان کی' اور جو آدمی تیسری ساعت میں گیا تو گویا اس نے ایک سینگوں والا مینڈھا قربان کیا' اور جو چوتھی ساعت میں گیا تو گویا اس نے ایک مرغی قربان کی' اور جو پانچویں ساعت میں گیا تو گویا اس نے ایک انڈا قربان کر کے اللہ کا قرب حاصل کیا۔ پھر جب امام (خطبہ کے لیے) نکلے تو فرشتے بھی (اندراج کا سلسلہ ختم کر کے) ذکر سننے کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں۔''

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے لفظ ''ساعت'' کی مختلف تاویلیں کی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی رائے اس ضمن میں یہ ہے (ذاتی طور پر مجھے اس رائے سے اختلاف ہے) کہ اس لفظ کا تعلق وقت کی ظاہری تقسیم سے نہیں بلکہ ان ''ساعتوں'' سے مخفی ساعتیں مراد ہیں۔ البتہ اس حدیث میں جس خطبہ کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ذکر الملائکۃ' ح:۳۲۱۱۔ وصحیح مسلم' کتاب الجمعۃ' باب فضل التھجیر یوم الجمعۃ' ح:۸۵۰۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الجمعۃ' باب الطیب والسواک یوم الجمعۃ۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب الطھارۃ' باب فی الغسل یوم الجمعۃ۔

مسنون خطبہ ہے۔ اس حکم کا اطلاق ہمارے ائمہ اور خطباء کی مقامی زبانوں میں کی جانے والی تقاریر پر نہیں ہوتا۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد حاضری کا اندراج نہ ہونے کے حوالے سے شاہ ولی اللہؒ کی رائے یہ ہے کہ اس کے بعد آنے والے جمعہ کی فضیلت سے محروم رہیں گے' البتہ ان کے فرض کی ادائیگی ہو جائے گی' حتیٰ کہ اگر کوئی شخص خطبہ کے دوران بھی شامل ہوگا تو فرض کی ادائیگی کی حد تک اس کی حاضری بھی قبول سمجھی جائے گی۔

آیت ۱۶ ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا﴾ ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔''

دراصل انسان کی اُخروی کامیابی یا ناکامی کا تمام تر انحصار اس کی ترجیحات پر ہے۔ اگر تو وہ اپنے معاملات کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے آخرت کی کامیابی کو مقدم رکھتا ہے اور دنیوی مفادات کے حوالے سے قناعت پسندی کی حکمت عملی پر کاربند رہتا ہے تو وہ کامیاب ہے اور اگر اس کا معاملہ اس کے برعکس ہے تو اس کا راستہ تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔ اس آیت میں اس حوالے سے ہم جیسے دنیادار مسلمانوں کے اصل مرض کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ ہم دنیوی زندگی کے مفادات کو آخرت کے معاملات پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دنیا کا نفع اور نقصان ہمیں نقد نظر آتا ہے جبکہ آخرت کی راحت اور تکلیف ہمیں سامنے نظر نہیں آتی۔ اس لیے دنیا کا معمولی سا مفاد ہم آخرت کے بہت بڑے عذاب کے بدلے میں بھی حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جیسے سورۃ النساء کی آیت ۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ جو لوگ ظلم و زیادتی سے یتیموں کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں۔ لیکن آج دنیا میں جو کوئی ایسا مال کھاتا ہے اسے ایسا کرتے ہوئے تو محسوس نہیں ہوتا کہ وہ آگ کے انگارے پیٹ میں بھر رہا ہے' اس لیے جب وہ ایسے مال کو اپنی پہنچ میں دیکھتا ہے تو اسے غصب کرنے سے باز نہیں رہتا۔ انسان کی اس طبعی اور جبلی کمزوری یا خامی کا ذکر سورۃ القیامہ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾﴾ ''ہرگز نہیں! اصل میں تم لوگ عاجلہ (جلد ملنے والی چیز) سے محبت کرتے ہو۔ اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

آیت ۱۷ ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ﴿١٧﴾﴾ ''جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔''

آیت ۱۸ ﴿اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ﴿١٨﴾﴾ ''یقیناً یہی بات اگلے صحیفوں میں بھی۔''

یعنی تذکیر اور ہدایت کا اصل جوہر اور خلاصہ یہی ہے کہ انسان آخرت کو دنیا پر ترجیح دے' کیونکہ دنیا فانی اور وقتی ہے جبکہ آخرت اس سے کہیں بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ہدایت کے حوالے سے یہ بنیادی نکتہ پہلے آسمانی صحیفوں میں بھی مذکور تھا۔

آیت ۱۹ ﴿صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی ﴿١٩﴾﴾ ''(یعنی) ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحائف تو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں' البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کا آج بظاہر کہیں نشان نہیں ملتا۔ اس حوالے سے میری رائے یہ ہے اور میں اپنی اس رائے کا اظہار قبل ازیں بھی متعدد بار کر چکا ہوں کہ ہندوؤں کے اپنشد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف ہی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔

سُوْرَةُ الْغَاشِيَة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا
حَامِيَةً ۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ
مِنْ جُوْعٍ ۝ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاعِمَةٌ ۝ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا
لَاغِيَةً ۝ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۝ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۝ وَّنَمَارِقُ
مَصْفُوْفَةٌ ۝ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ۝ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ
كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ
اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ
الْاَكْبَرَ ۝ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝ ع

آیت ۱ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ①﴾ ”کیا پہنچ چکی ہے آپ کے پاس اس ڈھانپ لینے والی (آفت) کی خبر؟“

یعنی قیامت کی خبر جو پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

آیت ۲ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ ②﴾ ”بہت سے چہرے اُس دن ذلیل ہوں گے۔“

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ القیامہ اور سورۂ عبس میں بھی آ چکا ہے۔ سورۃ القیامہ میں اس صورت حال کا نقشہ یوں دکھایا گیا ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ㉒ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ㉓ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۭ بَاسِرَةٌ ㉔ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ㉕﴾ ”کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے اور کچھ چہرے اُس دن افسردہ ہوں گے۔ خیال کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہونے والا ہے“۔ جبکہ سورۂ عبس میں یہی کیفیت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ㊳ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ㊴ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ㊵ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ㊶﴾ ”اس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے۔ مسکراتے ہوئے خوش و خرم۔ اور کچھ چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے۔ ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔“

آیت ۳ ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ③﴾ ”مشقت زدہ‘ تھکے ماندے۔“

آیت ۴ ﴿تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ④﴾ ''وہ داخل ہوں گے دہکتی ہوئی آگ میں۔''

آیت ۵ ﴿تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ⑤﴾ ''انہیں پلایا جائے گا پانی ایک کھولتے ہوئے چشمے سے۔''

آیت ۶ ﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ⑥﴾ ''نہیں ہوگا ان کے لیے کھانے کو کچھ بھی سوائے خاردار جھاڑیوں کے۔''

آیت ۷ ﴿لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ⑦﴾ ''جو نہ تو موٹا کرے اور نہ ہی بھوک مٹائے۔''

اسے کھانے سے نہ تو انہیں کوئی تقویت ملے گی اور نہ ہی بھوک کا احساس ختم ہوگا۔ کسی بھی غذا کے یہی دو فائدے ہوتے ہیں' لیکن اہل جہنم کو اس کھانے سے ان میں سے کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اب اگلی آیات میں نیک لوگوں کی کیفیت بیان کی جا رہی ہے:

آیت ۸ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ⑧﴾ ''بہت سے چہرے اُس روز تر وتازہ ہوں گے۔''

ان کے چہرے ناز ونعمت میں پلے بڑھے لوگوں کے چہروں کی طرح بارونق ہوں گے۔

آیت ۹ ﴿لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ⑨﴾ ''وہ اپنی کوشش (کے نتائج) پر راضی ہوں گے۔''

وہ لوگ اپنی دُنیوی زندگیوں میں آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے رہے تھے اور آخرت کی کامیابی کے لیے مسلسل کوشاں بھی تھے۔ چنانچہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی کوششیں اور محنتیں قبول فرمائے گا۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ⑲﴾ ''اور جو کوئی آخرت کا طلب گار ہو اور اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر افزائی کی جائے گی۔''

آیت ۱۰ ﴿فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ⑩﴾ ''(وہ ہوں گے) عالی مقام جنت میں۔''

آیت ۱۱ ﴿لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ⑪﴾ ''وہ اس میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔''

وہاں انہیں کوئی ایسی فضول یا غلط بات سنائی نہیں دے گی جس سے انہیں کوفت ہو۔

آیت ۱۲ ﴿فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ⑫﴾ ''اس میں ایک چشمہ ہے بہتا ہوا۔''

آیت ۱۳ ﴿فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ⑬﴾ ''اس میں اونچے اونچے تخت ہیں۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ⑭﴾ ''اور جام قرینے سے رکھے ہوئے۔''

آیت ۱۵ ﴿وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ⑮﴾ ''اور قالین بچھے ہوئے صف در صف۔''

آیت ۱۶ ﴿وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ⑯﴾ ''اور مخمل کے نہالچے جگہ جگہ پھیلے ہوئے۔''

اگلی چار آیات قرآن مجید کی ان آیات میں سے ہیں جو بقول علامہ اقبال شعوری مشاہدے پر زور دیتی ہیں کہ چیزوں کو دیکھو' ان پر غور کرو اور اپنی عقل اور منطق کے مطابق ان سے نتائج اخذ کرو۔ ظاہر ہے عقل' شعور اور حواس کی صلاحیتیں انسان کو اسی لیے دی گئی ہیں کہ اپنی زندگی میں وہ ان سے کام لے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ

لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔـوْلًا ۝﴾ (بنی اسرائیل) ''اور مت پیچھے پڑو اُس چیز کے جس کے بارے میں تمہیں علم نہیں۔ یقیناً سماعت' بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں باز پرس کی جائے گی''۔ واضح رہے کہ علم کے میدان میں یہ سائنٹیفک رجحان قرآن مجید نے متعارف کرایا ہے۔ مطلب یہ کہ انسان ہر چیز کو پہلے عقل کی کسوٹی پر پرکھے اور پھر کوئی رائے قائم کرے۔ عقل سے ماوراء صرف الہامی علم ہے۔ اس لیے وحی کی سند کے بغیر انسان کوئی ایسی بات تسلیم نہ کرے جس کے پیچھے کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ ہو۔ قرآن مجید کا عطا کردہ یہی وہ اندازِ فکر ہے جس نے ہر قسم کی توہم پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

آیت ۱۷ ﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝﴾ ''تو کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کو کہ انہیں کیسے بنایا گیا ہے!''

کیا یہ لوگ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے؟ اور نہیں تو یہ اونٹ کی تخلیق کو ہی دیکھ لیتے کہ اس جانور کے جسم کی ریگستان کے ماحول کے ساتھ کس قدر ہم آہنگی ہے۔ ریگستان کی گرمی میں' یہ کئی کئی دن کھائے پیئے بغیر چلتا رہتا ہے۔ اس کے پاؤں ایسے بنائے گئے ہیں کہ ریت میں نہیں دھنستے۔

آیت ۱۸ ﴿وَاِلَى السَّمَاۗءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝﴾ ''اور (کیا یہ دیکھتے نہیں) آسمان کو کہ کیسے بلند کیا گیا ہے!''

یہ ماہرین فلکیات کے لیے صلائے عام ہے کہ وہ اس میدان میں تحقیق کر کے ستاروں اور کہکشاؤں کی دنیا کے اسرار ورموز معلوم کریں۔

آیت ۱۹ ﴿وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝﴾ ''اور (کیا یہ دیکھتے نہیں) پہاڑوں کو کہ کیسے گاڑ دیے گئے ہیں!''

پہاڑوں کی بناوٹ اور کرۂ ارضی پر ان کے اثرات وغیرہ کے بارے میں تحقیق کرنا ماہرین ارضیات کا کام ہے۔

آیت ۲۰ ﴿وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝﴾ ''اور (کیا یہ دیکھتے نہیں) زمین کی طرف کہ کیسے بچھا دی گئی ہے!''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی آفاقی نشانیوں میں سے چند نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں بار بار آیا ہے لیکن ان آیات میں خصوصی طور پر قرآن مجید کے مخاطبین اوّلین سے خطاب ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں سرزمین حجاز کے باشندوں کا زیادہ تر وقت صحرائی مسافتوں میں گزرتا تھا' جیسا کہ سورۂ قریش کی آیت ﴿رِحْلَةَ الشِّتَاۗءِ وَالصَّيْفِ﴾ میں بھی ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ اپنے سفروں کے دوران جس ماحول سے ان لوگوں کا دن رات واسطہ رہتا تھا ان آیات میں اسی ماحول کی چار چیزوں کو گنوا کر انہیں غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ یعنی ایک وہ اونٹ جو ان کے صحرائی سفر کی واحد سواری تھی' اوپر آسمان' نیچے زمین اور اطراف وجوانب میں پہاڑی سلسلے۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں عام طور پر ان لوگوں کے شب وروز گزرتے تھے۔

بہرحال قرآن مجید کی ایسی تمام آیات صاحب شعور انسانوں کو دعوتِ فکر دیتی ہیں کہ تم لوگ ان مظاہرِ فطرت کو غور سے دیکھا کرو۔ ان میں سے ایک ایک چیز اللہ تعالیٰ کی نشانی اور اس کی صنّاعی وخلّاقی کا نمونہ ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴿۱۶۴﴾﴾

''یقیناً آسمان اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور اُن کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں (یا دریاؤں میں) لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اُس پانی میں کہ جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے پھر اس سے زندگی بخشی زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد اور ہر قسم کے حیوانات (اور چرند پرند) اس کے اندر پھیلا دیے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو معلق کر دیے گئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔''

اسی حقیقت کو شیخ سعدیؒ نے اپنے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار ہر ورقش دفترے است معرفتِ کردگار!

کہ ایک صاحبِ شعور انسان کے لیے سبز درختوں کا ایک ایک پتا گویا معرفتِ خداوندی کا دفتر ہے۔ شیخ سعدیؒ نے تو اپنے زمانے میں یہ بات اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر کہی تھی لیکن آج سائنسی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سبز درختوں کا ایک ایک پتا دراصل phtosynthesis کی فیکٹری ہے۔ یہ فیکٹریاں سارا دن آکسیجن بنانے اور سورج کی روشنی کو جذب کر کے درختوں کی لکڑی کی طرف منتقل کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔

ظاہر ہے یہ صفحات ایسی مثالوں کی تفصیل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس حوالے سے انسان کے سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کو محض حیوانی آنکھ سے نہیں بلکہ عقل اور شعور کی نظر سے دیکھے۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے ''زبورِ عجم'' میں کیا پتے کی بات کہی ہے:

دم چیست؟ پیام است، شنیدی نشنیدی! درخاکِ تو یک جلوۂ عام است ندیدی!

دیدن دگر آموز، شنیدن دگر آموز!

کہ اے غافل انسان! تمہارا ہر سانس اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے۔ کیا تم نے اس پیغام کو کبھی سنا؟ نہیں سنا! اور تمہاری اس خاک (حیوانی جسم) کے اندر ایک جلوۂ ربانی (نورانی روح) بھی پوشیدہ ہے، لیکن تم نے اس جلوے کو کبھی دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ چنانچہ تمہیں چاہیے کہ تم اس کائنات کی چیزوں کو حیوانی آنکھوں سے دیکھنا اور حیوانی کانوں سے سننا چھوڑ دو اور انسانوں کا سا دیکھنا اور سننا سیکھو۔ تم اشرف المخلوقات ہو، تمہیں اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور سمیت بہت سی اعلیٰ صلاحیتوں سے نواز رکھا ہے، ان صلاحیتوں کو استعمال میں لاؤ۔ مظاہر فطرت اور دوسری چیزوں کو دیکھو اور ان پر غور کرو: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ﴾ (البقرۃ:۲۹) یہ زمین پر جو کچھ ہے سب اللہ نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔ ان چیزوں پر تحقیق کرو، نئے نئے قوانین فطرت کو تلاش کرو، انہیں کام لاؤ۔ تمہیں زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت عطا ہوئی ہے۔ اس حیثیت سے خود زمین، اس پر موجود تمام چیزیں، یہ ہوائیں، یہ فضائیں، ستارے، سیارے، کہکشائیں سب تمہارے لیے مسخر ہیں۔ یاد رکھو! اگر تم عقل و شعور سے کام لو گے تو ان پر حکومت کرو گے، لیکن اگر تم توہمات میں پڑ جاؤ گے تو ان چیزوں کے غلام بن جاؤ گے۔

آیت ۲۱ ﴿فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝﴾ ”تو (اے نبی ﷺ!) آپ یاد دہانی کراتے رہیے‘ آپ تو بس یاد دہانی کرانے والے ہیں۔“

آیت ۲۲ ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝﴾ ”آپ ان پر کوئی داروغہ نہیں ہیں۔“

آپ کی ذمہ داری صرف تذکیر اور نصیحت تک ہے‘ کسی کو زبردستی راہِ ہدایت پر لانا آپ کا کام نہیں ہے۔

آیت ۲۳ ﴿اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ ۝﴾ ”مگر جس نے منہ موڑا اور کفر کیا۔“

آیت ۲۴ ﴿فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ۝﴾ ”تو اس کو اللہ عذاب دے گا سب سے بڑا عذاب۔“

بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا کلام اور پیغام اپنی بے داغ اور مثالی سیرت کی گواہی کے ساتھ اُمت تک اس انداز میں پہنچا دیا ہے کہ حق کو سمجھنے کے بارے میں کہیں کوئی ابہام نہیں رہا۔ اب اس کے بعد بھی جو شخص حق سے منہ موڑے گا تو وہ گویا حق کو حق سمجھتے ہوئے اسے ٹھکرائے گا اور اس سے یہی ثابت ہوگا کہ اس کے اندر بھلائی اور خیر کی کوئی رمق موجود ہی نہیں۔ چنانچہ ایسا ہر شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدید ترین عذاب کا مستحق ہے۔

آیت ۲۵ ﴿اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝﴾ ”(اے نبی ﷺ!) ان سب کو ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔“

آیت ۲۶ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝﴾ ”پھر ان کا حساب ہمارے ذمہ ہے۔“

آپ تذکیر اور یاد دہانی کے حوالے سے اپنا فرض ادا کرتے جایئے۔ ان کی جوابدہی اور حساب کا معاملہ آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ یہ وہی انداز اور اسلوب ہے جو اس گروپ کی سورتوں میں قبل ازیں بھی کئی بار آ چکا ہے۔ اس دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں مشرکین کو مہلت دینے کا ذکر بہت خصوصیت کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً سورۃ المزمل میں فرمایا گیا: ﴿وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝﴾ ”آپ مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو چھوڑ دیں‘ جو بڑی نعمتوں سے نوازے گئے ہیں اور ابھی آپ انہیں کچھ مہلت دیں“۔ اسی طرح سورۃ الطارق کی آخری آیت میں بھی یہ مضمون خصوصی اسلوب کے ساتھ آیا ہے۔ اس آیت میں اس مفہوم کے دو صیغے (مَهِّلْ ـ اَمْهِلْ) بابِ تفعیل اور بابِ افعال سے آئے ہیں۔ یہاں فرمایا کہ ”ان سب کو لوٹ کر ہماری ہی طرف آنا ہے۔ پھر ان کا حساب ہمارے ذمہ ہے!“

اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَّسِيْرًا ـ آمین یا ربّ العالمین!

سُوْرَةُ الْفَجْر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ ۝۱ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝۲ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝۳ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝۴ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝۵
اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝۶ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝۷ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝۸
وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝۹ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝۱۰ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝۱۱
فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝۱۲ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝۱۳ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝۱۴ فَاَمَّا
الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝۱۵ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ
فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝۱۶ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝۱۷ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى
طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۱۸ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝۱۹ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝۲۰ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ
الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝۲۱ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝۲۲ وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَىِٕذٍ
يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ۝۲۳ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ۝۲۴ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُعَذِّبُ
عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ۝۲۵ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ۝۲۶ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝۲۷ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ
رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝۲۸ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝۲۹ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝۳۰ ع

آیت ۱ ﴿وَالْفَجْرِ ۝۱﴾ ’’قسم ہے فجر کی۔‘‘

سورۃ الفجر کی ابتدائی آیات قسموں کے حوالے سے مشکلات القرآن میں سے ہیں اور ان کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ بہرحال اس پہلی آیت کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ اس سے ۱۰ ذی الحجہ کی فجر مراد ہے جس کے بعد قربانی ہوتی ہے اور یہ دن مناسکِ حج کے حوالے سے بنیادی اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

آیت ۲ ﴿وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝۲﴾ ’’اور قسم ہے دس راتوں کی۔‘‘

پہلی قسم کی مناسبت سے اکثر مفسرین نے ان راتوں سے ۱۰ ذی الحجہ کی فجر سے پہلے کی دس راتیں مراد لی ہیں۔ ظاہر ہے ۱۰ ذی الحجہ کی فجر سے پہلے ۱۰ ذی الحجہ کی رات گزر چکی ہوتی ہے‘ اس لیے وہ رات بھی ان میں شامل ہے۔

آیت ۳ ﴿وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝۳﴾ ’’اور قسم ہے جُفت کی اور طاق کی۔‘‘

اس سے عموماً رمضان کے آخری عشرہ کی جفت اور طاق راتیں مراد لی جاتی ہیں اور طاق راتوں میں لیلۃ القدر ہے۔ البتہ دنیا کے تمام علاقوں میں چاند چونکہ ایک ساتھ نظر نہیں آتا اس لیے مختلف علاقوں کی طاق اور جفت راتوں میں فرق ہوگا۔ مثلاً ہوسکتا ہے ہمارے ہاں پاکستان میں جو رات طاق ہو سعودی عرب میں وہ جفت ہو۔

آیت ۴ ﴿وَالَّيۡلِ اِذَا يَسۡرِ ۝۴﴾ ''اور قسم ہے رات کی جب وہ گزرنے لگے۔''

آیت ۵ ﴿هَلۡ فِىۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِىۡ حِجۡرٍ ۝۵﴾ ''کیا اس میں کوئی قسم (دلیل) ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل مند ہیں؟''

یعنی ان تمام چیزوں کو اگلی آیات کے مضمون پر گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔

آیت ۶ ﴿اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝۶﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں کیا کیا تھا آپ کے رب نے عاد کے ساتھ؟''

آیت ۷ ﴿اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۝۷﴾ ''وہ ارم جو ستونوں والے تھے۔''

''ارم'' کے بارے میں عام مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ قوم عاد کے شاہی خاندان کا لقب تھا۔ یعنی جس طرح مصر میں فراعنہ' عراق میں نمارده اور یمن میں تابعہ خاندانوں کی حکومتیں تھیں' اسی طرح قوم عاد کے علاقے میں ارم خاندان برسر اقتدار تھا۔ یہاں ان کے حوالے سے ستونوں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ وہ لوگ اپنی تعمیرات میں ستونوں کو خصوصی اہمیت دیتے تھے اور دنیا میں ستونوں پر بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے انہی نے شروع کیا تھا۔ جیسے اس قوم کے ایک شہر کے جو زیر زمین آثار دریافت ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اس شہر کی فصیل پر تیس ستون یا مینار بنائے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر شداد نے خصوصی اہتمام کے ساتھ بسایا تھا جو اس قوم کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔

آیت ۸ ﴿الَّتِىۡ لَمۡ يُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِى الۡبِلَادِ ۝۸﴾ ''جن کے مانند نہیں پیدا کیے گئے (دنیا کے) ملکوں میں۔''

یعنی قد و قامت اور جسمانی قوت کے لحاظ سے دنیا میں ان کا کوئی ثانی پیدا نہ ہوا۔ ان الفاظ کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس قوم نے جس معیار اور جس انداز کی تعمیرات کی تھیں ایسی تعمیرات ان سے پہلے دنیا میں کسی اور قوم نے نہیں کی تھیں۔ شاید اسی لیے تاریخ میں شداد کی ''جنت ارضی'' مشہور ہے۔

آیت ۹ ﴿وَثَمُوۡدَ الَّذِيۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ ۝۹﴾ ''اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا آپ کے رب نے) جنہوں نے وادی میں چٹانوں کو تراشا تھا۔''

قوم ثمود کے لوگ پہاڑوں کو تراشنے کے ماہر تھے۔ وہ بڑے بڑے پہاڑوں کو تراش کر خوبصورت کشادہ گھر اور محلات بناتے تھے۔ پہاڑوں سے تراشے ہوئے ان کے گھر اور محلات آج بھی موجود ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَفِرۡعَوۡنَ ذِى الۡاَوۡتَادِ ۝۱۰﴾ ''اور فرعون کے ساتھ (کیا کیا) جو میخوں والا تھا۔''

اوتاد (وتد کی جمع) لوہے کی میخوں کو بھی کہتے ہیں اور لکڑی کے کھونٹوں کو بھی جن کے ساتھ خیموں کی رسیاں باندھی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ اس کے لشکروں کے خیموں کے کھونٹوں کا ذکر ہے۔ اس

لیے کہ اس کے لشکر بہت بڑے تھے اور وہ بڑی شان وشوکت کا مالک تھا۔ جب وہ چڑھائی کرتا تو لشکروں کے خیمے نصب کرنے کے لیے کھونٹوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے ہمراہ ہوتا۔ ایک دوسری رائے یہ بھی ہے کہ وہ جس سے ناراض ہوتا اسے صلیب پر چڑھا کر اس کے جسم میں میخیں لگوا دیتا تھا۔ (واللہ اعلم!)

آیت ۱۱ ﴿الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝﴾ ''جنہوں نے (اپنے اپنے) ملکوں میں سرکشی اختیار کی تھی۔''

آیت ۱۲ ﴿فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝﴾ ''سو انہوں نے ان میں بکثرت فساد پھیلا دیا تھا۔''

ظاہر ہے جب اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے نظام سے سرکشی ہوگی تو اس کا نتیجہ مخلوقِ خدا پر ظلم وزیادتی کی صورت میں سامنے آئے گا اور اسی ظلم وزیادتی کا نام فساد ہے۔ جس طرح آج G-7 اور G-9 ممالک کی انسان دشمن پالیسیاں دنیا میں فساد کا باعث بن رہی ہیں۔ ان ظالمانہ پالیسیوں کے نتیجے میں سرمایہ داروں اور محروم طبقہ کے افراد کے درمیان North versus South کے عنوان سے خطرناک محاذ آرائی شروع ہوچکی ہے۔ لیکن اب وہ وقت بھی دور نہیں جب اس صورت حال کے خطرناک نتائج خود ان کے اپنے گلے کا طوق بنیں گے: ؎

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

بہرحال زمین میں فساد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے انسانوں کی سرکشی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے' جیسا کہ سورۃ الروم کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (آیت ۴۱) ''بحر وبر میں فساد رونما ہو چکا ہے' لوگوں کے اعمال کے سبب۔''

آیت ۱۳ ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝﴾ ''تو دے مارا ان کے اوپر آپ کے رب نے عذاب کا کوڑا۔''

چنانچہ یہ سب قومیں اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار بنیں اور دنیا سے ان کا نام ونشان مٹ گیا۔

آیت ۱۴ ﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝﴾ ''بے شک آپ کا رب تو (سرکشوں اور مفسدوں کی) تاک میں ہے۔''

یعنی کوئی فرد ہو یا کوئی قوم' جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے سرکشی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس جرم کی سزا ضرور دے گا۔

آیت ۱۵ ﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝﴾ ''انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب اس کا ربّ اسے آزماتا ہے پھر اسے عزت دیتا ہے اور نعمتیں عطا کرتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت دی!''

آیت ۱۶ ﴿وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ﴾ ''اور جب وہ اسے آزماتا ہے پھر اُس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے''

﴿فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝﴾ ''تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا!''

لیے کہ اس کے لشکر بہت بڑے تھے اور وہ بڑی شان و شوکت کا مالک تھا۔ جب وہ چڑھائی کرتا تو لشکروں کے خیمے نصب کرنے کے لیے کھونٹوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے ہمراہ ہوتا۔ ایک دوسری رائے یہ بھی ہے کہ وہ جس سے ناراض ہوتا اسے صلیب پر چڑھا کر اس کے جسم میں میخیں لگوا دیتا تھا۔ (واللہ اعلم!)

آیت ۱۱ ﴿الَّذِیۡنَ طَغَوۡا فِی الۡبِلَادِ ﴿۱۱﴾﴾ ''جنہوں نے (اپنے اپنے) ملکوں میں سرکشی اختیار کی تھی۔''

آیت ۱۲ ﴿فَاَکۡثَرُوۡا فِیۡہَا الۡفَسَادَ ﴿۱۲﴾﴾ ''سوانہوں نے ان میں بکثرت فساد پھیلا دیا تھا۔''

ظاہر ہے جب اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے نظام سے سرکشی ہوگی تو اس کا نتیجہ مخلوقِ خدا پر ظلم و زیادتی کی صورت میں سامنے آئے گا اور اسی ظلم و زیادتی کا نام فساد ہے۔ جس طرح آج G-7 اور G-9 ممالک کی انسان دشمن پالیسیاں دنیا میں فساد کا باعث بن رہی ہیں۔ ان ظالمانہ پالیسیوں کے نتیجے میں سرمایہ داروں اور محروم طبقہ کے افراد کے درمیان North versus South کے عنوان سے خطرناک محاذ آرائی شروع ہو چکی ہے۔ لیکن اب وہ وقت بھی دور نہیں جب اس صورت حال کے خطرناک نتائج خود ان کے اپنے گلے کا طوق بنیں گے:

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

بہرحال زمین میں فساد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے انسانوں کی سرکشی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے' جیسا کہ سورۃ الروم کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿ظَہَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ﴾ (آیت ۴۱) ''بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے' لوگوں کے اعمال کے سبب۔''

آیت ۱۳ ﴿فَصَبَّ عَلَیۡہِمۡ رَبُّکَ سَوۡطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾﴾ ''تو دے مارا ان کے اوپر آپ کے رب نے عذاب کا کوڑا۔''

چنانچہ یہ سب قومیں اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار بنیں اور دنیا سے ان کا نام و نشان مٹ گیا۔

آیت ۱۴ ﴿اِنَّ رَبَّکَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ﴿۱۴﴾﴾ ''بے شک آپ کا رب تو (سرکشوں اور مفسدوں کی) تاک میں ہے۔''

یعنی کوئی فرد ہو یا کوئی قوم' جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے سرکشی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس جرم کی سزا ضرور دے گا۔

آیت ۱۵ ﴿فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىہُ رَبُّہٗ فَاَکۡرَمَہٗ وَ نَعَّمَہٗ ۬ۙ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَکۡرَمَنِ ﴿۱۵﴾﴾ ''انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب اس کا رب اسے آزماتا ہے پھر اسے عزت دیتا ہے اور نعمتیں عطا کرتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت دی!''

آیت ۱۶ ﴿وَ اَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىہُ فَقَدَرَ عَلَیۡہِ رِزۡقَہٗ ۬ۙ﴾ ''اور جب وہ اسے آزماتا ہے پھر اُس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے''

﴿فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَہَانَنِ ﴿۱۶﴾﴾ ''تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا!''

آیت ۱۷ ﴿كَلَّا﴾ ''ایسا ہرگز نہیں ہے!''

یہ مقام اپنے مضمون کے اعتبار سے پورے قرآن مجید میں منفرد و ممتاز ہے۔ مذکورہ دونوں کیفیات کے حوالے سے انسان کے جن مکالمات کا یہاں ذکر ہوا ہے بظاہر ان میں کوئی خرابی یا شرک کی آلودگی نظر نہیں آتی۔ دونوں کلمات توحید کے عین مطابق ہیں۔ رزق کی فراخی اور تنگی کے حوالے سے عزت اور ذلت کو کسی دیوی یا دیوتا سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا گیا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دی ہے اور یہ کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ بظاہر تو یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ﴾ (آلِ عمران:۲۶) ہی کا اقرار ہے' کہ اے اللہ تُو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور تُو جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ تو پھر یہاں ان جملوں کو آخر قابل مذمت کیوں ٹھہرایا گیا ہے؟ اس نکتہ لطیف کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ توحید تو ہدایت کی جڑ اور بنیاد ہے' جبکہ اس بنیاد سے اوپر بھی ہدایت کی بہت سی منازل ہیں۔ اس لیے ایک بندۂ مؤمن کو زندگی میں راہنمائی کے لیے اپنی نگاہیں صرف منارۂ توحید پر ہی مرکوز نہیں رکھنی چاہئیں بلکہ اسے شاہراہِ ہدایت کے ہر سنگِ میل اور ہر موڑ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا رخ متعین کرنا چاہیے۔

چنانچہ ان جملوں کے حوالے سے اصل اور بنیادی خرابی یہ ہے کہ یہاں انسانی سوچ نے رزق کی فراخی اور تنگی کو عزت اور ذلت کا معیار سمجھ لیا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ انسان کے رزق کی بست و کشاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ امتحان اور آزمائش کے لیے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی زیادہ رزق دے کر آزماتا ہے تو کبھی اس کو معاشی تنگی سے دوچار کر کے اس کا امتحان لیتا ہے۔ گویا انسان کے لیے عیش و آرام اور مال و دولت کی فراوانی میں بھی امتحان ہے اور رنج و عسرت اور تنگدستی و ناداری بھی امتحان ہی کے مراحل ہیں۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو جس انسان نے مال و دولت کی کمی یا زیادتی کو ذلت اور عزت کا معیار سمجھ لیا وہ دھوکا کھا گیا —— ایک بندۂ مؤمن کو تو دنیوی عزت و ذلت کی ویسے بھی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے اصل اور حقیقی عزت یا ذلت کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا۔ چنانچہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ رزق کی فراخی سے آزما رہا ہے اس کی عزت اس میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور اپنے دائیں بائیں محروم و نادار لوگوں کو ان کا وہ حق ادا کرے جو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی غرض سے اس کے مال میں رکھ دیا ہے۔ اسی طرح جس شخص کا امتحان رزق کی تنگی کے ساتھ ہو رہا ہے اس کی عزت اس میں ہے کہ وہ صبر کرے اور اپنی عزتِ نفس کو بچا کر رکھے۔

اس معاملے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اگر رزق کی کمی بیشی اور عزت و ذلت کے حوالے سے مذکورہ فلسفہ واقعتاً ہماری سمجھ میں آ بھی جائے تو بھی ہمارا نفس ہمیں یہ پٹی ضرور پڑھاتا ہے کہ رزق کی فراخی والی آزمائش آسان ہے اور اس کے مقابلے میں غربت و تنگدستی کی آزمائش بہت مشکل ہے' جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس حوالے سے اصل حقیقت یہ ہے کہ غربت و تنگدستی کی آزمائش سے سرخرو ہونا انسان کے لیے نسبتاً آسان ہے اور اس کے مقابلے میں مال و دولت کی فراوانی کی آزمائش میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آسائش و آرام میں انسان کے غافل ہو جانے اور اللہ تعالیٰ کو بھول جانے کا زیادہ امکان ہے' جبکہ

مشکل اور پریشانی کی کیفیت میں انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى))(۱) ''جو (مال) مقدار میں کم ہو مگر کفایت کر جائے وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو مگر غافل کر دے۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جب خلیفۂ وقت کے عتاب کا شکار ہوئے تو جیل میں آپ پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں آپؒ کو جس تشدد کا سامنا کرنا پڑا ویسا تشدد اگر ہاتھی پر بھی کیا جاتا تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔ لیکن آپ نے وہ اذیت ناک آزمائش کمال صبر و استقامت سے برداشت کی اور اس دوران آنکھوں میں کبھی آنسو تک نہ آنے دیے۔ لیکن دوسرے خلیفہ کے دور میں جب آپؒ کو رہائی ملی اور آپؒ کی خدمت میں اشرفیوں کے توڑے بطور نذرانہ پیش کیے گئے تو آپؒ یہ ''نذرانہ'' دیکھ کر بے اختیار رو پڑے اور اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کی کہ اے اللہ! تیری یہ آزمائش بہت سخت ہے، میں اس آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ''توحید'' ہدایت کا پہلا اور بنیادی درجہ ہے۔ اگر انسان اپنے اچھے برے ہر طرح کے حالات کو من جانب اللہ سمجھے تو اس کا یہ طرزِ عمل توحید کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کے اوپر بھی ہدایت کے بہت سے درجات ہیں۔ ان درجات میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی آزمائش و ابتلاء کے اصول و ضوابط کو سمجھے اور یقین رکھے کہ دنیا کے عیش و آرام اور تنگدستی و عسرت کی کیفیات اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور یہ کہ تنگدستی و عسرت کی آزمائش کے مقابلے میں دولت کی فراوانی کی آزمائش کہیں زیادہ سخت اور خطرناک ہے۔

﴿كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾﴾ ''ایسا ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ یتیم کی عزت نہیں کرتے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور نہ ہی تم لوگ آپس میں مسکینوں کو کھلانے کی ترغیب دیتے ہو۔''

کسی دوسرے شخص کو کسی نیکی کی ترغیب دینا اس لیے بھی مشکل ہے کہ اس کے لیے انسان کو پہلے خود اس نیکی پر کاربند ہونا پڑتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں دراصل اسی انسانی کمزوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ نہ تم خود بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہو اور نہ ہی دوسروں کو اس نیک کام کی ترغیب دیتے ہو۔

آیت ۱۹ ﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾﴾ ''اور تم ساری کی ساری میراث سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔''

اس آیت میں انسانوں کے بنائے ہوئے غیر متوازن اور ظالمانہ قوانین وراثت کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس سے یہ بھی مراد ہے کہ تم میں سے جو طاقتور ہے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے تمام وراثت پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن مجید نے دنیا کو مفصل، جامع اور متوازن قوانین وراثت عطا کیے ہیں۔ اسلام سے قبل عرب معاشرے میں باپ کی پوری وراثت بڑے بیٹے کو منتقل ہو جاتی تھی اور چھوٹے تمام بہن بھائیوں کو اس میں سے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ دنیا کے بعض ممالک میں ایسے ظالمانہ قوانین آج بھی نافذ العمل ہیں۔

(۱) رواه احمد والطبرانی فی الکبیر۔ راوی: ابوالدرداء رضی اللہ عنہ

آیت ۲۰ ﴿وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾﴾ ''اورتم مال سے ٹوٹ کرمحبت کرتے ہو۔''

دنیوی مال ودولت کی محبت تمہارے دلوں میں کوٹ کوٹ کربھری ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ سورتوں کے اس جوڑے یعنی سورۃ الفجر اورسورۃ البلد میں نزولِ قرآن سے قبل کے عرب معاشرے کے تمدن اور رسم ورواج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً طاقتوروں کے میراث کوزبردستی ہڑپ کر جانے' مال ودولت کی غیر معمولی محبت اوراسی محبت کی وجہ سے خدمتِ خلق کے کاموں سے پہلوتہی کرنے کی مثالیں اس معاشرے میں عام تھیں۔

آیت ۲۱ ﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾﴾ ''ہرگزنہیں! جب زمین کوکوٹ کوٹ کرہموارکردیا جائے گا۔''

اس آیت کا یہ ترجمہ شاہ ولی اللہ ؒ کے فرزندارجمند شاہ عبدالقادر ؒ کے ترجمہ کے مطابق ہے' جبکہ ان کے بھائی شاہ رفیع الدین ؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ جب زمین کوریزہ ریزہ کردیا جائے گا۔

آیت ۲۲ ﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾﴾ ''اورآپ کارب جلوہ فرما ہوگا جب کہ فرشتے قطار درقطار حاضرہوں گے۔''

سورۃ الحاقہ میں قیامت کے دن کا ایک منظراس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿وَالْمَلَكُ عَلٰٓی اَرْجَآئِهَا ؕ وَیَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَةٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''اورفرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر' اوراس دن آپ کے ربّ کے عرش کواٹھائے ہوئے ہوں گے آٹھ فرشتے''۔ سورۃ الرحمٰن میں اس دن کے آسمان کی کیفیت کا ذکر یوں آیا ہے: ﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾﴾ ''پھرجب آسمان پھٹ جائے گا اور ہوجائے گا گلابی' تیل کی تلچھٹ جیسا۔''

قرآن مجید میں قیامت کے دن سے متعلق جوتفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پرغورکرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میدانِ حشراسی زمین پرقائم ہوگا۔ زمین کوکھینچ کر چپٹا ﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾﴾ (الانشقاق) اورکوٹ کوٹ کرایسے ہموارکردیا جائے گا کہ اس کے تمام نشیب وفرازختم ہوجائیں گے ﴿لَا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾﴾ (طٰہٰ)۔ پہاڑوں کوروئی کے گالوں کی طرح اڑادیا جائے گا۔ پھرزمین پراللہ تعالیٰ کا نزولِ اجلال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص تجلی کے ساتھ آٹھ فرشتے نازل ہوں گے۔ دوسرے فرشتے صفیں باندھے کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت لگے گی' حساب کتاب ہوگا اوریوں قصہ زمین برسرزمین ہی طے ہوگا۔ گویا جس زمین پر انسانوں نے اپنے اچھے برے اعمال کاارتکاب واکتساب کیا ہے' اسی زمین پران کا حساب ہوگا۔

آیت ۲۳ ﴿وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ﴾ ''اورلے آئی جائے گی اس روزجہنم بھی''

جہنم کاظہوربھی شایدزمین کے اندرسے ہی ہوگا۔ یعنی جب زمین کوکھینچ کرچپٹا کیا جائے گا تواس کے اندرکا کھولتا ہوالاوا باہرنکل آئے گا' جوجہنم کاسماں پیدا کردے گا۔ (واللہ اعلم!)

﴿یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰی لَهُ الذِّكْرٰی ﴿۲۳﴾﴾ ''اُس دن انسان کوسمجھ آئے گی' لیکن اب سمجھنے کا کیا فائدہ!''

شاہ عبدالقادرؒ صاحب نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ ''اُس دن انسان چیتے گا'' یعنی اس دن انسان کو بہت کچھ یاد آ جائے گا کہ وہ دنیا سے اپنے ساتھ کیا لے کر آیا تھا اور اسے نصیحت بھی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت کی نصیحت سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ظاہر ہے فائدہ تو تب ہوتا اگر اس نے دنیا میں نصیحت پکڑی ہوتی۔

آیت ۲۴ ﴿يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿٢٤﴾﴾ ''وہ کہے گا: اے کاش میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا!''

یہاں لفظ حَيَاتِيْ (میری زندگی) خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ یعنی اس وقت انسان کو معلوم ہو جائے گا کہ میری اصل زندگی تو یہ ہے جو اَب شروع ہوئی ہے۔ میں خواہ مخواہ دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھتا رہا جو اس اصل زندگی کی تمہید تھی۔

دراصل انسانی زندگی عالم ارواح سے شروع ہوتی ہے اور دنیا سے ہوتی ہوئی ابدالاباد تک جاتی ہے۔ دنیا کے ماہ و سال اور شب و روز کی گنتی سے زندگی کے اس طویل سفر کا حساب ممکن نہیں۔ علامہ اقبال نے اس فلسفے کی ترجمانی یوں کی ہے: ؎

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!

چنانچہ انسان کو اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ اس کی دُنیوی زندگی اس کی جاودانی زندگی کے تسلسل کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے امتحان کے لیے منتخب فرمایا ہے اور اس وقفہ امتحان کے اختتام کی علامت کے طور پر اس نے موت کو تخلیق فرمایا ہے، تاکہ ہر انسان کے اعمال کی جانچ کی جا سکے: ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾ (الملك: ٢) ''اس نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔''

آیت ۲۵ ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٥﴾﴾ ''تو اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب کوئی نہیں دے سکتا۔''

آیت ۲۶ ﴿وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٦﴾﴾ ''اور اُس کا سا باندھنا کوئی اور نہیں باندھ سکتا۔''

میدانِ حشر میں ایک طرف تو یہ نقشہ ہوگا اور دوسری طرف کچھ ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہوں گے جن سے کہا جائے گا:

آیت ۲۷ ﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾﴾ ''اے نفسِ مطمئنہ!''

جو اس امتحانی زندگی میں مطمئن ہو کر یکسوئی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی میں لگا رہا اور اس کے دین کے ساتھ چمٹا رہا۔

آیت ۲۸ ﴿ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾﴾ ''اب لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تم اس سے راضی، وہ تم سے راضی۔''

سورۃ البینہ کی آیت ۸ میں ایسے خوش قسمت لوگوں کی یہی کیفیت ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ﴾

''اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی!'' کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

آیت ۲۹ ﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾﴾ ''تو داخل ہو جاؤ میرے (نیک) بندوں میں۔''

اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی نشاندہی سورۃ النساء کی اس آیت میں کی گئی ہے:

﴿وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ﴿۶۹﴾﴾

''اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسولؐ کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی اُن کی جن پر اللہ کا انعام ہوا یعنی انبیاءکرام' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے!''

آیت ۳۰ ﴿وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾﴾ ''اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں!''

چنانچہ اس نَفسِ مُطمَئِنّہ سے کہا جائے گا کہ آؤ! میرے ان انعام یافتہ بندوں کی صف میں شامل ہو جاؤ۔ ایسے خوش قسمت لوگوں کے مراتب کی بلندی کے تصور اور اپنی تہی دامنی کے احساس کے پیش نظر ہمارا ان کی معیت کے لیے دُعا مانگنا اگرچہ ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کے زمرے میں آتا ہے مگر پھر بھی دل سے بے اختیار دُعا نکلتی ہے: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ —— آمین!

سُوْرَةُ الْبَلَد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۱﴾ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۲﴾ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ﴿۳﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ
فِيْ كَبَدٍ ﴿۴﴾ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ﴿۵﴾ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ﴿۶﴾ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ
يَرَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۷﴾ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ﴿۹﴾ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿۱۰﴾ فَلَا اقْتَحَمَ
الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا
مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا
بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْــَٔــمَةِ ﴿۱۹﴾
عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾ ع ۱۵

آیت ۱ ﴿لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۱﴾ ”نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔“

اس آیت میں بھی لَآ اُقْسِمُ کا مفہوم بالکل وہی ہے جو اس سے پہلے ہم سورۃ القیامہ کی پہلی اور دوسری آیات یا سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۶ میں پڑھ چکے ہیں۔ یعنی ان آیات میں لَا نافیہ نہیں ہے بلکہ مخاطبین کے خیالاتِ باطلہ کے ابطال کے لیے ہے۔ چنانچہ سورۃ القیامہ کی پہلی آیت ﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝۱﴾ کا اگر ہم انگریزی ترجمہ کریں تو ہم کہیں گے: Nay, I swear by the Day of Judgement! دراصل انگریزی میں توNay کے بعد کوما (،) آ جانے سے مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے‘ لیکن عربی میں چونکہ ”کوما“ وغیرہ کا استعمال نہیں ہوتا اس لیے سننے یا پڑھنے والا لَآ اُقْسِمُ کا مفہوم یوں بھی سمجھ سکتا ہے کہ ”میں قسم نہیں کھاتا“۔ بہرحال اس آیت کا مفہوم یہی ہے کہ جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو وہ درست نہیں‘ بلکہ میں اس شہر یعنی مکہ مکرمہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تمہارے خیالات و نظریات باطل ہیں۔ آگے چل کر واضح ہو جائے گا کہ یہاں مکہ مکرمہ کی قسم کیوں کھائی جا رہی ہے۔

آیت ۲ ﴿وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۲﴾ ”اور (اے نبی ﷺ!) آپ حلال کر لیے گئے ہیں اس شہر میں۔“

کچھ مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا ہے کہ ”آپ کے لیے حلال ہو جائے گا یہ شہر“۔ یعنی اگرچہ یہ بلد الحرام ہے‘ یہاں خونریزی وغیرہ کی اجازت نہیں‘ لیکن ایک وقت آئے گا کہ آپؐ کو اس کی اجازت مل جائے گی‘ جیسے فتح مکہ کے دن مکہ مکرمہ حضور ﷺ کے لیے حلال کر دیا گیا اور اس دن لشکر کشی کے دوران مسلح تصادم کے اِکا دُکا واقعات بھی ہوئے۔ البتہ میرے نزدیک آیت کا اصل مدعا اور مفہوم وہی ہے جو میں نے

ترجمے میں اختیار کیا ہے کہ اے نبی (ﷺ) ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس بلد الحرام میں آپؐ کی عزت پر حملے ہو رہے ہیں' آپؐ کی عزتِ نفس کو مجروح کیا جا رہا ہے' آپؐ کو مسلسل ستایا جا رہا ہے۔ اس وادی غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ کے ماحول میں جہاں معمول کی زندگی بھی سراپا مشقت ہے وہاں اہل شہر کی مخالفت نے آپؐ کے لیے زندگی کو مزید کٹھن اور مشکل بنا دیا ہے۔ چنانچہ دعوتِ حق کی جدوجہد میں مسلسل سختیاں برداشت کرتے ہوئے آپؐ کی زندگی کے شب و روز کی اس وقت جو صورتِ حال اور کیفیت ہے' ہم اس کی قسم کھا رہے ہیں۔

آیت ۳ ﴿وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝۳﴾ ''اور قسم ہے والد کی اور اولاد کی۔''

اس قسم میں اس مشقت اور ذمہ داری کی طرف اشارہ ہے جو ایک والد کو اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت وغیرہ کے حوالے سے برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اب اگلی آیت میں اس حقیقت یعنی مقسم علیہ کا ذکر ہے جس پر یہ قسمیں کھائی جا رہی ہیں:

آیت ۴ ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ۝۴﴾ ''بے شک ہم نے انسان کو پیدا ہی محنت اور مشقت میں کیا ہے۔''

سورۃ الانشقاق میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ ۝۶﴾ ''اے انسان! تو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف' پھر تو اس سے ملنے والا ہے''۔ انسانی زندگی کے بارے میں یہ تلخ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ اس دنیا میں کوئی انسان جیسا ہے جہاں ہے' غریب ہے' امیر ہے' صاحبِ اقتدار ہے' فقیر ہے' کلفت' مشقت' کوفت' پریشانی اس کا مقدر ہے۔ کوئی انسان جسمانی محنت کے ہاتھوں بے حال ہے تو کوئی ذہنی مشقت کی وجہ سے پریشان۔ کوئی جذباتی اذیت سے دوچار ہے تو کوئی نفسیاتی خلفشار کا شکار ہے۔ کوئی کوڑی کوڑی کا محتاج ہے تو کسی کے لیے دولت کے انبار وبالِ جان ہیں' کسی کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں تو کوئی مخملی گدیلوں پر لیٹا نیند کو ترستا ہے۔ غرض مختلف انسانوں کی مشقت کی کیفیت' نوعیت اور شدت تو مختلف ہو سکتی ہے مگر مشقت اور پریشانی سے چھٹکارا جیتے جی کسی کو بھی نہیں ہے۔ بقول غالب ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

بظاہر تو یہ صورتِ حال بھی بہت گھمبیر محسوس ہوتی ہے' لیکن انسان کی اصل مشکل اس سے کہیں بڑی ہے اور وہ مشکل یہ ہے کہ اسے دُنیوی زندگی میں پیش آنے والی یہ تمام پریشانیاں اور سختیاں بھی سہنی ہیں اور اس کے بعد اپنے ربّ کے حضور پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب بھی دینا ہے۔ سورۃ الانشقاق کی مذکورہ آیت میں اسی ''ملاقات'' کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے انسان کی قسمت کا حتمی فیصلہ تو اسی ملاقات میں ہونا ہے۔ اس ساری صورتِ حال میں انسان کی اصل مشقت' اصل مشکل اور اصل ٹریجڈی کا اندازہ لگانا ہو تو ایک ایسے انسان کا تصور کریں جو زندگی بھر ''دنیا'' حاصل کرنے کے جنون میں کولہو کا بیل بن کر محنت و مشقت کی چکی میں پستا اور طرح طرح کی ذہنی و نفسیاتی اذیتوں کی آگ میں جلتا رہا۔ پھر مشقتوں پر مشقتیں برداشت کرتا اور تکلیفوں پر تکلیفیں جھیلتا یہ

انسان جب اپنے رب کی عدالت میں پیش ہوا تو اس کا دامن مطلوبہ معیار ومقدار کی نیکیوں سے خالی تھا۔ چنانچہ اس عدالت سے اسے دائمی سزا کا حکم ہوا: ﴿وَيَصْلٰى سَعِيْرًا ⑫﴾ (الانشقاق) اور اس کے بعد اسے جہنم میں جھونک دیا گیا —— ہمیشہ ہمیش کے لیے! یہ ہے انسان کی اصل مشکل اور اصل ٹریجڈی جس کا تصور بھی روح فرسا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

آیت ۵ ﴿اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ⑤﴾ ''کیا یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی قابو نہیں پا سکے گا؟''

مشقت میں پڑے ہوئے انسان کا حال دیکھو۔ اس حالت میں بھی وہ غرور کرتا ہے۔ ابوجہل کو دیکھو کیسے اکڑا ہوا ہے —— مقامِ غور ہے! چاروں طرف سے مصائب ومشکلات میں گھرے ہوئے انسان کا اپنے خالق اور مالک کے سامنے یہ حال ہے تو اگر اس کے لیے دنیا میں آسانیاں ہی آسانیاں ہوتیں تو پھر یہ اللہ تعالیٰ سے کیسی کیسی بغاوتیں کرتا اور مخلوقِ خدا پر کیا کیا ستم ڈھاتا!

آیت ۶ ﴿يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ⑥﴾ ''کہتا ہے میں نے تو ڈھیروں مال خرچ کر ڈالا۔''

اس فقرے میں سردارانِ قریش کی ذہنیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ لوگ بھلائی اور نیکی کے کام اکثر وبیشتر جذبہ مسابقت کے تحت کرتے تھے اور پھر اپنی نیکیوں کا خوب چرچا کرتے اور شیخیاں بگھارتے تھے۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر لوگوں کے ایمان نہ لانے کا سبب بھی یہی جذبہ مسابقت تھا۔ ظاہر ہے وہ لوگ حضور ﷺ کو اپنے خاندان کے مدمقابل خاندان کا ایک فرد سمجھتے تھے اور اس حیثیت سے آپؐ کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا انہیں کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ اس حوالے سے ابوجہل کا اقراری بیان تو تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس سے جب پوچھا گیا کہ کیا تمہارے خیال میں محمد (ﷺ) جھوٹے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ نہیں' انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس پر پوچھنے والے نے سوال کیا کہ پھر تم انؐ پر ایمان کیوں نہیں لے آتے؟ اس پر اس نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے خاندان کا بنو ہاشم کے ساتھ پشتوں سے مقابلہ چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے غرباء کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھانے کھلائے۔ اگر وہ حُجاج کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہے تو اس میدان میں بھی ہم نے انہیں آگے نہیں نکلنے دیا۔ یوں اب تک ہم ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے چلے آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم ان کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو ہم ہمیشہ کے لیے ان کے غلام بن جائیں گے اور یہ صورت حال کم از کم مجھے کسی قیمت پر قابل قبول نہیں۔

آیت زیر مطالعہ میں سردارانِ قریش کے اسی طرزِ عمل کی تصویر دکھائی گئی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی شخص کبھی بھلائی کا کوئی کام سرانجام دے لیتا ہے تو جگہ جگہ اس کا تذکرہ کرتا اور شیخیاں بگھارتا پھرتا ہے کہ فلاں کام میں میں نے ڈھیروں مال کھپا ڈالا ہے۔

آیت ۷ ﴿اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ⑦﴾ ''کیا اس کا گمان ہے کہ اُسے کسی نے دیکھا نہیں؟''

کیا وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہر شخص کے ایک ایک عمل سے واقف ہے اس کی اس نیکی سے وہ بے خبر ہے۔ یعنی اگر تو اس نے وہ نیکی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کی تھی تو پھر وہ اس کا ڈھنڈھورا کیوں پیٹ رہا ہے؟

آیت ۸ ﴿اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ ۝۸﴾ ''کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟''

آیت ۹ ﴿وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ ۝۹﴾ ''اور ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے)؟''

آیت ۱۰ ﴿وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۝۱۰﴾ ''اور ہم نے اس کو راہ دکھلا دی دو گھاٹیوں کی۔''

عام مفسرین کے نزدیک دو گھاٹیوں سے مراد نیکی اور بدی کے دو راستے ہیں۔ البتہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے ماں کی دو چھاتیاں مراد ہیں۔ نجد کے لغوی معنی اُبھری ہوئی چیز کے ہیں۔ بلند سطح پر جو راستہ ہو اس کو بھی نجد کہتے ہیں۔ چنانچہ ''النَّجْدین'' کے معنی ''دو بلند (واضح) راستے'' بھی ہو سکتے ہیں اور ''دو اُبھار'' بھی۔ اور مجھے مؤخر الذکر رائے زیادہ پسند ہے۔ انسان کی زبان' اس کے دو ہونٹوں اور پھر ماں کی چھاتیوں کے ذکر کے حوالے سے دراصل یہاں انسان کی اس جبلی اور پیدائشی ہدایت کا ذکر مقصود ہے جس کے بارے میں ہم سورۃ الاعلیٰ کی آیت ﴿وَالَّذِيۡ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝۳﴾ میں پڑھ آئے ہیں۔ ظاہر ہے ایک بچہ اپنی پیدائش کے فوراً بعد نہ صرف ماں کے دودھ کی تلاش شروع کر دیتا ہے بلکہ جونہی اس کی رسائی ماں کی چھاتیوں تک ہوتی ہے تو وہ دودھ چوسنے بھی لگتا ہے۔ اس نومولود کو آخر اپنی غذا کی تلاش کا یہ شعور کس نے دیا ہے؟ اور اس مرحلے پر زبان اور ہونٹوں کے اس خاص استعمال کا طریقہ اسے کس نے سکھایا ہے؟ ظاہر ہے یہ شعور' یہ آگہی اور یہ ہدایت اس کی اس فطرت اور جبلت کا حصہ ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اور اس اعتبار سے بچے کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

آیت ۱۱ ﴿فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ۝۱۱﴾ ''لیکن وہ گھاٹی کو عبور نہ کر سکا۔''

آیت ۱۲ ﴿وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ۝۱۲﴾ ''اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کون سی ہے؟''

آیت ۱۳ ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ۝۱۳﴾ ''کسی گردن کا چھڑا دینا۔''

یعنی مال خرچ کر کے کسی غلام کو آزاد کرا دینا' یا کسی مقروض کا قرض ادا کر دینا۔

آیت ۱۴ ﴿اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِيۡ يَوۡمٍ ذِيۡ مَسۡغَبَةٍ ۝۱۴﴾ ''یا کھانا کھلا دینا بھوک کے دن میں۔''

یعنی کسی شخص کا قحط سالی کے دوران بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ خصوصی طور پر ایسی صورت حال میں جب اسے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت کا خیال بھی پریشان کیے دے رہا ہو۔

آیت ۱۵ ﴿يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ۝۱۵﴾ ''اُس یتیم کو جو قرابت دار بھی ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ۝۱۶﴾ ''یا اُس محتاج کو جو مٹی میں رُل رہا ہے۔''

یہ وہ فلسفہ ہے جس پر سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ مشکل گھاٹی دراصل حُبِ مال کی وہ چٹان ہے جو متعلقہ انسان کے لیے بھلائی کے راستے کو مسدود کیے کھڑی ہے۔ سورۃ الحدید کی

آیت ۱۸ کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے اسے گاڑی کی بریک سے تشبیہہ دی تھی۔ چنانچہ مذکورہ گھاٹی کو عبور کرنے یا گاڑی کی بریک کو کھولنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال کو اللہ کی رضا کے لیے محتاجوں اور ناداروں کی مدد کرنے اور بھلائی کے دوسروں کاموں پر دل کھول کر خرچ کرے۔ یعنی مال کی محبت کی آلودگی کو دل سے صاف کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے پیارے مال کو اللہ تعالیٰ کی محبت پر قربان کر دیا جائے۔ یاد رکھیں! حُبِّ مال کی گندگی کو دل سے نکالے بغیر انسان کو ایمان کی حلاوت نصیب نہیں ہو سکتی۔ (اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الحدید آیات ۱۷ تا ۲۰ کی تشریح۔)

آیت ۱۷ ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''پھر وہ شامل ہوا ان لوگوں میں جو ایمان لائے''

یہاں پر لفظ ثُمَّ بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ یعنی پہلے انسان اس مشکل گھاٹی کو عبور کرے، اپنے دل کی زمین میں انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چلائے، اس کے ذریعے سے دل کی زمین سے حُبِّ مال کا جھاڑ جھنکاڑ صاف کرے، اور پھر (ثُمَّ) اس میں ایمان کا بیج ڈالے۔ اگر وہ اس ترتیب اور اس انداز سے محنت کرے گا تو تبھی ایمان کا پودا اس کے دل کی زمین میں اپنی جڑیں پھیلائے گا اور برگ و بار لائے گا۔

﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾﴾ ''اور جنہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی اور باہم ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کی۔''

یہ مضمون سورۃ العصر میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿٣﴾﴾ ''سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے، اور باہم ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی''۔ الفاظ اور مفہوم کے اعتبار سے ان دونوں آیات میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ البتہ دونوں جگہ مذکورا صطلاحات کی ترتیب مختلف ہے۔ سورۃ العصر کی اس آیت میں ایمان کے بعد عمل صالح کا بیان ہے جبکہ آیت زیر مطالعہ میں عمل صالح (غرباء و مساکین اور یتیموں کے حقوق کی ادائیگی) کے بعد ایمان کا ذکر ہے۔ سورۃ العصر میں تواصی بالحق کے بعد تواصی بالصبر کا تذکرہ ہے، جبکہ یہاں پر پہلے تواصی بالصبر اور بعد میں تواصی بالمرحمہ کا ذکر آیا ہے۔ اس پہلو سے دونوں آیات کے تقابلی مطالعہ سے بہت سے حقائق و رموز کی نشاندہی ہوتی ہے۔

آیت ۱۸ ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿١٨﴾﴾ ''یہ ہوں گے داہنے والے۔''

یعنی یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھوں میں دیے جائیں گے۔ لفظ یمن کے معنی خوش بختی کے بھی ہیں۔ اس معنی میں آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ یہ وہ خوش قسمت لوگ ہوں گے جو رشد و ہدایت کے راستے پر چلتے ہوئے فوز و فلاح کی منازل تک پہنچ گئے۔

آیت ۱۹ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ ''اور جنہوں نے انکار کیا ہماری آیات کا''

﴿هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿١٩﴾﴾ ''وہ ہوں گے بائیں والے۔''

یعنی ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھوں میں پکڑائے جائیں گے۔ لغوی اعتبار سے جس طرح یمن

کے معنی خوش بختی کے ہیں اسی طرح الْمَشْئَمَة کے مادے میں بدبختی کے معنی پائے جاتے ہیں (شومیٔ قسمت کی ترکیب اردو میں بھی مستعمل ہے)۔ لہٰذا اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''یہ بدبختی والے لوگ ہوں گے''۔ قرآن مجید میں آخرت کی کامیابی یا ناکامی کے حوالے سے دائیں والے (اصحاب المیمنہ یا اصحاب الیمین) اور بائیں والے (اصحاب المشئمہ یا اصحاب الشمال) کا ذکر بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ البتہ سورۃ الواقعہ کی اس آیت میں نسلِ انسانی کے تین گروہوں کا تذکرہ بھی ہوا ہے: ﴿وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝﴾ کہ اس دن تم لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ ان میں سے دو گروہ تو یہی (دائیں اور بائیں والے) بتائے گئے ہیں' جبکہ تیسرے گروہ کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝﴾ (الواقعۃ) ''اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔ وہی تو بہت مقرب ہوں گے''۔ گویا یہ تیسرا گروہ اہل جنت میں سے بہت ہی خاص لوگوں یعنی مقربین بارگاہ پر مشتمل ہوگا۔ بہرحال آیت زیرِ مطالعہ میں ان بدقسمت لوگوں کا ذکر ہوا ہے جنہیں بائیں ہاتھ میں اعمال نامے پکڑا کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

آیت ۲۰ ﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝﴾ ''ان پر آگ بند کر دی جائے گی۔''

تاکہ پریشر ککر کی طرح آگ کی ساری تپش اندر ہی رہے اور انہیں شدید ترین عذاب ملے۔ اللہ کی پناہ! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایسے عذاب سے محفوظ رکھے اور اپنی رحمت اور شانِ غفاری کے طفیل اصحابِ جنت میں شامل فرمائے۔ آمین!

سُوْرَةُ الشَّمْس

تمہیدی کلمات

سورۃ الشّمس اور اس کے بعد کی تین سورتوں (سورۃ اللیل ٗ سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح) کے لیے میں نے ''چہار سورۂ نور و ظلمت'' کا مشترک عنوان تجویز کر رکھا ہے۔ ان میں سے پہلی تین سورتوں کا آغاز قسموں سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سورۃ الشّمس اور سورۃ اللیل (ان دونوں سورتوں کا باہم جوڑے کا تعلق بھی ہے) کا انداز سورۃ التکویر اور سورۃ الانفطار سے ملتا جلتا ہے۔ یاد رہے کہ سورۃ التکویر کے آغاز میں قسموں والا حصہ زیادہ آیات (۱۳ آیات) پر مشتمل ہے اور جوابِ قسم کے طور پر صرف ایک آیت (آیت ۱۴) آئی ہے ٗ جبکہ اس کی جڑواں سورت یعنی سورۃ الانفطار میں قسموں والا حصہ نسبتاً کم ہے اور بعد کی آیات میں ان دونوں سورتوں کا مرکزی مضمون زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ بالکل اسی انداز میں زیر مطالعہ جوڑے کی پہلی سورت یعنی سورۃ الشّمس میں قسموں والا حصہ زیادہ (آٹھ آیات پر مشتمل) ہے اور اس کے بعد جواب القسم کے ضمن میں صرف دو آیات آئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں سورۃ اللیل میں قسموں کا حصہ نسبتاً کم ہے ٗ جبکہ سورۃ الشّمس سے شروع ہونے والا مضمون یہاں آ کر مزید واضح ہو گیا ہے۔ اس طرح یہ مضمون تدریجاً آگے بڑھتا ہوا سورۃ الضحیٰ میں جا کر نقطۂ عروج کو پہنچے گا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝ وَالسَّمَآءِ
وَمَا بَنٰىهَا ۝ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ
اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝ اِذِ انْۢبَعَثَ
اَشْقٰىهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝ فَدَمْدَمَ
عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝ ع ۱۵ / ۱۶

آیت ۱ ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ①﴾ ''قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔''

آیت ۲ ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ②﴾ ''اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔''

تلا ٗ یتلو کے معنی ہیں کسی کے پیچھے آنا۔ تلاوت کا لفظ بھی اسی مادہ سے مشتق ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے لفظ ''تلاوت'' کے مفہوم میں قرآن مجید کے متن کا پڑھنا (زبان اور نظر سے عبارت کی پیروی کرنا) ٗ اس کے احکام پر عمل کرنا اور اس کا اتباع کرنا شامل ہے۔

آیت۳ ﴿وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝﴾ ''اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو روشن کر دیتا ہے۔''
اگرچہ بظاہر صورت حال تو یہ ہوتی ہے کہ سورج سے دن روشن ہوتا ہے' لیکن یہاں اسی بات کے اندر یہ لطیف نکتہ پیدا کیا گیا ہے کہ دن ہوتا ہے تو سورج نظر آتا ہے۔ گویا دن سورج کو روشن کرتا ہے۔ آیت کے اس اسلوب کا تعلق دراصل اگلی آیت کے اسلوب سے ہے۔ اگلی آیت میں رات کا ذکر بالکل اسی انداز میں ہوا ہے:
آیت۴ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝﴾ ''اور قسم ہے رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لیتی ہے۔''
ان دونوں آیات کا مفہوم یوں ہوگا کہ دن سورج کو نمایاں کر دیتا ہے جبکہ رات اسے ڈھانپ لیتی ہے۔
آیت۵ ﴿وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝﴾ ''اور قسم ہے آسمان کی اور جیسا کہ اسے بنایا۔''
آیت۶ ﴿وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝﴾ ''اور قسم ہے زمین کی اور جیسا کہ اسے بچھا دیا۔''
نوٹ کیجیے! یہ تمام قسمیں جوڑوں کی صورت میں آئی ہیں۔ پہلے سورج اور چاند کا' پھر دن اور رات کا اور اب آسمان اور زمین کا ذکر ہوا۔ ان ظاہری تضادات کی مثالوں سے دراصل نفس انسانی کے روشن اور تاریک پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ جس طرح کائنات میں ہر جگہ تم لوگوں کو تضادات نظر آتے ہیں' سورج ہے تو اس کے ساتھ چاند ہے' اندھیرا ہے تو اس کے ساتھ اُجالا ہے' بلندی ہے تو اس کے ساتھ پستی ہے' اسی طرح انسان کی ذات یا شخصیت کے بھی دو رُخ ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں تو تمام انسان ایک جیسے نظر آتے ہیں' لیکن حقیقت میں یہ ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی حیوانی اور نفسانی خواہشات کے راستے پر چل رہا ہے تو کسی نے اپنے نفس کا تزکیہ کر کے فلاح کی منزل حاصل کر لی ہے۔
آیت۷ ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝﴾ ''اور قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا کہ اس کو سنوارا۔''
آیت۸ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ ''پس اس کے اندر نیکی اور بدی کا علم الہام کر دیا۔''
اب اگلی دو آیات میں ان قسموں کے جواب مذکور ہے۔
آیت۹ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝﴾ ''یقیناً کامیاب ہو گیا جس نے اس (نفس) کو پاک کر لیا۔''
آیت۱۰ ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ ''اور ناکام ہو گیا جس نے اسے مٹی میں دفن کر دیا۔''
یہ اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ ان دو آیات میں انتہائی اختصار کے ساتھ انسان کی حقیقی کامیابی اور ناکامی کا معیار بیان کر دیا گیا ہے۔ دَسَّ يَدُسُّ کے معنی کسی چیز کو مٹی میں دفن کر دینے کے ہیں۔ سورۃ النحل (آیت ۵۹) میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ﴾ اس آیت میں قبل از اسلام زمانے کے عربوں کی ایک خاص ذہنیت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے جس شخص کے گھر بیٹی پیدا ہوتی ہے وہ یا تو اسے ذلت آمیز طریقے سے زندہ رکھتا ہے یا زندہ دفن کر دیتا ہے۔ یہاں ''دَسّٰى'' دراصل دَسَّسَ (باب تفعیل) ہے' اس کے آخری سین کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ تو جس انسان نے اپنے نفس کو مٹی میں دفن کر دیا (اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جس نے اپنی روح کو اپنے خاکی وجود کے اندر دبا دیا۔ یعنی جس کی حیوانی خواہشات و شہوات اس کی روح پر غالب آ گئیں) تو وہ ناکام رہا۔ البتہ جیسا کہ سورۃ الاعلیٰ کے مطالعہ کے

دوران بھی نشان دہی کی گئی ہے' زیر مطالعہ سورتوں کے مضامین میں سے اکثر کا تعلق سورۃ الاعلیٰ کے مضامین کے ساتھ ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعلیٰ میں ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ⑭﴾ کے الفاظ میں جو مضمون انتہائی مختصر انداز میں آیا تھا' یوں سمجھیں کہ اب آیات زیر مطالعہ میں اس مضمون کی مزید تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس مضمون پر قسموں کی صورت میں یہاں مزید گواہیاں بھی لائی گئی ہیں اور زیر مطالعہ آیت کے الفاظ ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ⑩﴾ میں تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا گیا ہے۔

دراصل انسان کا نفس اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اس امانت کو پاک صاف رکھنا اس کی ذمہ داری ہے۔ نفس کو پاک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو' یعنی اپنی شخصیت کو تمام رذائل اور باطنی بیماریوں سے پاک کر کے بہترین انسانی خوبیوں کا مرقع بنائے۔ اس کے لیے ہمارے ہاں عام طور پر تزکیہ نفس' تعمیرِ سیرت' تعمیرِ خودی وغیرہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی نظر میں کامیاب انسان وہی ہے جو اپنے نفس کو پاک کرنے اور پاک رکھنے میں کامیاب ہو گیا' خواہ دنیا والوں کی نظروں میں وہ حقیر' فقیر اور بے نام ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس جس انسان نے اپنے نفس کو رذائل و خبائث سے آلودہ کر لیا' اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ناکام ہے' دنیا میں خواہ وہ غیر معمولی عزت' شہرت اور دولت کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اصل اور حقیقی کامیابی اور ناکامی کا تعلق انسان کے ظاہر سے نہیں بلکہ اس کی ''ذات'' سے ہے۔

انسان کی ''ذات'' سے کیا مراد ہے؟ فرائڈ نے اسے انسان کی self (اَنا) کا نام دیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی self کو id اور libido کے تسلط سے آزاد کرا کے اسے مثبت انداز میں ترقی دے۔ علامہ اقبال نے اسے خودی کا نام دیا ہے اور انسان کی ''کامیابی'' کو اس کی خودی کی تعمیر و ترقی سے مشروط کیا ہے۔ بہرحال اس حوالے سے سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ انسان محض ایک جسم یا ہاتھ پاؤں' سر' دھڑ وغیرہ کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ انسان کہتا ہے میرا ہاتھ' میرا پاؤں' میرا سر وغیرہ۔ یہ تمام اعضاء بے شک اس کے ہیں' لیکن وہ انسان جو ان اعضاء کو اپنا بتا رہا ہے وہ خود کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ ظاہر ہے اصل انسان اس جسم یا وجود کے اندر ہے۔ اس کو ایسے سمجھیں کہ جس طرح آم کی گٹھلی کے اندر آم کا پورا درخت موجود ہے' اسی طرح انسانی جسم کے اندر اصل انسان ایک لطیف شخصیت کی صورت میں موجود ہے۔ یہ لطیف شخصیت عبارت ہے اس روح سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے حیوانی یا خاکی وجود کے اندر پھونکی ہے: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (الحجر: ۲۹)۔ روح یا انسان کی انا کا ذکر اپنشد کے اس فقرے میں بھی ہے' جس کا حوالہ میں پہلے بھی دے چکا ہوں:

> *Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths that encompass his real self.*

گویا انسان کی self یا انا یا خودی یا روح اس کے حیوانی وجود کی مٹی کے اندر دفن ایک خزانہ ہے۔ اب جو انسان اس خزانے کو مٹی سے نکال کر کام میں لے آئے گا' یعنی اپنی روح کو صیقل کر لے گا' اس کا نفس پاک ہو جائے گا (روح کی پاکیزگی نفس کی پاکیزگی کا باعث بنتی ہے۔ دونوں کا تعلق انسان کے باطن سے ہے) اور وہ کامیابی یا فلاح کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ (فلاح کا لفظ قرآن مجید میں ایک جامع اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا

ہے۔اس اصطلاح کے مفہوم کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت کی تشریح۔)

زیرِ مطالعہ آیات کے حوالے سے یہ نکتہ خصوصی طور پر پیش نظر رہنا چاہیے کہ انسان کی روح اور اس کا نفس دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان آیات میں انسانی روح کا نہیں بلکہ انسانی نفس کا ذکر ہوا ہے۔ روحِ انسانی دراصل عالمِ امر کی چیز ہے اور یہ معرفت خداوندی اور محبت خداوندی کی امین ہے' جبکہ نفس انسانی کا تعلق عالمِ خلق سے ہے۔اسی لیے اس کے ذکر سے پہلے جن چیزوں کی یہاں قسمیں کھائی گئی ہیں ان سب (سورج' چاند' دن' رات' آسمان' زمین) کا تعلق بھی عالم خلق سے ہے۔ روح تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو عطا ہوئی ہے' جبکہ نفس گدھے' گھوڑے اور چمپینزی وغیرہ سب جانوروں میں ہوتا ہے۔البتہ انسان کی خصوصیت اس حوالے سے یہ ہے کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں نفس انسانی کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی ارتقائی درجات سے نوازا ہے اور اس کے اندر اخلاقی حس اور نیکی و بدی کی وہ تمیز الہام کر دی ہے جو دوسرے جانوروں کے نفس میں نہیں پائی جاتی۔اسی حس اور تمیز کی وجہ سے انسانی فطرت آفاقی سطح پر نیکی کو اچھا اور بدی کو برا سمجھتی ہے۔ دنیا میں کسی معاشرے' کسی مذہب اور کسی نسل کا انسان ہو وہ سچ بولنے کو اچھا اور جھوٹ بولنے کو برا سمجھتا ہے۔اس حوالے سے قرآن میں معروف اور منکر کی اصطلاحات کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔معروف وہ چیزیں یا افعال یا اعمال ہیں جو نفس انسانی کے لیے مانوس ہیں۔انہیں دیکھ کر یا اپنا کر نفس انسانی کو راحت محسوس ہوتی ہے۔اس کے مقابلے میں منکرات وہ چیزیں یا اعمال یا افعال ہیں جنہیں نفس انسانی برا سمجھتا ہے اور جن کی صحبت و معیت میں وہ اجنبیت اور کوفت محسوس کرتا ہے' بلکہ وہ انسان کو ایسے اعمال و افعال سے ٹوکتا ہے۔اسی لیے انسان غلطی کرنے کے بعد اکثر یہ کہتا پایا جاتا ہے کہ ''میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے'' (my conscience is pinching me)۔نفس انسانی کی اسی خصوصیت کی وجہ سے سورۃ القیامہ کی آیت ۲ میں اسے نفسِ لوامہ (ملامت کرنے والا نفس) کا نام دیا گیا ہے۔

اس حوالے سے آیات زیر مطالعہ کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ نفس انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی اور بدی کی تمیز کا بنیادی بیج ڈال دیا گیا ہے۔اب انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس بیج کی حفاظت کرے' اسے سازگار ماحول فراہم کرے اور عمل صالح کے پانی سے اس کی آبیاری کرے۔سورۂ فاطر (آیت ۱۰) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ط﴾ کہ کسی بھی اچھی بات یا اچھے کلام میں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن عمل صالح اس کی اس صلاحیت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ انسان جب تزکیہ نفس اور اعمالِ صالحہ کے حوالے سے محنت کرے گا تو اسے ایمان کی حلاوت بھی نصیب ہوگی' وہ ایمان کے ان ثمرات سے بھی بہرہ مند ہوگا جن کا ذکر ہم سورۃ التغابن میں پڑھ آئے ہیں اور اسے کامیابی کی ضمانت بھی ملے گی۔اس کے برعکس جس انسان نے اپنے نفس کو حیوانی وجود کے تابع کیے رکھا اور وہ اس کی آواز کو دبا کر زندگی بھر جسمانی تقاضے پورے کرنے میں لگا رہا وہ گویا خائب و خاسر ہو کر رہ گیا۔

اب اگلی آیات میں ایک قوم یا ایک معاشرے کے اجتماعی ضمیر کے حوالے سے ایک مثال دی گئی ہے۔ ظاہر ہے جس طرح ایک انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز ہوتی ہے اسی طرح ہر معاشرے میں اجتماعی طور پر بھی اخلاقی حس پائی جاتی ہے' اور جس طرح ایک انسان میں اچھے برے داعیات ہوتے ہیں اسی طرح ہر معاشرے

کے اندر بھی نیکی کے علمبردار اور شر پھیلانے والے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ غرض جس طرح ایک فرد کا ضمیر ہوتا ہے اسی طرح معاشروں اور قوموں کا اجتماعی ضمیر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہو' اس کی صفوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ احسن طریقہ سے ادا کیا جا رہا ہو تو اس قوم کے مجموعی حالات بہتر طور پر چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر مردہ ہو جائے اور اس کی اخلاقی حس بحیثیت مجموعی اس قدر کمزور ہو جائے کہ اس کے ماحول میں برائی کو برائی کہنے والا بھی کوئی نہ رہے تو ایسی قوم اپنے زندہ رہنے کا جواز کھو دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی اجتماعی بے حسی کی تصویر پیش کی ہے:ے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

اس حوالے سے اب ملاحظہ ہو قومِ ثمود کی مثال:

آیت ۱۱ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ⑪﴾ ''قومِ ثمود نے بھی جھٹلایا تھا اپنی سرکشی کے باعث۔''

یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کو جھٹلا دیا جو اُن کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔

آیت ۱۲ ﴿اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ⑫﴾ ''جب اُٹھ کھڑا ہوا ان کا سب سے شقی انسان۔''

وہ شخص اپنی قوم کے لوگوں کے کہنے پر اس اونٹنی کو ہلاک کرنے پر کمربستہ ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے مطالبے پر بطورِ معجزہ پیدا کیا تھا۔

آیت ۱۳ ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ⑬﴾ ''تو اللہ کے رسول نے ان سے کہا کہ (خبردار!) یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ اس کے پانی پینے کا دن ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۪﴾ ''تو انہوں نے اُس کو جھٹلا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔''

﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ⑭﴾ ''تو الٹ دیا ان پر عذاب ان کے رب نے ان کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا۔''

ان کے جرمِ عظیم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذابِ استیصال نازل فرمایا اور پوری قوم کو ایک ساتھ پیوند خاک کر دیا۔

آیت ۱۵ ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ⑮﴾ ''اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا۔''

اللہ تعالیٰ کو اپنے اس فعل کے کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہ پوری کائنات کا مالک اور خالق ہے' وہ جو چاہے کرے۔ اس نے اس پوری قوم کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوم کو لے آیا۔ اس سورت میں پہلے انسانی نفس اور ضمیر کے حوالے سے انسان کی انفرادی کامیابی اور ناکامی کا ذکر ہوا اور پھر قومِ ثمود کی مثال دے کر قوموں کی اجتماعی کامیابی اور ناکامی کے معیار کے بارے میں بھی بتا دیا گیا۔ اس سورت کے مضمون کا تسلسل اگلی سورت میں بھی نظر آئے گا۔

کے اندر بھی نیکی کے علمبردار اور شر پھیلانے والے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ غرض جس طرح ایک فرد کا ضمیر ہوتا ہے اسی طرح معاشروں اور قوموں کا اجتماعی ضمیر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہو‘ اس کی صفوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ احسن طریقہ سے ادا کیا جا رہا ہو تو اس قوم کے مجموعی حالات بہتر طور پر چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر مردہ ہو جائے اور اس کی اخلاقی حس بحیثیت مجموعی اس قدر کمزور ہو جائے کہ اس کے ماحول میں برائی کو برائی کہنے والا بھی کوئی نہ رہے تو ایسی قوم اپنے زندہ رہنے کا جواز کھو دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی اجتماعی بے حسی کی تصویر پیش کی ہے: ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

اس حوالے سے اب ملاحظہ ہو قومِ ثمود کی مثال:

آیت ۱۱ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰىهَآ ⑪﴾ ”قومِ ثمود نے بھی جھٹلایا تھا اپنی سرکشی کے باعث۔“

یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کو جھٹلا دیا جو اُن کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔

آیت ۱۲ ﴿اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ⑫﴾ ”جب اُٹھ کھڑا ہوا ان کا سب سے شقی انسان۔“

وہ شخص اپنی قوم کے لوگوں کے کہنے پر اس اونٹنی کو ہلاک کرنے پر کمربستہ ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے مطالبے پر بطور معجزہ پیدا کیا تھا۔

آیت ۱۳ ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ⑬﴾ ”تو اللہ کے رسول نے ان سے کہا کہ (خبردار!) یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ اس کے پانی پینے کا دن ہے۔“

آیت ۱۴ ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ﴾ ”تو انہوں نے اُس کو جھٹلا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔“

﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ⑭﴾ ”تو الٹ دیا ان پر عذاب ان کے رب نے ان کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا۔“

ان کے جرم عظیم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذابِ استیصال نازل فرمایا اور پوری قوم کو ایک ساتھ پیوندِ خاک کر دیا۔

آیت ۱۵ ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ⑮﴾ ”اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا۔“

اللہ تعالیٰ کو اپنے اس فعل کے کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا ہو گا؟ وہ پوری کائنات کا مالک اور خالق ہے‘ وہ جو چاہے کرے۔ اس نے اس پوری قوم کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوم کو لے آیا۔

اس سورت میں پہلے انسانی نفس اور ضمیر کے حوالے سے انسان کی انفرادی کامیابی اور ناکامی کا ذکر ہوا اور پھر قومِ ثمود کی مثال دے کر قوموں کی اجتماعی کامیابی اور ناکامی کے معیار کے بارے میں بھی بتا دیا گیا۔ اس سورت کے مضمون کا تسلسل اگلی سورت میں بھی نظر آئے گا۔

سُوْرَۃُ الَّیْل

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ﴿۱﴾ وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰٓی ﴿۳﴾ اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ﴿۴﴾
فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ﴿۵﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ﴿۶﴾ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ
وَاسْتَغْنٰی ﴿۸﴾ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ﴿۹﴾ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ﴿۱۰﴾ وَمَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗٓ اِذَا تَرَدّٰی ﴿۱۱﴾
اِنَّ عَلَیْنَا لَلْہُدٰی ﴿۱۲﴾ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی ﴿۱۳﴾ فَاَنْذَرْتُکُمْ نَارًا تَلَظّٰی ﴿۱۴﴾ لَا یَصْلٰىہَآ اِلَّا
الْاَشْقَی ﴿۱۵﴾ الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴿۱۶﴾ وَسَیُجَنَّبُہَا الْاَتْقَی ﴿۱۷﴾ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ﴿۱۸﴾ وَمَا
لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَۃٍ تُجْزٰٓی ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی ﴿۲۰﴾ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ﴿۲۱﴾ ع

آیت ۱ ﴿وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانپ لیتی ہے۔''

یعنی تمام چیزوں پر تاریکی کا پردہ ڈال دیتی ہے۔

آیت ۲ ﴿وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ﴿۲﴾﴾ ''اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو جاتا ہے۔''

رات اور دن اللہ تعالیٰ کی آفاقی نشانیوں میں سے ہیں' جبکہ اگلی قسم کا تعلق انسان کی ذات (اللہ تعالیٰ کی انفسی نشانیوں) سے ہے۔

آیت ۳ ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰٓی ﴿۳﴾﴾ ''اور (قسم ہے) اُس کی جو اُس نے پیدا کیے نر اور مادہ۔''

ان قسموں سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے اندر نظر آنے والے تضادات دراصل نظامِ کائنات کا حصہ ہیں' بلکہ کائنات کا نظام انہی تضادات کی وجہ سے چل رہا ہے اور ایک جنس سے تعلق رکھنے والی دو متضاد چیزیں باہم مل کر فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہیں۔ دنیا کا سارا نظام دن اور رات کے ادلنے بدلنے کی وجہ سے قائم ہے۔ زمین پر حیوانی اور نباتاتی زندگی کا وجود اسی گردشِ لیل و نہار کا مرہونِ منت ہے۔ خود نسلِ انسانی کا تسلسل بھی مرد اور عورت کے جنسی اختلاف و تضاد کی وجہ سے چل رہا ہے۔ چنانچہ کائنات کی مختلف تخلیقات میں بظاہر نظر آنے والے ان تضادات کے اندر بھی ایک طرح کا توافق اور تطابق پایا جاتا ہے۔

آیت ۴ ﴿اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ﴿۴﴾﴾ ''بے شک تمہاری کوشش الگ الگ ہے۔''

یعنی جس طرح کائنات کی باقی چیزوں میں اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اسی طرح تمہارے مختلف افراد کی کوششوں اور محنتوں کی نوعیت بھی مختلف ہے۔

ظاہر ہے زندگی کے شب و روز میں محنت‘ مشقت اور بھاگ دوڑ کرنا تو انسان کا مقدر ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ④﴾(البلد) ’’بے شک ہم نے انسان کو پیدا ہی محنت اور مشقت میں کیا ہے‘‘۔ ہر انسان اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے لیے بھی مشقت کرتا ہے۔ پھر اگر وہ کسی نظریے کا پیروکار ہے تو اس نظریے کی اشاعت اور سربلندی کے لیے بھی تگ و دو کرتا ہے اور اس نظریے کے تحت ایک نظام کے قیام کے لیے بھی جدوجہد کرتا ہے۔ غرض اپنے اپنے ماحول اور حالات کے مطابق محنت اور مشقت تو سب انسان ہی کرتے ہیں لیکن ان کی مشقتوں کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص اپنی محنت کے نتیجے میں جنت خرید لیتا ہے اور دوسرا اپنی محنت و مشقت کی پاداش میں خود کو دوزخ کا مستحق بنالیتا ہے۔ انسانی محنت میں اس فرق کی وضاحت حضور ﷺ کی اس حدیث میں ملتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا))(۱) ’’ہر شخص روزانہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اپنی جان کا سودا کرتا ہے‘ پھر یا تو وہ اسے آزاد کرا لیتا ہے یا اسے تباہ کر بیٹھتا ہے‘‘۔ کوئی اپنی جسمانی قوت کا سودا کرتا ہے‘ کوئی ذہنی صلاحیت بیچتا ہے‘ کوئی اپنی مہارت نیلام کرتا ہے‘ کوئی اپنا وقت فروخت کرتا ہے۔ غرض اپنے اپنے طریقے اور اپنے اپنے انداز میں ہر شخص دن بھر خود کو بیچتا ہے۔ اب ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے خود کو بیچتے ہوئے حلال کو مدنظر رکھا‘ اس نے جھوٹ نہیں بولا‘ کسی کو دھوکہ نہیں دیا‘ کم معاوضہ قبول کر لیا لیکن حرام سے اجتناب کیا۔ ایسا شخص شام کو لوٹے گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شامل حال ہوگی۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرے شخص نے بھی دن بھر مشقت کی‘ مگر حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز ہو کر‘ معاوضہ اس نے بھی لیا مگر غلط بیانی کر کے اور دوسروں کو فریب دے کر‘ ناپ تول میں کمی کر کے اور گھٹیا چیز کو بڑھیا چیز کے دام پر بیچ کر۔ اب یہ شخص جب شام کو گھر آئے گا تو جہنم کے انگاروں کی گٹھڑی اُٹھائے ہوئے آئے گا۔

اب آئندہ آیات میں انسانی زندگی کے دو راستوں میں سے ہر راستے کے تین اوصاف یا تین سنگ ہائے میل کی نشاندہی کر دی گئی ہے‘ تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ اس نے کون سا راستہ اختیار کیا ہے‘ اس راستے پر اب وہ کس مقام پر ہے اور اگر وہ مزید آگے بڑھے گا تو آگے کون سی منزل اس کی منتظر ہوگی۔ اس مضمون کے اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن مجید کی اہم ترین سورت ہے۔ اب ملاحظہ ہوں ان میں سے پہلے راستے کے تین اوصاف:

آیت ۵ ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ⑤﴾ ’’تو جس نے عطا کیا اور تقویٰ اختیار کیا۔‘‘

ظاہر ہے یہ خیر کا راستہ ہے اور اس راستے کا پہلا وصف یا پہلا سنگ میل ’’اِعطاء‘‘ یا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ سورۃ البلد میں اس عمل کو انسان کے لیے ایک بہت مشکل گھاٹی قرار دے کر اس کی وضاحت یوں فرمائی گئی: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ⑬ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ يَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ⑭ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ⑮ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ⑯ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا......﴾ ’’کسی گردن کا چھڑا دینا۔ یا کھانا کھلا دینا بھوک کے دن‘ اُس یتیم کو کہ جو قرابت دار بھی ہے‘ یا اس محتاج کو جو مٹی میں رُل رہا ہے۔ پھر وہ شامل ہوا ان لوگوں میں جو ایمان لائے......‘‘

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الطہارۃ‘ باب فضل الوضوء۔

یعنی جو انسان اس ''مشکل گھاٹی'' کو عبور کرنے کے بعد اہل ایمان کی صف میں شامل ہو گا وہ ان شاء اللہ ابوبکر صدیق' عمر فاروق' عثمان غنی اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کا پیروکار بنے گا۔ لیکن جس نے یہ امتحان پاس کیے بغیر ہی کلمہ پڑھ لیا تو اس کے بارے میں خدشہ ہے کہ توحید و رسالت کی گواہی دینے کے بعد بھی اس کے ایمان کی بو باس عبداللہ بن اُبی کے ایمان کی سی ہو گی۔ ظاہر ہے جو کلمہ حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ' حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے پڑھا تھا وہی کلمہ عبداللہ بن اُبی نے بھی پڑھا تھا۔ یعنی ایمان کا بیج تو دونوں طرف ایک سا تھا' مگر یہ زمین اور تھی' وہ زمین اور تھی۔ اس زمین میں انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چل چکا تھا اور اُس زمین میں حُبِّ دنیا اور شکوک و تردّد کے جھاڑ جھنکاڑ نے قبضہ جما رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عبداللہ بن اُبی کے دل کی زمین میں ایمان کے بیج کا جماؤ ممکن ہی نہ ہوا۔ اس حوالے سے اگر سورۂ آل عمران کی آیت ۹۲ کے اس جملے کو مدنظر رکھا جائے تو انفاق و اِعطاء کے اس فلسفے کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ﴾ یعنی جب تک تم لوگ اپنی عزیز ترین چیز کو اللہ کی راہ میں نہ دے ڈالو تم نیکی کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہیے تو مال کی قربانی دو اور قربانی بھی بہترین چیز کی۔ یہ نہیں کہ چھانٹ کر بے کار چیزیں کسی کو دے کر سمجھو کہ تم نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار دی ہے۔

اس راستے کا دوسرا وصف یا سنگ میل تقویٰ (وَاتَّقٰى) ہے۔ یعنی انسان کا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے رہنا۔ ہر لحہ برائی کی خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچانے کی فکر میں رہنا اور مسلسل کوشش کرتے رہنا کہ میں کسی کا دل نہ دکھاؤں اور کسی کا حق نہ ماروں۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ وہ اخلاقی حس زندہ و بیدار ہو جس کا ذکر سورۃ الشمس کی آیت ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ میں آیا ہے۔ اگر اس کی اخلاقی حس کی شمع ہوا و ہوس کے طوفان کی نذر ہو چکی ہو تو پھر ظاہر ہے کہاں کا تقویٰ اور کس کا ڈر!

آیت ۶ ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝﴾ ''اور اس نے تصدیق کی اچھی بات کی۔''

یہ خیر کے راستے کی تیسری شرط یا اس کا تیسرا وصف ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھلائی اور حق کی کوئی بات انسان کے سامنے آئے اور اس کا دل گواہی دے دے کہ ہاں یہ بات حق ہے تو وہ بلا تردّد اس کی تصدیق کر دے۔ یعنی وہ بھلائی' سچائی اور حق کی تصدیق کرنے کے لیے عواقب و نتائج کی پروا نہ کرے۔ حق کو حق جان کر اس کی تصدیق و توثیق کے لیے سود و زیاں کا ترازو نصب کر کے نہ بیٹھ جائے اور نہ ہی اس حوالے سے اپنی انا کو آڑے آنے دے۔ جیسے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اکثر ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کی بحث کے دوران ایک آدمی پر واضح ہو جاتا ہے کہ دوسرے کی بات درست ہے مگر وہ صرف اپنی انا کی وجہ سے اس کے موقف کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

آیت ۷ ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝﴾ ''تو اس کو ہم رفتہ رفتہ آسان منزل (جنت) تک پہنچا دیں گے۔''

اس حوالے سے سورۃ الاعلیٰ کی یہ آیت بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝﴾ ''اور ہم رفتہ رفتہ پہنچائیں گے آپ کو آسان منزل تک''۔ لیکن سورۃ الاعلیٰ کی نسبت یہاں یہ مضمون زیادہ واضح انداز میں

آیا ہے۔اب اس کے مقابلے میں اگلی آیات میں دوسرے راستے اور اس کے تین سنگ ہائے میل کا ذکر آرہا ہے:

آیت ۸ ﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ﴾ ''اور جس نے بخل کیا''

پہلی تین خصوصیات کی ترتیب ذہن میں رکھیے اور نوٹ کیجیے کہ ''اِعطاء'' کے مقابلے میں یہاں بخل آ گیا ہے۔

﴿وَاسْتَغْنٰی ⑧﴾ ''اور بے پروائی اختیار کی۔''

بھلائی اور خیر کے راستے کی تین خصوصیات میں اِعطاء کے بعد تقویٰ یعنی پھونک پھونک کر قدم رکھنے اور ذمہ داری کے احساس کا بیان تھا۔اس کے مقابلے یہاں لااُبالی پن' لاپرواہی اور بے نیازی (استغناء) کا تذکرہ ہے۔گویا ایک شخص حلال وحرام کی تمیز سے ناآشنا اور نیکی و بدی کے تصور سے بیگانہ اپنی دھن میں مست چلا جارہا ہے۔کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو اس کی بلا سے' کسی کی عزت پر حرف آتا ہے تو آتا رہے' کسی کے جان و مال کی حرمت پامال ہوتی ہے تو بھی پروا نہیں!غرض اپنی سوچ ہے' اپنی مرضی ہے اور اپنے کام سے کام ہے:

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام ــــ کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

آیت ۹ ﴿وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ⑨﴾ ''اور جھٹلا دیا اچھی بات کو۔''

یعنی اس کے دل نے گواہی دے دی کہ یہ سچ اور حق بات ہے لیکن اس کے باوجود اس نے تعصب یا تکبر یا ہٹ دھرمی یا مفاد یا کسی خوف کی وجہ سے اسے جھٹلا دیا۔واضح رہے اس آیت کا تقابل آیت ۶ (وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ⑥) کے ساتھ ہے۔

آیت ۱۰ ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ⑩﴾ ''تو اس کو ہم رفتہ رفتہ مشکل منزل (جہنم) تک پہنچا دیں گے۔''

یہ ہیں انسانی کوشش اور مشقت کے دو رخ۔گویا پہلی تین شرائط کو اپنانے کا راستہ صدیقین اور شہداء کا راستہ ہے۔اگر کسی نے کوشش کی لیکن وہ مذکورہ تینوں شرائط کو کماحقہ پورا نہ کر سکا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوشش اور اخلاص کے مطابق ہوگا۔لیکن جس بدقسمت شخص کی کوشش اور محنت میں ان تینوں اوصاف کا فقدان ہوا اور وہ ان کے مقابلے میں عمر بھر دوسرے راستے (بخل' استغناء اور تکذیب) پر گامزن رہا' ظاہر ہے اس کا شمار ان بدترین لوگوں کے گروہ میں ہوگا جس کے سرغنہ ابولہب اور ابوجہل ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ ابوجہل کے مقابلے میں ابولہب کا کردار کہیں زیادہ گھٹیا اور مذموم تھا' بلکہ قرآن مجید نے جس انداز میں اس کی مذمت کی ہے اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے گروہ کا بدترین فرد تھا۔بزدلی' بخیلی اور حد سے بڑھی ہوئی خودغرضی اس کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں۔اس کے بخل اور مال کو سینت سینت کر رکھنے کا ذکر سورۃ اللھب میں بھی آیا ہے۔اس کی بزدلی اور خودغرضی کا پول اس وقت کھلا جب اس کے سامنے اپنے ''دین'' کے لیے جنگ کرنے کا مرحلہ آیا' اس وقت اس نے اپنی جگہ کرائے کے دو سپاہیوں کو لڑنے کے لیے بھیج دیا۔اس کے مقابلے میں ابوجہل صاف گو' بہادر اور اپنے نظریے پر مر مٹنے والا شخص تھا۔چنانچہ اس نے اپنے باطل دین کی خاطر بڑے فخر سے گردن کٹوائی۔انگریزی کی مثل ہے: "give the devil his due" یعنی شیطان کے کردار میں بھی اگر کوئی مثبت خصوصیت ہو تو اس کے اعتراف میں کوئی حرج نہیں۔ظاہر ہے اس کی شخصیت میں

آخر کوئی تو خوبی تھی جس کی بنا پر حضورﷺ نے اپنی خصوصی دعا میں اسے اور حضرت عمرؓ کو ایک ہی پلڑے میں رکھا تھا۔ حضورﷺ نے تو ان دونوں شخصیات کے لیے برابر کی دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر بن الخطاب اور عمرو بن ہشام میں سے کسی ایک کو میری جھولی میں ڈال دے! حضورﷺ کی اس دعا کی روشنی میں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر ابوجہل ایمان لے آتا تو وہ حضرت عمرؓ کے پائے کا مسلمان ہوتا' نہ کہ عبداللہ بن اُبی کے کردار والا مسلمان۔

بہرحال ان آیات میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کے معیار اور اوصاف کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی ہے۔ جو انسان اپنی سیرت وشخصیت کی بنیاد پہلے تین اوصاف (بحوالہ آیت ۵ اور ۶) پر رکھے گا وہ ان شاء اللہ کامیابی سے ہمکنار ہوگا اور جو آخری تین اوصاف (بحوالہ آیت ۸ اور ۹) کا انتخاب کرے گا وہ بدترین خلائق قرار پائے گا۔

آیت ۱۱ ﴿وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ⑪﴾ ''اور اس کا مال اس کے کچھ کام نہیں آئے گا جب وہ (جہنم کے) گڑھے میں گرے گا۔''

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ⑫﴾ ''(دیکھو انسانو!) یقیناً ہمارے ذمے ہے ہدایت پہنچا دینا۔''

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ بہت اہم آیت ہے۔ اس میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ انسان کو سیدھا راستہ دکھانا اور ''ہدایت'' اس تک پہنچانا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جبلی ہدایت بھی عطا کی ہے' اس کے نفس کے اندر اخلاقی حس بھی الہام کر دی ہے۔ اس کے اندر اپنی روح بھی پھونکی ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت کی امین ہے اور پھر اس ہدایت و معرفت کی تکمیل کے لیے اس نے دنیا میں پیغمبر بھی بھیجے اور کتابیں بھی نازل کیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے کئی ذرائع سے انسان کو راہِ ہدایت دکھانے کا اہتمام فرما دیا ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ⑬﴾ ''اور ہمارے ہی لیے ہے اختیار آخرت کا بھی اور دنیا کا بھی۔''

ظاہر ہے آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ کون انسان کامیاب ہوا ہے اور کون ناکام رہا ہے۔ اور دنیا میں بھی وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی قوم اب اس کی زمین پر بوجھ بننے جا رہی ہے اور اس طرح کے کس بوجھ سے کس وقت اس نے زمین کو آزاد کرنا ہے۔ گزشتہ سورت (سورۃ الشمس) میں قومِ ثمود کے بارے میں اللہ کے ایسے ہی ایک فیصلے کا ذکر ہم بایں الفاظ پڑھ آئے ہیں: ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ⑭﴾ ''تو الٹ دیا ان پر عذاب ان کے رب نے ان کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا''۔ یعنی جب اس قوم کے پاس اللہ تعالیٰ کا رسولؑ واضح نشانیوں کے ساتھ آ گیا' پھر اللہ کے رسولؑ نے اللہ کا پیغام پہنچا کر اور اپنے کردار وعمل کا نمونہ پیش کر کے اس قوم پر اتمامِ حجت کر دیا۔ اس کے بعد بھی جب وہ قوم کفر اور سرکشی پر اڑی رہی تو انہیں ایسے ملیامیٹ کر دیا گیا جیسے کسی باغ کی صفائی کے لیے اس کا سارا کوڑا کرکٹ جمع کر کے اسے آگ لگا دی جاتی ہے۔

آیت ۱۴ ﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ⑭﴾ ''دیکھو! میں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔''

جہنم تو بھوکے شیر کی طرح اپنے شکار کی تاک میں ہے: ﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ⑯ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ⑰﴾ (المعارج) ''وہ کلیجوں کو کھینچ لے گی۔ وہ پکارے گی ہر اُس شخص کو جس نے پیٹھ موڑ لی تھی اور رخ پھیر لیا تھا۔''

آیت ۱۵ ﴿لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ⑮﴾ ''نہیں پڑے گا اس میں مگر وہ جو انتہائی بدبخت ہے۔''

ظاہر ہے جس انسان کو آخری رسولؐ کے آجانے کے بعد بھی حقیقت نظر نہ آئی اس سے بڑا بدبخت اور کون ہوسکتا ہے اور اس سے زیادہ جہنم کے گڑھے میں گرنے کا مستحق کون ہوسکتا ہے؟ کیونکہ اگر کوئی شخص اندھیرے میں یا کم روشنی میں ٹھوکر کھا جائے تو اس کی ٹھوکر کا پھر بھی کچھ نہ کچھ جواز بنتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص دن کی روشنی میں اس وقت راستہ پہچاننے سے انکار کر دے جب سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو تو ظاہر ہے اس کے لیے وہ خود ہی قصوروار ہوگا۔

آیت ۱۶ ﴿الَّذِیۡ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ﴿ؕ۱۶﴾﴾ ''جس نے جھٹلایا اور منہ پھیر لیا۔''

آیت ۱۷ ﴿وَ سَیُجَنَّبُہَا الۡاَتۡقَی ﴿ۙ۱۷﴾﴾ ''اور بچالیا جائے گا اس سے جو انتہائی متقی ہے۔''

اس آیت کے بارے میں تقریباً تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس کے مصداق حضرت ابوبکر صدیق ؓ ہیں۔ کیونکہ قبل ازیں آیت ۵ اور ۶ میں جن تین اوصاف کا ذکر ہوا ہے وہ اس اُمت کی جس شخصیت میں بتمام وکمال نظر آتے ہیں وہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی شخصیت ہے۔

''تصدیق بالحسنیٰ'' کے حوالے سے آپؓ کے بارے میں خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ میں نے جس کسی کو بھی دعوت دی اس نے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا' سوائے ابوبکرؓ کے۔ انؓ کے سامنے جونہی میں نے اپنی نبوت کا ذکر کیا وہ فوراً مجھ پر ایمان لے آئے۔ آپؓ کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ زمانہ جاہلیت میں بھی آپؓ توحید پر کاربند اور بت پرستی سے دور رہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے میں بھی آپؓ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آپؓ نے کئی نادار خاندانوں کی کفالت مستقل طور پر اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ مکہ کے بہت سے غلاموں اور لونڈیوں کو آپؓ نے منہ مانگی قیمت میں خرید کر آزاد کرایا تھا اور غزوۂ تبوک کے موقع پر تو آپؓ نے اپنا پورا اثاثہ لا کر حضور ﷺ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا۔ غرض مذکورہ تینوں اوصاف بدرجہ اَتم اُمت کے مَردوں میں آپؓ کی شخصیت میں' جبکہ خواتین میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کی شخصیت میں پائے جاتے ہیں۔

آیت ۱۸ ﴿الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ﴿ۚ۱۸﴾﴾ ''جو اپنا مال دیتا ہے اپنے (نفس) کو پاک کرنے کے لیے۔''

یعنی مال خرچ کرتے ہوئے دنیاداری کا کوئی مفاد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے حضرت بلال ؓ کو آزاد کرانے کے لیے اُمیہ بن خلف کو جب منہ مانگی قیمت ادا کی تو اس پر اُمیہ خود بھی حیران رہ گیا۔ دوسری طرف حضرت ابوبکر ؓ کے والد حضرت ابوقحافہ ؓ (آپؓ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے) نے بھی آپؓ سے گلہ کیا کہ اتنی بڑی رقم تم نے کسی طاقتور غلام پر کیوں نہ خرچ کی جو تمہارے کام بھی آتا! (اس زمانے میں اگر کوئی شخص کسی غلام کو آزاد کراتا تھا تو وہ غلام زندگی بھر اسی شخصیت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا اور اخلاقی لحاظ سے بھی وہ اس کے تابع رہتا تھا۔ عرب رواج کے مطابق ایسے آزاد کردہ غلام کو متعلقہ شخصیت کا مولیٰ کہا جاتا تھا' جیسے حضرت زید بن حارثہ ؓ اور حضرت ثوبان ؓ حضور ﷺ کے مولیٰ تھے۔) بہرحال مال خرچ کرنے کا یہ فلسفہ ان لوگوں کی سمجھ سے بالا ہے جن کی نظر ہر وقت دنیا کے مفادات پر رہتی ہے۔

آیت ۱۹ ﴿وَ مَا لِاَحَدٍ عِنۡدَہٗ مِنۡ نِّعۡمَۃٍ تُجۡزٰۤی ﴿ۙ۱۹﴾﴾ ''اور اس کے ذمے کسی کا احسان نہیں جس کا وہ

بدلہ چکا رہا ہو۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰى ⑳﴾ ’’بلکہ (وہ تو خرچ کر رہا ہے) صرف اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضا جوئی کے لیے۔‘‘

آیت ۲۱ ﴿وَلَسَوۡفَ يَرۡضٰى ㉑﴾ ’’اور وہ عنقریب راضی ہو جائے گا۔‘‘

یہاں پر یَرۡضٰی کی ضمیر کا اشارہ بیک وقت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور اس شخصیت کی طرف بھی جس کی صفات کا ذکر ان آیات میں ہو رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو جائے گا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی راضی ہو جائیں گے۔ گویا یہ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ جیسی بشارت ہے کہ اگر اللہ کا یہ بندہ اپنا مال صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے لٹا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس سے راضی ہو جائے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو آخرت میں اتنا کچھ عطا کرے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ یہاں یہ اہم نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ معنوی اعتبار سے اس آیت کا اگلی سورت (سورۃ الضحیٰ) کی آیت ۵ کے ساتھ خصوصی ربط و تعلق ہے جس کی وضاحت سورۃ الضحیٰ کے مطالعہ کے دوران کی جائے گی۔

یہاں پر زیر مطالعہ سورتوں (سورۃ الشمس، سورۃ اللیل، سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح) کے مرکزی مضمون کے اہم نکات ایک دفعہ پھر اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ سورۃ الشمس کی ابتدائی آٹھ آیات قسموں پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد مقسم علیہ کے طور پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نفس انسانی کے اندر نیکی اور بدی کا شعور ودیعت کر دیا گیا ہے، اور پھر اس کے بعد دو آیات میں اس حوالے سے کامیابی اور ناکامی کا معیار بھی بتا دیا گیا ہے: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ⑨ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ⑩﴾ کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ٹھہرا اور جس نے اسے مٹی میں دفن کر دیا وہ ناکام ہو گیا۔ اگلی سورت یعنی سورۃ اللیل میں نفس کو سنوارنے اور بگاڑنے کے طریقوں یا راستوں کے بارے میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے کہ جو انسان اعطائے مال، تقویٰ اور تصدیق بالحسنیٰ کے اوصاف اپنائے گا وہ صدیقیت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ اس کے برعکس بخل، استغناء (حلال و حرام اور جائز و ناجائز سے متعلق لاپرواہی) اور حق کی تکذیب کی راہ پر چلنے والا انسان بالآخر خود کو جہنم کے گڑھے میں گرائے گا۔ پھر کامیابی کے راستے کی مثال کے طور پر امت کی ایک ایسی شخصیت کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا جسے پہلے تین اوصاف کو اپنانے کے باعث اعلیٰ مدارج و مراتب سے نوازا گیا۔ لیکن ظاہر ہے اس منزل کا بلند ترین مقام تو محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے مختص ہے جو معراجِ انسانیت ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کے حوالے سے اب اگلی دو سورتوں کا تعلق خصوصی طور پر حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ اسی نسبت سے ان سورتوں کا مطالعہ سیرت النبیؐ کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے بھی مفید ہے۔ متقدمین میں سے تصوف کا ذوق رکھنے والے اکثر مفسرین نے ان سورتوں میں بعض باطنی حقائق کی نشاندہی بھی کی ہے۔ (متعلقہ آیات کے مطالعہ کے دوران جہاں جس حد تک ممکن ہوا ایسے کچھ نکات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔) ظاہر ہے موجودہ دور کے ’’عقلیت پسند‘‘ مفسرین نہ تو تصوف کا ذوق رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں ایسے موضوعات سے دلچسپی ہے۔ (الا ماشاء اللہ!)

سُوْرَةُ الضُّحٰی

تمہیدی کلمات

سورۃ الضحیٰ کے شانِ نزول سے متعلق مختلف روایات میں جو تفصیل ملتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائے بعثت میں حضور ﷺ پر نزولِ وحی کا سلسلہ کچھ عرصہ جاری رہا اور پھر اچانک رُک گیا۔ جب یہ وقفہ زیادہ طویل ہوا تو اس کا علم آپؐ کے مخالفین کو بھی ہو گیا۔ (واضح رہے کہ یہ وقفہ اس وقفے کے علاوہ تھا جو پہلی وحی کے بعد آیا تھا اور جس کا ذکر سیرت کی کتابوں میں عام طور پر ''فترتِ وحی'' کے نام سے ملتا ہے۔) ظاہر ہے حضور ﷺ ہر نئی وحی کا کلام لوگوں کو سناتے تھے۔ جب آپؐ نے کافی دنوں تک لوگوں کو قرآن مجید کا کوئی نیا حصہ نہ سنایا تو لوگ سمجھ گئے کہ نزولِ وحی کا سلسلہ رک گیا ہے۔ کچھ روایات میں اس کی وضاحت یوں بھی آئی ہے کہ اس دوران علالتِ طبع کے باعث آپؐ چند راتوں تک قیام اللیل کے لیے نہ اُٹھ سکے تو ابولہب کی بیوی اُمِ جمیل' جس کا مکان حضور ﷺ کے مکان سے متصل تھا' آ کر کہنے لگی کہ میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے! بہرحال مشرکین کو جب معلوم ہوا کہ نزولِ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا ہے تو انہوں نے آپؐ کو طعنے دینے شروع کر دیے کہ محمد (ﷺ) کو خدا تعالیٰ نے چھوڑ دیا ہے اور وہ اس سے ناراض ہو گیا ہے۔

یہ کیفیت خود حضور ﷺ کے لیے بھی بے حد پریشان کن اور ناقابل برداشت تھی۔ وحی آپؐ کی روح کی غذا تھی۔ ہر نئی وحی سے آپؐ کی روح کو تازگی ملتی تھی۔ اس کے علاوہ آپؐ کو بار بار یہ خیال بھی آتا تھا کہ شاید مجھ سے کہیں کوئی خطا ہوئی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا ہے۔ لوگوں کے طعنے اس کے علاوہ تھے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ اس دوران شدید رنج و غم کی وجہ سے کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ میں کسی پہاڑ پر چڑھ کر خود کو نیچے گرا دوں۔ بہرحال اس پس منظر میں یہ سورت نازل ہوئی اور اس کی آیت ۳ میں خصوصی طور پر آپؐ کو تسلی دی گئی کہ آپؐ کے رب نے نہ تو آپؐ کو چھوڑا ہے اور نہ ہی وہ آپؐ سے ناراض ہوا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ روحانی انقباض کی کیفیت میں اس سورت کا پڑھنا تریاق کا درجہ رکھتا ہے۔ تصوف کی زبان میں قبض یا انقباض انسان کی اس روحانی کیفیت کا نام ہے جب اس کی طبیعت میں ناامیدی اور بندش سی آ جاتی ہے اور اسے ہر معاملے کا تاریک و منفی رخ ہی سوجھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کی مثبت روحانی کیفیت کو تصوف کی اصطلاح میں ''بسط'' کہا جاتا ہے۔ یہ انسان کی وہ روحانی کیفیت ہے جس میں اسے اپنی طبیعت میں انشراح محسوس ہوتا ہے اور ہر معاملے کا روشن اور مثبت پہلو نظر آتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے نفسیاتی طور پر انسان کے مزاج کے دو رخ ہیں۔ کبھی انسان کی طبیعت ہشاش بشاش اور ہنسنے کھیلنے پر آمادہ ہوتی ہے اور کبھی وہ غمگین وافسردہ ہوتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالضُّحٰی ۙ﴿۱﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۙ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ؕ﴿۳﴾ وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ؕ﴿۴﴾
وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ؕ﴿۵﴾ اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ۪﴿۶﴾ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَہَدٰی ۪﴿۷﴾
وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی ؕ﴿۸﴾ فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡہَرۡ ؕ﴿۹﴾ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡہَرۡ ﴿ؕ۱۰﴾ وَاَمَّا بِنِعۡمَۃِ
رَبِّکَ فَحَدِّثۡ ﴿۱۱﴾ ع

آیت ۱ ﴿وَالضُّحٰی ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے دھوپ چڑھنے کے وقت کی۔''

آیت ۲ ﴿وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۙ﴿۲﴾﴾ ''قسم ہے رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ چھا جائے۔''

رات میں اندھیرا اور سکون ہے' جبکہ دن اُجالے اور حرکت کا مظہر ہے۔ ان دو آیات میں رات اور دن کی متضاد خصوصیات کو اس فرمان پر بطور شہادت پیش کیا گیا کہ:

آیت ۳ ﴿مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ؕ﴿۳﴾﴾ ''آپؐ کے رب نے آپ کو رخصت نہیں کیا اور نہ ہی وہ آپؐ سے ناراض ہوا ہے۔''

یعنی وحی کے تسلسل میں یہ وقفہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ آپؐ سے ناراض ہو گیا ہے' بلکہ یہ وقفہ ہماری حکمت و مشیت کا حصہ اور آپؐ کی تربیت کا جزو تھا۔ ظاہر ہے نظامِ کائنات میں دن کے اُجالے کے ساتھ رات کی تاریکی کا وجود بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ جس طرح دن کے بعد رات کا آنا ضروری ہے اسی طرح نفسِ انسانی کے لیے بسط و کشاد کی لذت کے ساتھ ساتھ ''انقباض'' کی کیفیت سے آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔

آیت ۴ ﴿وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ؕ﴿۴﴾﴾ ''اور یقیناً بعد کا وقت آپ کے لیے بہتر ہوگا پہلے سے۔''

یعنی اس وقفے اور 'انقباض' کی کیفیت کے بعد آنے والی اب ہر گھڑی اور ہر ساعت آپؐ کے لیے 'انبساط' اور انشراح کا نیا پیغام لے کر آئے گی۔ ان آیات میں انقباض و انبساط کے حوالے سے جو اصول بیان ہوا ہے اس کی حیران کن حد تک درست ترجمانی غالبؔ نے اپنے اس مصرع میں کی ہے: ع ''رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور!'' یعنی اشعار کی آمد کے حوالے سے کبھی کبھی مجھ پر انقباض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے لیکن جب اس وقفے کے بعد دوبارہ آمد شروع ہوتی ہے تو پھر میری طبیعت کی روانی پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ گویا انقباض کے بعد جب انبساط کا مرحلہ آتا ہے تو انسان اپنی پہلی کیفیت کے مقابلے میں ایک درجہ آگے جا چکا ہوتا ہے۔

[اس آیت مبارکہ سے یہ مفہوم بھی متبادر ہوتا ہے کہ ''یقیناً ہر آنے والی گھڑی آپؐ کے لیے پہلی سے (بدرجہا) بہتر ہے''۔ آپؐ پر آپؐ کے رب کے لطف و کرم اور انعام و احسان کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ ہر آنے والا وقت گزشتہ حالات سے بہتر سے بہتر ہوگا۔ اس ایک جملہ میں کفار کے طعن و تشنیع اور الزام تراشیوں کا

بھی سدباب کر دیا گیا اور اسلام کے درخشاں مستقبل کے بارے میں بھی نوید جانفزا سنا دی گئی۔]

آیت ۵ ﴿وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰى ۝۵﴾ ''اور عنقریب آپؐ کا رب آپؐ کو اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپؐ راضی ہو جائیں گے۔''

یعنی اب بہت جلد آپ ﷺ کی محنتوں کے ایسے ایسے نتائج آپؐ کے سامنے آئیں گے کہ انہیں دیکھ کر آپؐ خوش ہو جائیں گے۔(۱)

یہاں پر پچھلی سورت کی آخری آیت کے یہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿وَلَسَوۡفَ يَرۡضٰى ۝۲۱﴾ گویا جو خوشخبری یہاں حضور ﷺ کو سنائی جا رہی ہے وہی بشارت سورۃ اللیل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دی گئی ہے۔ دونوں آیات کا اسلوب اصلاً ایک سا ہے' صرف ضمیر اور صیغے کا فرق ہے۔ حضور ﷺ پر چونکہ وحی آتی تھی اس لیے آپؐ کو صیغہ حاضر (تَرۡضٰى) میں براہِ راست مخاطب کیا گیا' جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے غائب کا صیغہ (يَرۡضٰى) آیا ہے۔

''انقباض'' کی مذکورہ کیفیت کے سیاق و سباق میں اب اللہ تعالیٰ حضور ﷺ پر اپنے احسانات جتا رہا ہے۔ یہ بھی دراصل حضور ﷺ کے لیے تسلی ہی کا ایک انداز ہے۔ جبکہ اس میں ہمارے لیے بھی راہنمائی ہے کہ جب کسی وقت آدمی پر ڈپریشن اور افسردگی کی کیفیت طاری ہو تو اسے چاہیے کہ اس کیفیت میں وہ خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کے احسانات کو گن گن کر یاد کرے کہ اللہ تعالیٰ کس کس انداز میں اس کی مدد کرتا رہا ہے اور کیسی کیسی مشکلات سے اسے نجات دلاتا رہا ہے۔ ظاہر ہے ماضی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے سے ایک پریشان حال آدمی کا حوصلہ بڑھتا ہے اور اس کی مثبت سوچ کو تحریک ملتی ہے۔

آیت ۶ ﴿اَلَمۡ يَجِدۡكَ يَتِيۡمًا فَاٰوٰى ۝۶﴾ ''کیا اُس نے نہیں پایا آپؐ کو یتیم' پھر پناہ دی!''

یہ آیات سیرت النبیؐ کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے حوالے سے بھی بہت اہم ہیں۔ حضور ﷺ کے والد آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ چنانچہ آپؐ پیدا ہی یتیمی کی حالت میں ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں والدہ کا سہارا بھی چھن گیا۔ دادا نے اپنی کفالت میں لیا تو دو سال بعد وہ بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ تایا زبیر بن عبدالمطلب سرپرست بنے تو کچھ عرصہ بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا (حضور ﷺ کی کفالت کے حوالے سے آپؐ کے تایا زبیر بن عبدالمطلب کا ذکر اکثر تاریخی حوالوں میں موجود ہی نہیں۔ ایسا دراصل جناب ابوطالب کے کردار

---

(۱) علامہ سید محمد آلوسی رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

(ترجمہ) ''یہ اللہ تعالیٰ کا کریمانہ وعدہ ہے جو ان تمام عطیات کو شامل ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دنیا میں سرفراز فرمایا۔ یعنی کمالِ نفس' اولین و آخرین کے علوم' اسلام کا غلبہ' دین کی سربلندی' ان فتوحات کے باعث جو عہد رسالت میں ہوئیں اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں ہوئیں یا دوسرے مسلمان بادشاہوں نے حاصل کیں اور اسلام کا دنیا کے مشارق و مغارب میں پھیل جانا۔ نیز یہ وعدہ ان عنایات اور عزت افزائیوں کو بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم ﷺ کے لیے آخرت کے لیے محفوظ رکھی ہیں' جن کی حقیقت اور نہایت کو اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی نہیں جان سکتا۔'' (بحوالہ تفسیر ضیاء القرآن' از پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ)

کو زیادہ نمایاں کرنے کے لیے جان بوجھ کر باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے)۔اس کے بعد جناب ابوطالب نے آپ ﷺ کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور انہی کی سرپرستی میں آپ جوانی کی عمر کو پہنچے۔ آیت کے لفظ ''فَاٰوٰی'' میں ان تمام دنیوی سہاروں کی طرف اشارہ ہے جو ظاہر ہے آپ کو اللہ تعالیٰ نے فراہم کیے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ہی ان تمام رشتہ داروں کے دلوں میں آپ کے لیے محبت اور چاہت پیدا کی تھی۔اسی نے آپ کی شخصیت ایسی بنائی تھی کہ جو کوئی آپ کو دیکھتا آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی بچپن میں سہارا دیا تھا۔سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ کی اس قدرت اور حکمت کا ذکر اس طرح آیا ہے:﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ﴾ (آیت ۳۹) کہ اے موسیٰؑ میں نے آپ پر اپنی محبت کا پَرتو ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے لوگ آپ کو دیکھ کر متاثر ہو جاتے تھے اور یوں وہ آپ کو قتل کرنے سے باز رہے۔

آیت ۷ ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝﴾ ''اور آپ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو ہدایت دی!''

جب آپ شعور کی پختگی کی عمر کو پہنچے اور آپ نے کائنات کے حقائق کے بارے میں غور و فکر کرنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ کو راہنمائی فراہم کر دی۔ (۱)

آیت ۸ ﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝﴾ ''اور اس نے آپ کو تنگ دست پایا تو غنی کر دیا!''

اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ساری دولت آپ ﷺ کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ حضرت خدیجہؓ بہت مال دار اور صاحب حیثیت خاتون تھیں۔ مکہ کے بڑے بڑے سرداران‌ؓ سے نکاح کے خواہش مند تھے' مگر اللہ تعالیٰ نے انؓ کا دل آپ ﷺ کی طرف پھیر دیا اور انہوںؓ نے خود آپ کو نکاح کا پیغام بھجوایا۔

گزشتہ آیات میں حضور ﷺ کی زندگی کے تین مراحل کے حوالے سے تین احسانات کا ذکر کرنے کے بعد اب اسی ترتیب سے آپ ﷺ کو تین ہدایات دی جا رہی ہیں:

آیت ۹ ﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝﴾ ''تو آپ کسی یتیم پر سختی نہ کریں۔''

جیسے آپ کی یتیمی میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی کفالت وغیرہ کا بندوبست کیا' اسی طرح اب آپ بھی یتیموں

---

(۱) اس آیت کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''جب حضرتؐ جوان ہوئے' قوم کے مشرکانہ اطوار اور بے ہودہ رسم و راہ سے سخت بیزار تھے اور قلب میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ پورے زور کے ساتھ موجزن تھا۔عشقِ الٰہی کی آگ سینۂ مبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ وصول الی اللہ اور ہدایتِ خلق کی اُس اکمل ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفسِ قدسی میں ودیعت کیا گیا تھا' اندر ہی اندر جوش مارتا تھا' لیکن کوئی صاف کھلا ہوا راستہ اور مفصل راستہ اور مفصل دستور العمل بظاہر دکھائی نہ دیتا تھا جس سے اُس عرش و کرسی سے وسیع قلب کو تسکین ہوتی۔اسی جوشِ طلب اور فرطِ محبت میں آپ بے قرار اور سرگرداں پھرتے اور غاروں اور پہاڑوں میں جا کر مالک کو یاد کرتے اور محبوبِ حقیقی کو پکارتے۔آخر اللہ تعالیٰ نے غارِ حرا میں فرشتہ کو وحی دے کر بھیجا اور وصول الی اللہ اور اصلاحِ خلق کی تفصیلی راہیں آپ پر کھول دیں' یعنی دینِ حق نازل فرمایا:﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ...... الخ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

کی سرپرستی کریں اورانہیں لوگوں کی زیادتیوں سے بچائیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ؁۱۰﴾ ''اور آپؐ کسی سائل کو نہ جھڑکیں۔''

ایک وقت تھا جب آپؐ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں تھے اور ہم نے آپؐ کو ہدایت عطا فرمائی تھی۔ اب اگر آپؐ کے پاس کوئی سائل اپنی حاجت لے کر آئے تو اس کی حاجت روائی کریں اور اسے جھڑکیں نہیں۔ ظاہر ہے سائل بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کوئی مالی معاونت کے لیے سوال کرتا ہے تو کوئی علم کی تلاش میں لوگوں کے دروازوں پر دستک دیتا ہے۔

آیت ۱۱ ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ؁۱۱﴾ ''اور اپنے رب کی نعمت کا بیان کریں۔''

یہ ہدایت جو آپؐ کو عطا ہوئی ہے' یہ آپؐ کے رب کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر شکر کا تقاضا ہے کہ آپؐ اس کی اس نعمت کا چرچا کریں اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پھیلائیں۔ اس حکم میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ ہدایت کی نعمت کو اگر انسان اپنی ذات تک محدود کر کے بیٹھ رہے تو اس کا یہ طرزِ عمل بخل کے مترادف ہوگا۔ لہٰذا جس کسی کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی دولت سے نوازے اسے چاہیے کہ اس خیر کو عام کرے اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرے۔

سُوْرَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ
ذِكْرَكَ ۝ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ
فَارْغَبْ ۝ ع

آیت ۱ ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ①﴾ ''کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کے سینے کو کھول نہیں دیا؟''
یعنی ہم نے آپ کا اضطراب کم کر کے آپ کے دل کو ایک ٹھہراؤ اور سکون عطا فرما دیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''اس میں علوم و معارف کے سمندر اُتار دیے اور لوازمِ نبوت اور فرائضِ رسالت برداشت کرنے کو بڑا وسیع حوصلہ دیا۔''

آیت ۲ ﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ②﴾ ''اور ہم نے اُتار نہیں دیا آپ سے آپ کا وہ بوجھ؟''

آیت ۳ ﴿الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ③﴾ ''جو آپ کی کمر کو توڑے دے رہا تھا!''

آیت ۴ ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ④﴾ ''اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا ہے۔''(۱)

آیت ۵ ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑤﴾ ''تو یقیناً مشکل ہی کے ساتھ آسانی ہے۔''

آیت ۶ ﴿اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑥﴾ ''یقیناً مشکل ہی کے ساتھ آسانی ہے۔''

یہ سورت دراصل مشکلات القرآن میں سے ہے۔ آیت ۲ میں جس بوجھ کا ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اس میں حضور ﷺ کی دعوت و تبلیغ کی مشقتوں اور لوگوں کی طرف سے پہنچائی جانے

---

(۱) صحیح ابن حبان، مسند ابی یعلی الموصلی اور دیگر کتب حدیث میں حضرت سعد بن مالک اور حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اتانی جبریل علیہ السلام فقال: اِنَّ رَبِّیْ وَرَبُّكَ يَقُوْلُ لَكَ: اَتَدْرِیْ كَيْفَ رَفَعْتُ ذِكْرَكَ؟ قُلْتُ: اللّٰہ اعلم۔ قال: اِذَا ذُكِرْتُ ذُكِرْتَ مَعِیْ))

''حضرت جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور کہا کہ میرا اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ کے ذکر کو کس طرح بلند کیا ہے؟ میں نے جواب دیا: اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ (آپ کے رفع ذکر کی کیفیت یہ ہے کہ) جہاں میرا ذکر کیا جائے گا وہاں آپ کا بھی میرے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔'' (حاشیہ از مرتب)

والی اذیتوں کی طرف اشارہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رائے صرف جزوی طور پر درست ہے اس لیے کہ یہ سورت بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھی۔ اس زمانے میں حضورﷺ کی مشکلات کا ابھی آغاز ہو رہا تھا اور بعد کے زمانے میں آپؐ کو نسبتاً بہت زیادہ مشکل مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ مثلاً شعب ابی طالب میں تین سال کی قید کا واقعہ اس سورت کے نزول کے بعد پیش آیا اور اس کے بعد ہی آپؐ کو یومِ طائف اور یومِ اُحد جیسے گھمبیر حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ دعوت و تبلیغ اور آپؐ کے فریضہ رسالت سے متعلقہ مشکلات بھی اس سورت کے نزول کے بعد کم ہونے کے بجائے مزید بڑھیں' بلکہ بڑھتی ہی چلی گئیں۔ اس لیے یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہاں جس بوجھ کے اتار دینے کا ذکر ہوا ہے وہ اصل میں کوئی اور بوجھ تھا۔

اس بوجھ کی کیفیت کے بارے میں جاننے کے لیے پہلے اس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو اپنے قربِ خاص کی نعمت سے نوازتا ہے۔ چنانچہ قربِ خاص کی لذت سے آشنا ہو جانے کے بعد انبیاء و رسل علیہم السلام کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی کیفیت میں گزاریں۔ لیکن وہاں سے حکم ملتا ہے کہ جاؤ خلقِ خدا تک میرا پیغام پہنچاؤ اور انہیں ہدایت کا راستہ دکھاؤ! مثلاً اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر اپنے قربِ خاص سے نوازا اور آپؑ سے کلام فرمایا تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خواہش تو یہی ہوگی کہ وہ سدا اسی کیفیت میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مکالمے اور مخاطبے کی لذت سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ لیکن اس کے فوراً بعد آپؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾﴾ (طٰہٰ) ''اب جاؤ فرعون کی طرف' وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے!'' ظاہر ہے فریضۂ رسالت کی ادائیگی کوئی آسان کام تو نہیں۔ اس بارے میں اصل حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ پیغمبروں کی دعوت کے جواب میں لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی تھی اور طنز و تمسخر کے تیر برسائے جاتے تھے' حتیٰ کہ جسمانی اذیت پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا تھا۔ الغرض اس راستے میں تو ہر قدم پر مخالفت اور ہر موڑ پر تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال میں پیغمبروں کو دوہری مشکل کا سامنا رہا ہے یعنی ایک طرف قرب و حضوری کی خصوصی کیفیت سے باہر آنے کا ملال اور دوسری طرف لوگوں کے رویے کے باعث دل پر تکدر کا بوجھ۔ کہاں وہ قربِ خاص کا کیف و سرور اور کہاں یہ مشقت بھری مصروفیات۔ روح اور طبیعت کا میلان تو ظاہر ہے اسی طرف ہوگا کہ وہی خلوت ہو' وہی حضوری ہو اور وہی کیف و سرور ہو۔ غالب نے اپنی زبان اور اپنے انداز میں محبوب کی قربت کے حوالے سے انسان کی اس کیفیت اور خواہش کی ترجمانی یوں کی ہے: ؎

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت' کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے!

اس صورتِ حال یا کیفیت کو علامہ اقبال کے بیان کردہ اس واقعہ کے حوالہ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال اپنے خطبات (چوتھے لیکچر) میں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دنیا و مافیہا سے بے خبر مراقبے کی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ اسی اثنا میں انہیں اقامت کی آواز سنائی دی۔ آپؒ فوراً نماز کے لیے کھڑے تو ہو گئے مگر جھنجھلا کر کہا: ''حضوری سے نکال کر دربانی میں کھڑا کر دیا!'' اب ظاہر ہے حضوری کی کیفیت میں تو اور ہی لذت تھی جبکہ نماز میں جماعت کا نظم ملحوظ رکھنے کی پابندی ہے اور ہر صورت میں امام کی اقتدا ضروری

ہے۔فرض کریں مقتدی کو تلاوت سننے میں لذت محسوس ہو رہی ہے اور وہ مزید سننا چاہتا ہے لیکن یہاں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ظاہر ہے جب امام قراءت ختم کر کے رکوع میں جائے گا تو اسے اس کی اقتدا کرنا ہوگی۔اگر وہ دیر تک سجدہ میں ہی پڑے رہنا چاہتا ہے تو بھی اسے اپنا سجدہ مختصر کر کے امام کی اقتدا میں سر اٹھانا ہوگا۔

اس تمہیدی وضاحت کو مدنظر رکھتے ہوئے اب آپ حضور ﷺ کی اس کیفیت کا تصور کیجیے جب حضور ﷺ رات کی تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔اس وقت آپؐ کی روح کیسی کیسی قربتوں اور رفعتوں سے آشنا ہوتی ہوگی اور آپؐ کے قلبِ مبارک پر کیسے کیسے انوار و تجلیات کی بارش ہوتی ہوگی۔پھر صبح کو جب آپؐ اہلِ مکہ کے درمیان جا کر ان سے شاعر' مجنون' کذاب (نعوذ باللہ) جیسے القابات سنتے ہوں گے اور ان کے تمسخر بھرے جملوں کا سامنا کرتے ہوں گے تو آپؐ اپنی طبیعت میں کیسا تکدر اور کیسی کوفت محسوس کرتے ہوں گے۔چنانچہ حضور ﷺ کے لیے اصل معاملہ یہ تھا کہ ''عروج'' (قربِ خاص) کی لذت کے بعد ''نزول'' کا مرحلہ آپؐ پر بہت شاق گزرتا تھا۔اور یہی وہ ''بوجھ'' تھا جو آپؐ کی کمر کو دہرا کیے دے رہا تھا۔البتہ رفتہ رفتہ آپؐ کا مزاج جب اس معمول کا خوگر ہو گیا تو اس بوجھ کے احساس میں کمی واقع ہوتی گئی۔پھر جب روز بروز اہل ایمان کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی تو دعوت و تحریک کی مصروفیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے تسکین کا سامان پیدا فرما دیا۔

بہرحال یہاں پر یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ فریضۂ رسالت کی انجام دہی کے لیے عروج اور نزول (ان کیفیات کے لیے صوفیاء کے ہاں ''سیر الی اللہ'' اور ''سیر عن اللہ'' کی اصطلاحات بھی معروف ہیں) کی دونوں کیفیات کا بیک وقت باہم متوازی چلنا ضروری ہے۔اس نکتہ لطیف کو مولانا روم نے بارش کی مثال سے بہت مؤثر انداز میں سمجھایا ہے۔مولانا کی بیان کردہ اس حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ سمندر سے بخارات کی شکل میں بالکل صاف اور پاکیزہ پانی فضا میں پہنچتا ہے۔بارش برستی ہے تو یہ صاف پانی فضا کی کدورتوں کو بھی صاف کرتا ہے' زمین کی گندگیوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر سمندر میں ڈال دیتا ہے اور اس کے بعد سمندر سے پھر بخارات بن کر صاف اور پاکیزہ حالت میں بارش کے لیے فضا میں پہنچ جاتا ہے۔اس مثال کو حضور ﷺ کی ذات پر منطبق کرتے ہوئے یوں سمجھیں کہ حضور ﷺ کو ''سیر الی اللہ'' (قیام اللیل اور خلوت کی مناجات وغیرہ) کے ذریعے روحانی ترفع حاصل ہوتا۔پھر جب آپؐ ''سیر عن اللہ'' کی صورت میں معاشرے کی طرف رجوع فرماتے تو آپؐ کی رحمت اور روحانیت لوگوں پر بارش کی طرح برستی اور راستے میں آنے والی تمام ظاہری و باطنی آلائشوں اور کدورتوں کو دھو ڈالتی۔اسی دوران لوگوں کی مخالفت اور گھٹیا حرکات کے باعث آپؐ کی ''روحانیت'' میں کچھ تکدر بھی پیدا ہوتا' جسے ''سیر الی اللہ'' کے اگلے مرحلے میں صاف کر دیا جاتا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ نتائج کے اعتبار سے تو دعوت و تبلیغ کی مصروفیات بھی ''سیر الی اللہ'' ہی کے زمرے میں آتی ہیں لیکن عملی طور پر اس کی کیفیت بظاہر ''سیر عن اللہ'' جیسی ہے۔جیسے نماز کی حالت میں انسان کا رخ اللہ کی طرف ہوتا ہے لیکن ایک داعی جب نماز سے فارغ ہو کر تبلیغ کے لیے نکلتا ہے تو بظاہر اس کی پشت اللہ کی طرف ہوتی ہے اور رُخ لوگوں کی طرف ہوتا ہے۔

آیت ۷،۸ ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ۝۷ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ۝۸﴾ ’’پھر جب آپ (فرائضِ نبوت سے) فارغ ہو جائیں تو اسی کام میں لگ جایئے۔ اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جایئے۔‘‘

تو اے نبی ﷺ! جب آپ اپنے فرضِ منصبی سے فارغ ہو جائیں اور اللہ کا دین غالب ہو جائے تو پھر آپ یکسو ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ نوٹ کیجیے! سورۃ النصر میں بھی حضور ﷺ کے لیے بالکل یہی پیغام ہے:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۝۲ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳﴾

یعنی جب غلبہ دین کے حوالے سے آپ کا مشن مکمل ہو جائے تو پھر ہمہ تن، ہمہ وقت آپ اللہ کی طرف متوجہ ہو جایئے گا اور تقرب الی اللہ کے لیے محنت شروع کر دیجیے گا۔ چنانچہ جونہی آپ کا مشن پایہ تکمیل کو پہنچا تو آپ نے فوراً محبوب کی طرف مراجعت کا فیصلہ کر لیا (اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى) کہ اے اللہ اب میں اپنے فرائض منصبی سے فارغ ہو گیا ہوں، اب مجھ میں مزید انتظار کا یارا نہیں! واضح رہے کہ انبیاء و رسل ﷩ کو اللہ تعالیٰ دنیا میں مزید رہنے یا کوچ کرنے سے متعلق اختیار عطا فرماتا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ آخری ایام میں ایک دن جب حضور ﷺ کے مرض میں افاقہ ہوا تو آپ مسجد میں تشریف لے گئے۔ منبر پر فروکش ہوئے اور خطبہ دیا۔ اس کے بعد منبر سے نیچے تشریف لائے۔ ظہر کی نماز پڑھائی اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور چند اہم نصیحتیں فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: ’’ایک بندے کو اللہ نے اختیار دیا کہ وہ یا تو دنیا کی چمک دمک اور زیب و زینت میں سے جو کچھ چاہے اللہ اسے دے دے یا اللہ کے پاس جو کچھ ہے اسے اختیار کر لے تو اس بندے نے اللہ کے پاس والی چیز کو اختیار کر لیا‘‘۔ یہ بات سن کر ابوبکر ؓ رونے لگے اور فرمایا: ’’ہم اپنے ماں باپ سمیت آپ پر قربان!‘‘ اس پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضور ﷺ کیا ارشاد فرما رہے ہیں اور اس پر ابوبکرؓ کیا کہہ رہے ہیں! لیکن چند دن بعد واضح ہوا کہ جس بندے کو اختیار دیا گیا تھا وہ خود رسول اللہ ﷺ تھے اور ابوبکر صدیقؓ صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ صاحبِ علم تھے۔

یہاں حضور ﷺ کے اس فرمان کا ذکر کرتے ہوئے میرے دل کی بات زبان پر آ گئی ہے —— وہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے مجھے حضور ﷺ کے قدموں میں پہنچا دیا تو میں حضور ﷺ سے شکوہ کرنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ حضور! آپ نے بہت جلدی کی ...... حضورؐ! مانا کہ ہجر و فراق کا ایک ایک لمحہ آپ کے لیے مشکل تھا...... مگر حضورؐ! جو لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوئے تھے وہ بھی تو آپ کے فیضانِ نظر کے محتاج تھے...... حضورؐ! اگر تھوڑا سا وقت ان کو بھی مل جاتا تو...... مہاجرینؓ و انصارؓ کی طرز پر ان کی تربیت بھی ہو جاتی......!!!

سُوْرَةُ التِّیْن

تمہیدی کلمات

سورۃ التین میں انسانی زندگی کے نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلو سے متعلق اہم حقائق بیان ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر اس سورت کا مضمون چونکہ انسان کی تخلیق سے متعلق ہے اس لیے اسے سمجھنے کے لیے نفس انسانی کی تخلیق کے بارے میں سورۃ الشمس کی آیت ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ⑧﴾ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی نفس کے بارے میں یہ حقیقت واضح فرما دی ہے کہ اس میں نیکی اور بدی کی تمیز الہام کر دی گئی ہے۔ اب اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ ایک ایسے انسان کا تصور کریں جس کی اخلاقی حس پوری طرح فعال و بیدار ہے۔ ایسا انسان جب ایک بگڑے ہوئے معاشرے کو دیکھتا ہے (بدقسمتی سے آج ہمارا معاشرہ اجتماعی بگاڑ کا مثالی نقشہ پیش کرتا ہے) تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید انسان بنیادی طور پر بہت گھٹیا اور گندی مخلوق ہے' اور یہ کہ شاید اس میں خیر نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے دورِ جدید کے تقریباً تمام ماہرین نفسیات اس نکتے پر متفق ہیں کہ انسان کے اندر حیوانی داعیات یعنی پیٹ اور شہوت کے تقاضوں اور حُبِ تفوق (urge to dominate) کے علاوہ اور کوئی حس یا داعیہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ صورت حال ایک حساس انسان کے لیے یقیناً بہت مایوس کن ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ سورت ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ انسان صرف شر کا پتلا اور گناہ کی پوٹلی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بہت اعلیٰ بلندیوں کو چھونے کی صلاحیت بھی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ① وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ② وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ③ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ
فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۡ④ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ⑤ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۭ⑥ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۭ⑦ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ
ع الْحٰكِمِيْنَ ۧ⑧

آیت ۱ ﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ①﴾ ''گواہ ہے انجیر اور گواہ ہے زیتون۔''

آیت ۲ ﴿وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ②﴾ ''اور گواہ ہے طورِ سینا۔''

آیت ۳ ﴿وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ③﴾ ''اور گواہ ہے یہ امن والا شہر۔''

اَلتِّیْن کے معنی انجیر کے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قومِ نوحؑ کے علاقے میں ایک بڑے پہاڑ کا نام بھی

جبل التِّین تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اسی پہاڑ کے دامن میں ساڑھے نو سو سال تک دعوت و تبلیغ کے فرائض سرانجام دیے۔ اسی طرح الزَّیْتُوْن سے مراد زیتون کا پھل اور درخت بھی ہے اور وہ پہاڑی بھی جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر تبلیغی خطبات دیا کرتے تھے۔ ان خطبات میں سے آپؑ کا ایک خطبہ ''پہاڑی کے وعظ'' (Sermon of the Mount) کے نام سے خاص طور پر مشہور ہے۔ تیسری قسم (وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ) کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے ہے۔ کوہِ طور پر آپؑ کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ اور امن والے شہر سے مکہ مکرمہ مراد ہے جہاں محمدؐ رسول اللہ ﷺ اس سورت کے نزول کے وقت دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔

گویا ان آیات میں جن مقامات کی قسمیں کھائی گئی ہیں ان میں سے ہر مقام کا تعلق ایک جلیل القدر شخصیت سے ہے۔ گویا ان شخصیات کو گواہ بنا کر یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ بنیادی طور پر انسان بہت بلند مرتبت اور صاحب عزت و عظمت مخلوق ہے۔ اگر کسی کو اس حقیقت کے بارے میں کوئی شک ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے بندے نوح علیہ السلام کی زندگی کے شب و روز کا تصور کرے۔ اس کے بندے عیسیٰ علیہ السلام کے کردار کا نقشہ ذہن میں لائے، موسیٰ علیہ السلام کی عظیم المرتبت شخصیت کو یاد کرے اور پھر سب سے بڑھ کر اس کے بندے محمد ﷺ کی بے مثال سیرت کا نمونہ دیکھے۔ یہ شخصیات، ان کے کردار اور ان کی سیرتیں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ:

آیت ۴ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴﴾ ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔''

ہم نے تو انسان کو اشرف المخلوقات کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کیا تھا: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝۷۰﴾ (بنی اسراء یل) ''اور ہم نے بڑی عزت بخشی ہے اولادِ آدمؑ کو اور ہم اٹھائے پھرتے ہیں انہیں خشکی اور سمندر میں اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور انہیں فضیلت دی اپنی بہت سی مخلوق پر، بہت بڑی فضیلت''۔ نسلِ انسانی کی عزت و تکریم کی انتہا یہ ہے کہ ان کے جدِ امجد کو ہم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق کیا (ص: ۷۵) اور مسجودِ ملائک بنایا۔

اگر تمہیں یہ دنیا ظالموں، بدکاروں اور گھٹیا انسانوں سے بھری نظر آتی ہے تو اللہ نے بھی تمہارے سامنے اپنے ایسے چار بندوں کی مثالیں پیش کر دی ہیں جو عظمت انسانی کے زندہ و جاوید ثبوت ہیں۔ کیا ان مثالوں کو دیکھنے کے بعد بھی کوئی عقل کا اندھا یہ دعویٰ کرے گا کہ انسان کے اندر خیر اور عظمت کا کوئی پہلو سرے سے موجود ہی نہیں؟ بہرحال اگر کوئی شخص عظمت کے ان میناروں کو دیکھ لینے کے بعد بھی انسانی عظمت کا قائل نہ ہو اور اس عظمت و اکرام کو پانے کے لیے اپنا رخ تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے تو یقیناً اس کا شمار نسل انسانی کے ان افراد میں ہوگا جو شرفِ انسانیت سے نیچے گر کر حیوانوں سے بھی بدتر ہو چکے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

آیت ۵ ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵﴾ ''پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین حالت کی طرف۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم المرتبت مخلوق (کی روح) کو اس کے جسد خاکی میں بٹھا کر نیچے دنیا میں بھیج

دیا۔لیکن واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر جہالت کی تاریکی میں نہیں بلکہ ہدایت کے اجالے میں بھیجا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے کامیابی اور ناکامی کے راستوں کا شعور بھی عطا کیا' اس کی فطرت میں نیکی و بدی کی تمیز بھی ودیعت کی اور وقتاً فوقتاً وہ براہِ راست ہدایات بھی بھیجتا رہا: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ (الحشر: ۱۹) کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا اور اس کی پاداش میں اللہ نے انہیں اپنے آپ سے ہی غافل کر دیا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اب اگر وہ اپنے شرفِ انسانی کو بھلا کر محض حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا رہے اور خود کو حیوان ہی سمجھتا رہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔

اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی سرشت (حیوانی وجود کے تقاضوں) کے اعتبار سے انسان میں کچھ کمزوریاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں' لیکن اپنی فطرت (روح) کے لحاظ سے یہ بہت اعلیٰ اور عظیم المرتبت مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح کو اس کے حیوانی جسم میں متمکن فرما کر اسے دنیا میں بھیجا تو اس کا ارفع واعلیٰ روحانی وجود اس کے حیوانی جسم میں قید ہو کر گویا اسفل (نچلی) مخلوق کی سطح پر آ گیا۔ چنانچہ دنیوی زندگی میں اس کے سامنے اصل ہدف یہ ہے کہ وہ اپنے شعور اور اللہ تعالیٰ کی فراہم کردہ ہدایت کے مطابق راستہ اختیار کرے' اس راستے کے تقاضے پورے کرنے کے لیے محنت کرے اور اسفل سطح سے اوپر اٹھ کر اپنی اصل عظمت اور حقیقی منزل کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اب اگلی آیت میں اس راستے کی نشاندہی اور مطلوبہ محنت کے طریقے کی وضاحت کی گئی ہے:

آیت ۶ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے''

اب مذکورہ پستی سے صرف وہی لوگ نکل پائیں گے جو اپنے شعور وحواس سے کام لیتے ہوئے اپنے خالق اور معبود کو پہچانیں گے یعنی اس پر ایمان لائیں گے اور پھر محنت کر کے اپنے کردار وعمل کو اس کی منشاء ومرضی کے مطابق ڈھالیں گے' یعنی اعمال صالحہ کا اہتمام کریں گے۔

﴿ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝﴾ ''تو ان کے لیے ایسا اجر ہوگا جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔''

آیت ۷ ﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝﴾ ''تو اس کے بعد کیا چیز تجھے آمادہ کرتی ہے جزاوسزا کے انکار پر؟''

تو اے جزاوسزا کے منکر انسان! جب تو خود دیکھ رہا ہے کہ دنیا میں تمام انسان ایک جیسے نہیں ہیں' ان میں کچھ بہت اعلیٰ سیرت وکردار کے مالک ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو انسانیت کے ماتھے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں' تو اس صورت حال میں کیا عقل اور انصاف کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اچھوں کو ان کی اچھائی اور محنت کا پھل ملے اور بروں کو ان کی برائی اور نافرمانی کی سزا دی جائے؟ یہ ایسی سیدھی سادی بات ہے جو عام ذہنی سطح کا ایک انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ تو یہ سب کچھ دیکھنے سننے اور سمجھنے کے بعد بھی آخر وہ کون سی منطق ہے جس کے تحت تم جزاو

سزا کے انکار پر جمے ہوئے ہو؟

آیت ۸ ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ⑧﴾ ''کیا اللہ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟''

دنیا میں تم لوگ چھوٹے چھوٹے حاکموں کو دیکھتے ہو کہ وہ اپنے غداروں اور باغیوں کو عبرتناک سزا دیتے ہیں اور اپنے وفاداروں کو انعام واکرام سے نوازتے ہیں۔ کیا دنیا میں تم نے کوئی ایسا حاکم بھی دیکھا ہے جو اپنے باغیوں اور وفاداروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے؟ اگر دنیا میں محدود اختیار کا مالک کوئی حاکم ایسا نہیں کرتا تو وہ اللہ عزوجل اپنے فرمانبردار بندوں اور نافرمانوں کو کیسے برابر کر دے گا جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے؟ کیا تم اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین نہیں مانتے ہو؟

مسند احمد‘ سنن الترمذی‘ سنن ابی داؤد اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی سورۃ التین پڑھے اور اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ پر پہنچے تو کہے: بلٰی وانا علٰی ذٰلک من الشاھدین ''کیوں نہیں! اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں''۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آیت پڑھتے تو فرماتے: سُبْحَانَكَ فَبَلٰى!

سُورَةُ العَلَق

تمہیدی کلمات

سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے بارے میں تمام مفسرین متفق ہیں کہ غارِ حرا میں حضورﷺ پر جو پہلی وحی آئی تھی وہ ان آیات پر مشتمل تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورﷺ پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی۔ رات کو آپؐ جو خواب دیکھتے دن کو اس کی تعبیر ہو بہو وہی سامنے آجاتی۔ پھر آپؐ خلوت گزینی کی طرف مائل ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آپؐ کئی کئی راتوں تک غارِ حرا میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ آپؓ فرماتی ہیں فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ یعنی غارِ حرا میں آپؐ عبادت کیا کرتے تھے۔ غارِ حرا کی خلوت میں آپؐ کی عبادت کی نوعیت کیا تھی' اس بارے میں تمام شارحین حدیث کا اجماع ہے کہ وہاں پر آپؐ اپنا وقت غور وفکر اور سوچ بچار (التفکّر والاعتبار) میں گزارتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن آپؐ غارِ حرا میں مصروفِ ذکر وفکر تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور آپؐ سے کہا: اِقْرَاْ کہ پڑھئے۔ آپؐ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپﷺ کو سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر پڑھنے کو کہا۔ آپؐ نے پھر فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔ حضرت جبرائیلؑ نے پھر وہی عمل دہرایا اور آپﷺ نے پھر وہی جواب دیا۔ حتیٰ کہ جب حضرت جبرائیلؑ نے تیسری مرتبہ آپؐ کو بھینچنے کے بعد فرمایا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ① ......الخ﴾ تو مذکورہ آیات آپؐ کی زبانِ مبارک پر جاری ہو گئیں۔ اس حوالے سے مجھے اس روایت سے اتفاق ہے کہ اس وحی کے نزول کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام آپؐ کے پاس سونے کی ایک تختی لے کر آئے تھے جس پر یہ آیات لکھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے اگر حضرت جبرائیلؑ نے آپؐ کو زبانی پڑھانا ہوتا تو آپؐ یقیناً مذکورہ جواب نہ دیتے۔ یعنی ضرور آپؐ کے سامنے کوئی ایسی چیز آئی تھی جسے دیکھ کر پڑھنا تھا۔ تبھی آپﷺ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔

اس وحی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس موقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام آپﷺ کے پاس اپنی اصلی مَلکی شکل میں آئے تھے۔ اس وقت اگرچہ آپؐ نیم بیداری اور نیم خوابیدگی کی کیفیت میں تھے لیکن آپؐ نے حضرت جبرائیل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک طویل وقفے (فترتِ وحی) کے بعد چوتھی وحی کے نزول کے موقع پر حضرت جبرائیلؑ آپؐ کو افق پر نظر آئے (اس واقعہ کی تفصیل سورۃ المدثر کے تمہیدی کلمات میں بیان ہو چکی ہے) تو آپؐ نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو قبل ازیں میرے پاس غارِ حراء میں آیا تھا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۝ۚ۱ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۝ۚ۲ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۝ۙ۳ الَّذِیۡ
عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝ۙ۴ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ۝ؕ۵ کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۝ۙ۶ اَنۡ رَّاٰہُ
اسۡتَغۡنٰی ۝ؕ۷ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی ۝ؕ۸ اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡہٰی ۝ۙ۹ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی ۝ؕ۱۰ اَرَءَیۡتَ اِنۡ
کَانَ عَلَی الۡہُدٰۤی ۝ۙ۱۱ اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰی ۝ؕ۱۲ اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ۝ؕ۱۳ اَلَمۡ یَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰہَ
یَرٰی ۝ؕ۱۴ کَلَّا لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ ۬ۙ لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِیَۃِ ۝ۙ۱۵ نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ ۝ۚ۱۶ فَلۡیَدۡعُ
نَادِیَہٗ ۝ۙ۱۷ سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَۃَ ۝ۙ۱۸ کَلَّا ؕ لَا تُطِعۡہُ وَ اسۡجُدۡ وَ اقۡتَرِبۡ ۝٪۱۹ السجدۃ ع ۱۹

آیت ۱ ﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۝۱﴾ ''پڑھیے اپنے اُس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔''

آیت ۲ ﴿خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۝۲﴾ ''انسان کو پیدا کیا ہے اُس جونک کی طرح کی چیز سے جو رحم مادر میں چمٹ گئی تھی۔''

آیت ۳ ﴿اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۝۳﴾ ''پڑھیے اور آپ کا ربّ بہت کریم ہے۔''

آیت ۴ ﴿الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝۴﴾ ''جس نے تعلیم دی ہے قلم کے ساتھ۔''

گویا عام انسانی تعلیم کا ذریعہ قلم ہے' جبکہ حضور ﷺ کی تعلیم کے لیے فرشتہ مقرر ہوا۔

آیت ۵ ﴿عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ۝۵﴾ ''اور انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

پہلی وحی ان پانچ آیات پر مشتمل تھی۔ اس وحی میں حضور ﷺ کو تبلیغ و انذار سے متعلق کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ البتہ اس وحی کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس سے آپؐ کی نبوت کا ظہور ہوا (ہر نبی اگرچہ پیدائشی طور پر ہی نبی ہوتا ہے لیکن اس کی نبوت کا باقاعدہ ظہور پہلی وحی کے وقت ہوتا ہے)۔ تبلیغ کا باقاعدہ حکم آپؐ کو سورۃ المدثر کی ان آیات میں دیا گیا: ﴿یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۝۲ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۝۳﴾ کہ اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ) کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو۔ یعنی اے نبی (ﷺ) اب آپ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیجیے۔ سورۃ العلق اور سورۃ المدثر کے مابین اس لحاظ سے گہری مشابہت پائی جاتی ہے کہ سورۃ المدثر کی طرح یہ سورت بھی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پھر جس طرح سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات میں حضور ﷺ سے خطاب کے بعد تین آیات میں قیامت کا ذکر آیا ہے' بالکل اسی طرح اس سورت میں بھی پہلی پانچ آیات میں حضور ﷺ سے خطاب ہے اور اس کے بعد درج ذیل تین آیات میں آخرت کا فلسفہ بیان ہوا ہے۔

آیت ۶ ﴿کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۝۶﴾ ''کوئی نہیں! انسان سرکشی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے۔''

انسان سرکشی اور ظلم و زیادتی پر کیوں اتر آتا ہے؟ اس کی وجہ اگلی آیت میں بتائی گئی:

آیت ۷ ﴿اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ؁۷﴾ ''اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔''
وہ دیکھتا ہے کہ اس پر کوئی پکڑ نہیں۔ دنیا میں نہ تو ظالم کو اس کے ظلم کی قرار واقعی سزا ملتی ہے اور نہ ہی مظلوم کی کماحقہ داد رسی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس دنیا کا نظام محض طبعی قوانین و ضوابط (physical laws) کے مطابق چل رہا ہے اور یہ کہ یہاں اخلاقی قوانین (moral laws) کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انسان کی روزمرہ زندگی کا تجربہ بھی اسے یہی بتاتا ہے کہ زہر کھانے سے تو آدمی ہلاک ہو جاتا ہے لیکن حرام کھانے سے اسے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب معاشرے کے عام آدمی کو نیکی' انصاف' دیانت داری جیسے الفاظ عملی طور پر بے معنی اور بے وقعت نظر آتے ہیں تو وہ سرکشی اور مَن مرضی کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ اب اگلی آیت میں انسان کی اس سرکشی اور بغاوت کا علاج بتایا جا رہا ہے۔ اس کا علاج اس یاد دہانی میں ہے کہ:

آیت ۸ ﴿اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی ؁۸﴾ ''یقیناً تجھے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''
گویا انسان کو راہِ راست پر رکھنے کا جو مؤثر ترین علاج ہے وہ ہے عقیدۂ آخرت پر پختہ یقین۔ یعنی یہ یقین کہ ایک دن اسے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے اور وہ عدالت بھی ایسی ہے جہاں ذرہ برابر بھی کوئی چیز چھپائی نہیں جا سکے گی: ﴿فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ؁۷ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ؁۸﴾ (الزلزال) ''جس کسی نے ذرّے کے ہم وزن نیکی کمائی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس کسی نے ذرّے کے ہم وزن برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا''۔ گویا یہ عقیدۂ آخرت پر پختہ یقین اور قیامت کے دن کی پیشی کا خوف ہی ہے جو انسان کے اندر خود احتسابی کا احساس اُجاگر کرتا ہے۔ یہی یقین اور خوف اسے خلوت و جلوت میں' اندھیرے اُجالے میں اور ہر جگہ' ہر حال میں غلط روی اور ظلم و تعدی کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ ورنہ انسان کی سرشت ایسی ہے کہ جس مفاد تک اس کا ہاتھ پہنچتا ہو اسے سمیٹنے کے لیے وہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود کی پروا نہیں کرتا۔

اب اگلی آیت سے اس سورت کا تیسرا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ سورۃ المدثر کے ساتھ اس سورت کے مضامین کی مشابہت کا انداز ملاحظہ ہو کہ سورۃ المدثر کے تیسرے حصے میں ولید بن مغیرہ کے کردار کی جھلک دکھائی گئی ہے' جبکہ یہاں اس کے مقابل ابوجہل کے طرزِ عمل کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۹ ﴿اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡهٰی ؁۹﴾ ''کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو روکتا ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی ؁۱۰﴾ ''(ہمارے) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔''
یہ اشارہ ہے ابوجہل کی ان جسارت آمیز حرکات کی طرف جو وہ حضور ﷺ کو نماز سے روکنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل نے آپؐ کو دیکھا تو اونٹ کی اوجھڑی منگوا کر عین سجدے کی حالت میں آپؐ کی پشت مبارک پر رکھوا دی۔ حضرت فاطمہ ؓ ابھی بچی تھیں' ان کو پتا چلا تو آپؓ گھر سے بھاگم بھاگ حرم میں پہنچیں اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس غلاظت کو آپؐ کے اوپر سے ہٹایا۔ اسی طرح ایک اور موقع پر ابوجہل نے آپؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال

کر اس قدر زور سے مروڑا کہ آپؐ کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضور ﷺ کے سفر طائف سے واپسی کے زمانے میں بھی پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل روایات میں یوں آتی ہے کہ ابوجہل نے لات اور عزیٰ کی قسم کھا کر کہا تھا کہ اگر اس نے پھر محمد (ﷺ) کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا تو ان کی گردن روند ڈالوں گا اور ان کا منہ خاک آلود کر دوں گا۔ ایک دن اُس نے آپ ﷺ کو حرم میں نماز پڑھتے دیکھا تو غصے میں آپ کو ڈانٹتے ہوئے آپؐ کی طرف بڑھا تا کہ اپنی قسم پوری کرے مگر پھر یکدم دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہوا؟ کیوں پیچھے ہٹ آئے؟ کہنے لگا کہ آگے بڑھنے پر مجھے اپنے اور محمد (ﷺ) کے درمیان حائل آگ سے بھری ہوئی ایک خندق اور ایک پروں والی کوئی مخلوق دکھائی دی جو میری تکہ بوٹی کرنے کو تیار تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو فرشتے اس کے چیتھڑے اڑا دیتے۔ یہاں یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ پہلے دونوں واقعات کے حوالے سے ابوجہل کو ایسے کسی غیر معمولی یا غیر مرئی ردِعمل کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میرے نزدیک اس کی توجیہہ یہ ہے کہ پہلے دونوں واقعات کے زمانے میں حضور ﷺ کی پشت پناہی کے لیے دنیوی اسباب کے طور پر جناب ابوطالب موجود تھے' جبکہ تیسرا واقعہ اس زمانے میں پیش آیا جب یہ دنیوی سہارا بھی موجود نہ رہا اور اب حضور ﷺ کی حفاظت براہِ راست اللہ تعالیٰ خود فرما رہا تھا۔ اس لیے اس وقت غیبی مدد کے ذریعے حضور ﷺ کی حفاظت کو یقینی بنایا گیا۔ آیات زیر مطالعہ میں خاص طور پر اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

آیت ۱۱ ﴿اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡهُدٰۤی ⑪﴾ ''کیا تم نے غور کیا اگر وہ شخص ہدایت پر ہوتا؟''

آیت ۱۲ ﴿اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰی ⑫﴾ ''یا وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا!''

جیسا کہ سورۃ اللیل کی آیت ۱۰ کے ضمن میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ ابوجہل کے کردار میں بہت سی مثبت خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ مثلاً وہ مال خرچ کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صاف گو بھی تھا۔ اپنے ایمان نہ لانے کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے بالکل کھری اور سچی بات کہی تھی کہ میں محمد (ﷺ) کو جھوٹا نہیں سمجھتا لیکن ہمارے خاندان نے چونکہ غرباء کو کھانے کھلانے اور حاجیوں کی خدمت کرنے میں ہمیشہ بنوہاشم کا مقابلہ کیا ہے' اس لیے اب میں محمد (ﷺ) کی نبوت کی شہادت دے کر اپنے حریف خاندان کی بڑائی تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ جری اور بہادر ایسا تھا کہ نزع کے وقت بھی اس نے ہار نہیں مانی اور میدانِ بدر میں اپنا سر قلم کرنے والے شخص کو مخاطب کر کے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ اس کی گردن کو ذرا نیچے سے کاٹا جائے تا کہ سر نیزے پر چڑھے تو اونچا نظر آئے۔ بہرحال شخصی اعتبار سے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح بہادر' نڈر' بے باک اور صاف گو انسان تھا۔ اگر وہ ایمان لے آتا تو یقیناً حضرت عمرؓ ہی کی طرح اعلیٰ پائے کا مسلمان ہوتا۔ لیکن جب وہ ﴿صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ⑥﴾ (اللیل) یعنی تصدیقِ حق کی گھاٹی عبور کرنے میں ناکام رہا تو اس کے کردار کی بہت سی مثبت خصوصیات بھی اس کے کسی کام نہ آسکیں۔

آیت ۱۳ ﴿اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ⑬﴾ ''کیا تم نے سوچا کہ اس نے جو جھٹلایا ہے اور منہ موڑ لیا ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿اَلَمۡ یَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ⑭﴾ ''کیا یہ جانتا نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے!''

آیت ۱۵ ﴿كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ﴾ ''ہرگز نہیں! اگر یہ باز نہ آیا''
﴿لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾﴾ ''تو ہم گھسیٹیں گے اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر۔''
آیت ۱۶ ﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾﴾ ''وہ پیشانی کہ جو خطا کار ہے' جھوٹی ہے۔''
آیت ۱۷ ﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٧﴾﴾ ''تو وہ بلا لے اپنی مجلس کے لوگوں کو۔''
آیت ۱۸ ﴿سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾﴾ ''ہم بھی بلا لیں گے جہنم کے فرشتوں کو۔''
آیت ۱۹ ﴿كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿١٩﴾﴾ ''کوئی بات نہیں! (اے نبی ﷺ) آپ اس کی بات نہ مانیے' آپ سجدہ کیجیے اور (اللہ سے اور) قریب ہو جائیے!''

آپ ﷺ اس جھوٹے' غلط کار شخص کی ایک نہ سنیے۔ یہ اگر آپ کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے تو اس کی پروانہ کیجیے۔ آپ اپنے پروردگار کی جناب میں سجدے کرتے رہیے اور کثرتِ سجود سے اس کا قرب حاصل کرتے رہیے۔

سُوْرَةُ القَدْر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ
شَهْرٍ ۝۳ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ
الْفَجْرِ ۝۵ ع

آیت ۱ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ ’’یقیناً ہم نے اتارا ہے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں۔‘‘ ’’اَنْزَلْنٰهُ‘‘ کی ضمیر مفعولی کا مرجع بالاتفاق قرآن مجید ہی ہے۔ نوٹ کیجیے! ان سورتوں کے مضامین کے اندر ایک ربط پایا جاتا ہے‘ یعنی پہلی وحی (سورۃ العلق) کے فوراً بعد بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے اس کلام کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ہے۔ قدر کا معنی تقدیر اور قسمت بھی ہے اور عزت و منزلت بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو اس رات میں اتارا ہے جو قدر و منزلت کے اعتبار سے بے مثل رات ہے‘ یا اس رات میں اتارا ہے جو تقدیر ساز ہے۔ سورۃ الدخان میں اس رات کا ذکر لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ کے نام سے آیا ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (آیت ۳) ’’یقیناً ہم نے نازل کیا ہے اس (قرآن) کو ایک مبارک رات میں‘‘۔ یہ کونسی رات ہے؟ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ))[1] ’’لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو‘‘۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ ستائیسویں رمضان کی شب ہی لیلۃ القدر ہے۔ لیکن جیسا کہ سورۃ الفجر کی آیت ۳ کے ضمن میں بھی وضاحت کی جا چکی ہے‘ قمری کیلنڈر کی طاق اور جفت راتوں کی گنتی دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً آج ہمارے ہاں جو طاق رات ہے سعودی عرب میں ممکن ہے وہ جفت رات ہو۔ اس لیے لیلۃ القدر کو تلاش کرنے کا محتاط طریقہ یہی ہے کہ اسے رمضان کے آخری عشرے کی تمام راتوں (جفت اور طاق دونوں) میں تلاش کیا جائے۔ اور اگر واقعی ستائیسویں رمضان کی شب ہی لیلۃ القدر ہے تو اس بارے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پھر یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی ستائیسویں شب ہے۔ واللہ اعلم!

اس رات میں قرآن نازل کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس رات کو پورا قرآن مجید

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب صلاۃ التراویح‘ باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الاواخر۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الصیام‘ باب فضل لیلۃ القدر ......

لوحِ محفوظ سے حاملین وحی فرشتوں کے سپرد کر دیا گیا اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ۲۳ سال کے دوران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ ﷺ پر نازل کرتے رہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا اس رات سے ہوئی۔

آیت ۲ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲﴾ ''اور تم کیا جانتے ہو کہ لیلۃ القدر کیا ہے!''

آیت ۳ ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳﴾ ''لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''

یہ بہتری اور افضلیت کس اعتبار سے ہے؟ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس رات کا عملِ خیر ہزار مہینوں کے عملِ خیر سے بہتر ہے جس میں لیلۃ القدر نہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))(۱) ''جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ سے اجر کی امید میں کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے''۔ اس رات کی افضلیت کے ضمن میں ایک رائے یہ ہے کہ اس ایک رات میں اتنی خیر تقسیم کی جاتی ہے جتنی ایک ہزار مہینہ میں بھی تقسیم نہیں کی جاتی۔ اس رات کی افضلیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کی اصلاح اور فلاح کے لیے جو کام (نزولِ قرآن) اس ایک رات میں ہوا، خیر اور بھلائی کا اتنا بڑا کام کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانے میں بھی نہ ہوا تھا۔ واضح رہے کہ اہل عرب بڑی کثیر تعداد کا تصور دلانے کے لیے اَلْف (ہزار) کا لفظ بولتے تھے۔

آیت ۴ ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴﴾ ''(اس رات میں) اُترتے ہیں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے۔''

روح سے مراد یہاں روح الامین یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت جبرائیلؑ فرشتوں کے سردار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں خصوصی مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ جیسا کہ سورۃ التکویر میں فرمایا گیا: ﴿ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝۲۰ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝۲۱﴾ ''وہ (جبرائیلؑ) بہت قوت والا ہے، صاحبِ عرش کے قرب میں اس کا ٹھکانہ ہے۔ اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہاں وہ امانت دار بھی ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں حضرت جبرائیلؑ اور فرشتوں کا ذکر آتا ہے تو انؑ (حضرت جبرائیلؑ) کا ذکر عام طور پر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

لیلۃ القدر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اور فرشتوں کا خصوصی نزول دراصل اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کے حوالے سے ہوتا ہے۔ سورۃ الدخان میں لیلۃ القدر یا لیلۃ مبارکہ کے بارے میں ایک خصوصی بات یہ بتائی گئی ہے: ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴﴾ کہ اس رات میں تمام پُرحکمت امور کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔ سورۃ الدخان کے مطالعے کے دوران اس آیت کے تحت اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ لیلۃ القدر اللہ تعالیٰ کی تکوینی سلطنت سے متعلق فیصلوں کے لیے سالانہ بجٹ سیشن کا درجہ رکھتی ہے۔ اس رات میں اگلے سال کے لیے تمام اہم امور کے فیصلے کر کے تعمیل و تنفیذ کی غرض سے فرشتوں کے حوالے کر دیے جاتے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا ونیۃ۔ وصحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح۔

ہیں۔ چنانچہ فرشتے حضرت جبرائیلؑ کی قیادت میں ان احکامات پر عمل درآمد کے لیے پوری زمین میں پھیل جاتے ہیں۔ نظامِ کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ کی اس ''تدبیرِ امر'' کا ذکر سورۃ السجدۃ کی اس آیت میں بھی آیا ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ﴾ (آیت ۵) ''وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف' پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف''۔ گویا اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کے بعد متعلقہ فرشتے تکمیلی رپورٹیں بھی بھیجتے ہیں۔

آیت ۵ ﴿سَلٰمٌ ۛ﴾ ''سراسر سلامتی ہے۔''

اس سلامتی کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً اس رات میں لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور عبادت کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

﴿هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝﴾ ''یہ (رات) رہتی ہے طلوعِ فجر تک۔''

سُوْرَةُ الْبَيِّنَة

تمہیدی کلمات

سورۃ البیّنۃ کو قرآن مجید کے اکثر نسخوں میں ''مدنیہ'' لکھا گیا ہے۔ مفسرین کے نزدیک اس کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ البتہ حضرت عائشہ ؓ کا قول ہے کہ یہ مکی سورت ہے۔ قرآن مجید کی ترتیب مصحف میں اس کو سورۃ العلق اور سورۃ القدر کے بعد رکھنا نظمِ قرآن کے اعتبار سے بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ سورۃ العلق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۃ القدر میں بتایا گیا ہے کہ اس قرآن کا نزول کب ہوا اور اس سورت میں واضح کیا گیا ہے کہ اس قرآن کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝١
رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝٢ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝٣ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝٤ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ
الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝٥ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝٦ اِنَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝٧ جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ
عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ
ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝٨ ع

آیت ۱ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝١﴾
''نہیں تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اہل کتاب میں سے اور مشرکین میں سے الگ ہونے والے (یا باز آنے والے) جب تک کہ ان کے پاس البیّنہ نہ آ جاتی۔''

ظاہر ہے وہ لوگ سیدھے راستے سے بھٹک کر گمراہی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اب جب تک ان کے سامنے کوئی بین (واضح) دلیل نہ آ جاتی جس سے انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ گمراہ ہیں یا انہیں بہت واضح انداز میں بتا نہ دیا جاتا کہ وہ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ راہِ ہدایت نہیں' اس وقت تک انہیں رشد و ہدایت کی راہ پر چلنے والوں سے

علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا مفہوم یوں بھی ہو سکتا ہے کہ جب تک ان لوگوں کے پاس البینہ نہ آ جاتی وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے ـــــ مُنْفَكِّيْنَ: اِنْفِكاك (فَكّ سے بابِ اِنْفعال) سے ہے' جس کا مفہوم ہے کسی چیز کا کسی چیز سے الگ ہو جانا' جدا ہو جانا۔

وہ البیّنہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت اگلی آیات میں کی جا رہی ہے:

آیت ۲ ﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝﴾ ''ایک رسول (ﷺ) اللہ کی جانب سے جو تلاوت کرتے ہیں پاکیزہ اوراق کی۔''

ان اوراق میں کیا ہے؟

آیت ۳ ﴿فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝﴾ ''ان میں بڑے مضبوط احکام (تحریر) ہیں۔''

لفظ ''کتاب'' کے بارے میں قبل ازیں بھی متعدد بار واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ عام طور پر احکامِ شریعت کے لیے آتا ہے۔ تو پتا چلا کہ اللہ کے رسول ﷺ اور اللہ کی کتاب کا اکٹھا نام البیّنہ ہے۔ یہ وہی بات ہے جو قبل ازیں ہم لفظ ''ذِكْرًا'' کے حوالے سے سورۃ الطلاق میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ وہاں اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ ......﴾ ''اللہ نے تمہاری طرف ذکر نازل کر دیا ہے۔ ایک رسولؐ جو اللہ کی آیاتِ بینات تم لوگوں کو پڑھ کر سنا رہا ہے......'' گویا تعبیر اور تعریف (definition) کے اعتبار سے اَلْبَیِّنَہ اور ذِکْرًا ہم معنی اصطلاحات ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے واضح احکام کتاب کی صورت میں نازل کیے اور اس کتاب کی تفہیم و تعلیم کے لیے رسول ﷺ کو بھی مبعوث فرمایا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے وہ تمام احکام اس انداز میں کھول کر بیان فرما دیے کہ اب اس کے بعد ان مخاطبین کے پاس کفر و شرک کے ساتھ چمٹے رہنے اور ضلالت و گمراہی سے باز نہ آنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

آیت ۴ ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝﴾ ''اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انہوں نے تفرقہ نہیں کیا تھا مگر اس کے بعد جبکہ ان کے پاس البیّنہ آ چکی تھی۔''

یعنی اسی طرح اس سے پہلے بنی اسرائیل کے پاس بھی البیّنہ (اللہ کا رسولؐ اور اس کی کتاب) آئی تھی' مگر وہ لوگ اس کے بعد بھی راہِ راست پر آنے کے بجائے تفرقہ بازی میں پڑ گئے۔ ان میں سے کچھ لوگ یہودی بن گئے اور کچھ نصاریٰ۔ بعد میں نصاریٰ مزید کئی فرقوں میں بٹتے چلے گئے۔ چنانچہ البیّنہ کے آ جانے کے بعد بھی راہِ راست پر نہ آنے کے جرم کی پاداش میں وہ لوگ شدید ترین سزا کے مستحق ہو چکے ہیں۔

آیت ۵ ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ﴾ ''اور انہیں حکم نہیں ہوا تھا مگر یہ کہ وہ بندگی کریں اللہ کی' اپنی اطاعت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے' بالکل یکسو ہو کر''

یہ حکم گویا پورے دین کا خلاصہ ہے جو اس سے پہلے سورۃ الزمر (آیات ۲' ۳' ۱۱ اور ۱۴) میں بہت تاکید اور شد و مد کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی پوری اطاعت کے ساتھ کریں۔ یہ نہیں کہ نماز

بھی پڑھے جا رہے ہیں اور حرام خوریوں سے بھی باز نہیں آتے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اپنے نفس کی اطاعت بھی جاری ہے۔ ایسی آیات دراصل ہمیں خبردار کرتی ہیں کہ جزوی بندگی اور ساجھے کی اطاعت اللہ تعالیٰ کو ہرگز قابل قبول نہیں۔ اور یہ کہ اگر ہم اس جرم کا ارتکاب کریں گے تو ہم بھی اسی وعید کے مستحق ہوں گے جو اس حوالے سے بنی اسرائیل کو سنائی گئی تھی۔ ملاحظہ ہوں اس وعید کے یہ الفاظ: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ﴾ (البقرۃ:۸۵) ''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟ تو نہیں ہے کوئی سزا اس کی جو یہ حرکت کرے تم میں سے سوائے ذلت و رسوائی کے دنیا کی زندگی میں' اور قیامت کے روز وہ لوٹا دیے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف''۔ بلکہ اس حوالے سے اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اس آیت میں دنیا کے جس عذاب کا ذکر ہے ﴿خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ وہ اس وقت بحیثیت اُمت ہم پر مسلط ہو بھی چکا ہے۔ مقامِ عبرت ہے! آج مسلمانوں کی آبادی دو ارب سے بھی زیادہ ہے' دنیا کے بہترین خطے اور بہترین وسائل ان کے قبضے میں ہیں' مگر اس کے باوجود عزت نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں۔ بین الاقوامی معاملات کے حوالے سے مسلمان حکمرانوں کی حالت یہ ہے کہ ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی؟'' یعنی عالمی معاملات میں کوئی ان کی رائے لینا بھی گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ مسلمان ملکوں کی اپنی پالیسیوں کا اختیار بھی ان کے پاس نہیں۔ ان کے سالانہ بجٹ بھی کہیں اور سے بن کر آتے ہیں۔

بہرحال اس آیت کے حکم کا مدعا یہی ہے کہ جسے اللہ کا ''بندہ'' بننا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اس کے قانون کے تابع کر کے اس کے حضور پیش ہو۔ ''قیصر کا حصہ قیصر کو دو اور خدا کا حصہ خدا کو دو'' والا قانون اللہ تعالیٰ کو قابل قبول نہیں۔ چنانچہ ایمان کے دعوے داروں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے پوری یکسوئی کے ساتھ اس کی عبادت کریں۔

﴿وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝﴾ ''اور (یہ کہ) نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں' اور یہی ہے سیدھا (اور سچا) دین۔''

گویا ان الفاظ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ''بندگی'' اور شے ہے' جبکہ نماز اور زکوٰۃ اس کے علاوہ ہے۔ اس نکتے کو یوں سمجھیں کہ بندگی تو پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دینے کا نام ہے۔ بقول شیخ سعدی:

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی!

جبکہ نماز' زکوٰۃ (عبادات) وغیرہ اس بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لوازمات ہیں' تاکہ ان کے ذریعے سے بندہ اپنے رب کو مسلسل یاد کرتا رہے اور اس کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہر دم' ہر گھڑی تازہ رہے۔ حفیظ جالندھری کے اس خوبصورت شعر میں یہی فلسفہ بیان ہوا ہے:

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

گویا ہمارے ''نقوشِ بندگی'' نفس پرستی کی کثافتوں اور کدورتوں کے گرد و غبار سے اکثر دھندلا جاتے ہیں۔

چنانچہ انہیں تازہ رکھنے کے لیے نماز' روزہ' زکوٰۃ اور دیگر مراسم عبودیت کے ذریعے ہمیں اللہ تعالیٰ کے حضور مسلسل حاضری دینے کی ضرورت رہتی ہے۔ جیسے ایک بندۂ مسلمان اپنی نماز پنجگانہ کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا یہ عہد تازہ کرتا ہے: ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۝﴾ کہ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں (اور کرتے رہیں گے) اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں (اور مانگتے رہیں گے)۔ تصور کیجیے اگر ایک بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ عہد پورے ارادے اور شعور کے ساتھ روزانہ بار بار دہرائے گا تو اس سے اس کے تعلق مع اللہ کے چمن میں تروتازگی کی کیسی کیسی بہاروں کا سماں بندھا رہے گا۔

آیت ۶ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ﴾ ''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی' خواہ وہ اہل کتاب میں سے تھے' خواہ مشرکین میں سے''

﴿فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ؕ﴾ ''وہ ہوں گے جہنم کی آگ میں' اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

﴿اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ ۝۶﴾ ''یہی لوگ بدترین خلائق ہیں۔''

آیت ۷ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ﴾ ''(اس کے برعکس) وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے''

﴿اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ ۝۷﴾ ''یہی بہترین خلائق ہیں۔''

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

آیت ۸ ﴿جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ؕ﴾ ''ان کا بدلہ ہوگا ان کے رب کے پاس دائمی قیام کے باغات کی صورت میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' ان میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

یہاں پر ضمنی طور پر یہ علمی نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید میں دو مقامات ایسے ہیں جہاں اہل جنت اور اہل جہنم کے فوری تقابل (simultaneous contrast) میں اہل جنت کے لیے ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا﴾ جبکہ اہل جہنم کے لیے صرف ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْھَا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں ایک مقام تو یہی ہے۔ یعنی اس سورت کی زیر مطالعہ آیت میں اہل جنت کے لیے ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا﴾ کے الفاظ آئے ہیں' جبکہ اس سے پہلے آیت ۶ میں اہلِ جہنم کا ذکر کرتے ہوئے ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْھَا﴾ کے الفاظ تک اکتفاء فرمایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ التغابن کی آیت ۹ اور آیت ۱۰ میں بھی اہل جنت اور اہل جہنم کے تقابل کے حوالے سے یہی فرق دیکھنے میں آتا ہے۔ ان دونوں مقامات میں مذکورہ فرق کی بنیاد پر اُمت مسلمہ کی دو بہت بڑی علمی شخصیات نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جنت اور اس کی نعمتیں تو ابدی ہیں' لیکن جہنم ابدی نہیں ہے اور یہ کہ کبھی ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اہلِ جہنم میں سے خیر کے حامل آخری عناصر کو نکال کر باقی لوگوں کو مدتِ مدید تک مبتلائے عذاب رکھنے کے بعد بالآخر اس میں جلا کر معدوم کر دیا جائے گا اور اس کے بعد جہنم کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔ اس موقف کی حامل دو

شخصیات میں ایک تو شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ ہیں جن کا شمار چوٹی کے صوفیاء میں ہوتا ہے اور دوسری شخصیت امام ابن تیمیہؒ کی ہے جو سلفی حضرات کے نزدیک اسلامی دنیا کے سب سے بڑے امام اور عالم ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کا اس نکتے پر محی الدین ابن عربیؒ سے متفق ہو جانا یقیناً ایک اہم بات اور ''متفق گردید رائے بوعلی بارائے من'' والا معاملہ ہے' کیونکہ مجموعی طور پر وہ محی الدین ابن عربیؒ کے خیالات ونظریات سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ جہنم کے ابدی نہ ہونے سے متعلق میں نے یہاں مذکورہ دو شخصیات کی آراء کا ذکر محض ایک علمی نکتے کے طور پر کیا ہے' عام اہل سنت کا عقیدہ بہرحال یہ نہیں ہے۔ اہل سنت علماء کے نزدیک جہنم بھی جنت کی طرح ابدی ہی ہے۔

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ﴾ ''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔''

یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ وہ اللہ سے خوش ہو جائیں گے۔

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝۸﴾ ''یہ (صلہ) اُس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔''

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! آمین' ثم آمین!

سُوْرَةُ الزِّلْزَال

تمہیدی کلمات

سورۃ الزلزال کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں بھی مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے اسلوب اور مضامین پر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ مکی سورت ہے۔ فضیلت کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نے اسے ایک ہزار آیات کے برابر قرار دیا ہے۔ یہ سورت اور اس کے بعد کی تین سورتیں (سورۃ العادیات، سورۃ القارعہ اور سورۃ التکاثر) انذارِ آخرت کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَاۙ۝۱ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَاۙ۝۲ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا
لَهَاۚ۝۳ یَوْمَىِٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَاۙ۝۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَاؕ۝۵ یَوْمَىِٕذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ
اَشْتَاتًا ۙ۬ لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْؕ۝۶ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗؕ۝۷ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ
ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ۠۝۸ ع ۸ ۲۲

آیت ۱ ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝۱﴾ ''جب زمین ہلائی جائے گی جیسے کہ ہلائی جائے گی۔''

یعنی تم انسان یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس زلزلے کی کیفیت کیسی ہو گی۔ سورۃ الحج کے آغاز میں اس کیفیت کی شدت کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۝۱ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ۝۲﴾

''اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے رب کا، یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہو گا۔ جس دن تم اُس کو دیکھو گے اس دن (حال یہ ہو گا کہ) بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی جسے وہ دودھ پلاتی تھی اور (دہشت کا عالم یہ ہو گا کہ) ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور تم دیکھو گے لوگوں کو جیسے وہ نشے میں ہوں، حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی بہت سخت ہے۔''

آیت ۲ ﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝۲﴾ ''اور زمین اپنے سارے بوجھ نکال کر باہر پھینک دے گی۔''

یعنی اس دن زمین اپنے اندر مدفون تمام انسانوں کو، وہ جس حالت میں بھی ہوں گے، نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اگر ان کے ذرّات منتشر ہو کر زمین کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہوں گے تو ان کو بھی یکجا کر دیا

جائے گا۔ واضح رہے کہ جو انسان اصطلاحی مفہوم میں زمین کے اندر باقاعدہ دفن نہیں بھی ہوتے' مثلاً سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں یا جلا دیے جاتے ہیں' ان کے اجسام کے اجزائی ذرات بھی کسی نہ کسی شکل میں بالآخر زمین میں ہی جذب ہوتے ہیں اور وہ قیامت کے دن زمین سے ہی برآمد ہوں گے۔ سورۂ طٰهٰ کی یہ آیت اس لحاظ سے بہت واضح ہے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ ''اسی (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے' اور اسی میں سے ہم تمہیں ایک مرتبہ پھر نکالیں گے۔''

آیت ۳ ﴿وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝۳﴾ ''اور انسان کہے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟''

آیت ۴ ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝۴﴾ ''اُس دن یہ اپنی خبریں کہہ سنائے گی۔''

اس دن اللہ تعالیٰ زمین کو بھی بولنے کی صلاحیت عطا فرمائے گا اور وہ ہر انسان کے بارے میں ایک ایک خبر دے گی کہ وہ اس کی پشت پر بیٹھ کر کیا کیا حرکتیں کرتا رہا ہے۔ یعنی جس طرح انسان کے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء اس دن اس کے خلاف گواہی دیں گے اسی طرح زمین کا متعلقہ حصہ اور ٹکڑا بھی اس کے خلاف بطور گواہ کھڑا ہو گا۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ (آیت ۲۱) میں ان گواہیوں کے حوالے سے بہت عبرتناک مکالمات کا ذکر ہے۔ جب انسانوں کی جلدوں سمیت ان کے تمام اعضاء ان کے خلاف گواہیاں دے رہے ہوں گے تو وہ جھنجھلا کر اپنی جلدوں سے کہیں گے: ﴿لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا﴾ کہ تم کیوں ہمارے خلاف بول رہے ہو؟ اس پر وہ ترکی بہ ترکی جواب دیں گی: ﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ کہ آج ہمیں بھی اُس اللہ نے بولنے کی صلاحیت عطا کر دی ہے جس نے باقی ہر چیز کو بولنا سکھایا ہے۔ بہرحال اس دن اللہ تعالیٰ زمین کو بھی زبان عطا کرے گا اور وہ انسانوں سے متعلق تمام احوال کی ایک ایک تفصیل بیان کرے گی۔

آیت ۵ ﴿بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝۵﴾ ''اس لیے کہ اسے اس کے رب نے حکم دیا ہو گا۔''

آیت ۶ ﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا﴾ ''اُس دن لوگ علیحدہ علیحدہ ہو کر نکل پڑیں گے''

اَشْتَاتًا جمع ہے شَتٌّ کی' یعنی منتشر و متفرق۔ نصب حالیت کی وجہ سے ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ سورۃ اللیل کی اس آیت میں بھی آیا ہے: ﴿اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝۴﴾ کہ تم انسان بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہو لیکن تمہاری سعی و جہد کے رخ بالکل مختلف ہیں۔

﴿لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝۶﴾ ''تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھا دیے جائیں۔''

اس منظر کی ایک جھلک سورۃ الکہف کی اس آیت میں بھی دکھائی گئی ہے:

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝۴۹﴾

''اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ' چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہو گا اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو' مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔ اور وہ پائیں گے جو عمل بھی انہوں نے کیا ہو گا اُسے موجود۔ اور

آپ کا رب ظلم نہیں کرے گا کسی پر بھی۔''

آج کے ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کا مفہوم یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس دن ایک بہت بڑا کمپیوٹر سرِ محشر نصب کر دیا جائے گا جس میں پوری نوعِ انسانی کے ایک ایک فرد کے اعمال سے متعلق تفصیلی ڈیٹا موجود ہوگا۔ جونہی کسی فرد کو حساب کے لیے پیش کیا جائے گا اس کی پوری زندگی کی آڈیو ویڈیو فلم فوراً سکرین پر چلنا شروع ہو جائے گی۔

آیت ۷ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝۷﴾ ''تو جس کسی نے ذرہ کے ہم وزن بھی کوئی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔''

آیت ۸ ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸﴾ ''اور جس کسی نے ذرہ کے ہم وزن کوئی بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

عربی لغت کے مطابق چیونٹی کے انڈے سے نکلنے والے بچے کو ''ذرّہ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی بہت چھوٹی اور حقیر چیز۔ اسی مفہوم میں لفظ ''ذرّہ'' اردو میں بھی مستعمل ہے۔

یہ آیت انسان کو اس اہم حقیقت پر متنبہ کرتی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی بہرحال اپنا ایک وزن اور اپنی ایک قدر رکھتی ہے' اور چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے۔ بسا اوقات انسان نیکی کے چھوٹے سے کام کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے' اور بعض اوقات صغیرہ گناہوں کی پروا نہیں کرتا۔ یہ درست طرزِ عمل نہیں ہے۔ کسی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر اسے چھوڑنا نہیں چاہیے اور کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر اس پر جری نہیں ہونا چاہیے۔

سُوْرَةُ الْعٰدِیٰت

تمہیدی کلمات

سورۃ العادیات قرآن مجید کی ان پانچ سورتوں میں پانچویں اور آخری سورت ہے جن کا آغاز ایک جیسے انداز میں پے در پے قسموں سے ہوتا ہے۔ اس فہرست میں اس سورت کے علاوہ سورۃ الصافات' سورۃ الذاریات' سورۃ المرسلات اور سورۃ النازعات شامل ہیں۔ اس سورت کے بھی مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے' لیکن سورت کے مضمون اور اندازِ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ابتدائی دور کی مکی سورت ہے۔ اس سورت کے آغاز کی قسموں کے بارے میں تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ ان میں گھوڑوں کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۝ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۝ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ۝ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهٖ
جَمْعًا ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝
اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ
لَّخَبِيْرٌ ۝

آیت ۱ ﴿وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۝﴾ ''قسم ہے ان گھوڑوں کی جو دوڑتے ہیں ہانپتے ہوئے۔''

آیت ۲ ﴿فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۝﴾ ''پھر وہ سُم مار کر چنگاریاں نکالتے ہیں۔''

جب سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے سُم کسی پتھر وغیرہ سے ٹکراتے ہیں تو ان سے چنگاریاں نکلتی دکھائی دیتی ہیں۔

آیت ۳ ﴿فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ۝﴾ ''پھر وہ علی الصبح غارت گری کرتے ہیں۔''

اس آیت میں گھوڑوں کی خصوصی صفات کے ساتھ ساتھ زمانہ جاہلیت کے عرب تمدن کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اہل عرب جب لوٹ مار یا قتل و غارت کے لیے کسی قبیلے پر حملے کی منصوبہ بندی کرتے تو اس کے لیے علی الصبح منہ اندھیرے کے اوقات (small hours of the morning) کا انتخاب کرتے تھے۔ اس قسم کی غارت گری کے لیے رات کا پچھلا پہر اس لیے موزوں سمجھا جاتا تھا کہ اس وقت ہر کوئی بڑی سکون کی نیند سو رہا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مریض تکلیف کی وجہ سے ساری رات سو نہ سکے تو رات کے پچھلے پہر اسے بھی نیند آ جاتی ہے۔

آیت ۴ ﴿فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝﴾ ''پھر وہ اس سے گرد اُڑاتے ہوئے جاتے ہیں۔''

آیت ۵ ﴿فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝۵﴾ ''پھر اس کے ساتھ وہ (دشمن کی) جمعیت کے اندر گھس جاتے ہیں۔''

پرانے زمانے کی جنگوں میں گھوڑے بہت مؤثر اور کارآمد ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ حملے کے وقت گھوڑے اپنے سواروں کے حکم پر مخالف فوج کی طرف سے تیروں کی بوچھاڑ اور نیزوں کی یلغار کی پروا نہ کرتے ہوئے ان کی صفوں میں گھس جاتے تھے۔ گھوڑے کا اپنے مالک کی فرمانبرداری میں اپنا خون پسینہ ایک کردینے کا جذبہ اور اس کی وفاداری میں اپنی جان کی بازی تک لگا دینے کا وصف! یہ ہے دراصل ان قسموں کے مضمون کا مرکزی نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ دلانا مقصود ہے۔ چنانچہ گھوڑوں کے ان اوصاف کے ذکر کے بعد تقابل کے طور پر انسان کے کردار کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

آیت ۶ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝۶﴾ ''یقیناً انسان اپنے رب کا بہت ہی ناشکرا ہے۔''

مطلب یہ کہ ایک طرف وہ جانور ہے جو اپنے مالک کے ایک اشارے پر اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے' جو اُس کا خالق نہیں ہے' بلکہ صرف اُس کے دانے پانی کا انتظام کرتا ہے' اور دوسری طرف یہ باشعور' صاحب عقل و دانش اشرف المخلوقات انسان ہے جو اپنے خالق اور مالک کا شکر ادا نہیں کرتا۔

آیت ۷ ﴿وَاِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝۷﴾ ''اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔''

وہ اپنے اس طرزِ عمل سے خوب واقف ہے۔ جیسا کہ سورۃ القیامہ میں فرمایا گیا: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴﴾ کہ انسان اپنے خیالات' جذبات اور کردار کے بارے میں خود سب کچھ جانتا ہے۔ چنانچہ انسان خوب جانتا ہے کہ وہ قدم قدم پر اپنے رب کی ناشکری کا مرتکب ہو رہا ہے۔

آیت ۸ ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸﴾ ''اور وہ مال و دولت کی محبت میں بہت شدید ہے۔''

مال و دولت کی محبت میں انسان اکثر اوقات حلال و حرام کی تمیز تک بھلا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ حرام کھاتے ہوئے وہ اپنے نفسِ لوامہ (بحوالہ سورۃ القیامہ' آیت ۲) اور ضمیر کی ملامت کی بھی پروا نہیں کرتا۔

آیت ۹ ﴿اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝۹﴾ ''تو کیا وہ اُس وقت کو نہیں جانتا جب نکال لیا جائے گا وہ سب کچھ جو قبروں میں ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝۱۰﴾ ''اور ظاہر کر دیا جائے گا جو کچھ سینوں میں ہے۔''

آیت ۱۱ ﴿اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝۱۱﴾ ''یقیناً ان کا رب اس دن ان سے پوری طرح باخبر ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ کو ان کے تمام اعمال و افعال کا علم ہے اور اس دن وہ ان سے ایک ایک چیز کا حساب لے لے گا۔ اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَّسِيْرًا ۔ آمین! انذارِ آخرت کے مضمون کی حامل ان سورتوں میں سے ہر سورت کی تلاوت کے بعد یہ دعا ضرور کرنی چاہیے کہ اے اللہ! تو ہم سے آسان حساب لینا اور اپنی خصوصی رحمت سے ہمارے گناہوں کو معاف کر دینا۔

سُوْرَةُ الْقَارِعَة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ ۝١ مَا الْقَارِعَةُ ۝٢ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝٣ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ
الْمَبْثُوْثِ ۝٤ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝٥ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٦ فَهُوَ فِيْ
عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝٧ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٨ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝٩ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝١٠ نَارٌ
حَامِيَةٌ ۝١١ ع

آیت ۱ ﴿اَلْقَارِعَةُ ①﴾ ''وہ کھٹکھٹانے والی۔''

آیت ۲ ﴿مَا الْقَارِعَةُ ②﴾ ''کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی!''

قَرْع کے معنی ایک چیز کو کسی دوسری چیز پر زور سے دے مارنے کے ہیں۔ جیسے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانا۔ اس لغوی معنی کی مناسبت سے قارعہ کا لفظ ہولناک حادثے اور عظیم مصیبت کے لیے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی قوم کسی حادثہ فاجعہ یا عظیم آفت کا شکار ہو تو عرب کہتے ہیں: قَرَعَتْهُمُ الْقَارِعَةُ —— یعنی وہ قیامت جب آئے گی تو پوری کائنات کو کھٹکھٹا ڈالے گی اور دنیا کی ہر چیز کو تہ و بالا کر دے گی۔ تمام اجرامِ فلکی آپس میں ٹکرائیں گے جس سے خوفناک دھماکے ہوں گے اور دل دہلا دینے والی آوازیں پیدا ہوں گی۔

آیت ۳ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ③﴾ ''اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی!''

آیت ۴ ﴿يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ④﴾ ''جس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی مانند ہوں گے۔''

آیت ۵ ﴿وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ⑤﴾ ''اور پہاڑ دُھنی ہوئی اون کی مانند ہو جائیں گے۔''

اَلْعِھْن: رنگ دار اون کو کہتے ہیں اور مَنْفُوْش کے معنی ہیں دُھنی ہوئی۔ یعنی پہاڑ اپنی جگہ پر قائم نہیں رہیں گے بلکہ ریزہ ریزہ ہو کر رنگ دار اون کی طرح ہوا میں اُڑ رہے ہوں گے۔

آیت ۶ ﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ⑥﴾ ''تو جن لوگوں کے (نیکیوں کے) پلڑے بھاری ہوں گے۔''

یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے کہ ان آیات میں ایک ہی قسم کے وزن یا میزان کے ایک ہی پلڑے کا ذکر آیا ہے۔ اس بارے میں عام رائے یہ ہے کہ ''مَوَازِین'' سے مراد یہاں نیکیوں کا وزن ہے۔ یعنی حساب کے وقت ہر شخص کی نیکیوں کا وزن کر کے دیکھا جائے گا کہ یہ وزن ''مطلوبہ معیار'' کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور یہ

''مطلوبہ معیار'' بھی ہر شخص کا الگ الگ اس کے ''شاکلہ'' کے مطابق ہوگا۔ ظاہر ہے ہر شخص کی استطاعت (پیدائشی صلاحیتوں اور ماحول کے منفی و مثبت اثرات کے مطابق) دوسرے شخص کی استطاعت سے مختلف ہوگی اور ہر شخص اپنی استطاعت کی حد تک ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مکلّف ہوگا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:٢٨٦) ''اللہ تعالیٰ نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اس کی وسعت کے مطابق''۔ چنانچہ ہر شخص کے شاکلہ یعنی اس کے جینز (genes) کی طرف سے اسے حاصل ہونے والی صلاحیتوں اور ماحول کے اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے لیے نیکیوں کے وزن کا ایک خاص معیار مقرر کیا جائے گا۔ اگر تو اس کی نیکیوں کے وزن (مَوَازِيْنُهٗ) کو اس معیار کے مطابق پایا گیا تو اسے کامیابی کا پروانہ مل جائے گا۔

آیت ٧ ﴿فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝٧﴾ ''تو وہ ہوگا عیش و عشرت کی زندگی میں۔''

آیت ٨ ﴿وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٨﴾ ''اور جس (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے۔''

آیت ٩ ﴿فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝٩﴾ ''تو اُس کا ٹھکانہ ایک گڑھا ہوگا۔''

آیت ١٠ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ۝١٠﴾ ''اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ کیا ہے؟''

آیت ١١ ﴿نَارٌ حَامِيَةٌ ۝١١﴾ ''آگ ہے دہکتی ہوئی!''

اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ يَا مُجِيْرُ يَا مُجِيْرُ يَا مُجِيْرُ!!

سُوْرَةُ التَّكَاثُر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴿۴﴾ کَلَّا
لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ ؕ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ ۙ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّہَا عَیۡنَ الۡیَقِیۡنِ ۙ﴿۷﴾ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ
یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ ٪﴿۸﴾

آیت ۱ ﴿اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۙ﴿۱﴾﴾ ''تمہیں غافل کیے رکھا ہے بہتات کی طلب نے!''

التکاثر کے معنی مال جمع کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے بھی ہیں اور مال و دولت کی کثرت پر فخر کرنے کے بھی۔

دولت انسان کے پاس چاہے جتنی بھی ہو اس کی طبیعت اس سے بھرتی نہیں اور وہ بدستور مزید حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔

آیت ۲ ﴿حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾﴾ ''یہاں تک کہ تم قبروں کو پہنچ جاتے ہو۔''

یعنی انسان اپنی ساری عمر اسی تگ و دو میں کھپا دیتا ہے اور مرتے دم تک یہ فکر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ انسان کی حرص و ہوس کے پیمانے کو صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے[(۱)]۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۰ میں انسانی زندگی کے جن مراحل کا ذکر ہوا ہے ان میں آخری مرحلہ **تکاثر فی الاموال والاولاد** کا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آخری عمر میں انسان کی یہ حرص مزید بڑھ جاتی ہے۔

آیت ۳ ﴿کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾﴾ ''کوئی بات نہیں! بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔''

آیت ۴ ﴿ثُمَّ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴿۴﴾﴾ ''پھر کوئی بات نہیں! بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔''

اپنے اسلوب کے اعتبار سے یہ آیات سورۃ النبا کی ان آیات سے مشابہ ہیں: ﴿کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴﴾ ثُمَّ

---

(۱) حضرات عبداللہ بن عباس، ابوموسیٰ الاشعری اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے (الفاظ کی معمولی کمی بیشی کے ساتھ) مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى وَادِيًا ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ))

(صحیح البخاری، ح:۶۴۳۶، صحیح مسلم، ح:۱۰۵۰ و ۱۰۴۸)

''اگر آدم کے بیٹے کے پاس مال سے بھری دو وادیاں ہوں تو وہ لازماً تیسری وادی کی خواہش کرے گا، اور ابن آدم کے پیٹ کو سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔''

(حاشیہ از مرتب)

﴿كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ⑤﴾۔ یعنی ابھی تم لوگ ''تَکاثُر'' کے نشے میں مست ہونے کی وجہ سے موت کا تصور بھی ذہن میں لانے کے لیے تیار نہیں ہو' مگر وہ وقت دُور نہیں جب موت خود آ کر تم سے ملاقات کرے گی: ﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ⑧﴾ (الجمعة) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی' پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اس ہستی کی طرف جو غیب اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے' پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے''۔ بہرحال جونہی تمہاری آنکھیں بند ہوں گی' وہ تمام حقائق تم پر روشن ہو جائیں گے جن سے تم اس وقت نظریں چرانے کی کوشش کر رہے ہو۔

آیت ۵ ﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ⑤﴾ ''کوئی بات نہیں! کاش کہ تم علم یقین کے ساتھ جان جاتے!''

یعنی موت یا قیامت کا علم دراصل یقینی علم ہے' کاش کہ تمہیں اس کا شعور ہوتا۔ حکماء کے ہاں ہمیں یقین کے تین درجوں کا ذکر ملتا ہے: علم الیقین' عین الیقین اور حق الیقین۔ علم الیقین وہ یقین ہے جو انسان کو علم' معلومات یا استدلال کی بنیاد پر حاصل ہو۔ مثلاً آپ نے دور سے دھواں اٹھتا دیکھا تو آپ نے کہا کہ وہاں آگ لگی ہوئی ہے' حالانکہ آگ آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔ پھر جب آپ نے وہاں جا کر خود اپنی آنکھوں سے آگ کو دیکھ لیا تو آپ کو عین الیقین حاصل ہو گیا۔ لیکن حق الیقین کا درجہ اس سے بھی آگے ہے۔ یقین کا یہ درجہ باقاعدہ تجربے سے حاصل ہوتا ہے اس لیے کہ آنکھ سے دیکھنے میں بھی دھوکے کا امکان ہے۔ ضروری نہیں کہ کوئی چیز جیسی نظر آ رہی ہے حقیقت میں بھی ویسی ہو۔ جیسے آج کل بعض الیکٹرک ہیٹرز میں انگارے دہکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں' لیکن جب آپ غور سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو محض دکھاوے کا منظر ہے اور حرارت کا اصل منبع کہیں اور ہے۔ چنانچہ آگ کے بارے میں آپ کو ''علم الیقین'' تو محض دھواں دیکھنے سے ہی حاصل ہو گیا۔ پھر جب آپ نے آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو آپ کا یقین ''عین الیقین'' میں بدل گیا۔ اس کے بعد جب آپ نے آگ کو چھو کر یا اس کے قریب ہو کر اس کی حرارت کو عملی طور پر محسوس کیا تو آگ کی موجودگی کے بارے میں آپ کا یقین ''حق الیقین'' کے درجے میں آ گیا۔

آیت ۶ ﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ⑥﴾ ''تم جہنم کو دیکھ کر رہو گے۔''

آیت ۷ ﴿ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ⑦﴾ ''پھر تم اس کو عین الیقین کے ساتھ دیکھو گے۔''

آیت ۸ ﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ⑧﴾ ''پھر اس دن تم سے ضرور پوچھا جائے گا نعمتوں کے بارے میں۔''

اس دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ایک ایک نعمت کے بارے میں تم سے جواب طلبی ہوگی کہ دنیا میں تم نے اس کی کون کون سی نعمتوں سے استفادہ کیا اور ان کے حقوق کہاں تک ادا کیے۔

سُوْرَةُ الْعَصْر

تمہیدی کلمات

سورۃ العصر قرآن مجید کی مختصر ترین اور جامع ترین سورتوں میں سے ہے۔ اس کی جامعیت کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ کے درج ذیل دو اقوال بہت اہم ہیں:

(۱) لَوْ لَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسَ ''اگر قرآن مجید میں سوائے اِس (سورۃ العصر) کے کچھ اور نازل نہ بھی ہوتا تو لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے یہی کافی ہوتی۔''

(۲) لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ ''اگر لوگ تنہا اسی ایک سورت پر غور کریں تو یہ ان کے لیے کافی ہو جائے۔''

یہ سورت ''مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب'' کا نقطہ آغاز بھی ہے۔ یعنی ہمارے منتخب نصاب کا پہلا درس سورۃ العصر کے بارے میں ہے۔ اس سورت پر میری ایک کتاب اور ایک مختصر کتابچہ بھی موجود ہے۔ تفصیلی معلومات کے لیے ان سے استفادہ کرنا مفید رہے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ ع ۲۸

آیت ۱ ﴿وَالْعَصْرِ ۝۱﴾ ''زمانے کی قسم ہے۔''

یعنی اس حقیقت پر زمانہ گواہ ہے یا پوری تاریخ انسانی شاہد ہے کہ:

آیت ۲ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲﴾ ''یقیناً انسان خسارے میں ہے۔''

اگلی آیت میں اس نقصان اور خسارے سے بچاؤ کے لیے چار شرائط بتائی گئی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک یا دو یا تین شرائط پوری کر دینے سے مذکورہ خسارے سے بچنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ کامیابی کے لیے بہرحال چاروں شرائط پر عمل درآمد ضروری ہے۔

آیت ۳ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳﴾ ''سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور انہوں نے

باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔"

ان شرائط میں پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان ایمان لائے۔ اس میں ایمان باللہ‘ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت سمیت تمام ایمانیات شامل ہیں۔ یعنی انسان اس کائنات کے مخفی اور غیبی حقائق کو سمجھے‘ ان کا شعور حاصل کرے اور ان کی تصدیق کرے۔ ایمان لانے کے بعد دوسری شرط اس ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے سے متعلق ہے۔ یعنی اگر انسان اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے عمل اور کردار سے ثابت ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کا فرمانبردار بندہ ہے اور اس کی نافرمانی سے ڈرتا ہے۔ غرض وہ ہر اس عمل کو اپنے شب و روز کے معمول کا حصہ بنانے پر کمربستہ ہو جائے جس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اور ہر اس فعل سے اجتناب کرنے کی فکر میں رہے جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے۔

تیسری شرط "تواصی بالحق" کی ہے۔ یعنی جس حق کو انسان نے خود قبول کیا ہے اور اپنی عملی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالا ہے اس حق کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علمبردار بن جائے۔ اس کے بعد چوتھی اور آخری شرط "تواصی بالصبر" کی ہے اور یہ "تواصی بالحق" کا لازمی اور منطقی نتیجہ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو بندہ "تواصی بالحق" کا عَلَم اٹھائے گا اسے شیطانی قوتوں کی مخالفت مول لے کر آزمائش و ابتلا کی مشکل گھاٹیوں سے بھی گزرنا ہوگا اور اس راستے پر چلتے ہوئے نہ صرف اسے خود صبر و استقامت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا ہوگا بلکہ اسے اپنے ہمراہیوں اور ساتھیوں کو بھی اس کی تلقین و نصیحت کرنا ہوگی۔ اسی لیے حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جب امر بالمعروف کی نصیحت کی تو ساتھ ہی صبر کی تلقین بھی کی تھی: ﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ط﴾ (لقمٰن:۱۷) "اے میرے بچے! نماز قائم کرو اور نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو بھی تکلیف تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو!"

بہرحال راہِ حق کے مسافروں کو پہلے سے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ راستہ آزمائش و ابتلا کے خارزاروں سے ہو کر گزرتا ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾﴾ (البقرۃ) "اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے۔ اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں کو۔"

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین!

سُوْرَۃُ الھُمَزَۃ

تمہیدی کلمات

سورۃ العصر میں نسلِ انسانی کو ایک بہت بڑے ممکنہ خسارے کی وعید سنائی گئی ہے اور ساتھ ہی اس خسارے سے بچنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ اب سورۃ الھمزہ میں تصویر کے دوسرے رخ کے طور پر ان لوگوں کے کردار کی جھلک دکھائی جا رہی ہے جو آخرت کے بارے میں کسی تنبیہہ یا وعید کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے اور اندھا دھند اسی راستے پر بھاگے چلے جا رہے ہیں جو حقیقت میں خسارے اور بربادی کا راستہ ہے۔ دراصل جب انسان کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین یا آدرش (ideal) نہیں ہوتا تو اس کی شخصیت پستی کی طرف مائل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس روش پر چلتے چلتے وہ پستی کی اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے اخلاق و کردار میں خیر اور بھلائی کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہتی۔ ایسا انسان معاشرے میں رہتے ہوئے کسی کی غیبت کرتا ہے تو کسی پر طعنہ زنی کرتا ہے‘ کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے تو کسی کا مال ہڑپ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی وقت وہ کوئی نیک کام بھی کرتا دکھائی دیتا ہے تو اس کے پیچھے بھی اس کا کوئی ذاتی مفاد پوشیدہ ہوتا ہے۔ غرض اس کی ہر حرکت اس کی پست سوچ کی مظہر اور اس کا ہر فعل اس کے گھٹیا کردار کا عکاس ہوتا ہے۔ پھر جب کسی معاشرے کے انسانوں کی غالب اکثریت پستی اور گھٹیا پن کا یہ رنگ اپنا لیتی ہے تو وہ معاشرہ مجموعی طور پر ہر قسم کے خیر سے محروم ہو کر گندگی اور غلاظت کے متعفن ڈھیر کا روپ دھار لیتا ہے۔

ایسے معاشرے کو دیکھ کر ایک حساس انسان بجا طور پر مایوسی کی اَتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ دوسری طرف اس معاشرے کے فلسفی اور حکماء انسان کے بارے میں ایسے فتوے جاری کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھنے لگتے ہیں کہ انسان تخلیقی اعتبار سے محض حیوانی داعیات و شہوات کا پتلا اور گندگی کی ایک پوٹ ہے اور یہ کہ اس میں خیر اور بھلائی کا کوئی عنصر سرے سے موجود ہی نہیں۔ ایسے ہی منفی نظریات و خیالات کے جواب کے طور پر سورۃ التین میں نسلِ انسانی کی چار عظیم شخصیات (حضرت نوح علیہ السلام‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ) کے اخلاق و کردار کو بطور نمونہ پیش کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ انسان بنیادی طور پر احسن تقویم کی سطح پر پیدا ہوا ہے۔ البتہ جب یہ اپنے فطری شرف سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنی اصل عظمت کو فراموش کر دیتا ہے تب یہ پستی میں گرتے گرتے اَسفل سافلین کے زمرے میں شمار ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان جب شرفِ انسانیت کی خلعتِ فاخرہ کو اُتار پھینکتا ہے اور اپنے حیوانی داعیات کی تسکین و تشفی کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتا ہے تو پھر یہ خنزیر سے بڑھ کر شہوت پرست‘ اونٹ سے بڑھ کر کینہ پرور اور بھیڑیے سے بڑھ کر سفاک بن جاتا ہے۔ یعنی یہ اشرف المخلوقات جب حیوان بنتا ہے تو بے حیائی‘ خود غرضی اور خونخواری کی دوڑ میں تمام حیوانوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ۙ﴿۲﴾ یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ ۚ﴿۳﴾ کَلَّا
لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَۃِ ۫﴿ۖ۴﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحُطَمَۃُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَۃُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی
الۡاَفۡـِٕدَۃِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّہَا عَلَیۡہِمۡ مُّؤۡصَدَۃٌ ۙ﴿۸﴾ فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ ٪﴿۹﴾ ع

آیت ۱ ﴿وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ ۙ﴿۱﴾﴾ ''بڑی خرابی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو لوگوں کے عیب چُنتا رہتا ہے اور طعنے دیتا رہتا ہے۔''

ھُمَزَۃ اور لُمَزَۃ دونوں الفاظ معنی کے اعتبار سے باہم بہت قریب ہیں۔ بعض اہل لغت کے نزدیک روبرو طعنہ زنی کرنے والے کو ھُمَزَۃ اور پس پشت عیب جوئی کرنے والے کو لُمَزَۃ کہتے ہیں' جبکہ بعض اہل لغت نے ان کا معنی برعکس بیان کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ہر چغلی کھانے والے' دوستوں میں جدائی اور تفرقہ ڈالنے والے' بے قصور اور بے عیب انسانوں میں نقص نکالنے والے کو ھُمَزَۃ اور لُمَزَۃ کہتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ۙ﴿۲﴾﴾ ''جو مال جمع کرتا رہا اور اس کو گنتا رہا۔''

جس نے اپنی زندگی اور زندگی کی ساری جدوجہد مال کمانے اور اس کا حساب رکھنے میں برباد کر دی۔ وہ یہی سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ اس ماہ میرے اکاؤنٹس میں اتنے فیصد اضافہ ہو گیا ہے اور پچھلے سال کے مقابلے میں اس سال میرے اثاثہ جات اس قدر بڑھ گئے ہیں۔

آیت ۳ ﴿یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ ۚ﴿۳﴾﴾ ''وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ باقی رکھے گا۔''

گویا اُس کے مال نے اسے زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ ایک دولت مند آدمی اپنی دولت کے ذریعے دنیا میں ایسے آثار و نقوش چھوڑ کر جانا چاہتا ہے جن کی وجہ سے اس کا نام دنیا میں ہمیشہ رہے۔ انسان کی اسی خواہش نے اسے اہرامِ مصر جیسے عجائبات کی تخلیق پر مجبور کیا۔ مشہور انگریزی نظم The Pyramids کے ان الفاظ میں انسان کی اسی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے:

Calm and self possessed,
Still and resolute,
Pyramids echo into eternity,
They defined cry of man's will
To strive & conquer the storms of time.

آیت ۴ ﴿کَلَّا لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَۃِ ﴿۴﴾﴾ ''ہرگز نہیں' وہ تو یقیناً جھونک دیا جائے گا حطمہ میں۔''

حُطَمَۃ : حَطَمَ سے ہے' یعنی توڑ ڈالنے والی' پیس ڈالنے والی' چور چور اور ریزہ ریزہ کر دینے والی۔ یہ دوزخ کے ایک خاص طبقے کا نام ہے جس کی آگ اتنی تیز ہو گی کہ اس میں جو شے بھی ڈالی جائے گی اس کو آنِ واحد میں پیس کر رکھ دے گی۔

آیت ۵ ﴿وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحُطَمَةُ ؕ﴾ ''اور کیا تم جانتے ہو وہ حطمہ کیا ہے؟''

آیت ۶ ﴿نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ۙ﴾ ''وہ آگ ہے اللہ کی بھڑکائی ہوئی۔''

آیت ۷ ﴿الَّتِىۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـِٕدَةِ ؕ﴾ ''جو دلوں کے اوپر جا چڑھے گی۔''

یعنی اس آگ کی حدت اور تپش انسان کی جلد سے زیادہ اس کے دل پر اثر انداز ہوگی۔ بہرحال آج جب انسان خود Infra red Rays اور Ultra violet Rays سمیت آگ اور حرارت کی رنگا رنگ اقسام ایجاد کر چکا ہے اس کے لیے ''حُطَمَه'' کی مذکورہ خصوصیت کو سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ ایک صاحب نے خیال پیش کیا ہے کہ حُطَمَة ایٹمی حرارت کی کوئی شکل ہوگی۔ ان کا کہنا ہے کہ ایٹم سے جو حرارت پھیلتی ہے وہ براہِ راست آگ نہیں ہوتی لیکن انسان کے وجود کو چیرتی چلی جاتی ہے۔

آیت ۸ ﴿اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ۙ﴾ ''بے شک وہ (آگ) ان پر بند کر دی جائے گی۔''

تا کہ اس کی تمام تر حرارت ان پر اثر انداز ہو اور انہیں زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچے۔

آیت ۹ ﴿فِىۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۞﴾ ''بڑے اونچے اونچے لمبے ستونوں میں۔''

سُوْرَۃُ الْفِیْل

تمہیدی کلمات

سورۃ الفیل اور اس کے بعد کی سورتوں میں سے اکثر کا تعلق حضورﷺ کی سیرت یا آپ ﷺ کے زمانے کے عرب معاشرے کے ماحول اور حالات سے ہے۔ جیسے سورۃ الفیل میں جس واقعہ کا ذکر ہے یہ واقعہ اسی سال پیش آیا جس سال حضورﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ آپؐ کی ولادت عین اس واقعہ کے دن ہوئی تھی۔ البتہ کچھ ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اس واقعہ کے پچاس دن بعد پیدا ہوئے تھے۔

اس واقعہ کا پس منظر یوں ہے کہ یمن کے عیسائی بادشاہ ابرہہ نے خانہ کعبہ کے مقابلے میں ایک عالیشان کلیسا اس غرض سے تعمیر کرایا کہ عرب کے لوگ خانہ کعبہ کا حج کرنے کے بجائے اس کلیسا میں حاضری دیا کریں۔ لیکن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے میں ناکام رہا۔ اسی دوران کسی عرب نے شرارتاً اس کلیسا میں رفع حاجت کر کے غلاظت بکھیر دی۔ ابرہہ تو پہلے ہی حسد کی آگ میں جل رہا تھا' اس واقعہ کو بہانہ بنا کر اس نے کعبہ کو مسمار کرنے کے ارادے سے مکہ مکرمہ پر باقاعدہ چڑھائی کر دی۔ مکہ پر حملہ آور ہونے والے ابرہہ کے لشکر کی تعداد ساٹھ ہزار تھی اور ان کے ساتھ بہت سے ہاتھی بھی تھے۔ اسی لیے عربوں نے اس لشکر کو ''اصحاب الفیل'' کا نام دیا اور جس سال یہ لشکر حملہ آور ہوا تھا وہ سال ان کے ہاں ''عام الفیل'' کے نام سے مشہور ہوا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اپنے گھر کی حفاظت فرمائی اور ابرہہ کے لشکر کو چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے نیست و نابود کر دیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲
وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ
مَّاْكُوْلٍ ۝۵ ع

آیت ۱ ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں کیا حشر کیا تمہارے رب نے ان ہاتھی والوں کا؟''

آیت ۲ ﴿اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲﴾ ''کیا اُس نے ان کی تمام تدبیروں کو بے کار اور غیر مؤثر نہیں کر دیا؟''

اَبرہہ کی اس لشکرکشی کا مقصد انہدامِ کعبہ کے علاوہ عرب میں عیسائیت پھیلانا اور اُس تجارت پر قبضہ کرنا بھی تھا جو بلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعے ہوتی تھی۔

آیت ۳ ﴿وَّاَرۡسَلَ عَلَیۡهِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ ۝۳﴾ ''اور اُن پر بھیج دیے جُھنڈ کے جُھنڈ اُڑتے ہوئے پرندوں کے۔''

آیت ۴ ﴿تَرۡمِیۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۝۴﴾ ''جواُن پر مارتے تھے کنکر کی پتھریاں۔''

رَمٰی یَرۡمِی رَمۡیًا کا معنی ہے پھینکنا' مارنا۔ حج کے دوران شیطان کو کنکریاں مارنے کے عمل کو بھی ''رمی جمرات'' کہا جاتا ہے۔

لفظ سِجِّیۡل دراصل فارسی ترکیب ''سنگِ گِل'' سے معرب ہے (فارسی کی ''گ'' عربی میں آکر ''ج'' سے بدل گئی ہے)۔ فارسی میں سنگ بمعنی پتھر اور گِل بمعنی مٹی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سنگِ گِل کے لغوی معنی ہیں مٹی کا پتھر۔ اس سے مراد وہ کنکریاں ہیں جو ریتلی زمین پر ہلکی بارش برسنے اور بعد میں مسلسل تیز دھوپ چمکنے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔ یعنی بارش کے ایک ایک قطرے کے ساتھ جو ریت ملی مٹی گیلی ہو جاتی ہے وہ بعد میں مسلسل تیز دھوپ کی حرارت سے پک کر سخت کنکری بن جاتی ہے۔

ابرہہ کے لشکر جرار کو تباہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کسی غیر معمولی طاقت کے استعمال کی ضرورت نہ پڑی' بلکہ اُس نے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے جُھنڈ بھیج دیے جو ساحل سمندر کی طرف سے اُمڈ پڑے اور چند لمحوں کی سنگ باری سے اس لشکر کا بھرکس نکال دیا۔ ان میں سے ہر پرندہ تین چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھائے ہوئے تھا' ایک اپنی چونچ میں اور دو اپنے پنجوں میں۔

آیت ۵ ﴿فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ۝۵﴾ ''پھر اُس نے کر دیا ان کو کھائے ہوئے بُھس کی طرح۔''

یعنی اس پورے لشکر کی حالت اس چارے یا بُھس کی طرح ہو گئی جسے جانوروں نے کھا کر چھوڑ دیا ہو۔

سُوْرَةُ قُرَيْش

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۙ اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ الَّذِيْٓ
اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۠ ع ۲۱

آیت ۱ ﴿لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ①﴾ ''قریش کے مانوس رکھنے کی وجہ سے۔''

آیت ۲ ﴿اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ②﴾ ''(یعنی) سردیوں اور گرمیوں کے سفر سے ان کو مانوس رکھنے کی وجہ سے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے قریش کے دلوں میں سردی اور گرمی کے تجارتی سفروں کی الفت ومحبت پیدا کر دی۔

اِیْلاف: اَلِفَ یَاْلَفُ اَلْفًا سے باب افعال کا مصدر ہے' یعنی مانوس کرنا اور خوگر بنانا۔ اردو میں اُلفت اور مالوف کے الفاظ بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔

سورۂ قریش کی پہلی دو آیات میں قریش کی اس اجارہ داری کی طرف اشارہ ہے جو حضور ﷺ کی پیدائش سے قبل زمانے میں انہیں مشرق اور مغرب کی تجارت پر حاصل تھی۔ اس زمانے میں مشرقِ بعید کے ممالک (ہندوستان' جاوا' ملایا' ساٹرا' چین وغیرہ) سے بحر ہند کے راستے جو سامانِ تجارت آتا تھا وہ یمن کے ساحل پر اترتا تھا۔ دوسری طرف یورپ سے آنے والے جہاز شام اور فلسطین کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ اس کے بعد یمن سے سامانِ تجارت کو شام پہنچانے اور ادھر کا سامان یمن پہنچانے کے لیے خشکی کا راستہ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ یمن اور شام کے درمیان اس راستے کی حیثیت اس زمانے میں گویا بین الاقوامی تجارتی شاہراہ کی سی تھی۔ ظاہر ہے یورپ کو انڈیا سے ملانے والا سمندری راستہ (around the cape of good hope) تو واسکوڈے گاما نے صدیوں بعد ۱۴۹۸ء میں دریافت کیا تھا' جبکہ بحیرۂ احمر کو بحر روم سے ملانے والی نہر سویز ۱۸۶۹ء میں بنی تھی۔

حضور ﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال پہلے تک اس تجارتی شاہراہ پر قومِ سبا کی اجارہ داری تھی۔ لیکن جب ''سد مآرب'' ٹوٹنے کی وجہ سے اس علاقے میں سیلاب آیا اور اس سیلاب کی وجہ سے اس قوم کا شیرازہ بکھر گیا تو یہ شاہراہ کُلی طور پر قریشِ مکّہ کے قبضے میں چلی گئی۔ قریش مکہ چونکہ کعبہ کے متولی تھے اس لیے پورے عرب میں انہیں عزت وعقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں جہاں کوئی بھی تجارتی قافلہ لٹیروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھا وہاں قریش کے قافلوں کو پورے عرب میں کوئی میلی نظر سے بھی نہیں

دیکھتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب کے تمام قبائل نے اپنے اپنے بت خانہ کعبہ میں نصب کر رکھے تھے۔ گویا ہر قبیلے کا ''خدا'' قریش کی مہربانی سے ہی خانہ کعبہ میں قیام پذیر تھا' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قریش کے پاس یرغمال تھا۔ اس لیے عرب کا کوئی قبیلہ بھی ان کے قافلوں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ قریش کے قافلے سارا سال بلاخوف وخطر یمن سے شام اور شام سے یمن کے راستے پر رواں دواں رہتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں وہ لوگ شام و فلسطین کے سرد علاقوں جبکہ سردیوں میں یمن کے گرم علاقے کا سفر اختیار کرتے تھے۔ آیت زیر مطالعہ میں ان کے اسی تجارتی سفر کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے بین الاقوامی تجارتی شاہراہ پر مکمل اجارہ داری' تجارتی قافلوں کے ہمہ وقت تحفظ کی یقینی ضمانت اور موسموں کی موافقت اور مطابقت سے سرد و گرم علاقوں کے سفر کی سہولت' یہ ان لوگوں کے لیے ایسی نعمتیں تھیں جس پر وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا۔ اس لیے ان نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

آیت ۳ ﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝۳﴾ ''پس انہیں بندگی کرنی چاہیے اس گھر کے رب کی۔''

ظاہر ہے ان کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کا یہ گھر (ع ''دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا'') توحید کے مرکز کی حیثیت سے تعمیر کیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو اس گھر کے پہلو میں بساتے وقت توحید کے اعتبار سے ان کی ذمہ داری کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا: لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ تاکہ وہ اللہ کی بندگی کے طور پر نماز قائم کریں۔ چنانچہ چاہیے تو یہ تھا کہ جس کعبہ کی تولیت کی وجہ سے انہیں خوشحالی اور عزت ملی تھی وہ اس گھر کے مالک کو پہچانتے اور اس کا حق ادا کرتے۔ لیکن اس کے برعکس انہوں نے اللہ کے اس گھر میں ۳۶۰ بت نصب کر کے اسے دنیا کے سب سے بڑے بت کدے میں تبدیل کر دیا اور اس کے اصل مالک کو بالکل ہی فراموش کر دیا۔

آیت ۴ ﴿الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۥ﴾ ''جس نے انہیں بھوک میں کھانے کو دیا''

انہیں رزق عطا فرما کر فاقہ کشی سے محفوظ رکھا۔ جب عرب کے عام لوگ غربت اور تنگ دستی کا شکار تھے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے قریشِ مکہ کو کامیاب تجارت اور کعبہ کی تولیت کی وجہ سے معاشی خوشحالی سے نواز رکھا تھا۔

﴿وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝۴﴾ ''اور انہیں خوف سے امن عطا کیا۔''

ان کے قافلے سارا سال یمن اور فلسطین کے درمیان بلاخوف وخطر محوِ سفر رہتے تھے۔ خداداد تحفظ کی یہ ضمانت انہیں اس سرزمین میں میسر تھی جہاں ہر طرف جنگل کے قانون کا راج تھا۔

سُوْرَۃُ الْمَاعُوْن

تمہیدی کلمات

سورۃ الماعون میں اس معاشرے کے اخلاقی انحطاط کی جھلک دکھائی گئی ہے جس میں حضورﷺ کی بعثت ہوئی۔ وہ لوگ بظاہر تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار تھے، لیکن عملی طور پر صورتحال یہ تھی کہ ان کے عقائد و نظریات مسخ ہو چکے تھے اور معاشرتی و اخلاقی اقدار بھی ان کے ہاں اب محض روایتوں اور رسموں کی حد تک زندہ رہ گئی تھیں۔ بدقسمتی سے آج اُمتِ مسلمہ بھی ایسے ہی نظریاتی و اخلاقی انحطاط کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ؕ﴿۱﴾ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۙ﴿۲﴾ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ
الْمِسْکِیْنِ ؕ﴿۳﴾ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۙ﴿۴﴾ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ ۙ﴿۵﴾ الَّذِیْنَ ھُمْ
یُرَآءُوْنَ ۙ﴿۶﴾ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ؑ﴿۷﴾ ع

آیت ۱ ﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ﴿۱﴾﴾ ”کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟“

جو نہ تو بعث بعد الموت کا قائل ہے اور نہ ہی آخرت کی جزا و سزا کو مانتا ہے۔ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس زندگی کے سوا ان کی کوئی اور زندگی نہیں ہے: ﴿وَقَالُوْا مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ ۚ﴾ (الجاثیۃ: ۲۴) ”وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے (کوئی اور زندگی) سوائے ہماری دنیا کی زندگی کے، ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں اور ہمیں نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ“۔

آخرت کے احتساب کا انکار کر کے انسان دراصل جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس کا کردار ع ”بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست“ کے فلسفے کا چلتا پھرتا اشتہار بن کر رہ جاتا ہے۔

آیت ۲ ﴿فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ﴿۲﴾﴾ ”یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔“

ظاہر ہے جو انسان اچھے برے اعمال کی جزا و سزا کو نہیں مانتا وہ معاشرے کے ایسے افراد کے لیے اپنا مال بھلا کیوں ضائع کرے گا جن سے اسے کسی فائدے کی توقع نہیں؟

آیت ۳ ﴿وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ﴿۳﴾﴾ ”اور نہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی تلقین کرتا ہے۔“

اس میں انسان کی اس اخلاقی کمزوری کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جس نیک کام پر وہ خود کاربند نہیں ہے اس کے بارے میں دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کرے۔

آیت ۴،۵ ﴿فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۝۴ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ۝۵﴾ ''تو بربادی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے' جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے زمانے تک مشرکین عرب کے ہاں نماز کا تصور موجود تھا لیکن اس کی عملی شکل بالکل مسخ ہو چکی تھی۔ جیسا کہ سورۃ الانفال کی اس آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے: ﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمۡ عِنۡدَ الۡبَيۡتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصۡدِيَةً ؕ﴾ (آیت ۳۵) ''اور نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس سوائے سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا''۔ ظاہر ہے جو لوگ برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے اور اس طواف کو سب سے اعلیٰ طواف سمجھتے تھے' ان کے لیے تو نماز میں سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا بھی ایک مقدس عمل اور حصولِ ثواب کا بہت بڑا ذریعہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم مسلمانوں کے ہاں نماز کی ظاہری شکل آج تک اپنی اصلی حالت میں جوں کی توں قائم ہے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا اور پھر حکم دیا: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ))(۱) کہ تم لوگ نماز اسی طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ حضور ﷺ کی نماز کا وہ طریقہ اور عملی نمونہ جو صحابہؓ کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے' آج ہم اس پر تو کاربند ہیں لیکن بدقسمتی سے نماز کی اصل روح سے ہم بالکل غافل ہو چکے ہیں۔ نماز کی اصل روح تو نمازی کا خضوع وخشوع اور یہ احساس ہے کہ وہ کس کے سامنے کھڑا ہے اور کس کے حضور کھڑے ہو کر اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ جیسا عہد و پیمان باندھ رہا ہے۔ بہرحال آج ہماری نمازیں اس روح سے خالی ہو کر محض ایک ''رسم'' کی ادائیگی کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ اقبال نے اپنے خصوصی انداز میں مسلمانوں کی اس زبوں حالی کی تصویر انہیں بار بار دکھائی ہے:۔

رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی!

اور ۔

نماز و روزہ و قربانی و حج　　یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے!

آیت ۶ ﴿الَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَآءُوۡنَ ۝۶﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں۔''

وہ نماز کی ادائیگی سمیت ہر نیک کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں تاکہ ان کی نیکی کا چرچا ہو۔

آیت ۷ ﴿وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ۝۷﴾ ''اور عام استعمال کی چیز بھی (مانگنے پر) نہیں دیتے۔''

مَاعُوْن کے معنی روزمرہ استعمال کی چیزیں ہیں' جو ہر پڑوسی بوقت ضرورت اپنے پڑوسی سے عاریتاً لے لیتا ہے اور اپنی ضرورت پوری کر کے واپس لوٹا دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے کردار کی پستی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے پاس سے آگ کی چنگاری (ماچس وغیرہ) اور نمک جیسی معمولی اشیاء تک بھی کسی کو دینا پسند نہیں کرتے۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ.....' ح: ۶۳۱۔

سُوْرَۃُ الْکَوْثَر

تمہیدی کلمات

سورۃ الکوثر اور اس سے پہلے کی تین سورتوں کے مضمون میں باہم گہرا ربط اور تعلق پایا جاتا ہے۔ اس ربط کو یوں سمجھئے کہ پہلی تین سورتوں (سورۃ الفیل‘ سورۂ قریش اور سورۃ الماعون) میں حضور ﷺ کی بعثت سے قبل کے ماحول کا تاریخی‘ اقتصادی اور اخلاقی پس منظر دکھایا گیا ہے‘ جبکہ سورۃ الکوثر میں آپ ﷺ کی بعثت کا ذکر ہے۔ گویا مذکورہ تینوں سورتوں کی حیثیت سورۃ الکوثر کی تمہید کی سی ہے۔ سورۃ الفیل میں اس دور کے ایک بہت اہم تاریخی واقعہ کا ذکر ہے۔ سورۂ قریش میں قریشِ مکّہ کی اقتصادیات کا حوالہ ہے کہ انہیں جو خوشحالی اور امن وامان حاصل ہے وہ صرف اور صرف بیت اللہ کی وجہ سے ہے‘ جبکہ سورۃ الماعون میں اس معاشرے کی اخلاقی پستی کی نشاندہی کی گئی ہے اور اب سورۃ الکوثر میں حضور اکرم ﷺ کی بعثت کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۝۳ ع ۲۲

آیت ۱ ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱﴾ ”(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو خیرِ کثیر عطا کیا۔“

الکوثر: کثرت سے ماخوذ ہے‘ اس کا وزن فَوْعَلْ ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کا اتنا کثیر ہونا کہ اس کا اندازہ نہ لگایا جا سکے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ ”خیرِ کثیر“ کیا گیا ہے۔

”الکوثر“ کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے حوضِ کوثر مراد ہے‘ جو میدانِ حشر میں ہوگا اور اس سے حضور ﷺ اپنی امت کے پیاسوں کو سیراب فرمائیں گے۔ لیکن درحقیقت وہ بھی ”خیرِ کثیر“ ہی میں شامل ہے۔ ”خیرِ کثیر“ کی وضاحت سے متعلق بھی تفاسیر میں لگ بھگ پچیس تیس اقوال ملتے ہیں۔ حضور ﷺ کو عطا ہونے والے خیرِ کثیر کی سب سے بڑی مثال خود قرآن مجید ہے۔ اسی طرح اس کی ایک مثال حکمت بھی ہے۔ ظاہر ہے آپ ﷺ کو اعلیٰ ترین درجے میں حکمت بھی عطا ہوئی تھی‘ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ”وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے‘ اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا“۔ مزید برآں جنت کی نہرِ کوثر‘ نبوت کے فیوض و برکات‘ دینِ اسلام‘ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثرت‘ رفعِ ذکر اور مقامِ محمود کو ”کوثر“ کا مصداق سمجھا دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کو وہ سب کچھ عطا کر دیا اور کثرت کے

ساتھ عطا کر دیا جس کی انسانیت کو ضرورت ہے اور جو نوعِ انسانی کے لیے طُرّۂ امتیاز بن سکتا ہے۔

آیت ۲ ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿۲﴾﴾ ''پس آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھا کیجیے اور قربانی کیا کیجیے۔''

نحر کے لغوی معنی اونٹ ذبح کرنے کے ہیں۔ اس آیت میں جن دو احکام کا ذکر ہے ان دونوں پر عید الاضحیٰ کے دن عمل ہوتا ہے۔ یعنی عید الاضحیٰ کے دن پہلے مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور پھر جانور قربان کرتے ہیں۔

آیت ۳ ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾﴾ ''یقیناً آپ (ﷺ) کا دشمن ہی جڑ کٹا ہوگا۔''

شَانِئ بغض و عداوت رکھنے والے دشمن کو کہتے ہیں۔ اَبْتَر: بتر سے ہے، یعنی کسی چیز کو کاٹ دینا، منقطع کر دینا۔ اہلِ عرب دُم کٹے جانور کو ابتر کہتے ہیں۔ عرفِ عام میں اس سے ایسا آدمی مراد لیا جاتا ہے جس کی نرینہ اولاد نہ ہو اور جس کی نسل آگے چلنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ یہ لفظ مشرکینِ مکہ نے (معاذ اللہ) حضور ﷺ کے لیے استعمال کیا تھا، جس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضور ﷺ کی یہ اولاد پیدا ہوئی: قاسم، پھر زینب، پھر عبداللہ، پھر اُم کلثوم، پھر فاطمہ، پھر رقیہ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ پہلے قاسم کا انتقال ہوا۔ پھر عبداللہ (جن کا لقب طیب و طاہر ہے) داغِ مفارقت دے گئے۔ اس پر مشرکین نے خوشیاں منائیں کہ آپ کے دونوں فرزند فوت ہو گئے ہیں اور باقی اولاد میں آپ کی بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں۔ لہٰذا آپ جو کچھ بھی ہیں بس اپنی زندگی تک ہی ہیں، آپ کے بعد نہ تو آپ کی نسل آگے چلے گی اور نہ ہی کوئی آپ کا نام لیوا ہوگا۔ اس پس منظر میں یہاں ان لوگوں کو سنانے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ آپ کا نام اور ذکر تو ہم بلند کریں گے، جس کی وجہ سے آپ کے نام لیوا تو اربوں کی تعداد میں ہوں گے۔ البتہ آپ کے یہ دشمن واقعی ابتر ہوں گے جن کا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔

سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْن

تمہیدی کلمات

سورۃ الکافرون گویا حضور ﷺ کا ان لوگوں سے اعلانِ براءت ہے جن پر ہر لحاظ سے ''حق'' واضح ہو چکا تھا اور وہ اس اتمامِ حجت کے باوجود بھی آپؐ کو جھٹلانے پر تُلے ہوئے تھے۔ یہ موڑ ہر رسولؑ کی دعوت کے سفر کے دوران آتا رہا ہے۔ ظاہر ہے ایسے اعلان کا انداز ناصحانہ یا واعظانہ نہیں بلکہ جارحانہ ہوتا ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ مکّہ مکرمہ کے اُس دور میں نازل ہوئی جب قریشِ مکّہ وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے' تاکہ آپؐ ان میں سے کسی ایک کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپؐ کے اور اُن کے مابین پیدا ہو چکا تھا۔ اس پر یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی جس نے کفارِ مکّہ کی ساری اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا اور انہیں ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ
مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ ع

آیت ۱ ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ①﴾ ''(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو!''

نوٹ کیجیے! یہ داعیانہ طرزِ تخاطب نہیں ہے' بلکہ لاتعلق اور علیحدہ ہونے کا انداز ہے۔ ظاہر ہے ایک داعی تو اپنے مخاطبین کو یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کہہ کر پکارتا ہے' کہ اے اللہ کے بندو! میری بات سنو! گویا کلمہ تخاطب میں ہی مفہوم واضح کر دیا گیا کہ اگر میری تمام تر ناصحانہ کوششوں کے باوجود بھی تم لوگوں نے کفر و انکار پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو تمہارا یہ فیصلہ اور طرزِ عمل تمہیں مبارک ہو۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے بعد اب میری اور تمہاری راہیں جدا ہو چکی ہیں۔

آیت ۲ ﴿لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ②﴾ ''میں ان کو ہرگز نہیں پوجتا جن کو تم پوجتے ہو۔''

آیت ۳ ﴿وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ③﴾ ''اور نہ تم پوجنے والے ہو اُسے جسے میں پوجتا ہوں۔''

اس آیت میں ان کے تمام معبودوں کی نفی کر دی گئی ہے۔ وہ لوگ اللہ کی پرستش تو کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے بھی قائل تھے۔ اس پس منظر میں ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ جس طرح میں خالص اللہ کی بندگی کرتا ہوں' اس طرح تم لوگ صرف اور صرف اس کی پرستش نہیں کرتے ہو۔ چنانچہ تمہاری اس

انداز کی پرستش تمہارے اپنے خودساختہ معبودوں کی پرستش تو ہو سکتی ہے ایک اللہ کی پرستش نہیں ہو سکتی۔

آیت ۴ ﴿وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴﴾ ''اور نہ ہی میں آئندہ کبھی پوجنے والا ہوں ان کو جن کی تم پرستش کر رہے ہو۔''

ان آیات میں بظاہر تکرار نظر آتی ہے لیکن درحقیقت اس اسلوب میں ماضی حال اور مستقبل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یعنی نہ میں نے زمانہ ماضی میں کبھی تمہارے معبودانِ باطل کی پرستش کی اور نہ آئندہ کبھی تم مجھ سے اس کی توقع کر سکتے ہو۔

آیت ۵ ﴿وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۵﴾ ''اور نہ تم پوجنے والے ہو اس کو جس کو میں پوج رہا ہوں۔''

آیت ۶ ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶﴾ ''اب تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔''

اب میرا تمہارا تعلق ختم۔ تم لوگ جس راستے پر جا رہے ہو تمہیں وہ راستہ مبارک ہو۔ تم اپنے حال میں مست رہو میں اپنے دین حق پر ثابت قدم ہوں۔ حق و باطل کا یہ معرکہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ کر رہے گا اور تم دیکھو گے کہ جلد ہی جزیرۂ عرب پر دینِ اسلام غالب آ کر رہے گا۔

سُوْرَةُ النَّصْر

تمہیدی کلمات

سورۃ النصر کے بارے میں اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ مدنی ہے لیکن میری تحقیق کے مطابق یہ سورت ابتدائی مکی دور میں نازل ہوئی اور اس میں حضور ﷺ کو خوشخبری سنائی گئی کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ کی تائید ونصرت سے آپ اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں گے اور لوگ فوج درفوج اللہ کے دین میں داخل ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس مفہوم میں میرے نزدیک اس سورت کے مضمون کا سورۃ الانشراح کی ان آیات سے گہرا تعلق ہے: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝﴾ ''پھر جب آپ فارغ ہو جائیں تو خوب محنت کیجیے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جایئے''۔ بلکہ اس سورت کی آخری آیت کے الفاظ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ﴾ تو سورۃ الانشراح کی مذکورہ آیات کے مضمون کا تسلسل محسوس ہوتے ہیں۔ (۱)

واضح رہے کہ قرآن مجید کے مختلف مصاحف میں کسی سورت کے بارے میں مکی یا مدنی لکھا ہونا حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ دراصل طویل سورتوں کے زمانۂ نزول کے بارے میں تو تیقن کے ساتھ معلوم ہے کہ یہ مکی ہیں یا مدنی' چنانچہ ان کے بارے میں مفسرین کا اجماع ہے' جبکہ چھوٹی سورتوں میں سے اکثر کے زمانۂ نزول سے متعلق تفاسیر میں بہت سے اقوال ملتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ع

(۱) سورۃ النصر کے زمانۂ نزول کے بارے میں مفسرین نے مختلف آراء نقل کی ہیں۔ ایک یہ کہ فتح مکہ کے بعد نازل ہونے والی سورتوں میں یہ سب سے آخری سورت ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ فتح مکہ سے پہلے اس کی بشارت کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ یہ قرآن مجید کی آخری سورت ہے' یعنی اس کے بعد کوئی مکمل سورت رسول اللہ ﷺ پر نازل نہیں ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول روایت کے مطابق یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط میں بمقام منیٰ نازل ہوئی اور اس کے بعد حضور ﷺ نے اونٹنی پر سوار ہو کر اپنا مشہور خطبہ (خطبۂ حجۃ الوداع) دیا۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس میں حضور ﷺ کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی نصرت آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپؐ کا وقت آن پورا ہوا۔ اس کے بعد آپ ﷺ اللہ کی حمد اور استغفار کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ابن عباسؓ کے اس قول کی تائید منقول ہے۔ (حاشیہ از مرتب)

آیت ۱ ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ①﴾ ''جب آ جائے مدد اللہ کی اور فتح نصیب ہو۔''

آیت ۲ ﴿وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ②﴾ ''اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج درفوج۔''

آیت ۳ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ﴾ ''تو پھر آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے' اور اس سے مغفرت طلب کیجیے۔''

﴿اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ③﴾ ''یقیناً وہ بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے۔''

یعنی ابھی تو آپ کو دعوت و تبلیغ اور فریضہ رسالت کے سلسلے میں بہت سی مشقتیں اٹھانی ہیں اور جنگ و قتال کے مراحل سے گزرنا ہے' لیکن جب آپ اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں یعنی اللہ کا دین غالب ہو جائے تو آپ ہمہ وقت' ہمہ تن اپنے رب کی تسبیح و تحمید میں مشغول ہو جایئے گا۔ نوٹ کیجیے! سورۃ الانشراح کی آخری آیات میں بھی اسی اسلوب و انداز میں بالکل ایسا ہی حکم دیا گیا ہے۔

سُوْرَۃُ اللَّھَب

تمہیدی کلمات

حضورﷺ اپنی بعثت کے بعد تقریباً تین سال تک دعوت و تبلیغ کا فریضہ زیادہ تر ذاتی سطح کی انفرادی ملاقاتوں (PP calls) کے ذریعے سرانجام دیتے رہے۔ اسی دوران آپؐ نے اپنے خاندان یعنی بنو ہاشم کے لوگوں کو دعوت کی غرض سے دو مرتبہ کھانے پر مدعو کیا۔ بعض مستشرقین نے آپؐ کے اس دور کے دعوتی رابطوں کو زیرزمین (under ground) سرگرمیوں کا نام دیا ہے جو کہ بالکل خلافِ حقیقت بات ہے' البتہ اسے دھیمے انداز کی (low key) دعوت کہا جا سکتا ہے۔

بہرحال جب سورۃ الحجر کی آیت ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۝۹۴﴾ کے ذریعے آپؐ کو حکم ملا کہ آپؐ اپنی دعوت کو ڈنکے کی چوٹ عام کریں تو آپؐ نے قریش مکہ کو کھلے عام دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے آپﷺ نے معاشرے کے عام رواج کے مطابق ایک دن کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر وَاصَبَاحَا کا نعرہ بلند کیا۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ اگر کوئی شخص لوگوں کو کسی اہم خبر سے متنبہ کرنا چاہتا تو وہ برہنہ حالت میں کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر وَاصَبَاحَا کی آواز بلند کرتا۔ عرب میں یہ نعرہ خطرے کا الارم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جو کوئی بھی اسے اس حالت میں دیکھتا یا اس کی آواز سنتا وہ اس کی بات سننے کے لیے فوراً اس کی طرف دوڑ پڑتا۔ اس زمانے میں زیادہ تر خبریں مخالف قبیلوں کے حملوں وغیرہ کے بارے میں ہوتی تھیں' اس حوالے سے کلمہ وَاصَبَاحَا کا مفہوم یہ تھا کہ کل تم لوگ بہت بری صبح کا سامنا کرنے جا رہے ہو۔ (اس زمانے میں یہ گویا ہنگامی پریس کانفرنس کا ایک انداز تھا۔) چنانچہ حضورﷺ نے اسی رواج پر جزوی انداز سے عمل کرتے ہوئے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر وَاصَبَاحَا کے اعلان سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ گویا آپؐ بھی ان لوگوں کو ایک بھیانک صبح کی خبر دینے والے تھے' اگرچہ یہ خبر اگلے دن کی معمول کی صبح کی نہیں تھی بلکہ صبح قیامت سے متعلق تھی: ؎

خندۂ صبح قیامت ہی سہی! بات کوئی تو ہنسی کی نکلے

بہرحال جب قریش کے لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے انہیں مخاطب کر کے انذارِ آخرت کے بارے میں ایک مدلل و مؤثر خطبہ ارشاد فرمایا۔ ابولہب آپؐ کے گھر کھانے کی دعوت میں آپؐ کی یہ باتیں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اس نے اس موقع پر انتہائی گستاخانہ انداز میں کہا: تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ کہ تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں (معاذ اللہ! نقل کفر کفر نباشد) تم نے صرف اس بات کے لیے ہمیں بلایا تھا؟ چنانچہ اس کے اس رویے اور اس جملے کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی اور اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا کہ ہاتھ تو دراصل تمہارے ٹوٹے ہیں اور تم اپنی بیوی سمیت دہکتی آگ کے گڑھے میں بھی گر چکے ہو۔

اپنے مضمون کے اعتبار سے اس سورت کا انداز سورۃ الکوثر کی آخری آیت ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ③﴾ سے ملتا جلتا ہے۔ سورۃ الکوثر کی اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے دشمنوں کے گستاخانہ فقروں کا جواب خود دیا تھا اور ان پر واضح کر دیا تھا کہ ''ابتر'' تو حقیقت میں تم لوگ ہو اور تمہارے بعد دنیا میں تمہارا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِىۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ ؕ ① مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ؕ ② سَيَصۡلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۖۚ ③

ع وَّامۡرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ ۚ ④ فِىۡ جِيۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ⑤

آیت ۱ ﴿تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِىۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ ①﴾ ''ٹوٹ گئے ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ و برباد ہوگیا۔''

آیت ۲ ﴿مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ②﴾ ''کچھ کام نہ آیا اس کے اس کا یہ مال اور وہ کمائی جو اس نے کی ہے۔''

آیت ۳ ﴿سَيَصۡلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③﴾ ''عنقریب وہ جھونکا جائے گا بھڑکتی ہوئی آگ میں۔''

لَھَب کے معنی آگ کے شعلے اور انگارے کے ہیں۔ اس شخص کی کنیت (ابولہب) کے حوالے سے یہاں اس لفظ کا استعمال ''صنعتِ لفظی'' کی بہترین مثال ہے۔ اس کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا' لیکن اپنی سرخ و سفید رنگت کی وجہ سے ''ابولہب'' (شعلہ رو) کی کنیت سے مشہور تھا۔ ظاہری اعتبار سے ابولہب بہت وجیہہ اور خوبصورت شخص تھا۔ اس پس منظر میں اس آیت کے الفاظ گویا یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اس شخص کو سرخ و سفید رنگت اور خوبصورت شکل و صورت بھی ہم نے عطا کی ہے اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں بھی اسے ہم ہی جھونکیں گے۔

[قرآن مجید کا یہ واحد مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے' حالانکہ مکہ مدینہ اور دیگر قبائل عرب میں حضور ﷺ کے دشمنوں اور بدخواہوں کی کمی نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابولہب حضور ﷺ کا حقیقی چچا اور قریب ترین ہمسایہ ہونے کے باوجود آپ ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھا اور اس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبت میں صلہ رحمی اور خاندانی حمیت جیسی عرب روایات کا بھی کچھ پاس نہ کیا۔]

آیت ۴ ﴿وَّامۡرَاَتُهٗ ؕ﴾ ''اور اس کی بیوی کو بھی۔''

اس کی بیوی بھی حضور ﷺ کی دشمنی میں ہمیشہ پیش پیش رہتی تھی۔ اس کا نام اَروَہ اور کنیت اُمّ جمیل تھی اور اس کے دل میں حضور ﷺ کی عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حضور ﷺ کی دشمنی کے اعتبار سے ان دونوں کے بارے میں جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ میاں بیوی میں سے کون حضور ﷺ کا بڑا دشمن تھا۔

قبل ازیں سورۃ التحریم کے آخری رکوع میں ہم خواتین کے کردار کی تین مثالوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ پہلی مثال میں حضرت لوط اور حضرت نوح علیہما السلام کی کافر بیویوں کا ذکر ہے۔ یہ بہترین شوہروں کے گھروں میں بدترین

بیویوں کی مثال ہے۔ پھر فرعون کی بیوی آسیہ ؓ کا ذکر گویا بدترین شوہر کے ہاں بہترین بیوی کی مثال ہے۔ اس کے بعد حضرت مریم سلامٌ علیہا کے حوالے سے ایک ایسی خاتون کی مثال بیان کی گئی ہے جو خود بھی نیک فطرت تھی اور حضرت زکریا علیہ السلام کی سرپرستی میں انہیں ماحول بھی ایسا ملا جو نیکی اور پاکیزگی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ گویا وہاں سورۃ التحریم میں خواتین کے حوالے سے تین قسم کی ممکنہ صورتوں کی مثالوں کا ذکر تو ہو چکا ہے، جبکہ اس سلسلے کی چوتھی ممکنہ صورت کا ذکر یہاں اس سورت میں ہوا ہے، یعنی شوہر بھی بدترین اور بیوی بھی بدترین۔

﴿حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ ۝۴﴾ ''جو ایندھن اٹھانے والی ہوگی۔''

روایات میں چونکہ ذکر ملتا ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی بہت بخیل تھے، اس لیے بعض لوگوں نے ان الفاظ سے یہ سمجھا ہے کہ یہ عورت جنگل سے لکڑیاں چن کر لایا کرتی تھی، حالانکہ یہ بات خلافِ عقل و قیاس ہے۔ ابولہب نہ صرف بہت مال دار تھا بلکہ معاشرتی لحاظ سے وہ اپنے زمانے کا بہت بڑا منصب دار بھی تھا۔ وہ حرم کے محکمہ مالیات کا انچارج تھا (اس حیثیت سے اس پر اگرچہ یہ الزام بھی تھا کہ اس نے حرم کے خزانے سے سونے کے دو ہرن چرا لیے تھے)۔ چنانچہ یہ دونوں میاں بیوی اپنے معاشرے کی اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معاشرے کی ایک وی آئی پی خاتون، بنو ہاشم کے رئیس کی بیوی، جسے گویا خاتونِ اوّل کا سا درجہ حاصل تھا، کے بارے میں جنگل سے لکڑیاں چن کر سر پر گٹھڑ لاد کر لانے والی بات بالکل قرین قیاس نہیں۔ چنانچہ اس آیت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اس عورت کی حرکتیں جہنم کی آگ کا ایندھن اکٹھا کرنے اور اپنے شوہر کی آگ کو مزید بھڑکانے کے مترادف ہیں۔ جب یہ اپنے شوہر کے ساتھ جہنم میں جھونکی جائے گی اُس وقت اس کا حال اُس مجرم کا سا ہوگا جو اپنے جلانے کا ایندھن خود اٹھائے ہوئے ہو۔

آیت ۵ ﴿فِیۡ جِیۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ۝۵﴾ ''اس کے گلے میں بٹی ہوئی رسّی ہوگی۔''

آج یہ عورت اپنے گلے میں جو خوبصورت ہار پہنے پھرتی ہے کل آخرت میں یہی ہار اس کے گلے میں ایک مضبوط بٹی ہوئی رسّی کی صورت اختیار کرلے گا جیسی رسی ایندھن ڈھونڈنے والی لونڈیوں کے گلے میں پڑی ہوتی ہے۔ اس رسّی میں یہ اپنے اعمالِ بد کا ایندھن باندھ کر جہنم میں لے جائے گی اور اپنی اور اپنے شوہر کی آگ کو مزید بھڑکائے گی۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے کہ ''شاید وہاں زقوم اور ضریع کی (جو جہنم کے خاردار درخت ہیں) لکڑیاں اٹھائے پھرے اور ان کے ذریعے سے اپنے شوہر پر عذابِ الٰہی کی آگ کو تیز کرتی رہے۔''

سُوْرَةُ الاِخْلَاص

تمہیدی کلمات

سورۃ الاخلاص قرآن مجید کی مختصر ترین سورتوں میں سے ہے اور توحید باری تعالیٰ کے موضوع پر یہ قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ اسی لیے حضورﷺ نے اس سورت کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔'الاخلاص' اس سورت کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے' کیونکہ اس میں خالص توحید بیان کی گئی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ع

آیت ۱ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١﴾ ''کہہ دیجیے وہ اللہ یکتا ہے۔''

اَحَد : وہ اکیلا اور یکتا جس کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں۔ وہی اکیلا ربّ ہے' کسی دوسرے کا ربوبیت اور اُلوہیت میں کوئی حصہ نہیں۔ وہی تنہا کائنات کا خالق' مالک الملک اور نظامِ عالم کا مدبر و منتظم ہے۔

آیت ۲ ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢﴾ ''اللہ سب کا مرجع ہے۔''

صَمَد کے لغوی معنی ایسی مضبوط چٹان کے ہیں جس کو سہارا بنا کر کوئی جنگجو اپنے دشمن کے خلاف لڑتا ہے تاکہ دشمن پیچھے سے حملہ نہ کر سکے۔ بعد میں یہ لفظ اسی مفہوم میں ایسے بڑے بڑے سرداروں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو لوگوں کو پناہ دیتے تھے اور جن سے لوگ اپنے مسائل کے لیے رجوع کرتے تھے۔ اس طرح اس لفظ میں مضبوط سہارے اور مرجع (جس کی طرف رجوع کیا جائے) کے معنی مستقل طور پر آ گئے۔ چنانچہ اَللّٰهُ الصَّمَدُ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کا مرجع اور مضبوط سہارا ہے۔ وہ خود بخود قائم ہے' اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ باقی تمام مخلوقات کو اس کے سہارے کی ضرورت ہے اور تمام مخلوق کی زندگی اور ہر چیز کا وجود اسی کی بدولت ہے۔ ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ (البقرۃ: ۲۵۵) ''اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی شے کا بھی سوائے اس کے جو وہ خود چاہے''۔ ظاہر ہے وہ الحی اور القیوم ہے' یعنی خود زندہ ہے اور تمام مخلوق کو تھامے ہوئے ہے۔ باقی تمام مخلوقات کے ہر فرد کا وجود مستعار ہے اور کائنات میں جو زندہ چیزیں ہیں ان کی زندگی بھی مستعار ہے۔ جیسے ہم انسانوں کی زندگی بھی ''عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن!'' کے مصداق اسی کی عطا کردہ ہے۔

آیت ۳ ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳﴾ ''نہ اُس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔''

یعنی نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اُس کی کوئی اولاد ہے۔ یہ نکتہ سورۃ الجن میں بایں الفاظ واضح فرمایا گیا: ﴿مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝۳﴾ ''اس نے اپنے لیے نہ کوئی بیوی اختیار کی ہے اور نہ کوئی اولاد''۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور یہودیوں کے بعض فرقے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے تھے۔ مشرکینِ عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بتاتے تھے۔ اس آیت میں ایسے تمام عقائد باطلہ کی نفی کر دی گئی ہے۔

آیت ۴ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴﴾ ''اور کوئی بھی اُس کا کفو نہیں ہے۔''

کُفُو کے معنی ہم سر کے ہیں، جو قدرت، علم، حکمت اور دیگر صفات میں ہم پلہ اور ہم پایہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا نہ تو کوئی ہم پلّہ اور برابری کرنے والا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ضد، ند، مثل، مثال، مثیل وغیرہ ہے۔

سُوْرَةُ الفَلَق

تمہیدی کلمات

اب ہم قرآن مجید کی آخری دوسورتوں (مُعَوِّذَتَین) کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں۔ یہ سورتیں گویا قرآن مجید کے اختتام پر دو پہرے دار ہیں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں آتا ہے کہ مدینہ کے ایک یہودی نے حضورﷺ پر جادو کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے آپؐ بعض باتیں بھول جاتے تھے اور آپؐ کو جسمانی طور پر بھی تکلیف رہتی تھی۔ اس صورتِ حال پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورتیں نازل ہوئیں۔ حضورﷺ ان سورتوں کی کثرت سے تلاوت کرتے رہے تا آنکہ آپؐ سے جادو کے اثرات زائل ہو گئے۔

جدید دور کے عقلیت پسند (rationalists) ''اہلِ علم'' خصوصی طور پر منکرینِ احادیث ایسی روایات کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں' بلکہ ان کے خیال کے مطابق تو ایسا سمجھنا حضورﷺ کی توہین کے مترادف ہے۔ اس قسم کے دلائل کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ حضورﷺ کامل ترین انسان ہیں اور معراجِ انسانیت کے درجے پر فائز ہیں۔ آپؐ کی عصمت و عظمت کے مراتب بلاشبہ ہمارے تصور سے بھی ماوراء ہیں' لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عام بشری کیفیات آپؐ کی ذات پر بھی اثر انداز ہوتی تھیں۔ مقامِ غور ہے کہ اگر حضورﷺ کو بخار ہوتا تھا' اگر آپؐ تلوار کے وار سے زخمی ہوئے تھے' اگر زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے آپؐ پر نقاہت طاری ہوئی تھی اور اگر آپؐ پر نزع کی تکلیف وارد ہوئی تھی تو آخر جادو آپؐ پر کیونکر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ بات واضح رہے کہ جادو کا اثر حضورﷺ کی جسمانی صحت تک محدود تھا' رسالت کا کوئی پہلو قطعاً اس سے متاثر نہ تھا۔ بہرحال جادو اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضورﷺ پر جادو کیا گیا اور اس کے منفی اثرات کی وجہ سے آپﷺ کو تکلیف کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اور اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی امت کو ان سورتوں کا بیش بہا تحفہ عطا کیا۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہﷺ نے مجھ سے فرمایا: ((اَلَمْ تَرَ آیَاتٍ اُنْزِلَتِ اللَّیْلَۃَ لَمْ یُرَ مِثْلُھُنَّ قَطُّ؟ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ))[1] یعنی تمہیں خبر ہے اللہ تعالیٰ نے آج رات ایسی آیات نازل فرمائی ہیں جن کی پہلے کوئی مثال نظر نہیں آتی؟ وہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہیں۔

یہ دونوں سورتیں مدنی ہیں اور ان دونوں کا مضمون ایک ہی ہے۔ یہ مضمون ایک سورت کی شکل میں بھی نازل ہو سکتا تھا' لیکن قرآن مجید کا عمومی مزاج چونکہ ایسا ہے کہ زیادہ تر سورتیں جوڑوں کی شکل میں نازل ہوئی

(۱) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فضل قراءۃ المعوذتین۔

ہیں' اس لیے اللہ تعالیٰ نے بنیادی مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دو الگ الگ سورتوں کی شکل میں نازل فرمایا۔ مضمون کی اس تقسیم کے مطابق سورۃ الفلق میں ان چیزوں یا ان شرور سے پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انسان پر باہر سے حملہ آور ہوتی ہیں' جبکہ سورۃ الناس میں اندرونی طور پر اثر انداز ہونے والے شرور کا ذکر ہے۔ بہرحال ہمیں چاہیے کہ ان تمام شرور کے اثراتِ بد سے بچنے کے لیے ہم ان سورتوں کے ذریعے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے رہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۝ۙ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ۙ وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ۙ وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ۝ۙ وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ع ۳۸

آیت ۱ ﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ①﴾ ''کہو کہ میں پناہ میں آتا ہوں صبح کے رب کی۔''

فَلَقَ یَفۡلِقُ کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے کے ہیں۔ سورۃ الانعام کی آیت ۹۶ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے حوالے سے ﴿فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ ۚ﴾ کے الفاظ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے سپیدۂ سحر نمودار کرتا ہے۔ البتہ اسی سورت کی آیت ۹۵ میں یہ لفظ دانوں اور گٹھلیوں وغیرہ کے پھاڑنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَالنَّوٰی ؕ﴾۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے زمین کے اندر دانوں یا گٹھلیوں کو پھاڑتا ہے تو پودوں یا درختوں کی پتیاں اور جڑیں نکلتی ہیں۔ چنانچہ فلق سے مراد یہاں صرف صبح ہی نہیں بلکہ ہر وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عدم کا پردہ چاک کر کے وجود بخشا ہے۔ جیسے کہ اگلی آیت میں واضح کر دیا گیا:

آیت ۲ ﴿مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ②﴾ ''(میں پناہ میں آتا ہوں) اس کی تمام مخلوقات کے شر سے۔''

یعنی ''شر'' مستقل طور پر علیحدہ وجود رکھنے والی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مختلف مخلوقات کے اندر ہی کا ایک عنصر ہے۔ اس نکتے کو یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقص یا عیب سے پاک ہے۔ لیکن اس کی مخلوق اپنے خالق کی طرح کامل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہر مخلوق کے اندر کمی یا تقصیر و تنقیص کا کوئی نہ کوئی پہلو یا عنصر بالقوہ (potentially) موجود ہے۔ جیسے خود انسان کی متعدد کمزوریوں کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا ㉘﴾ کہ انسان بنیادی طور پر کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ﴿وَکَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ⑪﴾ کے الفاظ میں انسان کی جلد بازی کا ذکر ہوا۔ سورۃ المعارج میں اس کی تین کمزوریوں کا ذکر بایں الفاظ ہوا: ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ ہَلُوۡعًا ⑲ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ⑳ وَّاِذَا مَسَّہُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ㉑﴾ ''یقیناً انسان پیدا کیا گیا ہے تھڑدلا۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت بخیل بن جاتا ہے۔''

گویا انسان روحانی طور پر اگرچہ احسن تقویم کے درجے میں پیدا کیا گیا ہے' لیکن اس کے حیوانی اور مادی وجود میں مذکورہ خامیوں سمیت بہت سی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہر مخلوق میں مختلف کمزوریوں

کے متعدد پہلو پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے 'شر' جنم لیتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ اے پروردگار! تیری جس جس مخلوق میں شر کے جو جو پہلو پائے جاتے ہیں میں ان میں سے ہر قسم کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔

آیت ۳ ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ③﴾ ''اور (خاص طور پر) اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جائے۔''

ظاہر ہے رات کے اندھیرے میں انسانوں' جنوں اور ضرر رساں جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کی صورت میں شر پھیلانے والے عناصر زیادہ فعال اور مستعد ہو جاتے ہیں۔ گویا رات کا اندھیرا بذاتِ خود ایک بہت بڑا شر ہے جس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا ضروری ہے۔

آیت ۴ ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ④﴾ ''اور اُن عورتوں کے شر سے جو گرہیں باندھ کر پھونکیں مارتی ہیں۔''

یعنی وہ تمام ٹونے ٹوٹکے' تعویذ گنڈے اور سفلی عملیات جن کے ذریعے سے کسی انسان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے یہاں یہ نکتہ اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ کسی چیز کا بالفعل موجود ہونا اور بات ہے اور اس چیز کا حلال' حرام یا جائز' ناجائز ہونا الگ بات ہے۔ مثلاً جادو ایک حقیقت ہے لیکن کفر ہے۔ شراب اپنی ایک مخصوص تاثیر رکھتی ہے لیکن حرام ہے۔ اسی طرح علم نجوم' پامسٹری (ہاتھ کی لکیروں کا علم) اور سفلی عملیات کی حقیقت اور تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا (ظاہر ہے جب ہم اچھے وظائف و کلمات کی اچھی تاثیر کو مانتے ہیں تو ہمیں سفلی و شیطانی کلمات وغیرہ کی منفی تاثیر کا بھی اقرار کرنا پڑے گا) لیکن شریعت نے ہمیں ایسے علوم سے استفادہ کرنے اور ایسے علوم کی بنیاد پر کیے گئے دعووں پر یقین کرنے سے منع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے اس نوعیت کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہ تو مؤثر ہو سکتی ہیں اور نہ ہی کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اس لیے ان کے شر سے بچنے کا آسان اور مؤثر طریقہ یہی ہے کہ انسان خود کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دے دے۔

آیت ۵ ﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ⑤﴾ ''اور حسد کرنے والے کے شر سے بھی (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) جب وہ حسد کرے۔''

ظاہر ہے جب ایک انسان کسی دوسرے انسان سے حسد کرتا ہے تو عین ممکن ہے وہ اپنے حاسدانہ جذبات سے مغلوب ہو کر عملی طور پر بھی اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَلْعَیْنُ حَقٌّ))(۱) یعنی نظر لگ جانا برحق ہے۔ چنانچہ حاسدانہ نگاہ بذاتِ خود بھی منفی اثرات کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس لیے حاسد کے شر سے بچنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ کی ضرورت ہے۔

بہرحال جادو' ٹونے' تعویذ گنڈے' نظر بد وغیرہ کے اثرات اپنی جگہ مسلّم ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲ میں شیاطینِ جن کا ذکر آیا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ گھناؤنا کاروبار کسی نہ کسی انداز سے ہر زمانے میں چلتا رہا ہے۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ ایسی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الطب' باب العین حق۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب الطب والمرض والرقی۔

چیزیں سیکھنے سکھانے اور پھر مختلف دعووں کے ساتھ اپنا کاروبار چمکانے میں مصروف ہیں۔ البتہ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے ہماری شریعت میں ایسی چیزیں سیکھنا اور پھر کسی بھی انداز میں ان سے استفادہ کرنا حرام ہے۔ اس حوالے سے ایک بندۂ مؤمن کو اپنے دل میں پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی' جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں بھی واضح کیا گیا ہے: ﴿وَمَاهُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۰۲)۔ ایک بندۂ مؤمن کو یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ جو تکلیف بھی آئے گی وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہی آئے گی (یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وجہ سے اللہ تعالیٰ خود کسی انسان کو کسی تکلیف یا مشکل سے دوچار کرنا چاہے) اور اللہ کے اذن سے ہی دور ہو گی۔ جہاں تک ایسی چیزوں سے حفاظتی تدابیر اپنانے یا ایسے کسی شیطانی حملے کے توڑ کرنے کا تعلق ہے تو ان دو سورتوں (مُعَوِّذَتَین) کے ہوتے ہوئے ایک بندۂ مسلمان کو کسی اور عمل' تعویذ یا تدبیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ سورتیں اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو سکھائی تھیں اور اس لحاظ سے یہ حضور ﷺ کی وساطت سے اُمت کے لیے ایک بیش بہا تحفے کا درجہ رکھتی ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ ؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ ہر شب آرام کرنے سے پہلے آخری تینوں سورتیں (سورۃ الاخلاص اور معوذتین) پڑھ کر اپنے مبارک ہاتھوں پر دم فرماتے اور پھر اپنے سارے جسم پر پھیر لیتے۔ مزید برآں شیطانی اثرات اور نظر بد وغیرہ سے حفاظت کے لیے احادیث میں متعدد ادعیہ ماثورہ بھی وارد ہوئی ہیں' جن کو ہمیں اپنا معمول بنانا چاہیے۔

سُوْرَۃُ النَّاس

تمہیدی کلمات

جیسا کہ سورۃ الفلق کے تعارف کے دوران بھی بتایا جا چکا ہے کہ سورۃ الناس مدنی سورت ہے' بلکہ میری تحقیق کے مطابق تو سورۃ الملک سے شروع ہونے والی سورتوں کے اس آخری گروپ میں صرف یہی دو سورتیں (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) ہی مدنی ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر مکی مدنی سورتوں کے اس آخری گروپ اور پہلے گروپ کے درمیان مدنی اور مکی قرآن کی مقدار کے حوالے سے پائی جانے والی ایک ''معکوس (reciprocal) نسبت'' کے بارے میں بھی جان لیجیے۔ یعنی جس طرح سورتوں کے پہلے گروپ میں مکی قرآن بہت تھوڑا (صرف سورۃ الفاتحہ) اور مدنی قرآن کی مقدار نسبتاً بہت زیادہ (سورۃ البقرۃ' سورۂ آل عمران' سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ پر مشتمل تقریباً سوا چھ پارے) ہے' اسی طرح زیر مطالعہ آخری گروپ میں مدنی قرآن کی مقدار بہت کم (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) ہے اور اس کے مقابلے میں مکی قرآن تقریباً دو پاروں پر مشتمل ہے۔

سورۃ الفلق میں ان مضرتوں اور شر انگیزیوں سے پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انسان کے ظاہری حالات اور جسمانی کیفیات کو متاثر کرتی ہیں' جبکہ سورۃ الناس میں ایسے شرور سے پناہ طلب کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے جو انسان کے باطن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے ایمان وایقان پر یلغار کرتے ہیں۔

سورۃ الناس کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس سورت کا سورۃ الفاتحہ کے ساتھ بھی جوڑے کا تعلق ہے۔ ان دونوں سورتوں کی آیات میں گہری مشابہت اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ دونوں سورتوں کا ایک ساتھ مطالعہ کرنے سے یہ مشابہت اور مناسبت صاف نظر آتی ہے۔ مثلاً سورۃ الفاتحہ کی پہلی اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی حمد وصفات کا بیان اور اس کے رب العالمین ہونے کا اقرار ہے' جبکہ سورۃ الناس کی پہلی آیت میں تمام انسانوں کے رب سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ دونوں سورتوں کی اگلی دونوں آیات (مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ۝۳ اور مَلِكِ النَّاسِ۝۲) کی لفظی ومعنوی مشابہت بہت ہی واضح ہے۔ اس کے بعد سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے اور اس کی عبادت کرنے کے عہد کے ساتھ اس سے ہدایت کی درخواست کی گئی ہے' جبکہ اس کے متوازی سورۃ الناس میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت (اِلٰهِ النَّاسِ۝۳) کے اقرار کے ساتھ شیطان کے وساوس کے خلاف اس کی پناہ طلب کی گئی ہے۔ ظاہر ہے سیدھے راستے پر چلنے کے لیے مدد طلب کرنا (استعانت) اور شیطان کے حملوں سے پناہ مانگنا (استعاذہ) باہم ملتی جلتی اصطلاحات ہیں کہ اے اللہ ہم تیری عبادت کا وعدہ کرتے ہیں مگر ہم تیری مدد کے محتاج ہیں۔ اس کے لیے ہمیں تیرے سہارے اور تیری پناہ کی ضرورت ہے تاکہ تیری پناہ میں آ کر ہم شیطان کی وسوسہ اندازی سے محفوظ ہو جائیں۔ اس زاویے سے ان دونوں سورتوں کا جائزہ لیا جائے تو سورۃ الناس' سورۃ الفاتحہ کا عکس یا ثنیٰ (duplicate) بنتی نظر آتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِکِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰہِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۬ۙ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾
الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ٪﴿۶﴾ ع

آیت ۱ ﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾﴾ ''کہیے کہ میں پناہ میں آتا ہوں تمام انسانوں کے رب کی۔''

یہاں سب سے پہلے ''رَبّ الناس'' (لوگوں کا پروردگار) کے کلمات سے اللہ تعالیٰ کا تعارف کرایا گیا ہے کہ تمہیں ایسی ذات سے پناہ مانگنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو تمہاری جملہ ضروریات کا کفیل ہے۔

آیت ۲ ﴿مَلِکِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾﴾ ''تمام انسانوں کے بادشاہ کی۔''

وہ تمام انسانوں کا صرف پروردگار ہی نہیں' ان کا بادشاہ اور فرماں روا بھی ہے۔ اس کا حکم ہر وقت' ہر جگہ اور ہر چیز پر نافذ ہے۔

آیت ۳ ﴿اِلٰہِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾﴾ ''تمام انسانوں کے معبود کی۔''

انسانوں کا رب اور بادشاہ ہونے کے علاوہ وہ ان کا معبود بھی ہے' چنانچہ وہ ان پر کامل اقتدار اور اختیار رکھتا ہے اور ان کی حفاظت پر پوری طرح قادر ہے۔

آیت ۴ ﴿مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۬ۙ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾﴾ ''اس بار بار وسوسہ ڈالنے والے' پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے۔''

شیطان کی وسوسہ اندازی کا طریق کار یہ ہے کہ وہ لگاتار اپنی کوشش جاری رکھتا ہے اور انسان کو گمراہ کرنے کی کوششوں سے تھکتا نہیں۔ کبھی حملہ کرتا ہے' کبھی دفاعی پسپائی اختیار کرتا ہے اور پھر پلٹ کر حملہ آور ہوتا ہے۔

آیت ۵ ﴿الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾﴾ ''جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔''

آیت ۶ ﴿مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾﴾ ''خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔''

انسان کے دل و دماغ پر شیطانی وساوس کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کی وضاحت حضور ﷺ کے اس فرمان سے ملتی ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ))(۱) ''شیطان انسان کے وجود میں خون کی مانند گردش کرتا ہے''۔ گویا شیطان نفس انسانی کے اندر موجود حیوانی شہوات اور سفلی داعیات (فرائیڈ اسے id یا libido کا نام دیتا ہے) کو بھڑکاتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ شیطان اپنی تھوتھنی انسان کے دل پر رکھ کر پھونکیں مارتا ہے اور اس طرح اس کے جذبات و شہوات میں اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتکاف' باب زیارۃ المرأۃ زوجھا فی اعتکافہ۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب بیان انہ یستحب لمن رئی خالیا بامرأۃ......

انسان کے دل میں وسوسے پیدا کرنے اور اس کے جذبات کو انگیخت دینے کی حد تک اختیار دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان سے زبردستی کوئی عمل کرانے کا اختیار اسے نہیں دیا گیا۔ بہر حال نفس انسانی بعض اوقات شیطان کے بہکاوے میں آ کر متعلقہ انسان کے لیے شیطان کا نمائندہ بن جاتا ہے اور پھر بالکل شیطان ہی کی طرح اس کے دل میں وسوسہ اندازی شروع کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ قٓ میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ﴾ (آیت ۱۶) ''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے''۔ ایسے نفس انسانی کو سورۂ یوسفؑ کی آیت ۵۳ میں ''نفس امارہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے اہم اور بنیادی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ شیطان اُسی دل پر اپنی تھوتھنی رکھ کر پھونکیں مارتا ہے اور اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے جو دل اللہ کی یاد سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو دل اللہ کی یاد میں مشغول اور اس کے ذکر سے معمور ہوتا ہے شیطان اس سے دور رہتا ہے۔ بہر حال شیطان کے تمام وسوسے اور حربے انسان کے اپنے نفس کے ذریعے سے ہی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ سورت خصوصی طور پر شیطانی وساوس کے توڑ کے لیے نازل ہوئی ہے۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وايّاكم بالآيات والذّكر الحكيم○○

دعائے ختمِ قرآن

اَللّٰھُمَّ آنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ، اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ، وَاجْعَلْہُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً، اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنِیْ مِنْہُ مَا نَسِیْتُ، وَعَلِّمْنِیْ مِنْہُ مَا جَھِلْتُ، وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَہٗ آنَاءَ اللَّیْلِ وَآنَاءَ النَّھَارِ، وَاجْعَلْہُ لِیْ حُجَّۃً یَّارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ!

اب ہم اس دعا کا مطالعہ کریں گے' کیونکہ دعا مانگنے کا مزہ تو تبھی ہے جب انسان اپنی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا مفہوم بھی سمجھتا ہو۔

اَللّٰھُمَّ آنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ

''اے اللہ! میری قبر کے اندر مجھے جو وحشت ہوگی اسے میرے لیے مانوس کر دے!''

اس وحشت کو دُور کرنے کے لیے مجھے قرآن مجید کا اُنس عطا کر دے!—— یاد رکھیں! قبر کی وحشت قرآن کے ساتھ تعلق کی بنا پر مانوس ہوگی۔ اپنی جوانی کے ایام میں (جب آتش جوان تھا!) جب میں اس دُعا کو پڑھا کرتا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ قرآن سے متعلق اصل دعا تو اگلے فقرے سے شروع ہوتی ہے اور یہ پہلا جملہ اضافی سا ہے۔ مگر اب جبکہ بڑھاپے میں قبر ہر وقت سامنے نظر آتی ہے تو اب معلوم ہوا ہے کہ اس دعا کا اہم ترین حصہ تو یہی ہے۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ

''اے اللہ! مجھ پر رحم فرما قرآنِ عظیم کی بدولت''

وَاجْعَلْہُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً

''اور اس کو میرے لیے امام' نور' ہدایت اور رحمت بنا دے!''

یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہوئے انسان کو چاہیے کہ قرآن مجید کو اپنا امام بنانے کا ارادہ بھی کرے' کہ اب مجھے قرآن مجید کو اپنا راہبر و راہنما مان کر اس کی پیروی کرنی ہے۔ لیکن اگر دل میں ایسا کوئی شعوری ارادہ سرے سے موجود ہی نہ ہو تو ظاہر ہے ایسی کیفیت میں یہ دعائیہ کلمہ بھی ''ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاھِکُمْ'' کے مصداق محض منہ سے نکلی ہوئی ایک بات بن کر رہ جائے گا اور عملی طور پر اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنِیْ مِنْہُ مَا نَسِیْتُ

''اے اللہ! مجھے یاد کرا دے جو کچھ میں اس میں سے بھول جاؤں''

وَعَلِّمْنِيْ مِنْهُ مَا جَهِلْتُ

اور مجھے سکھا دے اس میں سے جو میں نہیں جانتا''

ظاہر ہے یہ دعا بھی تبھی کارگر ہوگی جب عملی طور پر قرآن مجید کو سمجھنے کی نیت اور کوشش انسان کے شاملِ حال ہوگی۔ یاد رکھیں! قرآن مجید کا علم بہت قیمتی چیز ہے۔ یہ عظیم دولت اللہ تعالیٰ کسی کی جھولی میں زبردستی نہیں ڈالتا۔ چنانچہ جس طرح انسان دنیا کے دوسرے علوم وفنون کو سیکھنے کے لیے محنت اور کوشش کرتا ہے اسی طرح قرآن مجید کو سیکھنے کے لیے بھی محنت درکار ہے۔ چنانچہ قرآن سیکھنے کے لیے آپ زانوئے تلمذ تہ کریں اور عربی سیکھیں۔ اس حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ اشعار بہت بصیرت افروز ہیں:

يَغُوْصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللَّآلِي وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى سَهِرَ اللَّيَالِي

''جو شخص بھی موتیوں کا طلب گار رہتا ہے اسے سمندر میں غوطہ زنی کرنا پڑتی ہے۔ اور جو شخص کسی بلند مقام تک پہنچنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے (اور محنت ومشقت کرتا ہے)۔''

وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى مِنْ غَيْرِ كَدٍّ اَضَاعَ الْعُمْرَ فِيْ طَلَبِ الْمُحَالِ

''اور جو کوئی بلندی کا طلب گار بن جائے بغیر کوشش کے وہ اپنی عمر ضائع کر بیٹھتا ہے ایک محال چیز کی طلب میں۔''

اس حوالے سے پڑھے لکھے خواتین وحضرات کو خصوصی طور پر بہت سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ اگر انہوں نے بہت سے دُنیوی علوم وفنون سیکھ رکھے ہیں تو آخر وہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کیوں نہیں سیکھ سکتے؟ اور یہ کہ قیامت کے دن وہ اپنی اس کوتاہی کے جواز میں آخر کیا عذر پیش کریں گے؟

وَارْزُقْنِيْ تِلَاوَتَهٗ

''اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اسے پڑھتا رہوں''

آنَاۗءَ الَّيْلِ وَآنَاۗءَ النَّهَارِ

''رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی۔''

وَاجْعَلْهُ لِيْ حُجَّةً يَّارَبَّ الْعٰلَمِيْنَ!

''اور اے تمام جہانوں کے پروردگار! اس قرآن کو میرے حق میں دلیل اور گواہ بنا دے۔''

اس جملے کا مفہوم سمجھنے کے لیے حضور ﷺ کا یہ فرمان مدنظر رہنا چاہیے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ)) ''کہ یہ قرآن حجت (دلیل یا گواہ) ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف!'' یعنی قرآن مجید قیامت کے دن ہر انسان کے حساب کے وقت گواہ بن کر کھڑا ہوگا۔ جس کسی نے حسبِ استطاعت اس کے حقوق (یعنی اس پر ایمان لانے، اس کو پڑھنے، سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی ترویج وتبلیغ کے حوالے سے) ادا کیے ہوں گے تو قرآن مجید اس کے حق میں گواہی دے گا اور اس کے شافع کی حیثیت سے اس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ لیکن جس شخص نے قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے سے بے اعتنائی برتی ہوگی قیامت کے دن وہ اس کے خلاف گواہی دے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ

کی عدالت میں اس کے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا کہ اے اللہ! یہ بد بخت مجھے تیرا کلام تو مانتا تھا مگر اس کے باوجود اس نے مجھے پڑھنے یا سمجھنے یا میرے احکام پر عمل کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہ کی۔

یہ تو وہ دعا ہے جو قرآن مجید کے نسخوں کے اختتام پر عام طور پر لکھی ہوئی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ سے ایک اور دعا بھی منقول ہے' جسے میں نے تین مختلف روایتوں سے جمع کر کے لوگوں کی سہولت کے لیے ترجمے کے ساتھ شائع کروایا ہے۔ اس دعا میں عاجزی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ، وَابْنُ عَبْدِكَ، وَابْنُ اَمَتِكَ ، فِیْ قَبْضَتِكَ، نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ ، مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُ كَ، اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَكَ، سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ، اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ، اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ، اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ مَكْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ، اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْكَرِیْمَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ، وَنُوْرَ صَدْرِیْ، وَجِلَاءَ حُزْنِیْ، وَذَھَابَ ھَمِّیْ وَ غَمِّیْ۔ آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ!

اس دعا کو پڑھتے ہوئے مجھے امام ابن تیمیہ ؒ کے وہ الفاظ یاد آ جاتے ہیں جو انہوں نے عبادت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کے الفاظ میں عبادت ''غَایَةُ الْحُبِّ مَعَ غَایَةِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ'' کا نام ہے۔ یعنی عبادت یہ ہے کہ انسان خود کو حد درجے کی محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے بچھا دے۔ اس دعا کے ایک ایک جملے اور ایک ایک لفظ میں اللہ تعالیٰ کے لیے غایت درجے کی محبت' انکساری' عاجزی اور تذلل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہر بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ وہ اس دعا کو زبانی یاد کر لے اور حرزِ جاں بنا لے۔

آیئے اب اس دعا کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیجیے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ ''اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں''

وَابْنُ عَبْدِكَ، وَابْنُ اَمَتِكَ ''تیرے ایک ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں۔''

میرا باپ بھی تیرا ادنیٰ غلام تھا اور میری والدہ بھی تیری ادنیٰ کنیز تھی۔

فِیْ قَبْضَتِكَ ''میں تیرے قبضہ قدرت میں ہوں۔''

نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ ''میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔''

مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ ''میرے پورے وجود میں تیرا ہی حکم جاری وساری ہے۔''

عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُ كَ ''میرے بارے میں تیرا ہر فیصلہ عدل ہی پر مبنی ہے۔''

اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَكَ، سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ ''میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ہر اُس پاک نام کے واسطے سے' جس سے تو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا۔''

اس جملے میں گویا قرآن مجید کے اس حکم کی جھلک نظر آ رہی ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪﴾ (الاعراف: ۱۸۰) کہ سب اچھے نام اللہ ہی کے ہیں' تم اس سے ان ناموں کے حوالے سے دعا کیا کرو۔

اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ ''یا جسے تو نے اپنی کسی کتاب میں نازل کیا''
اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ ''یا تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا''
اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ مَكْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ ''یا اسے ابھی تو نے اپنے پاس' اپنے غیب کے خزانے میں محفوظ رکھا ہوا ہے۔''

اب دیکھیں حضورﷺ نے اپنی عاجزی وانکساری اور اللہ تعالیٰ کے سارے ناموں کا حوالہ دے کر مانگا کیا ہے؟
اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْكَرِیْمَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ ''(اے اللہ!) اس قرآن کریم کو میرے دل کی بہار بنا دے''
وَنُوْرَ صَدْرِیْ ''اور اسے میرے سینے کا نور بنا دے''
وَجِلَاءَ حُزْنِیْ ''اور میرے رنج وحزن کا مداوا بنا دے''
وَذَهَابَ هَمِّیْ وَ غَمِّیْ ''اور میرے تفکرات اور غموں کے ازالے کا سبب بنا دے۔''
آمِیْنَ! ثُمَّ آمِیْنَ!!

نوٹ کیجیے! حضورﷺ نے عبدیت' تواضع اور تذلل کی انتہا پر جا کر اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے تو قرآن کریم کی محبت کا' قرآن مجید کی معیت کا اور قرآن حکیم کے سہارے کا۔ ظاہر ہے یہی تو کائنات کی سب سے قیمتی چیز اور سب سے بڑی دولت ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ (یونس)
''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے امراض) کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔ (اے نبیﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے' تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں! وہ کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

بارك اللّٰه لی ولكم فی القرآن العظیم ونفعنی وایّاكم بالآیات والذّكر الحكیم ○○

(اختتامی نشست دورۂ ترجمہ قرآن' جامع مسجد قرآن اکیڈمی' ڈیفنس' کراچی'
۲۶ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ/ ۲۶ جنوری ۱۹۹۸ء)

کلمۂ تشکّر

الحمد للہ‘ ثم الحمد للہ ! بانی تنظیم اسلامی و مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن کی ترتیب وتسوید اور تدوین کا کام آج پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے ع ’’شکر صد شکر کہ جنازہ بمنزل رسید!‘‘

اس کٹھن کام‘ جسے خود ڈاکٹر صاحبؒ نے ’’پہاڑ ایسا بھاری کام‘‘ قرار دیا تھا‘ کا آغاز میں نے 2006ء میں ’’تعارف قرآن‘‘ کی ایڈیٹنگ سے کیا تھا‘ جبکہ ’’بیان القرآن‘‘ کا حصہ اول (مشتمل بر ’تعارف قرآن‘ سورۃ الفاتحہ وسورۃ البقرۃ‘‘) 2008ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد حصہ دوم کی ایڈیٹنگ کے دوران مجھے لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین صاحب (ایجوکیشن کور) کی رفاقت میسر آگئی‘ جس کی حیثیت بلاشبہ تائیدِ غیبی کی تھی۔ محترم کرنل صاحب نے خالصتاً رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر مسلسل چھ برس تک اس مشکل کام میں انتہائی دلچسپی‘ ذوق وشوق اور لگن سے حصہ لیا اور کمالِ مہارت سے معاونت کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی بھرپور جزائے خیر عطا فرمائے۔

’’بیان القرآن‘‘ کے قارئین اس امر سے واقف ہوں گے کہ دعوتِ قرآنی کی نشرواشاعت کے ضمن میں یہ تحریری کاوش محض دروسِ قرآنی کو لفظ بہ لفظ صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے کتابی صورت میں پیش کر دینے پر منحصر نہیں ہے‘ بلکہ خطابی انداز کو تحریری اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش ہے‘ جس میں الفاظ اور جملوں کی تقدیم وتاخیر کے علاوہ کہیں حسبِ ضرورت اختصار سے کام لیا جاتا ہے تو کہیں بعض الفاظ یا جملوں کا اضافہ بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ گویا ٹیپ سے اتارے گئے مسودہ کو ازسرِنو تحریر کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ احادیث نبویؐ کے صحتِ متن اور تخریج کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ ہم اس کاوش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں‘ اس ضمن میں ہمیں قارئین کی آراء‘ تبصروں اور تجاویز کا انتظار رہے گا۔

’’بیان القرآن‘‘ کی تیاری کے ضمن میں شعبہ مطبوعات‘ قرآن اکیڈمی لاہور کی پوری ٹیم نے بقدرِ استطاعت محنت اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ خصوصاً اس کی کمپوزنگ‘ پروف ریڈنگ‘ تصحیحِ اغلاط‘ تدوین وتزئین اور طباعت کے مراحل میں برادرم حافظ محبوب احمد خان‘ عزیزم مرتضیٰ احمد‘ عزیزم حافظ محمد زاہد اور برادر محترم شیخ رحیم الدین (انچارج پرنٹنگ) کی لگن اور سرگرمی لائقِ تحسین ہے۔ ’’بیان القرآن‘‘ کی طباعت کا سہرا انجمن خدام القرآن پشاور کے صدر جناب ڈاکٹر اقبال صافی کے سر ہے‘ جو اس کی تکمیل پر بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ’’بیان القرآن‘‘ کو اہلِ علم اور طالبانِ قرآن کے حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے اور اس کا حصہ ہفتم پریس جانے سے قبل حصہ اول کے دس ایڈیشن اور حصہ دوم تا حصہ ششم کے بھی متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ! مکتبہ خدام القرآن لاہور کے کارکنان جس مستعدی سے اس کی ترسیل وفروخت کی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ بھی یقیناً لائقِ ستائش ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دعوتِ قرآنی کی اس خدمت کو شرفِ قبول عطا فرما کر اسے داعی رجوع الی القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے لیے صدقۂ جاریہ اور رفعِ درجات کا ذریعہ بنائے اور اس کی ترتیب وتدوین اور اشاعت وطباعت کی خدمات سرانجام دینے والوں کے لیے اسے سعادتِ دارین کا باعث بنائے۔ آمین یارب العالمین!!

۱۷ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ/ ۵ جون ۲۰۱۵ء
بروز جمعۃ المبارک

حافظ خالد محمود خضر
مدیر شعبہ مطبوعات

بیان القرآن

ڈاکٹر اسرار احمد